هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ
تذکرہ شاہ ولی اللہؒ
شاہ ولی اللہ نمبر
۱۳۶۰ھ
۱۹۴۱ء
الفرقان (بریلی)
مرتبہ
محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ
طبع دوم

إِنَّ وَلِيِّيَ اللّٰهُ الَّذِي نَزَّلَ الْكِتٰبَ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِينَ

تذکرہ شاہ ولی اللہ علیہ رحمۃ اللہ

یعنی

ماہ نامہ **الفرقان** بریلی

کے

شاہ ولی اللہ نمبر کا

دوسرا مکمل تر اڈیشن

(مع اضافاتِ جدیدہ و ترمیماتِ مفیدہ)

بیادگار

حکیم الامت محی السنت مجدد الملت وارثِ کمالاتِ نبوت امام الہند

سیدنا حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی فاروقی

قدس اللہ روحہ وبرد مضجعہ ونور مرقدہ

مرتبہ

محمد منظور، نعمانی، عفا اللہ عنہ

قیمت قسم عام کاغذ سفید چکنا ۱۰ پونڈ عہ، مجلد (عہ) قسم خاص کاغذ نہایت اعلیٰ ۳۲ پونڈ (عہ) مجلد (ے)

(محبوب المطابع برقی پریس دہلی)

استلفات

قریباً ساڑھے چار سو صفحے کا یہ مجموعہ

جو آپ کے پیش نظر ہے اگرچہ اسکا براہ راست تعلق صرف حضرت امام شاہ ولی اللہ (قدس روحہ) کی سوانح حیات اور آپ کی علمی و دینی خدمات سے ہے اور اس کاوش کا اصل مقصد بالذات آپ ہی کے مجددانہ کام اور پیغام کو عہد حاضر کے مسلمانوں کے سامنے پیش کرنا ہے لیکن ضمناً اسمیں اسلامی ہند کی (کم از کم اجمالاً ہی) پوری دینی اور علمی تاریخ آگئی ہے۔ اور نہ صرف اسلامی ہند بلکہ اسلام کی تیرہ سو سال کی عمر میں جہاں کہیں اور جس زمانہ میں بھی تجدید دین اور احیاء ملت کا کوئی بڑا کام ہوا ہے اس کا بھی تذکرہ اس مجموعے میں آگیا ہے اور صرف "تذکرہ" ہی نہیں، بلکہ نتیجہ خیز اور سبق آموز تذکرہ آگیا ہے۔ بالخصوص عہد عالمگیری سے لیکر سلطنت مغلیہ کے زوال اور پھر حضرت سید احمد شہیدؒ و حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی تحریک جہاد تک کی جسقدر بصیرت افروز تاریخ سبق آموز نوعیت کے ساتھ اس میں درج ہوگئی ہے وہ کسی دوسری جگہ غالباً نہیں ملسکتی۔ وذٰلک من فضل اللہ علینا وعلی الناس:۔

اور اگرچہ اس مجموعے کے مقالوں کی تعداد مبیّن سے بھی کم ہی ہے لیکن الحمد للہ سیکڑوں نادر اور اہم علمی و تاریخی مباحث پر حاوی ہے جیسا کہ فہرست مضامین کے ملاحظہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ پھر بحمداللہ لکھنے والے وہ حضرات ہیں جو ان مباحث میں خاص بصیرت رکھتے ہیں اور اس باب میں استفادہ کیلئے جنکی طرف سب سے پہلے نظر جاسکتی ہے ۔

ان نادر علمی افادات کو دماغوں سے قلم تک اتروالانا اور کاغذ اور دیگر ضروریات پریس کی ہوشربا گرانی کے باوجود ایک دفعہ کے بعد دوسری مرتبہ چھپوا دینا میرا کام تھا اور اب انکی بیش از بیش اشاعت اور خدمت دین سے دلچسپی رکھنے والے حلقوں میں انکو پہنچا دینا آپ حضرات کے تعاون پر موقوف ہے جس کی توقع رکھنے کا آپ سے میں ضرور حقدار ہوں۔ والسلام

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

ربیع الاول سنہ ۱۳۶۰ھ

حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہ مدظلہم العالی کے تاثرات

(حضرت شاہ ولی اللہ رح اور "ولی اللہ نمبر" کے متعلق)

[اس دوسرے اڈیشن کی تیاری کے وقت حضرت مفتی صاحب مدظلہ سے بھی کچھ سطروں کیلئے درخواست کی گئی تھی، حضرت ممدوح نے اس درخواست پر جو کچھ ارقام فرمایا ہے اگرچہ براہ راست وہ "شاہ ولی اللہ نمبر" کے متعلق "اظہار رائے" ہے لیکن ضمناً انہی چند سطروں میں خود شاہ صاحب قدس سرہٗ کے متعلق حضرت ممدوح کے تاثرات بھی آگئے ہیں اس لئے ان سطور کو بھی شریک اشاعت کیا جاتا ہے۔ غرض حضرت ممدوح کی اس تحریر کی اشاعت سے مقصود تقریظی فائدہ حاصل کرنا نہیں ہے اگر ایسا خیال ہوتا تو اکابر امت اور مشاہیر ملک و ملت کی وہ پچاسوں تحسینی رائیں بھی شامل کی جاسکتی تھیں جو اب تک موصول ہو چکی ہیں ——— نعمانی غفرلہٗ]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلماً

"الفرقان بریلی" کے شاہ ولی اللہ نمبر کے مطالعہ سے فقیر شرف اندوز سعادت ہوا مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر "الفرقان" کا یہ کارنامہ امت اسلامیہ پر احسانِ عظیم ہے اگرچہ اس سے پہلے بھی مقربانِ بارگاہِ احدیت و مقبولانِ درگاہ صمدیت میں سے کئی نامور بزرگوں کے حالات میں "الفرقان" کے مخصوص نمبر شائع ہو چکے اور اسلامیانِ ہند سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں مگر ولی اللہ نمبر ایک خاص اہمیت اور نرالی شان کے ساتھ جلوہ گر ہوا ہے۔ اس میں ایک ایسے فرزندِ اسلام کا تذکرہ ہے جو نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیائے اسلام میں علوم اسلامیہ کا ماہر وراثت نبوت کے حاملین کا قائد، شریعت و طریقت کا جامع، علوم یقینیہ حقہ کا مروّج حکمتِ الٰہیہ کا معلم ہے جس کی مجتہدانہ بصیرت علماء زمانہ کی ہدایت کے لئے مشعل راہ تھی۔ اس کا فیض ہند اور ماورائے ہند عرب و عجم میں سمندر کی موجوں کی طرح جاری وساری تھا جس کے انفاس قدسیہ کی بدولت ہندوستان کی سرزمین بدعات کی تاریکی سے صاف اور سنت نبویہ کی عالمتاب روشنی سے منور ہوئی۔ اس کے علوم و معارف کی نہریں آج بھی ہندوستان کے گوشے گوشے میں تشنگان علم کو سیراب کر رہی ہیں۔ اور ہندوستان میں اتباع سنت کا جو ذوق پایا جاتا ہے وہ اسی مرد خدا حکیم الاسلام مجدد ملت اور اس کے خاندان کے فیوض اور مساعی مشکورہ کا نتیجہ ہے۔ مولانا منظور صاحب تمام مسلمانوں کی طرف سے مبارکباد اور شکر گزاری کے مستحق ہیں اور تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس گراں بہا ذخیرے سے متمتع ہوں جو حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کی سیرت کے متعلق اس نمبر میں جمع کر دیا گیا ہے۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ　　۶ ربیع الاول ۱۳۶۰ھ

فہرست مضامین تذکرہ شاہ ولی اللہؒ

یعنی

شاہ ولی اللہ نمبر الفرقان بریلی (طبع دوم)

فہرست حصہ نظم

چند کلمات

اِس دوسرے اڈیشن کے متعلق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کے تذکار کا جو مجموعہ اس وقت آپ کے سامنے ہے یہ ماہنامہ "الفرقان" بریلی کے "شاہ ولی اللہ نمبر" کا دوسرا اڈیشن ہے — اسکا پہلا اڈیشن ماہ محرم الحرام سنہ ۱۳۶۰ھ (مطابق فروری سنہ ۱۹۴۱ء) میں شائع ہوا تھا، جس کو "الفرقان" کے چار ماہ کے تمام پرچوں (بابت ماہ رمضان تا ذی الحجہ سنہ ۵۹ھ) کے قائم مقام کر دیا گیا تھا جس وقت اس کی طباعت شروع کرائی گئی تھی تو "الفرقان" کے مستقل خریداروں اور صرف نمبر کا آرڈر دینے والوں کی مجموعی تعداد ایک ہزار سے کم تھی، اگرچہ کاغذ بیحد گراں تھا لیکن پھر بھی ہمت کر کے ساڑھے بارہ سو (۱۲۵۰) چھپوایا گیا لیکن خلاف توقع دورانِ طباعت ہی میں آرڈر بہت زیادہ آ گئے، یہانتک کہ وسط فروری میں جب روانگی شروع ہوئی تو ابھی آمدہ فرمائشیں کچھ باقی ہی تھیں کہ نمبر ختم ہو گیا، —— اس کے بعد جو آرڈر آئے مجبوراً اُن کو انکاری جواب دینا پڑا —— اب ہر طرف سے دوسرے اڈیشن کے لئے اصرار شروع ہوا، کاغذ کی ہوش اڑا دینے والی روز افزوں گرانی کو دیکھتے ہوئے ہمت نہ ہوتی تھی، لیکن قدردان دوستوں کے اصرار نے اس درجہ مجبور کیا کہ اپنی گنجائش اور برداشت کے سوال سے قطع نظر کر کے کمر ہمت کس لینی پڑی اور صفر سنہ ۶۰ھ (مارچ سنہ ۴۱ء) کے دوسرے ہفتے میں کاغذ کے انتظام کے لئے دہلی پہنچ گیا یہاں یہ دیکھ کر اس ڈیڑھ دو مہینے میں کاغذ کے دام دو چند سے سہ چند ہو چکے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ سر چکرا گیا اور ارادہ مضمحل ہونے لگا، لیکن دلی کے ہمت افزا دوستوں نے ہمت افزائی فرما کر پھر اس ارادہ پر استوار کر دیا —— صرف ایک ہزار نسخوں کے لئے تقریباً چھ سو روپیہ کا محض کاغذ خریدا گیا کچھ کم و بیش اسی قدر کتابت و طباعت وغیرہ باقی اور کاموں پر صرف ہوئے اور پورا ایک مہینہ اس میں اس درجہ انہماک رہا کہ دوسرے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگایا جا سکا — اس طرح یہ دوسرا اڈیشن تیار ہو سکا ہے۔

اس کی مسرت ہے کہ اس دوسرے اڈیشن کے بہانے اِس نمبر کی تکمیل ہو گئی اور بعض وہ خامیاں جو پہلے اڈیشن میں رہ گئی تھیں بحمد اللہ اب وہ نہیں رہیں۔

کتابت و طباعت اور سب سے زیادہ صحت کی حیثیت سے تو یہ دوسرا اڈیشن بحمد اللہ فائق ہے ہی لیکن اس کے علاوہ

ایک خاص اور مفید اضافہ اس میں یہ ہوا ہے کہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی مدظلہ اور مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے مقالات میں خصوصاً اور بعض دوسرے مضامین میں بھی تقریباً تین ساڑھے تین سو عنوانوں کا اضافہ ہوا ہے بظاہر تو یہ بہت معمولی سی ترمیم ہے لیکن اگر آپ غور فرمائیں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ دونوں مقالے اپنی علمی گہرائیوں اور مخصوص طرز ادا کی وجہ سے شرح طلب تھے اور ان عنوانات نے بڑی حد تک ان کے مطالب کی تشریح کر دی ہے اور متوسط الاستعداد لوگوں کے لئے بھی ان کو قابل استفادہ بنا دیا ہے۔ پھر فہرست مضامین میں بھی یہ سب عنوانات دیدیئے گئے ہیں تاکہ مطالعہ اور استفادہ میں سہولت ہو۔

علاوہ ازیں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی کے ایک مقالہ کا اس اڈیشن میں ایک مستقل اضافہ بھی کیا گیا ہے، مختصر ہونے کے باوجود یہ اضافہ قیمتی ہے — اور یہ مولانا سندھی کے مقالہ کی آخری فصل بابت آخری سطروں کی اچھی شرح اس مقالہ سے ہو جاتی ہے، اور اسی واسطے اس کو مولانا سندھی کے مقالہ کے بعد متصلاً درج کیا گیا ہے۔ سب سے آخری صفحہ پر ہمارے رفیق مولانا نسیم احمد فریدی کی نظم حضرت شاہ ولی اللہ اور دار العلوم دیوبند بھی اس اڈیشن ہی کا اضافہ ہے۔

کوئی شک نہیں کہ ان اضافات نے نمبر کی جامعیت اور افادی حیثیت کو بہت کچھ بڑھا دیا ہے — اور تحدیثاً بالنعمۃ اب اسکی اظہار میں مجھے کوئی باک نہیں کہ مضامین و مقالات کا یہ مجموعہ صرف "ایک رسالہ کا خصوصی نمبر" ہی نہیں ہے بلکہ حضرت شاہ ولی اللہ رح کی ایک اچھی خاصی جامع سیرت ہے جس میں شاہ صاحب قدس سرہٗ کے مذہبی و سیاسی ماحول، آپکی دعوت اصلاح و ارشاد اور آپکے تجدیدی کارناموں کا تذکرہ تحقیق و تدقیق کیساتھ اس قدر بسط و تفصیل سے آگیا ہے کہ غالباً بلکہ (انشاء اللہ یقیناً) دوسری جگہ کہیں نہیں مل سکتا — پھر یہ صرف تذکرہ ہی نہیں ہے اور نہ صرف داستان سرائی اسکا مقصد ہے — بلکہ مدعا اس ساری دوڑ دھوپ سے "تاریخ ماضی" کی تذکیر کا یہ ہے کہ تاریکی کے اس دور میں ہم اسلامیان ہند بجائے اسکے کہ بقول مولانا گیلانی "مغربی" یا "ہندی ڈیوٹ" سے روشنی حاصل کریں کیوں نہ اپنے اُن ربانی بزرگوں کی ہدایات کو شمع راہ بنائیں جنکا سرمایہ صرف اپنا سوچ بچار ہی نہ تھا بلکہ کتاب و سنت میں تفکر اور اجتہادی بصیرت کے علاوہ الہام ربانی "عنایت الٰہی" اور "فیض روح القدس" کی تائید و تسدید بھی انکو حاصل تھی۔

صرف اسی مقصد کو سامنے رکھ کر یہ کام کیا گیا ہے اور کیا جا رہا ہے اور اسی واسطے اس مجموعہ میں خاص طور پر شاہ صاحب کے اُن حالات اور آپکی اُن مجددانہ خدمات کو اُجاگر کرنیکی زیادہ کوشش کی گئی ہے جن سے عہد حاضر کے مسلمان سبق لیکر اپنے لئے راہ عمل طے کر سکتے ہیں۔

غور کرنیوالوں کو اسی "تذکرہ" کے ضمن میں بہت سی ایسی چیزیں بھی ملیں گی جو اس نازک وقت میں جبکہ جنگ یورپ کی وجہ سے "ارڈیننس" کی تلوار سر پر لٹک رہی ہے براہ راست اور کھول کر نہیں کہی جا سکتیں۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ رح کے کام اور پیغام کے ابھی بہت سے گوشے ایسے باقی رہ گئے ہیں جنپر اس مجموعہ میں کچھ نہیں لکھا جا سکا، یا بہت ہی مجمل لکھا جا سکا ہے، اسکے لئے ہمارے دوسرے شاہ ولی اللہ نمبر کا انتظار فرمائیے: گویا یہ پیش نظر نمبر سیرت شاہ ولی اللہ رح کی پہلی جلد ہے اور وہ دوسرا شاہ ولی اللہ نمبر (جسکا ذکر نمبر ہذا کے ابتدائی اور آخری صفحات میں بھی کئی نظر سے گزریگا) اس کی دوسری جلد ہوگی۔ اسی لئے اس مجموعہ کی اس دوسری اڈیشن کو ہمنے خاص طور سے تذکرہ شاہ ولی اللہ ہی کے نام سے موسوم کر دیا ہے، انشاء اللہ تعالیٰ ہمارا دوسرا نمبر شاہ ولی اللّٰہی کام اور پیغام کے تجدید و احیاء کے اُس قرض کو ادا کر دیگا جو ڈیڑھ سو برس سے مسلمانان ہند کے ذمہ ہے واللہ ولی التوفیق

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ، مدیر الفرقان بریلی، ربیع الاول ۱۳۶۰ھ

بسم اللہ
الولی العزیز الرحیم

سویدائے دلِ ما یابی اندر پیچ و تاب ایں[1]
نقوش عالم اُمّ الکتابش میتواں گفتن

(حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ)

[1] یہ شعر حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ ہی کا ہے اور حسن اتفاق سے اس ولی اللہ نمبر پر اس قدر چسپاں ہے کہ گویا حضرت ممدوح نے عالم ارواح میں اس نمبر ہی کیلئے کہا ہے۔ ہم نے اس میں اتنا تصرف کیا ہے کہ پہلے مصرعہ کے آخر میں "او" تھا اس کے بجائے "ایں" کر دیا گیا ہے (نعمانی غفرلہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم

نگاہِ اوّلین

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ لَا نُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ

آنانکہ زاد ناس ہمی رستند — بالجبّہ انوار قدم پیوستند
فیض قدس از ہمت ایشان مجو — دروازۂ فیض قدس ایشان بستند
(حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ)

اب سے قریبًا دو سال پہلے اواخر ۱۳۵۵ھ میں "الفرقان" کا "مجدد الف ثانی نمبر" شائع کرنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی جس کے ذریعہ خدا کے ایک مقبول بندے اور "مبعوث مجدد"[1] حضرت شیخ احمد سرہندی (قدس سرہٗ) کا کام اور پیغام جو دسویں صدی کے اُن مسلمانوں کے سامنے پیش کیا گیا تھا جو اس وقت اسی قسم کے جاہلی فتنوں میں گھر رہے ہیں اور گھرتے چلے جا رہے ہیں جس قسم کے فتنوں کو شکست دینے کے لئے ہی حضرت ممدوح کو بحیثیت مجدد قدرت کی جانب سے کھڑا کیا گیا تھا اور ان فتنوں کے طوفان سے اسلامی ہند کو بچا لینا ہی حضرت کا وہ خاص کارنامہ ہے جس کی وجہ سے آپ کا نام ہی اسلامی تاریخ میں "مجدد الف ثانی" ہے۔

آج اُس سے دو سال کے بعد یہ "شاہ ولی اللہ نمبر" شائع کرنے کی توفیق مل رہی ہے۔ اس کے ذریعہ ہم نے دورِ حاضر کے مسلمانوں کے سامنے اُس "چراغِ ہدایت" کی روشنی کو پیش کرنا چاہا ہے جو اب سے قریبًا سوا دو سو برس پہلے قدرت کی طرف سے اسی ہندوستان میں اُس وقت روشن کیا گیا تھا جب سلطانِ اسلام غازی اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد چاروں طرف سے نہایت مہیب فتنوں کے بادل اسلامی ہند کی طرف اُٹھ رہے تھے اور اس ابتلائی اسبابی دور میں اپنی غفلت کیشیوں اور بداعمالیوں کا خمیازہ بھگتنے کے لئے کفر کی طاقتوں سے زیر ہو جانا ہندی مسلمانوں کیلئے طے ہو چکا تھا

یہ چراغِ ہدایت، اس دورۂ اخیرہ کے امام بارھویں صدی کے مجددِ اعظم حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کا وجود مسعود تھا جس نے کتاب و سنت کی صحیح معرفت، خداوندی الہام اور ایمانی بصیرت، ملاءِ اعلیٰ کی اعانت اور مجددانہ فراست کی مدد سے وہ روشنی پیدا کی جو دو صدیاں گزر جانے پر آج بھی مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔

---

[1] فی الحدیث "ان اللہ یبعث لھذہ الامۃ علی راس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا" (ابو داؤد) ۱۲ م

نمبروں کے اس سلسلہ سے ہماری غرض:-

"خاص نمبر" نکالنے کی رسم اگرچہ فی زماننا ایک مبتذل اور بے مقصد رسم بن چکی ہے اور اب عموماً اس رسم کے علاوہ اگر اس کا کوئی مقصد ہوتا ہے تو بس یہی کہ "صحافت کی دکان" کو چند نئے قمقموں اور جاذب نظر تصویروں سے سجا کر تجارت کو فروغ دیا جائے ۔۔۔ اور کوئی شک نہیں کہ ان حضرات کا یہ مقصد بڑی حد تک پورا بھی ہو جاتا ہے مجھے معلوم ہے اور ہر واقف کار کو معلوم ہوگا کہ جن مشہور رسائل کے "خاص نمبر" اور "سالنامے" اچھی شان اور آن بان سے نکلتے ہیں ان کے تمام مصارف صرف اشتہارات کی اجرت سے پورے ہو جاتے ہیں اور جو قیمت اپنے خریداروں سے ان کو وصول ہوتی ہے وہ ان کا خالص نفع ہو جاتا ہے لیکن یہاں کا حال اس بارہ میں جو کچھ ہے اس کا اندازہ اس نمبر کی ضخامت، کتابت، طباعت اور کاغذ کی نوعیت کو دیکھ کر آپ خود بھی فرما سکتے ہیں بشرطیکہ آپ کو آج کل کے ہوش اڑا دینے والے نرخوں کا پتہ ہو۔ ہاں بیشک ایک خاص فائدہ اس نمبر کے پہلے ہی اڈیشن کی اشاعت سے ہم کو یہ ضرور حاصل ہوا کہ اس نمبر کی برکت اور اس کے طفیل میں ہماری دعوت کا حلقہ اس سال کافی وسیع ہو گیا اور "الفرقان" کے ناظرین کی تعداد میں ایک معقول اور انشاء اللہ مستقل اضافہ اس نمبر نے کر دیا ۔۔۔ ایک دوسرا فائدہ جو ہمارے نقطۂ نظر سے اس سے بھی بڑا ہے یہ ہوا کہ یہ نمبر خاص علمی حلقوں میں بہت زیادہ پڑھا گیا اور دوسرے عام دینی مدارس اور علمی اداروں کے علاوہ "دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ" "جامعہ ملیہ دہلی" اور "مسلم یونیورسٹی علیگڑھ" میں بھی اچھی خاصی تعداد میں منگایا گیا اور وہاں کے خاص ارباب علم و فکر نے بھی اس کو ایک ممتاز اور مفید علمی و دینی خدمت قرار دیا اور اس طرح حضرت شاہ ولی اللہ کا کام اور پیغام ہم وہاں بھی پہنچا سکے جہاں بظاہر ہماری کمزور آواز کے پہنچنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ یہاں کی علمی دنیا اور دینی حلقوں میں جس طرح اس کا خیر مقدم کیا گیا ہے وہ یہاں کی مقبولیت کی طرف سے تو مطمئن کر دینے کیلئے کافی ہے ۔۔۔ رہا عند اللہ مقبولیت و نامقبولیت کا مسئلہ تو وہ غیب الغیب کی چیز ہے اور فی الحقیقت ہماری فلاح و خسران کا دار و مدار اسی پر ہے۔ تاہم کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس بندہ نواز "ذوالجود والکرم" کی رحمت بخشش سے مایوس ہوں۔

غرض نمبروں کے اس سلسلہ سے مالی نفع حاصل کرنا نہ تو ہمیں مقصود ہے اور نہ ہمارے لئے اس کا کوئی امکان ہے بلکہ اصل مقصد اس سلسلے سے صرف یہ ہے کہ اس طرح ہم اپنے ان مجددین اور مصلحین امت کے کارناموں کو روشن اور ان کی ہدایتوں کو زندہ کر کے مسلمانان حال کے سامنے پیش کر سکیں جنہوں نے "بگڑے ہوئے ہندوستان" ہی میں اقامت دین، احیاء ملت اور اشاعت کتاب و سنت کے سلسلہ میں وہ خدمات انجام دیں جن کے نتیجہ میں اسلام اور مسلمان آج تک اس ملک میں باقی ہیں اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس گئی گزری حالت میں بھی اسلام کیلئے جو کچھ اور جیسا کچھ ہندوستان میں ہو رہا ہے بحیثیت مجموعی دوسری جگہ نہیں ہو رہا ۔۔۔ درحقیقت یہ جو کچھ ہو رہا ہے سب طفیل اور صدقہ ہے ہمارے ان ہی مقدس بزرگوں کا جن کے ناموں کو تو ہم نے (بس ناموں کی حد تک) ضرور یاد رکھا ہے اور خوب یاد رکھا ہے لیکن ان کے

کاموں اور پیغاموں کو ایسا بھلایا گیا ہے کہ بیچارے عوام در کنار خواص تک ناواقف ہیں۔ ہم نے اس سلسلہ کو امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ سے شروع کیا ہے کیونکہ بقول حضرت امام ربانی رح "ہزارہ دوم" کے آغاز ہی سے یہاں دین کی "غربت" اور "جاہلیت" کے غلبہ کا خاص دور شروع ہوا ہے اور ہندوستان میں تجدیدی نوعیت کا کام وہیں سے شروع ہوتا ہے، (اس سے پہلے یہاں دین کی خدمت کے سلسلہ میں جو کچھ ہوا اس کا ذکر ہمارے ناظرین مولانا محمد نور الحق صاحب علوی پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور کے اُس سلسلہ مضامین میں ملاحظہ فرما رہے ہیں جس کا کافی حصہ پچھلے دو سال میں قسطوار الفرقان میں شائع ہو چکا ہے اور باقی انشاء اللہ آئندہ شائع ہوگا، نیز اُس عہد کی اجمالی تاریخ اسی نمبر میں مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کے مقالہ میں بھی آگئی ہے۔)

بہر حال اس ملک میں تجدیدی نوعیت کا کام چونکہ ہمارے خیال میں حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی ہی سے شروع ہوا ہے اس لئے ہم نے اپنے نمبروں کا سلسلہ بھی وہیں سے شروع کیا ہے، **مجدد الف ثانی نمبر** ہمارے اس سلسلہ کی پہلی کڑی تھی، ہم کو بیحد مسرت ہے کہ علمی حلقوں میں وہ ہماری توقعات سے زیادہ قبول ہوا، بہت زیادہ پڑھا گیا اور ہندوستان کے علمی طبقہ پر اس نے اپنا ایک خاص اثر ڈالا۔

اسی سلسلہ کی یہ دوسری کڑی ہے شاہ ولی اللہ نمبر ہے جس کا پہلا اڈیشن اشاعت کے ساتھ ہی ختم ہو گیا اور دوسرا اڈیشن آپ کے زیر نظر ہے

نمبر کے مضامین کے متعلق چند کلمات:-

اب جبکہ سب مقالات اور مضامین آپ کے سامنے ہیں ان کے متعلق مجھے کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں اور شاید یہی زیادہ مناسب بھی ہے کہ بجائے "عطار" کی زبان سے سننے کے اُس کے پیش کردہ "مشک و گلاب" کو آپ خود ہی سونگھ کر دیکھ لیں ـــ تاہم چند خاص باتیں عرض کرنی ضروری ہیں ـــ

پہلی بات تو یہ ہے کہ مضامین کی ترتیب میں نہ تو مضامین کی حیثیت کا لحاظ رکھا گیا ہے اور نہ مضامین نگار حضرات کے مراتب و درجات کا، بلکہ صرف کتابی ترتیب کے لحاظ سے مقالات کو مقدم یا مؤخر کیا گیا ہے ـــ یعنی اگر حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ پر کوئی مستقل کتاب لکھی جاتی تو جو ترتیب اُس کے مضامین کی ہوتی اسی کے لحاظ سے اس نمبر کے مقالات کو ترتیب دیا گیا ہے۔

چنانچہ شروع میں میری معروضات کے بعد متصلاً حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدظلہ العالی شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند و صدر جمعیۃ العلماء ہند کا ارشاد گرامی اور اس کے بعد مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی اڈیٹر صدق لکھنؤ کا ایک گرامی نامہ ہے ـــ اس کے بعد پہلا مقالہ مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کا ہے، موصوف عصر حاضر کے اُن ممتاز نوجوان ندوی فضلاء میں سے ہیں جنھوں نے "دارالعلوم ندوۃ العلماء" کی علمی خصوصیات کو اچھی طرح جذب کیا ہے۔ اب سے چند سال پہلے

"دارالعلوم ندوۃ العلماء" سے جو عربی رسالہ "الضیاء" نکلتا تھا اسکی عنانِ ادارت آپ ہی کے ہاتھ میں تھی، اور طبقۂ علماء میں آپکا پہلا تعارف اسی حیثیت سے ہوا ہے۔ نوجوانی کے باوجود آپ کا مطالعہ کافی وسیع اور فکر خالص اور خالص اسلامی ہے اور اسی لئے "مسلمانوں" کی اس تاریخ پر جو اسلامی نقطۂ نظر سے قابلِ تنقید ہے آپ کی تنقید سخت ہوتی ہے۔ جو مقالہ آپکا اس نمبر میں پیش ہو رہا ہے اس میں بھی آپ کی اس خصوصیت کی کافی جھلک موجود ہے — اس مقالہ میں آپ نے حضرت شاہ ولی اللہ رح سے پہلے ہندوستان کی "اسلامی تاریخ" پر تبصرہ کیا ہے گویا اس مقالہ کا تعلق صرف "اسلامی ہند ماقبل شاہ صاحب" سے ہے، اسی واسطے اس کو سب مقالوں پر مقدم رکھا گیا ہے۔ موصوف نے اس مقالہ کو کس قدر محنت اور قابلیت سے مرتب کیا ہے اس کا اندازہ کچھ وہی حضرات کر سکتے ہیں جن کو اس قسم کے کاموں سے واسطہ پڑتا ہے اور اس لئے وہی اس کی صحیح قدر بھی کر سکیں گے۔ البتہ نظریۂ "وحدۃ الوجود" اور اسی کے سلسلہ میں حضرت شیخ اکبر ابن عربی کا تذکرہ آپ نے اپنے اس مقالہ میں جس انداز سے کیا ہے وہ ہمارے خیال میں قابلِ نظرِ ثانی ہے، اور اس پر غور کرنے کے لئے خود حضرت شاہ ولی اللہ کی کتابیں اپنے اندر کافی سامان رکھتی ہیں۔ اس کے بعد دوسرا مقالہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مدیر "ترجمان القرآن لاہور" کا ہے، مولانا ممدوح کی شخصیت کم از کم ناظرینِ الفرقان کیلئے کسی تعارف کی محتاج نہیں، اُنکے دینی مضامین تقریباً سات آٹھ سال سے میری نظر سے گذر رہے ہیں، علم و عمل میں عصمت تو انسانوں میں صرف انبیاء علیہم السلام کا خاصہ ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ حقیقتِ اسلام اور مقتضیاتِ اسلام کے ادراک اور پھر ان کی تبیین کے بارہ میں انپر حق تعالیٰ کی خاص نوازش ہے اور اس نعمت سے انھیں حصۂ وافر ملا ہے، اگرچہ ہمارے قدیمی مدرسوں کی اصطلاح میں وہ باقاعدہ "فارغ التحصیل عالم" نہیں ہیں — تاہم علوم دین (تفسیر، حدیث، فقہ) کو انھوں نے ابتداءً باضابطہ اہلِ درس علماء سے ہی پڑھا ہے۔ لیکن پھر بھی علوم دین میں انکی نظر اور واقفیت آجکل بہت سے مستند اور اصحابِ درس علماء کرام سے کم نہیں زیادہ ہی ہے۔

مولانا موصوف کے متعلق یہ چند کلمات مجھے یہاں اس لئے لکھنے پڑے کہ اس نمبر کے پہلے اڈیشن میں مولانا ممدوح کا مقالہ دیکھ کر ایک صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ "میں نے سنا ہے سید ابوالاعلیٰ صاحب کسی مدرسہ کے "فارغ التحصیل عالم" نہیں ہیں اس لئے انہیں مسائلِ شرعی میں اس طرح دخل دینے کا کیا حق ہے؟"

یاد آتا ہے بعینہٖ یہی تنقید کسی زمانہ میں بعض درسی حلقوں میں مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق بھی کی جاتی تھی حالانکہ "الہلال" اور "البلاغ" کے ذریعہ مولانا کا علم دنیا کے سامنے آچکا تھا — معلوم نہ تھا کہ یہ ذہنیت اب بھی کہیں کہیں باقی ہے خدا رحم فرمائے ہماری حالتوں پر۔

خیر! یہ سطریں تو مولانا مودودی کے متعلق تھیں۔ موصوف کا جو مقالہ اس نمبر میں شائع ہو رہا ہے اسمیں "مقامِ مجددیت" اور "منصبِ تجدید" کی حقیقت کی تعیین کیلئے پہلے اسلام اور جاہلیت کی اُصولی کشمکش کی وضاحت کی گئی ہے پھر دکھلایا گیا ہے کہ جاہلیت کس طرح اور کن راہوں سے اسلام پر حملہ آور ہوتی ہے اور مجددینِ ملت کا کام یہی ہوتا ہے

کہ اسلام کو جاہلیت کی آلائشوں اور آمیزشوں سے پاک و صاف اور اس کے کلمہ کو بلند کریں ـــ اس کے بعد مولانا نے تاریخ اسلام کے مشہور مجددین، حضرت عمر بن عبد العزیز، ائمہ اربعہ، امام غزالی، امام ابن تیمیہ، حضرت مجدد الف ثانی اور پھر آخر میں حضرت شاہ ولی اللہ (رحمہم اللہ تعالیٰ) کے تجدیدی کارناموں پر اپنے مخصوص محققانہ انداز میں تبصرہ فرمایا ہے۔ پھر اس سلسلہ میں جو کام پہلے نہیں ہوا اور آج اس کی ضرورت ہے اس کو بھی انھوں نے اپنے عندیہ کے مطابق پوری جرأت سے پیش کیا ہے۔ محترم مولانا کے مقالہ کا یہ حصہ عصر حاضر میں خدمت دین کا صادق جذبہ رکھنے والوں کیلئے خاص طور پر قابل غور ہے اگرچہ اس کے بعض حصے انہی پر زیادہ گراں گزریں گے لیکن اسکے باوجود انکو یہ سمجھ کر کہ یہ بھی دین کے ایک خادم کی رائے ہے ان چیزوں پر غور کر لینا چاہئے، صرف تاثر، ناراضی، گرانی، اور ناگواری سے مشکلیں حل نہیں ہو سکتیں اور کام چل نہیں سکتا۔ خود راقم سطور کو بھی اس کے بعض اجزا سے پورا اتفاق نہیں ہے تاہم ان کے ان افکار پر بار بار ہم کو غور کرنا اور ٹھنڈے دل اور آزاد ذہنیت سے غور کرنا چاہئے "عسیٰ ان تکرھوا شیئاً وھو خیر لکم وعسیٰ ان تحبوا شیئاً وھو شر لکم"

مولانا مودودی کے بعد تیسرا مقالہ ہمارے مولانا سید مناظر احسن گیلانی مدظلہ کا ہے ناظرین "الفرقان" کو یہ تبلانے کی ضرورت نہیں کہ بالخصوص مقبولین بارگاہ الٰہی کی سیرت نگاری میں مولانا ممدوح ایک نرالے طرز نگارش کے مالک بلکہ موجد ہیں خود مولانا ہی کی اصطلاح میں اگر یہ کہا جائے کہ اس خاص موضوع پر وہ جب لکھتے ہیں تو دماغ سے نہیں بلکہ دل سے لکھتے ہیں اور صفحہ قرطاس پر اپنے دماغی افکار کو نہیں بلکہ قلبی کیفیات و واردات کو ثبت کرتے چلے جاتے ہیں، تو یہ تعبیر انشاء اللہ حقیقت سے بہت قریب ہوگی ـــ یہ مقالہ بھی مولانا کا اسی قبیل سے ہے ـــ اس میں آپ نے حضرت شاہ صاحب رح کے سیاسی ماحول اور اس عہد کے انقلابی وقائع کو کافی تفصیل سے لکھنے کے بعد آپ کے کام کو عہد حاضر کے مسلمانوں کے سامنے پیش کیا ہے تاکہ وہ راہ عمل کے انتخاب اور پھر عملی سرگرمیوں میں اس سے روشنی حاصل کر سکیں۔ اس سلسلہ میں بعض عصری نظریات کی موافقت یا مخالفت میں بھی ممدوح کو اپنی رائے ظاہر کرنی پڑی ہے اور شدت احساس کی وجہ سے اس میں کہیں کہیں کچھ تیزی بھی آگئی ہے، لیکن اس کے متعلق جو نوٹ خود انھوں نے آغاز مضمون میں لکھدیا ہے اس کے بعد کسی معذرت کی ضرورت نہیں رہتی البتہ ایک آدھ جگہ محترم مولانا نے وقت کے اقتصادی مسئلہ کی اہمیت کو بہت زیادہ گرا دیا ہے ـــ اس بارہ میں آجکل جو "افراط" ہو رہا ہے اس کے ردعمل کے طور پر اگرچہ اس "تفریط" کے لئے جواز نکل سکتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی سے اس مسئلہ کا جو واقعی اور حقیقی تعلق ہے اس کو تسلیم کر کے اس کا صحیح حل پیدا کرنا ہمارا فرض اور دین اسلام کا اہم باب ہے، اور شاید اس نکتہ کو حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے زیادہ اسلام کے کسی عالم اور مصنف نے نہیں سمجھا ہے جیسا کہ حجۃ اللہ اور بدور کے ابواب ارتفاقات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔

بہر حال مولانا محترم کا یہ مقالہ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کے کام اور اس زمانہ کے احوال پر سب سے زیادہ مبسوط اور جامع مقالہ ہے، درمیان درمیان میں بہت سے ایسے علمی اور تاریخی افادات بھی آگئے ہیں جن سے ہمارے علمی اور خصوصاً درسی حلقے بہت

کچھ روشنی اور بصیرت حاصل کر سکتے ہیں ۔۔۔ الفرقان کی خوش نصیبی ہے کہ اس کو محترم مولٰنا کی خصوصی نظرِ عنایت و التفات حاصل ہے ورنہ اتنے بسیط اور ایسے مقالہ کے لئے جو مختلف کتابوں کے ہزاروں صفحات کی اُلٹ پلٹ کے بغیر نہیں لکھا جا سکتا کون اتنا وقت قربان کر سکتا ہے فاحسن اللہ الیہ فی الدنیا والاٰخرۃ کما احسن الینا وجزاہ عنا احسن ما یجزی بہ المحسنین

اس کے بعد چوتھا مقالہ حضرت مولٰنا عبید اللہ سندھی مدظلہٗ کا ہے جس میں آپ نے حضرت شاہ صاحبؒ کی حکمت کا تعارف کرایا ہے اور قرآن، حدیث، فقہ، اور تصوف سے متعلق علوم میں شاہ صاحب نے جو تجدید فرمائی ہے اور ان ابواب میں آپ کے جو خاص افکار ہیں ان کو مولٰنا نے اپنی تحقیق کے مطابق اس مقالہ میں پورے طور پر پیش فرمایا ہے ۔۔۔ میں یہاں صفائی کے ساتھ یہ عرض کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ مولٰنا ممدوح جب ہندوستان واپس آئے تو یکے بعد دیگرے چند چیزیں آپ کی طرف سے الیی پریس میں آئیں جنکی وجہ سے خود مجھے مولٰنا کے متعلق کچھ زیادہ حسن ظن نہیں رہا اس کے باوجود چونکہ عہد حاضر میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کے فلسفہ کے مولٰنا ہی سب سے بڑے علمبردار اور داعی ہیں اس لئے میں نے ولی اللہ نمبر کیلئے آپ سے مقالہ کی درخواست کی تاکہ ہم جیسے لوگوں کو بھی معلوم ہو سکے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے جس فلسفہ کی طرف وہ دنیا کو دعوت دے رہے ہیں انکی تحقیق میں وہ کیا ہے اور جو پروگرام ایک سیاسی مفکر ہونے کی حیثیت سے وہ ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں اس کا اس فلسفہ سے کیا ربط ہے۔ میں بیحد ممنون ہوں کہ مولانا نے میری پہلی ہی درخواست پر یہ مقالہ بطور املا قلمبند کرا کے مرحمت فرمایا، اس مقالہ کو مطالعہ کے بعد چند جگہ معمولی اختلاف رائے کے باوجود مجھے مولٰنا کے علم کی گہرائی اور وسعت کا کافی حد تک قائل ہونا پڑا، یہ مقالہ مجھے مئی سنہ ۱۹۴۰ء میں مل گیا تھا۔ جولائی میں یکلخت میں بستر علالت پر پڑ گیا اور دو تین مہینے پڑے پڑے کتابیں دیکھنے کے سوا کوئی کام نہ کر سکا اس عرصہ میں حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کی کتابیں ہی زیادہ تر میرے زیر مطالعہ رہیں اور مطالعہ جتنا بڑھتا گیا حضرت مولٰنا سندھی کے اس مقالہ سے میرا وہ معمولی اختلاف بھی اسی نسبت سے کم ہوتا گیا جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مقالہ کے بعض مقامات کا صحیح مطلب میں شاہ صاحب کی کتابوں کے مطالعہ کے بعد ہی سمجھ سکا، پھر بھی ایک دو جگہ ایسی رہیں جہاں مولٰنا کے فکر سے پوری طرح متفق نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ ذیقعدہ کے آخری اور ذی الحجہ کے پہلے ہفتہ میں اس نمبر ہی کی تیاری کے سلسلہ میں مجھے بارہ چودہ دن دہلی رہنا پڑا اس عرصہ میں چند طویل صحبتوں میں مولٰنا کے افکار و نظریات کو خود مولٰنا ہی کی زبان سے پوری تفصیل سے سُننے کا موقع ملا تو حضرت مولٰنا کے متعلق مجھے اپنے قدیم خیالات میں بھی بہت کچھ ترمیم کرنی پڑی اور مقالہ کے بعض مقامات بھی اس بالمشافہ گفتگو کے بعد ہی سمجھ میں آئے اور یہ مستقل فیصلہ کرنا پڑا کہ مولانا جو کچھ فرماتے ہیں بالخصوص جب سیاسی پالیسی کی طرف مسلمانوں کو دعوت دیتے ہیں اس کی نسبت حقیقت خود مولٰنا سے سننے کے بعد آخری رائے قائم کرنی چاہئے (حضرت مولٰنا معاف فرمائیں) اکثر باب میں اُن کا طرز عمل ملامتیہ مشائخ کے طریق سے بہت ملتا جلتا ہے وہ بہت سی ایسی باتیں فرماتے ہیں جن سے خواہ مخواہ ہم جیسوں کو بھی وحشت بلکہ بدگمانی پیدا ہوتی ہے اور جب اُس کی حقیقت بیان فرماتے ہیں تو وہ اکثر و بیشتر تو قابل قبول ہوتی ہے ورنہ

قابلِ برداشت تو ہوتی ہی ہے۔ غالباً وہ اپنی تعبیرات میں کسی ایک طبقہ کی اشتمالت کا اتنا لحاظ فرماتے ہیں کہ شدہ مہر سطلقوں کی وحشت اور ان کے تاثر سے بالکل ہی "صرفِ نظر" فرما لیتے ہیں۔

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علوم کا مولانا مدظلہ نے نہایت گہرا مطالعہ فرمایا ہے اور وقت کے خاص مسائل کو ان کی روشنی میں حل کرنا مولانا کا خاص فن ہے اور یہ مقالہ آپ کے اس کمال کا پورا آئینہ دار ہے، مولانا خود چاہتے ہیں کہ ان کے اس مطالعہ اور پچاس سالہ سیاسی و مذہبی تجربات سے ذی استعداد اور صاحب تفقہ علماء فائدہ حاصل کریں اور اس کی بہترین صورت کم از کم مہینے دو مہینے ان کے پاس قیام کرنا ہے۔ دہلی میں یادگارِ "شیخ الہند" کے قیام سے ان کا اصل منشا یہی ہے۔ دلی کی مفصل ملاقاتوں کے بعد حضرت مولانا سے بالمشافہ استفادہ کو ہر صاحبِ علم و بصیرت کے لئے میں مفید بلکہ مفید تر سمجھتا ہوں۔

البتہ حضرت مولانا کے مزاج میں اپنے خیالات کے بارہ میں ایک خاص قسم کا غیر معمولی تشدد ہے، استفادہ کا ارادہ رکھنے والے "رائے کے اختلاف کے باوجود اگر دو چار دن بھی اس کو برداشت کر سکے (اور برداشت کرنا چاہئے) تو وہ اپنی رائے پر قائم رہتے ہوئے بھی حضرت مولانا سے بہت کچھ حاصل کر سکیں گے۔ نیز مولانا کے افکار و خیالات میں کہیں کہیں بے نظمی اور ناہمواری بھی محسوس ہو گی جو نتیجہ ہے غالباً خاص قسم کے حالات کا لیکن صاف اور سلجھی ہوئی ذہنیت رکھنے والا شخص مولانا سے مسلسل استفادہ کے بعد ان افکار کو مرتب کر کے ایک منظم پروگرام اور واضح پالیسی مرتب کر سکے گا۔ یہ جو کچھ میں نے لکھا ہے اپنے ذاتی تجربہ کے بعد لکھا ہے اور اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے لکھا ہے واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

نفس مقالہ کے متعلق میرا خیال یہ ہے کہ وہ شاہ صاحبؒ کی حکمت کا اجمالی تعارف ہی نہیں ہے بلکہ آپ کے علمی کام (تجدید فی العلوم الشرعیہ) سے واقفیت اور علی وجہ البصیرت واقفیت کے لئے اس میں کافی سامان ہے اور بے شک اگر یہ مقالہ اس نمبر میں نہ ہوتا تو "ولی اللہی حکمت" کی خدمت کا حق اس نمبر کے ذریعہ جس درجہ میں ہم ادا کر سکے ہیں یقیناً اس کی ادائیگی سے ہم قاصر رہتے۔

حضرت مولانا کے "مقالہ" کے متعلق چند ضروری نوٹ اس کے شروع میں بھی لکھ دیئے گئے ہیں وہ وہاں ملاحظہ فرمائے جائیں۔ یہاں دو باتیں حضرت مولانا کی زبانی ہدایت کے مطابق خود مولانا ہی کی طرف سے اور عرض کرنی ہیں:۔

مولانا کا ارشاد ہے کہ جن دیانت دار اہلِ علم کو میرے مضمون کے کسی حصہ سے اختلاف ہو وہ مجھ سے مل کر سمجھنے کی کوشش کریں اور "تحریر بازی" کے پھیر میں نہ پڑیں، میں اس قسم کی کسی چیز کا جواب تحریر سے نہیں دوں گا۔ نیز مولانا کا اعلان ہے کہ جو بات میں ایسی کہوں جس کو حضرت شاہ ولی اللہؒ و شاہ عبد العزیزؒ اور ان کے مستفیضین تا مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے یہاں نہ دکھا سکوں میں اس کو ہر وقت واپس لینے پر تیار ہوں، میں ان اکابر کے علوم سے باہر نہیں جاتا اگر فرق ہوتا ہے تو صرف تعبیر کا۔

حضرت مولانا سندھی کے بعد پانچواں[1] مقالہ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ کا ہے اور جیسا کہ اس کے ابتدائی سطور میں

[1] جدید ترتیب میں مولانا سندھی مدظلہ کے بعد مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا مقالہ ہے جس کا ذکر طبع ہذا کے دیباچہ میں (ص ۱۲) پر گزر چکا ہے ان صفحات کی کتابت کے وقت اس ترمیم سے ذہول ہو گیا ۱۲ نعمانی

تشریح بھی فرمادی گئی ہے وہ انتہائی عدیم الفرصتی کی حالت میں صرف میری درخواست بلکہ میرے اصرار پر لکھا گیا ہے اسی لئے مختصر ہے لیکن اس کے باوجود افادہ کے لحاظ سے مختصر نہیں ہے میں سید صاحب مدظلہ کا بید ممنون ہوں کہ ایسے وقت میں جبکہ ممدوح کو کم سے کم فرصت بھی نہ تھی میری درخواست کو رد نہ فرمایا، اور مجھے اُمید ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ پر جو کچھ اور جس تفصیل سے لکھنے کو خود آپکا جی چاہتا تھا انشاءاللہ کسی فرصت میں وہ بھی میں لکھوا سکونگا۔ واللہ الموفق!

سید صاحب مدظلہ کے اس مقالہ کے بعد ہمارے محترم دوست اور علمی بھائی مولٰنا سعید احمد صاحب اکبرآبادی ایم۔اے وفاضل دیوبند کا مقالہ ہے جس میں آج کل کی ایک عام غلطی پر تنبیہ کرتے ہوئے آپ نے یہ واضح فرمایا ہے کہ شاہ صاحبؒ کا اصلی مقام ایک "صاحب عزیمت مجدد دین وملت" کا ہے نہ کہ ایک "اصلاحی انقلابی" کا اگر یہ مقالہ اس نمبر میں نہ ہوتا تو یقیناً ایک بڑی کمی رہ جاتی۔

اس کے بعد ہمارے محترم اور مخلص ترین دوست مولٰنا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کا مقالہ ہے جس میں اسلام کی تصنیفی تاریخ پر ایک بصیرت افروز تبصرہ کے بعد اسلامی مصنفین کی صف میں حضرت شاہ صاحبؒ کا مقام دکھلایا گیا ہے — موصوف اس مقالہ کو اس سے بہت زیادہ بسط وتفصیل کے ساتھ لکھنا چاہتے لیکن ٹھیک اُس وقت جبکہ آپ نے اس کے لکھنے کیلئے قلم اٹھایا یکلخت علیل ہوگئے اور اسی حالت میں میرے تقاضوں سے مجبور ہوکر یہ مضمون لکھا جو اُن کے نزدیک بہت مختصر اور ناکافی ہے لیکن دوسروں کی نظر میں انشاءاللہ کافی ہی ہوگا اور فی الحقیقت بھی وہ کافی ہی ہے۔

اس کے بعد مولٰنا اویس صاحب ندوی نگرامی رفیق دارالمصنفین اعظم گڑھ کا مقالہ ہے جس میں آپنے بتلایا ہے کہ ہندوستانی علماء میں حضرت شاہ ولی اللہ رحؒ کی جو امتیازی شان اور ایک خاص رنگ نظر آتا ہے تو اس میں خود انکی ذاتی صلاحیتوں اور اجتہادی بصیرتوں کے علاوہ اس کا بھی اثر ہے کہ موصوف کو علامہ ابن تیمیہؒ کی کتابوں سے استفادہ کا موقع ملا اور انھوں نے آپ پر اپنا خاص اثر ڈالا، یہ مضمون بصورت موجودہ اگرچہ مختصر ہے لیکن شاہ صاحب اور امام ابن تیمیہ کی کتابوں کے وسیع اور عمیق مطالعہ کے بعد اس کو بہت زیادہ پھیلایا جاسکتا ہے نیز اُس باریک فرق کو بھی معلوم کیا جاسکتا ہے جو اس اتفاق کے باوجود شاہ صاحب اور علامہ موصوف کے نظریات میں ہے کہ علامہ کے یہاں "ظہر" کا غلبہ ہے اور شاہ صاحبؒ کے یہاں "بطن" بھی اپنی پوری تجلیوں کے ساتھ موجود ہے۔

اس کے بعد مولٰنا ابوالنظر رضوی امروہوی کا مقالہ ہے، موصوف بھی اُن اہل علم ونظر میں سے ہیں جو حضرت شاہ ولی اللہ رحؒ کی کتابوں سے خاص اعتنا اور اشتغال رکھتے ہیں۔ آپ نے اس نمبر کیلئے دراصل ایک اور مقالہ لکھا تھا جو قریباً ۳۰—۳۲ صفحات کا تھا لیکن اُسمیں چند بحثیں بہت غامض تھیں اور بعض باتیں ایسی بھی تھیں جو قطع نظر اختلاف واتفاق کے میرے خیال سے وہ عام اسٹیج پر لانے ہی کی نہ تھیں اور عام طبقہ میں اُس سے بہت سی غلط فہمیوں کا اندیشہ تھا اس لئے میں نے موصوف سے اس پر نظر ثانی اور ترمیم کی درخواست کی مولٰنا نے اس کے بجائے یہ دوسرا مستقل مقالہ سپرد قلم فرماکر

روانہ فرما دیا اور اُس کو واپس منگوا لیا، مجھے اس پہلے مقالہ کے شایع نہ ہو سکنے پر خود افسوس ہی لیکن اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔ اب مولانا کا جو مقالہ شائع ہو رہا ہی یہ بہت مختصر ہی اور جیسا کہ موصوف نے اپنے گرامی نامہ میں لکھا تھا میرے خط کے پہنچنے پر اسی مجلس میں قلم برداشتہ لکھدیا ہی، مولانا کی اس لطف و عنایت کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔

اس کے بعد مولانا محمد یوسف صاحب فاضل بنوری اور محترمی مولانا خیر محمد صاحب جالندہری کے دو مقالے ہیں جن میں "تقلید" اور "حنفیت" کے متعلق حضرت شاہ صاحب کے طرز عمل اور مسلک سے بحث کی گئی ہی۔ ناچیز راقم سطور کی اس باب میں جو رائے ہی وہ اپنے مختصر مضمون میں ظاہر کردی گئی ہی جو ان مقالوں کے بعد متصلاً ہی درج ہی اور اسی پر ضمنا بین کا یہ سلسلہ ختم ہی

میرا اصل مقالہ درحقیقت میں نے اس نمبر کے لئے جو مقالہ قریباً آٹھ دس مہینے کے مطالعہ اور محنت کے بعد شاہ صاحب کے سوانح و علمی خدمات اور آپ کی مساعی تجدید و ارشاد پر پورے بسط و تفصیل سے لکھا تھا اور جو اس نمبر کے قریباً ڈیڑھ سو صفحات میں سماتا، نمبر کی ضخامت اندازہ سے بڑھ جانے اور اس سے زیادہ ضخامت کا انتظام نہ کر سکنے کی وجہ سے اُسکو روک لینا پڑا۔ دوسرے حضرات سے جو مقالات حاصل کئے گئے تھے اُن میں سے کسی کا روکنا میں نے اخلاقاً اچھا نہ سمجھا نیز میں نے اپنے مقالہ کو کسی دوسرے مقالہ پر ترجیح کے قابل بھی نہیں سمجھا اس لئے اُسی کو روک لیا، لیکن اب اس اتفاقی مجبوری میں ایک خیر کی صورت بھی پیدا ہوگئی۔ اور وہ یہ کہ اس نمبر میں حضرت شاہ صاحب اور آپ کے علوم و خدمات کے تعارف کے سلسلہ میں بہت کچھ بلکہ سب کچھ آجانے کے باوجود آپ کے اُن علوم کا حصّہ کم آسکا جن کی فی زمانا اسلامی دنیا کو شدید احتیاج ہی۔ میں نے اپنے اصل مقالہ میں قریباً سو صفحات پر آپ کی صرف اس قسم کی تعلیمات کے اقتباسات لئے تھے لیکن چونکہ اس کی تیاری کے وقت صفحات کی محدود وسعت سامنے رکھلی گئی تھی اس لئے بہت سے مسائل میں پھر بھی بہت اختصار سے کام لینا پڑا تھا اب جبکہ ایک اتفاقی مجبوری سے وہ مقالہ اشاعت سے رہ گیا تو اس کو اب از سرِ نو پھر سے ترتیب دینے کا ارادہ ہے اس طرح کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق جو مباحث اس نمبر میں کافی تفصیل سے آگئے ہیں اُن کو تو اُس سے بالکل ہی نکال دیا جائے اور جو مضامین اس میں نہیں آسکے یا کافی درجہ میں آسکے ہیں اُن کو پورے شرح و بسط کے ساتھ لکھا جائے۔ بالخصوص تفسیر قرآن، شرح حدیث، تنقیح فقہ، تنقید تصوف مسلمانوں کے مختلف طبقوں کی اعتقادی و عملی اصلاح، فلسفۂ تشریع، اسلام کے نظریۂ سیاسی اور نظام خلافت راشدہ کی تشریح، اسلامی تعلیمات کی بنیاد پر اقتصادیات کی تنظیم، غرض ان تمام اہم مباحث پر حضرت شاہ صاحب نے اپنی تصانیف کے ہزارہا صفحات میں جو کچھ رقم فرمایا ہی، ارادہ ہی کہ اختصار کی کسی کوشش کے بغیر اُس کے پورے پورے اقتباسات لیکر اس مقالہ کو ایک مستقل کتاب کردیا جائے، اور الفرقان کے دوسرے شاہ ولی اللہ نمبر کی حیثیت سے اس کو شائع کردیا جائے اب یہی طے کر لیا گیا ہی۔

ولی اللہ نمبر کی نظمیں :-

اس نمبر کے مقالات کا مختصر تعارف آپ سے کرایا جاچکا۔ ان مقالات کے علاوہ اسمیں چند نظمیں بھی ہیں ایک غیر شاعر جو شعر کے محاسن کو جانتا بھی نہ ہو اور جس نے عمر بھر میں سلیقہ کا ایک مصرعہ بھی موزوں نہ کیا ہو وہ نظموں کے متعلق اظہار خیال کیا اور کیونکر کرے۔ اس فن سے اس کی اجنبیت ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ شعر کی دنیا کے مشاہیر سے بھی اس کو کوئی نیاز حاصل نہیں، جن چند حضرات کا منظوم کلام آپ اس نمبر میں پائیں گے اُن سے اس نمبر کے مرتب (راقم سطور) کا تعلق شناسائی صرف اس لئے ہے کہ یہ حضرات شاعر ہونے کے ساتھ اس زمانہ کے اچھے مسلمان بھی ہیں اور ہم مشربوں کے ساتھ بس یہی رشتہ کسی کو ملا دیتا ہے ۔ بہرحال جیسا کہ عرض کیا گیا میں چونکہ فن شعر سے نابلد ہوں اس لئے رائے دینے کا بھی حق نہیں رکھتا آپ خود ملاحظہ فرمائیں اور رائے قائم کرتے رہیں۔ میرا فرض بس ان حضرات کا شکریہ ادا کرنا ہے جن کی عنایت اور توجہ نے نمبر کی اس کمی کو پورا کر دیا۔ اللہ تعالےٰ ان کو بہتر جزا دے۔

ہاں بڑی ناسپاسی ہوگی اگر یہاں اُن حضرات کا شکریہ ادا نہ کیا جائے جن کی مدد سے وہ چند فوٹو حاصل ہوئے جو اس نمبر میں صفحہ ۔ اور صفحہ ۔ کے درمیان آپ ملاحظہ فرمائیں گے پہلا فوٹو حضرت شاہ ولی اللہؒ، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ شاہ عبدالرحیمؒ کے مزارات کا ہے یہ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ مدظلہ کے صاحبزادہ مولانا حفیظ الرحمن منیجر کتب خانہ رحیمیہ دہلی اور اُن کے برادر خورد خلیل الرحمن صاحب کی دوڑ دھوپ کا نتیجہ ہے۔

دوسرا فوٹو اکبرآبادی مسجد کا ہے جو آثار الصنادید کے مطبوعہ نسخہ سے لیا گیا ہے اور اس کے لئے میں مولوی عبدالمعید صاحب مالک کتب خانہ رشیدیہ دہلی کا شکرگزار ہوں کہ اُنھوں نے اپنے نسخہ سے یہ فوٹو حاصل کرنے کی اجازت دیدی۔ تیسرا فوٹو حضرت شاہ صاحبؒ کی تحریر کا پٹنہ کے کتب خانہ سے محترمی مولانا مسعود عالم صاحب ندوی نے اور چوتھا فوٹو دیوبند کے کتبخانہ سے مولوی سید محبوب صاحب رضوی نے اپنے ہی اہتمام سے تیار کراکے بھیجا ہے، اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو جزائے خیر دے۔

میری مثال :-

اب یہ نمبر جس حالت میں آپ کے سامنے پیش ہو رہا ہے ترتیب اور انتظام اشاعت یا چند مختصر نوٹ لکھنے کے سوا میری کوئی خاص محنت اس میں شریک نہیں ہے آخر میں ایک مختصر سا مضمون صرف ۲۶ صفحے کا ضرور میرا لکھا ہوا ہے لیکن جیسا کہ میں نے خود اس کے تمہیدی نوٹ میں عرض کر دیا ہے اس کی حیثیت "انگلی کٹا کے شہیدوں میں نام لکھوانے" سے زیادہ کچھ نہیں ہے ۔ بس میری مثال اس وقت اُس مالی کی سی ہے جو مختلف باغوں اور مختلف درختوں کے پھول چُن لاتا ہے اور ایک خاص ترتیب سے سجا کر گلدستہ کی شکل میں ان کو پیش کر دیتا ہے، جس طرح اس گلدستہ کے رنگ و بو میں اُس کی

صنّاعی کو کچھ دخل نہیں ہوتا، اسی طرح اس نمبر کی خوبیوں میں میرا کوئی حصہ نہیں ہے اس لئے آپ کی بھی تحسین اور شکریے مستحق فی الحقیقت صرف وہ حضرات ہیں جن کی محنتوں نے اس کو اتنا مکمل کیا ہے ۔ اور میں بھی انہی کا شکرگزار ہوں اور کھلے دل سے معترف ہوں کہ

کہاں ہم اور کہاں یہ نکہتِ گل
نسیمِ صبح ! تری مہربانی

میری آرزو اور حضرات اہل علم سے ایک خاص التجا۔

کاش میرے پاس وافر سرمایہ ہوتا تو میری آرزو تھی کہ اس نمبر کے ہزاروں نسخے بلا قیمت اُن علماء اور مدارس عربیہ کے اُن طلبہ تک پہنچا سکتا جو اپنی بے مقدوری یا "بے نیازی" کے باعث اسکو حاصل نہیں کر سکیں گے یا حاصل نہیں کریں گے لیکن افسوس کہ مالی حیثیت سے "الفرقان" کی بے سروسامانی میں اس آرزو کیلئے کوئی گنجائش نہیں ۔ اس لئے حضرات اہل علم سے گذارش ہے کہ جو حضرات اس کو قیمتاً یا کہیں سے عاریتاً ہی حاصل فرما سکتے ہوں حاصل فرماکر ملاحظہ فرمائیں اور "اردو کا ایک رسالہ" ہونے کے باوجود اس کے ملاحظہ کے لئے تھوڑے سے وقت کے ایثار سے دریغ نہ فرمائیں ۔

مواقع اختلاف میں نقطۂ عدل

پھر یہ ضروری نہیں کہ اس میں جو کچھ بھی لکھا گیا ہے اُس سے آپ کو اتفاق ہی ہو، کتاب اللہ کے بعد جمہور اہل علم کے نزدیک صحیح بخاری کا درجہ ہے لیکن اُس میں بھی کتنے ہی ایسے مواقع ہیں کہ آپ حضرات اپنے درس میں وہاں امام بخاری کی رائے اور ان کے اجتہاد سے اختلاف کرتے ہیں اور اُن کی روایت کی ہوئی بعض احادیث پر تنقید بھی کرتے ہیں تو اس مجموعہ میں بھی لامحالہ ایسی بہت سی چیزیں ہونگی جن سے بہت سے حضرات کو اتفاق نہ ہوگا بالخصوص مولانا سندھی اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے مقالات میں ایسی متعدد چیزیں نظر آئیں گی ۔ لیکن ایسے مواقع پر ناراض ہو کر نمبر کو ہاتھ سے رکھ نہ دیجئے بلکہ ایک خدا ترس عالم دین ہونے کی حیثیت سے اس پر غور فرمائیے کہ لکھنے والے نے جو لکھا ہے اس سے آپ کو اختلاف کس بنیاد پر ہے آیا وہ کسی "آیت محکمہ" کے خلاف ہے یا "سنت ثابتہ" کے یا "اجماع معتبر" کے اگر ان تینوں میں سے کسی ایک کے بھی خلاف ہے تو ضرور وہ قابل رد ہی بلکہ واجب الرد ۔۔ اور اگر آپ کا اختلاف صرف اس بنیاد پر ہے کہ وہ آپ کی یا آپکے اکابر اساتذہ کی تحقیق کے یا بعض ممتاز علمی حلقوں کے "خیال عام" کے خلاف ہے تو اگرچہ اس صورت میں بھی آپ کو اس سے اختلاف کا پورا حق ہے لیکن صرف اتنی وجہ سے مضمون یا صاحب مضمون کو "مردود" نہ کر دیجئے ۔ ضروری نہیں ہے کہ غیر اصولی چیزوں میں بھی ہر شخص کا زاویہ نظر وہی ہو جو آپ کا ہے ۔

مجھے صرف اُن حضرات سے یہ گزارش کرنے کی ضرورت ہے جنھوں نے حضرت شاہ ولی اللہ رح کی کتابوں سے استفادہ نہیں کیا ہے ورنہ جن حضرات نے "حجۃ اللہ البالغہ" کا دیباچہ بھی دیکھا ہوگا ان کو معلوم ہوگا کہ حضرت ممدوح نے اپنی تحقیقات پیش کرنے سے پہلے اپنے اہل عصر کے سامنے یہی اصول رکھا ہے فرماتے ہیں :-

وانا برئ من كل مقالة صلكت مخالفة لآية من كتاب الله او سنة قائمة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم او اجماع القرون المشهود لها بالخير او ما اختاره جمهور المجتهدين و معظم سواد المسلمين فان وقع شئ من ذلك فانه خطاء رحم الله تعالى من ايقظنا من سنتنا او نبهنا من غفلتنا اما هؤلاء البالحثون بالتخريج والاستنباط من كلام الاوائل المتحلون مذهب المناظرة والمجادلة فلا يجب علينا ان نوافقهم فى كل ما يتفوهون به ونحن رجال وهم رجال والامر بيننا وبينهم سجال

(حجۃ اللہ البالغہ صہ)

جو بات کتاب اللہ کی کسی آیت، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت قائمہ، یا قرون مشہود لہا بالخیر کے اجماع یا جمہور مجتہدین اور معظم سواد مسلمین کے مسلک مختار کے خلاف ہو میں اُس سے بری اور بیزار ہوں۔ پس اگر ایسی کوئی بات نکل جائے تو یقیناً وہ خطا اور چوک کا نتیجہ ہے، اللہ تعالےٰ کی رحمت ہو اس پر جو ہم کو خبردار اور غفلت سے متنبہ کرے ۔۔ لیکن یہ بعد کے مصنفین جن کا کام ائمہ متقدمین کے کلام سے تخریج اور استنباط ہے اور بحث و مجادلہ جن کا شیوہ ہے ضروری نہیں ہے کہ اُن کی تمام باتوں سے ہم اتفاق ہی کریں — وہ بھی انسان ہیں اور ہم بھی انسان اور ہمارا اُن کا معاملہ قریباً برابر سرابر ہی ہے۔

نیز ان سطروں سے پہلے حضرت شاہ صاحبؒ نے "اہل السنۃ" کی تحقیق میں جو کچھ ارقام فرمایا ہے ضروری ہے کہ مسائل اور تحقیقات کے اختلاف کی بنیاد پر کسی کو مقبول یا مردود ٹھیراتے ہوئے ہماری نظر اُس پر بھی رہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی اس تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ

"اہل سنتؔ ہونے کا مدار صرف اُن مسائل پر ہے جن کا ذکر کتاب اللہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مستفیضہ میں صراحۃً آگیا ہے اور صحابہ و تابعین کا جن پر عقیدہ رہا ہے سو ان مسائل کو اُسی طرح دل کانوں ماننا اہل سنتؔ ہونے کیلئے بیشک ضروری ہے۔ جیسے کہ عذاب قبر، وزن اعمال، مرور علی الصراط اور رویت باری تعالیٰ وغیرہ لیکن جن مسائل کا ذکر قرآن و احادیث میں صراحۃً نہیں آیا اور نہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ان پر کبھی کلام کیا اور "قرون مشہود لہا بالخیر" کے بعد ہی اہل علم نے ضرورۃً ان سے بحث کی اور ان کے بارہ میں رائیں مختلف ہوئیں جیسے کہ صفاتِ الٰہیہ کے تفصیلی مباحث اور ابطال ہیولی و اثبات اجزاء لاتتجزیٰ کی بحثیں یا جیسے کہ فضیلت انبیاء بر ملئکہ کا مسئلہ وغیرہ وغیرہ تو اس قسم کے مسائل میں کسی ایک گروہ کے مسلک کا پابند ہونا اہل سنت ہونے کے لئے ضروری نہیں ہے۔ اور اس قسم کے مسائل میں کسی خاص مسلک کی پابندی کی وجہ سے کسی گروہ کو "اہل سنتؔ" اور اس سے اختلاف رکھنے والوں کو "غیر اہل السنۃ" نہیں کہا جاسکتا کیونکہ اصل سنت تو ان مسائل میں بحث نہ کرنا ہے

جس طرح کہ صحابہ کا طرز عمل رہا ــــ اور پھر جب مابعد میں ان مسائل پر کلام کرنا ناگزیر ہو گیا تو کوئی وجہ نہیں کہ کسی ایک گروہ نے ان مباحث میں جو کچھ سوچا اور کہا وہ سب صحیح ہی ہو اور دوسروں نے جو کچھ سمجھا وہ سب غلط ہی ہو" ــــ

اس کے بعد شاہ صاحب رح فرماتے ہیں:-

ولهذا ذكرنا من ان كون الانسان سنيًا معتبرٌ بالقسم الاول دون الثاني ترى علماء السنة يختلفون فيما بينهم في كثيرٍ من الثاني كالاشاعرة والماتريدية وترى الحذاق من العلماء في كل قرن لا يتحرزون من كل دقيقة لا تخالفها السنة وان لم ينقل بها المتقدمون" (حجۃ اللہ البالغہ ص)

اور اسی وجہ سے کہ اہل سنت ہونے کا مدار صرف قسم اول کے مسائل پر ہے نہ دوسری قسم کے مسائل میں کسی خاص مسلک کی پابندی پر، تم دیکھو گے کہ خود علماء سنت قسم ثانی کے بہت سے مسائل میں مختلف الرائے ہیں چنانچہ اشاعرہ و ماتریدیہ کے اختلافات اسی قبیل سے ہیں اور نیز تم دیکھو گے کہ کسی زمانہ میں بھی علماء ماہرین ایسے دقائق کے بیان سے باز نہیں رہے جو فی نفسہٖ "سنت" کے خلاف نہ ہوں اگرچہ متقدمین اُن کے قائل نہ ہوئے ہوں۔

الغرض اس نمبر کے کسی مقالہ کے کسی مضمون میں اگر آپ کو کوئی نکارت اور غرابت معلوم ہو تو اعتدال و توازن کو ہاتھ سے نہ دیجئے اور حضرت شاہ صاحب رح کی ان تحقیقات کی روشنی میں رد و قبول کا فیصلہ کیجئے ــــ اس طرح انشاء اللہ آپ بہت سی غلطیوں اور بے اعتدالیوں سے بچ جائیں گے اور جو رائے بھی آپ قائم کریں گے وہ بصیرت اور عدل کی رائے ہوگی۔

نیز اس نمبر ہی کے بعض مقالات کا بعض دوسرے مقالات سے تصادم اور تدافع بھی کہیں کہیں آپ کو محسوس ہوگا۔ اور جب مختلف نقطہ ہائے نگاہ رکھنے والے ایک موضوع پر اظہار خیال کریں تو ایسا اختلاف یا تدافع ناگزیر ہے، لیکن جن خوش نصیبوں کو شاہ صاحب کی حکمت سے کچھ حصہ ملا ہے ان کی نظروں میں ایسے اختلافات کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ امام ابن تیمیہ و حضرت مجدد الف ثانی اور شیخ اکبر ابن عربی کے خیالات اور تحقیقات میں بظاہر کیسا تدافع اور کس قدر بُعد ہے لیکن شاہ صاحب کی نظر میں یہ اختلاف بھی مضمحل اور غیر اساسی ہے اسی لئے وہ ان تینوں بزرگوں کو قبول کرتے ہیں بلکہ اُن کی طرف سے دفاع کرتے ہیں۔

اپنے ایک مکتوب میں جو امام ابن تیمیہ کی طرف سے دفاع ہی کے سلسلہ میں لکھا گیا ہے یہ اصول بیان فرمانے کے بعد کہ "جو علماء کرام کتاب و سنت اور فقہ کے حامل اور ناشر و مبلغ گزرے ہیں اور جنہوں نے طریقہ سلف (عقیدہ اہلسنت) کی حمایت کی خدمت انجام دی ہے ان کے متعلق اچھا ہی عقیدہ رکھنا چاہئے اگرچہ ان کے کلام میں بعض ایسی چیزیں بھی ملتی ہوں جن کو ہم

پسند کرتے ہوں بشرطیکہ انکی یہ باتیں نص کتاب وسنت اور اجماع سلف سے مردود نہوں خواہ یہ باتیں باب عقائد میں ہوں یا مباحث فقہیہ میں یا حقائق وجدانیہ میں" اس اصول کی تحریر کے بعد ارشاد فرماتے ہیں:۔

وعلی ھذا الاصل اعتقدنا فی الشیخ الاجل محی الدین محمد بن علی بن العربی وفی الشیخ المجدد احمد بن عبد الاحد السرھندی انھما فی صفوۃ عباد اللہ ولم نلتفت الی ما قیل فیھما فکذالک ابن تیمیہ الخ (مکتوبات ۲۰)	اور اسی اصول پر شیخ اجل محی الدین محمد بن علی بن العربی اور مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد بن عبد الاحد سرہندی کے بارہ میں ہمارا اعتقاد ہے کہ یہ دونوں خدا کے برگزیدہ بندوں میں سے ہیں اور ان پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں ہم ان کی طرف کوئی التفات نہیں کرتے اور یہی حال ہمارے نزدیک علامہ ابن تیمیہ کا ہے۔

اور مکتوب مدنی[1] میں شاہ صاحب رح نے شیخ اکبر کے نظریۂ وحدۃ الوجود اور امام ربانی کے نظریۂ وحدۃ شہود میں جہاں تطبیق یا تقریب کی کوشش کی ہے اور علماء امت کے خلافیات کے متعلق وہاں جو ایک بصیرت افروز اصولی تقریر فرمائی ہے اس کے ذہن نشین کر لینے کے بعد تو اس قسم کے اختلاف آراء کی اہمیت بہت ہی گھٹ جاتی ہے بلکہ اکثر و بیشتر مقامات پر تو صرف لفظوں کا پھیر اور تعبیروں کا اختلاف ہی رہ جاتا ہے۔

بہر حال اس نمبر کے بعض مقالات میں جہاں آپ کو اختلاف آراء نظر آئے تو اس کو دو متحارب فریقوں کی لفظی جنگ نہ سمجھا جائے اور علماء کے اختلاف رائے سے زیادہ ان کو کوئی حیثیت نہ دی جائے۔ میں نے جب سے حضرت شاہ صاحب رح کے ان اصولوں کو اپنا مسلک بنایا ہے الحمد للہ زمانہ ماضی اور زمانہ حال کے علماء کے غیر اصولی اختلافات کی اہمیت میری نظر میں بہت گھٹ گئی بلکہ کچھ بھی نہیں رہی، اور اب میں اپنی علمی اور دینی برادری کو پہلے سے بہت زیادہ وسیع پاتا ہوں اور دعا کرتا ہوں اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ!! —— نیز اس نمبر کے کسی مقالہ میں اگر کوئی تاریخی بات ایسی آگئی ہو جس سے کسی فرقہ یا قوم کے جذبات متاثر ہو سکتے ہوں تو اس کے متعلق یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ اس نمبر کا موضوع تذکرہ اور تاریخ ہے اور مورخ مجبور ہوتا ہے کہ اصل حقیقت کو بلا کم و کاست بیان کر دے، ورنہ کسی کی دل آزاری ہمارے نزدیک انسانیت کا سخت ترین گناہ ہے اور "لاتسبوا الذین یدعون من دون اللہ" ہمارے مقدس مذہب کی خاص اور تاکیدی تعلیم۔

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

---

[1] ملاحظہ ہو مکتوب مدنی مندرجہ کلمات طیبات ۱۵۲ تا ۱۵۲ — ۱۲ منہ

شاہ ولی اللہ (قدس سرہ العزیز)

(از حضرت روش صدیقی جلالپوری)

رُخِ حجاز کی تنویر تھا جمال ترا　　جبینِ ہند کی تقدیر تھا جلال ترا
بنایا نازشِ بغداد تونے دہلی کو　　ہوا بلند وہ آوازۂ کمال ترا
مقامِ قلبِ مسلماں عیاں ہوا تجھسے　　ترے جواب کا تھا منتظر سوال ترا
فروغِ دید کا عنوان ہر نظر تیری　　جمالِ یار کا آئینہ ہر خیال ترا
تجھے حبیب تھا فرمودۂ خدا و نبی　　شہیدِ جذبِ محبت تھا حال قال ترا
جہانِ فکر و نظر تیرا غاشیہ بردار　　طلسمِ ظلمتِ اوہام پائمال ترا
گدازِ علم، جہادِ عمل، سرورِ یقیں　　نفس نفس تھا محبت میں لازوال ترا
تھی ارضِ ہند پہ طاری فنا کی تاریکی　　حیات بن کے اٹھا کوکبِ جلال ترا

وہ اے محدثِ اعظم عجب زمانہ تھا
کہ عام جب ترا درسِ مجاہدانہ تھا

دلوں کو باخبرِ رسم و راہ تو نے کیا　　بلند شعلۂ عشقِ الٰہ تو نے کیا
فقیہِ وقت کو دے کر جہاد کی شمشیر　　کچھ اور مرتبۂ خانقاہ تو نے کیا
ہر اک نفس کو بنا کر منادیٔ توحید　　جہاں میں تذکرۂ لا الٰہ تو نے کیا
زہے کمالِ محبت کہ ہر محبت کو　　نثارِ عشقِ رسالت پناہ تو نے کیا
ترے ضمیر کو تنویرِ راشدین ملی　　اسی چراغ کو پھر خضرِ راہ تو نے کیا
ترے عمل سے کھلا عقدۂ سیاستِ دیں　　لباسِ فقر کو گردوں پناہ تو نے کیا
سنا کے سلطنتِ کبریا کا مژدۂ نو　　گدا کو ہم نفسِ بادشاہ تو نے کیا
بتا کے دولتِ گیتی کو دولتِ جمہور　　نظامِ جبر و تظلم تباہ تو نے کیا

جہاں کو پھر ترے پیغام کی ضرورت ہے
نویدِ رحمتِ اسلام کی ضرورت ہے

در مناقب حضرت شاہ ولی اللہؒ

(از حضرت اثر زبیری لکھنوی)

عارفِ حق نما ولی اللہؒ
صوفیٔ باصفا ولی اللہؒ

صاف گو صاف قلب و صاف مگر
سر بسر آئینہ ولی اللہؒ

کاشفِ رمز و رازِ اُمّ کتاب
خاتمِ اولیاءؒ ولی اللہؒ

نقشبندِ نشانِ عشقِ نبیؐ
ارجمندِ وفا ولی اللہؒ

مصطفیٰؐ ظلِ ذاتِ باری ہیں
ظلِ ظلِ خدا ولی اللہؒ

کشورِ غوثیت میں ہے لاریب
اک شہِ لافتا ولی اللہؒ

یوسفِ مصرِ یوسفِ ہمدانیؒ
ہمہ داں باخدا ولی اللہؒ

جس سے باقی کی یاد باقی ہے
وہ نشانِ بقا ولی اللہؒ

ہند تھا ناشناسِ علمِ حدیث
تو نے احسان کیا ولی اللہؒ

ذکر معنیٰ، ذکر فرمودی
سیّدی انت یا ولی اللہؒ

ہر خفا کا ازالہ فرمایا
کیا کہوں کیا کیا ولی اللہؒ

جی اُٹھی تجھ سے دہلی مرحوم
تجھ پہ رحمت سدا ولی اللہؒ

کیوں نہ باطل ہو لرزہ براندام
حق کی شمشیر تھا ولی اللہؒ

ظلمتِ شرک ہو گئی کافور
مہر چمکا تھا یا ولی اللہؒ

سوزِ عشقِ نبی سے جل بھن کر
کیمیا بن گیا ولی اللہؒ

مرحبا نازِ حق نیاز عباد
شانِ زین العبادؒ ولی اللہؒ

تیرے قبضہ میں درّہ فاروقؓ
اے دلیلِ خدا ولی اللہؒ

دیکھ اے شاہ مسلکِ رومیؒ
رمِ اہلِ وغا ولی اللہؒ

انقلابات کا خطر کیا!
تو ہے کوہِ صفا ولی اللہؒ

عشق کیا ہے مجھے نہیں معلوم
میں ہوں تجھ پر فدا ولی اللہؒ

خدمتِ علم تیری خدمت ہے
پیکرِ علم تھا، ولی اللہؒ

ایک شاعر کا خاتمہ ہو بخیر
کیجئے یہ دعا ولی اللہؒ

اے اثر موجِ شاعری میں نہ بہ
عبدِ معبود تھا ولی اللہؒ

ارشادِ گرامی

حضرت مولٰنا سید حسین احمد صاحب مدنی شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند

و صدر جمعیت علماء ہند مدظلہ العالی

امام الملۃ حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ العزیز کی مقدس ہستی اُن ممتاز ہستیوں میں سے ہے جنکے وجود باجود سے اللہ تعالےٰ نے اُمتِ محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ) کو دیگر امم پر امتیاز اور شرف بخشا ہے منبع الفیوض الربانیہ اور قاسم الحکم الازلیہ آقائے نامدار حضرت خاتم النبیین علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ الصلوٰۃ والسلام سے ایسی نسبت رکھنے والے اشخاص جیسی کہ آفتاب سے آئینہ کو ہے ملتِ مرحومہ میں بہت کم نظر آتے ہیں، حضرت شاہ صاحب موصوف انھیں میں سے ہیں ان کی اعلیٰ تصانیف اُن کے مضامین عالیہ اُن کے اعلیٰ پایہ کے تلامذہ اُن کے سلاسل علوم ظاہریہ اور معارف باطنیہ کا علی مرالدہور جاری ہونا ان کے منتسبین کا تقویٰ اور علم میں بے نظیر ہونا بتلا رہا ہے کہ یہ مقدس ہستی منظورِ نظرِ الٰہی اور مخلصین عباد اور مجددین اُمت میں خصوصی شان رکھنے والی تھی اور یہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں ہی پر ان کی ذات بابرکات سے فیضیاب ہونیکا شرف مخصوص نہیں رہا بلکہ ان کے فیض سے سید مرتضیٰ بلگرامی ثم الزبیدی (شارح قاموس وشارح احیاء العلوم وصاحب عقود الجواہر المنیفہ وغیرہ) حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب دہلوی ثم المکی حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مجددی دہلوی ثم المدنی وغیرہم رحمہم اللہ تعالیٰ حضرات نے ملکِ عرب، مصر، شام، مغرب اقصےٰ وغیرہ کے مسلمانوں کو بھی بہت بڑے درجے تک مالامال فرمایا — اس ہستی پر اہل ہند جس قدر بھی ناز کریں بجا ہے اور ان کے بحارِ فیض سے تشنگان معارف جس قدر بھی اپنی پیاس بجھائیں مفید اور کارآمد ہے۔ انھیں کے فیوضِ غیر متناہیہ ہندوستان اور بیرونِ ہند کے مسلمانوں کے لئے آج مشعلِ ہدایت اور رہنمائے طریقت ہیں، دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس دینیہ ہندوستان انھیں کے انوار کے چراغ ہیں۔ ان کے کمالات متنوعہ کے اظہار کے لئے دفاتر کی ضرورت ہے "الفرقان" کے "ولی اللہ نمبر" میں اگرچہ بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر وہ سب کچھ ان کے بحرِ کمالات کا غرفہ یعنی چلو یا اس سے بھی کم ہے ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں قدس اللہ سرہ العزیز کا ارشاد ہے کہ "مجھ کو اللہ تعالےٰ نے تمام دنیا کی سیر کرائی میں نے اپنے زمانہ میں شاہ ولی اللہ جیسا کوئی نہیں دیکھا" میری معروضات پر روشنی ڈالتا ہے میں ناظرین نمبر مذکور سے امیدوار ہوں کہ وہ اس کو ضرور پڑھیں گے اور اس برگزیدہ امت محمدیہ کی محبت و توقیر سے اپنے دین و دنیا کو درست کرینگے۔ واللہ الموفق

(دستخط بقلم خود)

ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہ

۲۵ ذی قعدہ ۱۳۵۹ھ

ہندوستان میں قرآن فہمی کا چرچا اور حضرت شاہ ولی اللہؒ

مکتوب گرامی مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی بی اے مدیر "صدق" لکھنؤ

[مولانا ممدوح سے بھی "ولی اللہ نمبر" کیلئے مقالہ کی درخواست کی گئی تھی اور موصوف نے آمادگی کا کچھ اظہار بھی فرمایا تھا لیکن وہ ارادہ پورا نہ ہو سکا اسکی معذرت کے سلسلہ میں محترم مولانا کا جو گرامی نامہ صادر ہوا تھا وہ بجنسہ ہدیۂ ناظرین ہے — مدیر]

مخدوم و مکرم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ

آپکے سجائے ہوئے دربار ولی اللہی میں حاضری آپکے لئے باعث مسرت و شکر گزاری ہو یا نہ ہو میرے حق میں تو میرے لئے دلیل سعادت و خوش نصیبی تھی۔

مادح خورشید مداح خود است　　　کیں دو چشمم روشن و نامرمد است

اور کیا عرض کروں کہ اس سعادت سے محرومی پر دل کیا خون ہو رہا ہے۔

شاہ صاحب جیسے جامع کمالات پر ہمہ جہتی نظر ڈالنے کی ہمت تو میں خواب میں بھی نہیں کر سکتا تھا لے دے کے ان کی خدمات قرآن پر کچھ لکھنے کی ہمت کر رہا تھا اس کا جزو اعظم شاہ صاحبؒ کا فارسی ترجمہ القرآن مع حاشیہ فتح الرحمٰن تھا اتفاق سے یہی دستیاب نہ ہوا اس کا ایک قدیم نسخہ میرے پاس موجود ضرور ہے، بچپن میں بار بار پڑھا ہوا لیکن اب وہ محض تبرک ہو کر رہ گیا ہے، اس کام ہی کا نہیں کہ اس سے کام لیا جا سکے۔ کیا عرض کیا جائے کہ آپ کے ارشاد کی عدم تعمیل سے دل کیسا تڑپ تڑپ کر رہا!

ہندوستان میں یہ قرآن فہمی کا چرچا آج جو کچھ نظر آتا ہے، اور یہ اردو، انگریزی اور دوسری زبانوں میں جو بیسیوں ترجمے شائع ہو چکے ہیں یا شائع ہو رہے ہیں یا آئندہ شائع ہوں گے۔ انکے اجر کا جزو اعظم یقیناً حضرت شاہ صاحبؒ کے حسنات میں لکھا جائے گا۔ یہ سارے چراغ اسی چراغ سے روشن ہوئے ہیں۔ اگر اس کی ابتدا آپ اپنے مبارک ہاتھوں سے نہ کر جاتے تو نہ شاہ رفیع الدینؒ کا اردو ترجمہ وجود میں آتا اور نہ شاہ عبدالقادرؒ کا اور متاخرین کا تو ذکر ہی کیا۔ جو شخص امت کی بے شمار نسلوں کے لئے اتنی بڑی رحمت کا دروازہ کھول گیا اس کے اجر بے حساب کا حساب اور مزید بے نہایت کا اندازہ ہی کون کر سکتا ہے — جسے تصنیف تالیف ترجمہ کا ادنیٰ سا تجربہ بھی ہے وہ جانتا ہے کہ کسی موجود نمونہ کو ترقی دینے اسے بڑھانے چڑھانے اس میں گل بوٹے پیدا کرنے، اور خود ایک نمونہ قائم کرنے کے درمیان کیا زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے — شاہ صاحب کا ترجمہ بالفرض بالکل ناقص ہوتا جب بھی فضل تقدم و شرف اولیت کے لحاظ سے بے مثال ہوتا۔ چہ جائیکہ جب صحت و تحقیق کے لحاظ سے بھی اعلیٰ سے اعلیٰ معیار پر ہو اور فتح الرحمٰن کے وہ چھوٹے چھوٹے اشارے اور حاشیے ایجاز و جامعیت میں اپنی نظیر آپ!

حالات نے مساعدت کی ہوتی تو ایک مستقل مقالہ شاہ صاحب کے ترجمۃ القرآن کی خصوصیات پر ناظرین الفرقان کی نذر کیا جاتا اولاد صلبی نے جو کچھ خدمت قرآن کی کی وہ تو ظاہر ہی ہے۔ باقی اس وقت سے اب تک بڑے چھوٹے جتنے بھی خادمان قرآن پیدا ہو چکے ہیں یہ سب اگر حضرت کی اولاد معنوی نہیں تو اور کیا ہیں؟

فقیر عبدالماجد عفی عنہ

پیامِ ولی اللّٰہی

"تمسّک بالقرآن"

—— :(از):——

جناب مولوی سید انیس الدین احمد صاحب رضوی امروہوی ایم اے آنرز (علیگ)

زمانہ آیا کہ زندگی کا شباب پھر رنگ لا رہا ہے
پیامِ اعلونؔ کان میں کوئی چپکے چپکے سنا رہا ہے

عروسِ قسمت کے سر سے آخر سیاہ چادر اتر رہی ہے
نقابِ ظلمت سرک رہا ہے جبین کی بندی نکھر رہی ہے

طلسمِ عشق و وفا نے دل کو پھر اپنا آماجگہ بنایا
فسردہ جو ہو چکا تھا پودا اب اُس نے پھر اپنا سر اٹھایا

حریمِ حسنِ ازل سے پیہم نزولِ انوار ہو رہا ہے
یہ حال ہے صحنِ دل کا گویا کسی کا دربار ہو رہا ہے

یہ کیسے سجدے تڑپ رہے ہیں کہ کائنات اہتزاز میں ہے
کچھ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ جانِ شیریں نماز میں ہے

الٰہی ہو تو نہیں رہی ہے فسانۂ عصرِ نو کی تدوین
کہ ذرہ ذرہ ہے خاکِ دل کا بہار پرور بہار آگیں

عروقِ مردہ میں کس نے آکر نَفَخْتُ رُوحِی کا صور پھونکا
یہ برقِ انوار کیا تھی جس نے کہ قلب کا کوہِ طور پھونکا

دل و جگر میں شرار بن کر یہ کس کا پیغام آرہا ہے
نگاہ میں کون پھر رہا ہے زباں پہ کیا نام آرہا ہے

سروشِ غیبی کے لعلِ لب سے سرودِ مستانہ بہہ رہا ہے
وہ روح سے ہم کلام ہو کر دبی زباں میں یہ کہہ رہا ہے

وَلیؔ" دہلی کے پاس سے آرہا ہوں ارشادِ ناز لیکر
یہاں سے لوٹوں گا ان کے مستوں سے ہدیہ ہائے نیاز لیکر

وہ کہہ رہے ہیں کہ اے مسلماں ترے مرض کا علاج بھی ہے
دوا جو کل کارگر ہوئی تھی ترے مرض کو وہ آج بھی ہے

قبائے آفاق گل بداماں ترے لئے ہے ترے لئے ہے
مگر یہ پہلے سمجھ کہ قرآں ترے لئے ہے ترے لئے ہے

ترے لئے ہے کہ اس کو لے کر نشانِ جہد و عمل نکالے
جو حوصلہ ہو تو مورِ بیکس جبینِ قسمت کے بل نکالے

تجھے کلیدِ عمل ملی ہے کہ بابِ افلاک باز کر لے
کتاب جب تیرے ہاتھ میں ہے تو ہاتھ کو پھر دراز کر لے

اصولِ انسانیت ہے پیارے یقینِ ارشادِ حق نما پر
فَلَيْسَ[1] لِلْمَرْءِ فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِلَّا بِمَا سَعَى پر

---

[1] ارشاد باری تعالیٰ "وان لیس للانسان الا ما سعیٰ" کی تشریح ۱۲ منہ

امام ولی اللہ دہلوی

سے پہلے

اسلامی ہند کی دینی حالت اور تدریجی ارتقاء

(از جناب مولانا مسعود عالم صاحب ندوی)

ہندوستان پہلی صدی ہجری ہی میں اسلام کی روشنی سے جگمگا چکا تھا اور یہ سرزمین صحابہ و تابعین کے بابرکت قدم سے یکسر محروم نہیں تھی[1] پر یہ بھی واقعہ ہے کہ اسلام کی پہلی کرنیں سندھ کے ریگستان سے آگے نہ بڑھ سکیں، اسی طرح عرب تاجر اور جہاز راں، جو مغربی ساحل سے گزر کر سیلون اور جنوبی ہند کے دوسرے جزیروں کا رُخ کرتے تھے، ملک کے اندرونی علاقوں میں کم آئے اور انہی لوگوں کا حلقہ فیض ساحلی علاقوں (ملیبار) اور اس کے آس پاس کے خطے تک محدود رہا[2]۔

عرب اور مغل فاتحین کا فرق اس ملک اور خاص کر شمالی خطہ کی انتہائی بدبختی یہ ہوئی کہ یہ عرب فاتحین کے فیض سے تقریباً محروم رہا، اور ان کے بدلے ترکوں، مغلوں کی غیر اسلامی حکومت اس کے حصہ میں آئی، حالت یہ تھی کہ درۂ خیبر سے آنے والے سپاہی اور جرنیل اسلام کی خوبیوں سے بالکل ناواقف تھے۔ ان کے رگ و پے میں ابھی دین حنیف کی سچائیاں سرایت نہ کر سکی تھیں، اور زندگی کے ہر شعبہ میں وہ اسلامی رنگ جسے آج کل کلچر کہتے ہیں، بالکل نہ رچ سکا تھا یہ اسلام بھی ایسے وقت (تیسری صدی ہجری کے بعد) آئے، جب خود اسلامی مرکزوں (حجاز، عراق، شام) میں انحطاط کا آغاز ہو چکا تھا اور عباسی خلافت ترکوں کے ہاتھ میں کھلونا بن گئی تھی، یہ سپاہی اکثر ترک غلام تھے جن کے کان اسلام کے قانون جنگ سے یکسر ناآشنا تھے، ان کی فوج کے

---

[1] ہندوستان پر بحری حملے حضرت عمر فاروقؓ ہی کے عہد میں شروع ہو گئے تھے (بلاذری، باب فتوح السند) اس لئے یہ خیال کوئی بعید نہیں کہ گجرات کے علاقے جہاں یہ حملے ہوئے صحابہ کرامؓ کے قدموں سے مشرف ہوئے ہوں۔

[2] ہندوستان میں اسلام کیونکر پھیلا؟ اس کی تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو۔

(۱) عرب و ہند کے تعلقات علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ (۲) ہندوستان میں اسلام کیونکر پھیلا؟ (علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ! معارف ۱۹۲۳ء)

(۳) الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند (مسعودی) المسعودی، السیاحۃ ج ص ۱۱) التحفۃ ج ۱ [illegible] (۴) دعوت اسلام (آرنلڈ)

سپاہی مال و دولت کے لالچ میں چلے آئے تھے، ان کے دلوں میں نہ ابو عبیدہ کی تڑپ تھی اور نہ ان کے فرماں رواؤں میں عمر فاروق کا ولولۂ جہاد۔ درۂ خیبر کی راہ سے سب سے پہلا داخل ہونے والا جرنیل محمود غزنوی تھا اس کی سپاہ کا بھی یہی حال تھا اکثر نومسلم تھے، یہی نہیں بلکہ اس کی فوج میں ہندو سپاہی بھی تھے۔[1]

مغل تو محمود کے حملے کے وقت اسلام بھی نہیں لائے تھے، علاء الدین خلجی (۶۹۵-۷۱۶ ہجری) کے زمانہ تک ان کا شمار کفار میں تھا، یہی حال اکثر افغانی قبائل کا تھا محمود غزنوی کے عہد تک وہ حلقہ بگوش اسلام نہیں ہوئے تھے۔ اہل غور بھی بیشتر چھٹی صدی ہجری میں دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ یہ تو ان فاتح قوموں کے اسلام کا حال تھا، اب اسلامی تربیت اور زندگی کو لیجئے ان کی آبادیوں میں محمود غزنوی (۳۸۸-۴۲۱ ہجری) سے پہلے مدرسوں کا رواج نہ تھا۔ دوسرے ذریعوں سے بھی اسلامی تعلیمات عام نہ ہو سکی تھیں، پھر ان سے یہ توقع کیسے ہوتی کہ ان کے زیر سایہ ہندوستان میں دین حنیف کی اصلی تعلیم پھیلے گی اور صحیح اسلامی حکومت کے قانون جاری ہوں گے؟ نہ یہ توقع ہو سکتی تھی اور نہ ایسا ہوا، ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں سے بعض نامور بادشاہ ایک طرف تو غیر مسلموں پر جزیہ عائد کرتے ہیں، اور دوسری جانب ان کے عبادت خانوں کے انہدام سے بھی دریغ نہیں کرتے یہی نہیں بلکہ ان مسلمان نام مغل تاجین میں سے بعض ہندو مسلمانوں دونوں کو یکساں موت کے گھاٹ اتارنے میں بھی پس و پیش نہیں کرتے تیمور اور نادر کے حالات کچھ ڈھکے چھپے نہیں۔ ابن بطوطہ (ج ۳ ص ۱، مطبوعہ پیرس) کا بیان ملاحظہ ہو۔

"ہرات کے آس پاس کے رہنے والے بڑے بہادر ہیں، اہل ہند پر برابر دھاوا بولتے ہیں۔ اور بسا اوقات مسلمان عورتوں کو بھی لونڈیاں بنا کر لے آتے ہیں الخ۔"

BHATNIR کو بچانے کے لیے مسلمان راجپوتوں کے دوش بدوش نہ دل کھول کر صرف لڑے ہی نہیں بلکہ جب تیغ کی امیدیں جاتی رہیں، تو راجپوتوں کی طرح وہ بھی اپنی بیویوں بچوں کو تہہ تیغ کر کے جان دینے کے لئے میدان میں آ گئے۔

STUDIES IN INDIAN HISTORY BY S.N. SEN P 115

ہندوستان میں اسلام کی عام حالت | بس آپ نے دیکھا کہ اس ملک کی قسمت میں اسلام کے ایسے پیامبر تھے، جو اس کے احکام سے بھی صحیح طور پر واقف نہ تھے اور اگر تھوڑی بہت واقفیت تھی تو اس پر عامل نہیں تھے، نتیجہ ظاہر ہے، حجاز کی سرزمین میں حجاز سے نکلے ہوئے کھرے توحیدی مذہب کی مٹی پلید ہو گئی، اللہ کی کتاب عربی زبان میں تھی اور یہ خدا کے بندے فارسی لکھتے بولتے تھے، عربی سے دور کا لگاؤ بھی نہیں تھا نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب اللہ تو طاق نسیاں کی زینت بن گئی اور دین توحید ہندوانہ آلودگیوں میں لت پت ہو گیا، اللہ کی کتاب جب سامنے نہ ہو تو پھر ہندوانہ عقیدوں اور رسموں کی دھوم دھام اور حنیفی اور ہندی عقائد میں گھل مل جانا کیا تعجب کی بات ہے؟ سچی بات یہ ہے کہ محمد بن عبداللہ (فداہ ابی و امی صلی اللہ علیہ وسلم) کے لائے ہوئے دین کی جو درگت اس ہندوستان میں بنی، شاید دنیا کے کسی خطہ میں ایسا نہ ہوا ہو، ہندوستانی اسلام کی اس بدحالی پر

---

[1] ابن اثیر ج ۹ ص ۱۰۵، مطبوعہ لیڈن۔

اپنے تو اپنے، غیر بھی طعنہ زن ہیں، عبرت کے لئے ایک دو شہادتیں سن لیجئے:

"ہندوستانی اسلام کا مطالعہ کرتے وقت، ایک محقق کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہاں اس مذہب کی بری طرح مٹی پلید ہوئی ہے" (تمدن ہند (فرنچ میں) از لی بون، اردو ترجمہ ص۳۰)

"اگر ہندوستان میں دین محمدی نے اپنے کچھ اثرات چھوڑے ہیں، اور یہاں کے مذہب اور عقائد میں کچھ تبدیلی کی ہے تو اس سے زیادہ وہ خود یہاں کے تمدن اور مذہب سے متاثر ہوا ہے" (تمدن ہند ص۵)

"ہندوؤں سے اس قدر متاثر نہیں ہوئے جتنا یہ ہنود سے" (ص۱۳۵)

زیادہ تفصیل کا موقع نہیں خلاصہ یہ ہے کہ گو اسلام کے اس دیس پر ہزاروں احسان ہیں اور اس کی روشن تعلیمات کے اثر سے یہاں کے مذاہب میں تبدیلیاں اور اصلاحات ہوئی ہیں تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ ہندوستان میں اسلام جتنا بھی موثر ہو سکا اس سے زیادہ متاثر ہوا ہے اور یہاں مسلمانوں نے جو زبان، تہذیب، لباس اختیار کیے وہ سب ہندوانہ ہیں، یا ہندو مسلمانوں کے امتزاج کا نتیجہ۔ اور یہ بیچ میل ہندوانہ تہذیب اور معجون مرکب مذہب عوام تو عوام علماء اور صوفیوں کے دل و دماغ پر کچھ ایسا چھا گیا، کہ حضرت مجدد سرہندیؒ (۹۷۱ھ - ۱۰۳۴ھ) سے لے کر آج تک تین سو سال سے کچھ اوپر کی مسلسل اصلاحی کوششوں کے بعد بھی یہ صدیوں کا بیٹھا ہوا زنگ دور نہیں ہو سکا ہے اور خدا جانے نبی امی صلے اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے سچے دین کی اصلی تعلیمات یہاں اپنے سادہ اور اصلی رنگ میں کبھی جلوہ گر ہو بھی سکیں گی یا نہیں؟

دسویں صدی ہجری سے پہلے یہ ہندوانہ اسلام اور تصوف و ویدانت سے مرکب مذہب تو ہر دور میں دماغوں پر مستولی رہا ہے، پر دسویں صدی ہجری سے پہلے کفر و شرک کی یہ اندھیاری اپنی آخری حد کو پہونچ چکی تھی اور گجرات و سندھ کے ساحلی علاقوں کو چھوڑ کر، جن کے تعلقات عربی ملکوں سے زندہ تھے، صحیح اسلام کی روشنی کہیں دکھائی نہیں پڑتی تھی، جدھر نگاہ اٹھاؤ ایرانی ہندی تصوف، حلول، بروز اور وحدۃ الوجود[۱] کے عقیدے، اعمال ہندوانہ اور مشرکانہ، کہ قرآن و حدیث سے خالی اور کتاب و سنت کے چشمۂ صافی سے پیاس بجھانے والوں کا کال تھا۔

ان بت پرستانہ عقیدوں اور بدعات کے رواج کی سب سے بڑی وجہ قرآن و حدیث کا جہل ہے، وہ کتاب جو خلق کی

---

[۱] برہمنوں کی طرح یہ وحدۃ الوجود کے عقیدے کو ... بعض اہل یونان بھی اس کے قائل تھے۔ نصاریٰ اور یہود کے ہاں بھی اس کا چرچا رہا، علاوہ برہمنوں کے ویدانت کی بنیاد بھی اسی پر ہے، مسلمان صوفیوں کے ہاں بھی یہ عقیدہ پایا جاتا ہے، اس کی بعض قسمیں تو ان کے ہاں حلول کے ہم معنی ہو گئی ہیں، ہمارے پاس اس کی کوئی شہادت نہیں کہ ویدانت کا ترجمہ عربی میں ہوا ہو، حالانکہ یہ عقیدہ تیسری صدی ہجری کے آخر میں (حسین بن منصور حلاج کے زمانہ) مسلمان صوفیوں کے دلوں میں گھر کر چکا تھا۔ محی الدین ابن عربی (م ۶۳۸ھ) کی ان چار پر فلسفہ پختہ اور مدون ہو گیا۔ بہرحال ویدانت کا ترجمہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان آکر مسلمان صوفی برہمنوں کے ویدانت سے بری طرح متاثر ہوئے۔ لیکن اس عقیدہ کا پُرجوش علمبردار ابن العربی اندلس کا رہنے والا تھا اس لئے قرین قیاس یہ ہے کہ وہ نو افلاطونی فلسفہ سے متاثر ہوا ہو۔

ہدایت اور تذکیر کے لیے اتری تھی، قبروں پر قرآن خوانی کے لیے وقف کر دی گئی، اور سنت کا کیا ذکر، کہ شمالی ہند کی سرزمین "حدثنا" اور "اخبرنا" کی آوازوں سے یکسر ناآشنا تھی، یہاں ماوراء النہر سے اسلام آیا اور وہیں سے علم بھی، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا علم فقہ اور اصول فقہ سے آگے نہ بڑھ سکا، اسی کی جامد تقلید پر یہ قانع ہو گئے اور متاخرین فقہا کی کتابیں "اہل دین" قرار دے دی گئیں، اور یونان کی سڑی ہوئی ہڈیوں پر فاتحہ خوانی دینی خدمت کے ہم معنی سمجھ لی گئی۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ ہندوستان میں حدیث کا چرچا کبھی ہوا ہی نہیں۔ ہاں البتہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ سندھ اور گجرات کے ساحلی علاقوں کو چھوڑ کر شمالی ہند میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی (م ۱۰۵۲ھ) بلکہ امام ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) سے پہلے سنت کی گرم بازاری نہیں ہوئی، اور یہ واقعہ ہے کہ حسن بن محمد صغانی (م ۶۵۰ھ) سے پہلے، درۂ خیبر سے آنے والے مسلمانوں میں، حدیث کا کوئی مستند عالم پیدا نہیں ہوا، نویں صدی ہجری میں بھی جبکہ گجرات میں حدثنا و اخبرنا کا غلغلہ بلند ہو رہا تھا، دلی اور اس کے نواح میں گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا، تا آنکہ شیخ علی متقی (م ۹۷۵ھ) کا دور آیا، اور انہوں نے معقولات اور فروع کی اندھیاری میں حدیث کی شمع روشن کی لیکن صغانی اور علی متقی دو ناموں سے پانچ چھ سو برس کی اندھیاری کا فور نہیں ہو سکتی، اور درۂ خیبر سے آنے والے عالموں اور صوفیوں اور بادشاہوں کی پیشانیوں کے بدنما داغ، ان دو کارناموں سے نہیں مٹ سکتے اور گجرات میں بھی یہ حدیث و سنت کی چہل پہل اسی وقت تک رہی، جب تک شمالی ہند کا سایہ اس پر نہیں پڑا، بیچ کی دو صدیوں (۷۹۹-۹۸۰ھ) میں وہ مرکزی حکومت کے دباؤ سے محفوظ رہا تو علم و عمل کی خوب گرم بازاری رہی، اور جب اکبر (۹۶۴-۱۰۴۲ھ) نے مملکت گجرات کو بھی اپنے قلمرو میں شامل کر لیا تو یہاں بھی وہی جہل اور تاریکی لوٹ آئی۔

حدیث سے بے اعتنائی کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ تاریخ میں شیخ نظام الدین اولیاء (م ۷۲۵ھ) اور بعض علماء کے مناظرہ کا حال آتا ہے بحث "سماع" سے متعلق تھی، اثنائے گفتگو میں شیخ نظام الدین اولیاء نے اپنے دعوے کے ثبوت میں "حدیث"[1] پیش کی تو مقابل والے بول اٹھے:-

"اس حدیث سے تو شافعی استدلال کرتے ہیں اور وہ ہمارے مذہب کے دشمن ہیں"

اس سے حدیث کی وقعت کا اندازہ ہو گا، اب ذرا "حدیث" کی بھی سن لیجئے جو بقول فرشتہ، موقع استدلال میں لائی گئی تھی، بیان اس طرح آتا ہے:-

قاضی رکن الدین، شیخ کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا، سماع اور غناء کے جواز پر آپ کی دلیل کیا ہے؟ شیخ نے اس حدیث سے استدلال کیا "السماع مباح لاھلہ" قاضی بولے، "آپ کو حدیث سے کیا تعلق؟ آپ تو امام ابو حنیفہ کے مقلد ہیں اپنے امام کا کوئی قول پیش کیجئے تو ہم اسے دیکھیں" شیخ کا ارشاد ہوا "بندۂ خدا میں رسول اللہ (صلعم) کی حدیث بیان کرتا ہوں

---

[1] یہ حدیث نہیں بلکہ امام غزالی کا قول ہے، جو احیاء العلوم میں فتوے کے طور پر منقول ہے۔ غالباً فرشتہ نے اسے حدیث کہنے میں غلطی کی ہے اور بہت ممکن ہے کہ خود حضرت سلطان المشائخ کو غلط فہمی ہوئی ہو۔

اور آپ امام ابوحنیفہ کا قول چاہتے ہیں"[1]

علاؤ الدین خلجی (۶۹۵-۷۱۶ھ) کے دور کا ایک عبرتناک سانحہ بھی گوش گزار کر دیا جائے تو اچھا ہو، مصر سے ایک محدث شمس الدین ترک حدیث کی ترویج اور تبلیغ کی دھن میں ہندوستان تشریف لائے، کہا جاتا ہے کہ وہ اسی غرض سے حدیث و متعلقات کی کوئی چار سو کتابیں اپنے ساتھ لائے تھے ان کا یہ بھی خیال تھا کہ ایک جامع شرح لکھ کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کریں پر ابھی وہ ملتان ہی تک پہونچے تھے، کہ انھیں معلوم ہوا...................... کہ بادشاہ نمازِ پنجگانہ کا پابند نہیں اور نہ جمعہ جماعت کا اسے خیال ہے،" رنجیدہ ہوئے اور اُلٹے پاؤں لوٹ گئے۔

بعض مصلحین

دسویں صدی ہجری سے پہلے کی زبوں حالی پر بہت کچھ مسالہ فراہم کیا جا سکتا ہے اندازہ کے لیے اتنا کافی ہے ـــــــ اب جہاں ہم نے سندھ۔ گجرات کے علم برداران حدیث کا ذکر کیا ہے وہاں شمالی ہند کے ان نیک نفسوں کی طرف بھی اشارہ کرنا ضروری ہے جنھوں نے کسی نہ کسی درجہ میں اس صورت حال کے بدلنے کی کوشش کی، اس سلسلہ میں بعض بدعات کا ذکر بھی آئے گا۔

محمد تغلق (۷۲۵-۷۵۲ھ)

اس سلسلہ میں بادشاہوں کے زمرہ میں سب سے پہلے محمد تغلق کا نام زبان پر آتا ہے، محمد تغلق سے پہلے قطب الدین ایبک (۶۰۲-۶۰۶ھ) اور شمس الدین التمش (۶۰۷-۶۳۳ھ) جیسے معدل اور صاحب حزم فرماں روا بھی گزرے ہیں لیکن دینی تجدید کے سلسلہ میں، ان کا کوئی قابل ذکر کارنامہ ہمارے سامنے نہیں ہمارے علم میں محمد تغلق پہلا بادشاہ ہے جس نے بدعات کی بیخ کنی اور شعائر اسلام کے رائج کرنے کی دلی کوشش کی، اس کے جنون اور سخت گیری کے بارے میں جو کچھ کہا جائے، ہمیں یہ محبوب ہے، اس لیے کہ اس نے حکومت کی گدی پر بیٹھ کر مذہب کو فراموش نہیں کیا،

ابن بطوطہ (م ۷۷۹ھ) کے سفرنامہ میں اس کے دربار اور اخلاق و عادات کی دلچسپ تفصیلات ملتی ہیں محمد تغلق کے متعلق اس چشم دید شہادت سے زیادہ مستند بیان نہیں مل سکتا، ابن بطوطہ لکھتا ہے:۔

"دین کے شعائر اس کے ہاں محفوظ ہیں اور نماز کے معاملہ میں وہ سخت گیر ہے تارکین کیلئے سزائیں مقرر ہیں جلد ۳ صفحہ ۲۱۶ مطبوعہ پیرس)

سلطان نمازوں کی حرمت برقرار رکھنے میں بہت سخت تھا، جماعت کی سخت تاکید تھی، ترک صلوٰۃ پر سزائیں دیتا تھا صرف اس جرم میں اُس نے ایک دن نو آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جن میں ایک گویا تھا۔ بازار میں ان کے کارندے چلتے، جماعت کے وقت جو کوئی بھی ملتا سزا کا مستوجب ہوتا الخ" صفحہ ۲۸۶ ج ۳

پہلے غیر شرعی محصول لیے جاتے، ۷۳۳ھ میں محمد تغلق نے تمام ناجائز ٹیکس منسوخ کر دیئے صرف زکوٰۃ اور عشر کی وصولی ہی (صفحہ ۲۸۶)

---

[1] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو مقالہ "ہندوستان میں علم حدیث" (از استاذ محترم حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ) ہمارے سامنے اس وقت اس کا عربی ترجمہ ہے جو علم الحدیث فی الہند کے عنوان سے الضیاء (جلد ۲ ۱۹۳۳ء) میں مسلسل شایع ہوا تھا ممکن ہے ترجمہ در ترجمہ کی وجہ سے ترتیب کلام میں کچھ تبدیلی ہوگئی ہو۔

آستانۂ خلافت سے تعلقات کی تجدید بھی اسی کا کارنامہ ہے عہد فیروز شاہی کے ایک مستند مورخ کے بیان کے مطابق شمس الدین التمش[1] (۶۰۷-۶۳۳ھ) بھی بارگاہ خلافت کے "اذن ومنشور" سے مشرف ہوا تھا بعد کے بادشاہوں نے اس سے غفلت برتی اور سلاطین ہند کا رشتہ مصر کی عباسی خلافت سے ٹوٹ گیا، تا آنکہ محمد تغلق سریر آرائے خلافت ہوا اور اس نے یہ رسم کہن زندہ کی، بادشاہ کو خیال تھا کہ بارگاہ خلافت کی اذن ومنشور کے بغیر اس کے "احکام شرعی طور پر قابل اتباع نہیں ہوں گے، اسی اعتقاد کی بنا پر اس نے ۷۴۳ھ میں حاجی رجب برقعی کو عریضہ اور ہدایا کے ساتھ مصر بھیجا........ اور ۷۴۵ھ میں محمد تغلق نے بارگاہ خلافت کی شمشیر کمال عقیدت کے ساتھ زیب کمر کی، اس کے بعد پھر ہر سال مناشیر خلافت آنے لگے، اور محمد تغلق کے انتقال کے بعد اس کے جانشین فیروز شاہ کو بھی منشور و خلعت سے نوازا گیا اب تک ہر سال یہ نوازش ہوتی ہے...... ملخص از سیرت فیروز شاہی مخطوطہ خدابخش لائبریری (ص ۲۵۰)"

سیرت فیروز شاہی کے مندرجہ بالا بیان کی تائید ابن بطوطہ کی اس تفصیل سے بھی ہوتی ہے[2]

"سلطان نے خلیفہ ابو العباس کو مصر ہدایا بھیجے، اور خلیفہ سے ہندوستان اور سندھ پر حکومت کی اجازت طلب کی، خلیفہ نے اس کی درخواست قبول کی اور مصر کے شیخ الشیوخ رکن الدین کی معرفت مطلوبہ اجازت نامہ بھیج دیا، شیخ رکن الدین کی آمد پر سلطان نے اس کی توقیر و تعظیم میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا" (ص ۲ ج ۳)

ان بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ محمد تغلق کو مقام خلافت سے گہری عقیدت تھی، امیر غیاث الدین محمد بن عبد القاہر بن یوسف بن عبد العزیز بن مستنصر باللہ عباسی کی آمد اور ان کی توقیر کی جو تفصیلی سرگزشت ابن بطوطہ نے درج کی ہے (ج ۳ ص ۲۵۸-۲۶۶) اس سے بھی اس کی دلی کیفیت اور عباسیوں سے محبت کا حال معلوم ہوتا ہے۔ ــــ مصر کی نام نہاد خلافت جیسی بھی رہی ہو، پر محمد تغلق کی یہ عقیدت مقام خلافت کے ساتھ تھی جو اپنی جگہ پر مسلمانوں کی بین الاقوامی حیثیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے قابل قدر اور دوسرے بادشاہوں سے اسے ممتاز کرتی ہے

ابن بطوطہ کے سفر نامہ (جلد ۲ ص ۲۵۲) سے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ امام ابن تیمیہؒ (م ۷۲۸ھ) کے شاگردوں سے اسکو تعلقات تھے،

ابن بطوطہ، شیخ عبد العزیز الاردویلی کی آمد اور سلطان کی طرف سے توقیر و تکریم کا ذکر کرتا ہے (ص ۲۵۲) یہ شیخ عبد العزیز دمشق میں امام ابن تیمیہ، جمال الدین المزی (م ۷۴۲ھ) اور حافظ شمس الدین ذہبی (م ۷۴۸ھ) کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر چکے تھے، اس لئے سلطان پر ان کا اثر ضرور ہوا ہوگا، بھلا یہ کوئی بات ہے کہ ابن تیمیہؒ کا فیض یافتہ دربار میں آئے اور اپنا

---

[1] خلیفہ عباسی نے التمش کی حکومت تسلیم کر لی تھی، اور وہ اذن و تقاعد سے نوازا گیا تھا، یہ ۶۲۶ھ کا واقعہ ہے (خلافت اور ہندوستان ص ۱۰۶)

[2] نیز ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی (ضیاء برنی) (مخطوطہ کتب خانہ پٹنہ ص ۲۶۰) ایسٹ جلد ۲ ص ۲۴۹-

اثر نہ چھوڑ جائے۔[۵] دینی تجدید کے علاوہ محمد تغلق اپنی علمی قابلیت کے لحاظ سے بھی ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں میں ممتاز درجہ رکھتا ہے۔" (فہرست مشروح انگریزی، خدا بخش لائبریری، جلد، ص)

فیروز تغلق ۷۵۲ء - ۹۰ء محمد تغلق کے جانشین فیروز تغلق نے بھی اپنے پیش رو کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی اور بہتیری بدعات رسوم کی اصلاح کی خوش قسمتی سے اس کی اصلاحی کوششوں کی مختصر روداد، خود اسی کی زبانی ہم تک پہونچ گئی ہے۔ فتوحات فیروز شاہی[۵] سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ہندویت کس حد تک مسلمان دماغوں پر چھا گئی تھی۔ فیروز شاہ لکھتا ہے:-

زندیقوں کا ایک گروہ مستقل طور پر لوگوں کو زندقہ اور الحاد کی ترغیب دیا کرتا تھا۔ رات کو وہ دوستوں اور ملنے والوں کے ساتھ ایک مقررہ جگہ پر جمع ہوتے، شراب کا دور چلتا، اور وہ اسے مذہبی عبادت قرار دیتے، وہ اپنی بی بیاں، ماؤں اور لڑکیوں کو بھی ساتھ لاتے۔ جو جس کا دامن پکڑ لیتا۔ اس کے ساتھ اسے صحبت کا حق حاصل تھا۔ میں نے اس فرقہ کے سرغناؤں کو موت کی سزا دی اور باقی کو جلا وطنی اور قید سے نوازا کہ آئندہ اس جماعت کی دوڑ دھوپ بالکل ختم ہو جائے۔" (ملاحظہ ہو اصلاح ص)

فیروز شاہ نے ہندوانہ تصوف پر بھی نگاہ رکھی، گجرات کے ایک صوفی کا حال بیان کرتا ہے:-

گجرات میں ایک شخص نے اپنے کو شیخ مشہور کرنا شروع کیا، اپنے مریدوں کے غول میں اس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ وہ "انا الحق" کہتا اور سب یک زبان ہو کر اس کی تائید کرتے۔ وہ اپنے کو "باقی" اور غیر فانی بھی کہتا۔" (ملاحظہ ہو اصلاح ص)

بادشاہ کے حکم سے اس گجراتی زندیق کی ایک کتاب جلا دی گئی۔ لیکن یہاں تو سارا ملک اس قسم کی آوازوں سے گونج رہا تھا، بیچارہ فیروز شاہ کہاں تک کیا کرتا؟ اس کی زبانی ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اسی وقت سے مسلمان عورتیں قبروں کی زیارت کو جانے لگی تھیں، سنئے "شہنشاہ" کہتا ہے:-

"مسلمان شہروں میں ایک غیر شرعی رواج عام ہو گیا ہے متبرک دنوں میں عورتیں پالکیوں، یا سواریوں پر جھنڈ

---

[۵] ایک عجیب بات ہے ابن بطوطہ کے شاگرد دہلی کی آمد کی وجہ سے قدح کرتے ہیں کہ محمد تغلق بدعات سے متنفر رہا ہوگا اور دوسری طرف ضیاء برنی سر سالار مسعود کی قبر کی زیارت اور عقیدت مندانہ نذر و نیاز کا ذکر کرتا ہے جس سے حسنت ہوتی ہے اور حسن ظن ختم ہونے لگتا ہے (تاریخ فیروز شاہی: برنی ایلیٹ جلد ۳ ص ۲۴۹) بہرحال آٹھویں صدی کے ایک ہندوستان میں یہ بڑا غنیمت تھا۔

[۵] عہد فیروز شاہی کی چار مستند تاریخیں ہمارے سامنے ہیں (۱) تاریخ فیروز شاہی (ضیاء برنی) (۲) تاریخ فیروز شاہی شمس سراج عفیف، ایلیٹ جلد ۳ ص ۲۶۹-۲۷۳ (۳) سیرت فیروز شاہی کا قلمی مخطوطہ خدا بخش لائبریری (۴) فتوحات فیروز شاہی ان میں سے پہلی دو مشہور ہیں تیسری نادر ہے اس وقت بحث اس چوتھی کتاب سے ہے جو ۳۲ صفحات سے زیادہ نہیں، اصل کا تو پتہ نہیں چلتا لیکن اس کا مکمل ترجمہ ایلیٹ جلد ۳ ص ۳۷۴-۳۸۸ میں دیا گیا ہے۔ یہ خود فیروز شاہ کے قلم سے ہے (ملاحظہ فرشتہ جلد ۱ ص ۱۵۱ نیز فہرست مشروح خدا بخش لائبریری جلد ۷ ص) فتوحات فیروز شاہی میں جن اصلاحات اور تجدیدی کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے سیرت فیروز شاہی سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ نیز برنی کی تاریخ فیروز شاہی کو شمس سراج عفیف (جس میں اسکے مذہبی کارناموں کا تذکرہ کم ہے) برنی کی کتاب میں عہد فیروز شاہ کے صرف ابتدائی چھ سال کا ذکر ہے۔

کی مُفسد معتبروں کی زیارت کو جاتی ہیں" (ملاحظہ ہو صلاح ع۱)

بادشاہ نے اس بُری عادت کے روکنے کی بھی کوشش کی۔

تفصیل کہاں تک کی جائے مختصر طور پر، خود فیروز شاہ کی ترتیب کے مطابق، ذیل میں فتوحات کا خلاصہ درج کرتے ہیں:

(۱) پہلی بادشاہتوں میں مسلمانوں پر بارہا ظلم ہوتے تھے، میں نے ان سب کا خاتمہ کر دیا (ص۳۰۹ ملخص)

(۲) خطبہ میں ان بادشاہوں کی یاد تازہ کرائی جن کی بدولت آج اس ملک میں اسلامی پرچم بلند ہے (ص۳۰۷ ملخص)

(۳) اگلے بادشاہوں کے زمانہ میں ناجائز ٹیکس وصول کیے جاتے تھے، میں نے تمام ناجائز غیر شرعی ٹیکس منسوخ کر دیئے، اور تحصیل کنندہ غیر شرعی ٹیکس وصول کرتا، اسے سزا دی جاتی.... خزانہ عامرہ میں اب صرف وہی محصول داخل ہوں گے، جن کی شرع نے اجازت دی ہے ص۳۷۰ (نیز ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی شمس سراج عفیف)

(۴) مجھ سے پہلے یہ رواج تھا کہ مال غنیمت کا صرف ایک خمس سپاہیوں میں تقسیم ہوتا اور باقی سب کا سب خزانہ میں داخل کر لیا جاتا، میں نے اس غیر شرعی تقسیم کا سد باب کیا اور حکم دیا کہ اسٹیٹ صرف ایک خُمس لے، باقی چار خمس سپاہیوں میں تقسیم کیا جائے" (ص۳۷۷)

(۵) شیعوں کے فرقہ نے جسے روافض بھی کہا جاتا ہے، اپنے مذہب کی تبلیغ شروع کی انھوں نے کتابیں اور رسالے لکھے اور ہمارے مذہب کے پہلے سرداروں PIRST CHEIFS OF OU RELIGION کی بے حرمتی کی.......... میں نے ان سب کو گرفتار کیا اور سزا دی.......... ان کی کتابیں جلا دیں اور اس طرح پر اللہ کے فضل سے اس فرقہ کا بالکل قلع قمع ہو گیا (ص۳۷۷)

(۶) زندیقوں کے ایک فرقہ کا ذکر ہے جو رات کو جمع ہوتا، اور عورت و مرد آزادی کے ساتھ ایک دوسرے سے ہمکنار ہوتے (ص۳۷۸) مختصر تفصیل اوپر گزری۔

(۷) ایک شخص احمد بہاری کا ذکر کرتا ہے، جس نے الوہیت کا دعوٰے کیا تھا اور معتقدوں کا ایک گروہ اس کے گرد جمع ہو گیا تھا، فیروز شاہ نے انہیں سخت سزائیں دیں۔ (ص۳۷۸ ملخص)

(۸) ایک اور رکن الدین کا ذکر کرتا ہے، جس نے مہدویت کا دعوٰی کیا تھا بادشاہ نے اس کی بھی خبر لی اور قتل کا حکم

۱؎ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو ایلیٹ، جلد ۳ ص۳۸۰

۲؎ محمد تغلق کے کارناموں کے سلسلہ میں بھی اس کا ذکر آتا ہے، ہو سکتا ہے کہ دونوں نے اس غیر شرعی طریقہ کے ختم کرنے کی کوشش کی ہو لیکن صدیوں کا جما ہوا رنگ آسانی سے تو دور ہوتا نہیں۔

۳؎ ایلیٹ جلد ۳ ص۳۷۶، بعض ناجائز محصولوں کی تفصیل بھی اس میں درج ہے۔

۴؎ فیروز شاہ کے اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ آٹھویں صدی ہجری ہی میں شیعیت یہاں پھیل چکی تھی، بہر حال یہ فیروز شاہ کی کوششوں کا اثر ہو یا سامدہ حالات کا، کہ ہمایوں سے پہلے انہیں سر بلندی نہ حاصل ہو سکی تھی۔

صادر ہوا اور کہتا ہے:۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھ حقیر بندہ سے یہ کام لیا اور اس کے ذریعہ اس شرارت اور الحاد کا خاتمہ ہوا اور صحیح مذہب کی تجدید کی طرف میری رہنمائی کی ...... ان واقعات کو سُن کر مذہب کا ہر بہی خواہ فیصلہ کرے گا کہ ان لوگوں کو بجا طور پر سزا دی گئی، اور میں اس پاداش میں آخرت میں جزا کی توقع رکھتا ہوں"۔ (ص ۳۰)۔

(۹) گجرات کے وحدۃ الوجودی پیر، اس کی سزا اور کتاب کے جلانے کا تذکرہ جوش و خروش کے ساتھ کرتا ہے (ص ۳۰ مختصر تفصیل اوپر گزری)۔

(۱۰) عورتوں کو قبروں کی عام زیارت سے روکنا بھی اس کا ایک کارنامہ ہے خود اسی کی زبانی سُنئے:۔

میں نے حکم دیا کہ کوئی عورت مزارات پر نہیں جا سکتی، اب اللہ کا شکر ہے کہ کوئی شریف مسلمان عورت قبروں کی زیارت کو نہیں جاتی، یہ رواج اب بالکل موقوف ہو گیا ہے (ص ۳۰)

آٹھویں صدی ہجری میں تو یہ مذموم رواج رُک گیا تھا لیکن آج کتاب و سنت کی عام اشاعت اور علما کی تبلیغی جدوجہد کے باوجود یہ طریقہ عام ہے، البتہ شریف عورتیں شاید کھلے بندوں جلوس بنا کر زیارت کو نہ جاتی ہوں، اور فیروز شاہ نے نام "عورتوں" کی زیارت اور میلوں کی شرکت کی تردید بھی نہیں کی ہے۔

(۱۱-۱۲-۱۳) ہندو جو اہل جزیہ ہیں، نئے عبادت خانوں کے تعمیر سے روک دیئے گئے جہاں کہیں کسی نئے مندر کا سُراغ ملا ہے، اسے منہدم کر دیا گیا ہے (ص ۳۸۱-۳۸۰)

(۱۴-۱۵-۱۶) اگلے بادشاہ سونے چاندی کے برتن، زریں لباس، اور ریشمی کپڑے عام طور پر استعمال کرتے تھے، میں نے یہ سب چیزیں روک دیں، میں نے یہ حکم دیا کہ صرف وہ برتن استعمال ہوں جن کی شرع نے اجازت دی ہے"۔

نیز ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی (شمس سراج عفیف) (ص ۳۸۱-۳۸۲)

تصویروں کے امتناع کے سلسلہ میں شمس سراج عفیف لکھتا ہے:۔

ان بدعات میں سے ایک بادشاہوں کے خاص کمروں میں تصویروں کا رواج تھا، پہلے بادشاہ اسے اچھا سمجھتے تھے، لیکن فیروز شاہ نے اللہ کے خوف سے جانداروں کی تصویریں بند کرا دیں اور ان کے بدلے باغات اور مناظر کی تصویر کشی کی اجازت دی"۔ (ایلیٹ جلد ۳ ص ۳۷۶)

ان اصلاحات کے علاوہ، مسجدوں، اور دوسری عام نفع کی عمارتوں کی تعمیر اور متفرق بھلائی کے کاموں کا تذکرہ ہے جن کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں، خاتمہ کی چند سطریں قابل غور ہیں:۔

اس کتاب کے لکھنے سے میرا مقصد اللہ تعالیٰ کی ان عنایات اور احسانات کا شکر ادا کرنا ہے جو اس نے مجھ پر کی ہیں، دوسری بات یہ ہے کہ جو لوگ اچھے کام کرنے کے متمنی ہوں اسے پڑھیں اور صحیح طریقہ سے واقف ہوں"........ (ص ۳۸۸)

شمس سراج عفیف بعض ایسے واقعات کا ذکر کرتا ہے جن سے فیروز شاہ کی مذہبی پابندی پر مزید روشنی پڑتی ہے، اس سے پہلے برہمنوں سے جزیہ نہیں لیا جاتا تھا، عہد فیروز شاہی میں ان پر بھی جزیہ قائم کیا گیا جو ان کے مسلسل احتجاج اور فاقہ کشی کے باوجود قائم رہا (الیٹ جلد ۳ ص ۳۶۶) اسی طرح ایک برہمن کے سر دربار جلانے کا واقعہ شمس سراج عفیف کی عینی شہادت کے ذریعہ ہم تک پہونچا ہے قصہ یہ ہے کہ دہلی میں ایک برہمن بتوں کی پوجا برسر عام کیا کرتا تھا جہاں ہندو تو ہندو، مسلمان بھی شریک ہوتے، آخر افسروں کو خبر ہوئی، برہمن دربار میں بلایا گیا، اور پھر اسے سزا دی گئی (ص ۳۶۵)

سکندر لودی ۸۹۴ - ۹۲۳ سکندر لودی کے متعلق اتنا تو اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ عالم، علم دوست اور صالح بادشاہ تھا۔ الفنسٹن نے تاریخ ہند میں اس کی بڑی برائی کی ہے، اور جرم وہی تعصب، بربریت اور مذہب کا ہے، اس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید وہ واقعی مذہبی لحاظ سے سرگرم اور قابل تعریف رہا ہوگا۔ الفنسٹن کا پورا بیان ملاحظہ ہو:۔

لیکن وہ ہندوستان کے چند متعصب ترین بادشاہوں میں سے تھا، اس نے مندر گرائے اور لوگوں کو تیرتھ سے باز رکھنے کی کوشش کی، اپنے قلمرو کے اندر بعض دریاؤں پر اشنان کرنے سے بھی منع کیا، کبھی کبھی وہ اپنے جوش میں بے انصافی اور بے رحمی کی حد تک پہونچ جاتا تھا ایک برہمن کو اس حقیقت کی تبلیغ پر۔

"کہ تمام مذاہب، اگر صحیح طور پر برتے جائیں پرمیشور کے نزدیک قابل قبول ہیں"

تنبیہ کی اور علماء سے مناظرہ پر مجبور کیا، جب وہ اس پر بھی باز نہ آیا تو اسے تہ تیغ کر دیا۔

"خود ایک مسلمان نے جب اس تیرتھ روکنے پر بحث و حجت کی، تو سکندر تلوار کھینچ کر چلا اٹھا خبیث! تو بت پرستی کی حمایت کرتا ہے؟"

اس مسلمان نے جواب دیا:۔

نہیں! میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ بادشاہ رعایا پر تشدد نہ کرے،

ایک دفعہ وہ کسی مہم پر جا رہا تھا، راستہ میں ایک قلندر نے اسی کو مخاطب کر کے (شاید اس کی ذاتی دے کر) دعا مانگی، بادشاہ نے جواب دیا:۔

"اس سے دعا مانگو، جو واقعی اپنی رعایا (مخلوق) کی بھلائی کی فکر رکھتا ہے"۔

تاریخ ہند الفنسٹن، طبع ہفتم ص ۴۱۹)

الفنسٹن کے علاوہ، ایک معاصر ہندو مورخ کے مندرجہ ذیل بیان سے بھی سکندر لودی کے متعلق کچھ حسن ظن

پیدا ہوتا ہے:-

> فیروز شاہ کی اصلاحی کوششیں ناکام رہیں، اس لئے کہ سکندر لودی کو ازسرِ نو اس کے منع
>
> کردہ رسم و رواج کا قلع قمع کرنا پڑا۔[۱]

فیروز شاہ کی ان شہادتوں کے علاوہ لودیوں کی مستند تاریخ "داؤدی" میں بھی اس قسم کی مثالیں ملتی ہیں، نمونہ کے طور پر

ملاحظہ ہو:-

> "وہ ایک پرجوش مسلمان تھا، اس نے بت پرستوں کے مختلف عبادت خانے منہدم کرائے اور
>
> بت پرستی کے مرکز متھرا کی تیرتھ گاہیں تباہ کر دیں اور مشہور ہندو عبادت خانوں کو کارواں سرائے
>
> اور مدرسوں میں منتقل کر دیا" (تاریخ داؤدی، ایلیٹ جلد ۴ ص ۴۴۷)
>
> اس نے نومسلموں کو مختلف جگہوں میں زمینیں دیں (ص ۴۴۷) اس طرح پر ہر شہر اس کی خواہش کے
>
> مطابق اسلامی رسم و رواج کا پابند ہو گیا (ص ۔۔)
>
> سالار مسعود کے نیزہ کا سالانہ جلوس اس نے یک قلم موقوف کرا دیا (ص ۴۴۷)
>
> عورتیں بھی قبروں کی زیارت سے روک دی گئیں (ص ۔۔)

محمد تغلق، فیروز تغلق، سکندر لودی کے متعلق ان بیانات سے اتنا تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ انھیں مذہب سے لگاؤ تھا

اور وہ جس چیز کو شرعی طور پر بُرا خیال کرتے تھے، اس کے روکنے اور مٹانے کی بھی کوشش کرتے تھے،

پر دشواری یہ تھی کہ مذہب کی روح سے ناواقفیت اور اسلام کے قانون حرب سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے

وہ اپنے جوش میں ایسے کام بھی کر جاتے تھے جن کی شرع نے اجازت نہیں دی عرب اور درہ خیبر سے آنے والے بادشاہوں

کے درمیان یہی بڑا فرق ہے، محمد بن قاسم نے اپنی ساری جنگی مہم میں کوئی ایسا کام نہیں کیا جسے اسلام کا قانون حرب

روا نہ رکھتا ہو، وہ اور اس کے ساتھی صحیح اسلام کا نمونہ دیکھ کر آئے تھے، درہ خیبر سے آنے والے بیچارے کتاب و

سنت سے یکسر ناآشنا بس متاخرین کی فقہ اور اس کی جزئیات میں الجھے ہوئے دین کی اصلی روح سے بیگانہ رہے، اس لئے

---

[۱] ملاحظہ ہو S. N. Sen کا مضمون (ہندویت اور مسلم زندگی) HINDUISM AND MOHAMMADAN HERETICS مندرجہ STUDIES IN INDIAN HISTORY اس کی تائید تاریخ داؤدی سے بھی ہوتی ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل مثالوں سے واضح ہوگا۔

[۲] الفنسٹن اور سمتھ نے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا، مگر غالباً تاریخ داؤدی ہی ان کا ماخذ ہے اس لئے کہ لودیوں کی تاریخ میں یہ مشہور ہے

اگر ان میں فیروز تغلق جیسا زندہ دل بینا بھی ہوا تو اسے صحیح راہ دکھانے والا کہاں سے ملتا ؟

اس بے راہ روی کا ایک اور نمونہ پیش خدمت ہے، ابھی آپ نے محمد تغلق (م ۷۵۲ھ) فیروز تغلق (م ۷۹۰ھ) اور سکندر لودی[1] (م ۹۲۳ھ) کو اسلام کے نام پر اصلاح کرتے اور کافروں پر سختیاں کرتے دیکھا ہے، اب آئیے، اسی وطن میں امیر صاحبقران کا اسلامی جہاد بھی ملاحظہ فرمائیے، نویں صدی ہجری کا شروع ہے[2] اور آل تغلق (۷۲۱-۸۱۵ھ) کا آفتاب غروب ہو رہا ہے۔

فیروز تغلق کی وفات کو ابھی دس سال ہوئے ہیں، دلی کے تخت پر بُرا بھلا مسلمان نامی بادشاہ جلوہ افروز ہے کہ امیر تیمور (م ۸۰۷ھ) جہاد کا نام لے کر ہندوستان پر فوج کشی کرتا ہے، جہاد کا مقصد ارشاد ہوتا ہے :-

ہندوستان آنے اور ان تمام مشقتوں کے برداشت کرنے سے میرے خاص دو مقصد ہیں :-
سب سے پہلے اسلام کے دشمن، بت پرستوں سے جنگ کرنا۔ دوسرا مقصد دنیوی ہے وہ یہ کہ بت پرستوں کے مال و دولت کو لُوٹ کر اسلام کی سپاہ کچھ حاصل کر سکے۔

ملفوظات تیموری، الیٹ جلد ۳ ص ۳۹۷

کیا کہتے ہیں، مفتیان شرع متین ! اس جہاد (؟) کو جہاد شرعی کہا جائے گا ؟

اتفاق سے ایک جگہ (BHATNIR) ہندو مسلمان مل کر اس کا مقابلہ کرتے ہیں، وہاں مسلمانوں پر "کفر" کا ذیگا صادر ہوتا ہے :-

اب قلعہ میں مسلمانوں اور بت پرستوں کا حال بُرا تھا، بت پرستوں نے اپنی بیوی اور بچوں کو گھروں میں بند کر کے آگ لگا دی، اور وہ جو اپنے کو مسلمان کہتے ہیں، لیکن اسلام کی راہ سے الگ ہو گئے ہیں، انھوں نے اپنے بچوں اور عورتوں کو قتل کر ڈالا اور خود جان پر کھیل کر میدان میں کود پڑے (ص ۴۲۶)

یہ تو ہم نے مانا کہ ہندوستان کے یہ مسلمان راہ راست سے الگ ہو گئے تھے، لیکن چنگیز اور ہلاکو کے طریقہ پر قتل و غارتگری اسلام نے کہاں سکھائی ہے ؟

ملفوظات میں تیمور بار بار کہتا ہے :-

کہ یہ مہم ہندوستان کے بت پرستوں اور مشرکوں کے خلاف جاری کی گئی ہے ص ۳۹۷، ۳۹۴، ۳۹۵

لیکن قتل و نہب کے وقت ہندو مسلم کا امتیاز جاتا رہا، ایک جگہ اور کچھ شورپشت قطاع طریق کی تنبیہ کے سلسلہ میں

---

[1] سکندر لودی کا زمانہ تیمور کے تقریباً سو سال بعد ہے یہاں محمد تغلق اور فیروز تغلق کے ساتھ مماثلت کی وجہ سے ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے

[2] ملفوظات تیموری میں سمرقند سے روانگی کی تاریخ رجب ۸۰۰ھ ہے (الیٹ ج ۳ ص ۳۹۷)، دریائے سندھ کے عبور کی تاریخ محرم ۸۰۱ھ ہے (ص ۴۰۹) اور دہلی پر قبضہ ۸ ربیع الثانی ۸۰۱ھ کو ہوا (ظفرنامہ، الیٹ جلد ۳ ص ۵۰۳)

رقمطراز ہے :-

وہ صرف نام کے مسلمان تھے، چوری اور ڈاکہ میں کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، ص ۴۲۸

اب ان "سچے مسلمانوں" کے فرد عمل و اعتقاد کا جائزہ لیجئے شیخ فرید گنج شکر (م ۶۶۴ھ) کے مقبرہ کی زیارت کا حال لکھا ہے :-

مجھے اطلاع دی گئی کہ حضرت شیخ فرید گنج شکر رحمہ اللہ کا مقبرہ اسی شہر میں ہے، بس فوراً زیارت کے لئے روانہ ہوا، فاتحہ پڑھی اور امداد کیلئے دوسری دعائیں پڑھیں ...... اور ان کی مقبول روح سے کامیابی کی التجا کی، (ص ۱۸۶)

ممکن ہے خوش عقیدہ لوگ اس گرفت کو "وہابیت" سے تعبیر کریں لیکن سچائی سچائی رہے گی، اور قبروں کی پرستش مردوں سے التجا و درخواست، اور دوسری بدعات کبھی روا نہیں رکھی جا سکتیں ؟

بہرحال کہنا یہ ہے کہ دسویں صدی ہجری سے پہلے کے مسلمان بادشاہ معذور تھے، اس وقت اسلام کی صحیح تعلیم نام نہ ہو گئی تھی، اس لئے اگر کوئی صاحب دل اور صاحب عمل پیدا بھی ہوا، تو صحیح راستہ پر نہ چل سکا، اور اس کی ذات سے اسلام اور مسلمانوں کو جو فائدہ پہونچ سکتا تھا نہ پہونچ سکا۔

خیر بادشاہوں میں تو بعضوں نے اپنی سمجھ کے مطابق اصلاح کی کوشش بھی کی، لیکن علماء اور مشائخ، یا تو تھے ہی نہیں اور تھے تو اپنے فرائض سے غافل، کچھ پاک باز صوفی ضرور تھے، اور یہ انھیں کی خاموش دعوت کا اثر ہے کہ آج اس ملک میں مسلمان نظر آتے ہیں، پر وہ اپنی گوشہ نشینی کے باعث بدعات کے مٹانے سے قاصر تھے، اور تو اور ان بزرگوں کی قبریں خود بدعات کی آماجگاہ بنیں،

علماء و مشائخ کے زمرہ میں سید محمد جونپوری (۸۴۷ - ۹۱۱ھ) کا نام آتا ہے، جنھوں نے مہدویت کا دعویٰ بھی کیا تھا اصلاح رسوم اور بدعات کی بیخ کنی کے سلسلہ میں ان کی خدمات مشہور ہیں، پر مہدویت کے دعوے کی وجہ سے، ان سے متعلق رائیں بہت مختلف ہو گئی ہیں، بعض مستند مورخوں کا خیال ہے کہ وہ "مہدویت" سے صرف "احیاء سنت" کا ارادہ کرتے تھے، نمور معاصر مورخ سید ہاشمی فرید آبادی (تاریخ ہند جلد ۲ ص ۱۱۲) کی یہی رائے معلوم ہوتی ہے۔ مولانا ابو الکلام مدظلہ نے تو سید جونپوری کی مدافعت کا حق ادا کر دیا ہے (ملاحظہ ہو تذکرہ ص ۲۶ - ۶۰) ان کے خیال میں سید محمد مہدی سے مہدی آخر الزمان نہیں مراد لیتے تھے، سید ہاشمی اور مولانا ابو الکلام دونوں صاحبوں نے حضرت مجدد اور شاہ صاحب کی رائیں نقل کی ہیں اور سکوت کو ترجیح دی ہے، ہم بھی سکوت ہی کو ترجیح دیتے ہیں، لیکن اس وقت جو مہدوی فرقہ ان کی طرف منسوب ہے اور نواح مدراس و حیدرآباد میں پایا جاتا ہے اس کے خیالات تو بلاشبہ حد درجہ گمراہانہ ہیں، تمدیہ

ؔ یہ تمام حوالے ملفوظات تیموری (انگریزی ترجمہ) مندرجہ الیٹ (جلد ۳ ص ۳۸۹ - ۴۷۷) کے ہیں۔

سید محمد جونپوری کی دعوت کے ثمرات ابھی اچھی طرح ظاہر بھی نہیں ہونے پائے تھے کہ ان کے ماننے والوں پر سختیاں شروع ہو گئیں، یہ دسویں صدی ہجری کا آغاز تھا، اسی زمانہ میں ہمایوں (م ۹۶۳ھ) ایران سے "شیعیت"[1] کا تحفہ لایا، جس نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی، اب تک "خشک فقاہت" یا "ہندوانہ تصوف" ہی کی برائیاں تھیں، اس نئی آمیزش سے ایک نئے فتنہ کی پرورش شروع ہوئی، جو بعد کی صدیوں میں اسلامی ہند کا ایک "مستقل مسئلہ" بن گیا۔

دورِ ضلالت
۹۶۳ - ۱۰۱۴ھ

یہ سب جو کچھ کہا گیا، اُس دور سے پہلے کی سرگزشت تھی، جس میں دینِ حنیف کو یکسر مسخ کرنے کی کوشش کی گئی اور جس عہد کو بدقسمتی سے آج ہند و مسلم تاریخ کا زریں عہد کہا جاتا ہے، ہماری مراد اکبر (۹۶۳ - ۱۰۱۴ھ) کا دور ہے، اس سے پہلے کے مسلمان نام رکھنے والے بادشاہ "مذہب سے لاپروا" INDIFFERENT ضرور تھے لیکن انہیں مذہب سے عناد نہ تھا اور نہ اصول مذہب میں ترمیم و تنسیخ کا خیال ان کے دل میں آیا تھا صرف علاء الدین حسین شاہ سلطانِ بنگال (۸۹۹ - ۹۲۰ھ) کے متعلق روایت ہے کہ اس نے ستیہ پیر کی عبادت کو رواج دے کر ایک مذہبی معجون تیار کی تھی[2] (ستیہ کے معنی نرائن یا وشنو کے ہیں)، ممکن ہے کہ دو ایک مثالیں اور بھی مل جائیں، پر یہ بات اپنی جگہ پر ہے کہ اکبری راج سے پہلے مذہب اور اصول مذہب میں یہ افراتفری نہیں مچی تھی،

اکبر کی حکومت ۹۶۳ھ سے شروع ہو کر کوئی پچاس برس کے لگ بھگ رہی۔ پہلے بیس سال میں کسی دینی فتنہ کا سراغ نہیں ملتا، اس زمانہ میں عام سنی رعایا مطمئن رہی، ۹۸۳ھ سے اکبری "اجتہاد"[3] یا الحاد کا دور شروع ہوا جس کا سلسلہ ۱۰۰۳ھ تک جاری رہا، اس دوران میں عام سنی مسلمان سخت مذہبی فتنہ سے دوچار رہے، آخری دس سال کے متعلق شہادتیں نہیں ملتیں اس لیے کہ ندباری اور معاصر مورخ اپنا کام ۱۰۰۳ھ سے پہلے ختم کر چکے تھے[4]

اکبر اوّل تو بالکل ان پڑھ تھا، اس پر معلومات حاصل کرنے کا شوق، مولویوں اور مشائخ سے بحثیں کرتا، سنی، شیعہ، برہمن، عیسائی، یہودی، آتش پرست، ہر جماعت کے مذہبی عالم "بلائے جاتے" اور "شہنشاہ" ان کی باتیں سنتا، جس مذہب کی جو بات اچھی لگتی اُسے لے لیتا، بڑھتے بڑھتے یہ عقیدہ پیدا ہوا کہ "تمام مذاہب حق ہیں، اور اسلام کو کوئی برتری نہیں"، یہ نشہ اور

---

[1] ہمایوں سے پہلے شیعیت ہندوستان میں آ چکی تھی، جیسا کہ فیروز شاہ کے سلسلہ میں گزرا، پر ہمایوں سے پہلے اسے شاہی رسوخ نہ حاصل ہو سکا تھا اور نہ اس کے ماننے والوں کی کثرت تھی۔

[2] CULTBRAL FELLOWSHIP IN INDIA BY ATULANANDA CHAKARBARTI ص ۵۲

[3] الفرقان کے پچھلے مجدد نمبر میں "اکبری فتنہ" پر مخدومی مولانا سید مناظر احسن گیلانی کا بسیط مضمون شائع ہو چکا ہے اس لیے ہم یہاں "دورِ ضلالت" پر مختصر تبصرہ کریں گے اور یہ بھی مضمون کا تسلسل قائم رکھنے کے لیے۔

[4] اکبری فتنہ کا سب سے بڑا حامی ابو الفضل (صاحب اکبرنامہ و آئین اکبری) ۱۰۱۱ھ میں مقتول ہوا، اور سب سے تلخ نقاد عبدالقادر بدایونی (صاحب منتخب التواریخ) کی وفات ۱۰۰۴ھ میں ہوئی۔ ۱۲

تیز ہوا، ایک نئے دین کی داغ بیل ڈالی گئی "دین الہٰی" ام پڑا گو دربار سلطانی سے باہر اسے کوئی مقبولیت نہ حاصل ہوئی، کہا جاتا ہے کہ اٹھارہ آدمی نئے مذہب میں داخل ہوئے تھے، یہ زیادہ سے زیادہ اندازہ ہے۔

(ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، لفظ اکبر)

مورخین لکھتے ہیں کہ اس نے شیعہ مذہب بھی اختیار کیا تھا، اور سنی علماء پر بڑی سختیاں کی تھیں، فتح اللہ شیرازی اور عبداللہ یزدی کو خاص مقربان بارگاہ میں جگہ ملی، اسی طرح مبارک ناگوری کے بیٹے ابوالفضل (م سلنلہ ھ) اور فیضی (م سنلہ ھ) اس کے خاص چہیتے تھے، تا آنکہ وزارت عظمیٰ کے منصب پر سرفراز ہوئے، بعض کہتے ہیں کہ وہ تصوف کی طرف مائل تھا۔

جتنی زبانیں اتنی باتیں، اصل یہ ہے کہ وہ کسی عقیدہ پر جمتا نہیں تھا، ہم اسے مذہب کے باب میں خبطی کہہ سکتے ہیں۔ آفتاب اور آگ کے سامنے بھی عقیدت سے سرخم کرنا بیان کیا گیا ہے۔ حضرت مریم کو معبود بنانے اور ستاروں کی پرستش بھی اس کی طرف منسوب ہے، اور تو اور، اپنی عقل کو بھی وہ معصوم سمجھنے لگا تھا، اور یہی بدعقلی تھی جس نے اس کا دماغی توازن خراب کر رکھا تھا اور آئے دن اس کے عقیدے میں تبدیلیاں ہوتی رہتی تھیں۔

اکبر کی اس بے راہ روی میں، اس کی غیر مسلم بی بیوں کا بھی دخل تھا، انھوں نے اس کے "ہندوانے" میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، حرم میں ہندو عورتوں کی موجودگی ہی ہندوانہ ماحول بنانے کیلئے کافی تھی قصر شاہی میں عبادت خانے بنائے گئے اور بتوں کی پوجا کا انتظام ہوا، ہندو تہواروں کے موقعہ پر قصر شاہی میں عام عید منائی جاتی، گاؤکشی جرم قرار دی گئی، شام کو جب چراغ جلتے، تو اکبر تعظیم کے لئے کھڑا ہوتا، درباری لباس بالکل ہندوانہ ہوگیا، داڑھی بھی چہروں سے غائب ہونے لگی مختصر یہ کہ سارا ماحول یکسر ہندوانہ ہوگیا، اور قصر شاہی کے آداب و اطوار بالکل ہندوانہ رنگ میں رنگ گئے، اس دور کے لباس، تعمیر، مصوری، ہر چیز سے "ہندویت"، ظاہر ہوتی ہے، فتح پور سیکری کی مسجد ہو، یا شیخ سلیم کا مقبرہ، ہندو اثر بالکل نمایاں ہے، شیخ سلیم چشتی کے مقبرہ کے بارے میں، ونسنٹ اسمتھ اظہار رائے کرتا ہوا لکھتا ہے۔

"اتنے بڑے پرجوش مسلمان فقیر کے مقبرہ میں ہندو اثرات دیکھ کر تعجب ہوتا ہے، عمارت کی پوری ساخت ہندو جذبہ کو ظاہر کرتی ہے"

AKBAR, THEGREAT MUGHAL P.P. 442, 445)

اسی طرح HANELL کی رائے میں فتح پور سیکری کی مسجد مسجد سے زیادہ ونشنو مندر، معلوم ہوتی ہے

(A HANDBOOK OF INDIAN ART P.65)

لباس اور مصوری کو بھی اسی پر قیاس کیجئے، اس "ہندوانہ" رنگ کی بعض مثالیں آگے آتی ہیں

دراکبری کی اس کج روی کا بڑا سبب "علماء سوء" بھی ہیں ان کی آپس کی منافست، دنیا کی محبت اور دین کی سطحی واقفیت نے آگ پر تیل کا کام کیا، یہ علمائے دین کی بزدلی اور فرائض سے غفلت ہی کا نتیجہ تھا، کہ انھوں نے ایک مہمل محضر نامہ پر دستخط کئے

(۹۸۷ھ) اس کا مضمون یہ تھا کہ بادشاہ ظل اللہ ہے، امام عادل ہے، مجتہد العصر ہے، کسی کا پابند نہیں۔ اس کا حکم ہر بات ہے۔ الخ الخ

بے شک خلیفۂ وقت اور اہل حل و عقد کو ضرور حق اجتہاد حاصل ہے، لیکن یہ حق اجتہاد اکبر، جہانگیر، رضا شاہ کمال اتاترک اور امان اللہ جیسے دین سے بے بہرہ فرماں رواؤں کو نہیں دیا جا سکتا۔ اگر ایسے بادشاہوں کو اجتہاد کا منصب عطا کر دیا جائے اور پھر ابتری اور بدامنی عام نہ ہو، تو تعجب ہے۔ اکبری دور کے علماء سوء مخدوم الملک اور عبدالنبی نے محضر پر دستخط کر کے، اپنے کو جس عذاب الیم کا سزاوار بنایا، وہ تو خیر قادر مطلق ہی جانتا ہے، البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سے زیادہ اُس زمانہ کے "علماء سوء" کی نااہلی کا اور کوئی ثبوت نہیں مل سکتا، تاریخ نوائی معاف یا اور سچی بات تو یہ ہے کہ مختلف زمانوں اور ملکوں میں دین پر جتنے صدمے آئے ہیں، وہ سب انہیں علماء سوء کے ہاتھوں اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اکبری فتنہ کی بڑی ذمہ داری ابوالفضل اور فیضی پر نہیں، بلکہ انہیں دنیا کے کتوں پر ہے، جنھوں نے بدنصیبی سے اُس وقت علم دین کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا دور اکبری کے ابن حنبل، مجدد سرہندی بالکل صحیح فرماتے ہیں :-

> ہر فتورے کہ دریں زمانی در ترویج ملت و دین ظاہر گشتہ از شومی علماء سوء است کہ فی الحقیقت شرار مردم و لصوص دین اند، اولئک حزب الشیطان، الا ان حزب الشیطان ھم الخاسرون،، (بحوالہ تذکرہ، ابوالکلام ص۲۱)

یہ محضر نامہ نئے مذہب کے اعلان کی تمہید تھا، آخر ۹۹۰ھ میں "دین الٰہی"، کی تاسیس کا عام اعلان بھی ہو گیا گو چند مقربین بارگاہ کے سوا کسی نے اس سفاہت کا ساتھ نہیں دیا، جیسا کہ ہم ابھی لکھ چکے ہیں، "دین الٰہی" مذہب کے پیرووں کی تعداد بہت محدود رہی لیکن زندگی کے دوسرے شعبے اس فتنہ سامانی سے بُری طرح اثر پذیر ہوئے۔ اسلامی تاریخ کے بدلے تاریخ الٰہی (جلالی سنہ) کا اجرا بھی اسی دور کی بدعت ہے۔ درباری مصنفین اور ان کے شاگردوں اور ان سے متاثر ہونے والوں کو شاید اپنی مسخ شدہ ذہنیت کا احساس بھی نہیں باقی رہا، عام طور پر مسلمان لکھنے والے اپنی کتابیں حمد و نعت سے شروع کرتے ہیں، لیکن دربار اکبری کے فیض یافتہ اور ان کے شاگرد اپنی ہندی کتابوں یا ہندی اور سنسکرت کتابوں کے ترجمے کا آغاز گنیش یا سرسوتی کے "متبرک" ناموں سے کرتے ہیں، ان روشن خیال "سرسوتی نواز" مصنفوں اور مترجموں کا حال ایک واقف کار ہندو اہل قلم کی زبانی سنئے، ڈاکٹر تارا چند فرماتے ہیں :-

> ایک اہم دلچسپی کی چیز فارسی اور ہندی لکھنے والوں کا خالق کے سامنے اظہار عجز و نیاز کا طریقہ ہے یہ قابل توجہ بات ہے کہ جہاں ہندو اور مسلمان، دونوں کی مذہبی روایات خالق کے نام سے آغاز پر زور دیتی ہیں ان مصنفوں کے ہاں، خالق کی حمد مذہب کی بنا پر نہیں ہوتی تھی بلکہ زبان کی بنیاد پر۔ ہندو مسلمان دونوں، جب فارسی میں لکھتے بسم اللہ الرحمن الرحیم سے

شروع کرتے، اور ہندی کتابوں کا آغاز دونوں گنیش، سرسوتی، یا کسی دوسرے ہندو دیوتا کی تعریف سے کرتے۔ پہلی صورت تو عام ہے، دوسری کی چند مثالیں دی جاتی ہیں رحیم MADANA SATAKA کی ابتدا سری گنیش نامہ سے کرتا ہے، جہانگیر کے دور کا ایک انشا پرداز احمد جس نے سمدرک SAMUDRIKA پر ایک کتاب لکھی، اسی کے نقش قدم پر چلتا ہے، احمد اللہ اپنی کتاب سری راجی سہائے سے شروع کرتا ہے، یعقوب خاں اپنی کتاب RASABHUSHANA شروع کرتے ہوئے سری سرسوتی سری رادھا کرشن جی سری گوری شنکر جی تینوں دیوتاؤں کے سامنے سر نیاز خم کرتا ہے الخ

(خطبہ صدارت شعبہ دور مغلیہ، تاریخ کانگریس دسمبر ۲۹ سنہ ۱۹۴۶ء)

تارا چند صاحب نے اور بھی مثالیں دی ہیں، ہم اتنے ہی پر بس کرتے ہیں، ممکن ہے "متحدہ قومیت" اور اکبری راج کے ثنا خوانوں کے نزدیک یہ کوئی مفید اور قابل ذکر نمونہ ہو، پر ہم تو اسے مسلمانوں کے حق میں ذہنی ارتداد سے کم نہیں سمجھتے۔ اکبری دور کی یہی فتنہ سامانی تھی، جس نے مسلمانوں کی اندرونی زندگی کو کھوکھلی کر دی، زندگی کا سارا نظام ہندوانہ سانچے میں ڈھلنے لگا، معروف، اور منکر کا امتیاز جاتا رہا۔ اور خدانخواستہ اگر یہ ارتقاء یا ترقی معکوس برابر جاری رہتی، تو آج ہم آپ اس حال میں نہ ہوتے، ایک ہندوستان ہوتا، جہاں مسلمان نام رکھنے والے بھی خالدؓ اور ابو عبیدہؓ کے بدلے ارجن، اور رام چندر جی کے کارناموں پر فخر کرتے (والعیاذ باللہ) اب تک ہندوستان کی تاریخیں خالص دنیاوی بلکہ غیر اسلامی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں، اور اکبر کو نار و اطور پر اکبر اعظم کا لقب دیا گیا ہے ضرورت ہے کہ مسلمان لکھنے والے اسلامی ہند کی تاریخ کا اسلامی نقطۂ نظر سے مطالعہ کریں، اس طرح پر انہیں معلوم ہوگا کہ اسلامی ہند کی پوری تاریخ میں اکبری راج سے زیادہ تباہ وقت نہیں آیا، اس لئے اگر ہم اسے "دور ضلالت" سے تعبیر کرتے ہیں، تو کوئی زیادتی نہیں کرتے۔

حضرت مجدد سرہندیؒ[1]
۹۷۱ھ م ۱۰۳۴ ہجری

اب ہم اسلامی ہند کے دینی ارتقاء کی تاریخ کے اس نقطہ پر پہونچ گئے ہیں، جہاں سے صحیح اسلامی رہنمائی شروع ہوتی ہے، زمین تپتی ہے تو باران رحمت کا نزول ہوتا ہے، آخر شب کی اندھیاری ہی کے بعد سپیدۂ صبح نمودار ہوتا ہے۔ جب مصیبت حد سے گزر جاتی ہے تو رحمت الہٰی جوش میں آتی ہے۔

اسی طرح جب زندقہ والحاد نے حکومت کی آغوش میں بال و پر نکالنا شروع کئے، اور سچے مسلمانوں پر عرصہ حیات

---

[1] اس مضمون کا حق یہ تھا کہ اس میں حضرت مجددؒ کے مشن اور ان کی خدمات پر تفصیلی گفتگو کی جاتی، لیکن مجدد نمبر کی اشاعت کے بعد یہ تفصیل بیکار معلوم ہوتی ہے، اس لئے ہمارا یہ اب بھی مختصر ہے گا۔

تنگ ہونے لگا، اور ملک کے طول و عرض میں ہر طرف "ظلمات بعضہا فوق بعض" کا منظر نظر آنے لگا، اور ایک نئے احمد بن حنبل کی ضرورت محسوس ہوئی، تو قدرت نے ایک درویش کو خلعت تجدید عطا فرمایا، جس نے بھارت ورش کی بنجر بھومی میں پہلی مرتبہ بھولے بھٹکوں کی صحیح رہنمائی کی، کفر و شرک کی اندھیاری کا فور کی اور بدعات کی شب تار میں سنت و ہدایت کی شمع روشن کی، محمد بن عبداللہ (روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے لائے ہوئے دین کو بت پرستیوں کی آلودگیوں سے پاک کیا، ہندوانہ تصوف کی جگہ توحید خالص کا بول بالا کیا اور شریعت کے دامن سے رفض کا داغ دھونے کی کوشش کی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ افضل الجہاد کی سنت زندہ کی اور "کلمۂ حق" کہہ کر سیکڑوں، ہزاروں، بلکہ پوری قوم کی قوم کے متاع ایمان کی رکھوالی کرلی ——— یہ کون تھا؟ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمہ اللہ تعالے رحمۃ الابرار الصالحین من عبادہ و نوّر ضریحہ۔ حق یہ ہے کہ وہ "مجدد" کہے جانے کے حق دار ہیں، حسین بن علی، احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) اور ابن تیمیہ (م ۷۲۸ھ) نے جو کام اپنے اپنے زمانہ میں انجام دیئے تھے، وہی خدمت اس بوریہ نشین کے حصّہ میں بھی آئی، جسے اس نے انجام دیا اور پورے کرّ و فر کے ساتھ، شان استغفار کے ساتھ، اسی شان محبوبیت کے ساتھ جو ازل سے خاصان خدا کیلئے مقرر ہے۔

حضرت مجدد کی دعوت جہانگیر (۱۰۱۴ھ–۱۰۳۷ھ) کے دور میں سرسبز ہوئی جب کہ وہ "منکرات" کے مٹانے اور بدعات کا قلع قمع کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے، بتعداد خلقت آپ کے ہاتھوں ہدایت پذیر ہوئی، نزدیک اور دور سے لوگ کھنچ کھنچ کر آنے لگے، آپ تو آپ ان کے خلفا کا یہ عالم تھا کہ فوج میں تبلیغ کرتے اور افسر و ماتحت بلا تفریق ان کے ذریعہ ہدایت پاتے،

اول اول تو حکومت وقت نے ان پر توجہ نہ کی، لیکن جب ردّ شیعیت میں ان کی زبان صاف صاف کھلی تو ارکین حکومت میں کھلبلی مچ گئی اور بادشاہ کو طرح طرح سے ان کے خلاف اکسایا گیا۔ . . . . آخر دربار سے طلبی ہوئی . . . . آپ تشریف لائے، شان استغنار کے ساتھ اندر داخل ہوئے اسلام مسنون پر اکتفا کی اور زمانہ کے رواج کے مطابق زمین بوس نہ ہوئے، تو اساطین مملکت بپھر گئے . . . . مجاہد وہاں بھی کلمۂ حق سے باز نہ رہا۔ تقریر کی جس میں بدعات و منکرات کی کھلم کھلا مذمت تھی . . . . نتیجہ ظاہر تھا گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیئے گئے، سنت یوسفی وہاں تازہ ہوگئی، تذکیر و ہدایت شروع ہوئی اور آن کی آن میں قیدخانہ کی کایا پلٹ ہوگئی، اور حیوان نما انسان، انسانوں میں تبدیل ہوگئے، بادشاہ کو اطلاع دی گئی کہ اس قیدی نے تو حیوانوں کو انسان اور انسانوں کو فرشتہ بنا ڈالا، یہ ولی صفت انسان تو قیدخانہ کے قابل نہیں۔ بادشاہ متاثر ہوا اور پایۂ تخت آنے کی دعوت دی، ولی عہد شہزادہ خرم نے استقبال کیا، خود بادشاہ نے خوش آمدید کہا اور معذرت کی۔ موقع غنیمت تھا، مجاہد نے اپنا فرض ادا کیا، اور مندرجہ ذیل امور کے نفاذ اور ان پر عمل کا

مطالبہ کیا:۔

(۱) بادشاہ کے لیئے سجدہ تعظیمی کی یک قلم موقوفی

(۲) گائے ذبح کرنے کی اجازت

(۳) بادشاہ اور ارکین دولت پر باجماعت نماز کی پابندی،

(۴) عہدۂ قضا اور شرعی احتساب کے محکمہ کی تجدید،

(۵) تمام بدعات اور شرعی منکرات کا قلع قمع،

(۶) غیر شرعی قوانین کی منسوخی،

(۷) شکستہ اور منہدم مسجدوں کی دوبارہ تعمیر

شاہی حکم نافذ ہوا اور نصف صدی کی گھٹا ٹوپ اندھیاری کے بعد ایک مرتبہ پھر اسلام کو اس ملک میں سربلندی حاصل ہوئی اور عام مسلمان اس تبدیلی سے مسرور اور مطمئن ہو گئے،

حضرت مجدد کی خدمات کہاں تک گنائی جائیں، دین اور دینی اصلاح کا ہر شعبہ ان کی افادات کا مرہون منت ہے، ایک طرف اکبر، درو اختش، میں ان کے کارنامے آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں، تو دوسری طرف شریعت اور ہندوانہ تصوف کی باہمی کشمکش بھی انھیں کے ہاتھوں دور ہوئی، انھوں نے اس "باطل" تصوف کی اصلاح کی اتباع سنت پر زور دیا، اور لوگوں کو کتاب وسنت کے چشمۂ صافی کی طرف واپس لانے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔

عاجز کے نزدیک ان کا ایک بڑا تجدیدی کارنامہ بدعت حسنہ" کی پردہ دری ہے، دوسری تیسری صدی ہجری ہی سے علماء سوء، اور نام نہاد صوفیہ اپنی نت نئی بدعتوں کی پردہ پوشی "بدعت حسنہ" کے خوبصورت اور جاذب اصطلاح سے کیا کرتے تھے، کسی حکم پر حرف گیری کرنا جواب ملے گا "بدعت حسنہ" ہے، کسی بدعت پر تنبیہ کرو فوراً حسنہ" کی مہر سامنے آجائے گی، اللہ اللہ، رسول امی صلی اللہ علیہ وسلم کا تو ارشاد ہو:۔ من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منه فھو رد لیکن علماء سوء ہیں کہ دین کے اندر بدعات کا انبار لگاتے جا رہے ہیں، اور پوچھو تو ایک جواب:۔ بدعت حسنہ، حقیقت یہ ہے کہ دین کے اندر جو اضافہ کیا جائے وہ بدعت ہے اور اس لیئے ضلالت بھی ہے، حسنہ اور سیئہ کی کوئی تفریق نہیں ——— میں "دین کے اندر" کہہ رہا ہوں، رسول کریم (فداہ ابی و امی صلی اللہ علیہ وسلم نے "فی امرنا ھذا" فرمایا ہے۔ لباس طعام، اٹھنے بیٹھنے کے آداب اور طریقوں کا سوال نہیں، البتہ ان جدتوں اور نوتراشیدہ رسوم سے ہے، جو دین اور دینی اعمال کے اندر پیدا کرلی گئی ہیں، وہ کسی حال میں حسنہ نہیں ہو سکتیں مجدد صاحب کا احسان ہے کہ انھوں نے اس کفرزار میں پہلی مرتبہ اس بدعت کا راز فاش کیا، انھوں نے صاف صاف فرمایا:۔

النصیحة هی الدین ومتابعة سید المرسلین علیه وعلیهم الصلوة والسلام وامیان السنة السنیه والاجتناب عن البدعة اللامرضیة وان کانت البدعة تری مثل فلق الصبح لانه فی الحقیقة لا نور فیها ولا ضیاء ولا لعلیل منها شفاء ولا لداء منها دواء کیف والبدعة اما رافعة للسنة او ساکتة عنها والساکتة لابد ان تکون زائدة علی السنة فتکون ناسخة لها فی الحقیقة ایضا لان الزیادة علی النص نسخ له فالبدعة کیف کانت تکون رافعة للسنة نقیضة لها فلا خیر فیها ولا حسن فیها لیت شعری من این حکموا بحسن البدعة المحدثة فی الدین الکامل الخ

(مکتوب ۱۹، حصہ ششم دفتر دوم)

سچ کہا حضرت مجددؒ نے معلوم نہیں، ان لوگوں نے (دین کامل کے اندر) اختراع کردہ بدعتوں کی بہتری اور اچھائی کا حکم کہاں سے لگا دیا؟

بدعت حسنہ (؟) کی پردہ دری میں مجدد صاحب کے اقوال اس درجہ صاف اور واضح ہیں کہ کسی تاویل کی گنجائش نہیں[1] لیکن کتنے ہیں جو مجدد صاحب کی پیروی اور عقیدت کا دم بھرتے ہوئے بھی اس میں لت پت نہیں؟ اللہ ہم سب کو سچائیوں کے پہچاننے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق دے۔

شیخ عبدالحق دہلوی
۹۵۸ھ - م ۱۰۵۲ھ

مجدد صاحب کے کارناموں کے ساتھ ساتھ ان کے معاصر شیخ عبدالحق رحمہ محدث دہلوی کی خدمات کا ذکر بھی ضروری ہے، ان کی ذات سے شمالی ہندوستان میں علم حدیث کو زندگی ملی، اور سنت نبوی کا خزانہ ہر خاص و عام کے لیئے عام ہوگیا، ہمارے نزدیک حدیث کی خدمت اور کتب حدیث کی مزاولت خود بخود دین کی سچی روح سے قریب کرتی ہے، اگلے "علماء" اور صوفی بس متاخرین کی فقہ اور معقولیت میں الجھ کر رہ گئے اور کم از کم شمالی ہند میں حدیث کا عام چرچا نہ ہوسکا، بد دینی اور بدعقیدگی کا بڑا سبب یہی ہے۔ شیخ عبدالحق نے اس جہل کے دور کرنے کی کوشش کی، اور اس لیئے ہم آج ان کے شکرگزار ہیں اور ان کی علمی خدمات کا دل سے اعتراف کرتے ہیں،

شیخ کی تصنیفات بہت ہیں، فقہا اور صوفیہ دونوں ان کی شان میں رطب اللسان ہیں، معاصرت کی وجہ سے حضرت مجدد رحمہ اور شیخ کے درمیان کچھ غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں، جو بشریت کا تقاضا ہے اور ہر زمانہ میں

---

[1] بدعت حسنہ (؟) کی مذمت میں مکتوبات کا ذخیرہ بے پایاں ہے "الفرقان" کے مجدد نمبر میں جا بجا اقتباسات آئے ہیں،
(ملاحظہ ہو: صفحات ۴۶، ۴۷، ۵۹، ۳۰۲، ۳۶۴)

ہوتا آیا ہے، شمس الدین سخاوی (م ۹۰۲ھ) اور جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ) دونوں ایک دوسرے کو اپنی تالیفات میں اس طرح یاد کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے، یہاں معمولی سوء تفاہم، ہوا تھا جو بعد کو رفع ہوگیا، اور تعلقات استوار ہوگئے، اور دونوں خاندانوں کے اتحاد کو اصلاح و تجدید کے کاموں کو بڑی تقویت پہونچی۔

عالمگیر اورنگ زیب
۱۰۶۸ — ۱۱۱۸ ہجری

یوں تو جہانگیر (م ۱۰۳۶ھ) ہی کے آخر دور سے حکومت مغلیہ کی پالیسی میں نمایاں تبدیلی پیدا ہو چکی تھی، اور شاہ جہاں (۱۰۳۷ — ۱۰۶۸ھ) کے زمانہ میں مسلمانوں کو اپنے مذہبی معاملات میں پوری آزادی حاصل رہی، نیز بادشاہ کے ستھرے ذوق کے طفیل، کم از کم تعمیر اور فنون لطیفہ سے ہندوانہ اثرات زائل ہونے لگے، شاہجہاں کے زمانے کی عمارتیں ایرانی اور ہندی فنون (آرٹ) کے امتزاج کا اچھا نمونہ ہیں اسی طرح روزمرہ کی زندگی میں بھی اعتدال پیدا ہونے لگا........ پر ایک ایسے فرماں روا کی ضرورت باقی تھی جو اکبر کی پیدا کی ہوئی بیماریوں کا مداوا ہوسکے، اکبر اور اس کے حواری سالہا سال تک فتنہ الٰہیہ کی آبیاری کرتے رہے، ان کی ذہنی اور قلبی بیماریوں کے جراثیم معاشرت اور سماج کے رگ و پے میں سرایت کر چکے تھے ان جراثیم کے دفعیہ اور شجرۂ خبیثہ کے بیخ و بن سے اکھاڑنے کیلئے بھی ایک صاحب عزم اور صاحب فہم، گلیم پوش سلطان کی ضرورت تھی، جو الحمد للہ ابو المظفر محی الدین عالمگیر (اللہ اس کی لحد پر جنت کے پھول برسائے) کی تخت نشینی سے پوری ہوگئی تخت نشینی کیا تھی ایک مسلسل جہاد کا عزم ایک نہ ختم ہونے والی جد و جہد کا آغاز دارا شکوہ اور عالمگیر کی آویزش صرف دو بھائیوں کی آویزش نہ تھی، صرف ملک گیری کی لڑائی نہ تھی، یہ دو مختلف اصولوں کی جنگ تھی، دو فکر (IDEOLOGY) کی کشمکش تھی، ایک اپنے پردادا کے طور طریقے زندہ کرنا چاہتا تھا، دوسرا اپنے پیغمبر اور ہادی (صلے اللہ علیہ وسلم) کی سنت پر فریفتہ تھا، کہتے ہیں کہ اگر دارا شکوہ بادشاہ ہوتا، تو آج مغلیہ حکومت زندہ رہتی، ہوسکتا ہے کہ زندہ رہتی (سردست ہم اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے) پر اسلام کا اس دیس سے جنازہ نکل چکا ہوتا...... سچی بات یہ ہے کہ اسلامی ہند کی کوئی تاریخ اس بوریہ نشین شہنشاہ کے کارناموں کے بغیر مکمل نہیں کہی جاسکتی، یہ پہلا بادشاہ تھا — (اگر ہم تغلق خاندان کے بعض فرماں رواؤں کو الگ کر دیں) جس نے بتوں کی اس سرزمین میں دین حنیفی کو تقویت دی، بدعات اور منکرات کا قلع قمع کیا اور پہلی مرتبہ اس ملک کے مسلمانوں کو فرماں روا قوم کے فرد کی حیثیت دی۔

امام ولی اللہ دہلوی
۱۱۱۴ — ۱۱۷۶ ہجری

ایک طرف چھ سات سو سال کی گمراہیاں تھیں، دوسری طرف ایک فقیر اور ایک شہنشاہ کی مجاہدانہ کوششیں، یہ کوششیں اپنی جگہ پر آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہیں اور اگر عالمگیر کے جانشین لائق اور صاحب عزیمت ہوتے، تو یقینی یہ کوششیں برگ و بار لاتیں اور ان کے اچھے ثمرات ظاہر ہوتے، لیکن وہ جو کہ ہند میں ملت کے ناموس کا آخری نگہبان تھا، اس کے جانشین ایسے کمزور اور بودے ثابت ہوئے کہ آن کی آن میں حکومت ڈانوا ڈول ہونے لگی اور فتنوں نے پھر از سر نو سر اٹھایا..... حسب دستور

بدعات کی گرم بازاری شروع ہو گئی۔ ہندوانہ چلن، جو حضرت مجدد اور سلطان عالمگیر کی جد و جہد سے مٹنے لگے تھے پھر رواج پانے لگے، شیعیت، آخری کمزور بادشاہوں کی آغوش میں، پھر سر چڑھنے لگی، یہ تو عام فضا تھی "خواص" یعنی اہل دین اور اصحاب مسند کا حال اور بُرا تھا۔ صاف صاف کہتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے، پر موقع ایسا آپڑا ہے کہ بے کہے بھی رہا نہیں جاتا۔ .... نام نہاد فقراء اور صوفیہ فقر کی بساط بچھا کر سادہ لوح مسلمانوں کے مال اور ایمان پر ڈاکہ ڈال رہے ہیں، مدرسوں میں ابھی تک ارسطو کی سڑی ہوئی لاش پر عمل جراحی جاری ہے شمس بازغہ اور قاضی مبارک کی دھوم ہے، قرآن کریم اور حدیث رسول کی کانوں میں بھنک پڑ جائے، تو خیر حرج نہیں؛ لیکن ان کی تحصیل میں عمر عزیز کے کچھ حصے نذر کیے جائیں، یہ ناممکن!! بڑے بڑے "علما" کے خانوادے "مشکوٰۃ شریف" اور مشارق الانوار پڑھانا کافی خیال کرتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پیر مجدد رحمہ اللہ تعالیٰ اور شیخ عبدالحق کی ترغیب و تحریض کے فیض سے کوئی جماعت اگر یکسر محروم رہی ہے، تو انھیں اہل مدرسہ کی۔ اہل فتوے کا حال نہ پوچھیے، ان کے ہاں بس متاخرین کے مدون کردہ فقہ اور فتاوی کی گویا پرستش ہونے لگی، کیا مجال کہ ابن نجیم (م ۹۷۰ھ) اور ملا علی قاری (م ۱۰۱۴ھ) کے کسی فتوے یا قول سے آپ اختلاف رائے کا اظہار کر سکیں، اور اگر کسی سر پھرے نے کبھی ایسی جرأت کی تو وہ وہابی مبتدع، غیر مقلد، ...... اور دوسری "شرعی" گالیوں کا مستحق ٹھہرا۔

آپ پوچھیں گے کہ اس بزم میں کتاب ربانی کا کیا حال تھا؟ تو سچی بات تو یہ ہے کہ آج تک سننے میں نہیں آیا، کہ ان "اہل مدرسہ" کے ہاں کتاب عزیز کبھی بار پاتی تھی، اور واقعی ان بیچاروں کو "علوم الٰہیہ" سے اتنی فرصت کہاں ملتی تھی، کہ وہ کلام الٰہی کی طرف توجہ کرتے پورے "درس نظامی" میں اگر کوئی کتاب واقعی درس سے خارج تھی تو یہی کتاب ربانی، جسے قرآن کریم کہا جاتا ہے، جس پر ہم آپ ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ......

یہ تو علماء اور اصحاب درس کی حالت تھی، عوام اور متوسط طبقہ کی حالت اور دردناک تھی، ایک غیر مسلم بصر کے الفاظ میں فی الجملہ اسلام کی جان نکل چکی تھی اور محض بے روح رسمیات اور مبتذل توہمات کے سوا کچھ نہ رہا تھا، اگر محمد صلے اللہ علیہ وسلم پھر دنیا میں آتے تو وہ اپنے پیروں کے ارتداد اور بت پرستی پر بیزاری کا اظہار فرماتے۔[۲]

جدید دنیائے اسلام مصنفہ STODDARD

(مترجمہ جمیل الدین صاحب بدایونی)

---

[۱] یہ نام محض تمثیلاً لیے گئے ہیں، شکوہ ان کتابوں یا مصنفوں سے نہیں، شکوہ ان پر قرآن کریم کی طرح عمل کرنے والوں سے ہے ۱۲

[۲] اسٹاڈرڈ نے اپنی کتاب میں اٹھارھویں صدی عیسوی کی اسلامی دنیا کا جامع اور پر درد نقشہ کھینچا ہے۔ امیر شکیب ارسلان کے بقول میں کوئی حاذق مسلمان بھی اس سے زیادہ صحیح تصویر نہیں کھینچ سکتا تھا۔ سیرت سید احمد شہید (ص ۵۱-۵۰) میں سٹاڈرڈ کا پورا اقتباس درج ہے۔ طوالت یہاں درج کرنے سے مانع ہے۔ ۱۲

یہ پُرآشوب زمانہ تھا، اور یہ دردناک حالات تھے کہ غیرت حق کو حرکت ہوئی وقت آیا کہ از سرِ نو پیامِ محمدی کی تجدید ہو، مسجد نبوی (مدینہ منورہ) کے دو طالب علم خاص طور پر اس منصب سے نوازے گئے۔ ان میں ایک ہندی نژاد تھا، دوسرا نجد کا بادیہ نشین، آپ سمجھے؟ یہ طالب علم کون تھے، نجد کا بادیہ نشین محمد بن عبد الوہاب (و ۱۱۱۵ھ ـ م ۱۲۰۶ھ) اور ہندی نژاد ولی اللہ بن عبد الرحیم دہلوی (و ۱۱۱۴ھ ـ م ۱۱۷۶ھ) ـ یہ دونوں کیا تھے؟ انھوں نے کیا کیا؟ اس کی تفصیل ضخیم جلدوں کی محتاج ہے، ہم اتنا جانتے ہیں کہ آج[لہ] ہندوستان میں ایمان اور علم دین کی جو کچھ بری بھلی متاع ہمارے پاس موجود ہے وہ سب امام ولی اللہ اور ان کے جانشینوں کا صدقہ ہے اور اس دیس میں آج جہاں کہیں بھی علم اور معرفت کی سبیل جاری ہے سب کا منبع وہی ذات گرامی ہے، جس کی یاد تازہ کرنے کے لیئے آج کی صحبت مرتب کی گئی ہے اور جس کی خدمت میں اس وقت ہم آپ اپنے علم اور حوصلہ کے مطابق اپنی عقیدت اور محبت کی نذر پیش کر رہے ہیں۔

راقم کے ذمہ امام ولی اللہ سے پہلے اسلامی ہند کی دینی تاریخ کا اجمالی خاکہ پیش کرنا تھا مقدور بھر اس نے اپنا فرض ادا کرنے کی کوشش کی ہے، اگر خامی رہ گئی ہو تو یہ اس کے علم کا قصور ہے، اور اگر لہجہ میں کہیں تلخی ہو تو یہ شدت احساس کا نتیجہ ہے، جس کے لیئے معذرت کی ضرورت نہیں،

نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

لہ اسی طرح شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب کے مجاہدانہ اور مجددانہ کارنامے بھی کچھ کم اہم نہیں، راقم شیخ الاسلام کی مفصل سیرت لکھ رہا ہے، جو انشاء اللہ اپنے موضوع پر جامع چیز ہوگی۔

منصبِ تجدید کی حقیقت

اور

تاریخ تجدید میں حضرت شاہ ولی اللہ کا مقام

(از جناب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مدیر ترجمان القرآن لاہور)

[یہ مقالہ مولانا نے شاہ ولی اللہ نمبر ہی کے لیے لکھا تھا نمبر کے پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے بعد موصوف نے نظر ثانی فرما کر اس میں کہیں کہیں کچھ جزوی ترمیم بھی فرمائی ہے اب اس دوسرے اڈیشن میں یہ اُن ترمیمات کے ساتھ ہی شائع کیا جا رہا ہے۔ ("مدیر")]

اسلام کی اصطلاحی زبان کے جو الفاظ کثرت سے زبانوں پر آتے ہیں اُن میں سے ایک لفظ "مجدد" بھی ہے، اس لفظ کا ایک مجمل مفہوم تو قریب قریب ہر شخص سمجھتا ہے، یعنی یہ کہ جو شخص دین کو از سر نو زندہ اور تازہ کرے وہ مجدد ہے، لیکن اس کے تفصیلی مفہوم کی طرف بہت کم ذہن منتقل ہوتے ہیں۔ کم لوگ جانتے ہیں کہ تجدید (Revival) کی حقیقت کیا ہے، کس نوعیت کے کام کو تجدید سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اس کام کے کتنے شعبے ہیں، مکمل تجدید کا اطلاق کس کارنامے پر ہو سکتا ہے اور جزوی تجدید کیا چیز ہے۔ اسی ناواقفیت کا نتیجہ ہے کہ لوگ اُن مختلف بزرگوں کے کارناموں کی بھی پوری طرح تشخیص نہیں کر سکتے جن کو تاریخ اسلام میں مجدد قرار دیا گیا ہے۔ وہ بس اتنا ہی جانتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز بھی مجدد، امام غزالی بھی مجدد، ابن تیمیہ بھی مجدد، شیخ احمد سرہندی بھی مجدد اور شاہ ولی اللہ بھی مجدد۔ مگر ان کو یہ معلوم نہیں کہ کون کس حیثیت سے مجدد ہے اور اس کا تجدیدی کارنامہ کس نوعیت اور کس مرتبہ کا ہے۔ اس ذہول و غفلت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ جن ناموں کے ساتھ "حضرت"، "امام"، "حجۃ الاسلام"، "قطب العارفین"، "زبدۃ السالکین" اور اسی قسم کے الفاظ لگ جاتے ہیں ان کی عقیدت مندی کا اتنا بوجھ دماغوں پر پڑ جاتا ہے کہ پھر کسی میں یہ طاقت نہیں رہتی کہ آزادی کے ساتھ ان کے کاموں کا جائزہ لے کر ٹھیک ٹھیک

مشخص کرسکے کہ کس نے اس تحریک کے لیے کتنا اور کیسا کام کیا ہے، اور اس خدمت میں اس کا حصہ کس قدر ہے۔ عموماً تحسین کی بنی تلی زبان کے بجائے ان بزرگوں کے کارنامے عقیدت کی شاعرانہ زبان میں بیان کیے جاتے ہیں جن سے پڑھنے والے پر یہ اثر پڑتا ہے، اور شاید لکھنے والے کے ذہن میں بھی یہی ہوتا ہے کہ جس کا ذکر کیا جارہا ہے وہ مرد کامل تھا اور اس نے جو کچھ بھی کیا وہ ہر حیثیت سے کمال کے آخری درجہ پر پہونچا ہوا تھا۔ حالانکہ اگر اب ہم کو تحریک اسلامی کی تجدید و احیاء کیلئے کوشش کرنی ہو تو اس قسم کی عقیدت مندی اور اس ابہام و اجمال سے کچھ کام نہ چلے گا۔ ہم کو پوری طرح اس تجدید کے کام کو سمجھنا پڑے گا اور اپنی پچھلی تاریخ کی طرف پلٹ کر دیکھنا ہوگا کہ ان بہت سی صدیوں میں ہمارے مختلف لیڈروں نے کتنا کتنا کام کس کس طرح کیا ہے، اُن کے کارناموں سے ہم کس حد تک فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اور ان سے کیا کچھ چھوٹ گیا ہے جس کی تلافی پر اب ہمیں متوجہ ہونا چاہیئے۔

یہ مضمون ایک مستقل کتاب چاہتا ہے۔ مگر کتاب لکھنے کی فرصت کہاں۔ یہی غنیمت ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب کا ذکر خیر چھڑ گیا، جس کی وجہ سے اس مضمون کی طرف چند اشارے کرنے کا موقع نکل آیا، شاید کہ انہی اشاروں سے کسی اللہ کے بندے کو تاریخ تجدید و احیاء دین کی تدوین کا راستہ مل جائے۔

اسلام اور جاہلیت کی اصولی و تاریخی کشمکش

تجدید کی حقیقت و نوعیت سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اسلام اور جاہلیت کی اصولی اور تاریخی کشمکش کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے، کیونکہ تجدید دراصل نام ہے جاہلیت کے ہجوم سے اسلام کو نکال کر از سر نو چمکا دینے کا۔ پس آدمی نہ تو تجدید کو جان سکتا ہے نہ کسی مجدد کے کام کو پرکھ سکتا ہے جب تک کہ ان دونوں متصادم قوتوں کو اور ان کی کشمکش کو واضح طور پر نہ سمجھ لے۔

دنیا میں انسان کی زندگی کے لیے جو نظام بھی بنایا جائے گا اس کی ابتدا لامحالہ مابعد الطبیعی یا الٰہیاتی مسائل سے ہوگی۔ زندگی کی کوئی اسکیم بن نہیں سکتی جب تک کہ انسان کے متعلق اور اس کائنات کے متعلق جس میں انسان رہتا ہے، ایک واضح اور متعین تصور نہ قائم کرلیا جائے۔ یہ سوال کہ انسان کا برتاؤ یہاں کیا ہونا چاہیئے اور کس طرح اُسے اس دنیا میں کام کرنا چاہیئے، دراصل اس سوال سے گہرا تعلق رکھتا ہے کہ انسان کیا ہے، اس کائنات میں اس کی حیثیت کیا ہے، اور اس کائنات کا نظام کس ڈھنگ کا ہے جس سے انسان کی زندگی کے ڈھنگ کو ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔ اس سوال کا جو حل بھی تجویز کیا جائے گا اُسی کے لحاظ سے اخلاق کا ایک نظریہ قائم ہوگا، پھر اُسی نظریہ اخلاق کی نوعیت کے مطابق انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کی تشکیل ہوگی، پھر اسی سانچے کے اندر انفرادی سیرت و کردار اور اجتماعی تعلقات و معاملات کے قوانین اپنی تفصیلی صورتیں اختیار کریں گے، اور آخر کار تمدن کی پوری عمارت انہی بنیادوں پر تعمیر ہوگی۔ دُنیا میں اس وقت تک انسانی زندگی کے لیے جتنے مذہب و مسلک بھی بنے ہیں ان سب کو بہرحال اپنا ایک بنیادی

فلسفہ اور ایک اساسی نظریۂ اخلاق مرتب کرنا پڑتا ہے اور اصول سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے جزئیات تک میں ایک مسلک کو دوسرے مسلک سے جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ یہی فلسفہ اور یہی اخلاقی نقطۂ نظر ہے، کیونکہ ہر دستور زندگی کا مزاج اسی چیز کی طبیعت کے مطابق بنتا ہے اور یہ اس کے قالب میں روح کی حیثیت رکھتی ہے۔

جزئیات و فروع سے قطع نظر، اصولی حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو انسان اور کائنات کے متعلق چار ہی مابعد الطبیعی نظریے قائم ہو سکتے ہیں اور دنیا میں جتنے دستور زندگی پائے جاتے ہیں انھوں نے انہی چار میں سے کسی ایک کو اختیار کیا ہے:

جاہلیت خالصہ | ایک نظریہ یہ ہے کہ کائنات کا یہ سارا نظام ایک اتفاقی ہنگامۂ وجود و ظہور ہے جس کے پیچھے کوئی حکمت، کوئی مصلحت اور کوئی مقصد کارفرما نہیں ہے، یونہی بن گیا ہے، یونہی چل رہا ہے، اور یونہی بے نتیجہ ختم ہو جائے گا، اس کا کوئی خدا نہیں ہے، اور اگر ہے تو اس کے ہونے یا نہ ہونے کا انسان کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ انسان ایک قسم کا جانور ہے جو دوسری چیزوں کی طرح شاید اتفاقاً یہاں پیدا ہو گیا ہے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ اس کو کس نے پیدا کیا اور کس لئے پیدا کیا۔ ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہ اس زمین پر پایا جاتا ہے، کچھ خواہشیں رکھتا ہے جنھیں پورا کرنے کیلئے اس کی طبیعت اندر سے زور کرتی ہے، کچھ قوتیں اور کچھ آلات رکھتا ہے جو ان خواہشوں کی تکمیل کا ذریعہ بن سکتی ہیں، اور اپنے گرد و پیش زمین کے دامن پر بہت سا سامان پھیلا ہوا دیکھتا ہے جن پر وہ اپنے ان قویٰ اور آلات کو استعمال کر کے اپنی خواہشوں کی تکمیل کر سکتا ہے۔ لہٰذا اس کی زندگی کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ اپنی طبع حیوانی کے مطالبات پورے کرے، اور اس کی انسانی استعدادوں کا مصرف اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ان مطالبات کو پورا کرنے کے بہتر سے بہتر ذرائع فراہم کرے۔ انسان سے مافوق کوئی علم کا منبع اور ہدایت کا سرچشمہ موجود نہیں ہے جہاں سے اس کو اپنی زندگی کا قانون مل سکتا ہو، لہٰذا اس کو اپنے گرد و پیش کے آثار و احوال سے اور اپنی تاریخ کے تجربات سے خود ہی ایک قانون عمل اخذ کرنا چاہئے۔ بظاہر کوئی ایسی حکومت نظر نہیں آتی جس کے سامنے انسان جواب دہ ہو، اس لئے انسان بجائے خود ایک غیر ذمہ دار ہستی ہے، اور اگر یہ جواب دہ ہے بھی تو آپ اپنے ہی سامنے ہے، یا اس اقتدار کے سامنے جو خود انسانوں ہی میں سے پیدا ہو کر افراد پر مستولی ہو جائے۔ اعمال کے نتائج جو کچھ بھی ہیں اسی دنیوی زندگی کی حد تک ہیں۔ اس کے ماسوا کوئی زندگی نہیں ہے لہٰذا صحیح اور غلط، مفید اور مضر، قابل اخذ اور قابل ترک ہونے کا فیصلہ صرف ان ہی نتائج کے لحاظ سے کیا جائے گا جو اس دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں۔

انسان جب جاہلیت محضہ کی حالت میں ہوتا ہے، یعنی جب اپنے محسوسات سے ماوراء کسی حقیقت تک وہ نہیں پہونچتا یا بندگی نفس کی وجہ سے نہیں پہونچنا چاہتا تو اس کے ذہن پر یہی نظریہ حاوی ہوتا ہے۔ دنیا پرستوں نے ہر زمانہ میں یہی نظریہ اختیار کیا ہے۔ قلیل مستثنیات کو چھوڑ کر بادشاہوں نے، امیروں نے، درباریوں اور ارباب حکومت نے

خوش حال لوگوں اور خوش حالی کے پیچھے جان دینے والوں نے عموماً اسی نظریہ کو ترجیح دی ہے، اور جن قوموں کی تمدنی ترقی کے گیت تاریخ میں گائے جاتے ہیں، بالعموم ان سب کے تمدن کی جڑ میں یہی نظریہ کام کر رہا ہے، موجودہ مغربی تمدن کی بنیاد بھی یہی نظریہ ہے۔ اگرچہ اہل مغرب سب کے سب خدا اور آخرت کے منکر نہیں ہیں، نہ علمی حیثیت سے سب مادہ پرستانہ اخلاق کے قائل ہیں، لیکن جو روح ان کے پورے نظام تہذیب و تمدن میں کام کر رہی ہے وہ انکار خدا و آخرت اور اسی مادہ پرستانہ اخلاق ہی کی روح ہے، اور وہ کچھ اس طرح ان کی زندگی میں پیوست ہوگئی ہے کہ جو لوگ علمی حیثیت سے خدا اور آخرت کے قائل ہیں اور اخلاق میں ایک غیر مادہ پرستانہ نقطۂ نظر اختیار کرتے ہیں، وہ بھی غیر شعوری طور پر اپنی عملی زندگی میں دہریہ اور مادہ پرست ہی ہیں، کیونکہ اُن کے علمی نظریہ کا ان کی عملی زندگی سے بالفعل کوئی ربط قائم نہیں ہے۔ ایسی ہی کیفیت ان سے پہلے کے مترفین اور خدا فراموش لوگوں کی بھی تھی۔ بغداد، دمشق، دہلی، اور غرناطہ کے مترفین مسلمان ہونے کی وجہ سے خدا اور آخرت کے منکر نہ تھے، مگر ان کی زندگی کا سارا پروگرام اس طرح بنا تھا کہ گویا نہ خدا ہے، نہ آخرت ہے، نہ کسی کو جواب دینا ہے، نہ کہیں سے ہدایت لینی ہے، جو کچھ ہیں ہماری خواہشات ہیں، ان خواہشات کی تکمیل میں ہر قسم کے ذرائع اور ہر قسم کے طریقے اختیار کرنے کیلئے ہم آزاد ہیں اور دنیا میں جینے کی جتنی مہلت ملتی ہے اس کا بہترین مصرف بس یہ ہے کہ:

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

جیسا کہ اوپر میں نے اشارہ کیا، اس نظریہ کی عین فطرت یہی ہے کہ اس کی بنیاد پر ایک خالص مادہ پرستانہ نظام اخلاق بنتا ہے، خواہ کتابوں میں مدون ہو یا صرف ذہنیتوں ہی میں مرتب ہو کر رہ جائے۔ پھر اسی ذہنیت سے علوم و فنون اور افکار و آداب کی آبیاری ہوتی ہے اور پورے نظام تعلیم و تربیت میں الحاد و مادیت کی روح سرایت کر جاتی ہے، پھر انفرادی سیرتیں اسی سانچے میں ڈھلتی ہیں، انسان اور انسان کے درمیان تعلقات و معاملات کی تمام صورتیں اسی نقشہ پر بنتی ہیں، اور قوانین کا نشو و نما اسی ڈھنگ پر ہوتا ہے۔ پھر اس طرز کی سوسائٹی میں سطح پر وہ لوگ ابھر کر آتے ہیں جو سب سے زیادہ مکار، بددیانت، جھوٹے، دغاباز، سنگ دل اور خبیث النفس ہوتے ہیں تمام سوسائٹی کی سیادت و قیادت اور مملکت کی زمام کار انہی کے ہاتھوں میں ہوتی ہے اور وہ شتر بے مہار کی طرح ہر حساب سے بے خوف اور ہر مواخذہ سے بے پروا ہو کر خلق خدا پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ میکیاولی (Machiavelli) کے اصول سیاست پر ان کی ساری حکمت عملی مبنی ہوتی ہے۔ ان کی کتاب آئین میں زورکا نام حق اور بے زوری کا نام باطل ہوتا ہے۔ جہاں کوئی مادی رکاوٹ حائل نہیں ہوتی وہاں کوئی چیز ان کو ظلم سے نہیں روک سکتی۔ یہ ظلم مملکت کے دائرے میں یہ شکل اختیار کر لیتا ہے کہ شاطر طبقے اپنی ہی قوم کے کمزور طبقوں کو کھاتے اور دباتے ہیں۔ اور مملکت کے باہر اس کا ظہور قوم پرستی، امپیریلزم اور ملک گیری و اقوام کشی کی صورت میں ہوتا ہے۔

جاہلیت مشرکانہ

دوسرا ما بعد الطبیعی نظریہ یہ ہے کہ کائنات کا نظام اتفاقی تو نہیں ہے اور نہ بے خداوند ہے مگر اس کا ایک خداوند (Master) نہیں بلکہ بہت سے خداوند ہیں۔ یہ خیال چونکہ کسی علمی ثبوت (Scientific Proof) پر مبنی نہیں ہے بلکہ محض خیال آرائی پر اس کی بنا ہے، اس لیے موہوم، محسوس اور معقول اشیاء کی طرف خداوندی و الٰہیت کو منسوب کرنے میں مشرکین کے درمیان نہ کبھی اتفاق ہو سکتا ہے نہ کبھی ہوا ہے۔ اندھیرے میں بھٹکنے والوں کا ہاتھ جس چیز پر بھی پڑ گیا وہ خدا بنا لی گئی اور خداؤں کی فہرست ہمیشہ گھٹتی بڑھتی رہی، فرشتے، جن، ارواح، سیارے، زندہ اور مردہ انسان، درخت، پہاڑ، جانور، دریا، زمین، آگ، اور معانی مجردہ، مثلاً محبت، حسن، شہوت، قوت تخلیق، بیماری، جنگ، بھکمری وغیرہ اور خیالی مرکبات مثلاً شیر انسان، ماہی انسان، پرند انسان، چہار سرا، ہزار دستہ، خرطوم بینی وغیرہ مشرکین کے معبودوں میں جگہ پاتے رہے ہیں۔ پھر اس دیومالا کے گرد اوہام و خرافات (Mythology) کا ایک عجیب طلسم ہوشربا تیار ہوا ہے جس میں ہر جاہل قوم کی قوت واہمہ نے اپنی شادابی و نادرہ کاری کے وہ وہ دلچسپ نمونے فراہم کیے ہیں کہ دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ جن قوموں میں خداوند اعلیٰ یعنی اللہ کا تصور نمایاں پایا گیا ہے، وہاں تو خدائی کا انتظام کچھ اس طرز کا ہے گویا اللہ تعالیٰ بادشاہ ہے اور دوسرے خدا اس کے وزیر، درباری، مصاحب، عہدہ دار اور اہلکار ہیں، مگر انسان بادشاہ سلامت تک راہ نہیں پا سکتا اس کے سارے معاملات ماتحت خداؤں ہی سے وابستہ رہتے ہیں۔ اور جن قوموں میں خداوند اعلیٰ کا تصور بہت دھندلا یا تقریباً مفقود ہے، وہاں ساری خدائی ارباب متفرقین ہی میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے۔

جاہلیت خالصہ کے بعد یہ دوسری قسم کی جاہلیت ہے جس میں انسان قدیم ترین زمانے سے آج تک مبتلا ہوتا رہا ہے، اور ہمیشہ گھٹیا درجہ کی دماغی حالت ہی میں یہ کیفیت رونما ہوئی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کے اثر سے جہاں لوگ اللہ واحد قہار کی خدائی کے قائل ہو گئے۔ وہاں سے خداؤں کی دوسری اقسام تو رخصت ہو گئیں، مگر انبیاء، اولیاء، شہداء، صالحین، مجاذیب، اقطاب، ابدال، علماء، مشائخ اور ظل اللّٰہیوں کی خدائی، پھر بھی کسی نہ کسی طرح عقائد میں اپنی جگہ نکالتی ہی رہی۔ جاہل دماغوں نے مشرکین کے خداؤں کو چھوڑ کر ان نیک بندوں کو خدا بنا لیا جن کی ساری زندگیاں بندوں کی خدائی ختم کرنے اور صرف اللہ کی خدائی ثابت کرنے میں صرف ہوئی تھیں۔ ایک طرف مشرکانہ پوجا پاٹ کی جگہ فاتحہ، زیارات، نیاز، نذر، عرس، صندل، چڑھاوے، نشان، علم، تعزیے اور اسی قسم کے دوسرے مذہبی اعمال کی ایک نئی شریعت تصنیف کر لی گئی۔ دوسری طرف بغیر کسی ثبوت علمی کے ان بزرگوں کی ولادت و وفات، ظہور و غیاب، کرامات و خوارق، اختیارات و تصرفات، اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے تقرب کی کیفیات سے متعلق ایک پوری میتھالوجی تیار ہو گئی جو بت پرست مشرکین کی میتھالوجی سے ہر طرح لگا کھا سکتی ہے۔ تیسری طرف توسل اور استمداد روحانی اور اکتساب فیض وغیرہ کے ناموں کے خوشنما پردوں میں وہ سب معاملات جو اللہ اور بندے کے

درمیان ہوتے ہیں، ان بزرگوں سے تعلق ہو گئے اور عملاً وہی حالت قائم ہو گئی جو اللہ کو ماننے والے ان مشرکین کے ہاں ہے جن کے نزدیک پادشاہ عالم انسان کی رسائی سے بہت دور ہے اور انسان کی زندگی سے تعلق رکھنے والے تمام امور نیچے کے اہل کاروں ہی سے وابستہ ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان کے ہاں یہ اہل کار خانیہ الٰہ، دیوتا، اوتار، یا ابن اللہ کہلاتے ہیں، اور یہ انہیں غوث، قطب، اولیاء اور اہل اللہ وغیرہ الفاظ کے پردوں میں چھپاتے ہیں۔

یہ دوسری قسم کی جاہلیت تاریخ کے دوران میں عموماً پہلی قسم کی جاہلیت، یعنی جاہلیت خالصہ کے ساتھ تعاون کرتی رہی ہے۔ قدیم زمانہ میں بابل، مصر، ہندوستان، ایران، یونان، روم وغیرہ ممالک کے تمدن میں یہ دونوں جاہلیتیں ہم آغوش تھیں اور موجودہ زمانہ میں جاپان کے تمدن کا بھی یہی حال ہے۔ اس موافقت کے متعدد اسباب ہیں جن میں سے چند کی طرف میں اشارہ کروں گا۔

اولاً مشرکانہ جاہلیت میں آدمی کا کوئی تعلق اپنے معبودوں کے ساتھ اس کے سوا نہیں ہوتا کہ یہ اپنے خیال میں ان کو صاحب اختیار، نافع و ضار سمجھ لیتا ہے اور مختلف مراسم عبودیت کے ذریعہ سے اپنے دنیوی مقاصد میں ان کی مہربانی و اعانت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ باقی رہا یہ امر کہ وہاں اس کو کسی قسم کی اخلاقی ہدایت یا زندگی کا قانون و ضابطہ ملے، تو اس کا کوئی امکان ہی نہیں، کیونکہ وہاں کوئی واقع میں خدا ہو تو ہدایت اور قانون بھیجے۔ پس جب ایسی کوئی چیز موجود نہیں ہے تو مشرک انسان لامحالہ خود ہی ایک اخلاقی نظریہ بناتا ہے اور خود ہی اس نظریہ کی بنیاد پر ایک شریعت تصنیف کرتا ہے۔ اس طرح وہی جاہلیت محضہ برسرکار آجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خالص جاہلیت کے تمدن اور مشرکانہ تمدن میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں ہوتا کہ ایک جگہ جاہلیت کے ساتھ مندروں، پجاریوں اور عبادات کا سلسلہ ہوتا ہے، اور دوسری جگہ نہیں ہوتا۔ ورنہ اخلاق و اعمال جیسے یہاں ہوتے ہیں، ویسے ہی وہاں بھی ہوتے ہیں یونان قدیم اور بت پرست روم کے اخلاقی مزاج اور موجودہ یورپ کے اخلاقی مزاج میں جو مشابہت پائی جاتی ہے اس کا یہی سبب ہے۔

ثانیاً علوم و فنون، فلسفہ و ادب، اور سیاسیات و معاشیات وغیرہ کے لئے مشرکانہ نظریہ کوئی الگ مستقل بنیاد فراہم نہیں کرتا۔ اس باب میں بھی مشرک انسان جاہلیت محضہ ہی کا رُخ اختیار کرتا ہے اور مشرک سوسائٹی کا سارا دماغی نشوونما اسی ڈھنگ پر ہوتا ہے جس پر خالص جاہلی سوسائٹی میں ہوا کرتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ مشرکین کی قوت واہمہ حد سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے اس لیے ان کے افکار میں خیال آرائی (Speculation) کا عنصر بہت زیادہ ہوتا ہے، اور ملاحدہ ذرا عملی قسم کے لوگ ہوتے ہیں اس لیے نرے خیالی نسخوں سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ البتہ جب وہ خدا کے بغیر کائنات کے معمہ کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کی استدلالی کھینچ تان بھی اتنی ہی غیر معقول ہوتی ہے جتنی مشرکین کی میتھالوجی۔ بہر حال علمی حیثیت سے شرک اور جاہلیت خالصہ میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہوتا،

اور اس کا روشن ثبوت یہ ہے کہ موجودہ یورپ اپنے نظریات میں قدیم یونان و روم سے اس طرح سلسلہ جوڑتا ہے کہ گویا یہ بیٹا ہے اور وہ باپ۔

ثالثاً شرک سوسائٹی اُن تمام تمدنی طریقوں کو قبول کرنے کے لیے پوری طرح مستعد ہوتی ہے جن کو خالص جاہلی سوسائٹی اختیار کرتی ہے۔ اگرچہ سوسائٹی کی ترتیب و تعمیر میں شرک اور جاہلیت خالصہ کے ڈھنگ ذرا ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ شرک کی مملکت میں بادشاہوں کو خدائی کا مقام دیا جاتا ہے، روحانی پیشواؤں اور مذہبی عہدہ داروں کا ایک طبقہ مخصوص امتیازات کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، شاہی خاندان اور مذہبی طبقے مل کر ایک ملی بھگت قائم کرتے ہیں، خاندانوں پر خاندانوں کے اور نسلوں پر نسلوں کے تفوق کا ایک مستقل نظریہ وضع کیا جاتا ہے، اور اس طرح جاہل عوام پر مذہب کا جال پھیلا کر ظالمانہ تسلط قائم کر لیا جاتا ہے۔ بخلاف اس کے خالص جاہلی سوسائٹی میں یہ خرابیاں نسل پرستی، قوم پرستی، قومی امپیریلزم، ڈکٹیٹرشپ، سرمایہ داری اور طبقاتی نزاع کی شکل اختیار کرتی ہیں۔ لیکن جہاں تک روح اور جوہر کا تعلق ہے، انسان پر انسان کی خدائی مسلط کرنے، انسان کو انسان سے پھاڑنے، اور انسانیت کو تقسیم کر کے ایک ہی نوع کے افراد کو ایک دوسرے کے لیے صیاد بنانے میں دونوں ایک سطح پر ہیں۔

جاہلیت راہبانہ | تیسرا ما بعد الطبیعی نظریہ یہ ہے کہ یہ دُنیا اور یہ جسمانی وجود انسان کے لیے ایک دار العذاب ہے۔ انسان کی روح اس قفس عنصری میں دراصل ایک سزا یافتہ قیدی کی حیثیت رکھتی ہے۔ لذات و خواہشات اور تمام وہ ضروریات جو اس جسمانی تعلق کی وجہ سے انسان کو لاحق ہوتی ہیں اصل میں اس قیدخانہ کے طوق و سلاسل ہیں۔ انسان اس دنیا اور اس کی چیزوں سے جتنا تعلق رکھے گا اُتنا ہی گندگی سے آلودہ ہوگا اور اُسی قدر مزید عذاب کا مستحق بن جائے گا نجات کی صورت اس کے سوا کوئی نہیں ہے کہ اس زندگی کے بکھیڑوں سے قطع تعلق کیا جائے، خواہشات کو مٹایا جائے، لذات سے کنارہ کشی کی جائے، جسمانی ضروریات اور نفس کے مطالبات کو پورا کرنے سے انکار کیا جائے، اُن تمام محبتوں کو جو دنیوی اشیا اور گوشت و خون کی رشتہ داریوں کے ساتھ پیدا ہوتی ہیں، دل سے نکال دیا جائے، اور اپنے اس دشمن یعنی نفس و جسم کو مجاہدات و ریاضات کے ذریعہ سے اتنی تکلیفیں دی جائیں کہ روح پر اس کا تسلط قائم نہ رہ سکے۔ اس طرح روح ہلکی اور پاک صاف ہو جائے گی اور نجات کے بلند مقامات پر اُڑنے کی طاقت حاصل کر لے گی۔

یہ نظریہ بجائے خود غیر تمدنی (Anti-social) نظریہ ہے، مگر تمدن پر یہ متعدد طریقوں سے اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد پر ایک خاص قسم کا نظام فلسفہ بنتا ہے جس کی مختلف شکلیں ویدانتزم، اشراقیت (Neo-Platonism) یوگ، تصوف، مسیحی رہبانیت، اور بدھ ازم وغیرہ ناموں سے مشہور ہیں۔ اس فلسفہ کے ساتھ ایک ایسا نظام اخلاق وجود میں آتا ہے جو بہت کم ایجابی (Positive) اور بہت زیادہ بلکہ تمام تر سلبی نوعیت کا ہے۔ یہ دونوں چیزیں مل کر لٹریچر، عقائد، اخلاقیات اور عملی زندگی میں نفوذ کرتی ہیں اور جہاں جہاں

ان کے اثرات پہونچتے ہیں۔ وہاں افیون اور کوکین کا کام کرتے ہیں۔ ۔۔۔

پہلی دونوں قسم کی جاہلیتوں کے ساتھ اس تیسری قسم کی جاہلیت کا تعاون عموماً تین صورتوں سے ہوتا ہے:۔

(۱) یہ راہبانہ جاہلیت انسانی جماعت کے نیک اور پاکباز افراد کو دُنیا کے کاروبار سے ہٹا کر گوشۂ عزلت میں لے جاتی ہے اور بدترین قسم کے شر پسند افراد کیلئے میدان صاف ہو جاتا ہے۔ بدکار لوگ خدا کی زمین کے متولی بن کر آزادی کے ساتھ فساد پھیلاتے ہیں، اور نیک لوگ اپنی نجات کی فکر میں تپسیا کیئے چلے جاتے ہیں۔

(۲) اس جاہلیت کے اثرات جہاں تک عوام میں پہونچتے ہیں وہ ان کے اندر غلط قسم کا صبر وتحمل اور مایوسانہ نقطۂ نظر پیدا کرکے انھیں ظالموں کیلئے نرم نوالہ بنادیتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہمیشہ بادشاہ، امراء اور مذہبی اقتدار رکھنے والے طبقے اس راہبانہ فلسفہ واخلاق کی اشاعت میں خاص دلچسپی لیتے رہے ہیں، اور یہ خوب انہی کی سرپرستی میں پھیلتا رہا ہے۔ تاریخ میں کوئی مثال ایسی نہیں ملتی کہ امپیریلزم، سرمایہ داری اور روحانی ریاست سے اس راہبانہ فلسفہ و اخلاق کی کبھی لڑائی ہوئی ہو۔

(۳) جب یہ رہبانی فلسفہ واخلاق، انسانی فطرت سے شکست کھاتا ہے تو کتاب الحیل کی تصنیف شروع ہو جاتی ہے۔ کہیں کفارہ کا عقیدہ ایجاد ہوتا ہے تاکہ دل کھول کر گناہ کیا جا سکے اور جنت بھی ہاتھ سے نہ جائے۔ کہیں ہوس رانی کے لیے عشقِ مجازی کا حیلہ نکالا جاتا ہے تاکہ دل کی لگی بجھا بھی لی جائے اور تقدس بھی جوں کا توں قائم رہے۔ اور کہیں ترکِ دُنیا کے پردے میں بادشاہوں اور رئیسوں سے سانٹھ گانٹھ کی جاتی ہے اور روحانی امارت کا وہ جال پھیلایا جاتا ہے جس کی بدترین مثالیں روم کے پاپاؤں، اور مشرقی دنیا کے گدی نشینوں نے پیش کی ہیں۔

یہ تو اس جاہلیت کا معاملہ اپنی ہم جنس بہنوں کے ساتھ ہے۔ مگر انبیاء علیہم السلام کی اُمتوں میں جب یہ گھس آتی ہے تو کچھ اور ہی گل کھلاتی ہے۔ خدا کے دین پر اس کی پہلی ضرب یہ ہوتی ہے کہ یہ دُنیا کو دار العمل دار الامتحان اور مزرعۃ الآخرۃ کے بجائے دار العذاب اور "مایا کے جال" کی حیثیت سے آدمی کے سامنے پیش کرتی ہے نقطۂ نظر کے اس بنیادی تغیر کی وجہ سے آدمی یہ حقیقت بھول جاتا ہے کہ وہ اس دُنیا میں خلیفہ کی حیثیت سے مامور ہے۔ وہ یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ میں یہاں کام کرنے اور دُنیا کے معاملات کو چلانے نہیں آیا ہوں بلکہ گندگی و نجاست میں پھینکا گیا ہوں جس سے مجھے بچنا اور دور بھاگنا چاہیئے۔ میرے لیئے صحیح پوزیشن یہ ہے کہ میں یہاں نان کوآپریٹر کی طرح رہوں اور ذمہ داریوں کو قبول کرنے کے بجائے اُن سے کنارہ کروں۔ اس تصور کے ساتھ آدمی دُنیا اور اس کے معاملات پر سہمی ہوئی نگاہ ڈالنے لگتا ہے اور بارِ خلافت سنبھالنا تو درکنار، بارِ تمدن کو بھی اپنے سر لیتے ہوئے ڈرتا ہے۔ اس کے لیئے پورا نظامِ شریعت بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ عبادات اور اوامر و نواہی کا یہ مفہوم بالکلیہ ساقط ہو جاتا ہے کہ یہ حیاتِ دُنیا کی اصلاح اور فرائضِ خلافت کی انجام دہی کے لیئے

تیار کرنے والی چیزیں ہیں۔ برعکس اس کے آدمی یہ سمجھنے لگتا ہے کہ عبادات اور چند خاص مذہبی اعمال اس گناہ زندگی کا کفارہ ہیں۔ بس انہی کو پورے انہماک سے ٹھیک ناپ تول کے ساتھ انجام دیتے رہنا چاہیئے تاکہ آخر میں نجات حاصل ہو۔

اس ذہنیت نے انبیا کی امتوں میں سے ایک گروہ کو مراقبہ و مکاشفہ، چلہ کشی و ریاضت، اوراد و وظائف احزاب و اعمال، سیر مقامات و حقیقت کی فلسفیانہ تعبیروں کے چکر میں ڈال کر مستحبات و نوافل کے التزام میں فرائض سے بھی زیادہ منہمک کر کے، خلافت الٰہیہ کے اس کام سے غافل کر دیا جس کو جاری کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام آئے تھے۔ اور دوسرے گروہ میں تقشف، تعمق فی الدین، غلو، موشگافی اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کی ناپ تول اور جزئیات کے ساتھ غیر معمولی اہتمام کی بیماری پیدا کر دی، حتیٰ کہ ان کے لئے خدا کا دین ایک ایسا نازک آبگینہ بن گیا جو ذرا ذرا سی باتوں سے ٹھیس کھا کر پاش پاش ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان بیچاروں کا سارا وقت بس اسی دیکھ بھال کی نذر ہونے لگا کہ کہیں کچھ اونچ نیچ نہ ہو جائے اور یہ شیشے کا برتن جو سر پر رکھا ہے کھیل کھیل ہو کر نہ رہ جائے۔ دین میں اتنی باریکیاں نکل آنے کے بعد ناگزیر ہے کہ جو، تنگ خیالی اور کم حوصلگی پیدا ہو۔ ایسے لوگوں میں کہاں یہ قابلیت باقی رہ سکتی ہے کہ نگاہ جہاں بیں سے انسانی زندگی کے بڑے بڑے مسائل پر نظر ڈالیں، دین کے عالمگیر اصول و کلیات پر گرفت حاصل کریں اور زمانہ کی ہر نئی گردش میں دنیا کی امامت و رہنمائی کے لئے مستعد ہوں۔

اسلام | چوتھا مابعد الطبیعی نظریہ یہ ہے کہ سارا عالم ہست و بود جو ہمارے گرد و پیش پھیلا ہوا ہے اور جس کا ایک جزو ہم خود ہیں، دراصل ایک بادشاہ کی سلطنت ہے۔ اسی نے اس کو بنایا ہے، وہی اس کا مالک ہے، اور وہی اس کا واحد حاکم ہے اس سلطنت میں کسی کا حکم نہیں چلتا۔ سب کے سب تابع امر ہیں اور اختیارات بالکلیہ اسی ایک مالک و فرمانروا کے ہاتھ میں ہیں۔ انسان اس مملکت میں پیدائشی رعیت ہے، یعنی رعیت ہونا یا نہ ہونا اس کی مرضی پر موقوف نہیں ہے بلکہ یہ رعیت ہی پیدا ہوا ہے اور رعیت کے سوا کچھ اور ہونا اس کے امکان ہی میں نہیں ہے۔ اس نظام حکومت کے اندر انسان کی خود مختاری و غیر ذمہ داری کے لئے کوئی جگہ نہیں، نہ فطرتاً ہو سکتی ہے۔ پیدائشی رعیت اور ایک جزء مملکت ہونے کی حیثیت سے اس کے لئے کوئی راستہ اس کے سوا نہیں ہے کہ جس طرح مملکت کے تمام اجزاء بادشاہ کے امر کی اطاعت کر رہے ہیں اسی طرح یہ بھی کرے۔ یہ خود اپنے لئے طریق زندگی وضع کرنے اور اپنی ڈیوٹی آپ تجویز کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ مالک الملک کی طرف سے جو ہدایت آئے اس کی پیروی کرے۔ اس ہدایت کے آنے کا ذریعہ وحی ہے اور جن انسانوں کے پاس یہ آتی ہے وہ نبی ہیں۔

مگر انسان کی آزمائش کے لئے مالک نے یہ لطیف طریقہ اختیار کیا ہے کہ آپ بھی چھپ گیا اور اپنی سلطنت کا وہ پورا اندرونی انتظام بھی چھپا دیا جس سے وہ تدبیر امر کرتا ہے۔ ظاہر میں سلطنت اس طرح چل رہی ہے کہ نہ اس کا حاکم نظر آتا ہے نہ کارپرداز ہی دکھائی دیتے ہیں۔ انسان صرف ایک کارخانہ چلتا ہوا دیکھتا ہے، اس کے درمیان اپنے آپ کو

موجود پاتا ہے، اور ظاہر حواس سے کہیں محسوس نہیں کرتا کہ میں کسی کا محکوم ہوں اور کسی کو مجھے حساب دینا ہے۔ عیان و شہود میں کوئی ایسی نشانی نمایاں نہیں ہوتی کہ اس پر فرماں روائے عالم کی حاکمیت اور اپنی محکومیت و مسئولیت (Responsibility) کا حال غیر مشتبہ طور پر کھل جائے یہاں تک کہ ماننے بغیر چارہ نہ رہے۔ نبی بھی آتے ہیں تو اس طرح نہیں کہ ان کے اوپر حیاناً وحی اترتی دکھائی دے، یا کوئی ایسی صریح علامت ان کے ساتھ اترے جس کو دیکھ کر ان کی نبوت ماننے کے سوا چارہ نہ رہے۔ پھر آدمی ایک حد کے اندر اپنے آپ کو بالکل مختار پاتا ہے۔ بغاوت کرنا چاہے تو اس کی قدرت دیدی جاتی ہے۔ ذرائع بہم پہنچا دیئے جاتے ہیں، اور بڑی لمبی ڈھیل دی جاتی ہے حتےٰ کہ شرارت و عصیاں کی آخری حدود کو پہونچنے تک کوئی رکاوٹ اسے پیش نہیں آتی۔ مالک کے سوا دوسروں کی بندگی کرنا چاہے تو اس سے بھی زبردستی اس کو نہیں روکا جاتا، پوری آزادی دی جاتی ہے کہ جس جس کی بندگی، عبادت، اطاعت کرنا چاہے کرے۔ دونوں صورتوں (یعنی بغاوت اور بندگیٔ غیر کی صورتوں) میں نقد برابر ملتا ہے، سامانِ زندگی، وسائل کار، اسباب عیش حسب حیثیت خوب دیئے جاتے ہیں، اور مرتے دم تک دیئے جاتے رہتے ہیں کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کسی باغی یا کسی بندۂ غیر سے محض اس جرم کی پاداش میں اسباب دنیا روک لیئے جائیں۔ یہ سارا طرز کارروائی صرف اس لیئے ہے کہ خالق نے انسان کو عقل، تمیز، استدلال، ارادہ اور اختیار کی جو قوتیں دی ہیں، اور اپنی بے شمار مخلوقات پر اس کو ایک طرح کے حاکمانہ تصرف کی جو قدرت بخشی ہے، اس میں وہ اس کی آزمائش کرنا چاہتا ہے اسی آزمائش کی تکمیل کے لیئے حقیقت پر غیب کا پردہ ڈالا گیا ہے تاکہ انسان کی عقل کا امتحان ہو۔ انتخاب کی آزادی بخشی گئی ہے تاکہ اس امر کا امتحان ہو کہ آدمی حق کو جاننے کے بعد کسی مجبوری کے بغیر خود اپنی رضا و رغبت سے اسکی پیروی کرتا ہے یا خواہشات کی غلامی اختیار کر کے اس سے منہ موڑتا ہے۔ اسباب زندگی کا سرمایہ اور وسائل کار دیئے گئے ہیں، اور عمر بھر کی مہلت دی گئی ہے کیونکہ جب تک کسی کارکن کو سرمایہ، وسائل، اور کام کا موقع نہ دیا جائے اس کی لیاقت و عدم لیاقت کا امتحان نہیں ہو سکتا۔

یہ دنیوی زندگی چونکہ آزمائش کی مہلت ہے اس لیئے یہاں نہ حساب ہے نہ جزا نہ سزا۔ یہاں جو کچھ دیا جاتا ہے وہ کسی عمل نیک کا انعام نہیں ہے بلکہ امتحان کا سامان ہے۔ اور جو تکالیف، مصائب، شدائد وغیرہ پیش آتے ہیں وہ کسی عمل بد کی سزا نہیں بلکہ زیادہ تر اس قانون طبعی کے تحت، جس پر اس دنیا کا نظام قائم کیا گیا ہے، آپ سے آپ ظاہر ہونے والے نتائج ہیں، اعمال کے اصلی حساب، جانچ پڑتال اور فیصلہ کا وقت مہلت کی زندگی ختم ہونے کے بعد ہے اور اسی کا نام آخرت ہے۔ لہٰذا دنیا میں جو کچھ نتائج ظاہر ہوتے ہیں وہ کسی طریقہ یا کسی عمل کے صحیح یا غلط، نیک یا بد، اور قابل اخذ یا قابل ترک ہونے کا معیار نہیں بن سکتے۔ اصلی معیار آخرت کے نتائج ہیں۔ اور یہ علم کہ آخرت میں کس طریقہ اور کس عمل کا نتیجہ اچھا اور کس کا برا ہوگا، صرف اس وحی کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے جو اللہ تعالےٰ کی طرف سے

انبیاء پر نازل ہوئی ہے، جزئیات و تفصیلات سے قطع نظر، فیصلہ کن بات جس پر آخرت کی فلاح یا خسران کا مدار ہے یہ ہے کہ اولاً انسان اپنی قوت نظر و استدلال کے صحیح استعمال سے اللہ تعالیٰ کے حاکم حقیقی ہونے اور اس کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کے منجانب اللہ ہونے کو پہچانتا ہے یا نہیں، ثانیاً اس حقیقت سے واقف ہونے کے بعد وہ آزادی انتخاب رکھنے کے باوجود اپنی رضا و رغبت سے اللہ کی حاکمیت اور اس کے امر شرعی کے آگے سر تسلیم خم کرتا ہے یا نہیں

یہ وہ نظریہ ہے جسے ابتداء سے انبیاء علیہم السلام پیش کرتے آئے ہیں۔ اس نظریہ کی بنیاد پر تمام واقعاتِ عالم کی مکمل توجیہ (explanation) ہوتی ہے، کائنات کے تمام آثار (Phenomena) کی پوری تعبیر ملتی ہے اور کسی مشاہدہ یا کسی تجربہ سے یہ نظریہ ٹوٹتا نہیں۔ یہ ایک مستقل نظام فلسفہ پیدا کرتا ہے جو جاہلیت کے فلسفوں سے بنیادی طور پر بالکل مختلف ہے، کائنات اور خود وجود انسانی کے متعلق معلومات کے پورے ذخیرہ کو ایک دوسرے ڈھنگ پر مرتب کرتا ہے جو جاہلی علوم کی ترتیب سے سراسر متباین ہے، ادب اور ہنر (آرٹ اور لٹریچر) کے نشوونما کا ایک الگ راستہ بناتا ہے جو جاہلی ادب و ہنر کے تمام راستوں سے متغائر ہے۔ زندگی کے جملہ معاملات میں ایک خاص زاویۂ نظر اور ایک خاص مقصد پیدا کرتا ہے جو جاہلی مقاصد و نقطہائے نظر سے اپنی روح اور اپنے جوہر میں کسی طرح میل نہیں کھاتا، اخلاق کا ایک علیحدہ نظام بناتا ہے جس کو جاہلی اخلاقیات سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ پھر ان علمی و اخلاقی بنیادوں پر جس تہذیب کی عمارت اٹھتی ہے اس کی نوعیت تمام جاہلی تہذیبوں کی نوعیت سے قطعی مختلف ہوتی ہے اور اس کو سنبھالنے کے لئے ایک اور ہی طرز کے نظام تعلیم و تربیت کی ضرورت ہوتی ہے جس کے اصول جاہلیت کے ہر نظام تعلیم و تربیت سے کامل تضاد کی نسبت رکھتے ہیں۔ فی الجملہ اس تہذیب کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں جو روح کام کرتی ہے وہ اللہ واحد قہار کی حاکمیت، آخرت کے اعتقاد اور انسان کے محکوم و ذمہ دار ہونے کی روح ہے، بخلاف اس کے ہر جاہلی تہذیب کے پورے نظام میں انسان کی خود مختاری، بے قیدی و بے مہاری اور غیر ذمہ داری کی روح سرایت کئے ہوئے ہوتی ہے اسی لئے انسانیت کا جو نمونہ انبیاء علیہم السلام کی قائم کی ہوئی تہذیب سے تیار ہوتا ہے اس کے خط و خال اور رنگ و روغن جاہلی تہذیب کے بنائے ہوئے نمونے سے ہر جز اور ہر پہلو میں جدا ہوتے ہیں۔

اس کے بعد تمدن کی تفصیلی صورت جو اس بنیاد پر مبنی ہے اس کا سارا نقشہ دنیا کے دوسرے نقشوں سے بدلا ہوا ہوتا ہے، طہارت، خوراک، لباس، طرز زندگی، آداب و اطوار، شخصی کردار، کسب معاش، صرف دولت ازدواجی زندگی، خاندانی زندگی، معاشرتی رسوم، سماجی تعلقات، انسان اور انسان کے تعلق کی مختلف شکلیں لین دین کے معاملات، دولت کی تقسیم، مملکت کا انتظام، حکومت کی تشکیل، امیر کی حیثیت، شوریٰ کا طریقہ، سول سروس کی تنظیم، قانون کے اصول، تفصیلی ضوابط کا اصول سے استنباط، عدالت، پولیس، احتساب، مالگذاری، فینانس

امور نافعہ (Public works) صنعت و تجارت، خبر رسانی، تعلیمات اور دوسرے تمام محکموں کی پالیسی، فوج کی تربیت و تنظیم، جنگ و صلح کے معاملات، بین الاقوامی تعلقات اور خارجی سیاست، غرض انسانی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لے کر بڑے سے بڑے معاملات تک اس تمدن کا طور و طریق اپنی ایک مستقل شان رکھتا ہے اور ہر ہر جزء میں ایک واضح خطِ امتیاز اس کو دوسرے تمدنوں سے الگ کرتا ہے۔ اس کی ہر چیز میں اوّل سے آخر تک ایک خاص نقطۂ نظر، ایک خاص مقصد، ایک خاص اخلاقی رویہ کارفرما ہوتا ہے جس کا براہ راست تعلق خدائے واحد کی حاکمیتِ مطلقہ، اور انسان کی محکومیت و مسئولیت اور دنیا کے بجائے آخرت کی مقصودیت سے جڑا ہوا ہے۔

نبی کے کام کی نوعیت

اسی تہذیب و تمدن کو دنیا میں قایم کرنے کے لیے انبیاء علیہم السلام پے در پے بھیجے گئے تھے رہبانی تہذیب کو مستثنیٰ کر کے ہر وہ تہذیب جو دنیا کی زندگی کے متعلق ایک جامع نظریہ اور کاروبارِ دنیا کو چلانے کے لیے ایک ہمہ گیر طریقہ رکھتی ہو، قطع نظر اس کے کہ وہ جاہلیت کی تہذیب ہو یا اسلام کی، طبعًا اس بات کی طالب ہوتی ہے کہ حاکمانہ اختیارات پر قبضہ کرے، زمام کار اپنے ہاتھ میں لے اور زندگی کا نقشہ اپنے طرز پر بنائے حکومت کے بغیر کسی نظریہ و ضابطہ کو پیش کرنا یا اس کا معتقد ہونا محض بے معنی ہے۔ راہب تو دنیا کے معاملات کو چلانا ہی نہیں چاہتا بلکہ ایک خاص قسم کے "سلوک" سے اپنی خیالی نجات کی منزل تک باہر ہی باہر پہونچ جانے کی فکر میں لگا رہتا ہے اس لیے نہ اس کو حکومت کی حاجت نہ طلب۔ مگر جو دنیا کے معاملات ہی کو چلانے کا ایک خاص ڈھنگ لے کر اٹھے اور اسی ڈھنگ میں انسان کی فلاح و سعادت کا معتقد ہو، اس کے لیے تو بجز اس کے کوئی چارہ ہی نہیں کہ اقتدار کی کنجیوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے۔ کیونکہ اپنے نقشہ پر عملدرآمد کرنے کی طاقت جب تک وہ حاصل نہ کرے، اس کا نقشہ واقعات کی دنیا میں قایم نہیں ہو سکتا۔ بلکہ کاغذ پر اور ذہنوں میں بھی زیادہ عرصہ تک باقی نہیں رہ سکتا جس تہذیب کے ہاتھ میں زمام کار ہوتی ہے، دنیا کا سارا کاروبار اسی کے نقشہ پر چلتا ہے۔ وہی علوم و افکار اور فنون و آداب کی رہنمائی کرتی ہے، وہی اخلاق کے سانچے بناتی ہے، وہی تعلیم و تربیت عامہ کا انتظام کرتی ہے، اسی کے قوانین پر سارا نظام تمدن مبنی ہوتا ہے، اور اسی کی پالیسی ہر شعبۂ زندگی میں کارفرما ہوتی ہے۔ اس طرح زندگی میں کہیں بھی اُس تہذیب کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی جو اپنی حکومت نہ رکھتی ہو۔ یہاں تک کہ جب ایک طویل مدت تک حکمراں تہذیب کا دور دورہ رہتا ہے تو غیر حکمران تہذیب عمل کی دنیا میں خارج از بحث ہو جاتی ہے۔ اس کی طرف ہمدردانہ نقطۂ نظر رکھنے والوں کو بھی اس امر میں شبہ ہو جاتا ہے کہ یہ طریقہ دنیا کی زندگی میں چل سکتا ہے یا نہیں۔ اس کے نام نہاد علمبردار اور اس کی لیڈرشپ کے برعم خود دارثین تک تہذیب مخالف سے مدارات (Compromise) اور آدھے پونے کا مشترک

معاملہ کرنے پر اُتر آتے ہیں حالانکہ حکمرانی میں دو بالکل مختلف الاصول تہذیبوں کے درمیان مفاہمت و مصالحت قطعی غیر ممکن العمل چیز ہے اور انسانی تمدن اس شرک کو کبھی برداشت نہیں کرسکتا۔ ثانی کو ممکن العمل خیال کرنا عقل کی کمی پر دلالت کرتا ہے اور اس کے لیے راضی ہونا ایمان اور ہمت کی کمی پر۔

پس دُنیا میں انبیاء علیہم السلام کے مشن کا منتہائے مقصود یہ رہا ہے کہ حکومت الٰہیہ قایم کرکے اُس پورے نظام زندگی کو نافذ کریں جو وہ خدا کی طرف سے لائے تھے۔ وہ اہل جاہلیت کو یہ حق دینے کے لیے تیار تھے کہ اپنے جاہلی اعتقادات پر قایم رہیں اور جس حد کے اندر اُن کے عمل کا اثر انہی کی ذات تک محدود رہتا ہے اُس میں اپنے جاہلی طریقوں پر بھی چلتے رہیں۔ مگر وہ انھیں یہ حق دینے کے لیے تیار نہ تھے اور نہ دے سکتے تھے کہ اقتدار کی کنجیاں اُن کے ہاتھ میں رہیں اور وہ انسانی زندگی کے معاملات کو جاہلیت کے قوانین پر چلائیں۔ اسی وجہ سے تمام انبیاء نے سیاسی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی۔ بعض کی مساعی صرف زمین تیار کرنے کی حد تک رہیں، جیسے حضرت ابراہیم۔ بعض نے انقلابی تحریک عملاً شروع کردی مگر حکومت الٰہیہ قایم کرنے سے پہلے ہی اُن کا کام ختم ہوگیا، جیسے حضرت مسیح۔ اور بعض نے اس تحریک کو کامیابی کی منزل تک پہنچا دیا جیسے حضرت موسیٰ اور سیدنا محمد صلے اللہ علیہ وعلیہم اجمعین۔ فی الجملہ تمام انبیاء کے کام پر مجموعی حیثیت سے جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو اس کام کی نوعیت یہ پائی جاتی ہے۔

(۱) عام انسانوں کے اندر فکری و ذہنی انقلاب برپا کرنا۔ خالص اسلامی نقطۂ نظر و طرز فکر اور رویۂ اخلاق کو ان کے اندر اس حد تک پیوست کردینا کہ ان کے سوچنے کا طریقہ، زندگی کا مقصد، قدر و قیمت کا معیار اور عمل کا ڈھنگ بالکل اسلام کے رانچے میں ڈھل جائے۔

(۲) جو لوگ اس تعلیم و تربیت کا اثر قبول کرلیں اُن کا ایک مضبوط جتھا بناکر جاہلیت کے ہاتھوں سے اقتدار چھیننے کی جد و جہد کرنا اور اس جد و جہد میں تمام ان اسباب سے کام لینا جو وقت کے تمدن میں موجود ہوں۔

(۳) اسلامی نظام حکومت قایم کرکے تمدن کے تمام شعبوں کو خالص اسلام کی اساس پر مرتب کردینا اور ایسی تدابیر اختیار کرنا کہ ایک طرف اسلامی انقلاب کا دائرہ روئے زمین پر وسیع ہوتا جائے اور دوسری طرف تبلیغ اور تناسل کے ذریعہ سے جماعت اسلامی میں جتنی نئی بھرتی ہو اس کی ذہنی و اخلاقی تربیت پورے اسلامی طرز پر ہوتی رہے۔

خاتم النبیین سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سارا کام ۲۳ سال کی مدت میں تکمیل کو پہونچا دیا۔ آپ کے بعد ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما جو ویسے کامل لیڈر اسلام کو میسر آئے جنھوں نے اسی جامعیت کے ساتھ آپ کے کام کو جاری رکھا۔ پھر زمام قیادت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف منتقل ہوئی اور ابتدائی چند سال تک وہ پورا نقشہ بدستور جاری رہا جو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قایم کیا تھا۔

کے رنگ میں رنگ دیتے ہیں، ان کو مجدد کے خطاب سے نواز دیا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ مجدد نہیں متجدد ہوتے ہیں۔ اور ان کا کام تجدید نہیں تجدد ہوتا ہے۔ تجدید کا کام اس سے بالکل مختلف ہے۔ جاہلیت سے مصالحت کی صورتیں نکالنے کا نام تجدید نہیں ہے، اور نہ اسلام و جاہلیت کا کوئی نیا مرکب بنانا تجدید ہے، بلکہ دراصل تجدید کا کام یہ ہے کہ اسلام کو جاہلیت کے تمام اجزاء سے چھانٹ کر الگ کیا جائے، اور کسی نہ کسی حد تک اس کو اپنی خالص صورت میں پھر سے فروغ دینے کی کوشش کی جائے۔ اس لحاظ سے مجدد جاہلیت کے مقابلہ میں سخت غیر مصالحت پسند آدمی ہوتا ہے اور کسی خفیف سے خفیف جزء میں بھی جاہلیت کی موجودگی کا روادار نہیں ہوتا۔

مجدد نبی نہیں ہوتا مگر اپنے مزاج میں مزاج نبوت سے بہت قریب ہوتا ہے، نہایت صاف دماغ حقیقت رس نظر، ہر قسم کی کجی سے پاک۔ بالکل سیدھا ذہن، افراط و تفریط سے بچ کر توسط و اعتدال کی سیدھی راہ دیکھنے اور اپنا توازن قائم رکھنے کی خاص قابلیت اپنے ماحول اور صدیوں کے جمے اور رچے ہوئے تعصبات سے آزاد ہوکر سوچنے کی قوت، زمانہ کی بگڑی ہوئی رفتار سے لڑنے کی طاقت و جرأت، قیادت و رہنمائی کی پیدائشی صلاحیت اجتہاد اور تعمیر نو کی غیر معمولی اہلیت اور ان سب باتوں کے ساتھ اسلام میں مکمل شرح صدر، نقطہ نظر اور فہم و شعور میں پورا مسلمان ہونا، باریک سے باریک جزئیات تک میں اسلام اور جاہلیت کے درمیان تمیز کرنا، اور مدتہائے دراز کی الجھنوں میں سے امر حق کو ڈھونڈ کر الگ نکال لینا، یہ وہ خصوصیات ہیں جن کے بغیر کوئی شخص مجدد نہیں ہوسکتا، اور یہی وہ چیزیں ہیں جو اس سے بہت زیادہ بڑے پیمانہ پر نبی میں ہوتی ہیں لیکن وہ بنیادی چیز جو مجدد کو نبی سے جدا کرتی ہے، یہ ہے کہ نبی اپنے منصب پر امر تشریعی سے مامور ہوتا ہے، اس کو اپنی ماموریت کا علم ہوتا ہے، اس کے پاس وحی آتی ہے، وہ اپنی نبوت کے دعوے سے اپنے کام کا آغاز کرتا ہے، اسے لوگوں کو اپنی طرف دعوت دینی پڑتی ہے، اور اس کے دعوے ہی کو قبول کرنے یا نہ کرنے پر کفر و ایمان کا مدار ہوتا ہے۔ برعکس اس کے مجدد کو ان میں سے کوئی حیثیت بھی حاصل نہیں ہوتی۔ وہ اگر مامور بھی ہوتا ہے تو امر تکوینی سے نہ کہ امر تشریعی سے۔ بسا اوقات اس کو خود اپنے مجدد ہونے کی خبر نہیں ہوتی بلکہ اس کے مرنے کے بعد اس کی زندگی کے کارناموں سے لوگوں کو اس کے مجدد ہونے کا علم ہوتا ہے، اس پر الہام ہونا ضروری نہیں اور اگر ہوتا ہو تو لازم نہیں کہ اسے الہام کا شعور ہو۔ وہ کسی دعوے سے اپنے کام کا آغاز نہیں کرتا، نہ ایسا کرنے کا حق رکھتا ہے، کیونکہ اس پر ایمان لانے یا نہ لانے کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا اگرچہ اس کے زمانہ کے تمام اہل خیر و صلاح رفتہ رفتہ اس کے گرد جمع ہوجاتے ہیں اور صرف وہی لوگ اس سے الگ رہتے ہیں جن کی طبیعت میں کوئی ٹیڑھ ہوتی ہے، مگر بہر حال اس کو ماننا مسلمان ہونے کے لئے شرط نہیں ہوتا ان تمام فروق کے ساتھ مجدد کو فی الجملہ اسی نوعیت کا کام کرنا ہوتا ہے جو نبی کے کام کی نوعیت ہے۔

وفنون میں جمود اور تنگ خیالی پیدا کی اور ساری دینداری کو چند خاص مذہبی اعمال میں محدود کر کے رکھ دیا۔

انہی تینوں قسم کی جاہلیتوں کے ہجوم سے اسلام کو نکالنا اور پھر سے چمکا دینا وہ کام تھا جس کے لئے دین کو مجددین کی ضرورت پیش آئی۔ اگرچہ یہ گمان کرنا صحیح نہ ہوگا کہ اس طغیانِ جاہلیت میں اسلام بالکل ختم ہوگیا تھا اور جاہلیت کلیۃً غالب آگئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ جو قومیں اسلام سے متاثر ہو چکی تھیں یا بعد میں متاثر ہوئیں ان کی زندگیوں میں اسلام کا اصلاحی اثر تھوڑا یا بہت ضرور موجود رہا۔ جبار اور غیر ذمہ دار بادشاہوں تک میں اسلام کے اثر سے کہیں نہ کہیں خوف خدا کی جھلک نظر آہی جاتی تھی۔ جن شاہی خاندانوں میں خدائی کا رنگ جما ہوا تھا اُن کی آغوش میں دیندار، عادل اور متقی انسان بھی پیدا ہو جاتے تھے اور وہ شاہی اختیارات رکھنے کے باوجود حتی الامکان ذمہ دارانہ حکومت کرتے تھے۔ اسی طرح امارت و ریاست کے ایوانوں میں، فلسفہ و حکمت کے مدرسوں میں، تجارت و صنعت کی کارگاہوں میں، ترک و تجرید کی خانقاہوں میں، اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی اسلام اپنے بالواسطہ اثرات کم و بیش برابر پہونچاتا رہا، اور عوام کے اندر بھی مشرکانہ جاہلیت کی دراندازی کے باوجود اس نے اعتقاد، اخلاق اور معاشرت میں اصلاحی اور انسدادی دونوں حیثیتوں سے اپنا نفوذ جاری رکھا جس کی وجہ سے مسلمان قوموں کا معیارِ اخلاق بہر حال غیر مسلم قوموں سے ہمیشہ بلند تر رہا۔ علاوہ بریں ہر زمانے میں ایسے لوگ بھی برابر موجود رہے جو اسلام کی پیروی پر ثابت قدم تھے اور اسلامی علم و عمل کو اپنی زندگی میں اور اپنے محدود حلقۂ اثر میں زندہ رکھنے کی کوشش کرتے تھے لیکن جو مقصد انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا تھا اس کے لئے یہ دونوں چیزیں ناکافی تھیں۔ نہ یہ بات کافی تھی کہ اقتدار جاہلیت کے ہاتھ میں ہو اور اسلام محض ایک ثانوی قوت کی حیثیت سے کام کرے، اور نہ یہ بات کافی تھی کہ چند افراد یہاں اور چند وہاں محدود انفرادی زندگیوں میں اسلام کے حامل بنے رہیں اور وسیع تر اجتماعی زندگی میں اسلام دجاہلیت کی مختلف النوع مرکبات پھیلے رہیں۔ لہٰذا دین کو ہر دور میں ایسی طاقتور شخصیتوں کی ضرورت تھی اور ہے جو زمانہ کی بگڑی ہوئی رفتار کو بدل کر پھر سے اسلام کی طرف پھیر دیں، خواہ کلاً یا جزءً۔ انہی شخصیتوں کا نام مجدد ہے۔

کارِ تجدید کی نوعیت!

اب قبل اس کے کہ ہم مجددین امت کے کارناموں کا جائزہ لیں، ہمیں خود اس کارِ تجدید کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے۔

عموماً لوگ تجدد اور تجدید میں فرق نہیں کرتے اور سادہ لوحی سے ہر تجدد کو مجدد کہنے لگتے ہیں۔ ان کا گمان ہے کہ ہر وہ شخص جو کوئی نیا طریقہ نکالے اور اس کو ذرا زور سے چلا دے وہ مجدد ہوتا ہے۔ خصوصاً جو لوگ کسی مسلمان قوم کو برسرِ انحطاط دیکھ کر اس کو دنیوی حیثیت سے سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے زمانہ کی برسرِ عروج جاہلیت سے مصالحت کر کے اسلام و جاہلیت کا ایک نیا مخلوطہ تیار کر دیتے ہیں، یا فقط نام باقی رکھ کر اس قوم کو پورے جاہلیت

شاہی کی سرپرستی میں امراء، حکام، ولاۃ، اہلِ لشکر اور مترفین کی زندگیوں میں کم و بیش خالص جاہلیت کا نقطۂ نظر پھیل گیا اور اس نے ان کے اخلاق اور معاشرت کو پوری طرح ماؤف کر دیا۔ پھر یہ بالکل ایک طبعی امر تھا کہ اس کے ساتھ ہی جاہلیت کا فلسفہ، ادب اور ہنر بھی پھیلنا شروع ہوا اور علوم و فنون بھی اسی طرز پر مرتب و مدون ہوں، کیونکہ یہ سب چیزیں دولت اور حکومت کی سرپرستی چاہتی ہیں، اور جہاں دولت اور حکومت جاہلیت کے قبضہ میں ہو وہاں ان پر بھی جاہلیت کا تسلط ناگزیر ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ یونان اور عجم کے فلسفے اور علوم و آداب نے اس سوسائٹی میں راہ پائی جو اسلام کی طرف منسوب تھی، اور اس کی دراندازی سے "کلامیات" کی بحثیں شروع ہوئیں، اعتزال کا مسلک نکلا، زندقہ اور الحاد پر پرزے نکالنے لگا اور عقائد کی موشگافیوں نے نئے نئے فرقے پیدا کر دیئے۔ اسی پر بس نہیں بلکہ رقص، موسیقی اور تصویرکشی جیسے خالص جاہلی آرٹ بھی از سرِ نو اُن قوموں میں بار پانے لگے جن کو اسلام نے ان فتنوں سے بچا لیا تھا۔[۱]

جاہلیت مشرکانہ نے عوام پر حملہ کیا اور توحید کے رستہ سے ہٹا کر ان کو ضلالت کی بے شمار راہوں میں بھٹکا دیا۔ ایک صریح بت پرستی تو نہ ہو سکی، باقی کوئی قسم شرک کی ایسی نہ رہی جس نے مسلمانوں میں رواج نہ پایا ہو۔ پرانی جاہل قوموں کے جو لوگ اسلام میں داخل ہوئے تھے وہ اپنے ساتھ بہت سے مشرکانہ تصورات لیئے چلے آئے اور یہاں ان کو صرف اتنی تکلیف کرنی پڑی کہ پرانے معبودوں کی جگہ بزرگانِ اسلام میں سے کچھ معبود تلاش کریں، پرانے معبدوں کی جگہ مقابر اولیاء سے کام لیں، اور پرانی عبادات کی رسموں کو بدل کر نئی رسمیں ایجاد کریں۔ اس کام میں دنیا پرست علماء نے ان کی بڑی مدد کی اور وہ بہت سی مشکلات اُن کے راستہ سے دور کر دیں جو شرک کو اسلام کے اندر نصب کرنے میں پیش آسکتی تھیں۔ انھوں نے بڑی دیدہ دلیری سے آیات اور احادیث کو توڑ مروڑ کر اسلام میں اولیاء پرستی اور قبر پرستی کی جگہ نکالی، مشرکانہ اعمال کے لیئے اسلام کی اصلاحی زبان میں سے الفاظ بہم پہونچائے اور اس نئی شریعت کے لیئے رسموں کی ایسی صورتیں تجویز کیں کہ شرک جلی کی تعریف میں نہ آسکیں۔ اس فنی امداد کے بغیر اسلام کے دائرے میں شرک بیچارہ کہاں بار پا سکتا تھا؟

جاہلیت راہبانہ نے علماء، مشائخ، زہاد اور پاکباز لوگوں پر حملہ کیا اور ان میں وہ خرابیاں پھیلانی شروع کیں جن کی طرف میں اس سے پہلے اشارہ کر آیا ہوں۔ اس جاہلیت کے اثر سے اشراقی فلسفہ، راہبانہ اخلاقیات اور زندگی کے ہر پہلو میں مایوسانہ نقطۂ نظر مسلم سوسائٹی میں پھیلا۔ اس نے نہ صرف یہ کہ ادبیات اور علوم کو متاثر کیا، بلکہ فی الواقع سوسائٹی کے اچھے عناصر کو مارفیا کا انجکشن دے کر سست کر دیا، پادشاہی کے جاہلی نظام کو مضبوط کیا، اسلامی علوم

[۱] مولانا شبلی اور جسٹس امیر علی جیسے ورگوں نے ان بادشاہوں کے ان کارناموں کو اسلامی تہذیب و تمدن کی خدمات میں شمار کیا ہے۔

جاہلیت کا حملہ | مگر ایک طرف حکومت اسلامی کی تیز رفتار وسعت کی وجہ سے کام روز بروز زیادہ سخت ہوتا جا رہا تھا اور دوسری طرف حضرت عثمان، جن پر اس کارِ عظیم کا بار رکھا گیا تھا، اُن تمام خصوصیات کے حامل نہ تھے جو ان کے جلیل القدر پیش رووں کو عطا ہوئی تھیں، اس لیئے جاہلیت کو اسلامی نظام اجتماعی کے اندر گھس آنے کا راستہ مل گیا۔ حضرت عثمان نے اپنا سر دے کر اس خطرے کا راستہ روکنے کی کوشش کی مگر وہ نہ رُکا۔ ان کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور انھوں نے اسلام کے سیاسی اقتدار کو جاہلیت کے تسلط سے بچانے کی انتہائی کوشش کی مگر اُن کی جان کی قربانی بھی اس انقلاب معکوس (counter-revolution) کو نہ روک سکی۔ آخرکار خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دور ختم ہوگیا، ملک عضوض (Tyrant kingdom) نے اس کی جگہ لے لی، اور اس طرح حکومت کی اساس اسلام کے بجائے پھر جاہلیت پر قائم ہوگئی۔

حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد جاہلیت نے مرض سرطان کی طرح اجتماعی زندگی میں اپنے ریشے بتدریج پھیلانے شروع کر دیئے، کیونکہ اقتدار کی کنجی اب اسلام کے بجائے اُس کے ہاتھ میں تھی اور اسلام زورِ حکومت سے محروم ہونے کے بعد اُس کے نفوذ و اثر کو بڑھنے سے نہ روک سکتا تھا۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ جاہلیت بے نقاب ہو کر سامنے نہ آئی تھی بلکہ "مسلمان" بن کر آئی تھی۔ کھلے دہریے یا مشرکین و کفار سامنے ہوتے تو شاید مقابلہ آسان ہوتا۔ مگر یہاں تو آگے آگے توحید کا اقرار، رسالت کا اقرار، صوم و صلوٰۃ پر عمل، قرآن و حدیث سے استشہاد تھا اور اس کے پیچھے جاہلیت اپنا کام کر رہی تھی۔ ایک ہی وجود میں اسلام اور جاہلیت کا اجتماع ایسی سخت پیچیدگی پیدا کر دیتا ہے کہ اس سے عہدہ برآ ہونا ہمیشہ جاہلیت صریحہ کے مقابلہ کی بہ نسبت ہزاروں گنا زیادہ مشکل ثابت ہوا ہے۔ عریاں جاہلیت سے لڑیئے تو لاکھوں مجاہدین سر ہتھیلیوں پر لیئے آپ کے ساتھ ہو جائیں گے اور کوئی مسلمان علانیہ اُس کی حمایت نہ کر سکے گا، مگر اس مرکب جاہلیت سے لڑنے جائیے تو منافقین ہی نہیں بہت سے اصلی مسلمان بھی اُس کی حمایت پر کمربستہ ہو جائیں گے اور اُلٹا آپ کو موردِ الزام بنا ڈالیں گے۔ جاہلی امارت کی مسند اور جاہلی سیاست کی رہنمائی پر "مسلمان" کا جلوہ افروز ہونا، جاہلی تعلیم کے مدرسے میں "مسلمان" کا معلم ہونا، جاہلیت کے سجادہ پر "مسلمان" کا مرشد بن کر بیٹھنا وہ زبردست دھوکا ہے جس کے فریب میں آنے سے کم ہی لوگ بچ سکتے ہیں۔

اس معکوس انقلاب کا سب سے زیادہ خطرناک پہلو یہی تھا کہ اسلام کا نقاب اوڑھ کر تینوں قسم کی جاہلیتوں نے اپنی جڑیں پھیلانی شروع کر دیں اور ان کے اثرات روز بروز زیادہ پھیلتے چلے گئے۔

جاہلیتِ خالصہ نے حکومت اور دولت پر تسلط جمایا۔ نام خلافت کا تھا اور اصل میں وہی بادشاہی تھی جس کو مٹانے کے لیئے اسلام آیا تھا۔ بادشاہوں کو اِلٰہ کہنے کی ہمت کسی میں باقی نہ تھی اس لیئے السلطان ظل اللہ کا بہانہ اختیار کیا گیا اور اس بہانہ سے وہی مطاع مطلق کی حیثیت بادشاہوں نے اختیار کی جو اِلٰہ کی ہوتی ہے۔ اس

اس کار تجدید کے مختلف شعبے حسب ذیل ہیں:۔

(۱) اپنے ماحول کی صحیح تشخیص، یعنی حالات کا پورا جائزہ لے کر یہ سمجھنا کہ جاہلیت کہاں کہاں کس حد تک سرایت کر گئی ہے، کن کن راستوں سے آئی ہے، اس کی جڑیں کہاں کہاں اور کتنی پھیلی ہوئی ہیں، اور اسلام اس وقت ٹھیک کس حالت میں ہے۔

(۲) اصلاح کی تجویز، یعنی یہ تعیین کرنا کہ اس وقت کہاں ضرب لگائی جائے کہ جاہلیت کی گرفت ٹوٹے اور اسلام کو پھر اجتماعی زندگی پر گرفت کا موقع ملے۔

(۳) خود اپنے حدود کا تعین، یعنی اپنے آپ کو تول کر صحیح اندازہ لگانا کہ میں کتنی قوت رکھتا ہوں اور کس راستہ سے اصلاح کرنے پر قادر ہوں۔

(۴) ذہنی انقلاب کی کوشش، یعنی لوگوں کے خیالات کو بدلنا، عقائد و افکار اور اخلاقی نقطۂ نظر کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے، نظام تعلیم و تربیت کی اصلاح اور علوم اسلامی کا احیاء کرنا اور فی الجملہ اسلامی ذہنیت کو از سر نو تازہ کر دینا۔

(۵) عملی اصلاح کی کوشش، یعنی جاہلی رسوم کو مٹانا، اخلاق کا تزکیہ کرنا، اتباع شریعت کے جوش سے پھر لوگوں کو سرشار کر دینا، اور ایسے افراد تیار کرنا جو اسلامی طرز کے لیڈر بن سکیں۔

(۶) اجتہاد فی الدین، یعنی دین کے اصول کلیہ کو سمجھنا، اپنے وقت کے تمدنی حالات اور ارتقائے تمدن کی سمت کا اسلامی نقطۂ نظر سے صحیح اندازہ لگانا، اور یہ تعین کرنا کہ اصولِ شرع کے تحت تمدن کے پرانے متوارث نقشے میں کس طرح رد و بدل کیا جائے جس سے شریعت کی روح برقرار رہے، اس کے مقاصد پورے ہوں، اور تمدن کے صحیح ارتقاء میں اسلام دنیا کی امامت کر سکے۔

(۷) دفاعی جد و جہد، یعنی اسلام کو مٹانے اور دبانے والی سیاسی طاقت کا مقابلہ کرنا اور اس کے زور کو توڑ کر اسلام کے لیے ابھرنے کا راستہ پیدا کرنا۔

(۸) احیاء نظام اسلامی، یعنی جاہلیت کے ہاتھ سے اقتدار کی کنجیاں چھین لینا اور از سر نو حکومت کو عملاً اس نظام پر قائم کر دینا جسے صاحب شریعت علیہ السلام نے "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" کے نام سے موسوم کیا ہے۔

(۹) عالمگیر انقلاب کی کوشش یعنی صرف ایک ملک یا ان ممالک میں جہاں مسلمان پہلے سے موجود ہوں، اسلامی نظام کے قیام پر اکتفا نہ کرنا، بلکہ ایک ایسی طاقتور عالمگیر تحریک برپا کرنا جس سے اسلام کی اصلاحی و انقلابی دعوت عام انسانوں میں پھیل جائے، وہی تمام دنیا کی غالب تہذیب بنے۔ ساری دنیا کے نظام تمدن میں اسلامی طرز کا انقلاب برپا ہو، اور عالم انسانی کی اخلاقی، فکری اور سیاسی امامت و ریاست اسلام کے ہاتھ میں آئے۔

ان شعبوں پر غائر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی تین مدات تو ایسی ہیں جو ہر اس شخص کے لیے ناگزیر ہیں

جو تجدید کی خدمت انجام دے، لیکن باقی ۶ میں ایسی ہیں جن کا جامع ہونا مجدد ہونے کیلئے شرط نہیں ہے بلکہ جس نے ایک دو، تین، یا چار شعبوں میں کوئی نمایاں کارنامہ انجام دیا ہو وہ بھی مجدد قرار دیا جا سکتا ہے۔ البتہ اس قسم کا مجدد، جزوی مجدد ہوگا، کامل مجدد نہ ہوگا۔ کامل مجدد صرف وہ شخص ہو سکتا ہے جو ان تمام شعبوں میں پورا کام انجام دے کر نیابتِ نبوت کا حق ادا کردے۔

مجدد کامل کا مقام | تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک کوئی مجدد کامل پیدا نہیں ہوا ہے، قریب تھا کہ عمر ابن عبدالعزیز اس منصب پر فائز ہو جاتے، مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کے بعد جتنے مجدد پیدا ہوتے ان میں سے ہر ایک نے کسی خاص شعبے یا چند شعبوں ہی میں کام کیا۔ مجدد کامل کا مقام ابھی تک خالی ہے۔ مگر عقل چاہتی ہے، فطرت مطالبہ کرتی ہے، اور دنیا کے حالات کی رفتار متقاضی ہے کہ ایسا "لیڈر" پیدا ہو، خواہ اس دور میں پیدا ہو یا زمانے کی ہزاروں گردشوں کے بعد پیدا ہو، اسی لیڈر کا نام الامام المہدی ہے جس کے بارے میں صاف پیشین گوئیاں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کلام میں موجود ہیں[1]۔

---

[1] اگرچہ یہ پیشین گوئیاں مسلم، ترمذی، ابن ماجہ، مستدرک وغیرہ کتابوں میں کثرت کے ساتھ موجود ہیں مگر یہاں ہم اس روایت کا نقل کرنا فائدے سے خالی نہ سمجھو جو شاطبی نے موافقات میں اور مولانا اسمٰعیل شہید نے منصب امامت میں نقل کی ہے:۔

ان اول دینکم نبوۃ ورحمۃ وتکون فیکم ما شاء اللہ ان تکون ثم یرفعہا اللہ جل جلالہ	تمہارے دین کی ابتدا نبوت اور رحمت سے ہے اور وہ تمہارے درمیان رہے گی جب تک اللہ چاہے گا۔ پھر اللہ جل جلالہ اس کو اٹھالے گا۔
ثم تکون خلافۃ علی منہاج النبوۃ ما شاء اللہ ان تکون ثم یرفعہا اللہ جل جلالہ	پھر نبوت کے طریقہ پر خلافت ہوگی جب تک اللہ چاہے گا پھر اللہ اسے بھی اٹھالے گا۔
ثم تکون ملکا عاضا فیکون ما شاء اللہ ان یکون ثم یرفعہ اللہ جل جلالہ	پھر بد اطوار بادشاہی ہوگی اور جو کچھ اللہ چاہے گا وہ ہوگا پھر اللہ اسے بھی اٹھالے گا۔
ثم تکون ملکا جبریۃ فتکون ما شاء اللہ ان تکون ثم یرفعہا اللہ جل جلالہ	پھر جبر کی فرماں روائی ہوگی اور وہ بھی جب تک اللہ چاہے گا رہے گی پھر اللہ اسے بھی اٹھالے گا۔
ثم تکون خلافۃ علی منہاج النبوۃ تعمل فی الناس بسنۃ النبی ویلقی الاسلام بجرانہ فی الارض یرضی عنہا ساکن السماء وساکن الارض لا تدع السماء من قطر الا صبتہ مدرارا ولا تدع الارض من نباتہا وبرکاتہا شیئا الا اخرجتہ	پھر وہی خلافت بطریق نبوت ہوگی جو لوگوں کے درمیان نبی کی سنت کے مطابق عمل کرے گی اور اسلام زمین میں پاؤں جمالے گا اس حکومت سے آسمان والے بھی راضی ہوں گے اور زمین والے بھی آسمان دل کھول کر اپنی برکتوں کی بارش کرے گا اور زمین اپنے پیٹ کے سارے خزانے اگل دے گی۔

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

آج کل لوگ نادانی کی وجہ سے اس نام کو سن کر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ ان کو شکایت ہے کہ کسی آنے والے مرد کامل کے انتظار نے جاہل مسلمانوں کے قوائے عمل کو سرد کر دیا ہے، اس لیئے ان کی رائے یہ ہے کہ جس حقیقت کا غلط مفہوم لے کر جاہل لوگ بے عمل ہو جائیں وہ سرے سے حقیقت ہی نہ ہونی چاہیئے۔ نیز وہ کہتے ہیں کہ تمام مذہبی قوموں میں کسی "مردے از غیب" کی آمد کا عقیدہ پایا جاتا ہے، لہذا یہ محض ایک وہم ہے۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اگر خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح پچھلے انبیاء نے بھی اپنی قوموں کو یہ خوش خبری دی ہو کہ نوع انسان کی دُنیوی زندگی ختم ہونے سے پہلے ایک دفعہ اسلام ساری دُنیا کا دین بنے گا۔ اور انسان کے بنائے ہوئے سارے "ازموں" کی ناکامی کے بعد آخر کار تباہیوں کا مارا ہوا انسان "اس ازم" کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہوگا جسے خدا نے بنایا ہے، اور یہ نعمت انسان کو ایک ایسے عظیم الشان لیڈر کی بدولت نصیب ہوگی جو انبیاء کے طریقہ پر کام کر کے اسلام کو اس کی صحیح صورت میں پوری طرح نافذ کر دے گا، تو آخر اس میں وہم کی کونسی بات ہے؟ بہت ممکن ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے کلام سے نکل کر یہ چیز دُنیا کی دوسری قوموں میں بھی پھیلی ہو اور جہالت نے اس کی روح نکال کر اوہام کے لبادے اس کے گرد لپیٹ دیئے ہوں۔

مسلمانوں میں جو لوگ الامام المہدی کی آمد کے قائل ہیں وہ بھی اُن متجددین سے جو اس کے قائل نہیں ہیں، اپنی غلط فہمیوں میں کچھ پیچھے نہیں رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ امام مہدی کوئی اگلے وقتوں کے مولویانہ و صوفیانہ وضع قطع کے آدمی ہوں گے، تسبیح ہاتھ میں لیئے یکایک کسی مدرسے یا خانقاہ کے حجرے سے برآمد ہوں گے، آتے ہی انا المہدی کا اعلان کریں گے، علماء اور مشائخ کتابیں لیئے ہوئے پہنچ جائیں گے اور لکھی ہوئی علامتوں سے ان کے جسم کی ساخت وغیرہ کا مقابلہ کر کے انھیں شناخت کریں گے، پھر بیعت ہوگی اور اعلانِ جہاد کر دیا جائے گا، چلے کھینچے ہوئے درویش اور سب پرانے طرز کے "بقیۃ السلف" ان کے جھنڈے تلے جمع ہوں گے، تلوار تو محض شرط پوری کرنے کے لیئے برائے نام چلانی پڑے گی اصل میں سارا کام برکت اور روحانی تصرف سے چلے گا، پھونکوں اور وظیفوں کے زور سے میدان جیتے جائیں گے، جس کافر پر نظر پڑ جائے گی وہ تڑپ کر بے ہوش ہو جائے گا اور محض بد دعا کی تاثیر سے ٹینکوں اور ہوائی جہازوں میں کیڑے پڑ جائیں گے۔ عقیدۂ ظہور مہدی کے متعلق عام لوگوں کے تصورات کچھ اسی قسم کے ہیں۔ مگر میں جو کچھ سمجھا ہوں اس سے مجھ کو

(بسلسلہ صفحہ گذشتہ) میں نہیں کہہ سکتا کہ اسناد کے اعتبار سے اس روایت کا کیا مرتبہ ہے مگر معنی یہ ان تمام روایات سے مطابقت رکھتی ہے جو اس سنن میں وارد ہوئی ہیں۔ اس میں تاریخ کے پانچ مرحلوں کی طرف صاف اشارہ کیا گیا ہے جن میں سے تین گزر چکے ہیں اور چوتھا اب گزر رہا ہے آخری جس پانچویں مرحلہ کی پیشین گوئی کی گئی ہے، تمام قرائن بتا رہے ہیں کہ انسانی تاریخ تیزی کے ساتھ اس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ انسانی ساخت کے سارے ازم آزمائے جا چکے ہیں اور بری طرح ناکام ہوئے ہیں۔ آدمی کے لیئے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ تھک ہار کر اسلام کی طرف رجوع کرے۔

معاملہ بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ آنے والا اپنے زمانے میں بالکل جدید ترین طرز کا لیڈر ہوگا، وقت کے تمام علوم جدیدہ پر اس کو مجتہدانہ بصیرت حاصل ہوگی، زندگی کے سارے مسائل مہمہ کو وہ خوب سمجھتا ہوگا، عقلی و ذہنی ریاست سیاسی تدبر اور جنگی مہارت کے اعتبار سے وہ تمام دنیا پر اپنا سکہ جما دے گا، اور اپنے عہد کے تمام جدید والوں سے بڑھکر جدید ثابت ہوگا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی جدتوں کے خلاف مولوی اور صوفی صاحبان ہی سب سے پہلے شورش برپا کریں گے۔ پھر مجھے یہ بھی امید نہیں کہ اپنی جسمانی ساخت میں وہ عام انسانوں سے کچھ بہت مختلف ہوگا کہ اس کی علامتوں سے اس کو تاڑ لیا جائے گا۔ نہ میں یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ اپنے مہدی ہونے کا اعلان کرے گا، بلکہ شاید اسے خود بھی اپنے مہدی موعود ہونے کی خبر نہ ہوگی اور اس کی موت کے بعد اس کے کارناموں سے دنیا کو معلوم ہوگا کہ یہی تھا وہ خلافت کو منہاج النبوۃ پر قائم کرنے والا جس کی آمد کا مژدہ سنایا گیا تھا۔[1] جیسا کہ میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں، نبی کے سوا کسی کا یہ منصب ہی نہیں ہے کہ دعوے سے کام کا آغاز کرے اور نہ نبی کے سوا کسی کو یقینی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس خدمت پر مامور ہوا ہے، مہدویت دعویٰ کرنے کی چیز نہیں، کر کے دکھا جانے کی چیز ہے۔ اس قسم کے دعوے جو لوگ کرتے ہیں اور جو ان پر ایمان لاتے ہیں، میرے نزدیک دونوں اپنے علم کی کمی اور اپنے ذہن کی پستی کا ثبوت دیتے ہیں۔

مہدی کے کام کی نوعیت کا جو تصور میرے ذہن میں ہے وہ بھی ان حضرات کے تصور سے بالکل مختلف ہے مجھے اس کے کام میں کرامات، خوارق، کشوف و الہامات اور چلّوں اور مجاہدوں کی کوئی جگہ نظر نہیں آتی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایک "انقلابی لیڈر" کو دنیا میں جس طرح شدید جدوجہد اور کشمکش کے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ انہی مرحلوں سے مہدی کو بھی گزرنا ہوگا، وہ خالص اسلام کی بنیادوں پر ایک نیا مذہب فکر (School of thought) پیدا کرے گا ذہنیتوں کو بدلے گا، ایک زبردست تحریک اٹھائے گا جو بیک وقت تہذیبی بھی ہوگی اور سیاسی بھی، جاہلیت اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ اس کو کچلنے کی کوشش کرے گی، مگر بالآخر وہ جاہلی اقتدار کو الٹ کر پھینک دے گا اور ایک ایسا زبردست اسلامی اسٹیٹ قائم کرے گا جس میں ایک طرف اسلام کی پوری روح کارفرما ہوگی، اور دوسری طرف سائنٹفک ترقی اوج کمال پر پہونچ جائیگی، جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ "اس حکومت سے آسمان والے بھی راضی ہوں گے اور زمین والے بھی، آسمان دل کھول کر اپنی برکتوں کی بارش کرے گا اور زمین اپنے پیٹ کے سارے خزانے اگل دے گی"۔

اگر یہ توقع صحیح ہے کہ ایک وقت میں اسلام تمام دنیا کے افکار، تمدن اور سیاست پر چھا جانے والا ہے تو ایسے ایک عظیم الشان لیڈر کی پیدائش بھی یقینی ہے جس کی ہمہ گیر اور پر زور قیادت میں یہ انقلاب رونما ہوگا۔ جن لوگوں کو

[1] الفرقان۔ یہ خط کشیدہ فقرے اب تک کے اپنے معلومات کے صریح خلاف ہونے کی وجہ سے کچھ ادھورے سے معلوم ہوئے لیکن تلاش کے باوجود مجھے اس کے خلاف کوئی صحیح حدیث نہیں ملی جس میں تصریح ہوتی کہ حضرت مہدی اپنی مہدویت کے مدعی بھی ہوں گے اور لوگوں کو اس کے ماننے کی دعوت بھی دیں گے، لیکن اس وقت میرے پاس صحاح ستہ اور جمع الفوائد کے علاوہ حدیث کی کوئی اور کتاب بھی نہیں ہے اگر کوئی اور صاحب اس موضوع پر کوئی خاص روشنی ڈال سکیں تو الفرقان میں ان کی تحقیق شکریہ کے ساتھ شایع کی جائے گی۔ ۱۲ م

ایسے لیڈر کے ظہور کا خیال سُن کر حیرت ہوتی ہے مجھے ان کی عقل پر حیرت ہوتی ہے۔ جب خدا کی اس خدائی میں لینن اور ہٹلر جیسے ائمۂ ضلالت کا ظہور ہو سکتا ہے تو آخر ایک امام ہدایت ہی کا ظہور کیوں مستبعد ہو؟

جزوی مجددین اور ان کا کام | تاریخی ترتیب کو چھوڑ کر مستقبل کے مجددِ اعظم کا ذکر میں نے پہلے اس لیے کر دیا کہ لوگ پہلے مجددِ کامل کے مرتبہ و مقام سے واقف ہو جائیں تاکہ کمال مطلوب کے مقابلہ میں ان کے لیے جزوی تجدیدوں کے مرتبہ و مقام کا اندازہ کرنا آسان ہو جائے۔ اب میں ایک مختصر نقشہ اس تجدیدی کام کا پیش کروں گا جو اب تک انجام پا چکا ہے۔

عمر بن عبدالعزیز

اسلام کے سب سے پہلے مجدد عمر ابن عبدالعزیز[1] ہیں شاہی خاندان میں آنکھ کھولی ہوش سنبھالا تو اپنے باپ کو مصر جیسے عظیم الشان صوبہ کا گورنر پایا۔ بڑے ہوئے تو خود اموی سلطنت کے ماتحت گورنری پر مامور ہوئے۔ شاہان بنی امیہ نے جن جاگیروں سے اپنے خاندان کو مالا مال کیا تھا ان میں ان کا اور ان کے گھرانے کا بھی بہت بڑا حصہ تھا، حتیٰ کہ خاص ان کی ذاتی جائداد کی آمدنی پچاس ہزار اشرفی سالانہ تک پہونچتی تھی۔ رئیسوں کی طرح پوری شان سے رہتے تھے، لباس خوراک، سواری، مکان، عادات و خصائل سب وہی تھے جو شاہی حکومت میں شاہزادوں کے ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کا ماحول اُس کام سے دور کی مناسبت بھی نہ رکھتا تھا جو بعد میں اُنھوں نے انجام دیا لیکن ان کی ماں حضرت عمرؓ کی پوتی تھیں۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کو پچاس ہی برس ہوئے تھے جب وہ پیدا ہوئے، انکے زمانہ میں صحابہ اور تابعین بکثرت موجود تھے۔ ابتدا میں انھوں نے حدیث اور فقہ کی پوری تعلیم پائی تھی یہاں تک کہ محدثین کی صفِ اوّل میں شمار ہوتے تھے اور فقہ میں اجتہاد کا درجہ رکھتے تھے۔ پس علمی حیثیت سے تو ان کے لئے یہ جاننے اور سمجھنے میں کوئی دقت نہ تھی کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین مہدیین کے عہد میں تمدن کی اساس کن چیزوں پر تھی اور جب خلافت پادشاہی سے بدلی تو ان بنیادوں میں کس نوعیت کا تغیر واقع ہوا۔ البتہ جو چیز عملی حیثیت سے اُن کے راستے میں رکاوٹ ہو سکتی تھی وہ یہ تھی کہ اس جاہلی انقلاب کا بانی خود ان کا اپنا خاندان تھا اُس کے تمام فائدے اور بے حد و حساب فائدے اُن کے بھائی بندوں اور خود اُن کی ذات اور اُن کے بال بچوں کو پہنچتے تھے اور اُن کی خاندانی عصبیت، ذاتی طمع اور اپنی آئندہ نسل کی دُنیوی خیر خواہی کا پورا تقاضا یہ تھا کہ وہ بھی تخت شاہی پر فرعون بن کر بیٹھیں، اپنے علم اور ضمیر کو ٹھوس مادی فائدوں کے مقابلہ میں قربان کریں اور حق، انصاف، اخلاق اور اصول کے چکر میں نہ پڑیں۔ مگر جب ۳۶ سال کی عمر میں بالکل اتفاقی طور پر تختِ شاہی ان کے حصہ میں آیا اور انھوں نے محسوس کیا کہ کس قدر عظیم الشان ذمہ داری ان پر آ پڑی ہے تو دفعتہً ان کی زندگی کا رنگ بدل گیا۔ انھوں نے اس طرح کسی ادنے تامل کے بغیر جاہلیت کے مقابلہ میں اسلام کے راستے کو اپنے لئے منتخب کیا کہ گویا یہ ان کا پہلے سے سوچا سمجھا ہوا فیصلہ تھا۔

[1] سنہ ۶۱ھ میں پیدا ہوئے سنہ ۱۰۱ھ میں وفات پائی۔

تحویت شاہی انھیں خاندانی طریق پر ملا تھا مگر بیعت لیتے وقت مجمع عام میں صاف کہدیا کہ میں اپنی بیعت سے تمھیں آزاد کرتا ہوں، تم لوگ جس کو چاہو خلیفہ منتخب کرلو۔ اور جب لوگوں نے برضا و رغبت کہا کہ ہم آپ ہی کو منتخب کرتے ہیں تب انھوں نے خلافت کی عنان اپنے ہاتھ میں لے لی۔

پھر شاہانہ کر و فر، فرعونی انداز، قیصر و کسریٰ کے درباری طریقے اسب رخصت کیئے اور پہلے روز لوازم شاہی کو ترک کر کے وہ طرز اختیار کیا جو مسلمانوں کے درمیان اُن کے خلیفہ کا ہونا چاہیئے۔

اس کے بعد ان امتیازات کی طرف توجہ کی جو شاہی خاندان کے لوگوں کو حاصل تھے اور ان کو تمام حیثیتوں سے عام مسلمانوں کے برابر کر دیا۔ وہ تمام جاگیریں جو شاہی خاندان کے قبضہ میں تھیں، اپنی جاگیر سمیت بیت المال کو واپس کیں، جن جن کی زمینوں اور جائدادوں پر ناجائز قبضہ کیا گیا تھا وہ سب ان کو واپس دیں ــــ ان کی اپنی ذات کو اس تغیر سے جو نقصان پہونچا اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ پچاس ہزار کی جگہ صرف ۲۰۰ دوسو اشرفی سالانہ کی آمدنی رہ گئی۔ بیت المال کے روپے کو اپنی ذات پر اور اپنے خاندان والوں پر حرام کر دیا حتیٰ کہ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے تنخواہ تک نہ لی۔ اپنی زندگی کا سارا نقشہ بدل دیا۔ یا تو خلیفہ ہونے سے پہلے شاہانہ شان کے ساتھ رہتے تھے یا خلیفہ ہوتے ہی فقیر بن گئے۔

گھر اور خاندان کی اس اصلاح کے بعد نظام حکومت کی طرف توجہ کی۔ ظالم گورنروں کو الگ کیا اور ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر صالح آدمی تلاش کیئے کہ گورنری کی خدمت انجام دیں۔ عاملین حکومت، جو قانون اور ضابطہ سے آزاد ہو کر رعایا کی جان، مال، آبرو پر غیر محدود اختیارات کے مالک ہو گئے تھے، ان کو پھر ضابطہ کا پابند بنایا اور قانون کی حکومت قایم کی۔ ٹیکس عائد کرنے کی پوری پالیسی بدل دی، اور وہ تمام ناجائز ٹیکس جو شاہان بنی امیہ نے عائد کر دیئے تھے، جن میں انجاری تک کا محصول شامل تھا، یک قلم موقوف کیئے۔ زکوٰۃ کی تحصیل کا انتظام از سر نو درست کیا اور بیت المال کی دولت کو پھر سے عام مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیئے وقف کر دیا۔ غیر مسلم رعایا کے ساتھ جو ناانصافیاں کی گئی تھیں اُن سب کی تلافی کی، ان کے معابد جن پر ناجائز قبضہ کیا گیا تھا انھیں واپس دلائے، ان کی زمینیں جو غصب کر لی گئی تھیں پھر واگذاشت کیں اور ان کے تمام وہ حقوق بحال کیئے جو شریعت کی رو سے انھیں حاصل ہیں عدالت کو انتظامی حکومت کے دخل سے آزاد کیا اور حکم بین الناس کے ضابطہ اور اسپرٹ دونوں کو شاہی نظام کے اثرات سے پاک کر کے اسلامی اصول پر قایم کر دیا۔ اس طرح حضرت عمر ابن عبدالعزیز کے ہاتھوں سے اسلامی نظام حکومت دوبارہ زندہ ہوا۔

پھر انھوں نے سیاسی اقتدار سے کام لے کر لوگوں کی ذہنی، اخلاقی اور معاشرتی زندگی سے جاہلیت کے اُن اثرات کو نکالنا شروع کیا جو نصف صدی کی جاہلی حکومت کے سبب سے اجتماعی زندگی میں پھیل گئے تھے۔ فاسد

عقیدوں کی اشاعت کو روکا۔ عوام کی تعلیم کا وسیع پیمانہ پر انتظام کیا، قرآن، حدیث اور فقہ کے علوم کی طرف اہل دماغ طبقوں کی توجہات کو دوبارہ منعطف کیا اور ایک ایسی علمی تحریک پیدا کردی جس کے اثر سے اسلام کو ابوحنیفہ، مالک، شافعی، اور احمد ابن حنبل جیسے مجتہدین میسر آئے۔ اتباع شریعت کی روح کو تازہ کیا، شراب نوشی، تصویر کشی اور عیش وتنعم کی بیماریاں جو شاہی نظام کی بدولت پیدا ہوچکی تھیں، انکا انسداد کیا، اور فی الجملہ وہ مقصد پورا کیا جس کے لیے اسلام اپنی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے، یعنی اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ۔

بہت ہی قلیل مدت میں اس انقلاب حکومت کے اثرات عوام کی زندگی پر اور بین الاقوامی حالات پر مترتب ہونے شروع ہوگئے۔ ایک راوی کہتا ہے کہ ولید کے زمانہ میں لوگ جب آپس میں بیٹھتے تو عمارات اور باغوں کے متعلق گفتگو کرتے۔ سلیمان بن عبدالملک کا زمانہ آیا تو عوام کا مذاق صنفی معاملات کی طرف متوجہ ہوگیا، مگر جب عمر بن عبدالعزیز حکمران ہوئے تو حالت یہ تھی کہ جہاں چار آدمی جمع ہوئے نماز اور روزہ اور قرآن کا ذکر چھڑ جاتا تھا۔ غیر مسلم رعایا پر اس حکومت کا اتنا زبردست اثر ہوا کہ ہزار در ہزار آدمی اس مختصر سی مدت میں مسلمان ہوگئے اور جزیہ کی آمدنی دفعتہً اتنی گھٹ گئی کہ سلطنت کے مالیات اس سے متاثر ہوگئے۔ مملکت اسلامی کے اطراف میں جو غیر مسلم ریاستیں موجود تھیں، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ان کو اسلام کی طرف دعوت دی اور ان میں سے متعدد ریاستوں نے اس دین کو قبول کرلیا۔ اسلامی حکومت کی سب سے بڑی حریف سلطنت اس وقت روم کی سلطنت تھی جس کے ساتھ ایک صدی سے لڑائیوں کا سلسلہ جاری تھا اور اس وقت بھی سیاسی کشمکش چل رہی تھی۔ مگر عمر ابن عبدالعزیز کا جو اخلاقی اثر روم پر قائم ہوا اس کا اندازہ ان الفاظ سے کیا جاسکتا ہے جو ان کے انتقال کی خبر سن کر خود قیصر روم نے کہے تھے۔ اس نے کہا کہ:

> اگر کوئی راہب دنیا کو چھوڑ کر اپنے دروازے بند کرلے اور عبادت میں مشغول ہوجائے تو مجھے اس پر کوئی حیرت نہیں ہوتی۔ مگر مجھے حیرت ہے تو اس شخص پر جس کے قدموں کے نیچے دنیا تھی اور پھر اسے ٹھکرا کر اس نے فقیرانہ زندگی بسر کی۔"

اسلام کے اس مجدد اول کو صرف ڈھائی سال کام کرنے کا موقع ملا اور اس مختصر سی مدت میں اس نے یہ انقلاب عظیم برپا کرکے دکھا دیا۔ بنی امیہ کا پورا خاندان اس بندۂ خدا کا دشمن ہوگیا تھا۔ اسلام کی زندگی میں ان لوگوں کی موت تھی، وہ اس تجدید کے کام کو کس طرح برداشت کرسکتے تھے۔ آخرکار انھوں نے سازش کرکے زہر دیدیا اور صرف ۳۹ سال کی عمر میں یہ خادم دین و ملت دنیا سے رخصت ہوگیا جس کا رنج ہے۔ جو کام اس نے شروع کیا تھا، اس کی تکمیل میں اب صرف اتنی کسر باقی تھی کہ خاندانی حکومت کو ختم کرکے انتخابی خلافت کا سلسلہ پھر سے قائم کردیا جاتا۔ یہ اصلاح اس کے پیش نظر تھی، اور اپنے عندیہ کا اس نے اظہار بھی کردیا تھا، مگر اموی اقتدار کی جڑوں کو اجتماعی زندگی سے اکھاڑنا

اور عام مسلمانوں کی اخلاقی و ذہنی حالت کو خلافت کا بار سنبھالنے کے لئے تیار کرنا اتنا آسان کام نہ تھا کہ ڈھائی برس کے اندر انجام پا سکتا۔

ائمہ اربعہ

عمر ثانی کی وفات کے بعد اگرچہ سیاسی اقتدار کی کنجیاں پھر اسلام سے جاہلیت کی طرف منتقل ہو گئیں، اور سیاسی پہلو میں اُس پورے کام پر پانی پھر گیا جو اُنھوں نے انجام دیا تھا، مگر اسلامی ذہنیت میں جو بیداری اُنھوں نے پیدا کر دی تھی اور جس علمی حرکت کو وہ اکسا گئے تھے اُسے کوئی طاقت بار آور ہونے سے نہ روک سکی۔ بنی اُمیہ اور بنی عباس کے کوڑے اور اشرفیوں کے توڑے، دونوں ہی اس کے راستے میں حائل ہوئے، مگر کسی کی بھی اس کے آگے پیش نہ چلی۔ اس تحریک کے اثر سے قرآن و حدیث کے علوم میں تحقیق، اجتہاد اور تدوین کا بہت بڑا کام ہوا، اصول دین سے اسلام کے قوانین کی تفصیلی شکل مرتب کی گئی اور ایک وسیع نظامِ تمدن کو اسلامی طرز پر چلانے کے لئے جس قدر ضوابط و مناہج عمل کی ضرورت تھی وہ تقریباً سارے کے سارے اپنے تمام جزئیات کے ساتھ مدون کر ڈالے گئے۔ دوسری صدی کے آغاز سے تقریباً چوتھی صدی تک یہ کام پوری قوت کے ساتھ چلتا رہا۔

اس دور کے مجددین وہ چار بزرگ ہیں[۱] جن کی طرف آج فقہ کے چاروں مذاہب منسوب ہیں۔ اگرچہ مجتہد ان کے سوا اور بھی کثیر التعداد اصحاب تھے۔ مگر جس لحاظ سے ان حضرات کا مقام مجتہدین سے بلند ہو کر مجددین کے مرتبہ تک پہنچتا ہے وہ یہ ہے کہ

اوّلاً ان حضرات نے اپنی گہری بصیرت اور غیر معمولی ذکاوت و ذہانت سے ایسے مذاہب فکر پیدا کئے جنکی زبردست طاقت سات آٹھ صدیوں تک مجتہد پیدا کرتی رہی۔ انھوں نے کلیاتِ دین سے جزئیات مستنبط کرنے اور اصولِ شرع کو زندگی کے عملی مسائل پر منطبق کرنے کے ایسے وسیع و ہمہ گیر طریقے قائم کر دیے کہ آگے چل کر جس قدر اجتہادی کام ہوا اُن ہی کے طریقوں پر ہوا اور آئندہ بھی جب کبھی اس سلسلہ میں کوئی کام ہو گا ان کی رہنمائی سے انسان بے نیاز نہ ہو سکے گا۔

ثانیاً ان لوگوں نے یہ سارا کام شاہی نظامِ حکومت کی امداد کے بغیر، اس کی مداخلت سے بالکل آزاد ہو کر، بلکہ اس کی دراندازیوں کا سخت مقابلہ کر کے انجام دیا اور اس سلسلہ میں وہ وہ تکلیفیں اُٹھائیں جن کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ نے بنی اُمیہ اور بنی عباس دونوں کے زمانہ میں کوڑوں کی مار اور قید کی سزائیں بھگتیں یہاں تک کہ زہر سے ان کا خاتمہ ہی کر دیا گیا۔ امام مالک کو منصور عباسی کے زمانہ میں کوڑوں کی سزا دی گئی اور اس بُری طرح ان کی

---

[۱] امام ابو حنیفہ سنہ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے سنہ ۱۵۰ھ میں وفات پائی۔ امام مالک سنہ ۹۰ھ میں پیدا ہوئے سنہ ۱۷۹ھ میں وفات پائی۔ امام شافعی سنہ ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے سنہ ۲۰۴ھ میں وفات پائی۔ امام احمد ابن حنبل ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے سنہ ۲۴۱ھ میں وفات پائی۔

مشکیں کسی گئیں کہ ہاتھ بازو سے اکھڑ گیا۔ امام احمد ابن حنبل پر مامون، معتصم اور واثق تینوں کے زمانے میں مسلسل مصائب و شدائد کے پہاڑ ٹوٹتے رہے، اتنا اتنا مارا گیا کہ شاید اونٹ اور ہاتھی بھی اس مار کی تاب نہ لاسکیں۔ اور پھر متوکل کے زمانے میں شاہی انعام و اکرام اور عقیدت و تعظیم کی وہ بارش ان پر کی گئی کہ گھبرا کر پکار اٹھے کہ ھذا امر اشد علی من ذالک (یہ مجھ پر اس مار اور قید سے زیادہ سخت مصیبت ہے) مگر ان سب باتوں کے باوجود ان اللہ کے بندوں نے علم دین کی ترتیب و تدوین میں نہ صرف خود شاہی نفوذ و اثر کو گھسنے کا راستہ نہ دیا بلکہ کچھ ایسی طرح ڈال گئے کہ ان کے بعد بھی سارا اجتہادی و تمدینی کام بالکلیہ درباروں کے دخل سے آزاد رہا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج اسلامی قوانین اور علوم حدیث و قرآن کا جتنا معتبر و مستند ذخیرہ ہم تک پہونچا ہے وہ جاہلیت کے ادنیٰ شائبہ سے بھی ملوث نہیں ہوا ہے۔ یہ چیزیں ایسی پاک صاف صورت میں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی ہیں کہ صدیوں تک پادشاہوں اور امراء کی نفس پرستیوں اور عوام کے اخلاقی تنزل اور اعتقادی و تمدنی گمراہیوں کا جو دور دورہ رہا وہ گویا ان علوم کے لیے معدوم محض تھا، اس کا کوئی اثر ان علوم پر نہیں پایا جاتا۔

امام غزالیؒ

عمر بن عبدالعزیز کے بعد سیاست و حکومت کی باگیں مستقل طور پر جاہلیت کے ہاتھوں میں چلی گئیں اور بنی امیہ، بنی عباس اور پھر ترکی النسل بادشاہوں کا اقتدار قایم ہوا۔ ان حکومتوں نے جو خدمات انجام دیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک طرف یونان، روم، اور عجم کے جاہلی فلسفوں کو جوں کا توں لے کر مسلمانوں میں پھیلا دیا اور دوسری طرف علوم و فنون اور تمدن و معاشرت میں جاہلیت اولیٰ کی تمام گمراہیوں کو اپنی دولت اور طاقت کے زور سے شایع و ذائع کیا۔ عباسی خاندان کے تنزل نے مزید نقصان یہ پہونچایا کہ ابتدائی عباسی خلفاء کے بعد دنیوی اقتدار کی باگیں جن لوگوں کے ہاتھوں میں آئیں وہ علوم دینی سے بالکل ہی کورے تھے ان میں اتنی صلاحیت بھی نہ تھی کہ قضاء اور افتاء کے عہدوں کے لیے اہل آدمیوں کو منتخب کر سکتے اپنی جہالت اور سہولت پسندی کی وجہ سے وہ احکام شرعیہ کی تنفیذ کا کام ایسے لگے بندھے طریقوں پر کرنا چاہتے تھے جن میں کسی کد و کاوش کی ضرورت نہ ہو اور اس کے لیے تقلید جامد ہی کا راستہ موزوں تھا۔ مزید براں دنیا پرست علما نے ان کو مذہبی مناظروں کی چاٹ بھی لگا دی، اور پھر شاہی سرپرستی میں یہ مرض تمام پھیلا کہ اس نے تمام مسلم ممالک میں فرقہ بندی اختلاف اور سر پھٹول کی وبا پھیلا دی۔

پانچویں صدی تک پہونچتے پہونچتے یہ حال ہو گیا کہ

(۱) یونانی فلسفے کی اشاعت سے عقائد کی بنیادیں ہل گئیں، محدثین و فقہاء علوم عقلیہ سے ناواقف تھے اسلئے نظام دین کو مقتضائے زمانہ کے مطابق معقول انداز سے سمجھا نہ سکتے تھے اور زجر و توبیخ سے اعتقادی گمراہیوں کو دبانے کی کوشش کرتے تھے۔ علوم عقلیہ میں جن لوگوں کے کمال کا شہرہ تھا وہ نہ صرف یہ کہ علوم دینیہ میں کوئی بصیرت نہ رکھتے تھے بلکہ فلاسفہ یونان کے بالکل ذہنی غلام تھے اور ان میں کوئی ایسا بالغ النظر آدمی نہ تھا جو تنقید کی نگاہ سے اس یونانی لٹریچر

جائزہ لیا متکلمین کا جوگروہ اسلام کی حمایت کے لئے اٹھا اس نے وحی یونانی کو تو اٹل سمجھ کر جوں کا توں تسلیم کر لیا: اور شریعت کو توڑنا اور مروڑنا شروع کیا تاکہ اس کے مطابق ڈھل جائے۔ ان حالات کا عام مسلمانوں پر یہ اثر ہوا کہ وہ دین کو ایک غیر معقول چیز سمجھنے لگے، اس کی ہر چیز انھیں مشکوک نظر آنے لگی اور ان میں یہ خیال جاگزیں ہوتا چلا گیا کہ ہمارا دین ایک چھوئی موئی کا درخت ہے جو عقلی امتحان کی ذرا سی ٹھیس سے مرجھا جاتا ہے۔ امام ابوالحسن اشعری اور ان کے متبعین نے اس رَو کو بدلنے کی کوشش کی مگر یہ گروہ متکلمین کے علوم سے تو واقف تھا، لیکن معقولات کے گھر کا بھیدی نہ تھا اس لئے وہ عام بے اعتقادی کی رفتار کو بدلنے میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا، بلکہ معتزلہ کی ضد میں اس نے بعض ایسی باتوں کا التزام کیا جو فی الواقع عقائد دین میں سے نہ تھیں۔

(۲) جاہل زبان رواؤں کے اثر سے، اور علوم دینی کو مادّی وسائل کی تائید بہم نہ پہونچنے کے سبب سے اجتہاد کے چشمے خشک ہو گئے، تقلید جامد کی بیماری پھیل گئی، مذہبی اختلافات نے ترقی کر کے ذرا ذرا سے جزئیات پر نئے نئے فرقے پیدا کر دیئے اور ان فرقوں کی باہمی لڑائیوں سے مسلمانوں کی یہ حالت ہو گئی کہ گویا علےٰ شفا حفرۃ من النار ہیں۔

(۳) مشرق سے مغرب تک مسلم ممالک میں ہر طرف اخلاقی انحطاط رونما ہو گیا جس کے اثر سے کوئی طبقہ خالی نہ تھا قرآن اور نبوت کی روشنی سے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی بڑی حد تک خالی ہو گئی۔ علماء، امراء، عوام، سب بھول گئے کہ خدا کی کتاب اور رسول کی سنت بھی کوئی چیز ہے جس کی ہدایت و رہنمائی کے لیے کبھی رجوع کرنا چاہیئے۔

(۴) شاہی درباروں، خاندانوں، اور حکمراں طبقوں کی عیاشانہ زندگی اور خود غرضانہ لڑائیوں کی وجہ سے عموماً رعایا تباہ حال ہو رہی تھی، ناجائز ٹیکسوں کے بار نے معاشی زندگی کو نہایت خراب کر دیا تھا۔ تمدن کو حقیقی فائدہ پہونچانے والے علوم و صنائع روبہ تنزل تھے اور اُن فنون کا زور تھا جو شاہی درباروں میں قدر و منزلت رکھتے تھے مگر اخلاق و تمدن کے لئے غارت گر تھے۔ آثار سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ عام تباہی کا وقت قریب آلگا ہے۔

یہ حالات تھے جب پانچویں صدی کے وسط میں امام غزالی پیدا ہوئے[لہ] انھوں نے ابتداءً اس طرز کی تعلیم حاصل کی جو اس زمانہ میں دُنیوی ترقی کا ذریعہ بن سکتی تھی۔ انہی علوم میں کمال پیدا کیا جن کی بازار میں مانگ تھی، پھر اس منس کو لیکر وہاں پہونچے جہاں کے لئے تیار ہوئے تھے اور اُن بلند ترین مراتب تک ترقی کی جن کا تصور اس زمانہ میں کوئی عالم کر سکتا تھا۔ دُنیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی ——— نظامیہ بغداد ——— کے ریکٹر مقرر ہوئے۔ نظام الملک طوسی، ملک شاہ سلجوقی اور خلیفہ، بغداد کے درباروں میں اعتماد حاصل کیا۔ وقت کے سیاسیات میں یہاں تک دخیل ہوئے کہ سلجوقی تاجدار اور عباسی خلیفہ، کے درمیان جو اختلافات پیدا ہوتے تھے ان کو سلجھانے کے لئے ان کی مددات حاصل کی جاتی تھیں۔ دُنیوی عروج کے اس نقطہ پر پہونچ جانے کے بعد ان کی زندگی میں انقلاب رونما ہوا۔ اپنے زمانہ کی علمی، اخلاقی، مذہبی، سیاسی اور تمدنی

لہ ۴۵۰ھ ۱۰۵۸ء میں پیدا ہوئے۔ ۵۰۵ھ ۱۱۱۱ء میں وفات پائی۔

زندگی کو جتنی گہری نظر سے دیکھتے گئے اسی قدر ان کے اندر بغاوت کا جذبہ ابھرتا چلا گیا، اور اسی قدر ان کے ضمیر نے زیادہ زور سے صدا لگانی شروع کی کہ تم اس گندے سمندر کی شناوری کے لئے نہیں ہو بلکہ تمہارا فرض کچھ اور ہے، آخر کار اُن تمام اعزازات اور فوائد و منافع اور مشاغل پر لات ماری جن کے جنجال میں پھنسے ہوئے تھے، فقیرانہ سیاحت کے لئے نکل کھڑے ہوئے، گوشوں اور ویرانوں میں رہ کر غور و خوض کیا، چل پھر کر عام مسلمانوں کی زندگی کا گہرا مشاہدہ کیا، اور مشاہدات و ریاضات سے اپنی روح کو صاف کرتے رہے۔ ۳۸ سال کی عمر میں نکلے تھے، پورے دس برس کے بعد ۴۸ سال کی عمر میں واپس ہوئے، اور اس طویل غور و فکر و مشاہدہ کے بعد جو کام کیا وہ یہ تھا کہ بادشاہوں کے تعلق اور ان کی وظیفہ خواری سے توبہ کی، جدال و تعصب سے پرہیز کرنے کا دائمی عہد کیا، اُن تعلیمی ادارات میں کام کرنے سے انکار کر دیا جو سرکاری اثر میں ہوں، اور طوس میں خود اپنا ایک آزاد ادارہ قائم کیا۔ اس ادارہ میں وہ چیدہ افراد کو اپنے خاص طرز پر تعلیم و تربیت دے کر تیار کرنا چاہتے تھے، مگر غالباً ان کی یہ کوشش کوئی بڑا انقلاب انگیز کام نہ کر سکی کیونکہ پانچ چھ سال سے زیادہ ان کو اس طرز خاص پر کام کرنے کی اجل ہی نے مہلت نہ دی۔

امام غزالی کے تجدیدی کام کا خلاصہ یہ ہے۔

اولاً انھوں نے فلسفۂ یونان کا نہایت گہرا مطالعہ کر کے اس پر تنقید کی اور اتنی زبردست تنقید کی کہ وہ رعب جو مسلمانوں پر چھا گیا تھا، کم ہو گیا، اور لوگ جن نظریات کو حقائق سمجھے بیٹھے تھے، جن پر قرآن و حدیث کی تعلیمات کو منطبق کرنے کے سوا دین کے بچاؤ کی کوئی صورت انھیں نظر نہ آتی تھی، اُن کی اصلیت سے بڑی حد تک آگاہ ہو گئے۔ امام کی اس تنقید کا اثر مسلم ممالک ہی تک محدود نہ رہا بلکہ یورپ تک پہنچا اور وہاں بھی اس نے فلسفۂ یونان کے تسلط کو مٹانے اور جدید دور تنقید و تحقیق کا فتح باب کرنے میں حصّہ لیا۔

ثانیاً انھوں نے ان غلطیوں کی اصلاح کی جو فلاسفہ و متکلمین کی ضد میں اسلام کے وہ حمایتی کر رہے تھے جو علوم عقلیہ میں گہری بصیرت نہ رکھتے تھے۔ یہ لوگ اسی قسم کی حماقتیں کر رہے تھے جو بعد میں یورپ کے پادریوں نے کیں یعنی مذہبی عقائد کے اثبات کو بعض صریح غیر معقول باتوں پر موقوف سمجھ کر خواہ مخواہ اُن کو اصول موضوعہ قرار دے لیتے اور ان کو بھی عقائد دین میں داخل کر کے ہر اُس شخص کی تکفیر کرتے جو ان باتوں کا قائل نہ ہو اور ہر اس بُرہان یا تجربہ یا مشاہدہ کو دین کے لئے خطرہ سمجھتے جس سے ان کے مزعومات کی غلطی ثابت ہوتی ہو۔ اسی چیز نے یورپ کو بالآخر دہریت کی طرف دھکیل دیا۔ مگر مسلم ممالک میں امام غزالی نے بروقت اس کی اصلاح کی اور مسلمانوں کو بتایا کہ تمہارے عقائد دینی کا اثبات ان غیر معقولات کے التزام پر منحصر نہیں ہے بلکہ اس کے لئے معقول دلائل موجود ہیں، لہٰذا ان چیزوں پر اصرار فضول ہے۔

ثالثاً انھوں نے اسلام کے عقائد اور اساسیات (Fundamentals) کی ایسی معقول تعبیر پیش کی جس پر کم از کم اس زمانہ کے اور بعد کی کئی صدیوں تک کے معقولات کی بنا پر کوئی اعتراض نہ ہو سکتا تھا۔ اس کے ساتھ احکام شریعت

اور عبادات و مناسک کے اسرار و مصالح بھی بیان کیے اور دین کا ایک ایسا تصور لوگوں کے سامنے رکھا جس سے وہ غلط فہمیاں دور ہوگئیں جن کی بنا پر پہلے یہ گمان ہونے لگا تھا کہ اسلام عقلی امتحان کا بوجھ نہیں سہار سکتا۔

رابعًا انھوں نے اپنے وقت کے تمام مذہبی فرقوں اور ان کے اختلافات پر نظر ڈالی اور پوری تحقیق کے ساتھ بتایا کہ اسلام اور کفر کی امتیازی سرحدیں کیا ہیں، کن حدود کے اندر انسان کے لیے رائے و تاویل کی آزادی ہے، اور کن حدود سے تجاوز کرنے کے معنی اسلام سے نکل جانے کے ہیں، اسلام کے اصلی عقائد کون سے ہیں اور وہ کیا چیزیں ہیں جن کو خواہ مخواہ عقائد دین میں داخل کر لیا گیا ہے۔ اس تحقیقات نے ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے اور تکفیر بازی کرنے والے فرقوں کی سرگوں سے بہت سی باروت نکال دی اور لوگوں کے زاویۂ نظر میں وسعت پیدا کی۔

خامسًا انھوں نے دین کے فہم کو تازہ کیا، بے شعوری کی مذہبیت کو فضول ٹھیرایا، تقلید جامد کی سخت مخالفت کی لوگوں کو کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے چشمۂ فیض کی طرف پھر سے توجہ دلائی، اجتہاد کی روح کو تازہ کرنے کی کوشش کی، اور اپنے عہد کے تقریبًا ہر گروہ کی گمراہیوں اور کمزوریوں پر تنقید کر کے اصلاح کی طرف عام دعوت دی۔

سادسًا انھوں نے اس نظام تعلیم پر تنقید کی جو بالکل فرسودہ ہو چکا تھا اور تعلیم کا ایک نیا نظام تجویز کیا۔ اس وقت تک مسلمانوں میں جو نظام تعلیم قائم تھا اس میں دو قسم کی خرابیاں پائی جاتی تھیں۔ ایک یہ کہ علوم دنیا اور علوم دین الگ الگ تھے اور اس کا نتیجہ لامحالہ تفریق دنیا و دین کی صورت میں ظاہر ہوتا تھا جو اسلامی نقطۂ نظر سے بنیادی طور پر غلط ہے۔ دوسرے شرعی علوم کی حیثیت سے بعض ایسی چیزیں داخل درس تھیں جو شرعی اہمیت نہ رکھتی تھیں، اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ دین کے متعلق لوگوں کے تصورات غلط ہو رہے تھے اور بعض غیر جنس کی چیزوں کو دینی اہمیت حاصل ہو جانے کی وجہ سے فرقہ بندیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ امام غزالی نے ان خرابیوں کو دور کر کے ایک سمویا ہوا نظام بنایا جس کی ان کے ہم عصروں نے سخت مخالفت کی مگر بالآخر تمام مسلم ممالک میں اس کے اصول تسلیم کر لیے گئے اور جتنے نئے نظامات تعلیم بنے وہ تمام تر انہی خطوط پر بنے جو امام نے کھینچ دیے تھے۔ اس وقت تک مدارس عربیہ میں جو نصاب پڑھایا جا رہا ہے اس کی ابتدائی خط کشی امام غزالی ہی کی رہین منت ہے۔

سابعًا، انھوں نے اخلاق عامہ کا پورا جائزہ لیا۔ انھیں علما، مشائخ، امرا، سلاطین، عوام، سب کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے خوب مواقع ملے تھے۔ خود چل پھر کر مشرقی دنیا کا ایک بڑا حصہ دیکھ چکے تھے۔ اسی مطالعہ کا نتیجہ ان کی کتاب احیاء العلوم ہے جس میں انھوں نے ہر طبقہ کی اخلاقی حالت پر تنقید کی ہے، ایک ایک برائی کی جڑ اور اس کے نفسیاتی اور تمدنی اسباب کا کھوج لگایا ہے، اور اسلام کا صحیح اخلاقی معیار پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

ثامنًا، انھوں نے اپنے عہد کے نظام حکومت پر بھی پوری آزادی کے ساتھ تنقید کی براہ راست حکام وقت کو بھی دہم

اصلاح کی طرف توجہ دلاتے رہے، اور عوام میں بھی یہ روح پھونکنے کی کوشش کی کہ منفعلانہ انداز سے جبر وظلم کے آگے سر تسلیم خم نہ کریں بلکہ آزادانہ نکتہ چینی کریں۔ احیاء میں ایک جگہ صاف کہتے ہیں کہ "ہمارے زمانہ میں سلاطین کے تمام یا اکثر اموال حرام ہیں" ایک اور جگہ کہتے ہیں کہ ان سلاطین کو نہ اپنی صورت دکھانی چاہیئے، نہ ان کی دیکھنی چاہیئے۔ انسان کے لیئے لازم ہے کہ ان کے ظلم سے بغض رکھے، ان کے بقاء کو پسند نہ کرے، ان کی تعریف نہ کرے، ان کے حالات سے کوئی واسطہ نہ رکھے اور ان کے ہاں رسائی رکھنے والوں سے بھی دور رہے"۔ ایک اور جگہ اُن آداب پرستش وعبودیت پر سخت نکتہ چینی کرتے ہیں جو درباروں میں رائج تھے۔ اس معاشرت کی مذمت کرتے ہیں جو بادشاہوں اور امراء نے اختیار کر رکھی تھی۔ حتیٰ کہ ان کے محلات، ان کے لباس، ان کی آرائش، ہر چیز کو نجس بتاتے ہیں، اسی پر بس نہیں بلکہ انھوں نے اپنے عہد کے بادشاہ کو ایک مفصل خط لکھا جس میں اس کو اسلامی طرز حکومت کی طرف دعوت دی، حکمرانی کی ذمہ داریاں سمجھائیں، اور اسے بتایا کہ تیرے ملک میں جو کچھ ظلم ہو رہا ہے خواہ تو خود کرے یا تیرے عمال کریں، بہر حال اس کی ذمہ داری تجھ پر ہے ایک دفعہ مجبوراً دربار شاہی میں جانا پڑا تو دوران گفتگو میں بادشاہ کے منہ در منہ کہا کہ:-

"تیرے گھوڑوں کی گردن سازِ زریں سے نہ ٹوٹی تو کیا ہوا، مسلمانوں کی گردن تو فاقہ کشی کی مصیبت سے ٹوٹ گئی"۔

اسی طرح ان کے آخری زمانہ میں جتنے وزراء سلطنت کے مدار المہام ہوئے ان سب کو بھی امام نے پیہم خطوط لکھ کر رعایا کی تباہ حالی کی طرف توجہ دلائی۔ ایک وزیر کو لکھتے ہیں:-

"ظلم حد سے گزر چکا ہے۔ چونکہ مجھے اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھنا پڑتا تھا اس لیئے تقریباً ایک سال سے میں نے طوس کا قیام ترک کر دیا ہے تاکہ بے رحم وبے حیا ظالموں کی حرکات دیکھنے سے خلاصی پاؤں"۔

ابن خلدون کے بیان سے یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی سلطنت کے قیام کے خواہاں تھے جو خالص اسلامی اصول پر ہو، خواہ دنیا کے کسی گوشہ میں ہو۔ چنانچہ مغرب اقصیٰ میں موحدین کی سلطنت انہی کے اشارہ سے ان کے ایک شاگرد نے قائم کی۔ مگر امام موصوف کے کارنامے میں یہ سیاسی رنگ محض ضمنی حیثیت رکھتا تھا، سیاسی انقلاب کے لیئے انھوں نے کوئی باقاعدہ تحریک نہیں اُٹھائی، نہ حکومت کے نظام پر کوئی خفیف سے خفیف اثر ڈال سکے اسی لیئے جاہلیت کی حکمرانی میں مسلمان قوموں کی حالت برابر خراب ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ ایک صدی بعد تاتاری طوفان کے دروازے ان پر ٹوٹ پڑے اور اس نے ان کے پورے تمدن کو تباہ کر کے رکھ دیا۔

امام غزالی کے تجدیدی کام میں علمی وفکری حیثیت سے چند نقائص بھی تھے، اور وہ تین عنوانات پر تقسیم کیئے جا سکتے ہیں، ایک قسم ان نقائص کی جو حدیث کے علم میں کمزور ہونے کی وجہ سے اُن کے کام میں پیدا ہوئے

دوسری قسم اُن نقائص کی جو اُن کے ذہن پر عقلیات کے غلبہ کی وجہ سے تھے۔ اور تیسری قسم اُن نقائص کی جو تصوف کی طرف ضرورت سے زیادہ مائل ہو جانے کی وجہ سے تھے۔ ان کمزوریوں سے بچکر امام موصوف کے اصل کام یعنی اسلام کی ذہنی و اخلاقی روح کو زندہ کرنے اور بدعت و ضلالت کی آلائشوں کو نظام فکر و نظام تمدن سے چھانٹ چھانٹ کر نکالنے کا کام جس شخص نے انجام دیا وہ ابن تیمیہ تھا۔

ابن تیمیہ

امام غزالی کے ڈیڑھ سو برس بعد ساتویں صدی کے نصف آخر میں امام ابن تیمیہ پیدا ہوئے[۱]۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ دریائے سندھ سے فرات کے کناروں تک تمام مسلمان قوموں کو تاتاری غارت گر پامال کر چکے تھے اور شام کی طرف بڑھ رہے تھے مسلسل پچاس برس کی ان شکستوں نے، دائمی خوف و بدامنی کی حالت نے، اور علم و تہذیب کے تمام مرکزوں کی تباہی نے مسلمانوں کو اُس مرتبہ پستی سے بھی بہت زیادہ نیچے گرادیا تھا جس پر امام غزالی نے انھیں پایا تھا۔ تاتاری حملہ آور اگرچہ اسلام قبول کرتے جارہے تھے مگر جاہلیت میں یہ حکمراں اپنے پیش رو ترکی فرماں رواؤں سے بھی کچھ قدم آگے تھے، ان کے زیر اثر عوام اور علماء و مشایخ اور فقہاء و قضاۃ کے اخلاق اور بھی زیادہ گرنے لگے تقلید جامد اس حد کو پہونچ گئی کہ مختلف فقہی و کلامی مذاہب گویا مستقل دین بن گئے۔ اجتہاد معصیت بن کر رہ گیا۔ بدعات و خرافات نے شرعی حیثیت اختیار کرلی۔ کتاب و سنت کی طرف رجوع کرنا ایسا گناہ ہوگیا جو کسی طرح معاف نہ کیا جاسکتا تھا۔ اس دور میں جاہل و کم راہ عوام، دنیا پرست یا تنگ نظر علما اور جاہل و ظالم حکمرانوں کی ایسی سنگت بن گئی تھی کہ اس اتحاد ثلاثہ کے خلاف کسی کا اصلاح کے لیے اٹھنا اپنی گردن کو قصاب کی چھری کے سامنے پیش کرنے سے کم نہ تھا یہی وجہ ہے کہ گو اُس وقت صحیح الخیال، وسیع النظر، حقیقت شناس علما و ناپید نہ تھے نہ اُن سچے اور جبلی صوفیوں کی کمی تھی جو جادۂ حق پر گامزن تھے، مگر جس نے اس تاریک زمانہ میں اصلاح کا علم اٹھانے کی جرأت کی وہ ایک ہی اللہ کا بندہ تھا۔

ابن تیمیہ حدیث کے امام تھے یہاں تک کہ کہا گیا کل حدیث لایعرفہ ابن تیمیہ فلیس بحدیث (جس حدیث کو ابن تیمیہ نہ جانتے ہوں وہ حدیث نہیں ہے) تفقہ کی شان یہ تھی کہ بلاشبہ ان کو مجتہد مطلق کا مرتبہ حاصل تھا۔ علوم عقلیہ، منطق، فلسفہ اور کلام میں اتنی گہری نظر تھی کہ جن لوگوں کا سرمایۂ ناز یہی علوم تھے وہ اُن کے سامنے بچوں کی حیثیت رکھتے تھے، اور اس پر جرات و ہمت کا یہ حال تھا کہ اظہار حق میں کبھی کسی بڑی سے بڑی طاقت سے بھی نہ ڈرے رحمۃ کہ متعدد مرتبہ جیل بھیجے گئے اور آخر کار جیل ہی میں جان دی یہی وجہ ہے کہ وہ امام غزالی کے چھوڑے ہوئے کام کو ان سے زیادہ خوبی کے ساتھ آگے بڑھانے میں کامیاب ہوئے ان کے تجدیدی کارنامے کا خلاصہ یہ ہے:-

[۱] پیدائش ۶۶۱ھ وفات ۷۲۸ھ

(۱) انھوں نے یونانی منطق و فلسفہ پر امام غزالی سے زیادہ گہری اور زبردست تنقید کی اور اس کی کمزوریوں کو اس طرح نمایاں کر کے رکھ دیا کہ عقلیات کے میدان پر اس کا تسلط ہمیشہ کے لئے ڈھیلا ہو گیا۔ ان دونوں اماموں کی تنقید کے اثرات مشرق ہی تک محدود نہ رہے بلکہ مغرب تک بھی پہنچے۔ چنانچہ یورپ میں ارسطو کی منطق اور مسیحی متکلمین کے یونان زدہ فلسفیانہ نظام کے خلاف پہلی تنقیدی آواز ابن تیمیہ کے ڈھائی سو برس بعد اٹھی۔

(۲) انھوں نے اسلام کے عقائد، احکام، اور قوانین کی تائید میں ایسے زبردست دلائل قائم کیے جو امام غزالی کے دلائل سے زیادہ معقول بھی تھے اور اسلام کی اصلی روح کے حامل ہونے میں بھی ان سے بڑھے ہوئے تھے۔ امام غزالی کے بیان و استدلال پر اصطلاحی معقولات کا اثر چھایا ہوا تھا۔ ابن تیمیہ نے اس راہ کو چھوڑ کر عقل عام (Common sense) پر تفہیم و تبیین کی بنا رکھی جو زیادہ فطری، زیادہ مؤثر اور زیادہ قرآن و سنت کے قریب ہے۔ یہ نئی راہ پچھلوں کی راہ سے بالکل الگ تھی۔ جو لوگ دین کے علمبردار تھے وہ فقط احکام نقل کر دیتے تھے، تفہیم نہ کر سکتے تھے۔ اور جو کلام میں پھنس گئے تھے وہ فلسفہ اور اصطلاحی معقولات کو ذریعۂ تفہیم بنانے کی وجہ سے کتاب و سنت کی اصلی اسپرٹ کو کم و بیش کھو دیتے تھے۔ ابن تیمیہ نے عقائد و احکام کو ان کی اصلی اسپرٹ کے ساتھ بے کم و کاست بیان بھی کیا اور پھر تفہیم کا وہ سیدھا سادہ فطری ڈھنگ اختیار کیا جس کے سامنے اہل عقل کے لئے سر جھکا دینے کے سوا چارہ نہ تھا۔ اسی زبردست کارنامے کی تعریف امام حدیث علامہ ذہبی نے ان الفاظ میں کی ہے کہ ولقد نصر السنۃ المحضۃ والطریقۃ السلفیۃ واحتج لھا ببراھین ومقدمات وامور لم یسبق الیھا۔ یعنی ابن تیمیہ نے خالص سنت اور طریقہ سلف کی حمایت کی اور اس کی تائید میں ایسے دلائل اور ایسے طریقوں سے کام لیا جن کی طرف ان سے پہلے کسی کی نظر نہ گئی تھی

(۳) انھوں نے تقلید جامد کے خلاف صرف آواز ہی نہیں اٹھائی بلکہ قرون اولیٰ کے مجتہدین کے طریقہ پر اجتہاد کر کے دکھایا۔ براہ راست کتاب و سنت اور آثار صحابہ سے استنباط کر کے، اور مختلف مذاہب فقہیہ کے درمیان آزادانہ محاکمہ کر کے کثیر التعداد مسائل میں کلام کیا، جس سے راہ اجتہاد از سر نو باز ہوئی اور قوت اجتہادیہ کا طریق استعمال لوگوں پر واضح ہوا اس کے ساتھ انھوں نے اور ان کے جلیل القدر شاگرد ابن قیم نے حکمت تشریع اور شارع کے طرز قانون سازی پر اتنا نفیس کام کیا جس کی کوئی مثال ان سے پہلے کے شرعی لٹریچر میں نہیں ملتی۔ یہ وہ مواد ہے جس سے ان کے بعد اجتہادی کام کرنے والوں کو بہترین رہنمائی حاصل ہوئی اور آئندہ ہوتی رہے گی۔

(۴) انھوں نے بدعات اور مشرکانہ رسوم اور اعتقادی و اخلاقی گمراہیوں کے خلاف سخت جہاد کیا اور اس سلسلہ میں بڑی مصیبتیں اٹھائیں۔ اسلام کے چشمۂ صافی میں اس وقت تک جتنی آمیزشیں ہوئی تھیں، اس اللہ کے بندے نے ان میں سے ایک کو بھی نہ چھوڑا، ایک ایک کی خبر لی، اور ان سب سے چھانٹ کر ٹھیٹھ اسلام کے طریقہ کو الگ روشن کر کے دنیا کے سامنے رکھ دیا۔ اس تنقید و تنقیح میں اس شخص نے کسی کی رورعایت نہ کی، بڑے بڑے آدمی، جن کے

فضل وکمال کا اور تقدس کا سکہ مسلمانوں کی ساری دنیا پر بیٹھا ہوا تھا، جن کے نام سن کر لوگوں کی گردنیں جھک جاتی تھیں، ابن تیمیہ کی تنقید سے نہ بچ سکے۔ وہ طریقے اور اعمال جو مدیوں سے مذہبی حیثیت اختیار کیے ہوئے تھے، جنکے جواز، بلکہ استحباب کی دلیلیں نکال لی گئی تھیں، اور علماء حق بھی جن سے مداہنت کر رہے تھے، ابن تیمیہ نے ان کو تعلیم اسلام کے منافی پایا اور ان کی پرزور مخالفت کی۔ اس آزاد خیالی و صاف گوئی کی وجہ سے ایک دنیا ان کی دشمن ہوگئی، اور آج تک دشمن چلی آتی ہے۔ جو لوگ ان کے عہد میں تھے انھوں نے مقدمات قائم کر کے کئی بار جیل بھجوایا اور جو بعد میں آئے انھوں نے تکفیر و تضلیل کر کے اپنا دل ٹھنڈا کیا۔ مگر اسلام خالص محض کے اتباع کا جو صور اس شخص نے پھونکا تھا اس کی بدولت ایک مستقل حرکت دنیا میں پیدا ہوگئی جس کی آواز بازگشت اب تک بلند ہو رہی ہے۔

اس تجدیدی کام کے ساتھ انھوں نے تاتاری وحشت و بربریت کے مقابلہ میں تلوار سے بھی جہاد کیا۔ اس وقت مصر و شام آتش سیلاب سے بچے ہوئے تھے۔ امام نے وہاں کے عام مسلمانوں اور رئیسوں میں غیرت و حمیت کی آگ پھونکی اور انھیں مقابلہ پر آمادہ کیا۔ ان کے ہم عصر شہادت دیتے ہیں کہ مسلمان تاتاریوں سے اتنے مرعوب ہو چکے تھے کہ ان کا نام سن کر کانپ اٹھتے تھے اور ان کے مقابلہ میں جاتے ہوئے یوں ڈرتے تھے کانما یساقون الی الموت۔ مگر ابن تیمیہ نے ان میں جہاد کا جوش پھونک کر شجاعت کی سوئی ہوئی روح کو بیدار کر دیا۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ وہ بھی کوئی ایسی سیاسی تحریک نہ اٹھا سکے جس سے نظام حکومت میں انقلاب برپا ہوتا اور اقتدار کی کنجیاں جاہلیت کے قبضہ سے نکل کر اسلام کے ہاتھ میں آئیں۔

شیخ احمد سرہندی

ساتویں صدی میں فتنہ تاتار نے ہندوکش سے اس پار کی دنیا کو تو بالکل تاخت و تاراج کر دیا مگر ہندوستان اس کی دست برد سے بچ گیا تھا۔ اس ڈھیل نے یہاں کے مترفین کو اسی غلط فہمی میں ڈال دیا جو ہمیشہ فریفتگان زینت دنیا کو لاحق ہوتی ہے۔ یہاں وہ تمام خرابیاں پرورش پاتی رہیں جو خراسان و عراق میں تھیں۔ وہی بادشاہوں کی خداوندی وہی امراء و اہل دولت کی عیش پسندی، وہی باطل رستوں سے مال لینا اور باطل رستوں میں خرچ کرنا، وہی جبر و ظلم کی حکومت، وہی خدا سے غفلت اور دین کی صراط مستقیم سے بُعد۔ رفتہ رفتہ نوبت اکبر بادشاہ کے دور حکومت تک پہونچی جس میں گمراہیاں اپنی حد کو پہونچ گئیں۔

اکبر کے دربار میں یہ رائے عام تھی کہ ملت اسلام جاہل بدوؤں میں پیدا ہوئی تھی، کسی مہذب و شائستہ قوم کے لیے وہ موزوں نہیں، نبوت، وحی، حشر و نشر، دوزخ و جنت، ہر چیز کا مذاق اڑایا جانے لگا۔ قرآن کلام الٰہی ہونا مشتبہ، وحی کا نزول عقلاً مستبعد، مرنے کے بعد ثواب و عذاب غیر یقینی، البتہ تناسخ ہر آئینہ ممکن و اقرب الی الصواب معراج کو سلامیہ محال قرار دیا جاتا۔ ذات نبوی پر اعتراضات کیے جاتے، خصوصاً آپ کی ازواج کے تعدد پر اور آپ کے

غزوات وسرایا پر۔ یہاں تک کہ لفظ احمد اور محمد سے بھی بیزاری ہوگئی اور جن کے ناموں میں یہ لفظ شامل تھا ان کے نام بدلے جانے لگے۔ دُنیا پرست علماء نے اپنی کتابوں کے خطبوں میں نعت لکھنی چھوڑ دی بعض ظالم اس حد تک بڑھے کہ دجال کی نشانیاں ہادیِ اعظم صلے اللہ علیہ وسلم پر چسپاں کرنے لگے، العیاذ باللہ، العیاذ باللہ۔ دیوانخانۂ شاہی میں کسی کی مجال نہ تھی کہ نماز ادا کرے ابوالفضل نے نماز روزہ حج اور دوسرے شعائر دینی پر سخت اعتراضات کیے اور ان کا مذاق اڑایا شعراء نے ان شعائر کی ہجو لکھی جو عوام کی زبانوں تک بھی پہونچی۔

بہائی نظریہ کی بنا بھی درحقیقت اکبری عہد ہے، اُس وقت یہ نظریہ قائم کیا گیا کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت پر ایک ہزار سال گزر چکے ہیں اور اس دین کی مدت ایک ہزار سال ہی تھی، اس لیے اب وہ منسوخ ہوگیا اور اس کی جگہ نئے دین کی ضرورت ہے۔ اس نظریہ کو سکوں کے ذریعہ سے پھیلایا گیا کیونکہ اس زمانہ میں نشر واشاعت کا سب سے زیادہ قوی ذریعہ یہی تھا۔ اس کے بعد ایک نئے دین اور نئی شریعت کی طرح ڈالی گئی جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہب کو ملا کر ایک مخلوط مذہب بنایا جائے تاکہ شاہی حکومت مستحکم ہو۔ دربار کے خوشامدی ہندوؤں نے اپنے بزرگوں کی طرف سے اس قسم کی پیشین گوئیاں سنانی شروع کر دیں کہ فلاں زمانہ میں ایک گئو رکھشک مہاتما بادشاہ پیدا ہوگا اور اسی طرح بندۂ زر علماء نے بھی اکبر کو مہدی اور صاحب زمان اور امام مجتہد وغیرہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ایک "تاج العارفین" صاحب یہاں تک بڑھے کہ اکبر کو انسان کامل اور خلیفۃ الزماں ہونے کی حیثیت سے خدا کا عکس ہی ٹھیرا دیا، عوام کو بھانے کے لئے کہا گیا کہ "حق اور صدق (عالمگیر سچائیاں) تمام مذاہب میں موجود ہیں، کوئی ایک ہی دینِ حق کا اجارہ دار نہیں ہے، لہٰذا سب مذہبوں میں جو جو باتیں حق ہیں انھیں لے کر ایک جامع طریقہ بنانا چاہیے اور اس کی طرف لوگوں کو دعوت عام دینی چاہیے تاکہ ملتوں کے سب اختلافات مٹ جائیں، اسی طریق جامع کا نام دین الٰہی ہے۔" اس نئے دین کا کلمہ لاالٰہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ تجویز کیا گیا۔ جو لوگ اس دین میں داخل ہوتے ان کو "دینِ اسلام مجازی وتقلیدی کہ از پدران دیدہ وشنیدہ ام" سے توبہ کرکے "دینِ الٰہی اکبر شاہی" میں داخل ہونا پڑتا تھا، اور داخل ہونے کے بعد ان کو لفظ "چیلہ" سے تعبیر کیا جاتا۔ سلام کا طریقہ بدل کر یوں کر دیا گیا کہ سلام کرنے والا "اللہ اکبر" اور جواب دینے والا "جل جلالہ" کہتا (یاد رہے کہ اکبر کا نام جلال الدین تھا) چیلوں کو بادشاہ کی تصویر دی جاتی اور وہ اسے پگڑی میں لگاتے۔ بادشاہ پرستی اس دین کے ارکان میں سے ایک رکن تھی۔ ہر روز صبح کو بادشاہ کا درشن کیا جاتا، اور بادشاہ کے سامنے جب حاضری کا شرف عطا ہوتا تو اس کے سامنے سجدہ بجالایا جاتا۔ علماء کرام اور صوفیان باصفا، دونوں اپنے اس قبلۂ حاجات وکعبۂ مرادات کو بے تکلف سجدہ فرماتے تھے اور اس صریح شرک کو "سجدۂ تحیۃ" اور "زمین بوسی" جیسے الفاظ کے پردے میں چھپاتے تھے۔ یہ وہی ملعون حیلہ بازی تھی جس کی پیشین گوئی نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جب لوگ حرام چیز کا نام بدل کر اس کو حلال کر لیا کریں گے۔

اس نئے دین کی بنا تو یہ کہہ کر رکھی گئی تھی کہ اس میں بلا کسی تعصب کے ہر مذہب کی اچھی باتیں لی جائیں گی مگر در اصل اس میں اسلام کے سوا ہر مذہب کی پذیرائی تھی اور نفرت و عداوت کے لیئے صرف اسلام اور اس کے احکام و تعلیمات ہی کو مختص کر لیا گیا تھا۔ پارسیوں سے آتش پرستی لی گئی، اکبری محل میں دائمی آگ کا الاؤ روشن کیا گیا اور چراغ روشن کرنے کے وقت قیام تعظیمی کیا جانے لگا۔ عیسائیوں سے ناقوس نوازی اور تماشائے صورت ثالث ثلاثہ اور اسی قسم کی چند چیزیں لی گئیں۔ سب سے زیادہ نظر عنایت ہندویت پر تھی کیونکہ یہ ملک کی اکثر آبادی کا مذہب تھا اور بادشاہی کی جڑیں مضبوط کرنے کے لیئے اس کی استمالت ضروری تھا، چنانچہ گائے کا گوشت حرام کیا گیا، ہندو تہوار، دیوالی دسہرہ، راکھی پونم شیوراتری وغیرہ پوری ہندوانہ رسوم کے ساتھ منائے جانے لگے۔ شاہی محل میں ہون کی رسم ادا کیجانے لگی، دن میں چار وقت آفتاب کی عبادت کی جاتی اور آفتاب کے ایک ہزار ایک ناموں کا جاپ کیا جاتا۔ آفتاب کا نام جب زبان پر آتا تو "جلت قدرتہ" کے الفاظ کہے جاتے۔ پیشانی پر قشقہ لگایا جاتا۔ دوش و کمر پر جنیوڈالا جاتا اور گائے کی تعظیم کی جاتی۔ معاد کے متعلق عقیدۂ تناسخ تسلیم کر لیا گیا اور برہمنوں سے ان کے دوسرے بہت سے اعتقادات سیکھے گئے یہ سارا معاملہ تو تھا دوسرے مذاہب کے ساتھ۔ رہا اسلام تو اس کے معاملہ میں بادشاہ اور درباریوں کی ایک ایک حرکت سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کو اس سے ضد اور چڑ ہو گئی ہے۔ اسلامی تعلیمات کے خلاف دوسرے مذہب والوں کی طرف سے جو بات دربار کا رنگ دیکھ کر فلسفیانہ و صوفیانہ انداز میں پیش کر دی جاتی اسے وحی آسمانی سمجھ کر قبول کر لیا جاتا اور اس کے مقابلہ میں اسلامی تعلیم رد کر دی جاتی۔ علمار اسلام اگر اسلام کی طرف سے کوئی بات کہتے، یا کسی گمراہی کی مخالفت کرتے تو تحقیر "فقیہ" کے نام سے موسوم کیا جاتا جسکے معنے اُن کی اصطلاح خاص میں احمق اور ناقابل التفات آدمی کے ہو گئے تھے۔ چالیس آدمیوں کی ایک کمیٹی مذاہب کی تحقیق کے لیئے مقرر کی گئی تھی جس میں تمام مذاہب کا مطالعہ بڑی رواداری بلکہ عقیدت مندی کے ساتھ کیا جاتا تھا، مگر اسلام کا نام آتے ہی اس کا مذاق اُڑایا جانے لگتا تھا اور اگر اسلام کا کوئی حامی جواب دینا چاہتا تو اس کی زبان بندی کر دی جاتی تھی۔ یہ برتاؤ اسی حد تک نہ رہا بلکہ عملاً اسلام کے احکام میں دل کھول کر ترمیم و تنسیخ کی گئی۔ سود، جوئے اور شراب کو حلال کیا گیا۔ شاہی مجلس میں نوروز کے موقع پر شراب کا استعمال ضروری تھا، حتیٰ کہ قاضی و مفتی تک پی جاتے تھے۔ داڑھی منڈوانے کا فیشن عام کیا گیا اور اس کے جواز پر دلائل قائم کیئے گئے۔ چچا، ماموں زاد بہن سے نکاح کو ممنوع ٹھہرایا گیا۔ لڑکے کے لیئے ۱۶ سال اور لڑکی کے لیئے ۱۴ سال کی عمر نکاح مقرر کی گئی۔ ایک بیوی سے زیادہ بیویاں رکھنے کی مانعت کی گئی۔ حد زنا نہ صرف موقوف کی گئی بلکہ چند ضوابط کے ساتھ زنا کو قانوناً جائز ٹھیرایا گیا۔ ۱۲ سال کی عمر سے پہلے ختنہ کی مانعت کر دی گئی۔ ریشم اور سونے کے استعمال کو حلال کیا گیا۔ شیر اور بھیڑیئے کو حلال کیا گیا۔ سور کو اسلام کی ضد میں نہ صرف پاک بلکہ ایک مقدس جانور قرار دیا گیا، حتیٰ کہ صبح آنکھ کھولتے ہی اس کو دیکھنا مبارک خیال کیا جاتا تھا۔ مُردوں کو دفن کرنے کے بجائے جلانا یا پانی میں بہانا

احسن ٹھیرایا گیا، اور اگر کوئی دفن ہی کرنا چاہیے تو سفارش کی گئی کہ پاؤں قبلہ کی طرف رکھے جائیں۔ اکبر خود اسلام کی ضد میں قبلہ ہی کی طرف پاؤں کرکے سونے کا التزام کرتا تھا۔ حکومت کی تعلیمی پالیسی بھی سراسر اسلام کی مخالف تھی۔ عربی زبان کی تعلیم اور فقہ و حدیث کے درس کو ناپسندیدہ سمجھا جاتا اور جو لوگ ان علوم کو حاصل کرتے وہ حقیر خیال کیے جاتے علوم دینی کے بجائے حکمت، فلسفہ، ریاضی و تاریخ اور اسی نوع کے علوم کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی۔ زبان میں ہندیت پیدا کرنے کی طرف خاص میلان تھا اور عربی حروف کو زبان سے خارج کرنے کی بھی تجویزیں تھیں۔ ان حالات کی وجہ سے دینی مدرسے ویران ہونے لگے اور اکثر اہل علم ملک چھوڑ چھوڑ کر نکلنے لگے۔

یہ تو تھا حکومت کا حال۔ اور عوام کا حال یہ تھا کہ جو لوگ باہر سے آئے تھے وہ ایران و خراسان کی اخلاقی و اعتقادی بیماریاں ساتھ لائے تھے اور جو لوگ ہندوستان ہی میں مسلمان ہوئے تھے اُن کی اسلامی تعلیم و تربیت کا کوئی خاص انتظام نہ تھا اس لیے وہ پُرانی جاہلیت کی بہت سی باتیں اپنے خیالات اور اپنی عملی زندگی میں لیے ہوئے تھے۔ ان دونوں قسم کے مسلمانوں نے مل جل کر ایک عجیب مرکب تیار کیا تھا جس کا نام "اسلامی تمدن" تھا۔ اس میں شرک بھی تھا، نسلی اور طبقاتی امتیازات بھی تھے، اوہام و خرافات بھی تھے، اور نو ایجاد رسموں کی ایک نئی شریعت بھی تھی۔ دُنیا پرست علماء و مشائخ نے نہ صرف اس مخالطہ سے موافقت کرلی تھی، بلکہ وہ اس نئے مت کے پروہت بن گئے تھے لوگوں کی طرف سے اُن کو نذرانے پہنچتے، اور اُن کی طرف سے لوگوں کو فرقہ بندی کا تحفہ ملتا۔

پیرانِ طریقت کے ہاتھوں سے ایک اور بیماری پھیل رہی تھی، اشراقیت، رواقیت (stoicism) اور ویدانتزم کی آمیزش سے ایک عجیب قسم کا فلسفیانہ تصوف پیدا ہو گیا تھا جسے اسلام کے نظام اعتقادی و اخلاقی میں ٹھونس دیا گیا تھا۔ طریقت و حقیقت، شرعِ اسلامی سے الگ اور اس سے بے نیاز قرار دی گئی تھیں۔ باطن کا کوچہ ظاہر سے جدا بنا لیا گیا اور اس کوچہ کا قانون یہ تھا کہ حدود حلال و حرام رخصت، احکام دین عملاً منسوخ، اور ہوائے نفس کے ہاتھ میں کلی اختیارات، جس فرض کو چاہے ساقط کرے اور جس چیز کو چاہے فرض بلکہ فرض الفرض بنا دے، جس حلال کو چاہے حرام کردے، اور جس حرام کو چاہے حلال کردے۔ ان عام پیروں سے بہتر جن کی حالت تھی ان پر بھی کم و بیش اس فلسفیانہ تصوف کے اثرات پڑے ہوئے تھے، اور وحدت الوجود کے ایک غلط تصور نے خصوصیت کے ساتھ تمام قوائے عمل کو بیکار کردیا تھا۔

یہ حالات تھے جب اکبری سلطنت کے ابتدائی ایام میں شیخ احمد سرہندی پیدا ہوئے[۵]۔ ان کی تعلیم و تربیت ایسے لوگوں میں ہوئی تھی جو اُس دور کے صالح ترین لوگ تھے، گو اپنے گرد و پیش کے فساد کا مقابلہ نہ کرسکتے تھے مگر کم از کم اپنے ایمان و عمل کو بچائے ہوئے تھے، اور جہاں تک ہوسکتا تھا دوسروں کی اصلاح بھی کر رہے تھے۔ خصوصیت کے ساتھ شیخ کو

[۵] پیدائش ۹۷۱ھ / ۱۵۶۳ء۔ وفات ۱۰۳۴ھ / ۱۶۲۴ء

سب سے زیادہ فیض حضرت باقی باللہ صاحب سے پہنچا جو اپنے وقت کے ایک بڑے صالح بزرگ تھے۔ مگر خود شیخ کی ذاتی صلاحیتوں کا حال یہ تھا کہ جب حضرت موصوف کے ساتھ راہ و رسم کی ابتدا ہوئی تھی اسی وقت انھوں نے شیخ کے متعلق اپنے یہ خیالات ایک دوست کو لکھ کر بھیجے تھے کہ:-

"حال میں سرہند سے ایک شخص شیخ احمد نامی آیا ہے۔ نہایت ذی علم ہے۔ بڑی عملی طاقت رکھتا ہے۔ چند روز فقیر کے ساتھ اس کی نشست و برخاست ہوئی ہے۔ اس دوران میں اس کے حالات کا جو مشاہدہ ہوا اس کی بنا پر توقع ہے کہ آگے چل کر یہ ایک چراغ ہوگا جو دنیا کو روشن کردیگا"

یہ پیشین گوئی پوری ہوئی۔ ہندوستان کے گوشوں میں بہت سے حق پرست علماء اور سچے صوفیہ بھی اس وقت موجود تھے، مگر ان سب کے درمیان وہ اکیلا شخص تھا جو وقت کے ان فتنوں کی اصلاح اور شریعت محمدی کی حمایت کیلئے اٹھا اور جس نے شاہی قوت کے مقابلہ میں یکہ و تنہا احیاء دین کی جد و جہد کی۔ اس بے سرو سامان فقیر نے علی الاعلان اٹھ کر ان گمراہیوں کی مخالفت کی جنھیں حکومت کی حمایت حاصل تھی، اور اس شریعت کی تائید کی جو حکومت کی نگاہ میں مبغوض تھی۔ حکومت نے اس کو ہر طرح دبانے کی کوشش کی حتیٰ کہ جیل بھی بھیجا، مگر بالآخر وہ فتنہ کے منہ پھیر دینے میں کامیاب ہوگیا۔ جہانگیر، جس نے سجدۂ تحیۃ نہ کرنے پر شیخ کو گوالیار کے قیدخانہ میں بھیجدیا تھا، آخر میں شیخ کا معتقد ہوگیا اور اپنے بیٹے خرم کو، جو بعد میں شاہجہاں کے لقب سے تخت نشین ہوا، ان کے حلقۂ بیعت میں داخل کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کے متعلق حکومت کی معاندانہ روش احترام سے بدل گئی۔ "دین الٰہی اکبر شاہی"، ان تمام بدعتوں کے ساتھ ختم ہوا جو درباری شریعت سازوں نے گھڑی تھیں۔ اسلامی احکام کی جو ترمیم و تنسیخ کی گئی تھی وہ خود منسوخ ہوگئی۔ حکومت اگرچہ شاہی حکومت ہی رہی مگر کم از کم اتنا تو ہوا کہ علوم دینی اور احکام شرعی کی طرف اس کا رویہ کافرانہ ہونے کے بجائے عقیدت مندانہ ہوگیا۔ شیخ کی وفات کے تین چار ہی سال بعد عالمگیر پیدا ہوا اور غالباً وہ شیخ ہی کے پھیلائے ہوئے اصلاحی اثرات تھے جن کی بدولت تیموری خاندان کے اس شاہزادے کو وہ علمی اور اخلاقی تربیت مل سکی کہ اکبر جیسے ہادم شریعت کا پرپوتا خادم شریعت ہوا۔

شیخ کا کارنامہ اتنا ہی نہیں ہے کہ انھوں نے ہندوستان میں حکومت کو بالکل ہی کفر کی گود میں چلے جانے سے روکا اور اس فتنۂ عظیم کے سیلاب کا منہ پھیرا جو اب سے تین چار سو برس پہلے ہی یہاں اسلام کا نام و نشان مٹادیتا۔ اس کے علاوہ انھوں نے دو عظیم الشان کام اور بھی انجام دیئے۔ ایک یہ کہ تصوف کے چشمۂ صافی کو ان آلائشوں سے جو فلسفیانہ اور راہبانہ گمراہیوں سے اس میں سرایت کرگئی تھیں پاک کرکے اسلام کا اصلی اور صحیح تصوف پیش کیا دوسرے یہ کہ ان تمام رسوم جاہلیت کی شدید مخالفت کی جو اس وقت عوام میں پھیلی ہوئی تھیں اور سلسلۂ بیعت

ارشاد کے ذریعہ سے اتباع شریعت کی ایک ایسی تحریک پھیلائی جس کے ہزارہا تربیت یافتہ کارکنوں نے نہ صرف ہندوستان کے مختلف گوشوں میں، بلکہ وسط ایشیا تک پہونچکر عوام کے اخلاق اور عقائد کی اصلاح کے لیے کوشش کی یہی کام ہے جس کی وجہ سے شیخ سرہندی کا شمار مجددین ملت میں ہوتا ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ

حضرت مجدد الف ثانی کی وفات کے ۸۰ سال بعد اور عالمگیر بادشاہ کی وفات سے چار سال پہلے نواح دہلی میں شاہ ولی اللہ صاحب پیدا ہوئے۔[1] ایک طرف اُن کے زمانے اور ماحول کو اور دوسری طرف اُن کے کام کو جب آدمی بالمقابل رکھ کر دیکھتا ہے تو عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ اس دور میں اس نظر، ان خیالات، اس ذہنیت کا آدمی کیسے پیدا ہوگیا۔ فرخ سیر، محمد شاہ رنگیلے اور شاہ عالم کے ہندوستان کو کون نہیں جانتا۔ اس تاریک زمانہ میں نشو ونما پاکر ایسا آزاد خیال مفکر و مبصر منظر عام پر آتا ہے جو زمانہ اور ماحول کی ساری بندشوں سے آزاد ہوکر سوچتا ہے، تقلیدی علم اور صدیوں کے جمے ہوئے تعصبات کے بند توڑ کر ہر مسئلہ زندگی پر محققانہ و مجتہدانہ نگاہ ڈالتا ہے اور ایسا لٹریچر چھوڑ کر جاتا ہے جس کی زبان، انداز بیان، خیالات، نظریات، موادِ تحقیق اور نتائج مستخرجہ، کسی چیز پر بھی ماحول کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا، حتیٰ کہ اس کے اوراق کی سیر کرتے ہوئے یہ گمان تک نہیں ہوتا کہ یہ چیزیں اُس جگہ لکھی گئی تھیں جس کے گرد وپیش عیاشی، نفس پرستی، قتل وغارت، جبر وظلم و بدامنی و طوائف الملوکی کا طوفان برپا تھا۔

شاہ صاحب تاریخ انسانی کے اُن لیڈروں میں سے ہیں جو خیالات کے اُلجھے ہوئے جنگل کو صاف کرکے فکر ونظر کی ایک صاف، سیدھی شاہراہ بناتے ہیں اور ذہن کی دنیا میں حالات موجودہ کے خلاف ایسی تخریبی اور تعمیر نو کا ایسا دل آویز نقشہ پیدا کرکے چلے جاتے ہیں جس کی وجہ سے ناگزیر طور پر تخریب فاسد و تعمیر صالح کیلئے ایک تحریک اُٹھتی ہے۔ شاذونادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ اس قسم کے لیڈر اپنے خیالات کے مطابق خود کوئی عملی تحریک اٹھاتے ہوں اور بگڑی ہوئی دنیا کو توڑ پھوڑ کر اپنے ہاتھوں سے نئی دنیا بنانے کے لیے میدان میں نکل آتے ہوں تاریخ میں اس کی مثالیں بہت ہی کم ملتی ہیں اس طرز کے لیڈروں کا اصلی کارنامہ یہی ہوتا ہے کہ وہ تنقید سے صدہا برس کی جمی ہوئی غلط فہمیوں کا غبار چھانٹ دیتے ہیں، اذہان میں نئی روشنی پیدا کرتے ہیں زندگی کے بگڑے ہوئے مگر پختہ بنے ہوئے سانچے کو عالم ذہنی میں توڑتے ہیں اور اس کے ملبے میں سے اصلی اور پائدار حقیقتوں کو نکال کر دُنیا کے سامنے رکھ جاتے ہیں، یہ کام بجائے خود اتنا بڑا ہوتا ہے کہ اس کی مشغولیتوں سے آدمی کو اتنی فرصت مشکل ہی سے مل سکتی ہے کہ خود میدان میں آکر تعمیر کا عملی کام بھی کرسکے اگرچہ شاہ صاحب تفہیمات الہیہ میں ایک جگہ اشارہ کرتے ہیں کہ اگر وقت و محل کا اقتضا ہوتا تو میں جنگ کرکے عملاً اصلاح کرنے کی قابلیت

[1] پیدائش ۱۱۱۴ھ - وفات ۱۱۷۶ھ تذکرہ شاہ ولی اللہ

بھی رکھتا تھا۔[1] مگر واقعہ یہی ہے کہ انھوں نے اس طرز کا کوئی کام نہیں کیا۔ بلکہ اپنے خیالات کی دنیا میں ان کا انہماک اتنا بڑھا ہوا تھا کہ خود اُن کے اپنے گھر اور اُن کے قریبی حلقہ میں بہت سے غیر اسلامی طریقے رائج تھے اور وہ ان کی اصلاح پر بھی توجہ صرف کرنے سے معذور رہے۔ مثلاً السلام علیکم تک کا رواج اُن کے گھر میں نہ تھا۔ "رفیع الدین آداب بجا لاتا ہے" "عبد القادر تسلیمات عرض کرتا ہے" سلام مسنون کے بجائے اس قسم کے فقرے بولے جاتے تھے۔ شاہ صاحب کی پوتی اور شاہ عبد العزیز صاحب کی صاحبزادی جوان بیوہ بیٹھی ہوئی تھیں اور نکاح ثانی میں انھیں اسلئے تامل تھا کہ ہندوانہ جاہلیت اسے معیوب سمجھتی تھی۔ بی بی کی صحنک اور اسی قسم کی نیازوں کا سلسلہ خود اس خاندان کی خواتین میں جاری تھا۔[2] یہ سب باتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ شاہ صاحب کی ساری قوتوں کو تنقید و تعمیر افکار کے بھاری کام نے بالکل اپنے اندر جذب کر رکھا تھا اور ان کو اس کار عظیم سے اتنی مہلت بھی نہ ملتی تھی کہ اپنے قریب ترین ماحول کی طرف ہی توجہ کر سکتے جیسا کہ آگے چل کر عرض کیا جائے گا، اُن کے صاف کیئے ہوئے راستہ پر عملی جد و جہد کرنے کے لئے کچھ دوسرے لوگوں کی ضرورت تھی، اور وہ نصف صدی کے اندر خود انہی کے حلقہ تعلیم و تربیت سے نشوونما پا کر اُٹھے۔

شاہ صاحب کے تجدیدی کارنامے کو ہم دو بڑے عنوانات پر تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک عنوان تنقید و تنقیح کا، اور دوسرا عنوان تعمیر کا۔ میں ان دونوں کو الگ الگ بیان کرونگا۔

پہلے عنوان کے سلسلہ میں شاہ صاحب نے پوری تاریخ اسلام پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے شاہ صاحب پہلے شخص ہیں جس کی نظر تاریخ اسلام اور تاریخ مسلمین کے اصولی فرق اور باریک فرق تک پہنچی اور جس نے تاریخ مسلمین پر تاریخ اسلام کے نقطۂ نظر سے نقد و تبصرہ کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ ان بہت سی صدیوں میں اسلام قبول کرنے والی اقوام کے درمیان فی الواقع اسلام کا کیا حال رہا ہے۔ یہ ایک ایسا نازک مضمون ہے جسکی پیچیدگیوں میں

---

[1] تفہیمات جلد اول صفحہ: فلو فرض ان یکون ھٰذا الرجل فی زمان واقتضت الاسباب ان یکون اصلاح الناس باقامة الحروب ونفث فی قلبه اصلاحھم لقام ھٰذا الرجل بامر الحرب اتم قیام و کان اماماً فی الحرب لایقاس بالرستم والاسفندیار بل الرستم والاسفندیار وغیرھما طفیلیون علیه مستمدون منه مقتدون به۔

[2] مولانا محمد منظور صاحب مدیر الفرقان نے مجھے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ شاہ صاحب اور ان کے خاندان کے متعلق یہ روایات کچھ زیادہ معتبر نہیں ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ بیانات یا ان میں سے اکثر غلط ہوں۔ مجھے ان کے صحیح ہونے پر اصرار نہیں ہے۔ مگر جو بات میں ثابت کرنا چاہتا ہوں وہ بجائے خود حقیقت ہے۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ساری زندگی اس پر شاہد ہے کہ وہ تمام عمر تنقیح و تنقید اور تعمیر افکار کے کام میں منہمک رہے اور دعوتِ عامہ کی طرف توجہ کرنے کا ان کو موقع ہی نہیں ملا۔ تطہیر و تعمیر افکار اپنی جگہ خود ایک بہت بڑا کام ہے اور دعوتِ عامہ کا کام اس سے مختلف ایک دوسری نوعیت کا کام ہے۔ بہت ہی کم ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص یہ دونوں کام ایک ساتھ انجام دے سکے اور اگر کسی شخص نے صرف پہلا کام کیا ہو اور دوسرا کام نہ کر سکا ہو تو اس سے اس کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا۔

پہلے بھی لوگ الجھے رہے ہیں اور اب تک الجھے ہوئے ہیں، چنانچہ شاہ صاحب کے بعد بھی کوئی ایسا صاحب نظر نہ اٹھا جس کے ذہن میں حقیقی تاریخ اسلام کا، تاریخ مسلمین سے الگ، کوئی واضح تصور ہوتا۔ شاہ صاحب کے کلام میں مختلف مقامات پر اس سے متعلق اشارات موجود ہیں، مگر خصوصیت کے ساتھ ازالۃ الخفا کی فصل ششم میں انھوں نے صفحہ ۱۲۲ سے صفحہ ۱۵۸ تک[5] مسلسل تاریخ مسلمین پر تبصرہ کیا ہے، اور کمال یہ کیا ہے کہ ایک ایک دور کی خصوصیات اور ایک ایک زمانہ کے فتنوں کو بیان کرتے ہوئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی اُن پیشین گوئیوں کو نقل کرتے گئے ہیں جن میں ان حالات کی طرف صریح اشارات پائے جاتے ہیں۔ اس تبصرہ میں قریب قریب اُن تمام جاہلی آمیزشوں کی نشان دہی ہو گئی ہے جو مسلمانوں کے عقائد، افکار، علوم، اخلاق، تمدن اور سیاست میں ہوتی رہیں۔

پھر شاہ صاحب نے خرابیوں کے اس ہجوم میں کھوج لگا کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان میں بنیادی خرابیاں کونسی ہیں جن سے باقی تمام خرابیوں کا شجرۂ نسب ملتا ہو، اور آخر کار دو چیزوں پر انگلی رکھدی ہے۔ ایک اقتدار سیاسی کا خلافت سے بادشاہی کی طرف انتقال، دوسرے روح اجتہاد کا مردہ ہو جانا اور تقلید جامد کا دماغوں پر مسلط ہو جانا۔

پہلی خرابی پر انھوں نے ازالہ میں پوری تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے خلافت اور بادشاہی کے اصولی و اصطلاحی فرق کو جس قدر واضح صورت میں انھوں نے بیان کیا ہے اور جس طرح احادیث سے اس کی تشریح کی ہے، اس کی کوئی مثال ان سے پہلے کے مصنفین کی تحریروں میں نہیں ملتی۔ اسی طرح اس انقلاب کے نتائج کو بھی جس صراحت کے ساتھ انھوں نے پیش کیا ہے وہ اگلوں کے کلام میں مفقود ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:-

> ارکان اسلام کی اقامت میں فتور عظیم برپا ہو گیا...... حضرت عثمان کے بعد کسی فرمانروا نے حج قایم نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اپنے نائب ہی مقرر کرکے بھیجتے رہے، حالانکہ اقامتِ حج خلافت کے لوازم میں سے ہے جس طرح تخت پر بیٹھنا، تاج پہننا اور شاہانِ گزشتہ کی نشستوں میں بیٹھنا قیصر و کسریٰ کے لیے علامتِ بادشاہی تھا اسی طرح حج خود اپنی امارت میں قایم کرنا اسلام میں علامتِ خلافت ہے،،

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:-

> پہلے وعظ اور فتویٰ دونوں خلیفہ کی رائے پر موقوف تھے۔ خلیفہ کی اجازت کے بغیر نہ وعظ کہا جا سکتا تھا اور نہ کوئی شخص فتویٰ دینے کا مجاز تھا۔ مگر اس انقلاب کے بعد وعظ اور فتوے دونوں اس نگرانی سے آزاد ہو گئے بلکہ بعد میں تو فتویٰ دینے کیلئے جماعت صالحین کے مشورے کی قید بھی نہ رہی،،

پھر فرماتے ہیں:-

> اُن لوگوں کی حکومت مجوسیوں کی حکومت کے مانند رہی ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ یہ نماز پڑھتے اور

[5] میرے پیش نظر ۱۲۸۶ھ کا نسخہ ہے جو بریلی میں طبع ہوا تھا۔

کلمۂ شہادت زبان سے ادا کرتے رہے ہیں۔ ہم اسی تغیر کے دامن میں پیدا ہوئے ہیں، معلوم نہیں آگے چل کر خدائے تعالٰی کیا دکھانا چاہتا ہے"۔

یہی دوسری خرابی تو شاہ صاحب نے ازالہ میں، حجت میں، بدور بازغہ میں، تفہیمات میں، مسوّیٰ و مصفّیٰ میں اور قریب قریب اپنی ہر تصنیف میں اس پر ماتم کیا ہے۔

ازالہ میں فرماتے ہیں:۔

"دولت شام (اموی سلطنت) کے خاتمہ تک کوئی اپنے آپ کو حنفی یا شافعی نہ کہتا تھا بلکہ سب اپنے اپنے ائمہ اور اساتذہ کے طریقے پر دلائل شرعی سے استنباط کرتے تھے۔ دولتِ عراق (عباسی سلطنت) کے زمانہ میں ہر ایک نے اپنا ایک نام متعین کیا اور یہ کیفیت ہوگئی کہ جب تک اپنے مذہب کے بڑوں کی نص نہ پاتے کتاب وسنت کی دلیل پر حکم نہ کرتے۔ اس طرح وہ اختلافات جو تاویل کتاب وسنت کے مقتضا سے ناگزیر طور پر پیدا ہوتے تھے، مضبوط بنیادوں پر جم گئے، پھر جب دولتِ عرب کا خاتمہ ہوگیا (یعنی ترکی اقتدار کا زمانہ آیا) اور لوگ مختلف ممالک میں منتشر ہوئے تو ہر ایک نے جو کچھ اپنے مذہب فقہی سے یاد کیا تھا اسی کو اصل بنالیا۔ پہلے جو چیز مذہب مستنبط تھی اب وہ سنت مستقرہ بن گئی۔ اب ان کے علم کا مدار اس پر رہ گیا کہ تخریج پر تخریج کریں اور تفریع پر تفریع"۔

مصفّیٰ میں لکھتے ہیں:۔

"ہمارے زمانہ کے سادہ لوح اجتہاد سے بالکل برگشتہ ہیں۔ اونٹ کی طرح ناک میں نکیل پڑی ہے اور کچھ نہیں جانتے کہ کدھر جارہے ہیں۔ ان کا کاروبار ہی دوسرا ہے۔ یہ بیچارے ان امور کی سمجھ بوجھ کے لئے مکلف ہی نہیں ہیں"۔

حجت کے مبحث ہفتم میں اور انصاف میں شاہ صاحب نے اس مرض کی پوری تاریخ بیان کی ہے اور ان خرابیوں کی نشاندہی کی ہے جو اس کی بدولت پیدا ہوئیں۔

تاریخی تنقید کے بعد شاہ صاحب اپنے زمانہ کی حالت کا جائزہ لیتے ہیں اور ایک ایک گروہ کو نام بنام پکار کر اس کے نقائص بیان کرتے ہیں۔ تفہیمات میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"یہ وصی (یعنی خود شاہ صاحب) ایسے زمانہ میں پیدا ہوا ہے جبکہ لوگوں میں تین چیزیں خلط ملط ہوگئیں ہیں:۔

(۱) دلیل بازی، اور یہ یونانی علوم کے اختلاط کی بدولت ہے۔ لوگ کلامی مباحث میں مشغول

ہو گئے ہیں یہاں تک کہ عقائد میں کوئی گفتگو ایسی نہیں ہوتی جو استدلالی مناظرات سے خالی ہو۔
(۲) وجدان پرستی، اور یہ صوفیوں کی مقبولیت اور ان کی حلقہ گوشی کی وجہ سے ہے جس نے مشرق سے مغرب تک لوگوں کو گھیر رکھا ہے، یہاں تک کہ ان حضرات کے اقوال و احوال لوگوں کے دلوں پر کتاب وسنت اور ہر چیز سے زیادہ تسلط رکھتے ہیں، ان کے رموز و اشارات اس قدر دخل پا گئے ہیں کہ جو شخص ان رموز و اشارات کا انکار کرے یا ان سے خالی ہو وہ نہ مقبول ہوتا ہے، نہ صالحین میں شمار ہوتا ہے، منبروں پر کوئی واعظ ایسا نہیں جس کی تقریر اشارات صوفیہ سے پاک ہو، اور درس کی مسندوں پر کوئی عالم ایسا نہیں جو ان کے کلام میں اعتقاد اور غور و خوض کا اظہار نہ کرے، ورنہ اس کا شمار گدھوں میں ہونے لگتا ہے۔ پھر امراء اور روساء وغیرہ کی کوئی مجلس ایسی نہیں جن کے ہاں لطف کلام اور بذلہ سنجی اور تفنن طبع کے لیئے صوفیہ کے اشعار اور نکات کھلونا بنے ہوئے نہ ہوں۔
(۳) طاعت، اور یہ اس بنا پر ہے کہ یہ لوگ ملت اسلامیہ میں داخل ہیں۔ پھر اس زمانہ کی ایک بیماری یہ ہے کہ ہر ایک اپنی رائے پر چلتا ہے اور بگٹٹ چلا جا رہا ہے، نہ متشابہات پر جا کر رکتا ہے اور نہ کسی ایسے امر میں دخل دینے سے باز رہتا ہے جو اس کے علم سے بالاتر ہو۔ احکام کے معانی اور اسرار پر ہر ایک اپنی عقل سے کلام کر رہا ہے اور جو کچھ جس نے سمجھ لیا ہے اس پر دوسروں سے مناظرہ و مباحثہ کر رہا ہے۔ دوسری بیماری یہ ہے کہ فقہ میں حنفی، شافعی وغیرہ کے سخت اختلافات پائے جاتے ہیں، ہر ایک اپنے طریقہ میں تعصب برتتا ہے اور دوسروں کے طریقہ پر اعتراض کرتا ہے۔ ہر مذہب میں تخریجات کی کثرت ہے اور حق اس غبار میں چھپ گیا ہے"

اسی کتاب میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں:—

"میں ان پیرزادوں سے، جو کسی استحقاق کے بغیر باپ دادا کی گدیوں پر بیٹھے ہیں، کہتا ہوں کہ یہ کیا دھڑے بندیاں تم نے کر رکھی ہیں؟ کیوں تم میں سے ہر ایک اپنے طریقہ پر چل رہا ہے اور کیوں اس طریقہ کو سب نے چھوڑ رکھا ہے جسے اللہ نے محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر اتارا تھا؟ تم میں سے ہر ایک امام بن بیٹھا ہے، اپنی طرف لوگوں کو بلا رہا ہے اور اپنے آپ کو ہادی و مہدی سمجھتا ہے حالانکہ وہ ضال و مضل ہے۔ ہم ہرگز ان لوگوں سے راضی نہیں ہیں جو دنیا کے فوائد کی خاطر لوگوں سے بیعت لیتے ہیں، یا اس لیئے علم حاصل کرتے ہیں کہ اغراض دنیوی

حاصل کریں، یا لوگوں کو اپنی طرف دعوت دیتے ہیں اور اپنی خواہشاتِ نفس کی اطاعت ان سے کراتے ہیں۔ یہ سب رہزن ہیں، دجّال ہیں، کذّاب ہیں، خود بھی دھوکے میں ہیں اور دوسروں کو بھی دھوکہ دے رہے ہیں۔......

میں اُن طالبانِ علم سے کہتا ہوں جو اپنے آپ کو علماء کہتے ہیں کہ بے وقوفو! تم یونانیوں کے علوم اور صرف ونحو ومعانی میں پھنس گئے اور سمجھے کہ علم اس کا نام ہے، حالانکہ علم تو کتاب اللہ کی آیت محکمہ ہے، یا وہ سنت ہے جو رسول سے ثابت ہو۔.... تم پچھلے فقہا کے استحسانات اور تفریعات میں ڈوب گئے۔ کیا تمھیں خبر نہیں کہ حکم صرف وہ ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے فرمایا ہو؟ تم میں سے اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب کسی کو نبی کی کوئی حدیث پہونچتی ہے تو وہ اس پر عمل نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ میرا عمل تو فلاں کے مذہب پر ہے نہ کہ حدیث پر۔ پھر وہ حیلہ پیش کرتا ہے کہ "صاحب! حدیث کا فہم اور اس کے مطابق فیصلہ تو کاملین و ماہرین کا کام ہے، اور یہ حدیث ائمہ سلف سے چھپی تو رہی نہ ہوگی، پھر کوئی وجہ تو ہوگی کہ انھوں نے اسے ترک کردیا"، جان رکھو کہ یہ ہرگز دین کا طریقہ نہیں ہے۔ اگر تم اپنے نبی پر ایمان لائے ہو تو اس کا اتباع کرو خواہ کسی مذہب کے موافق ہو یا مخالف.......

میں ان متقشف واعظوں، عابدوں اور خانقاہ نشینوں سے کہتا ہوں کہ اے زہد کے مدعیو! تم ہر وادی میں بھٹک نکلے اور ہر رطب ویابس کو لے بیٹھے۔ تم نے لوگوں کو موضوعات اور اباطیل کی طرف بلایا۔ تم نے خلقِ خدا پر زندگی کا دائرہ تنگ کردیا، حالانکہ تم فراخی کے لیئے مامور تھے نہ کہ تنگی کے لیئے۔ تم نے مغلوب الحال عشاق کی باتوں کو اپنا مدار علیہ بنالیا ہے حالانکہ یہ چیزیں پھیلانے کی نہیں، لپیٹ کر رکھ دینے کی ہیں۔...... میں اُمرا سے کہتا ہوں کہ تمھیں خدا کا خوف نہیں آتا؟ تم فانی لذتوں کی طلب میں مستغرق ہوگئے اور رعیت کو چھوڑ دیا کہ ایک دوسرے کو کھا جائے۔ علانیہ شرابیں پی جارہی ہیں اور تم نہیں روکتے، زناکاری، شراب خواری اور قماربازی کے اڈے برسرِ عام بن گئے ہیں اور تم انکا انسداد نہیں کرتے۔ اس عظیم الشان ملک میں مدتہائے دراز سے کوئی حدِ شرعی نہیں لگائی گئی جس کو تم ضعیف پاتے ہو اسے کھا جاتے ہو اور جسے قوی پاتے ہو اسے چھوڑ دیتے ہو، کھانوں کی لذت، عورتوں کے ناز و انداز، کپڑوں اور مکانوں کی لطافت، بس یہ چیزیں ہیں جن میں تم ڈوب گئے ہو۔ کبھی خدا کا خیال تمھیں

نہیں آتا.........

میں ان فوجی آدمیوں سے کہتا ہوں کہ تم کو تو اللہ نے جہاد کے لیئے، اعلائے کلمۂ حق کے لیے، شرک واہلِ شرک کا زور توڑنے کے لیئے بنایا تھا۔ اس کو چھوڑ کر تم نے گھوڑ سواری اور ہتھیار بندی کو پیشہ بنا لیا اب جہاد کی نیت اور قصد سے تمہارے دل خالی ہیں پیسہ کمانے کیلئے سپاہگی ہی کا پیشہ کرتے ہو۔ بھنگ اور شراب پیتے ہو۔ داڑھیاں منڈاتے اور مونچھیں بڑھاتے ہو، بندگانِ خدا پر ظلم ڈھاتے ہو، اور تمھیں کبھی اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ حرام کی روٹی کما رہے ہو یا حلال کی۔ خدا کی قسم تمھیں ایک روز دنیا سے جانا ہے، پھر اللہ تمھیں بتلائے گا کہ کیا کر کے آئے ہو

....

میں ان اہلِ حرفہ اور عوام سے کہتا ہوں کہ تم میں سے امانت و دیانت رخصت ہو گئی ہے، اپنے رب کی عبادت سے تم غافل ہو گئے ہو اور اللہ کے ساتھ شرک کرنے لگے ہو۔ تم غیر اللہ کے لیئے قربانیاں کرتے ہو اور مدار صاحب اور سالار صاحب کی قبروں کا حج کرتے ہو۔ یہ تمہارے بدترین افعال ہیں۔ تم میں سے جو کوئی خوشحال ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے لباس اور کھانے پر اتنا خرچ کرتا ہے کہ اس کی آمدنی اس کے لیئے کافی نہیں ہوتی اور اہل و عیال کی حق تلفی کرنی پڑتی ہے، یا پھر وہ شراب نوشی اور کرایہ کی عورتوں میں اپنی معاش اور معاد دونوں کو ضایع کرتا ہے.........

پھر میں مسلمانوں کی تمام جاعتوں کو عام خطاب کر کے کہتا ہوں کہ اے بنی آدم! تم نے اپنے اخلاق کھو دیئے، تم پر تنگ دلی چھا گئی اور شیطان تمہارا محافظ بن گیا۔ عورتیں مردوں پر حاوی ہو گئی ہیں اور مردوں نے عورتوں کو ذلیل بنا رکھا ہے۔ حرام میں تمھیں مزا آتا ہے اور حلال تمہارے لیئے بدمزہ بن گیا ہے.......... اے بنی آدم! تم نے ایسی فاسد رسمیں اختیار کر لی ہیں جن سے دین متغیر ہو گیا ہے مثلاً روزِ عاشورا کو تم جمع ہو کر باطل حرکات کرتے ہو، ایک جماعت نے اس دن کو ماتم کا دن بنا رکھا ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ سب دن اللہ کے ہیں اور سارے حوادث اللہ کی مشیت سے ہوتے ہیں؟ اگر حسین رضی اللہ عنہ اس روز شہید کیے گئے تو اور کونسا دن ہے جس میں کسی محبوبِ خدا کی موت واقع نہ ہوئی ہو؟ کچھ لوگوں نے اس دن کو کھیل تماشوں کا دن بنا لیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اسے مذہبی مناسک کا دن بنا رکھا ہے۔ پھر تم شب برات میں جاہل قوموں کی طرح کھیل تماشے کرتے ہو اور تم میں ایک گروہ کا یہ خیال ہے کہ اس روز مردوں کو کثرت سے کھانا بھیجنا چاہیئے۔ اگر تم سچے ہو تو

اپنے اس خیال اور ان حرکات کے لیے کوئی دلیل لاؤ۔ پھر تم نے ایسی رسمیں بنا رکھی ہیں جن سے تمہاری زندگی تنگ ہو رہی ہے، مثلاً شادیوں میں فضول خرچی، طلاق کو ممنوع بنا لینا، بیوہ عورت کو بٹھا رکھنا۔ اس قسم کی رسموں میں تم اپنے مال اور اپنی زندگیوں کو خراب کر رہے ہو اور ہدایت صالحہ کو تم نے چھوڑ دیا ہے، حالانکہ بہتر یہ تھا کہ ان رسموں کو چھوڑ کر اس طریقہ پر چلتے جس میں سہولت بھی نہ کہ تنگی۔ پھر تم نے موت اور غمی کو عید بنا رکھا ہے، گویا تم پر کسی نے فرض کر دیا ہے کہ جب کوئی مرے تو اس کے اقربا خوب کھانے کھلائیں، تم نمازوں سے غافل ہو، کوئی اپنے کاروبار میں اتنا مشغول ہوتا ہے کہ نماز کے لیے وقت نہیں پاتا اور کوئی اپنی تفریحوں اور خوش گپیوں میں اتنا منہمک ہوتا ہے کہ نماز فراموش ہو جاتی ہے، تم زکوٰۃ سے بھی غافل ہو، تم میں کوئی مالدار ایسا نہیں جس کے ساتھ بہت سے کھانے والے لگے ہوئے نہ ہوں، وہ ان کو کھاتا اور پہناتا ہے مگر زکوٰۃ اور عبادت کی نیت نہیں کرتا۔ تم رمضان کے روزے بھی ضائع کرتے ہو اور اس کے لیے طرح طرح کے بہانے بناتے ہو۔ تم لوگ سخت بے تدبیر ہو گئے ہو۔ تم نے اپنی بسر اوقات کا انحصار سلاطین کے وظائف و مناصب پر کر رکھا ہے اور جب تمہارا بار سنبھالنے کے لیے سلاطین کے خزانے کافی نہیں ہوتے تو وہ رعیت کو تنگ کرنے لگتے ہیں ...."

ایک اور تفہیم میں فرماتے ہیں :۔

جو لوگ حاجتیں طلب کرنے کے لیے اجمیر یا سالار مسعود کی قبر یا ایسے ہی دوسرے مقامات پر جاتے ہیں وہ اتنا بڑا گناہ کرتے ہیں کہ قتل اور زنا کا گناہ اس سے کم تر ہے۔ آخر اس میں اور خود ساختہ معبودوں کی پرستش میں فرق کیا ہے؟ جو لوگ لات اور عزیٰ سے حاجتیں طلب کرتے تھے ان کا فعل ان لوگوں کے فعل سے آخر کس طرح مختلف تھا؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہم ان کے برعکس ان لوگوں کو صاف الفاظ میں کافر کہنے سے احتراز کرتے ہیں کیونکہ خاص انکے معاملہ میں شارع کی نص موجود نہیں ہے۔ مگر اصولاً ہر وہ شخص جو کسی مردے کو زندہ ٹھیرا کر اس سے حاجتیں طلب کرتا ہے اس کا دل گناہ میں مبتلا ہے"۔

یہ اقتباسات بہت طویل ہو گئے ہیں، مگر تفہیمات جلد دوم کے چند فقرے اور تقاضا کر رہے ہیں کہ ان کو بھی اس سلسلہ میں ناظرین تک پہونچا دیا جائے۔ فرماتے ہیں:۔

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ تم مسلمان بھی آخر کار اپنے سے پہلے کی امتوں کے طریقے

اختیار کرلوگے اور جہاں جہاں انھوں نے قدم رکھا ہے وہاں تم بھی قدم رکھوگے حتیٰ کہ وہ کسی گوہ کے بل میں گھسے ہیں تو تم بھی ان کے پیچھے جاؤگے۔ صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ پہلی امتوں سے آپ کی مراد یہود و نصاریٰ ہیں؟ حضور نے فرمایا اور کون؟ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔

سچ فرمایا اللہ کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم نے۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے وہ ضعیف الایمان مسلمان دیکھے ہیں جنھوں نے صلحا کو ارباب من دون اللہ بنالیا ہے اور یہود و نصاریٰ کی طرح اپنے اولیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا رکھا ہے۔ ہم نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو کلام شارع میں تحریف کرتے ہیں اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ قول منسوب کرتے ہیں کہ نیک لوگ اللہ کے لیے ہیں اور گناہگار میرے لیے۔ یہ اسی قسم کی بات ہے جیسی یہودی کہتے تھے کہ لن تمسنا النار الا ایاما معدودۃ (ہم دوزخ میں نہ جائیں گے اور گئے بھی تو بس چند روز کیلئے) سچ پوچھو تو آج ہر گروہ میں دین کی تحریف پھیلی ہوئی ہے۔ صوفیہ کو دیکھو تو ان میں ایسے اقوال زباں زد ہیں جو کتاب وسنت سے مطابقت نہیں رکھتے، خصوصاً مسئلہ توحید میں۔ اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شرع کی انھیں بالکل پروا نہیں ہے۔ فقہا کی فقہ کو دیکھو تو اس میں اکثر وہ باتیں ملتی ہیں جن کے ماخذ کا پتہ ہی نہیں، مثلاً دہ دردہ کا مسئلہ[1] اور کنوؤں کی طہارت کا مسئلہ[2]۔ رہے اصحاب معقول اور شعرا اور اصحاب ثروت اور عوام تو ان کی تحریفات کا ذکر کہاں تک کیا جائے"

ان اقتباسات سے ایک دھندلا سا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شاہ صاحب نے مسلمانوں کے ماضی اور حال کا کس قدر تفصیلی جائزہ لیا ہے اور کس قدر جامعیت کے ساتھ ان پر تنقید کی ہے۔ اس قسم کی تنقید کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سوسائٹی میں جتنے صالح عناصر موجود ہوتے ہیں، جنکے ضمیر وایمان میں زندگی اور جن کے قلب میں برے اور بھلے کی تمیز ہوتی ہے، ان کو حالات کی خرابی کا احساس سخت مضطرب کر دیتا ہے۔ ان کی اسلامی حس اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ اپنے گرد و پیش کی زندگی میں جاہلیت کا ہر اثر انھیں کھٹکنے لگتا ہے۔ ان کی قوت امتیاز اتنی بڑھ جاتی ہے کہ وہ زندگی کے ہر پہلو میں اسلام اور جاہلیت کی آمیزشوں کو تحلیل کرنے لگتے ہیں اور ان کی قوت ایمانی اس قدر بیدار ہو جاتی ہے کہ فارزار جاہلیت کی ہر کھٹک انھیں اصلاح کے لیئے بیچین کر دیتی ہے۔ اس کے بعد مجدد کیلیئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ ان کے

[1] یعنی یہ مسئلہ کہ دس ہاتھ لمبا دس ہاتھ چوڑا حوض ہو تب اس کا پانی ماء کثیر ہوگا۔
[2] یعنی یہ مسئلہ کہ کنوئیں میں کس جانور کے گرنے پر کتنے ڈول پانی کے نکالے جائیں۔

سامنے تعمیر نو کا ایک نقشہ واضح صورت میں پیش کرے تاکہ حالت موجودہ کو جس حالت سے بدلنا مطلوب ہے اس کی طرف وہ اپنی نظر جما سکیں اور اپنی تمام سعی و عمل کو اسی سمت میں مرکوز کر دیں۔ یہ تعمیری کام بھی شاہ صاحب نے اسی خوبی اور جامعیت کے ساتھ انجام دیا جو ان کے تنقیدی کام میں آپ دیکھ چکے ہیں۔

تعمیر کے سلسلہ میں ان کا پہلا اہم کام یہ ہے کہ وہ فقہ میں ایک نہایت معتدل مسلک پیش کرتے ہیں جس میں کسی ایک مذہب کی جانبداری اور دوسرے مذاہب پر نکتہ چینی نہیں پائی جاتی۔ ایک محقق کی طرح انھوں نے تمام مذاہب فقہیہ کے اصول اور طریق استنباط کا مطالعہ کیا ہے اور بالکل آزادانہ رائے قائم کی ہے۔ جس مذہب کی کسی مسئلہ میں تائید کی، اس بنا پر کی کہ دلیل اس کے حق میں پائی، نہ اس بنا پر کہ وہ اس مذہب کی وکالت کا عہد کر چکے ہیں۔ اور جس سے اختلاف کیا، اس بنا پر کیا کہ دلیل اس کے خلاف پائی، نہ اس بنا پر کہ انھیں اس سے عناد ہے۔ اسی وجہ سے کہیں وہ حنفی نظر آتے ہیں، کہیں شافعی، کہیں مالکی اور کہیں حنبلی۔ انھوں نے ان لوگوں سے بھی اختلاف کیا ہے جو ایک مذہب کی پیروی کا قلادہ اپنی گردن میں ڈال لیتے ہیں اور قسم کھا لیتے ہیں کہ تمام مسائل میں اسی کا اتباع کریں گے اور اسی طرح وہ اُن سے بھی سخت اختلاف کرتے ہیں جنھوں نے ائمہ مذاہب میں سے کسی کی مخالفت کا عہد کر لیا ہے۔ ان دونوں کے بین بین وہ ایک ایسے معتدل راستہ پر چلتے ہیں جس میں ہر غیر متعصب طالب حق کو اطمینان حاصل ہو سکتا ہے۔ انکا رسالہ انصاف اس مسلک کا آئینہ ہے۔ یہی رنگ مصفّٰی اور انکی دوسری کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ تفہیمات میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

"میرے دل میں ایک خیال ڈالا گیا ہے اور اسکی تفصیل یہ ہے کہ ابوحنیفہ اور شافعی کے مذہب اُمت میں سب سے زیادہ مشہور ہیں، سب سے زیادہ پیرو بھی انہیں دونوں کے پائے جاتے ہیں اور تصنیفات بھی انہی مذاہب کی زیادہ ہیں۔ فقہا، محدثین، مفسرین، متکلمین اور صوفیہ اور زیادہ تر مذہب شافعی کے پیرو ہیں۔ اور حکومتیں اور عوام زیادہ تر مذہب حنفی کے متبع ہیں۔ اس وقت جو امر حق ملاء اعلیٰ کے علوم سے مطابقت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ ان دونوں کو ایک مذہب کی طرح کر دیا جائے۔ دونوں کے مسائل کو حدیث نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے مجموعوں سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے۔ جو کچھ ان کے موافق ہو وہ باقی رکھا جائے اور جسکی کوئی اصل نہ ملے اسے ساقط کر دیا جائے، پھر جو چیزیں تنقید کے بعد ثابت نکلیں، اگر وہ دونوں مذہبوں میں متفق علیہ ہوں تو وہ اس لائق ہیں کہ انھیں دانتوں سے پکڑ لیا جائے اور اگر انہیں دونوں کے درمیان اختلاف ہو تو مسئلہ میں دونوں قول تسلیم کیئے جائیں اور دونوں پر عمل کرنے کو صحیح قرار دیا جائے۔ یا تو ان کی حیثیت ایسی ہوگی جیسی قرآن میں اختلاف قرات کی حیثیت ہے، یا رخصت اور عزیمت کا فرق ہوگا، یا کسی مخمصہ سے نکلنے کے ڈو راستوں کی سی نوعیت ہوگی جیسے تعدد کفارات یا دو برابر کے مباح طریقوں کا سا حال ہوگا۔ ان چار پہلوؤں کے باہر کوئی پہلو انشاء اللہ تعالےٰ نہ پایا جائے گا۔"

انصاف میں انھوں نے اپنی رائے اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ دی ہے چنانچہ باب سوم میں واعلم ان التخریج علی کلام الفقہاء سے لیکر آخر باب تک جو کچھ لکھا ہے وہ اس لائق ہے کہ اہل الحدیث اور اہل تخریج دونوں اسکو غور کی نگاہ سے دیکھیں۔ اس بحث میں انھوں نے جس طریقہ کو ترجیح دی ہے وہ یہ ہے کہ طریق اہل حدیث اور طریق اہل تخریج، دونوں کو جمع کیا جائے۔ اسی طرح حجت کے مبحث مفتم بین فصل و مما یناسب ھٰذا المقام التنبیہ علی مسائل ضلت فی بوادیہا الافہام کے تحت جو بحث کی ہے وہ بھی دیکھنے کے لائق ہے۔

یہ مسلک معتدل اختیار کرنیکا فائدہ یہ ہے کہ تعصب اور تنگ نظری اور تقلید جامد اور لاطائل بحثوں میں تضیع اوقات کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور وسعت نظر کے ساتھ تحقیق و اجتہاد کا راستہ کھلتا ہے چنانچہ اس کے ساتھ ہی شاہ صاحب اجتہاد کی ضرورت پر زور دیتے ہیں، اور قریب قریب ان کی تمام کتابوں میں ایسی عبارتیں موجود ہیں جن میں کسی نہ کسی طرح تحقیق و اجتہاد پر زور دیا گیا ہے مثال کے طور پر مصفّیٰ کے مقدمہ سے چند فقرے انہی کے الفاظ میں نقل کرتا ہوں:-

"اجتہاد در ہر عصر فرض بالکفایہ است۔ و مراد از اجتہاد اینجا ..... معرفت احکام شرعیہ از ادلہ تفصیلیہ و تفریع و ترتیب مجتہدانہ اگرچہ بارشاد صاحب مذہبے بودہ باشد۔ و آنکہ گفتیم اجتہاد در ہر عصر فرض است بجہت آنست کہ مسائل کثیرۃ الوقوع غیر محصور اند، و معرفت احکام الٰہی در انہا واجب، و آنچہ مسطور مدون شدہ است غیر کافی، و در انہا اختلاف بسیار کہ بدون رجوع بادلہ حل اختلاف آن نتواں کرد و طرق آں تا مجتہدین غالباً منقطع، پس بغیر عرض بر قواعد اجتہاد در است نیاید۔"

یہی نہیں کہ شاہ صاحب نے اجتہاد پر محض زور ہی دیا ہو بلکہ انھوں نے پوری تفصیل کے ساتھ اجتہاد کے اصول و قواعد اور اس کی شرائط کو بیان بھی کیا ہے، ازالۃ حجت، عقد الجید، انصاف، بدور بازغہ مصفّیٰ وغیرہ میں اس مسئلہ پر کہیں اشارات اور کہیں مفصل تقریریں موجود ہیں۔ نیز اپنی کتابوں میں جہاں بھی انھوں نے کسی مسئلہ پر گفتگو کی ہے ایک محقق اور مجتہد کی حیثیت سے کی ہے گویا اُن کی کتابوں کے مطالعہ سے آدمی کو نہ صرف اجتہاد کے اصول معلوم ہو سکتے ہیں بلکہ ساتھ ساتھ اس کی تربیت بھی مل جاتی ہے۔

مذکورۂ بالا دو کام تو ایسے ہیں جو شاہ صاحب سے پہلے بھی لوگوں نے کئے ہیں، مگر جو کام ان سے پہلے کسی نے نہ کیا تھا وہ یہ ہے کہ انھوں نے اسلام کے پورے فکری، اخلاقی، شرعی اور تمدنی نظام کو ایک مرتب صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے یہ وہ کارنامہ ہے جسمیں وہ اپنے تمام پیش روؤں سے بازی لیگئے ہیں۔ اگرچہ ابتدائی تین چار صدیوں میں بکثرت ایسے ائمہ گزرے ہیں جنکے کام کو دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ذہن میں اسلام کے نظام حیات کا مکمل تصور رکھتے ہیں، اور اسی طرح بعد کی صدیوں میں بھی ایسے محققین ملتے ہیں جنکے متعلق یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس تصور سے خالی تھے، لیکن ان میں سے کسی نے بھی جامعیت اور منطقی ترتیب کے ساتھ اسلامی نظام کو بحیثیت ایک نظام کے مرتب کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ یہ شرف شاہ ولی اللہ کیلئے مقدر

ہو چکا تھا کہ اِس راہ میں پیش قدمی کریں۔ انکی کتابوں میں سے حجۃ اللہ اور البدور البازغہ، دونوں کا موضوع یہی ہے پہلی کتاب زیادہ مفصل ہے اور دوسری زیادہ فلسفیانہ۔

اِن کتابوں میں انھوں نے مابعد الطبیعی مسائل سے ابتدا کی ہے اور تاریخ میں پہلی مرتبہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص فلسفہ اسلام کو مدوّن کرنے کی بنا ڈال رہا ہے۔ اس سے پہلے مسلمان فلسفہ میں جو کچھ لکھتے اور کہتے رہے اس کو محض نادانی سے لوگوں نے "فلسفہ اسلام" کے نام سے موسوم کر رکھا ہے، حالانکہ وہ فلسفہ اسلام نہیں، فلسفہ مسلمین ہے جس کا شجرۂ نسب یونان و روم اور ایران و ہندوستان سے ملتا ہے۔ فی الواقع جو چیز اس نام سے موسوم کرنے کے لائق ہے اس کی داغ بیل سب سے پہلے اسی ہادی شخ نے ڈالی ہے۔ اگرچہ اصطلاحات وہی قدیم فلسفہ و کلام یا فلسفیانہ تصوّف کی زبان سے لی ہیں اور غیر شعوری طور پر بہت سے تخیلات بھی وہیں سے آگئے ہیں، جیسا کہ اوّل اوّل ہر نئی راہ نکالنے والے کیلئے طبعًا ناگزیر ہے، مگر پھر بھی تحقیق کا ایک نیا دروازہ کھولنے کی یہ ایک بڑی زبردست کوشش ہے، خصوصًا ایسے شدید انحطاط کے دَور میں اتنی طاقتور عقلیت کے آدمی کا ظاہر ہونا بالکل حیرت انگیز ہے۔

اِس فلسفہ میں شاہ صاحب کائنات کا اور کائنات میں انسان کا ایک ایسا تصوّر قایم کرنے کی سعی کرتے ہیں جو اسلام کے نظامِ اخلاق و تمدن کے ساتھ ہم آہنگ و متحد المزاج ہو سکتا ہو، یا دوسرے الفاظ میں جس کو اگر شجرۂ اسلام کی جڑ قرار دیا جائے تو جڑ میں اور اس درخت میں جو اس سے پھوٹا، عقلًا کوئی فطری مباینت محسوس نہ کی جا سکتی ہو۔ٗ میں حیران رہ جاتا ہوں جب سنتا ہوں کہ شاہ صاحب نے ویدانتی فلسفہ اور اسلامی فلسفہ کا جوڑ لگا کر نئی ہندی قومیت کیلئے فکری اساس فراہم کرنے کی کوئی کوشش کی تھی۔ مجھے ان کی کتابوں میں اس کوشش کا کہیں سُراغ نہ ملا۔ اور اگر مل جاتا تو باللہ العظیم کہ میں شاہ صاحب کو مجددین کی فہرست سے خارج کرکے متجددین کی صف میں لے جاکر بٹھاتا۔

مابعد الطبیعی بنیاد کو استوار کرنیکے بعد وہ اس پر ایک نظامِ اخلاق مرتب کرتے ہیں اور اس مقام پر انتہائی جذبۂ اعتراف کے ساتھ میں دیکھتا ہوں کہ وہ یونانی ایتھکس کی غلامی سے پہلو بچا رہے ہیں، اُس ایتھکس کی غلامی سے جس میں دوانی جیسے لوگ جا پھنسے اور جس کا اچھا خاصا اثر امام غزالی تک کے ذہن پر قایم رہا۔ مگر یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ شاہ صاحب اس ایتھکس کے اثر سے بالکل آزاد ہو چکے تھے۔

نظامِ اخلاق پر وہ ایک اجتماعی فلسفہ (Social philosophy) کی عمارت اٹھاتے ہیں جسکے لیے انھوں نے ارتفاقات کا عنوان تجویز کیا ہے اور اس سلسلہ میں تدبیر منزل، آدابِ معاشرت، سیاستِ مدن، عدالت، ضرب

ٗ جو فلسفہ مسلمانوں میں رائج تھا وہ اسلام کو علمی، اخلاقی اور اعتقادی نظام کو کوئی ربط نہیں رکھتا تھا، اس وجہ سے اس کا رواج جتنا جتنا بڑھا اسی قدر مسلمانوں کی زندگی بگڑتی چلی گئی، عقیدہ بھی کمزور ہوا، اخلاق بھی ڈھیلے ہوئے اور تقویٰ سے عمل بھی سو ہو گئے۔ ذہن میں متصادم خیالات کی کشمکش کا یہ طبعی نتیجہ ہے۔ اور یہی اثر اب موجودہ مغربی فلسفہ کے رواج سے بھی رونما ہو رہا ہے کیونکہ وہ بھی کسی طرح نظامِ اسلامی کی فکری اساس نہیں بن سکتا۔

محاصل (Taxation) انتظام ملکی اور تنظیم عسکری وغیرہ کی تفصیلات بیان کرتے ہیں، اور ساتھ ہی اُن اسباب پر روشنی ڈالتے ہیں جن سے تمدن میں فساد پیدا ہوتا ہے۔

پھر وہ نظام شریعت، عبادات، احکام اور قوانین کو پیش کرتے ہیں اور ہر ایک چیز کی حکمتیں سمجھاتے چلے جاتے ہیں اس خاص مضمون پر جو کام انھوں نے کیا ہے وہ اسی نوعیت کا ہے جو ان سے پہلے امام غزالی نے کیا تھا، اور حقیقی بات ہے کہ وہ اس راہ میں امام موصوف سے آگے بڑھ گئے ہیں۔

آخر میں انھوں نے تاریخ ملل و شرائع پر بھی نظر ڈالی ہے اور کم از کم میرے علم کی حد تک وہ پہلے شخص ہیں جس نے اسلام و جاہلیت کی تاریخی کشمکش کا ایک دھندلا سا تصور پیش کیا ہے۔

نظام اسلامی کے اس قدر معقول اور واضح مرتب خاکے کا پیش ہو جانا بجائے خود اس امر کی پوری ضمانت ہے کہ وہ تمام صحیح الفطرت اور سلیم الطبع لوگوں کا نصب العین بن جائے، اور جو لوگ اُن میں سے زیادہ قوت عمل رکھتے ہوں وہ اس نصب العین کے لیئے جان و تن کی بازی لگا دیں، خواہ اس نصب العین کو سامنے رکھنے والا خود عملاً ایسی کسی تحریک کی رہنمائی کرے یا نہ کرے۔ مگر جو چیز اس سے بھی زیادہ محرک ثابت ہوئی وہ یہ تھی کہ شاہ صاحب نے جاہلی حکومت اور اسلامی حکومت کے فرق کو بالکل نمایاں کر کے لوگوں کے سامنے رکھدیا، اور نہ صرف اسلامی حکومت کی خصوصیات صاف صاف بیان کیں، بلکہ اس بحث کو بتکرار ایسے طریقوں سے پیش کیا جنکی وجہ سے اصحاب ایمان کیلیے جاہلی حکومت کو اسلامی حکومت سے بدلنے کی جد وجہد کیے بغیر چین سے بیٹھنا محال ہو گیا۔ یہ مضمون حجت میں بھی کافی تفصیل کے ساتھ آیا ہے، مگر ازالۃ الخفا تو گویا ہے ہی اسی موضوع پر۔ اس کتاب میں وہ احادیث سے ثابت کرتے ہیں کہ خلافت اسلامی اور بادشاہی دو بالکل مختلف الاصل چیزیں ہیں۔ پھر ایک طرف بادشاہی کو اور ان تمام فتنوں کو رکھتے ہیں جو بادشاہی کے ساتھ مسلمانوں کی حیات اجتماعی میں از روئے تاریخ پیدا ہوئے، اور دوسری طرف خلافت اسلامی کی خصوصیات اور شرائط کو اور ان رحمتوں کو پیش کر دیتے ہیں جو اسلامی خلافت میں فی الواقع مسلمانوں پر نازل ہو چکی ہیں۔ اس کے بعد کس طرح ممکن تھا کہ لوگ چین سے بیٹھ جاتے۔

سید احمد بریلویؒ اور شاہ اسمٰعیل شہید

یہی وجہ ہے کہ شاہ صاحب کی وفات پر پوری نصف صدی بھی نہ گزری تھی کہ ہندوستان میں ایک تحریک اُٹھ کھڑی ہوئی جس کا نصب العین وہی تھا جو شاہ صاحب نگاہوں کے سامنے روشن کر کے رکھ گئے تھے۔ سید صاحب کے خطوط اور ملفوظات اور شاہ شہیدؒ کی منصب امامت، عبقات، تقویۃ الایمان اور دوسری تحریریں دیکھیے۔ دونوں جگہ

---

[۱] سید صاحب ۱۲۰۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۴۶ھ ۱۸۳۱ء میں شہادت پائی۔ شاہ اسمٰعیل صاحب ۱۱۹۳ھ ۱۷۷۹ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۲۴۶ھ ۱۸۳۱ء میں شہادت پائی۔ انقلابی تحریک کی چنگاری سید صاحب کے دل میں غالباً ۱۸۱۸ء کے لگ بھگ زمانے ہی میں بھڑک اٹھی تھی۔

وہی شاہ صاحب کی زبان بولتی نظر آئے گی۔ شاہ صاحب نے عملاً جو کچھ کیا وہ یہ تھا کہ حدیث اور قرآن کی تعلیم اور اپنی شخصیت کی تاثیر سے صحیح الخیال اور صالح لوگوں کی ایک کثیر تعداد پیدا کر دی، اور پھر ان کے چاروں صاحبزادوں نے، خصوصاً شاہ عبدالعزیز صاحب نے اس حلقے کو بہت زیادہ وسیع کیا، یہاں تک کہ ہزارہا ایسے آدمی ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئے جنکے اندر شاہ صاحب کے خیالات نفوذ کیے ہوئے تھے، جن کے دماغوں میں اسلام کی صحیح تصویر اتر چکی تھی، اور جو اپنے علم و فضل اور اپنی عمدہ سیرت کی وجہ سے عام لوگوں میں شاہ صاحب اور ان کے حلقہ کا اثر قائم ہونے کا ذریعہ بن گئے تھے۔ اس چیز نے اُس تحریک کے لیے گویا زمین تیار کر دی جو بالآخر شاہ صاحب ہی کے حلقہ سے، بلکہ یوں کہیے کہ ان کے گھر سے اٹھنے والی تھی۔

سید صاحب اور شاہ صاحب دونوں روحاً و معنیً ایک وجود رکھتے ہیں، اور اس وجودِ متحد کو میں مستقل بالذات مجدد نہیں سمجھتا بلکہ شاہ ولی اللہ صاحب کی تجدید کا تتمہ سمجھتا ہوں۔ ان حضرات کے کارنامہ کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) انھوں نے عامۂ خلائق کے دین، اخلاق اور معاملات کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا، اور جہاں جہاں ان کے اثرات پہونچ سکے وہاں زندگیوں میں ایسا زبردست انقلاب رونما ہوا کہ صحابہ کرام کے دور کی یاد تازہ ہوگئی۔

(۲) انھوں نے اتنے وسیع پیمانے پر، جو انیسویں صدی کے ابتدائی دور میں ہندوستان جیسے بر سر تنزل ملک میں بمشکل ہی ممکن ہوسکتا تھا، جہاد کی تیاری کی، اور اس تیاری میں اپنی تنظیمی قابلیت کا کمال ظاہر کر دیا۔ پھر غایت تدبر کے ساتھ آغاز کار کے لیے شمالی مغربی ہندوستان کو منتخب کیا جو ظاہر ہے کہ جغرافی و سیاسی حیثیت سے اس کام کیلیے موزوں ترین خطہ ہوسکتا تھا۔ پھر اس جہاد میں ٹھیک وہی اصول اخلاق اور قوانین جنگ سنبھال کیے جن سے ایک دنیا پرست جنگ آزما کے مقابلہ میں ایک مجاہد فی سبیل اللہ ممتاز ہوتا ہے، اور اس طرح انھوں نے صحیح معنوں میں روح اسلامی کا پھر ایک مرتبہ دنیا کے سامنے مظاہرہ کر دیا۔ ان کی جنگ ملک و مال، یا قومی عصبیت، یا کسی دنیوی غرض کیلیے نہ تھی بلکہ خالص فی سبیل اللہ تھی۔ ان کے سامنے کوئی مقصد اس کے سوا نہ تھا کہ خلق اللہ کو جابروں کی حکومت سے نکالیں اور وہ نظام حکومت قائم کریں جو خالق اور مالک الملک کے منشار کے مطابق ہے۔ اس غرض کے لیے جب وہ لڑے تو حسب قاعدہ اسلام یا جزیہ کی طرف پہلے دعوت دی اور پھر اتمام حجت کرکے تلوار اٹھائی۔ اور جب تلوار اٹھائی تو جنگ کے اُس مہذب قانون کی پوری پابندی کی جو اسلام نے سکھایا ہے۔ کوئی ظالمانہ اور وحشیانہ فعل ان سے سرزد نہیں ہوا۔ جس بستی میں داخل ہوئے مصلح کی حیثیت سے داخل ہوئے، نہ کہ مفسد کی حیثیت سے ان کی فوج کے ساتھ نہ شراب تھی، نہ بینڈ بجتا تھا، نہ بیسواؤں کی پلٹن ہوتی تھی۔ ان کی چھاؤنی بدکاریوں کا اڈا بنتی تھی، اور نہ کوئی ایسی مثال ملتی ہے کہ ان کی فوج کسی علاقے سے گزری ہو اور اس علاقے کے لوگ اپنے مال اور اپنی عورتوں کی عصمتیں لٹنے پر ماتم کناں ہوں۔ ان کے سپاہی دن کو گھوڑے کی پیٹھ پر اور رات کو جانماز پر ہوتے تھے۔

خدا سے ڈرنے والے آخرت کے حساب کو یاد رکھنے والے، اور ہر حال میں راستی پر قایم رکھنے والے خواہ اُس پر قایم رہنے میں ان کو فائدہ پہونچے یا نقصان۔ انھوں نے کہیں شکست کھائی تو بُزدل ثابت نہ ہوئے، اور کہیں فتح پائی تو جبار اور متکبر نہ پائے گئے۔

(۳) اُن کو ایک چھوٹے سے علاقہ میں حکومت کرنے کا جو تھوڑا سا موقع ملا اُس میں انھوں نے ٹھیک اُس طرز کی حکومت قایم کی جس کو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کہا گیا ہے، وہی فقیرانہ امارت، وہی مساوات، وہی شوریٰ وہی عدل و انصاف، وہی حدود شرعیہ، وہی مال کو حق کے ساتھ لینا اور حق کے مطابق صرف کرنا، وہی مظلوم کی حمایت اگرچہ ضعیف ہو اور ظالم کی مخالفت اگرچہ قوی ہو، وہی خدا سے ڈر کر حکومت کرنا اور اخلاق صالحہ کی بنیاد پر سیاست چلانا غرض ہر پہلو میں انھوں نے اسی حکمرانی کا نمونہ ایک مرتبہ پھر تازہ کر دیا جو کبھی صدیق وفاروق نے کی تھی۔

یہ لوگ بعض طبعی اسباب کی وجہ سے، جن کا ذکر آگے آتا ہے، ناکام ہوئے۔ مگر خیالات میں جو حرکت وہ پیدا کر گئے تھے اس کے اثرات ایک صدی سے زیادہ مدت گزر جانے کے باوجود اب تک ہندوستان میں موجود ہیں۔

اسباب ناکامی اس آخری مجددانہ تحریک کی ناکامی کے اسباب پر بحث کرنا عموماً اُن حضرات کے مذاق کے خلاف ہے جو بزرگوں کا ذکر عقیدت ہی کے ساتھ کرنا پسند کرتے ہیں، اس لیئے مجھے اندیشہ ہے کہ جو کچھ میں اس عنوان کے تحت عرض کروں گا وہ میرے بہت سے بھائیوں کے لیئے تکلیف کا موجب ہوگا لیکن اگر ہمارا مقصد اس تمام ذکر اذکار سے محض سابقین بالایمان کو خراج تحسین ہی پیش کرنا نہیں ہے، بلکہ آئندہ تجدید دین کے لیئے ان کے کاموں سے سبق حاصل کرنا بھی ہے، تو ہمارے لیئے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ تاریخ پر تنقیدی نگاہ ڈالیں اور ان بزرگوں کے کارناموں کا سُراغ لگانے کے ساتھ اُن اسباب کا کھوج بھی لگائیں جن کی وجہ سے یہ اپنے مقصد کو پہونچنے میں ناکام ہوئے۔ شاہ صاحب اور ان کے صاحبزادوں نے علماء حق اور صالحین کی جو عظیم القدر جماعت پیدا کی، اور پھر سید صاحب اور شاہ شہید نے صلحاء و اتقیا کا جو لشکر فراہم کیا اُس کے حالات پڑھ کر ہم دنگ رہ جاتے ہیں، ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قرن اول کے صحابہ و تابعین کی سیرتیں پڑھ رہے ہیں، اور ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ ہم سے اس قدر قریب زمانہ میں اس پایہ کے لوگ ہو گزرے ہیں۔ مگر ساتھ ہی ہمارے دل میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ اتنی زبردست اصلاحی و انقلابی تحریک جس کے لیڈر اور کارکن ایسے صالح و متقی اور ایسے سرگرم مجاہد لوگ تھے، انتہائی کوششوں کے باوجود ہندوستان پر اسلامی حکومت قایم کرنے میں کامیاب نہ ہوئی، اور اس کے برعکس کئی ہزار میل سے آئے ہوئے انگریز یہاں خالص جاہلی حکومت قایم کرنے میں کامیاب ہو گئے؟ اس سوال کو عقیدتمندی کے جوش میں لا جواب چھوڑ دینے کے معنی یہ ہیں کہ لوگ اصلاح و تقویٰ اور جہاد کو اس دنیا کی اصلاح کے معاملہ میں ضعیف الاثر سمجھیں گے، وہ یہ خیال کر کے مایوس ہو جائیں کہ جب ایسے زبردست متقیانہ جہاد سے بھی کچھ نہ بنا تو آئندہ کیا بن سکیگا

میں اس قسم کے شبہات فی الواقع لوگوں کی زبان سے سُن چکا ہوں بلکہ حال میں جب مجھے علی گڑھ جانے کا اتفاق ہوا تھا تو اسٹریچی ہال کے بھرے جلسہ میں میرے سامنے یہی شبہ پیش کیا گیا تھا اور اسے رفع کرنے کے لئے مجھے ایک مختصر تقریر کرنی پڑی تھی۔ نیز مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس وقت علماء صالحین کی جو جماعت ہمارے درمیان موجود ہے وہ بالعموم اس مسئلہ میں بالکل خالی الذہن ہے، حالانکہ اگر اس کی تحقیق کی جائے تو بہت سے ایسے سبق ہمیں مل سکتے ہیں جن سے استفادہ کرکے آئندہ زیادہ بہتر اور زیادہ صحیح کام ہو سکتا ہے۔

پہلا سبب | پہلی چیز جو مجھ کو حضرت مجدد الف ثانی کے وقت سے شاہ صاحب اور ان کے خلفاء تک تجدیدی کام میں کھٹکی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے تصوف کے بارے میں مسلمانوں کی بیماری کا پورا اندازہ نہیں لگایا اور ان کو پھر وہی غذا دیدی جس سے مکمل پرہیز کرانے کی ضرورت تھی۔ حاشا کہ مجھے فی نفسہ اُس تصوف پر اعتراض نہیں ہے جو ان حضرات نے پیش کیا۔ وہ بجائے خود اپنی روح کے اعتبار سے اسلام کا اصلی تصوف ہے اور اسکی نوعیت "احسان" سے کچھ مختلف نہیں ہے لیکن جس چیز کو میں لائق پرہیز کہہ رہا ہوں وہ متصوفانہ رموز و اشارات اور متصوفانہ زبان کا استعمال اور متصوفانہ طریقہ سے مشابہت رکھنے والے طریقوں کو جاری رکھنا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ حقیقی اسلامی تصوف اس خاص قالب کا محتاج نہیں ہے۔ اس کے سوا اس کے لئے دوسرا قالب بھی ممکن ہے۔ اُس کے لئے زبان بھی دوسری اختیار کی جا سکتی ہے، رموز و اشارات سے بھی اجتناب کیا جا سکتا ہے، اور پیری مریدی اور اس سلسلہ کی تمام عملی شکلوں کو بھی چھوڑ کر دوسری شکلیں اختیار کی جا سکتی ہیں۔ پھر کیا ضرور ہے کہ اسی قالب کو اختیار کرنے پر اصرار کیا جائے حالانکہ یہ پُرانا قالب اس بنا پر قابلِ ترک تھا اور ہے کہ مدتہائے دراز سے اسی قالب میں جاہلی تصوف کی گرم بازاری رہی ہے اور اس کی کثرتِ اشاعت نے مسلمانوں کو سخت اعتقادی و اخلاقی بیماریوں میں مبتلا کیا ہے، اور اب حال یہ ہو چکا ہے کہ ایک شخص خواہ کتنی ہی صحیح تعلیم دے، مگر یہ قالب جہاں استعمال کیا گیا اور پھر وہی تمام بیماریاں عود کر آتی ہیں جو صدیوں کے رواج عام سے اس کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہیں۔ پس جس طرح پانی جیسی حلال چیز بھی اُس وقت ممنوع ہو جاتی ہے جبکہ مریض کیلئے نقصان دہ ہو، اسی طرح یہ قالب بھی مباح ہونے کے باوجود اس بنا پر قطعی چھوڑ دینے کے قابل ہو گیا ہے کہ اسی کے لباس میں مسلمانوں کو افیون کا چسکا لگایا گیا ہے اور اس کے قریب جاتے ہی ان مزمن مریضوں کو پھر وہی چُنیا بیگم یاد آجاتی ہے جو صدیوں ان کو تھپک تھپک کر سُلاتی رہی ہیں۔ بیعت کا معاملہ پیش آنے کے بعد کچھ دیر نہیں لگتی کہ مریدوں میں وہ ذہنیت پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہے جو مریدی کے ساتھ مختص ہو چکی ہے یعنی وہی "بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید" والی ذہنیت جسکے بعد پیر صاحب اور اربابٌ من دون اللہ میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ فکر و نظر مفلوج، قوتِ تنقید ماؤف، علم و عقل کا استعمال موقوف، اور دل و دماغ پر بندگیِ شیخ کا ایسا مکمل تسلط کہ گویا شیخ ان کا رب ہے، اور یہ اسکے مربوب۔ پھر جہاں کشف و الہام کی بات چیت شروع ہوئی اور معتقدین کی ذہنی غلامی کے

بند اور زیادہ مضبوط ہونے شروع ہو گئے، اس کے بعد صوفیانہ رموز و اشارات کی باری آتی ہے جس سے مریدوں کی قوتِ واہمہ کو گویا تازیانہ لگ جاتا ہے اور وہ انھیں لے کر ایسی اڑتی ہے کہ بیچارے ہر وقت عجائبات و طلسمات ہی کے عالم میں سیر کرتے رہتے ہیں، واقعات کی دنیا میں ٹھیرنے کا موقع غریبوں کو کم ملتا ہی۔ مسلمانوں کے اس مرض سے نہ حضرت مجدد صاحب ناواقف تھے، نہ شاہ صاحب۔ دونوں کے کلام میں اس پر تنقید موجود ہے۔ مگر غالبًا اس مرض کی شدت کا انھیں پورا اندازہ نہ تھا، یہی وجہ ہے کہ دونوں بزرگوں نے ان بیماروں کو پھر وہی غذا دیدی جو اس مرض میں مہلک ثابت ہو چکی تھی، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ دونوں کا حلقہ پھر اسی پرانے مرض سے متاثر ہوتا چلا گیا۔ اگرچہ مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ کر ٹھیک وہی روش اختیار کی تھی جو ابن تیمیہ کی تھی، لیکن شاہ صاحب کے لٹریچر میں تو یہ سامان موجود ہی تھا اور پیری مریدی کا سلسلہ بھی سید صاحب کی تحریک میں چل رہا تھا، اس لیئے مرضِ صوفیت کے جراثیم سے یہ تحریک پاک نہ رہ سکی، حتیٰ کہ سید صاحب کی شہادت کے بعد ہی ایک گروہ ان کے حلقہ میں ایسا پیدا ہو گیا جو شیعوں کی طرح ان کی غیبوبت کا قائل ہوا اور اب تک اُن کے ظہورِ ثانی کا منتظر ہے! اب جس کسی کو تجدید دین کے لیئے کوئی کام کرنا ہو اس کے لیئے لازم ہے کہ متصوفین کی زبان و اصطلاحات، رموز و اشارات، لباس، اطوار، پیری مریدی اور ہر اس چیز سے جو اس طریقہ کی یاد تازہ کرنے والی ہو، مسلمانوں کو اس طرح پرہیز کرائے جیسے ذیابطیس کے مریض کو شکر سے پرہیز کرایا جاتا ہے۔

دوسرا سبب دوسری چیز جو مجھے تنقیدی مطالعہ کے دوران میں محسوس ہوئی وہ ہے کہ سید صاحب اور شاہ شہید نے جس علاقہ میں جاکر جہاد کیا اور جہاں اسلامی حکومت قایم کی، اُس علاقہ کو اس انقلاب کے لیئے پہلے اچھی طرح تیار نہیں کیا تھا۔ اُن کا لشکر تو یقینًا بہترین اخلاقی و روحانی تربیت پائے ہوئے لوگوں پر مشتمل تھا مگر یہ لوگ ہندوستان کے مختلف گوشوں سے جمع ہوئے تھے اور شمالی مغربی ہندوستان میں ان کی حیثیت مہاجرین کی سی تھی۔ اس علاقہ میں سیاسی انقلاب برپا کرنے کے لیئے ضروری تھا کہ خود اس علاقہ ہی کی آبادی میں پہلے اخلاقی و ذہنی انقلاب برپا کر دیا جاتا، تاکہ مقامی لوگ اسلامی نظام حکومت کو سمجھنے اور اس کے انصار بننے کے قابل ہو جاتے۔ دونوں لیڈر غالبًا اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ سرحد کے لوگ چونکہ مسلمان ہیں، اور غیر مسلم اقتدار کے ستائے ہوئے بھی ہیں، اس لیئے وہ اسلامی حکومت کا خیر مقدم کریں گے۔ اسی وجہ سے انھوں نے جاتے ہی وہاں جہاد شروع کر دیا، اور جتنا ملک قابو میں آیا اس پر اسلامی خلافت قایم کر دی لیکن بالآخر تجربہ سے ثابت ہو گیا کہ نام کے مسلمانوں کو اصلی مسلمان سمجھنا اور ان سے وہ توقعات وابستہ کرنا جو اصلی مسلمان ہی پورے کر سکتے ہیں، محض ایک دھوکا تھا۔ وہ لوگ خلافت کا بوجھ سہارنے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ جب ان پر یہ بوجھ رکھا گیا تو خود بھی گرے اور اس پاکیزہ عمارت کو بھی لے گرے ـــــــ تاریخ کا یہ سبق بھی ایسا ہے جسے آئندہ ہر تجدیدی تحریک میں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین

کرلینا چاہیئے کہ جس سیاسی انقلاب کی جڑیں اجتماعی ذہنیت، اخلاق اور تمدن میں گہری جمی ہوئی نہ ہوں، وہ نفس بر آب کی طرح ہوتا ہے کسی عارضی طاقت سے ایسا انقلاب واقع ہو بھی جائے تو قائم نہیں رہ سکتا اور جب مٹتا ہے تو اس طرح مٹتا ہے کہ اپنا کوئی اثر چھوڑ کر نہیں جاتا۔

تیسرا سبب | اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اس تجدیدی تحریک کے مقابلہ میں کئی ہزار میل دور سے آئے ہوئے انگریزوں کو کس قسم کی فوقیت حاصل تھی جس کی وجہ سے وہ تو یہاں جاہلی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے اور یہ خود اپنے گھر میں اسلامی حکومت قائم نہ کرسکی؟ اس کا صحیح جواب آپ نہیں پا سکتے جب تک کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی کی یورپ کی تاریخ آپ کے سامنے نہ ہو شاہ صاحب اور ان کے خلفاء نے اسلام کی تجدید کے لیے جو کام کیا اس کی طاقت کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھیئے اور دوسرے پلڑے میں اس طاقت کو رکھیئے جس کے ساتھ ان کی ہمعصر جاہلیت اٹھی تھی تب آپ کو پورا اندازہ ہوگا کہ اس عالم اسباب میں جو قوانین کارفرما ہیں ان کے لحاظ سے دونوں طاقتوں میں کیا تناسب تھا۔ میں مبالغہ نہ کرونگا اگر یہ کہوں کہ ان دونوں قوتوں میں ایک تولے اور پچاس من کی نسبت تھی اس لیے نتیجہ جو فی الواقع رونما ہوا اس کے سوا اور کچھ ہو نہ سکتا تھا۔ جس دور میں ہمارے ہاں شاہ ولی اللہ صاحب، شاہ عبدالعزیز صاحب اور شاہ اسمٰعیل شہید پیدا ہوئے، اسی دور میں یورپ قرون وسطیٰ کی نیند سے بیدار ہو کر نئی طاقت کے ساتھ اُبھرا ہوا تھا وہاں ہر علم و فن کے محققین، مکتشفین اور موجدین اس کثرت سے پیدا ہوئے جنہوں نے ایک دنیا کی دنیا بدل ڈالی۔ وہی دور تھا جس میں ہیوم، کانٹ، فشتے (Fichte) ہیگل کونت (Comte) شلائرماخر (Schliermacher) اور مل جیسے فلاسفہ پیدا ہوئے جنہوں نے منطق و فلسفہ، اخلاقیات و نفسیات اور تمام علوم عقلیہ میں انقلاب برپا کیا۔ وہی دور تھا جب طبعیات میں گیلوینی (Galvani) اور وولٹا (Volta) علم الکیمیا میں لاوو ئزیر (Lavoisier) پریسٹلے (Priestlay)، ڈیوی (Davy)، ہاوی (Haiiy)، اور برزلیس (Berzelius) حیاتیات میں لینے (Linne)، ہالر (Haller)، بیشات (Bichat) اور وولف (Wolff) جیسے محققین اٹھے جن کی تحقیقات نے صرف سائنس ہی کو ترقی نہیں دی بلکہ کائنات اور انسان کے متعلق بھی ایک نیا نظریہ پیدا کر دیا۔ اسی دور میں کوسنے (Quesnay)، ٹرگوٹ (Turgot) آدم سمتھ اور مالتھس کی دماغی کاوشوں سے معاشیات کا نیا علم مرتب ہوا۔ وہی دور تھا جب فرانس میں روسو والٹیر، مانٹیسکیو ڈینس ڈائڈیرو (Denis Diderot) لامیٹری (Mettrie)، کیبانیس (Cabanis)، بفون (Buffon) روبینہ (Robinat)، انگلستان میں ٹامس پین (Paine) ولیم گوڈون (Godwin) ڈیوڈ ہارٹلے جوزف پریسٹلے، ایراسمس ڈارون، اور جرمنی میں گوئٹے، ہرڈر، شیلر، ونکلمان (Winckelmann) لسنگ (Lessing) اور بیرن دی ہولباش (Baron d'Holbach) جیسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے اخلاقیات، ادب، قانون

مذہب، سیاسیات اور تمام علوم عمران پر زبردست اثر ڈالا اور انتہائی جرأت و بیباکی کے ساتھ دنیائے قدیم پر تنقید کر کے نظریات و افکار کی ایک نئی دنیا بنا ڈالی، پریس کے استعمال، اشاعت کی کثرت، اسالیب بیان کی ترقی اور مشکل اصطلاحی زبان کے بجائے عام فہم زبان کو ذریعہ اظہار خیال بنانے کی وجہ سے ان لوگوں کے خیالات نہایت وسیع پیمانے پر پھیلے۔ انھوں نے محدود افراد کو نہیں بلکہ قوموں کو بحیثیت مجموعی متاثر کیا۔ ذہنیتیں بدل دیں، اخلاق بدل دیئے، نظام تعلیم بدل دیا، نظریۂ حیات اور مقصد زندگی بدل دیا، اور تمدن و سیاست کا پورا نظام بدل دیا۔ اسی زمانہ میں انقلاب فرانس رونما ہوا جس سے ایک نئی تہذیب پیدا ہوئی۔ اسی زمانہ میں مشین کی ایجاد نے صنعتی انقلاب برپا کیا جس نے ایک نیا تمدن، نئی طاقت اور نئے مسائل زندگی کے ساتھ پیدا کیا۔ اسی زمانہ میں انجنیرنگ کو غیر معمولی ترقی ہوئی جس سے یورپ کو وہ قوتیں حاصل ہوئیں کہ پہلے دنیا کی کسی قوم کو حاصل نہ ہوئی تھیں۔ اسی زمانہ میں قدیم فن جنگ کی جگہ نیا فن جنگ نئے آلات اور نئی تدابیر کے ساتھ پیدا ہوا۔ باقاعدہ ڈرل کے ذریعہ سے فوجوں کو منظم کرنے کا سلسلہ شروع ہوا جس کی وجہ سے میدان جنگ میں پلٹنیں مشین کی طرح حرکت کرنے لگیں اور پرانے طرز کی فوجوں کا ان کے مقابلہ میں ٹھیرنا مشکل ہو گیا۔ فوجوں کی ترتیب، عساکر کی تقسیم اور جنگی چالوں میں بھی پیہم تغیرات ہوئے، اور ہر جنگ کے تجربات سے فائدہ اٹھا کر اس فن کو برابر ترقی دی جاتی رہی۔ آلات حرب میں بھی مسلسل نئی ایجادیں ہوتی چلی گئیں۔ رائفل ایجاد ہوئی، ہلکی اور سریع الحرکت میدانی توپیں بنائی گئیں، قلعہ شکن توپیں پہلے سے بہت زیادہ طاقتور تیار کی گئیں، اور کارتوس کی ایجاد نے نئی بندوقوں کے مقابلہ میں پرانی توڑے دار بندوقوں کو بیکار کر کے رکھدیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ یورپ میں ترکوں کو اور ہندوستان میں دیسی ریاستوں کو جدید طرز کی فوجوں کے مقابلہ میں مسلسل شکستیں اٹھانی پڑیں، اور نپولین نے مٹھی بھر فوج سے مصر پر قبضہ کر لیا۔

معاصر تاریخ کے اس سرسری خاکہ پر نظر ڈالنے سے بآسانی یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ ہمارے ہاں تو چند خاص اشخاص ہی پیدا ہوئے تھے مگر وہاں قوموں کی قومیں جاگ پڑیں۔ یہاں صرف ایک جہت میں تھوڑا سا کام ہوا تھا، اور وہاں ہر جہت میں ہزاروں گنا زیادہ کام کر ڈالا گیا بلکہ کوئی شعبۂ زندگی ایسا نہ تھا جس میں نمایاں پیش قدمی نہ کی گئی ہو۔ یہاں شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کی اولاد نے چند کتابیں خاص خاص علوم پر لکھیں جو ایک نہایت محدود حلقہ تک پہونچکر رہ گئیں، اور وہاں لائبریریوں کی لائبریریاں ہر علم و فن پر تیار ہوئیں جو تمام دنیا پر چھا گئیں اور آخرکار دماغوں اور ذہنیتوں پر قابض ہو گئیں، یہاں فلسفہ، اخلاقیات، اجتماعیات، سیاسیات اور معاشیات وغیرہ علوم پر طرح طرح کی بات چیت محض ابتدائی اور سرسری حد تک رہی جس پر آگے کچھ کام نہ ہوا، اور وہاں اس دوران میں ان مسائل پر پورے پورے نظام فکر مرتب ہو گئے جنھوں نے دنیا کا نقشہ بدل ڈالا۔ یہاں علوم طبیعیہ اور قوائے مادیہ کا علم وہی رہا جو پانچ سو سال پہلے تھا، اور وہاں

اس میدان میں اتنی ترقی ہوئی اور اس ترقی کی بدولت اہلِ مغرب کی طاقت اتنی بڑھ گئی کہ اُن کے مقابلہ میں پرانے آلات و وسائل کی کمزوری کا ثابت ہونا قطعی یقینی تھا۔

حیرت تو یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب کے زمانہ میں انگریز بنگال پر چھا گئے تھے اور الٰہ آباد تک ان کا اقتدار پہنچ چکا تھا مگر انھوں نے اس نئی اُبھرنے والی طاقت کا کوئی نوٹس نہ لیا، شاہ عبدالعزیز صاحب کے زمانہ میں تو دہلی کا بادشاہ انگریزوں کا پنشن خوار ہو چکا تھا اور قریب قریب سارے ہی ہندوستان پر انگریزوں کے پنجے جم چکے تھے مگر اُن کے ذہن میں بھی یہ سوال پیدا نہ ہوا کہ آخر کیا چیز اس قوم کو اس طرح بڑھا رہی ہے، اور اس نئی طاقت کے پیچھے اسباب طاقت کیا ہیں۔ سید صاحب اور شاہ اسماعیل شہید عملاً اسلامی انقلاب برپا کرنے کیلئے اُٹھے تھے۔ انھوں نے سارے انتظامات تو کئے مگر اتنا نہ کیا کہ اہلِ نظر علما کا ایک وفد یورپ بھیجتے اور یہ تحقیق کراتے کہ یہ قوم جو طوفان کی طرح چھاتی چلی جا رہی ہے، اور نئے آلات، نئے وسائل، نئے طریقوں اور نئے علوم و فنون سے کام لے رہی ہے، اسکی اتنی قوت اور اتنی ترقی کا راز کیا ہے، اس کے گھر میں کس نوعیت کے ادارات قائم ہیں، اس کے علوم کس قسم کے ہیں، اس کے تمدن کی اساس کن چیزوں پر ہے، اور اس کے مقابلہ میں ہمارے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ جس وقت یہ حضرات جہاد کے لیے اُٹھے ہیں، اُس وقت یہ بات کسی سے چھپی ہوئی نہ تھی کہ ہندوستان میں اصلی طاقت سکھوں کی نہیں، انگریز کی ہے، اور اسلامی انقلاب کی راہ میں سب سے بڑی مخالف طاقت اگر کوئی ہو سکتی ہے تو انگریز ہی کی ہو سکتی ہے پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح ان بزرگوں کی نگاہ دوررس سے معاملہ کا یہ پہلو بالکل ہی اوجھل رہ گیا کہ اسلام و جاہلیت کی کشمکش کا آخری فیصلہ کرنے کیلئے جس حریف سے نبٹنا ہوگا اُس کے مقابلہ میں اپنی قوت کا اندازہ کریں، اور اپنی کمزوری کو سمجھ کر اسے دور کرنے کی فکر کریں۔ بہرحال جب ان سے یہ چوک ہوئی تو عالم اسباب میں ایسی چوک کے نتائج سے وہ نہ بچ سکتے تھے۔

مغربی جاہلیت کے مقابلہ میں اسلامی تجدید کی اس تحریک کی جو ناکامی ہوئی اُس کا پہلا سبق تو ہمیں یہ ملتا ہے کہ تجدید دین کیلئے صرف علوم دینیہ کا احیاء اور اتباع شریعت کی روح کو تازہ کر دینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ایک جامع اور ہمہ گیر اسلامی تحریک کی ضرورت ہے جو تمام علوم، افکار، تمام فنون و صناعات اور تمام شعبہائے زندگی پر اپنا اثر پھیلائے اور تمام امکانی قوتوں سے اسلام کی خدمت لے۔ اور دوسرا سبق جو اسی سے قریب الماخذ ہے، یہ ہے کہ اب تجدید کا کام نئی اجتہادی قوت کا طالب ہے لیکن وہ اجتہادی بصیرت جو شاہ ولی اللہ صاحب یا اُن سے پہلے کے مجتہدین و مجددین کے کارناموں میں پائی جاتی ہے، اس وقت کے کام سے عہدہ برا ہونے کیلئے کافی نہیں ہے۔ جاہلیت جدیدہ بے شمار نئے وسائل کے ساتھ آئی ہے، اس نے بے حد نئے مسائلِ زندگی پیدا کر دیئے ہیں جن کا وہم تک شاہ صاحب اور دوسرے مجددین کے ذہن میں نہ گزرا تھا۔ صرف اللہ جل جلالہ کا علم اور اسکی بخشش سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بصیرت ہی پر یہ حالات روشن تھے لہذا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہی وہ تنہا ماخذ ہے جس سے اس دور میں تجدید ملت کا کام کرنے کیلئے رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اور اس رہنمائی کو اخذ کر کے اس وقت کے حالات میں نظام فکر و عمل تعمیر کرنے کیلئے ایسی مستقل قوت اجتہادیہ درکار ہے جو مجتہدین سلف میں سے کسی ایک کے علوم اور منہاج کی پابند نہ ہو، اگرچہ استفادہ ہر ایک سے کرے اور پرہیز کسی سے بھی نہ کرے۔

آغوشِ موج کا ایک دُرِ تابندہ

یا اسلامی ہند کے طوفانی عہد میں!

خُدا کا ایک وفادار بندہ
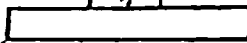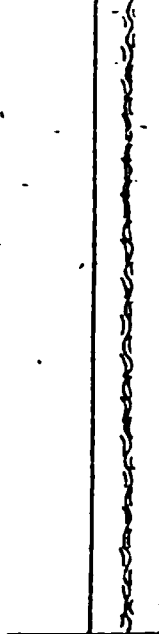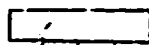
از جناب مولانا سید مناظر احسن گیلانی
صدر شعبۂ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن

خاص الفرقان کے ولی اللہ نمبر کے لئے لکھا گیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریب

(اس مضمون کے پڑھنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ ناظرین یہ دو باتیں پڑھ لیں)

(۱) چند ہی دن ہوئے کہ حضرت مجدد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح حیات کے ایک حصہ کی ترتیب سے فارغ ہوا تھا[1] کہ مولانا نعمانی دام مجدہ العالی نے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق تیار ہو جانے کا بگل بجا دیا، دماغ تھکا ہوا تھا نیز یہ سوچکر کہ شاہ صاحب کی کتابیں چونکہ عام طور پر متداول ہیں، ان کے خاص خیالات و نظریات سے لوگ واقف ہیں، بآسانی دوسرے حضرات مقالات لکھ لیں گے، جی چاہا کہ خاموش ہو جاؤں لیکن مولانا کے بار بار تقاضے سے بالآخر آمادہ ہوا یہ خیال کر کے کہ اس زمانہ میں ایک بڑا گروہ ہم میں ایسوں کا پیدا ہو گیا ہے، جو سمجھتا ہے کہ سیاسی برتری جب تک حاصل نہ ہو جائے اسلام اور مسلمانوں کے متعلق کسی قسم کی خدمت کا امکان نہیں ہے، ان کے نزدیک محکومیت کی لعنت کا مٹانا ہر کام اسی پر موقوف ہے، لیکن عراق سے جب تک تریاق آئے کیا مار گزیدہ کو یوں ہی چھوڑ دیا جائے۔؟

اسی خیال نے مجھے آمادہ کیا کہ ہندوستان کی تاریخ کا وہ دور جب اس ملک میں مسلمان اپنی سیاسی قوت اگر بالکلیہ کھو نہیں چکے تھے، تو سرعت کے ساتھ کھوتے چلے جا رہے تھے، نمک جس طرح پانی میں گھلتا چلا جاتا ہے اسی طرح ہماری مسلمانوں کا ملوکانہ اقتدار اس ملک میں گلتا اور گھلتا چلا جا رہا تھا، حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے چونکہ فتنوں کی ان ہی تاریک اور بھیانک راتوں میں کام کیا، اور اپنے کام میں کامیاب، بہت زیادہ کامیاب رہے، خیال گذرا کہ "روح اللہ" سے جن دلوں میں گونہ "یاس" پیدا ہوتا چلا جا رہا ہے، شاید اس داستان کے دہرانے سے ان کے دلوں میں قوت پیدا ہو، مطلب یہ ہے کہ کام کرنے والوں کے لئے ہر زمانہ، ہر ملک، اور ہر عہد میں بڑا میدان ہے، بہانہ جو طبائع غیر شعوری طور پر موانع و عوائق کے پہاڑ ان کو اپنے سامنے کھڑا کر کے اپنی ہمت پست کر لیتی ہیں، یا ایسی شرطوں پر اپنی آمادگی کو موقوف و مشروط کر لیتے ہیں جن کا حصول ہی مشکل ہوتا ہے ورنہ سچ یہ ہے کہ

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ ✽ تو اگر چاہے تو تیرے پاس یہ ساماں بھی ہے

اپنے مجذوبانہ انداز میں جو میری دیوانگی کا تقاضا ہے اس مضمون کو میں نے لکھا ہے، نہ میں "مورخ" ہوں اور نہ سیاست کار، بلکہ سچ یہ ہے کہ جن جن علوم و فنون سے حضرت شاہ ولی اللہ نے بحث فرمائی ہے ان میں سے کسی

---

[1] اس سے مراد وہ مقالہ ہے جو "الفرقان" کے مجدد الف ثانی نمبر میں بعنوان "ہزارہ دوم کا تجدیدی کارنامہ" شائع ہوا تھا اور جس کی دوسری قسط ربیع الثانی ۱۳۵۵ھ کے شمارہ میں شائع ہوئی ہے۔ ۱۲ م

ایک سے بھی مجھے ناہرانہ تعلق نہیں، کچھ ادھر ادھر کی شکستہ وگسستہ باتوں کو میں نے جمع کر دیا ہے اگر کسی ایک دل میں بھی وہ جذبہ پیدا ہو جائے جو اس مقالہ کے لکھنے کا مقصود ہے تو سمجھوں گا کہ محنت ٹھکانے لگی ورنہ

قہر درویش بجان درویش

میں نے اپنے اس مضمون کے بیچ بیچ میں کہیں "عصری نظریات" کا تذکرہ بھی مصلحۃً کیا ہے اور کسی ایک پہلو کی طرف بظاہر میرا رجحان بھی محسوس ہو سکتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اپنی رائے پر میں نے چونکہ خود کبھی اعتماد نہیں کیا اسلئے صرف رائے کی حیثیت سے اپنا خیال ظاہر کر دیا ہے باقی اعتماد تو ان ہی لوگوں کے شوروں پر دوسروں کو کیا خود مجھے بھی کرنا چاہئے جن پر اہل فہم و اہل دین مسلمانوں کی اکثریت اعتماد کرتی ہے " اِتَّبِعُوا السَّوَادَ الْاَعْظَمَ " پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کا فرمان ہے، میں نے یہ اسلئے لکھ دیا کہ خواہ مخواہ ان امور کی وجہ سے مجھے کسی خاص پارٹی کا آدمی نہ خیال کیا جائے، بلکہ چند وساوس تھے جن کا اظہار کر دیا گیا چاہئے کہ آدمی ہر پہلو کے سوچنے والوں کی باتوں پر غور کرے

" گر نوشت ست پند بر دیوار "

(۲) آئندہ مضمون کے پڑھنے اور سمجھنے میں سہولت ہوگی اگر حسب ذیل معلومات کا ایک سرسری خاکہ اپنے سامنے رکھ لیا جائے۔

(الف) حضرت شاہ ولی اللہؒ کی ولادت ۱۱۱۴ھ اور وفات ۱۱۷۶ھ میں ہوئی۔

(ب) اس لحاظ سے آپ کی ولادت عہد عالمگیری کے آخری زمانے میں ہوئی یعنی حضرت اورنگ زیب عالمگیر (انار اللہ برہانہ) کی وفات سے چار سال پہلے شاہ صاحب نے اس عالم ناسوت میں قدم رکھا۔

(ج) شاہ عالم ثانی یعنی جس بادشاہ نے بنگال و بہار کی دیوانی کلائیو کے ذریعہ سے کمپنی بہادر کو سپرد کی اسی نابینا بادشاہ کے عہد میں شاہ صاحب اس عالم سے عالم جاودانی کی طرف تشریف لے گئے۔

(د) حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کو دس بادشاہوں کے عہد حکومت سے گزرنا پڑا۔

(ر) ان دس بادشاہوں کی ترتیب یہ ہے۔ عالمگیر، بہادر شاہ، معز الدین جہاندار شاہ، فرخ سیر، رفیع الدرجات رفیع الدولہ۔ محمد شاہ بادشاہ (المعروف برنگیلا) ابو النصر احمد شاہ، عالمگیر ثانی، شاہ عالم بادشاہ کور و مسلوب و مظلوم۔

(س) ان سلاطین کے عہد میں ہندوستان کو جن مہیب اور خونی واقعات اور شدید تاریخی انقلابات سے گزرنا پڑا اور مسلسل فتنے جو پیدا ہوئے عموماً لوگ اس سے واقف ہیں۔ بارہہ کے سادات، جو (کنگس میکر) بادشاہ گر بھائیوں کے نام سے تاریخ میں یاد کئے جاتے ہیں ان کا تسلط فرخ سیر کا ان کے ہاتھوں قید میں بعد بیکسی مرنا، پھر دربار کے تورانی امراء کے ہاتھوں ان سادات کا قتل، مرہٹوں کی سرکشی کا انتہائی عروج، سکھوں کا خونی فتنہ، نادر شاہ کا قتل عام، ابدالی کا پانی پت میں ایک فیصلہ کن جنگ کے ذریعہ ہندوستان کی تاریخ کا رخ بدل دینا، روہیلوں کا

ہندوستان کی سیاست میں شریک ہونا۔ ایرانی اور تورانی امراء کی باہمی کش مکش، مغربی قوتوں کا بتدریج ملک کی سیاسیات میں دخیل ہوتے چلے جانا، انگریزوں کا اقتدار بنگال اور مدراس کے بعض علاقوں پر قائم ہونا تقریباً یہ سارے واقعات شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی ہی میں پیش آئے۔

(ش) ظاہر ہے کہ جو کچھ ہو رہا تھا بالواسطہ یا بلاواسطہ ان سب کی آخری زد دینی پر پڑ رہی تھی جو شاہ ولی اللہ کا مستقر تھا، سوال یہی ہوتا ہے کہ جس دل و دماغ کے شاہ صاحب قدس سرہٗ مالک تھے، کیا وہ ان واقعات سے متاثر نہیں ہو رہے تھے، اسی سوال کا جواب ایک خاص طرز سے اس مضمون میں دینے کی کوشش کی گئی ہے اس سلسلہ میں علاوہ دیگر امور کے شاہ صاحبؒ کے دو اہم خوابوں کا تذکرہ کیا جائے گا جن میں سے ایک کا تعلق ہندوستان کی اس فیصلہ کن جنگ سے ہے جسے مرہٹہ اور ابدالی کی جنگ کہتے ہیں، اور دوسرے خواب کا تعلق شاہ صاحب کی ان علمی خدمات سے ہے جن کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمان بحمد اللہ اس وقت تک مسلمان ہیں، اور ایسے مسلمان کہ شاید دوسرے اسلامی ممالک کے مسلمانوں سے ان کا دینی اور علمی پہلو اگر غالب نہیں تو مغلوب بھی نہیں ہے مقصود صرف داستاں گوئی نہیں ہے بلکہ یہ بتانا ہے کہ مشکلات کا حل جہاں دماغی اور جسمانی قوتوں میں تلاش کیا جاتا ہے کیا دل کی طاقتوں میں اس سلسلہ کی روشنی نہیں مل سکتی ہے، اور کیا اسی طرح اسلام کی خدمت تلوار کے ساتھ ساتھ قلم سے بھی ممکن ہے؟ شاہ ولی اللہؒ کی زندگی چونکہ ان سوالات کا جواب اپنے اندر رکھتی ہے، اسی لئے اس مقالہ میں ایک خاص طرز سے ان کے خاص حالات مرتب کئے گئے ہیں۔

قرآن پاک میں طالوت کی بادشاہت «و ملک» کی علامت یہ پیش کی گئی ہے کہ وہ بنی اسرائیل میں اس تابوت کو واپس لے آئیں گے جس میں اسرائیلیوں کی سکینت، اور آل موسیٰؑ و ہارونؑ کا "بقیہ" محفوظ ہے۔

شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خاندان والوں نے ہندی مسلمانوں میں قرآن اور حدیث کے علم کو واپس لا کر اگر کوئی کام انجام دیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کو بھی ہندی اسلام کی تاریخ میں کوئی اہم مقام نہ عطا کیا جائے بہرحال یہ اجمالی اشارات ہیں اب اصل مضمون کا مطالعہ کیجئے۔

"وَاللّٰہُ یَقُوْلُ الْحَقَّ وَھُوَ یَھْدِی السَّبِیْلَ"

مناظر احسن گیلانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ والصلوٰۃ والسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

کُلَّ یَوۡمٍ هُوَ فِی شَاْنٍ (العزیز الرحیم)

ہر لحظہ جمالِ خود نوعِ دگر آرائی
شورِ دگر انگیزی شوقِ دگر افزائی
(العارف الجامیؒ)

ہر چڑھاؤ کے بعد اُتار

یہی ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہیگا، اور کیوں نہ ہو جبکہ اس پیکرِ رحمت کی زبانِ مبارک سے بھی جو جمال آرائیوں کے ارتقاء کی رفتار کا منتہائے کمال تھا (صلی اللہ علیہ وسلم)

انی لاریٰ الفتن تقع فی بیوتکم　　میں فتنوں کو دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے گھروں میں

کوقع المطر (صحیح البخاری)　　اس طرح برس رہے ہیں جیسے بارش برستی ہو۔

کی "خیر القرون" کے کان میں آواز آئی تھی اور جو سُنا گیا تھا، کیا ایمان والوں کو وہی دِکھایا نہیں گیا؟ ذو النورین رضی اللہ عنہ کے آنگن سے تو اس فتنہ کا صرف بادل اُٹھا تھا، لیکن ابو بکرؓ ہوں یا عمرؓ، علیؓ ہوں یا طلحہؓ، زبیرؓ ہوں یا انسانیت کے اس بہترین عہد کی کوئی اور ہستی (رضوان اللہ علیہم) اُن کے گھروں میں ان فتنوں کو مسلسل برستے ہوئے نہیں پایا گیا؟ پھر جب اس دُنیا کی ریت یہی ہے کہ

نہ گل بلذتِ عشرت زِ نست نہ بلبل در باغ
ہمہ را نعرہ زناں جامہ دراں می داری!
(الحافظ الشیرازیؒ)

اور جب اس ابتلائی زندگی کے خیر سے شر کے عنصر کا جُدا کرنا ناممکن ہے تو بجائے

اپنی مرضی کے مطابق دہر کو کیوں کر کروں
مجھ کو بے حد غصہ آتا ہے مگر کس پر کروں
(لسان العصر مرحوم)

کی بے معنی تلملاہٹ، رنج اور کڑھن کے ـــــ "اطمینان" کے خیال سے ہٹ کر "امتحان" کے میدان میں

لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا　　ہم تاکہ تمہیں جانچیں کہ اپنے اپنے کردار کی رُو سے کون تم میں اچھا اور بھلا ہے

بڑھتے ہوئے ہم کیوں نہ اُتر جائیں اور یہاں کی ہر لحظہ کی "شور انگیزیوں" کو بجائے گھبرانے اور بھاگنے کے اپنی "شوق افزائیوں" کا ذریعہ کیوں نہ بنالیں، ہر "شور" پر نیا "شیون" پیدا ہونا بھی تو انسانی زندگی کی جان ہے۔ اگر "شر" کے وجود ہی کو ختم

کردیا جائیگا، تو "خیر خواہوں اور" خیر طلبوں کے لئے " اجر و مزدوری " کا استحقاق ہی کب باقی رہے گا۔ "الشیطان" کے وجود کو نگلنے والوں نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ اس ملعون کے ہٹ جانے کے بعد انسان کی فطرت اب مقابلہ کس کا کرے گی؟ تم سے ٹکرا کر بلاشبہ وہ جہنم میں گرتا ہے لیکن تم کو اسی کی ٹکر جنت میں پہنچاتی ہے، بقا ہو یا ارتقا اس دنیا میں دونوں کا یہی قانون ہے، اور صرف یہی قانون ہے۔

چڑھاؤ کے بعد اُتار اور عروج کے بعد زوال کا راز یہی ہے تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (ان چند دنوں میں دنیاوی دولت و قوت کو ہم لوگوں میں چکر دیتے رہتے ہیں) کے ارشادِ قرآنی کی یہی تفسیر ہی اور سچی بات بھی یہی ہے کہ تجدید کی وادی کا قیس ہی کیوں تنہا ٹھیکہ دار بنا رہے اس وادی میں اُترنے والے اُترتے رہیں گے اور

ہر کسے پنجروزہ نوبت او ست

کی نفیری پھونکتے ہوئے "فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ" کی بلند یکری کی طرف چڑھتے ہوئے "رِضْوَانٌ مِّنَ اللهِ اَكْبَرُ" کے "مقام امین" اور "مقعدِ صدق" تک پہنچتے چلے جائیں گے"۔

الف ثانی کے تجدیدی کارنامے کی انتہا

چند دن ہوئے کہ ہندوستان کے ایک تجدیدی کارنامے کی داستان سنانے کی سعادت میسر آئی تھی بتایا گیا تھا کہ اخلاص و وفا اور صدق و صفا کے سوا جس فقیر بے نوا کے پاس قوت و طاقت کا کوئی سرمایہ نہ تھا، وہ اپنے کشکولِ گدائی کی اسی بضاعت مزجاۃ کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا اور آیا کھڑا ہوا اور پھر اس وقت تک نہ بیٹھا جب تک کہ ملت و دین کی تجدید کی جس نہر کو وہ جاری کرنا چاہتا تھا، وہ جاری نہ ہو گئی وہ جاری ہوئی اور اسکے بعد بھی جاری رہی بلکہ بڑھتی رہی چڑھتی رہی — تا اینکہ ایک صدی بھی شاید پوری نہ گذرنے پائی تھی کہ اسکی یہی تجدیدی نہر ایک بحر بیکراں کی شکل میں ٹھاٹھیں مارتی ہوئی آفاق کے کناروں سے ٹکرانے لگی جس مغل بادشاہ نے "فقیہ" کا ترجمہ بزورِ شمشیر "احمق" مشہور کیا تھا خدا کی شان دیکھو کہ اسی کے تخت پر اسی کا حقیقی پوتا اس تجدیدی معرکہ کے بعد بیٹھتا ہے اور قرآن و حدیث تو بڑی چیزیں ہیں دینی علمی حیثیت سے جسکا درجہ نسبتاً فروتر ہے یعنی وہی فقہ و فقہاء جنہیں اُس کے دادا نے اپنی آنکھوں سے گرایا تھا اُنہیں وہ اپنے سر پر بٹھاتا ہے، آخر کون نہیں جانتا کہ حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے عہد میں "فتاویٰ ہندیہ" یا فتاویٰ عالمگیری کے مدون کرانے کی خدمت انجام دلائی تھی اور یہ تو عوام میں مشہور ہے، ورنہ اصل واقعہ تو یہ ہے کہ اکبر کا یہ پوتا فقہ کی اس کتاب کی تدوین میں عملی طور پر بذاتِ خود بھی شریک تھا حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ "انفاس العارفین" میں راوی ہیں کہ

فتاویٰ عالمگیری کی تدوین و تالیف میں عالمگیر کی شرکت

دراں ایام عالمگیر را بجمع و تدوین آں اہتمامے عظیم بود، ملا نظام ہر روز یک صفحہ پیش بادشاہ مے خواندند (صـ۲۲)

ان دنوں میں عالمگیر کو اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں بہت زیادہ اہتمام تھا، ملا نظام (افسر سررشتہ تدوین) روزانہ ایک صفحہ بادشاہ کے سامنے پڑھا کرتے تھے۔

اس کے معنی بجز اس کے اور کیا ہو سکتے ہیں کہ فتاویٰ عالمگیری اورنگ زیب صرف حکم یا زر ہی کی امداد ہی سے مرتب

نہیں ہوئی ہے بلکہ اس کی تدوین و تصحیح و ترتیب میں بنفس نفیس خود بادشاہ بھی شریک تھا۔ علماء دن بھر مختلف کتابوں سے جزئیات اور مسائل کا انتخاب کرکے جب مرتب کرچکتے تو روز کا روز بادشاہ اُسے سُن لیتا تھا کیا اس کا یہ سننا صرف بطور تبرک اور حصول ثواب کے تھا؟ شاہ صاحب نے اس کے بعد جو قصہ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ہر لفظ کے سمجھنے کے بعد آگے بڑھتا تھا جو بات سمجھ میں نہیں آتی تھی اُس پر بحث کرتا تھا، شاہ صاحب نے جو کچھ ارقام فرمایا ہے اسکا حاصل یہ ہے کہ شاہ عبدالرحیم شاہ ولی اللہ کے پدر بزرگوار نے فتاوی عالمگیری کے اس حصہ پر جو ان کے ایک دوست ملا حامد کے سپرد تھا ایک حاشیہ لکھدیا تھا، ملا نظام (جو صیغہ تدوین کے افسر اعلیٰ تھے) اور اپنے رفقار کار کے کاموں کو روز بادشاہ کے سامنے پیش کرتے تھے حسب دستور ملا حامد کے اس مسودہ کو سُنا رہے تھے کہ شاہ عبدالرحیم والے حاشیہ پر پہنچے، ملا صاحب کو تو دُمیں خبر نہ ہوئی، لیکن عالمگیر جس توجہ سے عالمگیری کے سودات کو سنتا تھا اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ حاشیہ والے زائد فقرے کا کان میں پہنچنا تھا اور "ایں عبارت چیست" کی آواز شاہی جلال کے ساتھ ملا نظام کے کان میں گونجی، پھر ہوش و حواس کو درست کرکے غور کرتے ہیں جب بھی مطلب خبط ہی نظر آیا حتیٰ کہ اس وقت کچھ سمجھ میں[1] نہ آیا، خفیف ہو کر معذرت خواہ ہوئے، اور بولے۔

ایں را مطالعہ کردہ ام فردا بتفصیل	اس مقام کا میں نے مطالعہ نہیں کیا ہے کل
عرض خواہم کرد۔	تفصیل سے اس کا مطلب عرض کرونگا"

عالمگیری کارناموں میں مجددی اثرات کا دخل

افسوس کہ "الف ثانی کے تجدیدی کارنامہ" کی تفصیل کا اندازہ پھر موقعہ نہ مل سکا، ورنہ تاریخی حقائق کی روشنی میں بتایا جاتا کہ عالمگیری تحریکات و مجاہدات میں حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کی تجدیدی مساعی کو کس حد تک دخل ہے کم از کم حضرت مجدد کے فرزند مولانا شاہ معصوم کے وہ مکاتیب ہی پڑھ لئے جائیں جو مطبوعہ ہیں تو ان سے بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ عالمگیر کے دُنیاوی مہمات حتیٰ کہ جنگی اور سیاسی کارناموں میں شاہ معصوم رحمہ اللہ کے مشوروں بلکہ حکم کو کتنا دخل ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ جب کبھی اس مضمون کی تکمیل کا موقع میسر آئے گا اس وقت اس مسئلہ کو بھی روشن کیا جائے گا، اسی بنیاد پر میں سمجھتا ہوں کہ فتاویٰ عالمگیری اور اس کی تدوین کا بادشاہ کو اتنا عظیم اہتمام بھی حضرت مجدد الف ثانی کی تجدیدی کوششوں ہی کا ایک ثمرہ ہے غالباً فقہ اور فقہی کتابوں میں یہ خصوصیت صرف فتاویٰ عالمگیری کو حاصل ہے کہ ایک سلطنت کبریٰ (گریٹ امپائر) کا سب سے بڑا مطلق العنان بادشاہ اس کی تدوین و تالیف میں خود شریک رہا یوں سمجھنا چاہئے کہ جس تجدیدی عمل کی ابتداء جہانگیر سے ہوئی تھی اس کے عروج کا انتہائی کمال عالمگیر کی ذات پر ہوا۔ سوچا جا سکتا ہے کہ سو پشت سے تیغ زنی و سپہ گری جس کا آبائی پیشہ ہو، اور نسلاً بعد نسل سے تخت و تاج و اورنگ و دیہیم کے آغوش میں جس نے پرورش پائی ہو، تجدیدی عمل کے زور کو دیکھو کہ ایسے تلوار کے

[1] اصل عبارت میں اختلاف پیدا ہو گیا، اسلئے کہ واقعہ یہ پیش آیا تھا کہ ملا حامد نے ایک ہی مسئلہ کے متعلق دو کتابوں کی دو متفرق عبارتوں کو جمع کرکے عبارت میں گنجلک پیدا کر دی تھی شاہ عبدالرحیم صاحب والد حضرت شاہ ولی اللہ کی نظر جب اس مقام پر پڑی اصل کتابوں کو آپ نے دیکھا اور پیچیدگی کے منشاء سے واقف ہونے کے بعد مسودہ کے حاشیہ پر یہ عبارت لکھدی "من لم یتفقه فی الدین قد خلط فیه هذا غلط وصوابه کذا" (یعنی دین کی سمجھ جو نہیں رکھتا اس نے یہاں گڑبڑ کر دی ہے اور صحیح یوں ہے")

دھنی کے ہاتھ میں اس لئے قلم پکڑوایا گیا کہ فلسفہ و منطق اور تفسیر و حدیث وغیرہ کے متعلق بھی نہیں، بلکہ نماز روزہ، حج زکوٰۃ، بیع و شریٰ اور طلاق و نکاح کے خشک فقہی مسائل کی ترتیب میں خود شریک ہو، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دین کو اعزاز کا آخر اس سے بھی زیادہ بلند ترین مقام اور کیا مل سکتا تھا، قرآن لکھ کر اگر عالمگیر روز کا آذوقہ مہیا کرتا تھا تو اس کی نظیر تاریخ سے مفقود نہ تھی، اسی دلی کے تخت پر نصیر الدین محمود بادشاہ اسی شان اور اسی التزام کے ساتھ سنا جاتا ہے کہ بیٹھا تھا، لیکن فقہ جیسے غیر دلچسپ دقیق و پیچیدہ علم کے ساتھ بادشاہ کی یہ دلچسپی میرے نزدیک دینی عزت کا آخری زینہ تھا

عروج کے بعد نزول

اب اگر اس عروج کے بعد کسی نزول کی پیش گوئی کی جاتی تو تاریخ کے اوراق اسکی شہادت ادا کر سکتے تھے، دنیا کے پچھلے تجربوں سے اسکی توثیق ہو سکتی تھی، جیسا کہ میں نے تمہید میں اشارہ کیا ہے کہ جمال کی تجلیوں کا جب کبھی ابتلائی حیات کے کسی عبوری دور میں اتنا زور بندھا ہے تو تاڑنے والوں نے اس کے بعد جلال کے مظاہر کا ہمیشہ انتظار کیا ہے اور دنیا جانتی ہے کہ عالمگیر کی رحلت کے بعد ہی دوسرے رخ کا آغاز شروع ہو گیا۔ "شور انگیزیوں" کی ساکن سطح میں پھر جنبش شروع ہوئی ——————— "کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق" کے غیبی نقیبوں نے صلائے عام دینا شروع کیا۔

وہی دلی جہاں کابل سے آسام اور نیپال سے ساحل سمندر تک کی زمین اور اس کے باشندوں کے تنہا مالک کو دیکھا گیا تھا کہ وہ مبسوط سرخسی، حاوی قدسی، مضمرات، تاتار خانیہ وغیرہ فقہی کتابوں کی عبارتوں کو سنانا اپنے لئے زادِ آخرت قرار دے رہا تھا۔ اسلام کے کلیات اور اساسی امور ہی نے نہیں بلکہ ان کتابوں کی جزئیات بعیدہ نے بھی عزت و احترام کا یہ درجہ حاصل کر لیا تھا۔

وہی دلی ہے، دلی کا لال قلعہ ہے، لال قلعہ بابری و تیموری نسل کے بچوں سے ابھی خالی نہیں ہوا ہے؛ اسی دلی کو سب سے بڑا امام بلکہ سارے ہندوستان کے مسلمانوں کا مسلم الکل پیشوا اسی دلی میں بیٹھا ہوا رو رہا ہے، اسلام پر رو رہا ہے، مسلمانوں پر روتا ہے، اور ان کی کھوئی ہوئی عظمتِ رفتہ پر روتا ہے۔

میری مراد شاہ ولی اللہؒ کے بڑے صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیز قدس اللہ سرہٗ العزیز سے ہے، اپنے چچا حضرت شاہ اہل اللہ کے نام عربی میں چند خطوط آپ نے لکھے ہیں غالباً کسی مصلحت سے اس زمانہ کے تاثرات اور اپنے احساسات کا اظہار عربی نظم کی صورت میں فرماتے ہیں میں ان نظموں کے چند اشعار بقدر ضرورت حاصل معنی کے ساتھ یہاں نقل کرتا ہوں فرماتے ہیں۔

شاہ عبدالعزیز کے خونیں آنسو یا البکائے نیم شبی

جزی اللہ عنا قوم سیکھ و مرھٹ	عقوبۃ شر عاجلا غیر آجل
اللہ سکھ اور مرہٹوں کی قوم کو ہماری طرف سے بدلہ چکھائے۔	بہت برا بدلہ اور جلد چکھائے
وقد قتلوا جمعا کثیرا من الوریٰ	وقد اوجعوا اہل شاء و جاہل
ان دونوں نے بہت سی اللہ کی مخلوق کو قتل کیا	اور بیچارے گدڑیوں والوں کو بھی انہوں نے دکھ پہنچایا

(مکاتیب [illegible])

لهم كل عام نهبة في بلادنا　　يخوضون فينا بالضحى والأصائل

ہماری بستیوں اور آبادیوں پر ہر سال لوٹ مار مچاتے ہیں　　اور ہمارے علاقوں میں یہ دن دہاڑے اور شام کو پہنچتے ہیں

فهل ههنا من معاذ لعائذ　　وهل من مغيث يتقي الله عادل

پھر کیا پناہ لینے والوں کیلئے یہاں کوئی جائے پناہ ہے؟　　اور ہے کوئی ایسا فریاد رس جو اللہ کو ڈرتا ہو اور انصاف کرتا ہو

ایک اور دوسرے خط میں جوان ہی شاہ اہل اللہ کے نام ہے فرماتے ہیں۔

ايام برد اتت فالقلب منزعج　　من قوم سکھ وان الخوف معقول

سردیوں کا موسم آگیا اور دل پریشان ہے　　سکھ قوم سے اور دل کا یہ اندیشہ معقول ہے

أنفاهم الله عن هذا البلاد يا شتم　　شر الاعادي وهم من جنة غول

خدا اس ملک سے ان کو نا پید فرمائے　　یہ بدترین دشمن ہیں اور خود یہ غول بیابانی ہیں

فوضت أمري وأمر الناس أجمعهم　　إلى الإله وإن الحفظ مأمول

میں اپنے اور لوگوں کے معاملہ کو خدا کے سپرد کرتا ہوں　　اور اللہ سے امید ہے کہ وہ حفاظت فرمائیگا

ایک اور تیسرے خط کے چند اشعار یہ ہیں۔

ثم ان البلاد فاسدة[1]　　عن ايادي الغشوم والظلام

پھر معلوم ہو کہ ملک تباہ و برباد ہے　　ظالموں اور بد معاشوں کے ہاتھوں سے

غير خاف عليك ما صنعت　　قوم سکھ بجانب البوتام

آپ پر غالباً مخفی نہ ہوگا جو کچھ کیا　　سکھ قوم نے نواں علاقے میں؟

خفضوا كل قرية ومضوا　　يفتحون الحصون والآطام

ہر بستی کو انہوں نے پست کر دیا اور گذر گئے　　قلعے اور گڑھیاں فتح کرتے پھرتے ہیں

ضيعوا امة من الأرواح　　قتلوا امة من الأجسام

ایک گروہ کی جان انہوں نے ضائع کی　　اور ایک طبقہ کے اجسام کو انہوں نے قتل کیا

نهبوا عدة من الاموال　　او تقو عدة من الأيتام

---

[1] اس نمبر کے پہلے اڈیشن میں یہاں "کانت التوشام" تھا جو حیات ولی سے لیا گیا تھا اور اسکے کچھ معنی سمجھ میں نہیں آتے تھے اور یہ سمجھ کر کہ یہ لفظ مسخ ہو گیا ہے محض قرینہ اور قیاس کی اسکے معنی بحوزت کی نشانی کر دیئے گئے تھے۔ بعد میں ایک قلمی بیاض میں یہ اشعار دیکھے گئے اور وہاں اس موقع پر یہ لفظ تھا جو اب یہاں لکھا گیا ہے اسکا نمبر کرتہ بجانب "کے بعد کا" اس قلمی بیاض میں بھی صاف نہیں ہے غالباً یہ کسی بستی کا نام ہے اگر کوئی صاحب اسکی تصحیح اور تحقیق فرما سکیں تو مطلع فرمائیں - ۱۲ نعمانی عفا اللہ عنہ۔

مال اندوزی کے بھوکے ہیں ــ اور ہمارے کتنے یتیموں کو انہوں نے قید و بند کیا

وسقوا کل من تعرضهم ــ من فئام الانام كاس الحمام

اسی کو پلا دیتے ہیں موت کا پیالہ ــ جو انسانوں کے گروہ میں سے انکی راہیں آڑے آئے

ذهلت كل مرضع عما ــ ارضعته وكل ذات فطام

(آج) ہر دودھ پلانے والی نے ۔ اس بچہ کو بھول چکی ہے جسے دودھ پلاتی تھی

اور اُن کو بھی جو دودھ چھوڑ چکے ہیں

حضرت شاہ عبدالعزیز قدس اللہ سرہ العزیز نے اپنے ان اشعار میں ہندوستان کے جن سیاسی حالات کیطرف اشارہ فرمایا ہے، تاریخ کی کتابیں ان کی تفصیلات سے معمور ہیں اور آئندہ بقدر ضرورت ہیں ان کا ذکر بھی کرونگا لیکن قصداً اس سلسلہ میں میں نے حضرت شاہ صاحب کی شہادت اس لئے پیش کی ہے، تاکہ ایک عام غلط فہمی جو پھیلی ہوئی ہے، کہ علماء و صوفیاء کو ملک کے سیاسیات سے کوئی تعلق نہ تھا اس کا ازالہ ہوسکے، یہ صحیح ہے کہ ہمارے اسلاف کی خصوصاً اپنی تالیفات و تصنیفات میں یہ خاص خصوصیت تھی کہ وہ جو کچھ لکھنا چاہتے تھے اسی کو لکھتے تھے بیچ بیچ میں اپنے زمانہ کے سیاسی جھگڑوں کا ذکر لے کر نہ بیٹھ جاتے تھے، اور غالباً غلط فہمی کا منشا بھی یہی ہے، آخر یہی شاہ ولی اللہ ہیں، بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ کے مؤلفات کے دفاتر و طوامیر ہزارہا صفحات سے متجاوز ہیں، لیکن بجز "انفاس العارفین" کے جس میں آپ نے اپنے آباء و اجداد کے کچھ حالات درج کئے ہیں، اور اس سلسلہ میں بلا ارادہ کہیں کہیں بعض سیاسی حوادث کا بھی اجمالاً ذکر آگیا ہے، مگر اس کے سوا آپ کی کسی چھوٹی بڑی کتاب سے بمشکل اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ وہی کتابیں ہیں جو اس وقت لکھی گئیں جب نادر شاہ اپنی بے پناہ تلوار سے چاندنی چوک کی نہروں میں بجائے جمنا کے پانی کے انسانوں کا خون بہا رہا تھا۔ فتحپوری کی مسجد زمین سے چھت تک لاشوں سے پٹی ہوئی تھی۔ قاضی کا حوض، اور دلی کے عام کنویں صرف مردوں سے بھرے ہوئے تھے، سڑی ہوئی لاشوں سے پاک کرنے کے لئے دلی کے شہر کو پرالاؤ جوڑا گیا تھا جس میں ہندو ہو یا مسلمان سب کی میت بلا امتیاز جھونکی جارہی تھی۔ اور یہی ایک واقعہ کیا مرحوم اورنگ زیب کے بعد دلی کے آسمان نے جن جانگداز، روح فرسا واقعات کا تماشا کیا تھا ان سے کون واقف نہیں ہے۔

دلی کے خونیں فتنے اور شاہ ولی اللہ کی استقامت

لیکن دیکھتے ہو! دھن کے پکوں کی اس شان کو دیکھتے ہو! بادشاہتوں پر بادشاہتیں گزرتی چلی جاتی ہیں، انقلاب پر انقلاب ہوتا چلا جارہا ہے، قومیں قوموں پر چڑھی چلی جارہی ہیں، فتنوں کا ہر طرف زور ہے، فساد کا ہر طرف شور ہے لیکن اللہ کے کچھ بندے ہیں، جو سب کچھ دیکھتے ہیں، سب کچھ سنتے ہیں، سب سے متاثر ہوتے ہیں اور ہر مشکل کے حل کا ساز و سامان بھی اندر اندر تیار کرتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن۔

اے مرغ سحر عشق ز پروانہ بیاموز ــ کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد

نہ اُن کی زبانوں پر آسمانوں کو ہلانے والی تقریریں ہیں نہ آنکھوں سے جھوٹے آنسوؤں کا سیلاب بہایا جا رہا ہے نہ زرہ پوشوں کے بجائے دشمنوں کے حصار پر گولہ باری کر کے فتح کے شادیانے بجائے جا رہے ہیں، نہ مخالفوں کی بے سرو پا تجویزوں یا مشہور کئے ہوئے منصوبوں کو سُن سُن کر ان کا زہرہ آب ہوا جاتا ہے نہ بھی اندیشوں میں مبتلا ہو ہو کر ڈراؤنے خواب خود دیکھتے ہیں نہ دوسروں کو دکھاتے ہیں، نہ لایعنی بے معنی مشوروں سے مسلمانوں کو کبھی خیبر اور بولان کے درّوں کی طرف بھگاتے ہیں —— جس قوم کا فرض صرف آگے بڑھنا اور آگے بڑھتے ہی چلے جانا ہے، نہ اُن میں بزدلی اور جبن کے جذبات کی پرورش کر کے مورچوں کے چھوڑنے کا بگل بجاتے ہیں، نہ صرف پیٹ کی روٹی اور تن کے چیتھڑوں کو بچا لینے کے لئے اللہ کی مسجدوں کو، بزرگوں کے آثار کو، آباؤ اجداد کے مقابر کو، کفار کے مویشیوں کے گوسالہ بنانے پر آپ کو راضی کرتے ہیں، کفر کی جن نسلوں کے متعلق امید تھی کہ آج نہیں تو کل جہنم کی آگ سے ان کو بچا لینے میں ہم کامیاب ہوں گے، قیامت تک کے لئے ان پر ایمان کا دروازہ بند کر کے ہم اسئے بھاگے جا رہے ہیں کہ جس طرح بے کتاب و بے پیغمبر زندگی گزارنے والی قوموں کے سامنے صرف روٹی کے چند ٹکڑوں کا سوال ہے اور اسی کا حل زندگی کے سارے غموں کا حل ہے ہم بھی کوئی ایسا کونہ زمین کے کسی حصہ پر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں جہاں ہمارے لقموں پر دوسری قوموں کے غرانے والے دکھائی نہ دیں[1] - ہڈیوں پر اگر ہم لڑیں بھی تو آپس ہی میں لڑیں اور دے کر اب "فرشتہ صید" "پیمبر شکار" "یزداں گیر" کے "شاہین بچوں" کو اسی "مردار پیٹ" کے مسئلہ پر قناعت کا مشورہ دیا جا رہا ہے "معاشی مشکلات" کی اہمیت کھلا کر ان پر غنودگی طاری کی جا رہی ہے، ان نوجوانوں کو کون سمجھا سکتا ہے جنھیں بجائے اپنے اسلاف کے اہلِ کفر کے بزرگوں پر ایمان لانے کی خود ہمارے گھر کے لوگ دعوت دے رہے ہیں، آج کیا وقت آیا ہے اس سے پہلے جو گھڑیاں گزر چکی ہیں اُن کے مقابلہ میں سچ تو یہ ہے کہ ابھی کچھ نہیں ہوا ہے لیکن ہمارے باپ دادوں کا شیوہ بولنے کا نہیں کرنے کا تھا۔ محض اسلئے کہ وہ بولے نہیں تم غلط سمجھتے ہو اگر سمجھتے ہو کہ ان کو ان خطروں کا احساس نہ تھا، جو چیز کردار میں تلاش کی جاتی ہے اُم سے غلطی ہو رہی ہے کہ اُسے گفتار میں ڈھونڈتے ہو، باتوں کی پیچیدگیاں باتوں سے حل ہو سکتی ہیں لیکن کام کی دشواریاں بجائے کام کے صرف باتوں سے حل ہوں یہ اُس زمانہ کا دستور نہ تھا، ان کے کاموں کا جائزہ لینا چاہتے ہو تو بجائے باتوں کے اُن کے کاموں سے ہی تمہیں اسکا اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کے سامنے کیا تھا؟ اور اس کے لئے انہوں نے کیا کیا، بقول شخصے ؎

اے دل طریق رندی از محتسب بیاموز مست ست و در حق او کس ایں گماں ندارد

---

[1] اور مشاہدہ کہو یا تجربہ، وہ تو بتا رہا ہے کہ ان تنگ پیٹ روٹی پرستوں کو اگر کسی جگہ کوئی عافیت کا ایسا گوشہ کسی شکل میں میسر آ بھی گیا تو وہاں انہوں نے پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسلام اور قرآن کی ہدایتوں کو بالکل بھلا دیا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محمد اور قرآن، اسلام اور ایمان کے الفاظ یہ صرف اس وقت تک استعمال کرتے ہیں جب تک روٹی کے دوسرے دعویداروں کے مقابلہ میں ان ہی الفاظ کو چند لقموں کو اپنے پیٹ کے کمتر کرنے میں ہو سکا۔ ہو سکتے ہیں لیکن جہاں اس مقابلہ کا خوف محو ہوتا دیکھا جاتا ہے کہ پیٹ کے سوا دماغ اسی کمیں کو عافیت کے ان گوشوں میں کھیلنا چاہتے ہیں جو ان کا مداری اُن سے کھلوانا چاہتا ہے وہی بے پردگی کی مخالفت، وہی مخلوط تعلیم، وہی رقص و سرود، وہی میخواری و قمار بازی سود ہی کا کاروبار وغیرہ کا جنون ان پر سوار ہو جاتا ہے - ۱۲

بہر حال حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق بھی چونکہ میں بجائے ان کی باتوں کے اُن کے کام ہی کے ایک پہلو کو پیش کرنا چاہتا ہوں اسلئے ظاہر ہے کہ اُن کے اقوال کی جگہ میں بھی آپکے سامنے صرف ان کے اعمال ہی پیش کرونگا۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اگر ان کے اعمال کے متعلق میں اقوال پیش بھی کرنا چاہتا تو "سینہ از سوختہ" کی راکھ سے میں ان جیسوں کا ریکارڈ کیسے تیار کر سکتا ہوں جو صرف "مرغ سحر" کے سوانح نگار ہی کو مل سکتے ہیں۔ لیکن واقعہ تو یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق آئندہ اپنے جس دعوے کو پیش کرنا چاہتا ہوں اگر بجائے آثاری شہادتوں کے صرف تحریری شہادتوں کا مجھ سے مطالبہ کیا جائے تو اس مطالبہ سے عہدہ برآ ہونا شاید میرے لئے آسان نہ ہو، اگرچہ بڑی تلاش و تفحص سے بعض جستہ جستہ چیزیں اُن کی طویل الذیل تصنیفات میں ملی ہیں اور بعض کو میں آئندہ پیش بھی کرونگا، مگر حضرت مجدد کے تجدیدی کارناموں کے کمال کے بعد جس زوال سے شاہ صاحب کو سابقہ پڑا ہے قبل اس کے کہ عام تاریخی مواد اس کے متعلق پیش کروں میں نے براہ راست ولی اللہی گھرانے کے ایک مشہور بزرگ بلکہ براہ راست بڑے صاحبزادے کی گواہی سے اسی لئے آغاز کیا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ میں آئندہ حضرت شاہ صاحب کی طرف جن دینی و ملی احساسات کو منسوب کرونگا وہ محض میرا کوئی اختراعی نظریہ نہیں ہے یا منطق کی اصطلاح میں وہ اتفاقی قضیوں میں لزوم کے تعلق کو محض میرے حسن ظن نے نہیں پیدا کر دیا ہے۔

آخر اندازہ کرنے والے اندازہ کر سکتے ہیں کہ جس باپ کا بیٹا، بیٹا ہی نہیں بلکہ جانشین خلیفہ اور کیسا جانشین خلیفہ سمًّا ددلاً و ہدیًا جو ہو بہو اس کا مثنیٰ تھا، جب وہ اپنے سیاسی ماحول سے اس طرح متاثر تھا تو یہ کتنی بڑی غباوت ہوگی کہ حضرت شاہ ولی اللہ جیسے ذکی الحس، بیدار شعور، دقیقہ رس، نکتہ سنج، ژرف نگاہ باپ کے سینہ کو ان جذبات سے محض اس لئے خالی فرض کیا جائے کہ ان کی عام کتابوں میں ان احساسات کا سراغ نہیں ملتا، حالانکہ یہ نتیجہ بھی غلط ہے جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا، لیکن منجملہ اور چیزوں کے حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے یہ چند اشعار بھی اپنے اندر اس کی قوی شہادت رکھتے ہیں کہ "اسلامی ایوان" میں عہد عالمگیری کے بعد جو آگ لگی تھی اسمیں جن جن کے کیسے بجھے گئے اور جن جن کے سینے آبلوں سے معمور ہوگئے، اس میں حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بھی خاندان تھا، اور شاید یہی آبلے تھے جو "اسمٰعیلی جہاد" کے رنگ میں پھوٹ کر بالاکوٹ بہہ گئے، اگرچہ اس "جہاد" کی روشنی پر پردہ ڈال دیا گیا تھا لیکن خدا جزائے خیر دے برادر عزیز محترم مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کو جنہوں نے بزور اس پردہ کو "سیرت سید احمد شہید" لکھ کر حال ہی میں چاک کیا ہے، گو میں نہیں جانتا کہ جن لوگوں نے طے کر لیا ہے کہ بزرگوں کی روشنی کو نہیں دیکھیں گے اور جو قدم بھی اُٹھائیں گے وہ مغربی لیمپ یا ہندی ڈیوٹ ہی کی روشنی میں اُٹھائیں گے اُنکی نظر بھی اس مینار پر پڑی یا نہیں یا للعجب! كُنْتُمْ شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ "سارے جہان کے انسانوں کی نگرانی جن کے سپرد کی گئی اور جنکے وجود کا "اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ" طغرائے امتیاز تھا، آج وہی اپنی ہر حرکت و سکون میں غیروں کی طرف تاکتے ہیں اپنے کو

بے بس پا رہے ہیں، حالانکہ ان کو جو مرکزی قبلہ، مرکزی نبی، مرکزی کتاب، دی گئی تھی اسی سے اندازہ کرتے کہ اب سب کو ہمارے ساتھ وابستہ ہو کر بیٹھنا ہے۔ لیکن انہوں نے ان کے "چلانے والوں" نے تو طے کر لیا ہے کہ وہی دوسروں کی کمر پکڑ کر جئیں گے اسکے بڑا زندگی کی ساری راہیں انپر مسدود ہو چکی ہیں، ــــ "وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ"

عالمگیر کے بعد فتنوں کا آغاز

خیر میں کدھر نکلا جا رہا ہوں، تو بات یہ ہو رہی تھی کہ اورنگزیبی عہد کے بعد ہندوستان اور ہندوستان کے مسلمانوں کی کیا گذر رہی تھی۔ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے تو ان واقعات کی طرف اجمالی اشارہ کیا ہے، اس اجمال کی تھوڑی تفصیل پہلے کر لینا چاہتا ہوں۔

سکھ تحریک اور مرہٹہ تحریک

اتنا تو ان اشعار سے بھی معلوم ہوا، اور تقریباً سب ہی جانتے ہیں کہ عالمگیر کے بعد ہی ایک تحریک ہندوستان کے مغربی شمالی خطوں میں "سکھ تحریک" کے نام سے اور دوسری تحریک جنوبی ہند میں مرہٹہ یا سیواجی کی تحریک کے نام سے اٹھی تھی اور ثانی الذکر تحریک کا صرف آغاز ہی نہیں بلکہ ایک حد تک اشتداد عالمگیر ہی کے زمانہ میں ہو چکا تھا، اسی کے ساتھ اجمالی طور پر لوگوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ دونوں تحریکیں سیاسی تھیں اور ان دونوں کا رُخ اسلام اور مسلمانوں کی طرف تھا لیکن اگر قرآنی لہجہ میں پوچھا جائے کہ اَلْمَرْهَتَه وَمَا اَدْرٰكَ مَا الْمَرْهَتَه ؟ یا اَلسِّكْهَه وَمَا اَدْرٰكَ مَا السِّكْهَه؟ تو شاید اس سوال کے جواب کی جو واقعی ہیبتناک، وزہرہ گداز، ہوشربا تصویر ہے وہ شاید ہی اس زمانہ کے مسلمانوں کے سامنے ہو!

چونکہ ان واقعات یا ان کے سوا بھی میں اور جن چند چیزوں کو پیش کر رہا ہوں ان سے خود ان واقعات کا تذکرہ مقصود نہیں ہے بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ جن کے قلبی واردات کا حال یہ ہے کہ باوجود شاعر نہ ہونے کے جب اپنے باطنی احساسات سے مضطرب ہوتے تھے تو اس وقت بیساختہ انکی زبان یا قلم کی شورانگیزیاں ان اشعار کی صورت اختیار کرتی

بہ زلفِ پیچ در پیچ کسے گم کردہ ام خود را ۔ حزوش درد دل شبہائی کردم چہ می کردم

دلے پُرد زدجاں افگار یار تند خو دارم جہاں دا پُر زیاری ہائی کردم چہ می کردم

آخر میں آپ کا مشہور مصرع ہے ــ " جنوں ترک منصبہائی کردم چہ می کردم

تو اس وقت جبکہ ہر معمولی سواد خواں اعتصام الدولہ صمصام الملک خانِ دوراں اور امیر الامراء بن بن کر عزت وجلال کے اوج پر چمک رہا تھا ــ شاہ صاحب بقول خود کسی "جنوں" میں مبتلا ہو کر سب پر لات مار کر اپنا عذر ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں

" جنوں ترک منصبہائی کردم چہ می کردم " ــ

جلال کی جن تجلیوں کا تماشا فرما رہے تھے ان ہی کو پیش نظر رکھ کر کبھی فرماتے ہیں ــ

جہاں وجاں فدائے وضع شوخ شہر آشوبت قیامت بینائی ودم عیسیٰ ومرہم ہم

غور کرنا چاہیے ایک ایسے وارفتہ دست الست کے متعلق یہ خیال کرنا کہ جس طرح بہت سے لوگ جو محض اسلئے کہ لکھنا جانتے ہیں، کتابیں لکھتے تھے اسی زمرہ میں شاہ صاحب یا شاہ صاحب کی تالیفی وتعلیمی خدمات کو شمار کرنا کم از کم میرے

نزدیک "واقعات" اسکے عدم احساس ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے بہر نہج یہ ہے کہ اس گروہ کو جسکا سب سے بڑا کام صرف لکھنا ہے اسکو ان دل باختوں، سوختہ سامانوں سے کیا نسبت؟ جنہوں نے کسی بڑے کام کے لئے لکھنے کا پیشہ اختیار کیا، ٹھیک جو حال مولانا روم کا ہے جن کا کام شاعری نہ تھا، لیکن ایک کام کے لئے انہوں نے شاعروں کا لبادہ اوڑھ لیا تھا، میرے نزدیک حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے تمام مساعی کا مرکزی نقطہ بھی یہی تھا اور آئندہ آپ کے سامنے اسی نظریہ کی کچھ تفصیل (جتنی کہ کسی مجلہ میں گنجائش نکل سکتی ہے) پیش کی جائے گی، اسی لئے پہلے ان حالات کو پیش کرتا ہوں جن میں حضرت شاہ صاحب گھر گئے تھے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا، عہد عالمگیری کے بعد سب سے بڑے فتنے دو تھے: جن میں ایک کا مرکز پنجاب اور دوسرے کا منشاء و مولد جنوبی ہند کا وہ ساحلی علاقہ تھا جسے عموماً کوکن یا مرہٹواڑی کہتے ہیں، میں پہلے فتنۂ سکھ کا اجمالاً ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

پنجاب کی جدید خاکسار تحریک اور قدیم سکھ تحریک میں وجوہ مماثلت

یہ عجیب بات ہے کہ ٹھیک جس طرح پچھلے چند سالوں میں پنجاب ہی کی سرزمین سے ایک تحریک اٹھی جس کے آغاز میں یہ ظاہر کیا گیا کہ "مذہب" کے سمجھنے میں لوگوں کو جو غلطی ہوئی ہے محض اسکی اصلاح مقصود ہے اور اس سلسلہ میں آج تک تیرہ سو برس سے قرآن کا جو مطلب مسلمان سمجھتے تھے وہ بالکلیہ الٹ دیا گیا حتی کہ جو کفر تھا وہ اسلام قرار پایا اور جو اسلام تھا وہ سراسر کفر بن گیا، بہر حال ابتداءً جس طرح یہ ایک مذہبی اصلاحی تحریک تھی لیکن چند ہی دنوں میں صاحب تحریک نے آہستہ آہستہ چولا بدلنا شروع کیا، ایک آہنی اوزار [1] کو مذہبی شعار کا رنگ عطا کر کے ماننے والوں کو مسلح کیا گیا، پھر روپیہ کے ساتھ ساتھ چند دن میں گھوڑے خیمے وردیاں وصول ہونے لگیں، اور بالآخر اچانک اس تحریک کا رخ "سیاسیات" کی طرف پلٹ گیا حتی کہ خون و قتال کی گرم بازاریاں بھی شروع ہو گئیں "غزاۃ" اور "شہداء" کی فہرستیں بننے لگیں ــــ قریب قریب کچھ اسی شکل کے ساتھ پنجاب ہی سے "سکھ تحریک" کا آغاز ہوا تھا۔ مفصل حال تو کتب تاریخ سے معلوم ہوگا یہاں صرف اتنا تسلیم کر لینا بس کافی ہے کہ ایک لڑکا جس کے متعلق مصنف سیر المتاخرین کا بیان ہے کہ:-

"پدرش بقالے از قوم کھتری بود در عہد طفلی حسنی و صباحتے بانذک استعداد و لیاقتے خداداد داشت" (سیر صفحہ ۱۰۱ ج ۲)

چونکہ اس حسین و صبیح لڑکے کی طرف پنجاب کے ایک صوفی منش بزرگ سید حسن نامی کی نظر خاص تھی (برادر نظر توجہ داشت) اسلئے بتفیض صحبت درویش حقیقت کیش فی الجملہ شعور و دانش بہم رسانیدہ بر حقائق و معارف کتب فقرائے اسلام و صوفیہ ذوالاحترام بآں سخون است اطلاع حاصل نمود ــــ" اور اسی وجہ سے ــــ "از کیش آبائی خود در گذشتہ مقدمہ اقوال آں بزرگوار بزبان پنجابی کہ داشت در بحور اشعار ہندی موزوں می نمود"

آخر انہی اشعار نے گرنتھ کے نام سے ایک مذہبی کتاب کی شکل اختیار کی اور اس کے یہ مبلغ "گرونانک" کے نام سے مشہور ہوئے تو جس طرح گویا پنجاب کی موجودہ تحریک جیسے عہد حاضر کی قوت حاکمہ کے ادبیات سے متاثر ہو کر ابتداءً مذہبی رنگ میں شروع ہوئی ہے اسی طرح پنجاب کی پہلی تحریک بھی اس زمانہ کی قوت حاکمہ کی تعلیمات سے متاثر ہو کر ابتداءً مذہبی ہی

[1] یعنی بیلچہ ۱۲

رنگ میں جاری ہوئی تھی، ـــــ البتہ موجودہ تحریک کے محرک اول ہی نے اپنے ہی زمانہ میں اسکا رُخ سیاسیات کی طرف پھیر دیا لیکن پہلی تحریک نے محرکِ اوّل کے چند جانشینوں کے بعد اچانک سیاسی کروٹ لی، ـــ ،،

سکھ تحریک کی سیاسی کروٹ اور اسکے فروغ کے اسباب

ایسا کیوں ہوا اور کن اسباب کے تحت ہوا، اس کا قصہ تو طویل ہے لیکن اسی زمانہ میں جب حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہو چکے تھے، پنجاب کی یہ مذہبی تحریک مشہور گورو گوبند کی کوششوں سے سیاسی رنگ اختیار کر چکی تھی اپنی مذہبی تحریک کو سیاسی رنگ دینے کے لئے گورو گوبند نے بھی وہی کیا جو پنجاب کی موجودہ تحریک میں کیا گیا یا کیا جا رہا ہے ـ صاحب سیر المتاخرین لکھتے ہیں ـ

گورو گوبند بجائے پدر خود تیغ بہادر[1] نشستہ منتشران فرقہ خود را آہستہ آہستہ جمع نمود و سلاح و اسپ یراق بہم رسانیدہ و برہمراہیان خود قسمت کردہ و اندک اندک دست و پائے خود را انداز و شروع تگ و تاز نمود (صفحہ ۴۰۲)

گورو گوبند نے اپنے باپ تیغ بہادر کی جگہ بیٹھ کر اپنے فرقہ کی پراگندہ و منتشر افراد کو آہستہ آہستہ اکٹھا کرنا شروع کیا، اور ہتھیار گھوڑے اور دوسرے جنگی ساز و سامان بھی فراہم کئے اور اپنے رفقاء پر سب کو تقسیم کرنے لگا یوں تھوڑا تھوڑا کرکے اس نے اپنے پاؤں نکالنے شروع کئے اور دوڑ دھوپ کی ابتدا کی

بہر حال گورو گوبند کے ساتھ تو "بموجب فرمان بادشاہ فوجداران حضور بتادیب او پرداختند" لیکن گوبند کا جانشین جب بندا نامی گرو ہوا اور اس وقت حضرت شاہ صاحب جوان ہو چکے تھے اس نے مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ کیا ان چند الفاظ سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے ـ

مسلمانوں پر لرزہ خیز مظالم

بر دہات و آبادی اہل اسلام ہر جا دست اندازی تاختہ از سکنہ آنجا بر کرامی یافت ابقا نمی کرد ہر چند اطفال صغیر السن باشند قساوت و بطش شدید و جباریت کا بہ عالم بود کہ حتی زنہائے حاملہ را شکم دریدہ جنین را بیروں کشیدہ می کشتند (سیر المتاخرین صفحہ ۴۰۲)

اہل اسلام کے گاؤں اور آبادیوں پر جہاں کہیں قابو پاتا تھا چڑھ دوڑتا، اور باشندوں میں جس کسی کو پاتا باقی نہیں چھوڑتا تھا خواہ ننھے چھوٹے کمسن بچے ہی کیوں نہ ہوں حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کرکے بچے کو باہر نکال کر مار ڈالتے تھے ـ

[1] تیغ بہادر کے متعلق طباطبائی نے عجیب بات لکھی ہے کہ "شیوہ اخذ جبر و تعدی اختیار نمودہ در پنجاب میگردید" لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت مجدد صاحب کے مشہور خلیفہ حضرت حافظ شیخ آدم بنوری نے بھی ایک جمعیت فراہم کی تھی اور "تیغ بہادر از ہندوان زبانی گرفت" اور حضرت شیخ کے متعلق لکھا ہے کہ "حافظ آدم از مسلمانان" طباطبائی اور ان جیسے "بزرگوں" کو حضرت مجدد سے جو خاص کد تھی کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اسی کا نتیجہ ہے یا اس سکھی تحریک کے مقابلہ میں حافظ آدم رحمۃ اللہ علیہ ہی فی الحقیقت اٹھے تھے مجھے امید ہے کہ ہمارے دوست مولانا یوسف بنوری جو غالباً حضرت حافظ صاحب کے خاندان سے ہیں اس مسئلہ پر الفرقان میں روشنی ڈالیں گے۔ "مجددیت" کے سلسلہ میں اس سے ایک باب کا اضافہ ہوگا ـ ۱۲

یہ تو طباطبائی کا بیان ہے۔ مرزا حیرت نے ایک ہندو مصنف کی جو پنجاب میں اکسٹرا اسسٹنٹ کے عہدہ پر مامور تھے حسب ذیل شہادت نقل کی ہے ۔

ایک ہندو مصنف کی شہادت

مسلمانوں سے سکھوں کو بڑی دشمنی تھی اذان یعنی بانگ بآواز بلند نہیں ہونے دیتے تھے، مسجدوں کو اپنے تحت میں لیکر گرنتھ پڑھنا اس میں شروع کرنے اور اسکا نام ست گڑھ رکھتے تھے ..... اکثر نشہ باز اور شراب خوار ہوتے ہیں تھوڑے پر چڑھے ہوئے روٹی کھاتے جاتے ہیں ۔

دیکھنے والے کہتے ہیں کہ جہاں پہنچتے تھے جو برتن مٹی کا استعمال کی مذہب والے حضوصاً مسلمانوں کا پڑا ہوا اُن کے ہاتھ آجاتا تھا پانچ چھ بر جوتے اسپر مار کر اسمیں کھانا پکالیتے تھے (حیات طیبہ صفحہ ۱۳۱)

مسلمانوں کے برتن کے پاک کرنے کا سکھوں نے جوتے مارنے کا عجیب طریقہ اختیار کیا تھا، بہر حال اگر یہ واقعات صحیح ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ بعید از قیاس کہا جائے اس واقعہ کو جو ان "نشہ باز اور شراب خواروں" کے متعلق مرزا حیرت نے درج کیا ہے ۔ کہ

زندہ جانوروں کے بھُرتے

سکھوں کا دستور ہے کہ وہ بھرتے کرکے کھاتے ہیں، دہلی میں بھرتے دیکھے بینگنوں کو گھاس پھوس کی آگ میں مسلمانوں کے بھرتہ کرنے کو کہتے ہیں، مگر سکھوں میں انہیں بھرتے نہیں کہتے وہ ایک بڑے فولادی پنجرے میں چیل کوے، کبوتر، تیتر، مینائیں، طوطے، غرض ہر قسم کے جانور بند کرکے پنجرے کو کسی درخت سے لٹکا دیتے ہیں اور پھر نیچے آگ دیدیتے ہیں وہ زندہ پرندے پھڑ پھڑا بھن کے کوئلہ ہوجاتے ہیں، پھر انہیں صاف کرکے یہ ناخدا ترس کھاتے ہیں ۔

خیر یہ غریب پرندوں اور جانوروں کو بھرتہ بنانے کی شکل تھی، آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا ہے جب اس کے بعد مرزا حیرت کی اس روایت پر نظر پڑتی ہے کہ :-

انسانوں کے بھُرتے صفحہ ۱۳۱

"اسی طرح بے گناہ مسلمانوں کے بھرتے کئے جاتے تھے اور دیں تو پاتر بلکے انہیں ملا جاتا تھا" بہر حال قتل وغارت وخون ریزی وخون خواری اس تحریک کی روح تھی، باغوں کو اتنا مسرور کیا گیا تھا کہ جب فرخ سیر نے اپنے زمانہ میں سکھوں کی ان ظالمانہ چیرہ دستیوں کا قرار واقعی علاج کرنا چاہا اور عبدالصمد خاں تورانی صوبہ دار کشمیر اس مہم پر متعین ہوا جس نے بڑی دلیری سے بندا اور اس کے ساتھیوں پر قابو حاصل کرکے سب کو گرفتار کرکے دہلی روانہ کیا، بادشاہ کے پاس ہزارہا غریب و بے کس مسلمانوں کی فریادو زاری کی عرضیاں پہنچی ہوئی تھیں جب حکم دیا گیا کہ اب ان سے انتقام لیا جائے تو بقول طباطبائی اس وقت کا سماں عجیب تھا۔ لکھتے ہیں ۔

سکھوں کا جذبہ قربانی

نقلے عجیب زاں جا مسموع شدہ کو در گفتہ شدن ۔ عجیب قسم کی بحث جانی اس گروہ کے متعلق سننے میں آئی یعنی

یکے بر دیگرے سبقت می جست و منت جلاد می نمود — مارے جانے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش
کرتا جلاد کی خوشامد کرتا کہ پہلے اُسے مار ڈالا جائے — کہ اول اورا بکشد صفحہ ۱۴۳ ج ۲

باطل کے لئے مرجانا اور حق پر جان دینے کا فرق

کتنی عجیب بات ہے حق ہو یا باطل اس قسم کی قربانیوں اور دیدہ دلیریوں کے نظائر کی تاریخ میں کچھ کمی نہیں ہے لیکن پھر بھی کچھ لوگ ہیں جو ہر چیز سے قطع نظر کرکے صرف کسی کے تصلب و استقلال یا جذبہ قربانی کو اسکی صداقت کی دلیل بنالیتے ہیں، کس لئے مرا؟ یہ نہیں دیکھتے بلکہ کسی بات پر ہٹ کرتے ہوئے مرجانا بس یہی اُنکے نزدیک اس کے خیال کی صحت، اور اس کے مسلک کی راستی کی کافی شہادت ہے، حالانکہ اگر حق و باطل کا یہی معیار ہو تو سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ابوجہل اور سید الشہداء حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں یہ دیوانے کس بنیاد پر امتیاز پیدا کرتے ہیں۔ آخر ابوجہل نے قربانی کی کونسی ایسی قسم تھی جو پیش نہیں کی۔ مال لٹایا، گھر چھوڑا، در چھوڑا، اور بالآخر اپنے مسلک پر اصرار کرتے ہوئے بدر پہنچکر اسی راہ میں اپنی جان بھی دیدی، پھر کیا واقعی محض اسلئے ابوجہل بجائے ابوجہل ہونے کے ابوالحکم قرار دیا جاسکتا ہے، جس نے بھی اپنی جان دیدی، بس اس کے بلندی رتبہ کا ان کے سامنے پھر کوئی ٹھکانا نہیں رہتا، حالانکہ سچ پوچھئے تو ایک نہیں لاکھوں ہر زمانہ میں ہر ملک میں آپ کو ایسے آدمی مل سکتے ہیں اور ملتے رہتے ہیں، اور اس وقت بھی مل رہے ہیں، جو کسی بڑی چیز کے لئے نہیں صرف پندرہ روپے ماہوار کے لئے فوجوں میں اسلئے بھرتی ہونے پر تیار ہیں، کہ جب جی چاہے اُن کی گردن اُن کے سروں سے اُتار لی جائے۔ پھر کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ فوج کا ہر سپاہی قربانی و ایثار استقامت و استقلال کا پیکر مجسم اور مظہر اتم ہے؟ صرف اسلئے کہ بجائے کسی بڑے نصب العین کے عام فوجی سپاہیوں کے سامنے محض چند روپے ہوتے ہیں، جن کے لئے وہ اپنی جانوں سے بھی دست بردار ہوجاتے ہیں، اُنکی کوئی عظمت کسی دل میں نہیں پائی جاتی؟ یہی واقعہ ہے اور یہی فطرت کی شہادت ہے۔

بڑی جہالت ہے کہ کس لئے جان دی؟ اس سوال کی تحقیق کرنے سے پہلے لوگ غل مچادیتے ہیں کہ فلاں نے جان دیدی اب اس سے زیادہ اسکی راست بازی کی اور کیا دلیل ہوسکتی ہے۔

آج بھی تحریکوں کی صداقت و عدم صداقت کا معیار جاہلوں میں صرف یہی چیز بنی ہوئی ہے۔ کبھی کبھی کسی مسلک کی تصدیق اسلئے کی جاتی ہے کہ اسپر چلنے والے بڑے منظم ہیں، بڑے اولوالعزم ہیں۔ ہندوستان ہی نہیں، ہندوستان کے باہر بھی اپنے خیال کے پرچار میں دیوانہ وار مارے مارے پھرتے ہیں، کبھی کہا جاتا ہے کہ آخر جو نہ کسی سے کچھ لیتے ہیں اور نہ مانگتے ہیں بلکہ اپنی جیب خاص سے اپنی وردیاں بناتے ہیں پیسے خرچ کرتے ہیں کرایہ یا بلا کرایہ ریل گاڑیوں پر سفر کرتے ہیں ہر بڑی سے بڑی قوت سے ٹکرا جانے پر ہر وقت تیار رہتے ہیں نہ اپنی جائدادوں کی اُنہیں پرواہ ہے، نہ اپنی اولاد کی فکر، "جان عزیز" ہر وقت اُن کی مٹھی میں دھری ہے

معمولی اشاروں پر اسے باسانی پھینک دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ آخر اس سے بڑھ کر ان کی سچائی اور خدا کی مرضی کے مطابق ہونے کی اور کیا دلیل تلاش کی جاتی ہے — میں یہ نہیں کہتا کہ بجائے خود یہ صفات اچھے نہیں ہیں، لیکن لکڑی کاٹنے کے لئے جسے تیشہ دیا گیا، اگر بجائے لکڑی کے وہ مسجد کی دیوار کھودنے لگے تو اس میں "تیشہ" کی برائی نہیں، استعمال کرنے والے کی غلطی ہے۔ سعدیؒ نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

ترا تیشہ دادم کہ ہیزم شکن   نہ گفتم کہ دیوار مسجد بکن

آپ یہ نہ دیکھئے کہ اس کے ہاتھ میں کیا ہے بلکہ یہ دیکھئے کہ وہ اپنے ہتھیار کو کن چیزوں پر چلا رہا ہے، تنظیم، اتحاد، ایثار، قربانی، یہ قدرت کے اٹل قوانین ہیں جن کے بغیر اپنے "نصب العین" کی تکمیل میں مشکل ہی کوئی کامیاب ہو سکتا ہے مگر بایں ہمہ خود ان کی کوئی قیمت نہیں ہے اگر کسی اچھے، بلند نصب العین کے لئے انہیں استعمال کیا جائے تو یہ بہترین چیزیں ہیں لیکن اگر شر و فساد، خونریزی، و تباہ کاری، اضلال و تسویل، نوامیس شرعیہ کی توہین، اہل حق کی تحقیر کا ذریعہ ان ہی چیزوں کو بنایا جائے تو پھر ان صفات سے زیادہ بدتر کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا، چونکہ مجھے شمال مغرب کی قدیم تحریک اور جدید تحریک میں گونہ مشابہت نظر آ رہی تھی اسلئے ان چند اشارات کا ذکر مناسب معلوم ہوا —— اب میں اپنے مقصد کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

میرا مطلب یہ ہے کہ سکھوں کے جس فتنہ کا اجمالی نقشہ آپ کے سامنے پیش کیا گیا، آپ کو تو اس وقت یہ بتایا جا رہا ہے، لیکن دین کے جس دیوانے اور شمع محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے جس پروانے کا نام "ولی اللہ" تھا اُسے یہ سب کچھ دکھایا جا رہا تھا، ٹھیک جن دنوں پنجاب بندا کی ترکتازیوں سے قیامت کا نمونہ بنا ہوا تھا اسلامی حکومت اس کا اور اسکے ساتھیوں کا تعاقب کرتی تھی لیکن۔

بندا مذکور کمتر مقابل افواج بادشاہی می گشت اکثر بطور چپاولی و قطاع الطریقی در اطراف و جوانب دویدہ، یکجائی آسودہ، ہر جا کہ آدمی یافت در قتل و غارت و تخریب مساجد و نبش قبور مسلمانان قصوری نمود صفحہ ۴۰۲ طباطبائی ج ۲	مذکورہ بالا بندا بادشاہی فوج کا سامنا بہت کم کرتا تھا بلکہ زیادہ تر (گوریلا وار) کے طور پر چھپ چھپا کر حملے کرتا تھا اور اطراف و جوانب میں راہزنی کرتے ہوئے پھرا پھرتا۔ ایک جگہ اپنا ٹھکانا بنا کر نہیں رہتا تھا جہاں موقع مل جاتا قتل و قتال، لوٹ مار اور مسجدوں کی بربادی مسلمانوں کے مقابر کے اکھاڑنے میں کمی نہیں کرتا۔

بندا کے یہ ساتھی جس وقت دلی میں خود اپنے قتل کے لئے منت جلاد میں سبقت کر رہے تھے، حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اس وقت دلی ہی میں موجود تھے اور یہ سارے واقعات ان کے سامنے گذر رہے تھے، ان صفات کے زیر اثر جو تحریک اٹھائی گئی ہو عوام کو اسکی اہمیت کا ممکن ہے صحیح اندازہ نہ ہو لیکن جس نے حجۃ اللہ البالغہ

اور الخیر الکثیر، ازالۃ الخفا جیسی ولی اللٰہی تصنیفات کا مطالعہ کیا ہے اور حضرت شاہ صاحب کی نگاہ عقابین کا اُسے تجربہ ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ ان حالات کو دیکھ دیکھ کر قرآن وحدیث کے اس عاشق جانباز پر کیا گذر رہی ہوگی، مسلمانوں کے بھیانک انجام کی جو تصویر ان کے سامنے گھوم رہی ہوگی ارباب بصیرت ہی اسکا کچھ اندازہ کر سکتے ہیں۔ ایک طرف پنجاب سے یہ آندھی اُٹھی تھی اور تبدریج تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی، سلطنت وحکومت کی قوتیں بھی اس کے مقابلہ میں بسا اوقات اپنے کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور پا رہی تھیں کہ سیواجی کے دماغ نے "دکن" میں جو "الاؤ" جوڑا تھا عالمگیر انار اللہ برہانہ کی بست سالہ مسلسل کوششوں سے اگرچہ وہ کبھی کبھی دب دب جاتا تھا لیکن سچی بات یہی ہے جیسا کہ اسی طباطبائی نے لکھا ہے کہ۔

عالمگیر خود بنفس نفیس متوجہ دکن شد، وبست و پنج سال کامل در گوشمالی مرہٹہ صرف نمود، از تہاون بعض امرائے رکاب کہ برائے اغراض خود انفصال ہنگامہ مرہٹہ نمی خواستند استیصال جماعۃ مرہٹہ صورت نگرفت۔ صفہ ۹۲۳ ج ۳	عالمگیر نے بذات خود دکن کی طرف رُخ کیا اور پورے پچیس سال مرہٹوں کی گوشمالی میں صرف کیا، لیکن شاہی رکاب میں جو امراء تھے اُن کی سستی وکاہلی سے جس میں کچھ اغراض پوشیدہ تھے، معاملہ کا قطعی فیصلہ نہ ہو پایا، بیا امراء اپنے ذاتی اغراض کے تحت مرہٹوں کے ہنگاموں کو ختم کرنا ہی نہیں چاہتے تھے۔

بلکہ اورنگ زیب کے پنجۂ فولادیں کے دباؤ کے اُٹھ جانے کے بعد اس قوم کو صرف دکن اور کوکن ہی نہیں بلکہ تقریباً ہندوستان کے اکثر علاقوں میں تگ وتاز، تاخت وتاراج کا کھلا میدان مل گیا "برگی" جو مرہٹہ غارتگروں کا کیکپا دینے والا نام تھا اس سے ملک کے اکثر ومیشتر صوبے پامال ہو رہے تھے خود دہلی پر اکثر مرہٹوں کے حملے ہوتے تھے اور حکومت ان کے مقابلہ سے دن بدن اپنے کو عاجز پاتی چلی جا رہی تھی، یہ وہ واقعات ہیں جن سے عامی و خاصی سب ہی واقف ہیں۔

سکھ تحریک اور مرہٹہ تحریک کا ایک خاص فرق

لیکن اس سلسلہ میں ایک چیز قابل غور ہے کہ مغربی شمالی گوشہ سے جو فتنہ اُٹھا تھا، جیسا کہ بیان کیا گیا۔ ابتداءً اسکی شکل ایک مذہبی اصلاحی تحریک کی تھی اور غالباً انتقامی جذبات کے تحت اس نے سیاسی کروٹ لی —— لیکن اسی کے مقابلہ میں جس تحریک کی ابتداء جنوبی منطقہ سے ہوئی تھی عجیب بات ہے کہ بجائے کسی مذہبی اصلاحی تحریک کے شروع ہی سے اسکا آغاز ایک ایسی سیاسی تحریک کی شکل میں ہوا جسکا مقصد ہندوستان کو قدیم براہمنی تہذیب کی طرف واپس لیجانا تھا پنجاب کی تحریک کا تعلق عوام کے مذہبی خیالات کی اصلاح سے تھا اور چونکہ اسکا بانی ہندوؤں کی کسی اعلیٰ ذات سے نہیں بلکہ قوم کھتری سے تعلق رکھتا تھا اسلئے ہر طبقہ کے عوام اس میں شریک ہوتے تھے۔ صاحب سیرالمتاخرین کا بیان ہے کہ سکھ لوگوں کا دستور تھا کہ۔

"ہر چند از فرق مختلفہ باشند ہرگاہ ایں مسلک اختیار نمایند اجتناب و احتراز از بعد گر لبقاعدہ مستمرہ بضابطہ دیرینہ ہنود نمی کنند، اگر چہ از ابعد فرق باشند" صفحہ ۴۰

لیکن جنوبی ہند کی تحریک کے بانی چونکہ سیواجی سمجھے جاتے ہیں اور انکا نسلی تعلق اددے پور کے راناؤں سے بتایا جاتا ہے اسلئے شروع سے ہندوؤں کے اعلیٰ طبقے اسمیں شریک ہے حتیٰ کہ آخر میں تو مرہٹہ تحریک کی عنان بالاجی المعروف بہ پیشوا کے ہاتھ میں آگئی تھی جو براہ راست کوکنی برہمن تھا گویا آج جنوبی ہند سے جس تحریک کی ابتدا ہوئی اور بالآخر اس وقت تمام دوسرے صوبوں کی مختلف تحریکیں بھی دب دبا کر اسی میں ہضم ہو چکی ہیں، اس تحریک کی خصوصیت بھی وہی ہے جو پہلے کی تھی۔ علامہ غلام علی آزاد بلگرامی جن کی زندگی کا بڑا حصہ مرہٹواڑی ہی میں گزرا ہے اور اس قوم کے عادات و اطوار، مقاصد اور منصوبوں سے جتنی زیادہ واقفیت اس مورخ کو حاصل ہو سکتی تھی دوسروں کو اس کے مواقع حاصل نہ تھے۔ وہ یہ لکھتے ہوئے کہ

حق علیم است و کفیٰ بہ شہیداً کہ ایں ہمہ امور مطابق واقع بقلم آمدہ و تعصب و تصنع اصلاً دخلے ندارد	اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور گواہ ہونے کے لئے وہ کافی ہے کہ جو کچھ لکھا جا رہا ہے سب وہی ہے جو واقعات کے مطابق ہے تعصب یا بناوٹ کو اسمیں قطعاً دخل نہیں ہے

مرہٹہ تحریک کے نصب العین کو ان الفاظ میں ادا فرماتے ہیں۔

مخفی نماند کہ فرقتین مذکورتین نیتے دارند کہ ہر جا دست یابند وجوہ معاش جمیع خلق اللہ بند کردہ بطرف خود می کشند و زمینداری و مقدمی و عمل پٹواری گری ہم بالقدیم نگذاشتہ اساس دارند کارہائے مذکورہ را از بیخ و بن بر کنند و بنیاد دخل و تصرف خود قائم کنند	لوگوں سے یہ بات پوشیدہ نہ رہے کہ دونوں فرقوں (مرہٹہ اور کوکنی برہمن) کی نیت یہ ہے کہ جہاں انکو قابو حاصل ہو جائے وہاں خدا کی ساری مخلوق کے ذرائع معاش کو بند کر کے اپنی طرف انکو سمیٹ لیں، زمینداری مقدمی پٹواری کا کام ان پیشوں کو بھی پرانے لوگوں کے ہاتھوں میں انہوں نے باقی نہیں چھوڑا ہے جو بیچارے ان لوگوں کے مدت سے تھے ان کی تو جڑ اکھاڑ کر انہوں نے بالکلیہ ان سب پر اپنا عمل دخل قائم کر لیا ہے۔

آخر میں اُن کے "اندرونی منصوبے" کا ذکر ان الفاظ میں فرماتے ہیں —

و می خواہند کہ مالک تمام روئے زمین شوند	یہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ تمام روئے زمین کے مالک بن جائیں

اگرچہ بیچارے میر صاحب نے اس کے بعد اپنے ایمانی خیالات کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا ہے ۔ کہ

رزاق مطلق تعالیٰ شانہ کہ روزی رساں ہندو مسلمان است برائے رزق اصناف خلائق بر ہمیں زمین نوشتہ تمام ایں مملکت بر یک قوم چہ طور مسلم تواند ماند۔	رزاق مطلق اللہ تعالیٰ جو ہندو اور مسلمان دونوں کا روزی پہنچانے والا ہے اسی نے ہر ایک کی روزی کا حصہ اسی سرزمین (ہند) میں مقرر فرمایا ہے یہ سلطنت کسی ایک قوم کے نام کے لئے کسطرح مخصوص کیا جا سکتی ہے؟

۱ یہ ساری عبارت ان کی کتاب "خزانہ عامرہ" سے منقول ہو طباطبائی نے بھی تصنیف اپنی کتاب میں اسکو نقل کیا ہے — ۱۲

ہندوؤں کی موجودہ سیاسی سرگرمیوں کا رُخ اور اُنکا مقصد

لیکن میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جنوبی ہند سے شروع ہونے والی موجودہ سیاسی تحریک کو (جس کی قیادت عملاً اعلیٰ طبقہ کے ہندوؤں ہی کے ہاتھ میں ہے) جو لوگ مغربی کلیات اور کالجوں کی تعلیم کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور اس بنیاد پر اس قوم کا گن گایا جاتا ہے اور کم از کم اس کے وجود کا یہ فائدہ بتایا جاتا ہے کہ اسی کی بدولت سوتے ہوئے جاگ پڑے، اُن کو غور کرنا چاہئے کہ اس میں کہاں تک حقیقت کا عنصر شریک ہے۔

کیا ہندوستان کی تقسیم سے ہمارے مرض کا علاج ہوسکتا ہے

اور اس کے بعد مجھے ان لوگوں سے عرض کرنا ہے جو اسی مسئلہ "رزق" کے حل کی صورت نکال کر مطمئن ہونا چاہتے ہیں کہ ہم ملک کا کوئی گوشہ اپنے لئے الگ کرکے آباد ہوجانے میں کامیاب ہوجائیں گے، تو پھر روز کی اس کھٹ کھٹ سے نجات مل جائے گی، اول تو جنگ و جدال اور باہمی نزاع و فساد کے لئے صرف ہندو مسلمان کی تفریق کی ضرورت نہیں، چاہنے والے اگر چاہیں گے، تو شیعہ سنی کے مسئلہ میں بھی اسی قدر زہر بھر سکتے ہیں بلکہ میں تو آگے بڑھ کر کہتا ہوں کہ خالص حنفی سنی مسلمانوں میں بھی اس سے زیادہ خونریزیاں اور بربادیاں محض ایک لفظ "وہابی و غیر وہابی، یا دیوبندی و بریلوی" یا ازیں قبیل دوسری تقسیموں سے پھیلائی جاسکتی ہیں، پھر جن لوگوں نے مرض کا یہ علاج تجویز کیا ہے میں اگر ان کے متعلق یہ باور کرتا ہوں کہ ان کی نظر دور نہیں پہنچی ہے، تو کیا غلط سمجھ رہا ہوں، اور بالفرض مسلمانوں کے بانٹنے یا بٹوانے میں بانٹنے والی قوتوں کو کسی وجہ سے کامیابی نہ بھی ہو لیکن جس کا نصب العین آج ہی نہیں بلکہ آج سے صدیوں پہلے یہ تھا کہ

می خواہند کہ مالک تمام روئے زمین شوند ؏ چاہتے ہیں کہ تمام "روئے زمین" کے مالک ہوجائیں

آخر ان سے ہم کہاں تک بھاگ کر پناہ لیں گے، اب ہندوستان ہی کے متعلق سوچ رہے ہیں کہ اس ملک کے کسی علاقہ میں ہمیں چین نصیب ہوسکتا ہے؟ اگر ان سے بالکل الگ ہوجائیں، لیکن ہندوستان تو بقول ان کے "ہندوستھان" ہے جو ہندو ستھان نہیں ہے جب وہ بھی ان کے "می خواہند" میں داخل ہے، تو آخر صرف علیحدگی، اور بٹوارہ کو جو ہر مرض کی دوا خیال کیا جارہا ہے کہاں تک صحیح ہوسکتا ہے، زندگی اور حیات کے قدرتی قانونوں سے محروم ہونے کے بعد محض لاشوں کے چہرہ پر غازہ ملنے سے کسی کو زندہ نہیں خیال کیا گیا ہے اور نہ ان سے زندگی کے آثار نمایاں ہوسکتے ہیں، ہمارے پاس ہماری کتاب میں ہمارے پیشوا صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں جینے کے جو اصول بتائے گئے ہیں، ان سے کٹ کر جو باوجود دعاوی اسلام کے اپنی خود تراشیدہ تدبیروں کے ذریعہ سے جینا چاہتے ہیں، میں نہیں سمجھتا کہ وہ اپنے کو کس طرح زندہ رکھ سکتے ہیں،

بہرحال ایک طرف پنجاب سے سکھوں کا فتنہ تھا جو بڑھتے ہوئے بادل کی طرح مسلمانوں پر چھاتا چلا جاتا تھا، اور امید بندی سے بجائے پانی کے ان پر آگ برسا رہا تھا، اور دوسری طرف جنوبی ہند کا مرہٹی سیلاب تھا جس میں جنوب سے شمال اور مشرق سے مغرب تک کے مسلمان اپنے ڈوبنے اور بہنے کا تماشہ دیکھنے کا انتظار کررہے تھے۔

مرہٹہ گردی کا

مرہٹے ملک میں اس کنارے سے اس کنارے تک جہاں تک پہنچ سکتے تھے پہنچ کر،

ہر جا آبادی یافت سوختہ و غارت کردہ بخاک برابر ساختہ (سیر ۲ ج ۲)	جہاں کہیں آبادی انھوں نے پائی اسے جلا کر لوٹ کر زمین کے برابر

کرتے چلے جاتے تھے حتیٰ کہ خود دہلی کو اس وقت جس وقت شاہ صاحب کی عمر چونتیس پینتیس سال کی تھی، اور کالکا کے میلے کے تماشا دیکھنے کے لئے ہندو مسلمان شہر سے باہر ہو گئے تھے مرہٹوں نے

دلی پر مرہٹوں کی تاخت اور دوسری اسلامی بستیوں کی بربادی

از دحام عظیم نمودہ بخاطر جمع غارت نمودہ بال وافر اندوختہ و شب نزدیک مزار خواجہ قطب الدین ماندہ صبح روز چہار شنبہ یوم العرفہ مینا بازار ودوکا نہائے آبادی آنجا را سوختہ، غارت نمودہ. ص	ہلہ کر کے ایک بڑی بھیڑ کے ساتھ باطمینان تمام دلی کو لوٹا اور بہت دولت جمع کی، رات جب قریب ہوئی تو حضرت خواجہ قطب الدین دکا کی بک کے مزار کے پاس شب گزار کر صبح بدھ کے دن جو عرفہ کا دن تھا مینا بازار اور آبادی کی دکانوں کو آگ لگا کر بھسم کیا اور سب کو لوٹ کھسوٹ لیا
اور یہاں سے پلٹنے کے بعد مسلمانوں کی مشہور بستیاں قصبہ ریواڑھی، و پاٹوڈھی رفتہ ہر دو قصبہ را چناں کہ خواست غارت نمودہ از بیخ و بن برانگند	قصبہ ریواڑھی، پاٹوڈھی گئے اور دونوں قصبوں کو جیسا ان کے جی میں آیا لوٹا غارت کیا اور ان آبادیوں کی بیخ و بنیاد اکھاڑ دی۔

عید قرباں کے دن مسلمانوں کی قربانیاں

گویا ٹھیک عید الاضحیٰ کے دن مسلمانوں کی قربانیاں کر کے یہ اپنے حرص و آز کے دیوتاؤں کو خوش کر رہے تھے، سوچنے والے سوچ سکتے ہیں کہ اس ماحول میں اوروں کا جو حال ہوگا وہ تو بجائے خود لیکن جس سینہ میں "اطیب النغم" کا سوز بھرا ہوا تھا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمتِ مرحومہ کے اس حال کو دیکھ دیکھ کر سن سن کر ان پر کیا گزرتی ہوگی۔؟

حضرت شاہ صاحب کا ایک تاریخی خواب

کون کہہ سکتا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس مشہور خواب میں جس کا تذکرہ "فیوض الحرمین" میں آپ نے فرمایا ہے، ان احساسات کو دخل نہ تھا، درحقیقت اسی سلسلہ میں آپ کی آرزوئں اور ہمت ودعا کی توجہات ہی نے عالم مثال میں یہ شکل اختیار کی تھی۔

فیوض الحرمین کے پڑھنے والے تو اس خواب سے واقف ہیں لیکن نہ پڑھنے والوں اور نہ جاننے والوں کے لئے میں بجنسہ اصل عربی عبارت کے ساتھ درج کرتا ہوں، فرماتے ہیں۔

رائتنی فی المنام قائم الزمان اعنی بذلک ان اللہ اذا اراد شیئاً من نظام الخیر جعلنی کالجارحۃ لاتمام مرادہ ورائیت ان ملک	میں نے خواب میں اپنے کو دیکھا کہ میں قائم الزمان ہوں جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب بھلائی اور خیر کے کسی نظام کو قائم فرمانا چاہتا ہے تو اس وقت مجھے اس مقصد کی تکمیل کے لئے

الکفار قد استولی علیٰ بلاد المسلمین و نھب اموالھم وسبا ذریتھم واظھر فی بلدۃ اجمیر شعائر الکفر وابطل شعائر الاسلام (والعیاذ باللہ) فغضب اللہ تعالیٰ علی اھل الارض غضباً شدیداً ورأیتُ صورۃ ھذا الغضب متمثلۃ فی الملأ الأعلیٰ ثم ترشح الغضبُ الیّ فرأیتنی غضباناً من جھۃ نفث من تلک الحضرۃ فی نفسی لا من جھۃ مایرجع الی ھذا العالم ورأیتنی ساعتئذٍ فی جمع غفیر من الناس منھم الروم منھم الازابکۃ ومنھم العرب بعضھم رکبان الابل وبعضھم فرسان وبعضھم مشاۃ علی اقدامھم واقرب ما رأیت شبھا بھولاء الحجاج یوم عرفۃ ورأیتھم غضباناً لغضبی وسالونی ماذا حکم اللہ فی ھذہ الساعۃ قلت فک کل نظام قالوا الی متی قلت الی ان ترونی قد سکت غضبی فجعلوا یتقاتلون بینھم ویضربون البھم فقتل منھم کثیروا نکسرت روس ابلھم وشفاھھا ثم انی تقدمت الی البلدۃ اخربھا واقتل اھلھا فتبعونی فی ذلک وکذلک خربنا بلدۃ بعد بلدۃ

گویا ایک آلہ اور واسطہ بناتے ہیں اور میں نے دیکھا کہ کفار کا راجہ (یا بادشاہ) مسلمانوں کے بلاد پر مسلط ہو گیا ہے اور ان کے اموال کو اس نے لوٹ لیا اُن کی عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر لیا اور شہر اجمیر میں اس نے کفر کے شعائر کا اعلان کر دیا شعائر اسلام کو اس نے مٹا دیا (خدا کی پناہ) پھر اس کے بعد یہ دیکھا کہ زمین کے باشندوں پر حق تعالیٰ غضبناک ہوئے اور سخت غضبناک اور میں نے حق تعالیٰ کے غصہ کی صورت کو ملاءِ اعلیٰ میں متمثل ہوتے ہوئے دیکھا، پھر وہاں سے ٹپک ٹپک کر یہ الٰہی غیظ میرے اندر اُترا، پھر میں نے اپنے کو غضب ناک پایا اور یہ غضب جو مجھ میں بھر گیا تھا حضرتِ الٰہیہ کی طرف سے مجھ میں دم کیا گیا تھا، اس کا منشا کوئی ایسی چیز نہ تھی جس کا تعلق اس عالم سے ہو اور میں نے اس وقت اپنے کو ایک بڑے مجمع میں پایا جس میں روم والے بھی تھے اور ازبکی (ترک) بھی، اور عرب بھی، اور بعض ان میں اونٹوں کے سوار تھے اور بعض اسپ سوار اور بعض پیدل قریب قریب اس گروہ کی حالت ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے عرفہ کے دن حجاج کی ہوتی ہے پھر میں نے ان لوگوں کو بھی اپنے غضب ناک ہونے کی وجہ سے غصہ میں بھرا پایا، ان لوگوں نے مجھ سے پوچھا کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کا کیا حکم ہے، میں نے کہا کہ "ہر نظام اور آئین کو توڑ دینا" یہی حکم ہے۔

انہوں نے دریافت کیا یہ حال کب تک رہے گا۔ میں نے کہا کہ اس وقت تک جب تک تم میرے غصہ کو ٹھنڈا ہوتا نہ پاؤ۔ پھر وہ باہم آپس میں لڑنے لگے اور جانوروں کو مارنے لگے پھر ان میں سے بہت سے مارے گئے اور ان کے اونٹوں کے سر ٹوٹے اور لب چور ہوئے، پھر میں ایک شہر کی طرف اسے برباد کرتے ہوئے اور اس کے باشندوں کو قتل کرتے ہوئے آگے بڑھا، لوگ میرا ساتھ دے رہے تھے، یوں ہی ایک شہر کے بعد دوسرے شہر کو برباد

حتی وصلنا الاجمیر وقتلنا هنالک الکفار واستخلصناها منهم وسبینا ملک الکفار ثم رأیت ملک الکفار یماشی مع ملک الاسلام فی نفر من المسلمین فامر ملک الاسلام فی اثناء ذلک بذبحه فبطش به القوم وصرعوه وذبحوه بسکین فلما رأیت الدم یخرج من اوداجه مثل فقلت الآن نزلت الرحمة ورأیت الرحمة والسکینة شملت من باشر القتال من المسلمین وصاروا مرحومین فقام الی رجل وسألنی عن المسلمین اقتتلوا فیها......

و برباد کرتے ہوئے ہم بالآخر اجمیر پہنچ گئے اور وہاں ہم نے کفار کو قتل کیا، پھر میں نے کفار کے بادشاہ کو دیکھا کہ وہ اسلام کے بادشاہ کے ساتھ مسلمانوں کے ایک گروہ میں ساتھ ساتھ چل رہا ہے اتنے میں اسلام کے بادشاہ نے کفار کے بادشاہ کے متعلق حکم دیا کہ اسے ذبح کر دیا جائے لوگوں نے اسے پکڑ کر دے ٹپکا اور چھری سے اسے ذبح کر دیا میں نے جب دیکھا کہ اسکی گردن کی شہ رگوں میں سے خون اچھل اچھل کر نکل رہا ہے تب میں نے کہا کہ اب رحمت نازل ہو گئی اور میں نے دیکھا کہ یہ جو مسلمانوں میں لوگ جنگ میں شریک تھے ان کو اس رحمت و سکون نے احاطہ کر لیا اور ان پر رحم کیا گیا پھر ان میں سے ایک آدمی اٹھ کر میرے پاس آیا اور ان مسلمانوں کے متعلق پوچھا جو باہم لڑتے تھے میں جواب میں خاموش ہو گیا اور کوئی تصریح میں نے کی۔

(فیوض الحرمین [illegible] صفحہ ۹۰-۹۱)

شاہ صاحب عام طور پر اپنے خوابوں کے آخر میں تاریخ درج نہیں کرتے، لیکن اس خواب کی تاریخ لکھی ہے اسی طرح ایک اور خواب جس کا ذکر آئندہ آئے گا، اس میں بھی انہوں نے یہی کیا، بہر حال اس خواب کی تاریخ انہوں نے یہ درج کی ہے۔

رأیت ذلک فی لیلة الجمعة الحادیة والعشرین من ذی القعدہ سنہ ۱۱۴۴ھ

میں نے یہ خواب شب جمعہ ۲۱ر ذی قعدہ سنہ ۱۱۴۴ھ میں دیکھا۔

شاہ صاحب کے اس خواب کی تعبیر پانی پت کی مشہور تاریخی جنگ

ٹھیک اس تاریخ سے ۲۹ سال بعد یعنی سنہ ۱۱۷۳ھ میں اپنی وفات سے تین سال پہلے اسی شخص نے جس نے گذشتہ بالا واقعات کو خواب میں دیکھا تھا اپنے سر کی آنکھوں سے وہی شخص ایک ایسا واقعہ دیکھتا ہے جس میں بجائے اجمیر کے اگر دلی کا لفظ شامل کر دیا جائے تو تقریباً جو کچھ خواب میں دیکھا گیا تھا بیداری میں "کفلق الصبح"۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پھر اسی کا معائنہ کرایا گیا۔ اس سے میرا اشارہ پانی پت کے مشہور فیصلہ کن معرکہ کی طرف ہے جو تاریخوں میں "مرہٹہ اور ابدالی کی جنگ" سے موسوم ہے۔ چونکہ ہندوستانی "تاریخ" کی ہر چھوٹی بڑی کتاب میں یہ واقعہ یا اس کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور مذکور رہے اسلئے تفصیل کی تو یہاں گنجائش نہیں لیکن

سیر المتاخرین جو تقریباً تمام پچھلی تاریخوں کا ماخذ ہے، اسی سے بعض جستہ جستہ فقرے یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

خواب اور بیداری کے واقعات کا انطباق

میں نے جو یہ کہا کہ بجائے "اجمیر" کے دلی فرض کی جائے۔ یہ بھی محض فرض نہیں ہے، بلکہ ہندستان کے "خالص اسلامی مرکز" کو کفر کے احاطہ میں چونکہ دکھانا مقصود تھا اور دہلی کو ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ کوئی خاص خصوصیت نہیں ہے جس طرح اسلامی بادشاہوں نے اسے دار السلطنت بنایا تھا، ہندوؤں کا اندر پرست "بلکہ ہستنا پور" دلی ہی کے کھنڈروں میں موجود ہے اور آج "رائے سینا" بھی دلی ہی کے اطراف میں آباد ہے، علاوہ اس کے "دلی" زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کا مرکز تھی لیکن ہندستان میں مسلمانوں ہی کا نہیں بلکہ اسلام کا سب سے پہلا مرکز تو وہی ہے جہاں سے ولی الہند (یا بقول عوام ہند الولی) حضرت خواجہ بزرگ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے

کرد از "اجمیر" کار انبیا　　　بے کتاب و بے پرلیس و مدرس

اور یہ تو ان کے لئے کہہ رہا ہوں جو نہیں دیکھتے ہیں، پر جو اس محسوس نظام کو کسی غیر محسوس نظام کے ساتھ وابستہ پاتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ "اجمیر"[۱] کا تعلق ہندوستان کے محیط سے کیا ہے، خیر کسی وجہ سے بھی سہی آپ "اجمیر" کی جگہ "دلی" پڑھ لیجئے اور اس کے بعد مورخین نے "ابدالی" اور "مرہٹوں" کی اس فیصلہ کن جنگ کا جو حال لکھا ہے پڑھئے، پھر اندازہ کیجئے کہ سنہ ۱۱۴۴ھ میں جو کچھ خواب میں دکھایا گیا تھا کیا اسی کا ۱۱۷۳ھ میں مشاہدہ نہیں کرایا گیا، شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ پہلے میں نے دیکھا کہ ملک الکفار مسلمانوں کے بلاد پر مسلط ہو گیا اور ان کے اموال کو اس نے لوٹ لیا اور ان کی اولاد کو قید کر لیا، طبا طبائی لکھتے ہیں:۔

لال قلعہ پر مرہٹوں کا قبضہ

نو ذی الحجہ سال مذکور ۱۱۷۳ قلعہ (لال قلعہ) بدست بھاؤ افتادہ حرم سرائے شاہی و جمیع کارخانجات سلطنت باختیار مرہٹہ رفت "ذلک تقدیر العزیز العلیم" ص ۹۱۲ ج ۳

نویں ذی الحجہ ۱۱۷۳ میں لال قلعہ بھاؤ (سپہ سالار مرہٹہ) کے قبضہ میں چلا گیا، اور شاہی حرم سرا کے ساتھ سلطنت کے تمام کارخانے مرہٹوں کے تصرف میں آگئے، یہ عزیز علیم کا نوشتہ تھا۔

آگے شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اجمیر شہر پر اس کا قبضہ ہو گیا اور کفر کے شعائر کا اس نے اعلان کیا اسلامی شعائر کو ختم کر دیا، طبا طبائی کے الفاظ یہ ہیں:۔

بھاؤ قلعہ داری شاہجہاں آباد بنارو شنکر برہمن تفویض کرد و جمعے را بحراست قلعہ ہمراہ او کرد۔

بھاؤ (سپہ سالار مرہٹہ) نے شاہجہاں آباد (دہلی) کی قلعہ داری نارو شنکر برہمن کے سپرد کر کے ایک فوجی دستہ کو قلعہ کی حفاظت کے لئے اس کے ساتھ چھوڑ دیا۔

اس سلسلہ میں بھاؤ جب یہ چال چلا، کہ اپنی حکومت کو مستحکم کرنے کے لئے اودھ کے شجاع الدولہ کو اپنے ساتھ ملانا

---

[۱] ممکن ہے ملاء ظاہر یا متحزبین تقطعوا امرہم بینہم زبرا" پر میری یہ گفتگو گراں گزرے وہ باوجود چشتی صابری ہونے کا دعوے رکھنے کے اس بلدہ پاک سے وہ تعلق رکھنا نہیں چاہتے یا نہیں رکھتے جو حضرت شاہ صاحب کو اپنے اس خواب میں اسلامی مرکز کے رنگ میں دکھایا گیا ہے، مگر میں کیا کروں جو پاتا ہوں اسکا اظہار کرتا ہوں یا ان محسنوں کو کیسے بھول جاؤں جنکے صدقہ میں ایمان و اسلام کا حصہ ملا ہے رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ

غرور ہوا دمولوی غلام علی آزاد بلگرامی کے ایک شاگرد برہمن کو اس مہم پر شجاع الدولہ کے پاس بھیجا تو اس وقت شجاع الدولہ نے جو جواب دیا وہ مرہٹوں کی بھی اور شاہ صاحب کے خواب کی بھی کامل شرح ہے، شجاع الدولہ نے جواباً کہا:۔

از مدتے براہمہ دکھن بر ہندوستان مسلط شدہ اند روادار آبرو، و مرفاہ و آسائش احدے از خلق خدا نیستند۔

ایک زمانہ سے دکن کے برہمن ہندوستان پر مسلط ہو گئے ہیں، اور یہ لوگ خلق اللہ میں سے کسی کے آرام و آسائش اور فراغبالی کے روادار نہیں ہیں۔

اور آخر میں ان براہمہ دکن کی اس عجیب خصوصیت کا اظہار کیا ہے۔

ہمہ را برائے خود و اقوام خود می خواہند مردم از دست ایشاں بجاں آمدہ

سب کو اپنے لئے اور اپنی قوم کے لئے محکوم بنانا چاہتے ہیں، لوگ اُن کے ہاتھوں جاں بلب ہیں،

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا مجھے تو شاہ صاحب کے خواب سے غرض ہے یعنی مسلمانوں پر ملک الکفار کے غلبہ کو جس شان سے انھوں نے دیکھا تھا آپ دیکھ رہے ہیں کہ من وعن وہی صورت پیش آ رہی ہے "لال قلعہ" پر جس وقت مرہٹوں کا قبضہ ہوا ہے "تو نہب اموال" (لوٹ مار) میں کس حد تک وہ پہنچے تھے اس کا اندازہ صرف اس واقعہ سے ہو سکتا ہے" کہ

تنگ ظرف مرہٹوں کی لوٹ مار کی ذلیل نوعیت

دنائت و تنگ چشمی بھاؤ بمرتبہ بود کہ سقف دیوان خاص پادشاہی کہ از نقرہ میناکار بود کندہ مسکوک ساخت و طلا آلات و نقرہ آلات مزار اقدام نبوی و مقبرہ نظام الدین معروف باولیا و مرقد محمد شاہ مثل عود سوز و شمع دان و قنادیل وغیرہ طلبیدہ مسکوک نمود (سیر المتاخرین صفحہ ۹۱۲)

بھاؤ کی پست نظری اور تنگ چشمی اس حد کو پہنچی ہوئی تھی کہ دیوان خاص کی چھت جس کی میناکاری چاندی سے کی گئی تھی اس کی سب چاندی کو کھرچ کر اس نے سکہ بنا لیا اور طلائی آلات چاندی کے ظروف جو قدم رسول کی زیارتگاہ اور حضرت نظام الدین کے مقبرہ و محمد شاہ کے مرقد میں تھے مثلاً عود سوز، شمع دان قندیل وغیرہ کو اس نے سکہ بنا لیا۔

مرہٹوں کی اس تنگ نظری کا ذکر آزاد بلگرامی نے ان الفاظ میں فرمایا ہے:۔

رسوم حقداران دہات مثل مقدم و پٹواری و نجار و گازر و حجام و حداد وغیرہم را ضبط نمودہ۔

دیہات کے رسوم کے پرانے حقدار مثلاً مقدم پٹواری بڑھئی دھوبی، حجام، لوہار، سب کے حقوق کو ضبط کر لیا تھا،

اور صرف "ضبط" نہیں کیا گیا، بلکہ ان سب کو بھی ٹھیکہ پر لگا دیا گیا۔

بمستاجران دادہ مبالغ خطیرے ازیں وجہ داخل خزانہ حرص او شد۔

ٹھیکہ داروں کو (یہ حقوق دے دیئے گئے تھے) اور بڑی بڑی رقمیں اس راہ سے ان کے حرص کے خزانہ میں داخل ہوتی تھیں۔

حالانکہ ہر دیہات کے یہ رسوم تقریباً ہزار ہا ہزار سال سے چلے آتے تھے اور اب بھی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں

ان موروثی حقوق پر کسی نے دست اندازی نہیں کی ہے، نقطۂ نظر کے اس اختلاف کا کیا علاج ہے کہ طباطبائی صاحب تو اسے ذلت و ننگ جینی پر محمول کرتے ہیں لیکن حسن ظن سے کام لیجئے تو اسے ہی "معاشی مہارت" اور "اقتصادی بلند نظری" سے تعبیر کریں گے میر غلام علی صاحب نے اسی "ملک الکفار" کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

بالاجی راؤ با آں اقتدار کہ سلطنت ہند و دکن بدست آورد بود نان باجرہ می خورد و نان گندم خوش نداشت باد نجان خام دانبہ خام و کرسنہ خام برغبت تمام خوردہ۔	بالاجی راؤ اس اقتدار کے باوجود کہ دکن اور ہندوستان کی سلطنت پر اس کا قبضہ ہو گیا تھا باجرے کی روٹی کھاتا تھا اور گیہوں کی روٹی اسے اچھی نہیں معلوم ہوتی تھی کچے بیگن، کچے آم، کرسنہ[1] خام، ان سب چیزوں کو بڑی رغبت سے کھاتا تھا

ان عجیب و غریب خوراکوں اور عجیب و غریب باتوں کا ظہور جب اس زمانہ میں ہوا تو کتنوں نے اسے نفس کشی کی مثال قرار دیا لیکن واقع میں یہ نفس کشی ہے یا نفس پرستی؟ میر غلام علی کو توان حرکات کے پیچھے جو "چیز" نظر آتی تھی وہ ان ہی کی زبانی سنئے، ممکن ہے کہ آپ کو یا مجھے اس سے اتفاق نہ ہو لیکن بطور نقل اس کے ذکر میں کیا حرج ہے؟ فرماتے ہیں:۔

چوں اصل پیشہ براہمہ گدائی ست و در کیش ہندوان مقرر شدہ کہ صدقات را بہ براہمہ باید داد طباع آں قوم نسلاً بعد نسل بدریوزہ گری معتاد شدہ است و طماعی ناپن الغرضی لازم ماہیت برہمنی گردیدہ بنابریں باوجود حصول مرتبہ سلطنت و امارت شیوۂ گدائی از طینت آں ہا بدر نمی رود۔	چونکہ برہمنوں کا اصل پیشہ دریوزہ گری ہے ان کے دھرم کی مانی ہوئی بات ہے کہ ہر قسم کے دان پُن برہمنوں ہی کو دیئے جائیں اسی کی وجہ سے نسلاً بعد نسل اس قوم کی سرشت میں ابن الغرضی بطور لازم ماہیت کے شریک ہو گئی ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ سلطنت اور حکومت کے درجہ تک پہنچنے کے بعد بھی ان کی فطرت سے شیوۂ گدائی الگ نہ ہو سکا۔

خود اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ

ہر محتاجے کہ بحکام و متصدیان براہمہ مذکور رجوع کند نظر اں ہا ہمیں کہ برائے ما چہ آوردہ؟ ہر چہ پیش او باشد کشیدہ گرفتہ برآمد کار او حوالہ بعالم می کنند۔	کسی قوم کا کوئی حاجتمند جب ان مذکورہ بالا برہمنوں کے حکام اور کارندوں کی طرف رجوع کرتا ہے تو ان حکام اور کارندوں کی نظر اسی پر ہوتی ہے کہ ہمارے لئے وہ کیا لایا ہے جو کچھ اس بچارے کے پاس ہوتا ہے اسے بھی گھسیٹ لیتے ہیں اور اس کے کام کو دنیا کے حوالہ کرتے ہیں۔

آخر میں داد دیتے ہوئے ایک شعر بھی درج فرماتے ہیں:۔

بدست خلق عالم کاسہ دریوزہ می بینم	گدا چوں پادشہ گردد گدا سازد جہانے را

(یعنی میں دنیا کی مخلوق کے ہاتھ میں بھیک کا پیالہ ہی دیکھتا ہوں گدا جب بادشاہ ہو جاتے تو سارے جہان کو گدا بنا کر رہتا ہے)
خدا جانے میر صاحب قیافے کے ماہر تھے یا نہیں لیکن اس کے بعد انھوں نے جو لطیفہ درج کیا ہے ممکن ہے کہ اطبا اس کی تصدیق کریں فرماتے ہیں، ان عادات و اطوار کی ایک دوسری توجیہ ان کے نزدیک یہ ہے کہ

[1] کرسنہ کو بہار میں کھساری کہتے ہیں مثلث شکل خاکی رنگ کا اناج ہے ۱۲

مدار غذا ئے اینہا خواہ غنی باشد یا فقیر بر دال توریست و با ایں دال علاوہ از روغن کہ آں را در ہندی بگھار گویند نمی کنند واز خارج نیز روغن بکار نمی برند کہ یبوستش را اصلاح نماید واحیاناً اگر کسے بخورد اقل قلیل مرتبہ ایست کہ گویا نخوردہ و مرچ سرخ دہلیت در زرد چوبہ ہم در ماکولات شان بسیار استعمال می شود مرچ سوائے آنچہ در پختن داخل نمودہ اند ہنگام خوردن با طعام نیز با فراط می خورند لہٰذا نطفہ اینہا لیست برلیست از ماکولات مذکورہ متکون می شود (خزانۂ عامرہ میر غلام علی آزاد ص ۴۶)

ان کی خوراک کا دارومدار خواہ امیر ہو یا فقیر صرف توراہر کی دال پر ہے اس دال کے ساتھ روغن ڈال کر جو تدبیر کی جاتی ہے جسے ہندوستان میں بگھار کہتے ہیں۔ یہ لوگ اس عمل کو دال کے ساتھ نہیں کرتے علاوہ اس کے باہر سے بھی روغن اس میں شریک نہیں کرتے تاکہ اس کی خشکی کی کچھ اصلاح ہو کبھی اگر کوئی روغن ڈالتا بھی ہے تو اس کی مقدار اتنی قلیل ہوتی ہے گویا کہ اس نے روغن کا استعمال نہیں کیا، اسی طرح لال مرچ اور ہینگ ہلدی بھی ان کے کھانوں میں بہت مستعمل ہے لال مرچ کو پکاتے وقت تو کھانے میں شریک کرتے ہی ہیں، اس کے سوا جب کھانا کھانے لگتے ہیں اس وقت بھی بکثرت لال مرچ کو چباتے ہیں، اسی لئے ان کی نسل پشتہا پشت سے اسی قسم کی خوراکوں سے تیار ہوتی چلی آرہی ہے[1]

خیر یہ تو اس قوم کی چند خصوصیات کا ایک ضمنی ذکر ہے چونکہ اس زمانہ میں اسی کی تعبیر سادگی اور کفایت شعاری کی زندگی سے کی جاتی ہے، اور جو قومیں نسلہا نسل سے ان خوراکوں کی عادی ہیں نہ اس طرز زندگی کی، ان سے جب اسی قسم کی بجائے اسی قسم کے کھانوں کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو وہ گھبراتی ہیں کچھ دن ساتھ دیتی ہیں اور پھر پیچھے ہٹ جاتی ہیں، مقصد یہ ہے کہ اس کے حقیقی اسباب کی طرف بھی موقع سے اشارہ کرتا چلوں، ورنہ اصل گفتگو تو شاہ صاحب کے خواب کے متعلق ہو رہی تھی یعنی خواب میں جس شان سے دیکھا گیا تھا ٹھیک ان ہی خصوصیات کے ساتھ ملک الکفار سلطان ہند پر مستولی ہو گیا، اور ان کے مرکزی مقام پر اس نے قبضہ کر لیا تھا۔

شاہ صاحب کے خواب کا دوسرا جزء اور ہندوستان پر غازی احمد شاہ ابدالی کا حملہ اور مرہٹہ طاقت کی شکست

خواب کے دوسرے اجزا کے متعلق بظاہر تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اچانک احمد شاہ ابدالی غازی کا ہندوستان پر جو حملہ ہوا اور مرہٹہ تحریک پانی پت کے میدان میں ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی، کہا جاتا ہے اور مورخین لکھتے ہیں کہ اس حملہ پر احمد شاہ کو خود ہندوستان کے امیروں اور نوابوں نے عرضداشت بھیجکر آمادہ کیا تھا جیسا کہ طباطبائی کا بیان ہے:-

نجیب الدولہ و راجہائے ہندوستان از دست مرہٹہ و عماد الملک بجان آمدہ زوال دولت و ملک خود از دست برد مرہٹہ بالعین مشاہدہ نمودہ عرائض استدعا بخدمت

نجیب الدولہ اور ہندوستان کے مختلف راجواڑے مرہٹوں اور عماد الملک کے ہاتھوں جاں بلب ہو کر دیکھنے لگے کہ ان کی حکومت ان کے ہاتھوں سے نکل کر مرہٹوں کے قبضہ

---

[1] اس مرچ سرخ کے متعلق میر صاحب نے ایک اور عجیب خبر سنائی ہے فرماتے ہیں "و دریں وقت سالے کہ قدم آں بالبرزمین ہندوستان رسید مرچ معدوم بود ہندوستانیان ہم استعمال مرچ سرخ آموختند پیشتر رواج ایں مرچ در بیت المال ہندوستان نہ بود" (خزانۂ عامرہ ص ۴۲) واللہ اعلم بالصواب گیا جس طرح ایک حکومت کے زیر اثر ہندوستان کے ہر گھر میں پہنچی ہے یہی حال اس مرچ سرخ کا بھی ہے ۱۲

احمد شاہ ابدالی نگاشتہ خواہاں ورود او در ہند شدند -

میں جارہی ہے اپنی آنکھوں سے یہ تماشا انکو نظر آرہا تھا

تب انھوں نے احمد شاہ ابدالی کی خدمت میں عرائض لکھ کر بھیجے اور اس بات کے خواہشمند ہوئے کہ شاہ ابدالی خود ہندوستان آئیں
مرہٹوں نے جب شجاع الدولہ کو ابدالی کی رفاقت سے روکنے کے لئے اپنے سفرا بھیجے، تو اس کے جواب میں بھی شجاع الدولہ
نے یہی کہا تھا جس کا ذکر کچھ پہلے بھی آیا ہے یعنی :-

مردم از دست شان بجان آمدہ برائے پاس ناموس و آبروئے
خود در پناہ عالمی شاہ ابدالی را بمنت از ولایت طلب داشتہ
و صدمات او را بنسبت ایذائے مرہٹہ سہل انگاشتہ

لوگوں کا مرہٹوں کے ہاتھوں ناک میں دم آگیا ہے اپنی
عزت وآبرو اور دنیا کی آسائش و امن کے لئے ابدالی کو
خوشامد درآمد کرکے ولائت سے بلایا گیا ہے اور ابدالی سے
جو نقصانات پہنچیں گے انھیں مرہٹوں کی مصیبت سے آسان خیال کرکے ایسا کیا گیا

لیکن یہ تو باہر والے دیکھ رہے تھے، پر بارگاہ الست کے دوربینوں کو انتیس[29] سال پہلے ہی دکھایا گیا تھا کہ یہ
"ربك لبالمرصاد" کا "سوط عذاب" تھا جو ہمیشہ :-

اذا اکثروا فیہا الفساد

جب لوگ زمین پر بگاڑ اور فساد کو پھیلانے اور خیر سے آگے بڑھا دیتے ہیں

کے موقعہ پر قدرتی قانون کے ماتحت ظاہر ہوتا رہتا ہے لوگوں نے "الغازی الابدالی" کو "خدا کا ہاتھ" خیال کیا، لیکن اس عالم
محسوس کے پیچھے بھی جو نظام ہے، وہاں کسی اور نے اپنے آپ کو :-

جعلنی کالجارحۃ

مجھے خدا نے بمنزلہ ایک آلہ اور عضو کے قرار دیا۔

کی شکل میں پایا، باہر والوں نے نجیب الدولہ، شجاع الدولہ، دوندے خاں، رحمت خاں، اور آخر میں ان سب کے ساتھ
"ابدالی" کے قلوب کو غصہ سے معمور پایا، لیکن اندر والے نے اس کو باہر سے نہیں بلکہ اس غضب کی آگ کو "اندر" سے بلکہ
"باطن الباطن" سے بھڑکتے ہوئے ملاء اعلیٰ تک اور ملاء اعلیٰ سے خود اپنے اندر پہنچی ہوئی محسوس کیا، جیسا کہ فرماتے ہیں۔

فغضب اللہ علی اہل الارض غضبا شدیدا
ورأیت صورۃ ھذا الغضب متمثلۃ
فی الملاء الاعلیٰ ثم ترشح الغضب الیّ
فرشحنی غضبانا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے زمین والوں پر سخت غصہ کے ساتھ غضبناک
ہوا اور میں نے اسی غصہ کو ملاء اعلیٰ میں متمثل ہوتے ہوئے
پایا وہاں سے ٹپک ٹپک کر وہی غصہ مجھ میں اترا پھر میں نے
اپنے آپ کو بھی غضبناک پایا۔

اور یہی آگ تھی جو غیب سے چل کر بالآخر پانی پت کے میدان میں بھڑکی اور جن پر خدا کا غضب تھا وہ اس میں
بھسم ہوئے، باہر والوں نے "پانی پت کی آخری جنگ" کا مرد میدان احمد شاہ رحمۃ اللہ علیہ کو قرار دیا، لیکن آج سننے والے
سن رہے ہیں کہ اس سلسلہ میں اپنے کو "قائم الزماں" کسی اور کو دکھایا گیا تھا۔

شاہ صاحب نے اس خواب میں یہ بھی دیکھا تھا کہ خود اس معرکہ میں مسلمانوں نے بھی مسلمانوں کو قتل کیا تھا
اور ان مسلمانوں کے متعلق ان سے پوچھا بھی گیا تھا جس کا انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا، کون نہیں جانتا کہ مرہٹوں
کی اس جنگ میں مسلمانوں کی بھی ایک جماعت بطور نوکروں کے مرہٹوں کے ساتھ تھی، ان میں حضرمی عرب بھی تھے اور

ہندوستان کے مسلمان بھی، خصوصاً توپ خانہ کا سردار تو آجتک ابراہیم گاردی کے نام سے مشہور ہے جو باد وازدہ ہزار بندوقی جیقاتی: تو پہا بضابطہ فرنگ مرہٹوں کے ساتھ تھا اور اسی نے ایک مدت تک توپوں کی زنجیر بندی کر کے مرہٹوں کو سانس لینے کا موقع دیا او رتعجب ہی کیا ، کیوں ہو کیا آج بھی مختلف رنگوں میں یہی تاریخ نہیں دہرائی جا رہی ؟

شاہ صاحب نے یہ بھی دیکھا تھا کہ پوچھنے والوں نے پوچھا کہ "خدا کا حکم اس وقت کیا ہے؟" تو آپ نے فکّ کل نظام (اس وقت ہر قسم کے نظم کو ختم کر دینا چاہیے) فرمایا تھا ظاہر ہے کہ جس وقت پانی پت کی یہ جنگ ہوئی ہندوستان کے تقریباً بڑے بڑے نواب اور امیر اپنی اپنی حکومتوں کو چھوڑ کر آخری فیصلہ کے لئے میدان ہی میں آگئے تھے حتیٰ کہ دلّی میں بھی کوئی نظام حکومت باقی نہ تھا اور جب تک "غضب الٰہی" کا ظہور رہا اس وقت تک کوئی نظام قائم نہ ہو سکا ، شاہ صاحب نے یہ بھی دیکھا کہ مَلِکُ الکفار پکڑا گیا ، اور ذبح ہوا، طباطبائی واقعات کی تفصیل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب کشتوں کے پشتے لگنے لگے

تو سرداران اوّل بسواس راؤ دلپسر بالاجی راؤ کہ شہزادۂ آں با بود در عین شباب بزخم تفنگ آہنگ صحرائے عدم نمود	تو اعلیٰ درجہ کے مرہٹے سرداروں بالاجی پنڈت کا بیٹا بسواس راؤ جو مرہٹوں کا شاہزادہ تھا عین جوانی کے دنوں میں بندوق کے تیر سے عدم کے صحرا کی طرف روانہ ہو گیا

ہاشمی صاحب اپنی تاریخ ہند میں ناقل ہیں کہ بھاؤ نے دلّی پہنچکر چاہا تھا کہ اپنے بھتیجے (یعنی اسی بسواس راؤ پسر بالاجی) کو تخت پر بٹھا کر یہ اعلان کر دے کہ "اب ممالک ہند کی شہنشاہی مرہٹہ برہمنوں کی ملکیت ہے" لیکن پھر جنگ کے فیصلہ تک اعلان کے خیال کو ملتوی کر دیا"

بہر حال تخت شاہی پر بٹھائے جانے والا بسواس بھی اور بٹھانے والا بھاؤ بھی اسی جنگ میں ختم ہوئے طباطبائی ان دونوں کے ذکر کے بعد ایک طویل فہرست درج کرتے ہیں - آخر میں لکھتے ہیں :

واز سرداران نامور غنیم ، احدے جاں بہ سلامت نبرد مگر دو سہ کس	دشمن کے نامور سرداروں میں کوئی اپنی جان بچا کر نہ بھاگ سکا مگر صرف دو تین آدمی -

خواب میں ملوکانہ اقتدار کے ان مظاہر کو بلکہ "شہزادہ" تھا جس کی بادشاہت کا گویا صرف اعلان کرنا باقی رہ گیا تھا اگر اسی کو خواب میں

رئیت الدم یخرج من اوداجہ مثل فقا	میں نے دیکھا کہ اسکی شہ رگ سے خون کے فوارے پھوٹ رہے ہیں

کی شکل میں دیکھا گیا تو مثالی اور ناسوتی تعلقات کے جاننے والے کیا تعبیر کی تکمیل میں شک کر سکتے ہیں او رپیچ تو یہ ہے کہ جب تمام مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ

بعد از وقوع ایں شکست فاحش بالاجی ہم غصہ مرگ گشتہ پس از پنج ماہ و سیزدہ روز نوزدہم ذیقعدہ سال	اس فاش شکست کے بعد بالاجی (یعنی پیشوا مرہٹوں کا حال بادشاہ تھا) وہ بھی موت کے غصہ کا شکار ہو گیا پانچ مہینے

لہ ہمارے ایک اشتراکی مزاج دوست نے جو اسلامی نظام کو بھی ایک قسم کا اشتراکی نما نظام یا اقرب الی الاشتراکیت سمجھتے ہیں نہ معلوم کہاں سے نقل فرمایا ہے کہ شاہ صاحب کے عالم رؤیا یا مکاشفہ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا یعنی انقلاب کا حکم دیا تھا اسکو اپنا ملفوظ نبوی قرار دیتے ہیں... [illegible]

مذکور بپسر و برادر خود ملحق گشت۔ تیرہ روز بعد ام غیوں ذیقعدہ کو اسی سال وہ بھی اپنے لڑکے اور اپنے بھائی (جاؤ) کے ساتھ جا کر مل گیا۔

تو پھر بغیر تاویل کے شاہ صاحب کا خواب کفلق الصبح بن جاتا ہے۔ گویا خواب میں ملک لکھا کا میدان جنگ میں زخمی ہونا اور بعد کو ملک الاسلام کے ساتھ ساتھ چلنا، اس کے یہی معنی ہیں، کہ ہر طرف سے گھر جانے گویا قیدیوں کے مانند ہونے کے بعد پھر بھی کچھ دن وہ ملک الاسلام کے ساتھ رسوائی و ذلت کی زندگی گذارے گا، اور بالآخر ختم ہو جائے گا، یہاں ایک نکتہ قابل لحاظ یہ بھی ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے یہ خواب ذیقعدہ ہی میں دیکھا تھا اور بالاجی راؤ کا انتقال بھی ذیقعدہ ہی میں ہوا۔

درمیان میں ایک خاص چیز جس کی طرف شاہ صاحب نے اجمالاً لیکن بلیغ فقرہ میں اشارہ فرمایا ہے وہ اپنے غیظ و غضب کے متعلق آپ کا یہ جملہ ہے کہ

نفث من تلك الحضرة فى نفسى لا من جهة ما يرجع الى هذا العالم	حضرت (الٰہیہ) کی طرف سے یہ غصہ مجھ میں پھونک دیا گیا اور اس کا سبب اور منشا کوئی ایسی چیز نہ تھی جس کا تعلق اس عالم سے ہو۔

یہ بڑے پتہ کی بات ہے۔ کہ ایک حمیت، و غیظ و غضب تو وہ ہوتا ہے جس کی محرک (مثلاً) اپنی کوئی رسوائی و فضیحت ہوتی ہے اور یہ ایسی چیز ہے جس میں مومن و کافر سب ہی شریک ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں لیکن اس حمیت اور غصہ کا خدا کے یہاں بھی اجر ہے یا اس کا شمار حمیت الجاہلیہ، میں ہے بہت زیادہ محل غور و تامل ہو سکتا ہے اسی کی تعبیر حضرت نے کم از کم میرے نزدیک "ما یرجع الی ھذا العالم" سے فرمائی ہے۔ لیکن ایک حمیت و غیظ وہ ہے جس کی بنیاد "الحب للہ والبغض للہ" کی نہ ہلنے والی چٹان پر قائم ہے، یہی حمیت و غیرت، اور یہی غیظ و غضب وہ ہے جس کی پیدا کردہ دعار و ہمت اور الحاج و زاری سے غیب اور غیب الغیب تک کے دوائر میں جنبش پیدا ہو جاتی ہے سچ پوچھیے تو حمیت کی یہی تلخی، رگ جب کسی کی پھڑک اٹھتی ہے اور اس مقدس محرک سے جب کسی کے خون میں جوش آتا ہے تو ایک بیوہ زن کی آہ بھی "برکند عالمے" کا تماشا دکھاتی ہے اور شبگیر نالوں کا یہی شور ہوتا ہے جو "المنتقم الجبار" کی انتقامی شانوں کو برسر کار لا کر ملار اعلیٰ و اسفل میں تلاطم پیدا کر کے کتنے ابدالی اور کتنے حافظ الملک، دوندے خاں اور نجیب الدولہ کی شکل عالم ناسوت میں اختیار کرتا ہے، حالانکہ کام کسی کنج نشین کا دل شکستہ کرتا ہے لیکن تاریخ والے ان واقعات کو ان ہی ظاہری مظاہر اور شہادتی قوالب کی طرف منسوب کرتے ہیں، نالوں کی بے تاثیری کے شکوہ کرنے والے چاہیں تو حضرت شاہ صاحب کے اس عمیق لیکن مختصر اشارہ ہی سے اپنی ہدایت کی شمع روشن کر سکتے ہیں اور جو مشکلات کی گرہوں کو دماغ کے زور سے کھولنے میں جب بے بس ہو جائیں تو دل کی قوت سے بھی وہ امداد حاصل کر سکتے ہیں بہر حال اس کے بعد شاہ صاحب نے دیکھا کہ یکے بعد دیگرے شہروں کو فتح و برباد کرتے ہوئے ہم "اجمیر" پہنچ گئے، تاریخوں کو اٹھا کر پڑھئے، ٹھیک اسی شان کے ساتھ ابدالی اور ان کے رفقار شہروں کو فتح کرتے ہوئے "اسلامی مرکز" یعنی دہلی پہنچ گئے، شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ "ملک لکھا" کے خاتمہ کے بعد مسلمانوں پر رحمت و سکینت نازل ہوئی اور ان پر خدا کا رحم ہوا۔ ظاہر ہے کہ اس "فتح" کے

بعدو ہی لوگ جن کا مال چھینا گیا، اور جن کی شاہی حرم سرائیں کفار کے قبضہ میں آ گئی تھیں، وہی غنیم کی فوج سے

دو ہزار غلام و کنیز کہ اکثرے از اولاد و احفاد شرفاء و متوسطاں بود کہ در عسکریان ابدالی تقسیم یافتہ۔ غنائمے کہ در احاطہ و انحصار نمی گنجد از جواہر و نقود و اجناس دیگر و توپ خانہ و پنجاہ ہزار اسپ و دو لاکھ گاؤ و چندیں ہزار شتر و پانصد فیل کوہ پیکر بدست عساکر منصورہ افتاد ۱۱۷۴ھ

دو ہزار غلام اور لونڈیاں جن میں اکثر بڑے اور اوسط درجہ کے لوگوں کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں ابدالی کے لشکر میں تقسیم ہوئیں اور جواہر و نقد دیئے اور دوسری قسم کی چیزیں توپخانے وغیرہ کے ذیل کی بے شمار مال غنیمت میں ہاتھ آئیں پچاس ہزار گھوڑے دو لاکھ بیل اور کئی ہزار اونٹ پانسو ہاتھی کوہ پیکر کامیاب اور فتحمند فوج کے قبضہ میں آئے۔

شاہ ابدالی کا بےنظیر ایثار اور اسکا راز

اس تاریخی معمہ کا حل بھی شاہ صاحب کی اس رویاء صادقہ میں اگر لوگ چاہیں تو تلاش کر سکتے ہیں کہ یہ سب کچھ کرنے دھرنے کے بعد شاہ غازی ابدالی انار اللہ برہانہ نے

شانزدہم شعبان سال مذکور از باغ شالہ مار دہلی بقصد قندھار یکراں ہمت زیر ران کشید و کلمہ مراجعت قندھار نمود

اسی سال کی سولھویں شعبان کو دلی کے شالامار باغ سے ہمت کے گھوڑے پر سوار ہو کر قندھار کا ارادہ فرمالیا اور اسی طرف پلٹ گئے۔

اور بخوشی و رضا شاہ ابدالی نے

سلطنت برائے شاہ عالم و وزارت بنام شجاع الدولہ و امیر الامرائی بنام نجیب الدولہ مقرر نمود

سلطنت کو شاہ عالم کے نام، وزارت شجاع الدولہ کے نام اور امیر الامرائی نجیب الدولہ کے نام مقرر فرما کر خود قندھار چلدیئے

لوگ حیران ہیں کہ اتنے بڑے پر اعظم پر اتنی عظیم کامیابی و فتح مندی کے بعد ابدالی کا ملک کو شاہ عالم ہی کے سپرد کر کے قندھار جیسی معمولی حکومت کی طرف واپس ہو جانے کا کیا راز تھا؟ حضرت شاہ صاحب کا وہی فقرہ کہ یہ جو کچھ تھا کسی اور عالم کی بات تھی۔

لا مایرجع الی ھذا العالم — اس کا تعلق اس دنیا کے قانون سے نہ تھا۔

اگر صحیح ہی اور صحیح نہ ہونے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے، تو اس کے سمجھنے میں کوئی دقت باقی نہیں رہتی غازی ابدالی قدس سرہٗ نے اپنے دین کو دنیا اور اپنے خدا کو بت بنانا نہیں چاہا جن کے اندر "ان الدار الاخرۃ لھی الحیوان" "والاخرۃ خیر و ابقی" کا یقین راسخ نہیں ہوا ہے، اور اس کی وجہ بجز اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ان کو اعتقاد کامل میسر نہیں ہوا ہے ورنہ اس کی توثیق و تکمیل کے بعد یقیناً ان کو بھی وہی نظر آسکتا ہے جو ابدالی کو "تؤثر الاخرۃ علی الدنیا" کو نظر آیا تھا، لیکن "رضوا بالحیوۃ الدنیا واطمأنوا بھا"، جن کا انتہائی مبلغ علم ہوا ان کی فہم سے سچ ہے کہ یہ بات بعید ہی نہیں بلکہ ناممکنات کی حد تک پہنچی ہوئی ہو اور سچ تو یہ ہے

کہ محمدی معجزوں میں اگر کوئی چاہے تو اس "ایثار ابدالی" کو بھی شریک کر سکتا ہے۔

نعمت اور نقمت کے بعد بھی مسلمانوں کی غفلت اور خدا فراموشی

یہ واقعہ بھی گزر گیا، اس فتنہ کا شباب بھی حضرت شاہ صاحب ہی کی زندگی میں ہوا، اور اس دنیا سے روانہ ہونے سے پہلے اپنے خواب کی تعبیر بھی انھوں نے دیکھ لی، لیکن جن مسلمانوں کے "مکاسب ایدی" اور "زشتیٔ اعمال" نے شرہٹوں کی شکل اختیار کی تھی، باوجود سب کچھ دیکھنے کے کیا ان میں کوئی تغیر پیدا ہوا تھا۔ حضرت شاہ صاحب کا مکاشفہ کہ مسلمانوں اور اسلام پر "ملک الکفار" کی جانب سے جو مظالم ہو رہے تھے اسی سے

غضب اللہ تعالیٰ علی اهل الارض غضبا شدیدا	زمین والوں پر حق تعالیٰ سخت غصہ کے ساتھ غضبناک ہوئے۔

کا ظہور ہوا تھا، واحسرتاہ و یا ویلاہ کہ "غیب" میں جس امت کی یہ ناز برداریاں ہیں آہ کہ اسکی بے نیازی یا میں سچ پوچھئے تو کوئی کمی نہیں یا بہت کم کمی واقع ہوئی تھی، وہ اپنی زشتیٔ اعمال کو "صوت نادر" بھی قرار دیتے تھے، وسکھی اور مرہٹی فتنوں کو خدا کی تنبیہ بھی سمجھتے تھے، لیکن باوجود سب کچھ سمجھنے کے کچھ نہیں سمجھتے تھے، سب کچھ دیکھنے کے انھیں کچھ نہیں سوجھتا تھا، فطرتیں مسخ ہو چکی تھیں، دلوں پر رین اور زنگ چھایا ہوا تھا، دیکھتے تھے اور نہیں دیکھتے تھے، سنتے تھے اور نہیں سنتے تھے، سننے والے بہرے اور دیکھنے والے اندھے اُن میں زیادہ پیدا ہو چکے تھے۔

شاہ ولی اللہ کی چیخ پکار اور خطرہ کا مسلسل الارم

وہ "قدسی روح" جو اس بجھتے ہوئے چراغ کو آخری دفعہ سنبھالا دینے کے لئے "غیب" سے ہندوستان کے مسلمانوں کو دی گئی تھی وہ چیخ رہی تھی، چلا رہی تھی، لیکن ان میں کم تھے، جو اس "نقار خانہ" میں طوطی کی اس آواز پر کان رکھتے، میری مراد حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ سے ہے، ان کی مختلف کتابوں میں ان کی چیخ پکار کی شورشیں اس وقت تک بند ہیں، شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا "پیغام" کیا تھا، مختلف طریقوں سے وہ مسلمانوں پر پیش کیا جاتا تھا لیکن ان میں علم بافوں، کتاب بازوں، اور معارف فروشوں کا ایک گروہ ہر طرف پھیلا ہوا تھا، غلطی ہوئی اور بڑی غلطی ہوئی کہ شاہ ولی اللہ کو بھی ان ہی پیشہ وروں میں سے ایک خیال کیا گیا حالانکہ وہ ہر بات میں ان سے جدا تھا، اس کی آواز سب سے نرالی تھی لیکن اس کی تیز کس میں باقی تھی۔

مسلمانوں کے مختلف طبقات کے نام شاہ صاحب کا ایک پیغام اور سب کے لئے مفصل پروگرام

بطور نمونہ کے حضرت شاہ صاحبؒ کے ایک پیغام کا ترجمہ درج کرتا ہوں جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ "لیلاً و نہاراً اور سراً و جہاراً" جس امر کی دعوت دے رہے تھے وہ کیا تھا۔ تفہیماتِ الٰہیہ کے جامع نے ایک جگہ اس کو بھی درج کر دیا ہے میں اسی کا ترجمہ پیش کرتا ہوں کیونکہ اصل عبارت کے نقل کرنے میں طوالت ہوگی، عربی کے جاننے والے عربی میں پڑھ سکتے ہیں، خدا جزائے خیر دے مجلس علمی ڈابھیل کو جس نے ان چند سالوں میں ان گراں بہا دفینوں کو وقف عام کر دیا ہے۔ بہرحال منجملہ تفہیمات کے ایک طویل تفہیمی مقالے کے بعض اجزاء ہیں، جس میں مسلمانوں کے مختلف طبقات اور گروہوں کو ان کے موجودہ حالات پر تنبیہ کر کے آپ نے اصلاح کی راہ سمجھائی ہے، مثلاً سلاطین اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں!۔

سلاطین اسلام سے خطاب

"اے بادشاہو! ملاء اعلیٰ کی مرضی اس زمانہ میں اس امر پر مقرر ہو چکی ہے کہ تم تلواریں کھینچ لو اور اس وقت تک نیام میں داخل نہ کرو جب تک مسلم مشرک سے بالکلیہ جدا نہ ہو جائے اور اہل کفر و فسق کے سرکش لیڈر کمزوروں کے گروہ میں جا کر شامل نہ ہو جائیں، اور یہ کہ ان کے قابو میں پھر کوئی ایسی بات نہ رہ جائے جس کی بدولت وہ آئندہ سر اٹھا سکیں۔ قاتلوھم حتیٰ لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ (یعنی ان سے جنگ کرتے رہو تاآنکہ فتنہ فرو ہو جائے اور دین صرف اللہ کے لئے مخصوص ہو جائے) پھر جب کفر و اسلام کے درمیان ایسا کھلا نمایاں امتیاز پیدا ہو جائے تب تمہیں چاہئے کہ ہر تین دن یا چار دن کے سفر کی منزلوں پر اپنا ایک ایک حاکم مقرر کرو، ایسا حاکم جو عدل و انصاف کا مجسمہ ہو، قوی ہو جو ظالم سے مظلوم کا حق وصول کر سکتا ہو، اور خدا کے حدود کو قائم کر سکتا ہو اور اسمیں سرگرم ہو کہ پھر لوگوں میں بغاوت و سرکشی کے جذبات پیدا نہ ہوں نہ وہ جنگ پر آمادہ ہوں، اور نہ دین سے مرتد ہونے کی کسی میں جرأت باقی رہے، نہ کسی گناہ کبیرہ کے ارتکاب کی کسی کو مجال ہو، اسلام کا کھلے بندوں اعلان ہو، اور اس کے شعائر کا علانیہ اظہار کیا جائے۔ ہر شخص اپنے متعلقہ فرائض کو صحیح طور پر ادا کرے۔ چاہئے کہ ہر شہر کا حاکم اپنے پاس اتنی قوت رکھے جس کے ذریعے سے اپنے متعلقہ آبادی کی اصلاح کر سکتا ہو۔ مگر اسی کے ساتھ اس کو اتنی قوت فراہم کرنے کا موقع نہ دیا جائے جس کے بل بوتے پر وہ خود ان سے نفع گیر ہونے کی تدبیریں سوچنے لگے اور حکومت کے مقابلہ پر آمادہ ہو جائے۔ چاہئے کہ اپنے متعلقہ مقبوضات کے بڑے علاقہ اور اقلیم پر ایسے امیر مقرر کئے جائیں جو جنگی مہمات کا بھی اختیار رکھتے ہوں ایسے امیر کے ساتھ بارہ ہزار کی جمعیت رکھی جائے مگر جمعیت ایسے آدمیوں سے بھرتی ہو، جن کے دل میں جہاد کا ولولہ ہو، اور خدا کی راہ میں کسی کی ملامت سے خوفزدہ نہ ہوں، ہر سرکش دشمن سے جنگ اور مقابلہ کی ان میں صلاحیت ہو —— اے بادشاہو! جب تم یہ کر لو گے، تو اس کے بعد ملاء اعلیٰ کی رضامندی یہ چاہے گی کہ تم لوگوں کی منزلی اور عائلی زندگی کی طرف توجہ کرو، ان کے باہمی معاملات کو سلجھا دو اور ایسا کر دو کہ پھر کوئی معاملہ ایسا نہ ہونے پائے جو شرعی قوانین کے مطابق نہ ہو اسی کے بعد لوگ امن و امان کی صحیح مسرت سے نازاں ہو سکتے ہیں"۔

اسلامی امیروں کو مخاطب فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

امراء و ارکان دولت سے خطاب

اے امیرو! دیکھو! کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے، دنیا کی فانی لذتوں میں تم ڈوبے جا رہے ہو اور جن لوگوں کی نگرانی تمہارے سپرد ہوئی ہے، ان کو تم نے چھوڑ دیا ہے تاکہ ان میں بعض بعض کو کھاتے اور نگلتے رہیں —— کیا تم علانیہ شرابیں نہیں پیتے؟ اور پھر اپنے اس فعل کو تم برا بھی نہیں سمجھتے، تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ بہت سے لوگوں نے اونچے اونچے محل اس لئے کھڑے کئے

ہیں کہ ان میں زناکاری کی جائے اور شرابیں ڈھالی جائیں، جوا کھیلا جائے، لیکن تم اس میں دخل نہیں دیتے اور اس حال کو نہیں بدلتے کیا حال ہے ان بڑے بڑے شہروں کا جن میں چھ سو سال سے کسی پر حدِ شرعی نہیں جاری ہوئی، جب کوئی کمزور مل جاتا ہے تو اسے پکڑ لیتے ہو اور جب قوی ہوتا ہے تو چھوڑ دیتے ہو، تمہاری ساری ذہنی قوتیں اس پر صرف ہو رہی ہیں کہ لذیذ کھانوں کی قسمیں پکواتے رہو، اور نرم وگداز جسم والی عورتوں سے لطف اُٹھاتے رہو، اچھے کپڑوں اور اونچے مکانات کے سوا تمہاری توجہ اور کسی طرف منعطف نہیں ہوتی، کیا تم نے اپنے سر کبھی اللہ کے سامنے جُھکائے؟ خدا کا نام تمہارے پاس صرف اس لئے رہ گیا ہے کہ اپنے تذکروں، اور قصے کہانیوں میں اس نام کو استعمال کرو، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے لفظ سے تمہاری مراد زمانہ کا انقلاب ہے کیونکہ تم اکثر بولتے ہو خدا قادر ہے کہ ایسا کر دے، یعنی زمانہ کے انقلاب کی یہ تعبیر ہے۔

فوجی سپاہیوں کو خطاب

اے فوجیو! اور عسکریو! تمھیں خدا نے جہاد کے لئے پیدا فرمایا تھا مقصد یہ تھا کہ اللہ کی بات اونچی ہو گی اور خدا کا کلمہ بلند ہوگا اور شرک اور اس کی جڑوں کو تم دُنیا سے نکال پھینکوگے لیکن جس کام کے لئے تم پیدا کئے گئے تھے اسے تم چھوڑ بیٹھے، اب جو تم گھوڑے پالتے ہو، ہتھیار جمع کرتے ہو، اس کا مقصد صرف یہ رہ گیا ہے کہ محض اپنی دولت میں اس سے اضافہ کرو، اس سلسلہ میں جہاد کی نیت سے تم بالکل خالی الذہن ہوتے ہو۔ تم شرابیں پیتے ہو، بھانگ کے پیالے چڑھاتے ہو، ڈاڑھیاں منڈواتے ہو اور مونچھیں بڑھاتے ہو، عام لوگوں پر زیادتیاں اور ظلم کرتے ہو، حالانکہ جو کچھ ان کا ہے کر کھاتے ہو اُس کی قیمت ان تک نہیں پہنچتی، — خدا کی قسم تم عنقریب اللہ کی طرف واپس جاؤ گے پھر تمھیں وہ بتائے گا جو کچھ تم کیا کرتے تھے، — تمہارے ساتھ خدا کی یہ مرضی ہے کہ اچھے پارسا صالحین غازیوں کا لباس اور ان کی وضع اختیار کرو، چاہیئے کہ اپنی ڈاڑھیاں بڑھاؤ، مونچھیں کٹواؤ، پنجوقتہ نماز ادا کیا کرو، اور عام لوگوں کے مال سے بچتے رہو، جنگ اور مقابلہ کے میدان میں ڈٹے رہو، تمھیں چاہیئے کہ سفر اور جنگ وغیرہ کے موقع پر نماز میں جو آسانیاں اور رخصتیں رکھی گئی ہیں انھیں سیکھ لو مثلاً قصر کرنا، جمع کرنا، سنتوں کے ترک کرنے کی اجازت ہے اس سے واقف ہونا، تیمم کی اجازت سے مطلع ہونا — پھر اس کے بعد نماز کو خوب زور سے پکڑ لو اور اپنی نیتوں کو درست کرلو، اور اللہ تعالےٰ تمہارے جاہ ومنصب میں برکت دے گا اور دشمنوں پر تمھیں فتح عطا فرمائے گا۔

عام پیشہ وروں کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں۔

اہل صنعت وحرفت سے خطاب

ارباب پیشہ! دیکھو! امانت کا جذبہ تم سے مفقود ہو گیا ہے تم اپنے رب کی عبادت سے خالی الذہن ہو چکے ہو، اور تم اپنے فرضی بنائے ہوئے معبودوں پر قربانیاں چڑھاتے ہو، تم مدار اور سالار کا حج کرتے ہو، تم میں بعض لوگوں نے فال بازی اور ٹوٹکا اور گنڈے وغیرہ کا

پیشہ اختیار کر رکھا ہے، یہی انکی دولت ہے اور یہی ان کا ہنر ہے، یہ لوگ خاص قسم کا لباس اور بانا اختیار کرتے ہیں، خاص طرح کے کھانے کھاتے ہیں، ان میں جن کی آمدنی کم ہوتی ہے وہ اپنی عورتوں اور اپنے بچوں کے حقوق کی پرواہ نہیں کرتے تم میں بعض صرف شراب خواری کو پیشہ بنائے ہوئے ہیں، اور تم ہی میں کچھ لوگ عورتوں کو کرایہ پر چلا کر پیٹ پالتے ہیں، یہ کیسا بدبخت آدمی ہے اپنی دنیا اور آخرت دونوں کو برباد کر رہا ہے حالانکہ حق تعالیٰ نے تمہارے لئے مختلف قسم کے پیشے، اور کمانے کھانے کے دروازے کھول رکھے ہیں، جو تمہاری اور تمہارے متعلقین کی ضرورتوں کے لئے کافی ہوسکتے ہیں، بشرطیکہ تم اعتدال کی راہ اپنے خرچ میں اختیار کرو، اور محض اتنی روزی پر قناعت کرنے کے لئے آمادہ ہوجاؤ جو تمہیں بآسانی اخروی زندگی کے نتائج تک پہنچا دے۔ لیکن تم نے خدا کی ناشکری کی، اور غلط راہ حصول رزق کی اختیار کی کیا تم جہنم کے عذاب سے نہیں ڈرتے جو بڑا برا بچھونا ہے۔

دیکھو! اپنی صبح و شام کو تم خدا کی یاد میں بسر کیا کرو، اور دن کے بڑے حصہ کو اپنے پیشہ میں صرف کرو، اور رات کو اپنی عورتوں کے ساتھ گزارو، اپنے خرچ کو اپنی آمدنی سے ہمیشہ کم رکھا کرو پھر جو بچ جایا کرے اس سے مسافروں کی مسکینوں کی مدد کیا کرو، اور کچھ اپنے اتفاقی مصائب اور ضرورتوں کے لئے پس انداز بھی کیا کرو۔

تم نے اگر اس راہ کو اختیار نہ کیا تو تم غلط راہ پر جا رہے ہو اور تمہاری تدبیر درست نہیں ہے۔

پھر اسی طرح مشائخ کی اولاد، اس زمانہ کے عام طلبۂ علم اور واعظوں زاہدوں کو بھی آپ نے خصوصیت کے ساتھ پکارا ہے، مثلاً مشائخ کی اولاد کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

مشائخ کی اولاد یعنی پیرزادوں سے خطاب

اے وہ لوگو جو اپنے آبا و اجداد کے رسوم کو بغیر کسی حق کے پکڑے ہوئے ہو یعنی گزشتہ بزرگانِ دین کی اولاد میں ہو، میرا آپ سے سوال ہے، کہ آپ کو کیا ہوگیا ہے کہ ٹکڑیوں، ٹکڑیوں، ٹولیوں، ٹولیوں میں آپ بٹ گئے ہیں، ہر ایک اپنے اپنے راگ اپنی اپنی منڈلی میں الاپ رہا ہے، اور جس طریقہ کو اللہ نے اپنے رسول محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے نازل فرمایا تھا اور محض اپنے لطف و کرم سے جس راہ کی طرف راہنمائی فرمائی تھی اسے چھوڑ کر ہر ایک تم میں ایک مستقل پیشوا بنا ہوا ہے، اور لوگوں کو اسی کی طرف بلا رہا ہے، اپنی جگہ اپنے کو راہ یافتہ اور راہنما ٹھیرائے ہوئے ہے۔ حالانکہ دراصل وہ خود گم کردہ راہ اور دوسروں کو بھٹکانے والا ہے، ہم ایسے لوگوں کو قطعاً پسند نہیں کرتے جو محض لوگوں کو اس لئے مرید کرتے ہیں تاکہ ان سے ٹکے وصول کریں، ایک علم شریف کو سیکھ کر دنیا بٹورتے ہیں کیونکہ جب تک اہل دین کی شکل و شباہت اور طرز و انداز وہ نہ اختیار کریں گے دنیا حاصل نہیں ہوسکتی۔

اور تم میں اُن لوگوں سے راضی ہوں جو سوائے اللہ و رسول کے خود اپنی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں اور اپنی مرضی کی پابندی کا لوگوں کو حکم دیتے ہیں، یہ لوگ بٹ مار اور راہ گیر ہیں ان کا شمار دجالوں کذابوں فتانوں اور اُن لوگوں میں ہے، جو خود فتنہ اور آزمائش کے شکار رہیں۔

خبردار! خبردار!! ہرگز اُس کی پیروی نہ کرنا، جو اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت کی طرف دعوت نہ دیتا ہو اور اپنی طرف بلاتا ہو، اور چاہئے کہ زبانی جمع خرچ صوفیہ کرام کے اشاروں کے متعلق عام مجلسوں میں نہ کیا جائے کیونکہ مقصود تو (تصوف) سے صرف یہ ہے کہ آدمی کو احسان کا مقام حاصل ہو جائے، لوگو، دیکھو! کیا تمہارے لئے اللہ تبارک و تعالےٰ کے اس ارشاد میں کوئی عبرت نہیں ہے؟

ان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ　　یہ میری راہ ہے سیدھی، تو اس پر چل پڑو اور مختلف راہوں کے پیچھے نہ پڑو وہ تمہیں اللہ کی راہ سے بچھڑا دیں گی

پھر اس زمانہ کے طلبہ علم کو خطاب کر کے فرماتے ہیں:۔

غلط کار علماء سے خطاب

ارے بدعقلو! جنہوں نے اپنا نام "علماء" رکھ چھوڑا ہے تم یونانیوں کے علوم میں ڈوبے ہوئے ہو اور صرف و نحو و معانی میں غرق ہو اور سمجھتے ہو کہ یہی علم ہے، یاد رکھو! علم یا تو قرآن کی کسی آیت محکم کا نام ہے یا سنت ثابتہ قائمہ کا۔

چاہئے کہ قرآن سیکھو! پہلے اس کے غریب لغات کو حل کرو، پھر سبب نزول کا پتہ چلاؤ اور اس کے مشکلات کو حل کرو، اسی طرح جو حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح ثابت ہو چکی ہے اسے محفوظ کرو، یعنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نماز کس طرح پڑھتے تھے، وضو کرنیکا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا طریقہ تھا اپنی ضرورت کے لئے کس طرح جاتے تھے اور حج کیونکر ادا فرماتے تھے، جہاد کا آپ کے کیا قاعدہ تھا، گفتگو کا کیا انداز تھا، اپنی زبان کی حفاظت کس طرح فرماتے تھے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیا تھے، چاہئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری روش کی پیروی کرو، اور آپ کی سنت پر عمل کرو، مگر اس میں بھی اس کا خیال رہے کہ جو سنت ہے اُسے سنت ہی سمجھو نہ کہ اسے فرض کا درجہ عطا کرو، اسی طرح چاہئے کہ جو تم پر فرائض ہیں انھیں سیکھو مثلاً وضو، کے ارکان کیا ہیں، نماز کے ارکان کیا ہیں، زکوٰۃ کا نصاب کیا ہے قدر واجب کیا ہے، میت کے حصوں کی مقدار کیا ہے، پھر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی عام سیرت کا مطالعہ کرو، جس سے آخرت کی رغبت پیدا ہو، صحابہ اور تابعین کے حالات پڑھو اور یہ چیزیں فرائض سے فاضل اور زیادہ ہیں لیکن افسوس جن چیزوں میں تم اُلجھے ہوئے ہو اور جس میں سر کھپا رہے ہو اس کو آخرت کے علم سے کیا واسطہ یہ دنیا کے علوم ہیں۔

پھر ان ہی طلبہ کو فرماتے ہیں:۔

جن علوم کی حیثیت صرف ذرائع اور آلات کی ہے (مثلاً صرف و نحو وغیرہ) تو ان کی حیثیت آلہ اور ذریعہ ہی کی رہنے دو، نہ کہ خود ان ہی کو مستقل علم بنا بیٹھو، علم کا پڑھنا تو اسی لئے واجب ہے کہ اس کو سیکھ کر مسلمانوں کی بستیوں میں اسلامی شعائر کو رواج دو، لیکن تم نے دینی شعار اور اس کے احکام کو تو پھیلایا نہیں، اور لوگوں کو زائد از ضرورت باتوں کا مشورہ دے رہے ہو۔

تم نے اپنے حالات سے عام مسلمانوں کو یہ باور کرا دیا ہے، کہ علما کی بڑی کثرت ہو چکی ہے، حالانکہ ابھی کتنے بڑے بڑے علاقے ہیں، جو علماء سے خالی ہیں، اور جہاں علماء پائے بھی جاتے ہیں وہاں بھی دینی شعاروں کو غلبہ حاصل نہیں ہے۔

پھر آپ نے ان زاہدوں کو بھی مخاطب کیا ہے جنھوں نے اپنے وسوسوں کا نام دین رکھ چھوڑا ہے اور جو ان کے وساوس کے معیار پر پورا نہیں اترتا، گویا دین سے وہ خارج ہے اس گروہ میں زیادہ تر زہاد، عُبّاد اور وعّاظ ہی اس زمانہ میں مبتلا تھے اس لئے عنوان کا آغاز ان ہی سے کیا گیا ہے فرماتے ہیں۔

دین میں تنگی پیدا کرنے والے واعظوں اور کنج نشین زاہدوں سے خطاب

دین میں خشکی اور سختی کی راہ اختیار کرنے والوں سے میں پوچھتا ہوں اور واعظوں، عابدوں اور ان کنج نشینوں سے سوال ہے جو خانقاہوں میں بیٹھے ہیں — کہ بہ جبر اپنے اوپر دین کو عائد کرنے والو! تمہارا کیا حال ہے؟ ہر بُری بھلی بات ہر رطب و یابس پر تمہارا ایمان ہے، لوگوں کو تم جعلی اور گھڑی ہوئی حدیثوں کا وعظ سناتے ہو، اللہ کی مخلوق پر تم نے زندگی تنگ کر چھوڑی ہے، حالانکہ تم تو (اے امتِ محمدیہ) اس لئے پیدا ہوئے تھے کہ لوگوں کو آسانیاں بہم پہنچاؤ گے نہ کہ ان کو دشواریوں میں مبتلا کر دو گے، تم ایسے لوگوں کی باتیں دلیل میں پیش کرتے ہو، جو بیچارے مغلوب الحال تھے اور عشق و محبت الٰہی میں عقل و ہوش بھی کھو بیٹھے تھے، حالانکہ اہلِ عشق کی باتیں دریں کی تہیں لپیٹ کر رکھدی جاتی ہیں نہ کہ ان کا چرچا کیا جاتا ہے — تم نے وساوس کو اپنے لئے گوارا کر لیا ہے، اور اس کا نام احتیاط رکھ چھوڑا ہے — حالانکہ تمہیں صرف یہ چاہئے تھا کہ اعتقاداً و عملاً احسان کے مقام کے لئے جن امور کی ضرورت ہے، بس اس کو سیکھ لیتے، لیکن جو بیچارے اپنے اپنے خاص حال میں مغلوب تھے خواہ مخواہ ان کی باتوں کو احسانی خالص امور میں گڈمڈ کرنے کی حاجت نہ تھی اور نہ ارباب کشف کی چیزوں کو ان میں مخلوط کرنے کی ضرورت تھی۔

چاہئے کہ مقام احسان کی طرف لوگوں کو بلاؤ، پہلے اسے خود سیکھ لو پھر دوسروں کو دعوت دو، کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے، کہ سب سے بڑی رحمت اور سب سے بڑا کرم اللہ کا وہ ہے جسے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے پہنچایا ہے، وہی صرف ہدایت ہے جو آپ کی ہدایت ہے، پھر تم کیا بتا سکتے ہو، کہ جن افعال کو تم کرتے ہو وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرامؓ کیا کرتے تھے،

آخر میں ایک عام خطاب عام مسلمانوں کے نام ہے جس میں کسی خاص طبقہ کی تخصیص نہیں ہو فرماتے ہیں:۔

عام امت مسلمہ سے جامع خطاب امراض کی تشخیص اور علاج کی تجویز

میں مسلمانوں کی عام جماعت کی طرف اب مخاطب ہوں اور کہتا ہوں اے آدم کے بچو! دیکھو! تمہارے اخلاق سو چکے ہیں، تم پر بیجا حرص و آز کا بھوکھا سوار ہو گیا ہے، تم پر شیطان نے قابو پالیا ہے، عورتیں مردوں کے سر چڑھ گئی ہیں اور مرد عورتوں کے حقوق برباد کر رہے ہیں، حرام کو تم نے اپنے لئے خوشگوار بنا لیا ہو اور حلال تمہارے لئے بدمزہ ہو چکا ہے، قسم ہے اللہ کی اللہ نے ہرگز کسی کو اس کے بس سے زیادہ تکلیف نہیں دی ہے، چاہئے کہ تم اپنے شہوانی خواہشوں کو نکاح کے ذریعہ پوری کرو، خواہ تمھیں ایک سے زیادہ نکاح ہی کیوں نہ کرنا پڑے، اور اپنے مصارف وضع قطع میں تکلف سے کام نہ لیا کرو، اسی قدر خرچ کرو، جس کی تم میں سکت ہو، یاد رکھو! ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھاتا، اور اپنے اوپر خواہ مخواہ تنگی سے کام نہ لو، اگر تم ایسا کرو گے، تو تمہارے نفوس بالآخر فسق کے حدود تک پہنچ جائیں گے، اللہ تعالیٰ اس کو پسند فرماتا ہے کہ اس کے بندے اس کی آسانیوں سے نفع اٹھائیں جیسا کہ یہی اسی کو پسند ہے، کہ جو چاہیں وہ اعلیٰ مدارج پر احکام کی پابندی بھی کر سکتے ہیں، اپنے شکم کی خواہشوں کی تکمیل چاہئے کہ کھانوں سے کرو، اور اتنا کمانے کی کوشش کرو جس سے تمہاری ضرورتیں پوری ہوں، دوسروں کے سینوں کے بوجھ بننے کی کوشش نہ کرو، کہ ان سے مانگ مانگ کر کھایا کرو، تم ان سے مانگو اور وہ نہ دیں، اسی طرح بیچارے بادشاہوں اور حکام کے اوپر بھی بوجھ نہ بن جاؤ تمہارے لئے یہی پسندیدہ ہے کہ تم خود کما کر کھایا کرو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو خدا تمھیں معاش کی بھی راہ سجھائے گا، جو تمہارے لئے کافی ہو گی۔

اے آدم کے بچو! جسے خدا نے ایک جائے سکونت دی بخشی ہو، جس میں وہ آرام کرے اتنا پانی جس سے وہ سیراب ہو، اتنا کھانا جس سے بسر ہو جائے، اتنا کپڑا جس سے تن ڈھک جائے ایسی بیوی جو اس کی شرمگاہ کی حفاظت کر سکتی ہو اور اس کے رہن سہن کی جد وجہد میں مدد دے سکتی ہو، تو یاد رکھو، کہ دنیا کامل طور سے اس شخص کو مل چکی ہے۔ چاہئے کہ اس پر خدا کا شکر کرے۔

بہرحال کوئی نہ کوئی کمائی کی راہ آدمی ضرور اختیار کرے، اور اسی کے ساتھ قناعت کو اپنا دستور زندگی بنائے اور رہنے سہنے میں اعتدال کا جادہ اختیار کرے، اور اللہ کی یاد کیلئے جو فرصت ہم دست ہو اسے غنیمت شمار کرے کم از کم تین وقتوں صبح شام اور پچھلی رات کے ذکر کا خاص طور سے خیال رکھے، حق تعالیٰ کی یاد، اس کی تسبیح و تہلیل اور قرآن کی تلاوت کے ذریعہ سے کیا کرے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثا سنے اور ذکر کے حلقوں میں حاضر ہوا کرے۔

اے آدم کے بچو! تم نے ایسے بگڑے ہوئے رسوم اختیار کرلئے ہیں جن سے دین کی اصلی صورت بگڑ گئی ہے، تم عاشوراء کے دن جھوٹی باتوں پر اکٹھے ہوتے ہو، اسی طرح شب برات میں کھیل کود کرتے ہو، اور مُردوں کے لئے کھانے پکا پکا کر کھلانے کو اچھا خیال کرتے ہو، اگر تم سچے ہو تو اس کی دلیل پیش کرو

اسی طرح اور بھی بُری بُری رسمیں تم میں جاری ہیں، جس نے تم پر تمہاری زندگی تنگ کردی ہے، مثلاً تقریبات کی دعوتوں میں تم نے حد سے زیادہ تکلف برتنا شروع کر دیا ہے، اسی طرح ایک بُری رسم یہ بھی ہے کہ کچھ بھی ہو جائے لیکن طلاق کو گویا تم نے ناجائز ٹھیرا لیا ہے، یوں ہی بیوہ عورتوں کو نکاح سے روکے رہتے ہو، ان رسموں میں تم اپنی دولت ضائع کرتے ہو، وقت برباد کرتے ہو اور جو صحت بخش روش تھی اسے چھوڑ بیٹھے ہو۔

تم نے اپنی نمازیں برباد کر رکھی ہیں، تم میں کچھ لوگ ہیں جو دُنیا کمانے میں اور اپنے دھندوں میں اتنے پھنس گئے ہیں کہ نماز کا انھیں وقت ہی نہیں ملتا، کچھ لوگ ہیں جو قصہ کہانی سننے میں وقت گنواتے ہیں، خیر پھر بھی اگر ایسی مجلسیں لوگ ایسے مقامات پر قائم کیا کرتے جو مسجدوں سے قریب ہوتا تو شاید ان کی نمازیں ضائع نہ ہوتیں، تم نے زکوٰۃ کو بھی چھوڑ دیا ہے حالانکہ کوئی ایسا دولت مند نہیں ہے جس کے اقرباؤ اعزہ میں حاجتمند لوگ نہیں ہوتے، اگر ان لوگوں کی وہ مدد کیا کریں، ان کو کھلایا پلایا کریں اور زکوٰۃ کی نیت کر لیا کریں تو یہ بھی ان کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔

تم میں بعضوں نے روزے چھوڑ رکھے ہیں، خصوصاً جو فوجی ملازم ہیں، کہتے ہیں کہ وہ روزہ رکھنے پر قادر نہیں ہیں، یعنی جو محنت انھیں برداشت کرنی پڑتی ہے اس کے ساتھ روزے نہیں رکھ سکتے — تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ تم نے راہ غلط کر دی ہے اور تم حکومت کے سینہ پر بوجھ بن گئے ہو، بادشاہ جب اپنے خزانہ میں اتنی گنجائش نہیں پاتا جس سے تمہاری تنخواہ ادا کرے تب رعایا پر زندگی کو دشوار کرتا ہے — یا ہیو! یہ تمہاری کیسی بُری عادت ہے! — کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو روزے رکھتے ہیں، لیکن سحری نہیں کرتے، اور رمضان میں ان سخت کاموں کو نہیں چھوڑتے جن کی وجہ سے روزے ان پر گراں ہو جاتے ہیں۔

آخر میں فرماتے ہیں:-

ملاءِ اعلیٰ کی طرف سے اصلاحی مطالبات کا اس زمانہ میں جن جن امور کے متعلق تقاضا ہو رہا ہے اس کا ایک طویل باب ہے، لیکن کھڑکی سے آدمی بڑی بیکیوں کو جھانک سکتا ہے اور ڈھیر کیلئے اس کا نمونہ کافی ہے۔

ہم نے قصداً شاہ صاحب کے ان دعوتی پیغاموں کا ترجمہ پیش کیا ہے جس سے اس کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ عام طور پر مسلمانوں کے ہر طبقہ کی ہندوستان میں کیا حالت ہو چکی تھی، نیز اسی سے حضرت شاہ صاحب کے

اندرونی جذبات و احساسات کا بھی سراغ مل سکتا ہے کہ ان کی نگاہیں کہاں کہاں تھیں اور کن کن چیزوں کو دیکھ رہی تھیں، جو لوگ ان کی کتابوں کو حنفیت و شافعیت، تقلید و عدم تقلید یا صرف تصوف و کلام کے متعلقہ مباحث تک محدود خیال کرتے ہیں، ان کے لئے بھی ان تقریروں میں تنبیہ ہے، چاہئے کہ شاہ صاحب کے خدمات کی قیمت لگاتے ہوئے ذرا زیادہ بلند نظری سے وہ کام لیں،

ہندی مسلمانوں کا جمود مارنے کا تہیا

خلاصہ یہ ہے کہ قدرت کی طرف سے تکوینی طور پر بھی مسلمانان ہند کو مسلسل الارم دیا جا رہا تھا، اور تشریعی حیثیت سے پیغمبروں کے صحیح جانشینوں کو اٹھایا جا رہا تھا، جو انھیں بار بار جھنکار رہے تھے، جگا رہے تھے، لیکن وہ اپنی جگہ کچھ فیصلہ کر چکے تھے، ان کے بڑوں اور چھوٹوں نے گویا مرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

ادھر مرہٹوں کا نازک ترین مرحلہ محض اللہ کے رحم و کرم سے طے ہو گیا تھا چاہئے تھا کہ آنکھیں کھل جاتیں لیکن شاہ صاحب کے جو کچھ مطالبات تھے ان میں تیر سو فرق نہ ہوا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں فساد کے ایک جرثومہ کی جڑ نکلی تھی، بلکہ سچ یہ ہے کہ شاہ غازی ابدالی نے سکھوں کی قوتوں پر بھی مختلف ضربیں ایسی لگائی تھیں کہ پنجاب کے مسلمان اگر چاہتے تو وقفہ کی ان گھڑیوں میں جاگ سکتے تھے، لیکن وہ اسی طرح سوتے رہے جیسے پہلے تھے، گویا ان کو کالا سونگھ گیا تھا۔

قدرتی قانون کے مطابق اس خواب غفلت کی سزا انگریزی اقتدار کا آغاز

آخر قدرت کے قوانین جو اٹل ہیں، وہ بھی کام کرتے رہے، ادھر ان اندرونی فتنوں کی زندگی میں کچھ کمی ہوئی لیکن شمال مشرق اور جنوب مشرق کے ساحلی کناروں سے وہی قوم جس کے متعلق مسلمانوں کے اہل لغت کبھی یہ لکھا کرتے تھے کہ

انگریز بروزن رنگریز، نوعی ست از نوع انسانی کہ گاہ گاہ بکنار دریا ظاہر می شود۔

انگریز کا لفظ رنگریز کے وزن پر ہے، یہ انسانی نوع کی ایک قسم ہے جو کبھی کبھی سمندر کے کنارے نمایاں ہوتی ہے۔

توان ہی دنوں میں جب پانی پت کے میدانوں میں مرہٹوں کا فیصلہ ہو رہا تھا، قدرت کسی اور فیصلہ کا انتظام کر رہی تھی، بنگال کے ناظم سراج الدولہ کی فوج لارڈ کلیف (المشہور بہ کلایو) کے اس شبخون حملے سے دل از دست رفتہ ہو چکی تھی، جس میں غالباً پہلی دفعہ جماعتی بندوقوں کے چلانے والوں کو کارتوسی گولیوں کا تجربہ ہوا تھا، طباطبائی نے لکھا ہے کہ کلایو اور اس کے ساتھی

سراج الدولہ کی فوج پر کارتوسی بندوقوں کے ساتھ لارڈ کلایو کا پہلا شبخون نمبر

ساعتے از شب باقی ماندہ انگریز کشتی نزدیک آمدہ از طرف پشت لشکر تفنگ افگنان داخل شدند فاصلہ در تفنگ نداده قدم بقدم راہ می پیمودند و گولہ تفنگ چوں تگرگ بلا بر سر لشکریان سراج الدولہ می بارید۔

کچھ رات رہے پشت سے انگریز کشتی سے اتر کر سراج الدولہ کی فوج کے پشت کی طرف سے بندوقیں سر کرتے ہوئے اس کی فوج میں گھس گئے وہ باڑھ مار نے میں وقفہ نہیں دیتے تھے اور مسلسل مارچ کرتے ہوئے آگے بڑھے چلے جاتے تھے اور بندوق کی گولیاں اولوں کی طرح سراج الدولہ کے فوجیوں پر برس رہی تھیں۔

ظاہر ہے کہ ہندوستانی سپاہیوں کو "گولہ تفنگ چوں تگرگ" کا پہلی دفعہ تجربہ ہوا تھا، وہاں نہ ڈھال کام آتی تھی، نہ نیزہ، نہ تلوار، اور نہ اس کے ہاتھا، ربینئر ے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ

سراج الدولہ کے لشکر میں ابتری اور قیامت کا نمونہ

بمشاہدہ ایں رست خیز کہ نمونہ محشر دراں عسکر آشکا ما نہ نمایاں گشتہ بود دل از دست رفتہ اضطرابے وہراسے عظیم درخاطر جائے گرفت،

اس بھاگ دوڑ میں جو قیامت کا نمونہ سراج الدولہ کی چھاؤنی میں قائم ہو گیا تھا، لوگوں کے دل قابو سے نکل گئے۔ دلوں میں سخت خوف وہراس نے جڑ پکڑ لی۔

اگرچہ یہ واقعہ "پانی پت" کے سانحہ سے تین سال پہلے پیش آیا تھا، لیکن "تفنگ چوں تگرگ" کے مقابلہ میں ہندی سپاہیوں میں پھر کبھی ہمت نہ ہوئی، اور بالآخر "پلاسی" کے مشہور میدان میں اس لئے کہ

میر جعفر وغیرہ کی غداری اور جنگ پلاسی میں انگریزوں کی فتح

میر جعفر خاں ودیگراں کہ باعث ایں فساد وخواہاں شکست سراج الدولہ بودند از دور بطرفیکہ متعین بودند استادہ تماشائے می نمودند

میر جعفر خاں اور دوسرے لوگ جو اس فساد کے بانی مبانی تھے اور سراج الدولہ کی شکست کے آرزومند تھے، جس مقام پر متعین تھے وہیں سے کھڑے اس تماشے کو دیکھ رہے تھے۔

جو مقدر تھا وہ پورا ہوا، اپنے نمک حرام طوطا چشم ملازم میر جعفر کا قیدی سراج الدولہ محمدی بیگ سے جو اس کے قتل کے لئے بھیجا گیا تھا یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ

آیا راضی نمی شوند کہ در گوشہ افتادہ زندگی کنم۔

کیا (میر جعفر وغیرہ) اس پر بھی راضی نہیں ہیں کہ کسی گوشۂ تنہائی میں پڑا ایں زندگی گزار دوں؟

لیکن اس کے باپ اور نانا کے نمک پروردہ محمدی نے سر ہلایا

سراج الدولہ کا لرزہ خیز قتل

وضربتے چند بر پیکر نازنین او زد بر روئے زمین افتاد وگفت بس ست کہ کار من تمام شد وانتقام بانجام رسید،

اور چند وار اس کے نازنین پیکر پر اس نے کئے، وہ زمین پر گر پڑا اور بولا بس کرو میرا کام تمام ہو گیا، اور انتقام اپنے آخری انجام کو پہنچ گیا،

اپنے پایۂ تخت مرشد آباد کے بازاروں میں سراج الدولہ کی لاش

وہی مرشد آباد جہاں بنگال و بہار و اڑیسہ کے اس مطلق العنان خود سر بادشاہ کی سواریاں شاہانہ تجمل و شکوہ سے روز نکلا کرتی تھیں آج اس کی

لاش او را بر ہودج فیلے انداختہ بطور تشہیر در شہر گردانیدند

لاش ایک ہاتھی کے ہودج پر ڈال کر بطور تشہیر شہر میں پھرائی گئی۔

اور میر جعفر کی کھال اوڑھ کر کرنل کلیف (کلایو) اور اس کے جانشینوں نے کمپنی بہادر کے نام سے سرزمین ہند پر اس تخت کو بچھایا، جو آج تک بچھا ہوا ہے

ہندوستان کے مسلمانوں کو الغازی الابدالی جس شاہ عالم اور شجاع الدولہ کے سپرد کر کے خود قندھار سدھار گئے

تھے، حضرت شاہ صاحب کی وفات کے تقریباً دو سال بعد کلا یو نے بمقام الہ آباد مشہور

بنگال، بہار، اڑیسہ کی دیوانی کمپنی بہادر کے نام	
فرمان اسناد دیوانی ہر سہ صوبہ بنگال بہار اڑیسہ بنام کمپنی از وزیر (شجاع الدولہ) و بادشاہ (شاہ عالم) درخواست و چاروناچار قبول نمودہ بردفق خواہش او فرامین اسناد نوشتہ دادند۔	تینوں صوبے بنگال بہار اڑیسہ کی دیوانی کی سند کمپنی بہادر کے نام وزیر (شجاع الدولہ) اور بادشاہ (شاہ عالم) سے چاہی، اور چاروناچار دونوں کو قبول کرنا پڑا اور کلایو کی خواہش کے مطابق اسناد کے فرامین لکھے گئے۔

اتنے بڑے بڑے صوبوں کی کل مالگذاری چوبیس لاکھ مقرر ہوئی اور چالیس ہزار سالانہ ناظم بنگالہ کے اخراجات کے لئے طے ہوئے اور

قبولیت بمہر کمپنی کہ دست آویز تعہد مالگذاری است داخل دفتر بادشاہی گردید،	کمپنی کے مہر کے ساتھ قبولیت نامہ جو مالگذاری کے معاہدہ کی دستاویز تھی بادشاہی دفتر میں داخل ہوئی،

بقول طباطبائی اتنا اہم کام اتنی آسانی سے انجام پاگیا۔

کہ بیع و شرائے خربار بردار و چارپائے کم مقدار ہم باین زودی بدون تکرار کسے نمی شود، انفصال و انقطاع یافتہ	کہ کسی بوجھ لادنے والے گدھے اور کسی چوپایہ کی خریداری بھی اتنی جلدی بغیر کسی ردوکد اور تکرار کے طے نہیں ہوتی لیکن یہاں (اتنا بڑا معاملہ) طے پاکر ختم ہوگیا،

"تؤتی الملك من تشاء وتنزع الملك ممن تشاء" کی پھر ایک تفسیر گنگا وجمنا کے سنگم پر لکھی گئی، شاہ عالم نام کو ہندوستان کے بادشاہ تھے، لیکن کرنل اسمتھ جوان کی نگرانی کے لئے الہ آباد میں چھوڑا گیا تھا اس کا حال یہ تھا کہ

فرنگی ٹھیکہ داروں کی نزاکت باطبع شاہی نقارہ کی آواز سے سر میں درد	
از صدا ہائے نقارہ و نوبت خانہ بادشاہی کہ در قلعہ بود گاہے ناخوش گشتہ نواختن نوبت شاہی را مانع می شد و مردم نقارخانہ ناچار ممنوع از عمل خود بودند	بادشاہی نوبت خانے کے نقارہ کی آواز سے ناخوش ہوتا تھا اور نقارہ کے بجانے میں مانع ہوا، نقارخانہ والے مجبوراً رک گئے۔

سچ ہے ؎ تا نہ پڑے خلل کہیں آپ کے خواب ناز میں
ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شب دراز میں

ان "ٹھیکہ داروں" کی نزاکت دماغ کے اب کیا کہتے تھے ع غنچہ چٹکا تو کہا سر میں دھمک ہوتی ہے۔

فانا للہ وانا الیہ راجعون

ظاہر ہے دین کا وہ دیوانہ جو مسلسل پچاس ساٹھ سال سے آسمان کے ان بدلے ہوئے تیوروں کا اندازہ کر رہا تھا اس کی اندرونی تڑپ اور بے چینی کبھی کبھی، ابدالی اور حافظ الملک رحمت خاں، شجاع الدولہ اور میر قاسم کی شکلیں بن بنکر

نمایاں ہو رہی تھیں، لیکن جن کے لئے وہ تڑپ رہا تھا وہ تو سوئے ہوئے تھے، کیا کرتا، کب تک اپنے جگر کے نالوں سے آسمانوں کو ہلاتا۔

آخر عمر میں شاہ ولی اللہ کی دردناک وصیت

آخر عمر میں جب وصیت نامہ ترتیب دینے لگے تو جہاں اور باتیں لکھیں ان میں سب سے زیادہ دردناک وصیت وہ ہے جسے پڑھ کر کلیجہ کانپ اٹھتا ہے، دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کے عاصمہ (پایۂ تخت) میں بیٹھ کر اسی سلطنت کا ایک عالم لکھتا ہے اور حالات نے جو رخ لیا تھا ان کا صحیح اندازہ کرنے کے بعد لکھتا ہے :-

ما مردم غریبیم کہ در دیار ہندوستان آبائے ما بغربت افتادہ اند۔ وصیت نامہ صلا

ہم لوگ اجنبی مسافر لوگ ہیں ہمارے باپ دادے اس ملک میں بحالت مسافرت بہ غربت ہی یہاں داخل ہوئے

(اور پھر یہی حالت واپس ہو گئی)

حضرت کے کلام اور مختلف کتابوں سے جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان پر اپنی قوم کی اس حالت کا خاص اثر تھا، وہ دیکھ رہے تھے کہ اگر یہی لیل و نہار ہیں تو اس ملک میں اب دین اور اہل دین کا بس خدا ہی حافظ، اور اب اس میں شک کی گنجائش ہی کیا باقی تھی، جو کچھ ہونے والا تھا، اس کی صبح بلکہ صبح سے بھی زیادہ روشنی طلوع ہو چکی تھی، قوم کی تقدیر ان پر واضح ہو چکی تھی،

۱۱۴۳ھ میں حالات کی نزاکت کے باوجود شاہ صاحب کے سفر حجاز کا عزم

اور آج ہی نہیں بلکہ میرا تو خیال ہے کہ ۱۱۴۳ھ میں جب آپ کی عمر تقریباً ۳۰ سال کی تھی اچانک آپ کا سفر حجاز کے لئے آمادہ ہو جانا، اور ایسے زمانہ میں اس خطرناک ارادہ پر عمل کرنے کی ٹھان لینا جب بحر عرب اور بحر ہند و بحر احمر کے تمام سواحل پرتگیزی و لندیزی قزاقوں اور فرانسیسی و انگریزی تاجر صورت ملک گیروں کی بحری ترکتازیوں کے جولانگاہ بنے ہوئے تھے، علانیہ حاجیوں کے جہاز لوٹے جاتے تھے جس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں بلکہ ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے، یوں بھی شمالی ہند سے جنوبی ہند کے علاقوں کو طے کر کے سورت کی بندرگاہ تک پہنچنا آسان نہ تھا، خشکی میں ہر جگہ خصوصاً صوبجات متوسطہ، مالوہ گجرات جو بندرگاہ کے راستہ پر واقع تھے مرہٹوں کی شورشوں کی خصوصی آماجگاہ بنے ہوئے تھے، تاہم شاہ صاحب راہ کی ان تمام دشواریوں کے باوجود عزم حجاز کو پورا کر کے رہے راستہ کا حال یہ تھا کہ رات کو اگر کوئی ساتھی کسی گاؤں یا آبادی میں بھی چھوٹ جاتا تھا تو شاہ صاحب "یا بدیع العجائب یا بدیع العجائب" کا وظیفہ شروع کر دیتے تھے، جس کے یہ معنی ہیں کہ گویا ایسے آدمی کا بخیر خطرہ سے نکل آنا ایک اعجوبۂ روزگار بات تھی، بہر حال میرے نزدیک علاوہ حج و زیارت اور دوسرے مقاصد کے ایک بڑا محرک جیسا کہ آئندہ بھی اس پر کچھ بحث کی جائے گی مسلمانان ہند کے تاریک مستقبل کا احساس بھی تھا جس کی اسی سرزمین ہند میں اس خیال پر اگر فتار ہونیوالی تھی کچھ ان تک خبر پہنچائی تھی، اور جہاں کی دعائیں رد نہیں ہوتیں؛ ہاں بھی کچھ عرض کرنا چاہتے تھے، اسی سلسلہ میں ان کو مکہ معظمہ میں وہ خواب دکھلایا گیا جس کا ذکر گزر چکا اور مدینہ منورہ میں یہ سرفرازی نصیب ہوئی کہ خود ختمی مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے براہ راست اس بشارت سے مفتخر فرمایا کہ

تمہارے متعلق خدا کا ارادہ ہو چکا ہے کہ امت مرحومہ کے جتھوں میں سے کسی جتھے کی تنظیم تمہارے ذریعہ سے کیجائے	بل مراد الحق فیک ان یجمع شملا من شمل الامۃ المرحومۃ بک ۔ (فیوض)

میرے خیال میں یہ ہندوستان ہی کی امت مرحومہ تھی، جس کی پراگندگیوں کی تنظیم کا کام ایک خاص الٰہی تدبیر سے حضرت اور حضرت کے دودمان "ادہ" ذریات طیبات" سے لیا گیا، اس مضمون کو کسی آئندہ مناسب مقام پر ذرا تفصیل سے انشاءاللہ عرض کروں گا۔

بالفعل یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایسی حالت میں جب شاہ صاحب ہندوستان کو چھوڑ چکے تھے اور ایک دوسری صورت بھی آپ کے سامنے تھی، یعنی اپنی اس مسافرت اور غربت کا ازالہ، جس کا احساس انھیں اس ملک میں ہو چکا تو یوں بھی تو کر سکتے تھے کہ بجائے غربت اور مسافرت کی معیبت کے ملک حجاز ہی میں وہ رہ پڑتے۔ کیونکہ گو ان ممالک کی خیر بھی نظر نہیں آ رہی تھی، اور مسلمان جن علاقوں کو ابتک اپنا وطن سمجھ رہے تھے مستقبل کی گھڑیوں پر نظر رکھنے والے وہاں بھی ان کی غربت اور مسافرت کو دبے پاؤں آتا ہوا دیکھ رہے تھے لیکن پھر بھی

(شاہ صاحب نے ہندوستان کو بالکل خیرباد کہکر حجاز ہی میں اقامت کیوں نہیں کرلی)

جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو اب شبلی کہاں جائیں | کہ اب امن و امان شام و نجد و قیروان تک

کی حالت بیدا ہوئی تھی، بالخصوص سرزمین حجاز تو ترکی اور مصری سلطنتوں کے برج میں بہت کچھ قابل بھروسہ تھی پھر اس مقدس ملک میں آپ کو قیام کا بھی کافی موقعہ ملا، مختلف مقامات میں آپ کو مختلف اشارے بھی ہوتے رہے اور طرح طرح کے مکاشفے مختلف رنگوں میں ہوئے، مگر ان میں کسی جگہ بھی آپ کو اس کا ایماء کیا گیا، کہ ہندوستان کی واپسی کا ارادہ ترک کر دو، یہی نہیں بلکہ آپ کے بعض متوسلوں نے ہندوستان کی ان حالتوں کو دیکھ کر جب چاہا کہ حجاز سے واپس نہ ہوں اور وہیں رہ پڑیں اور مشورۃً شاہ صاحبؒ کو اس بارہ میں خط لکھا تو آپ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ

اور تمہارا ارادہ کہ وطن کی طرف اب واپس نہیں ہونا چاہیے تو اس پر اصرار نہ کرو، جب تک خود تمہارا سینہ نہ کھل جائے۔ یا کسی اور شخص (یعنی خود شاہ صاحبؒ)	واما عزمہ ترک الرجوع الی الوطن فلا تستبد بہ حتی یشرح اللہ صدرک او صدر رجل لاجلک ۔ (مکاتیب حیات ولی ص ۲۹۱)

کو شرح صدر تمہارے لئے نہ ہو جائے۔

بلکہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "امت مرحومہ" کے جس طبقہ کے "شمل" کے اجتماع کی آپ نے بشارت پائی تھی اس کے لئے بہرحال اسی عالم غربت میں مرنا اپنے لئے پسند کرتے تھے، حتٰی کہ حالات جب روز بروز بدتر ہوتے چلے جا رہے تھے اور آپ کو اس کا یقین ہو گیا کہ اب اس ملک پر مسلمانوں کی حکومت قائم نہیں رہ سکتی اور بہرحال غیر اسلامی قوتوں کا اس پر اقتدار قائم ہی ہو جائے گا، تو اب چاہے آپ اسے اپنے دل کی تسلی خیال کیجئے یا جیسا اور بہت سی چیزیں انھوں نے "مبنی اشارات" کے تحت لکھی ہیں، اس کا بھی اعلان کسی گمان غالب کے تحت میں نہیں بلکہ یقین و اعتقاد کی صورت میں کیا ہے۔

شاہ صاحب کی ایک محیر العقول توقع	
والذی اعتقد انہ ان اتفق غلبۃ الهنود مثلاً علی اقلیم هندوستان غلبۃ مستقرۃ عامۃ وجب فی حکمۃ اللہ تعالیٰ ان یلهم رؤسائهم التدین بدین الاسلام (تفہیمات الٰہیہ ۱ ص)	اور جس بات کا مجھے یقین ہے وہ یہ ہے کہ اگر مثلاً ہندوؤں کا ہندوستان کے ملک پر تسلط قائم ہو جائے اور یہ تسلط مستحکم اور ہر پہلو کے اعتبار سے ہو، جب بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت کی رو سے یہ واجب اور ضروری ہے کہ ہندوؤں کے سرداروں اور لیڈروں کے دل میں یہ الہام کرے کہ وہ دین اسلام کو اپنا مذہب بنالیں۔

غالباً آپ کی یہ تحریر "پانی پت" کے تقدیری فیصلہ سے پہلے کی ہے اور اسی لئے خاص کر اسی قوم کے تسلط کے خیال کو انھوں نے تمثیل کی شکل میں پیش کیا ہے۔ بہرحال ہندوستان کے متعلق

"پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے"

اُن کا نظریہ بلکہ عقیدہ تھا بلکہ یہ ہے کہ غالباً اس نظریہ کے موجب اول بھی دہی ہیں کیونکہ انھیں نے لکھا ہے: کہ "کما الهم الترک" یعنی جیسے ترکوں کو قبول اسلام کی الہامی توفیق ہوئی اور جو اسلامی جھنڈے کو سرنگوں کر رہے تھے خود اس کے آگے سرنگوں ہو کر صدیوں اسلامی علم کے دنیا میں تنہا علم بردار رہے۔

شاہ صاحب اور نظریۂ وطنیت

لیکن باوجود اس خیال کے کہ "غربت و مسافرت" کی حالت میں بھی سرزمین ہند کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے، انھوں نے اس کا خیال کبھی نہیں کیا کہ بجائے عرب کے اپنا مرکزی تعلق بھی ہم ہندوستان ہی سے قائم کرلیں۔ اپنی اسی وصیت میں شرت کے ساتھ اصراراً لکھتے ہیں۔

مانا لابدست کہ بحرمین محترمین رویم و روئے خود را برآں آستانہا مالیم۔	ہم مسلمانوں کے لئے ناگزیر ہے کہ حرمین محترمین ہم جایا کریں اور اپنے چہروں کو اُن آستانوں پر جا کر ملا کریں،

اور آخر میں دوٹوک قطعی فیصلہ کی صورت میں ارقام فرماتے ہوئے نظریۂ وطنیت' کی جو واقعی جڑ ہے اس پر تبر لگاتے ہیں۔

سعادت ما این ست و شقاوت ما در اعراض ازیں	ہماری سعادت اور کامیابی اسی میں ہے اور ہماری بدبختی و شقاوت اس مسلک سے روگردانی اور اعراض کرنے میں ہے

کس قدر عجیب بات ہے آج "ہندی قومیت" "انڈین نیشنلٹی" کی راہ کا جو سب سے بڑا کانٹا خیال کیا جاتا ہے کہ مسلمان جسم کو اپنے تو رکھتے ہیں ہندوستان میں لیکن دل اُن کا رہتا ہے مکہ اور مدینہ میں۔ کہا جاتا ہے اور علانیہ کہا جاتا ہے کہ جب تک یہ ڈوری کاٹ نہیں دی جائیگی اس ملک میں صحیح وطنیت" کا جذبہ کبھی بار آور نہیں ہو سکتا اور یہی بات بھی ہے کہ وطن پرست ہی نہیں بلکہ ایک اچھے وطن دوست کے لئے بھی یہ بات دنیا کی نظر میں قابل تعجب ہو سکتی ہے اور ضرور ہو سکتی ہے کہ رہتا ہے وہ ہندوستان میں اور ہر تھوڑی دیر بعد وہ سر جھکاتا ہے اُس خطہ کی طرف، اُس ملک کی طرف اُس سمت کی طرف، اور اُس قبلہ کی طرف، جو ہزاروں میل دور سمندر پار

ایک ریگستان میں ہے" وطن پرستوں" کے نزدیک تو یہ طریقہ غلط اور اتنا غلط ہے کہ جہاں تک جلد ممکن ہو اس کا خاتمہ کر دینا چاہیئے لیکن وطن دوستوں کے ایک حلقہ میں بھی اس کی لاحاصل کوشش جاری ہے کہ دونوں نظریوں میں تطبیق دی جائے اور" مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِي جَوْفِهِ" کے قدرتی قانون کو توڑ کر چاہا جاتا ہے کہ ایک ہی آدمی کے سینے میں دو دل بنا دیے جائیں ۔۔۔ ایک اللہ والے آخر کسی دوسرے اللہ کا اضافہ اپنے معبودوں مطلوبوں مقصودوں میں کیونکر کریں۔

بہرحال جس کی جو سمجھ میں آ رہا ہے کر رہا ہے اور ذاتی طور پر میں ان خیالات میں سے کسی خیال کی ترجیح کی صلاحیت اپنے اندر نہیں پاتا۔ لیکن حضرت شاہ صاحب کا خیال یہی تھا کہ مسلمانوں کی ساری سعادت اسی میں ہے کہ وہ ابنائے حرم کی زمین پاک ہی کو بنائے رکھیں، اور ان کی پوری بدبختی یہی ہے کہ کسی حیثیت سے بھی وہ ان دونوں مقدس مقاموں سے الگ ہو جائیں۔

حجازی تہذیب اور مسلمانوں کے امتیازی طریقہ زندگی کے بارہ میں شاہ صاحب کا تشدد

اور صرف یہی نہیں بلکہ اپنی مختلف کتابوں کے مختلف مقاموں پر منجملہ چند کلی امور کے شاہ صاحب جس پر بالکل بے اختیار ہو کر بھر جاتے ہیں وہ یہ ہے، کہ مسلمان خواہ کسی ملک میں اپنی ابتلائی زندگی گزاریں لیکن بہرحال اپنی وضع قطع اور طرز بود و ماند میں اُن کو اس ملک کے مقامی باشندوں سے قطعاً جدا رہنا چاہیئے۔ اور جہاں کہیں رہیں اپنی عربی شان اور عربی رجحانات ہی میں ڈوبے رہیں، اسی وصیت میں فرماتے ہیں، اور اپنے اس خیال کی توجیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

عربیت نسب، عربیت لسان، ہر دو فخر ماست کہ ما را بسید الاولین والآخرین و افضل انبیاء و مرسلین و فخر موجودات علیہ و علی آلہ الصلوٰۃ و التسلیمات نزدیک می گردانند۔

عربی نسل عربی زبان، یہ دونوں چیزیں ہمارے لئے فخر ہیں کہ انھیں دونوں نسبتوں سے ہم سید الاولین والآخرین افضل الانبیاء والمرسلین علیہ افضل الصلوٰت والتسلیمات سے نزدیک رہتے ہیں۔

پھر اس کے بعد اور صراحت کرتے ہیں کہ

شکر نعمت عظمیٰ ایں ست کہ بقدر امکان عادات و رسوم عرب اول کہ منشاء آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم است از دست ندہیم

اس سب سے بڑی نعمت کا شکر یہی ہے کہ حتی الوسع عرب اول کے عادات و رسوم جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء ہے اس کو ہم اپنے ہاتھوں سے نہ چھوڑیں۔

شاید ہمارے ہی بعض حلقوں میں قیامت کا شور برپا ہو جائے گا اور ڈھنڈورا پیٹا جائیگا جب ان کو سنایا جائیگا کہ یہی امام ولی اللہ جن کو ہندی نیشنلزم اور" قومی پالیسی" کے پہلے علمبردار لیڈر ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اپنی اسی وصیت میں آگے فرماتے ہیں کہ

رسوم عجم و عادات ہنود را در میان خود نگذاریم

عجم (غیر عربی اقوام) کی رسمیں اور ہندوؤں کی عادتوں کو چاہیئے کہ ہم اپنے اندر کسی طرح باقی نہ رکھیں،

اب للہ مجھے بتاؤ کہ جب شاہ صاحب ہی کا نام لے کر مسلمانوں کو لباس اور وضع قطع تک میں غیروں کے قدم بقدم چلنے کا مشورہ دیا جائے اور مجھے اس پر حیرت اور غصہ ہو تو کیا قصوروار میں ہی ہوں؟

انصاف! انصاف!! اے اہل انصاف! للہ انصاف!!!

اور اسی ایک جگہ نہیں "زی الاعاجم" (غیر عربی اقوام کے فیشن) کے متعلق "آپاک آپاک کی صدا شاہ صاحب نے اپنی کس کتاب میں نہیں لگائی ہے، آپ نے ایک مکتوب میں اس کا اندازہ کرکے کہ "وضع وقطع" یا "فیشن کی تبدیلی کا عارضہ پہلے کھاتے پیتوں اور ان ہی لوگوں کو پکڑتا ہے، جو تھوڑی بہت معاشی فراغبالی رکھتے ہوں جس کا شاہ صاحب کو تو فقط اندازہ ہوا تھا، اور ہم اپنی آنکھوں سے اس کا تماشا کر رہے ہیں، اگرچہ اس زمانہ میں "امیروں" کی حقیقت پر "تعلیم یافتگی" کی چادر اڑھا دی گئی ہے، اور جب ارباب ثروت و فراغت کا اب ذکر آتا ہے تو عموماً لوگوں کا ذہن پرانے جاگیرداروں، اور زمینداروں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، حالانکہ مدت ہوئی کم از کم مسلمانوں میں تو اس طبقہ کا گویا خاتمہ ہو چکا ہے، اور اب اُن کی جانشینی کا کام وہی لوگ انجام دے رہے ہیں جو کسی نہ کسی حیثیت سے موجودہ حکومت کے متوسلین میں ہیں، ان میں وہ سارے عوارض پیدا ہو چکے ہیں، جو عموماً امیروں اور امیرزادوں کے ساتھ خاص ہیں لیکن ایک لفظ "تعلیم یافتہ" بول کر خود وہی نہیں بلکہ دوسرے بھی ان کو امراء و اغنیاء کے زمرے سے باہر کر دیتے ہیں، اور اب جو کچھ امیروں کے متعلق سنا جاتا ہے سمجھتے ہیں اور غلط سمجھتے ہیں کہ اس کا نشانہ "تعلیم یافتوں" کا معاشی وسعت رکھنے والا گروہ نہیں ہے، بہرحال شاہ صاحب نے اس خط میں چند خاص طبقات سے مکتوب الیہ کو پرہیز کرنے کا حکم دیا ہے، اسی سلسلہ میں فرماتے ہیں:-

اہل عجم کے فیشن اختیار کرنے والوں سے شاہ صاحب کی بیزاری

فایاک ... وغنی طاغ یتکلف زی الاعاجم ویدخل فی مضاربۃ الجاجم (ص ۲۹)

(منقول از حیات ولی)

خبردار! آپ بچے رہنا اس تونگر امیر کی کرشن سے جو خواہ مخواہ غیروں (عجمیوں) کے فیشن کو زبردستی اختیار کرتا ہے، جو لوگ صحیح راہ سے منحرف ہیں ان سے برابری اور مقابلہ کے میدان میں گھسا پھرتا ہے۔

موجودہ اصطلاح کے "تعلیم یافتوں" اور پرانے محاورہ کے تونگروں امیروں میں یہ دونوں خصوصیات کتنے بہتر طریقے پر پائی جاتی ہیں، لیکن شاہ صاحب بیچاروں کو کیا معلوم تھا کہ آئندہ دنوں میں ارباب غنا و ثروت تو اپنی امارت و تونگری کی وجہ سے بہ تکلف زبردستی غیروں کی ریس کرینگے، لیکن جو غربت کی وجہ سے اس مرض سے محفوظ رہیں گے، ان کے سر اُن ہی کی امامت اور قیادت کے نام سے غیروں کے لباس اور معاشرت کے منڈھنے کی کوشش کی جائے گی۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

پھر شاہ صاحب نے ہندوستان کو کیوں نہیں چھوڑا

اس قصہ کو مختصر کرکے میں پھر اپنے اصل مضمون کی طرف متوجہ ہوتا ہوں یعنی بہرحال شاہ صاحب کے گزشتہ بیانات سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ ہندوستانی مسلمانوں کے ان مصائب کو دیکھتے ہوئے بھی، اور اس کا بھی اندازہ لگاتے ہوئے کہ زوال کی یہ حالت ابھی دور تک جائے گی،

شاہ صاحبؒ نے ہندوستان چھوڑنے کا ارادہ کبھی نہیں فرمایا اور نہ کسی کو اس کا مشورہ دیا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرنے والے کروڑوں مسلمانوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر محض اپنی تن آسانی کیلئے ملک سے باہر نکل جائیں۔ گویا

زاہد نداشت تابِ جمالِ پری رخاں　　کنجے گرفت و ترس خدا را بہانہ ساخت

درحقیقت کشمکش حیات سے کسی طرح پیچھا چھوٹ نہیں سکتا

حالانکہ جب زندگی ابتلائی کشمکشوں ہی کا نام ہے، اور جو بھی جہاں کہیں بھی جس حال میں ہے وہ

ع ـــ " زندگی ہے یا کوئی طوفاں ہے" ـــ کی پیچ میں مبتلا ہے۔

حتیٰ کہ ایک ملک ایک مذہب، ایک رنگ، ایک معاشرت، رکھنے والا یورپ آج جن قیامت خیز مصیبتوں کا شکار ہے اس سے زیادہ کا تو شاید تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور آج کیا کب ایک ایک صدی بھی باایں ہمہ اتحاد و اشتراک وتعلیم و تہذیب ورواداری اس ملک میں خون کی ندیاں نہیں بہی ہیں، سروں کو گردنوں سے نہیں اڑایا گیا ہے اپنے ہی ہم مذہبوں نے خود اپنے مذہب والوں کی عورتوں کو بیوہ اور بچوں کو یتیم نہیں کیا ہے، گھروں میں آگ نہیں لگائی ہے، مال و دولت کو تاخت و تاراج نہیں کیا ہے ـــ ہاں تو پھر "تم خیراً" کے یہ خیالی منصوبے بنانا کہ یہاں سے چھوڑ کر دوسری جگہ جب چلے جائینگے تو عافیت نصیب ہوگی، اور جس آسمان کے نیچے یہاں ہیں کسی دوسری زمین میں وہ آسمان بدل جائے گا خام خیالی نہیں تو کیا ہے؟ ـــ بلاشبہ بعض اوقات خاص حالات میں قومیں اس فعل پر بھی مجبور ہوئی ہیں، اور مجبوری ارادی نہیں بلکہ مجبوری ہی کی شکل میں آئی ہے، اس وقت اس پر عمل ناگزیر ہو جاتا ہے، اور ایسی حالت میں عمل نہ کرنے والے اپنے قومی و ملی خصوصیات کو کھو بیٹھے ہیں، لیکن ہر تھوڑی پریشانی کے بعد پیٹھ پھیر کر مورچہ چھوڑ دینا، اور اسی کو عقل و رائے کا حکم قرار دینا میرے خیال میں بزدلی ہی نہیں، بلکہ ان لاکھوں بلکہ کروڑوں بے کسوں، کمزوروں کے ساتھ غداری بھی ہے جنہیں دشمنوں کے پنجوں میں پھڑپھڑانے کے لئے چھوڑ دیا جائے، حتیٰ الوسع حالات کا مقابلہ کرنا چاہیئے، اور اپنے سے زیادہ ان بے وسیلہ غریب ہم قوموں کا خیال کرنا چاہیئے، جو اپنے اندر بھاگنے کی سکت بھی نہیں پاتے ـــــــ

میرا خیال ہے کہ شاہ صاحب نے اسی خیال سے ہندوستان کے چھوڑنے کا ارادہ نہیں فرمایا، اور اپنے کو اس حد تک راضی کر لیا کہ اگر خدانخواستہ اسیر ہونا عام اور تام دخل و قبضہ بھی ہو گیا تو اس وقت بھی ان کو یقین تھا جیسا کہ پہلے بھی یقین دلایا گیا ہے کہ "وہی نہیں جن پر ہم گرتے ہیں بلکہ وہ بھی جو ہم پہ گریں گے، ان کو جھکنا مجبور ہونا پڑیگا" اسلام کی ساری تاریخ بجائے پہلی صورت کے دوسری صورت کی شہادتیں اپنے اندر زیادہ تعداد میں رکھتی ہے عرب گرا چور ہوا، ایران گرا بسم ہو گیا، مصری ہم پر ٹوٹے انگوٹھا پڑا ترک جھپٹے، لیکن ہم ہی نے ان کو اپنے پیٹ میں لے لیا ـــ اور یہ بھی تو سوچنا چاہیئے کہ ہمارا نصب العین صرف خود ہی جینا نہیں ہے، بلکہ اسی کے ساتھ دوسروں کے جلانے کا کام بھی تو ہمارے سپرد ہے، اور بقول حضرت شاہ صاحب کے "ختم نبوت" کے اسباب میں

ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ پہلے تو شخصی انبیاء ؑ اٹھائے جاتے تھے، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ میں جب ایک امت ہی "اخرجت للناس" کی سند دے کر دنیا کے لئے اٹھائی گئی تو پھر اب فالتو نبوتوں کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے، قرآن مجید میں متعدد جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت اور نگرانی کو اس کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے کہ ہم بھی "شہداء علی الناس" (دنیا کے انسانوں) کے نگراں بنے رہیں) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عہدہ سے ہٹنے کے ساتھ ہی اپنے رسول کی شہادت و نگرانی سے ہم محروم ہو جاتے ہیں کیونکہ جس دن سے ہمارا رخ عام انسانوں سے ہٹ کر صرف اپنی جماعت تک محدود ہو گیا ہے، دن بدن ان نگرانیوں کی برکات سے ہم محروم ہوتے چلے جاتے ہیں جو النبی الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی کے لازمی نتائج ہیں۔

کیا کروں بات میں بات نکلتی چلی آتی ہے، قلم کو روکتا ہوں لیکن یہ خیال کر کے کہ پھر موقع ملے نہ ملے جو کچھ اپنے اندر ہے وہ دوسروں تک پہنچا دیا جائے، جذبات دبانے سے نہیں دبتے اور سلف کے حالات سننے یا سنانے کا مقصد بھی صرف سننا یا سنانا نہ ہونا چاہئے ماضی سے مستقبل کی تعمیر میں اگر کچھ مدد لی جا سکتی ہے تو پھر یہ کام کی بات ہے، ورنہ بجز ایک دلچسپ داستان کے وہ اور کیا ہے۔

ہندوستان میں قیام اور مستقبل کا کام

ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ ہندوستان ہی میں قیام کا ارادہ طے کرتے ہوئے شاہ صاحب نے یقیناً اپنے عمل کا کوئی پروگرام بنایا، اگرچہ تفصیل انھوں نے اپنے دستور العمل کے ضابطہ کو کسی جگہ قلم بند نہیں فرمایا ہے لیکن پھلوں سے بھی درختوں کی نوعیت کا پتہ چلایا گیا ہے، خود جس کا عمل اس کے منصوبے کی فہرست اگر ہمارے سامنے پیش کرتا ہو تو ہمیں اس کے سمجھنے اور پڑھنے سے انکار نہ کرنا چاہئے۔

بہرحال میں نے جہاں تک غور کیا ہے اور شاہ صاحب کی کتابوں کی کثرت مطالعہ نے جن نتائج تک مجھے پہنچایا ہے اس کا خلاصہ میرے الفاظ میں یہ ہو سکتا ہے کہ اپنے زمانہ کے مختلف فتنوں کو دیکھ دیکھ کر ان کے رونگٹے کھڑے ہو ہو جاتے تھے گویا ٹھیک "اطیب النغم" میں جو شاہ صاحب کا پہلا شعر ہے،

کان نجوما ومضت فی الغیاھب | عیون الافاعی اورؤس العقارب

(ترجمہ) تاریکیوں میں جو ستارے چمک رہے ہیں — مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناگوں کی آنکھیں ہیں یا بچھوؤں کے سر ہیں

وہ سماں ہندوستان میں ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا، انھوں نے اندازہ کر لیا تھا اور وہ نہ کرتے تو کون کر سکتا تھا کہ اب ع

بے رہو گے تم اس ملک میں میاں کبتک

بہ دیر یا بسویر رہی سہی نام نہاد اسلامی حکومت کے خاتمہ کا وقت قریب آ چکا ہے، ان کے سامنے سوال آتا ہوگا، کہ آخر ان کروڑوں مسلمانوں کا انجام کیا ہوگا، معاش کا کفیل تو خیر رزاق مطلق ہے جب تک جو جیتا ہے ذو القوۃ المتین بہرحال اس کا انتظام کسی نہ کسی شکل میں کر ہی دیا کرتا ہے اور یوں قناعت کی راہوں کو چھوڑ کر کوئی مینہ کوبی ہی پر مصر ہو تو آج انگلستان جو نہ صرف سیاسی قوتوں کے ذریعہ سے دنیا کے آباد ترین پیداوار دل کا تنہا خرمن ہے، بلکہ تجارت، صنعت، حرفت، قمار، ربوا الغرض مالی انتفاع کے ممکنہ وسائل کی کنجیاں ساری دوسری

زمین کی اسی کے ہاتھ میں ہیں اور کس انگلستان کا یہ حال ہو جو اپنے طول و عرض میں بنگال کے کسی متوسط درجہ کے ضلع سے بھی بہت زیادہ بڑا نہیں ہے، آبادی بمشکل صرف چار ساڑھے چار کروڑ تک پہنچی ہے، لیکن باایں ہمہ ان چار کروڑوں میں تقریباً دو کروڑ لیبررس اور مزدور "روٹی پیٹ پیٹ" کے شور سے آسمان تھرا رہا ہے —— آئے دن حکومت والوں پر پتھر پھینکے جاتے ہیں، کھڑکیاں توڑی جاتی ہیں، اور جو کچھ ہوتا رہتا ہے روزناموں کے تاروں میں اس کی خبریں چھپتی رہتی ہیں، بھلا جس ملک کو خود آزادی ہی حاصل نہیں ہے بلکہ بیسیوں ممالک واقالیم کی آزادیاں بھی اسی کی آزادی میں ہضم ہو چکی ہیں، سیاسۃً بھی تجارۃً بھی صنعۃً بھی حرفۃً بھی —— اور اس کے سوا ہر راہ سے ہر چیز ہر قوم کی اسی انگلستان کے باشندوں میں فنا ہو رہی ہے جب اس کا یہ حال ہو تو جن کا یہ خیال ہے کہ صرف غیروں سے آزاد ہو کر یا ہم آزاد ہو کر ہم ہتیس کروڑ انسانوں کی "آوازۂ شکم" کو قناعت کے ذریعہ سے نہیں، بلکہ حرص و آز کی بھٹیوں کو بھڑکا کر دبانے میں کامیاب ہوں گے ان کے اس خیال کو خواب و خیال کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ آج جو حضرات عوام کو اپنے جھنڈوں کے نیچے پیٹ بجا بجا کر بلا رہے ہیں اور دنیا کو یہ بتلا اور سمجھا رہے ہیں کہ انسان کے لئے سب سے مقدم اور اہم پیٹ کا مسئلہ ہے اور اعضاء انسانی میں عضو رئیس بس معدہ ہی ان کو فکر معقولؒ سے کام لینا چاہئے کہ جس راہ پر آدم کی اولاد کو وہ لئے جا رہے ہیں یہ ترکستان جا رہی ہے یا کعبہ پہنچائے گی۔

بہرحال میرے نزدیک شاہ صاحب کے سامنے مسلمانوں کے "شکم" کے غم سے زیادہ زندگی کے اس سوال اہم "کا" ہم" تھا، جس کے جواب کے بغیر اس دنیا کی ہر زندگی بے نتیجہ ہو کر رہ جاتی ہے یعنی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو انجام کی درستی کے لئے "آغاز" کا جو دستور خدا کی طرف سے پہنچایا تھا، شاہ صاحب دیکھ رہے تھے کہ مسلمانوں کو اس پیغام سے جو تعلق ہے ان فتنوں کی پہلی زد قدرۃً اسی تعلق پر پڑے گی، اب تک تو ہر مسلمان علاوہ موروثی مسلمان ہونے کے "علی دین ملوکہم" کے قانون کے تحت بھی مسلمان ہی رہنے میں فائدہ محسوس کرتا تھا بلکہ غیروں میں بھی کتنے ایسے تھے جو اپنے نامسلمان ہونے پر اس زمانہ میں پچھتاتے تھے، لیکن جب "ملوک" بدل جائیں گے اور "افسدوھا وجعلوا اعزۃ اھلہا اذلۃ وکذلک یفعلون"[1] کے مستمر قاعدہ کی بنیاد پر اس وقت اسلام سے وابستگی کا یہ ملوکی ذریعہ بھی باقی نہ رہے گا، سوال یہی تھا کہ پھر اسلام اور پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کے دامن مبارک کے ساتھ بندھے رہنے کی ہندوستان میں مسلمانوں کی کیا شکل ہوگی۔

شاہ صاحب کے زمانہ کے علماء و مشائخ کی کمزوریاں،

دوسری طرف وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ ہندوستان میں مذہب اسلام کی تعلیم و تعلم اور نشر و اشاعت کے جو ذمہ دار ہیں، ان کے دونوں طبقوں (یعنی مذہب کے ظاہری رسوم و عام عقائد کے محافظ جنھیں عموماً علماء کہتے ہیں اور مذہب کی واقعی روح اور اس کے باطنی مقاصد کے علم بردار جنھیں صوفیہ اور مشائخ کہتے ہیں،) دونوں گروہوں کا اس زمانہ تک پہنچتے پہنچتے عجیب حال ہو رہا تھا، شاہ صاحب کے جس پیغام کا ترجمہ

[1] قرآن کی آیت ہے ملکہ سبا نے کہا تھا کہ سلاطین جب کسی ملک میں داخل ہوتے ہیں تو اسکو بگاڑ دیتے ہیں اور ملک کے عزت والوں کو خوار و ذلیل کر دیتے ہیں

پہلے درج کر چکا ہوں اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس عہد کے علما کی کیا حالت تھی کہ ان کو مخاطب کر کے فرمایا تھا

اشتغلتم بعلوم الیونانیین وبالصرف والنحو والمعانی — تم یونانیوں کے علوم اور صرف ونحو ومعانی میں الجھے ہوئے ہو،

فقیہوں کی بے راہ روی اور بے بصیری

اور یہ تو عام علما کا حال تھا، خصوصیت کے ساتھ جنھیں علماء دین کا لقب حاصل تھا اور فلسفہ ومنطق سے وہ کارہ تھے جن کا نام فقہا تھا ان کی یہ کیفیت تھی کہ دین کے حقیقی سرچشموں قرآن وحدیث اور ائمہ مجتہدین اور ان کے تلامذہ کے اقوال تک سے بہت دور آگے نکل کر ہر وہ چیز جو فقہ کے نام سے کسی کتاب میں لکھی ہوئی ہوتی انکے نزدیک "وحی محکم" اور "نص قطعی" کا درجہ حاصل کئے ہوئے تھی، اپنی مشہور کتاب "انصاف" میں فقہاء عصر کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔

فالفقیه یومئذ هو الثرثار المتشدق الذی حفظ اقوال الفقهاء قویها وضعیفها من غیر تمییز وسردها بشقشقة شدقیه (۹۳)

اس زمانہ میں فقیہ اس شخص کا نام ہے جو باتونی ہو زور زور سے ایک جبڑے کو دوسرے جبڑے پر ٹپکتا ہو جو فقہا کے اقوال قوی ہوں، یا ضعیف سب کو یاد کر کے بغیر اس امتیاز کے کہ ان میں سے کس میں قوت ہے کس میں نہیں ہے وہ انھیں اپنے جبڑوں کے زور سے چلتا کرتا ہے

اسی گروہ کے متعلق دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ ان کی بے تمیزیوں کا یہ حال ہے کہ خود امام ابو حنیفہ اور ان کے تلامذہ اور بعد کے علماء کے اقوال تک میں فرق نہیں کر سکتے۔

ویزعم ان جمیع ما یوجد فی هذه الشروح الطویلة وکتب الفتاوی الضخمة فهو قول ابی حنیفة وصاحبیه ولا یفرق بین القول المخرج وبین ما هو قول فی الحقیقة ولا یحصل معنی قولهم علی تخریج الکرخی کذا وعلی تخریج الطحاوی کذا ولا یمیز بین قولهم جواب المسئلة علی قول ابی حنیفة کذا وعلی اصل ابی حنیفة کذا (۸۶)

(یعنی اس زمانہ کے فقیہوں کا) خیال یہ ہے کہ طویل وضخیم شرحوں اور فتاوی کی کتابوں میں جو مسائل پائے جاتے ہیں یہ سارے کے سارے امام ابو حنیفہ اور ان کے شاگردوں کے ہیں (یہ مسکین فقیہ) اس کی تمیز نہیں رکھتا کہ جو باتیں ائمہ کے اصول کی بنیاد پر ان کی طرف منسوب کی گئی ہیں ان میں، اور جو واقعی انکے اقوال ہیں ان میں کیا فرق ہے، وہ بیچارا فقہ کی اصطلاح بھی نہیں سمجھتا جو لکھتے ہیں کہ فلاں بات کرخی کی تخریج پر مبنی ہے، یا طحاوی کی تخریج سے اس کا تعلق ہے

اسی طرح یہ قول کہ ابو حنیفہ کے قول پر مسئلہ کا جواب یہ ہے اور ابو حنیفہ کی اصل پر جواب یہ ہے' ان دونوں قولوں میں انکو کوئی تمیز نہیں ہوتی اور یہ بیچارے ان میں کوئی فرق نہیں جانتے۔

اس قسم کی واقعی تنقیدوں سے ان کی کتابیں معمور ہیں، ماسوا اس کے ایک گروہ ان لوگوں کا بھی تھا جو

تعرضوا لطلب العلم لیتوصلوا الی اغراض الدنیا فاصبح الفقهاء بعد ما کانوا مطلوبین طالبین

طلب علم کے لئے اس لئے آمادہ ہوئے تاکہ علم کو اپنی عزت اور جاہ کے حاصل کرنیکا ذریعہ بنائیں نتیجہ اس کے بعد یہ ہوا

وبعد ان کانوا اعزۃ بالاعراض عن السلاطین اذلۃ بالاقبال علیہم (۸۱)

کر فقہا، جو پہلے عوام کے مطلوب تھے اب یہی عوام کے طالب ہوگئے اور سلاطین اور بادشاہوں کے دربار سے الگ رہنے کی وجہ سے جو معزز شمار کئے جاتے تھے، اب بادشاہوں کے آستانوں پر وہ جھک کر ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔

دین کے ان غاشیہ برداروں کو شاہ صاحب دیکھ رہے تھے، اور ان کا سینہ شق ہوا جاتا تھا" ملوکی" رابطہ کے ختم ہونے کے بعد مسلمانوں کو ان کے صحیح دین پر باقی رکھنے کی ایسوں سے کیا توقع ہوسکتی تھی، پھر کچھ یہی ان شتران ہی دنیا طلب علماء کے ہاتھوں اکبر کے دربار میں اسلام کا جو حشر ہو چکا تھا اس کا نقشہ بھی شاہ صاحب کے پیش نظر تھا۔

صوفیوں کی افسوسناک حالت

دوسری طرف صوفیہ اور مشائخ کی جو کیفیت تھی شاہ صاحب کے دردمند دل کے لئے وہ صرف اذیت اور دکھ ہی بنی ہوئی تھی، کیونکہ علماء سے زیادہ غریب مسلمانوں پر اس زمانہ میں خصوصاً ہندوستان میں ان ہی کا اثر غالب تھا، ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اگر مسلمان ان ہی کے ہاتھوں میں سپرد کر دیئے گئے تو یہ ان کو کہاں لے جا کر غرق کریں گے، اپنے وصیت نامہ میں لکھتے ہیں:۔

کرامات فروشاں ایں زماں ہمہ الا ماشاء اللہ طلسمات و نیرنجات را کرامات دانستہ اند

کرامتوں کے بیچنے والے اس زمانہ میں سب کے سب (بجز اس کے جسے خدا چاہے) اپنی طلسماتی کاروائیوں اور علم نیرنج کے نتائج کو کرامات سمجھے بیٹھے ہیں۔

پھر اس کی تفصیل کرنے کے بعد کہ آدمی طلسمی قوانین، اور علوم نیرنجات کے زور سے کس کس قسم کے "خوارق" دکھا سکتا ہے آخر میں فرماتے ہیں کہ

واعمال جوگ کہ بعضے ملاحظات جوگیہ را خاصیتے تمام است در اشراف وکشف

اور جوگ کی بعض تدبیریں، کیونکہ جوگیوں کی زندگی کے بعض پہلوؤں کو دوسرے کی حالت پر فی الجملہ اطلاع یا کشف وغیرہ سے خاص تعلق ہے۔

جن لوگوں نے شاہ صاحب کے متعلق خیال قائم کیا ہے کہ انھوں نے ہندوستان کے راہما در جوگیہ کے فلسفہ ویدانت اور فلسفہ یوگا کو اسلامی حقائق سے مخلوط کر کے ایک "جدید ہندی دین" کی بنیاد ڈالی ہے، کیا ان کی نگاہوں سے یہ اور اس قسم کی بیسیوں عبارتیں نہیں گزریں ہیں، شاہ صاحب نے صاف کھل کر لکھ دیا ہے کہ

بسیارے از سادہ لوحاں دیدہ ایم کہ چوں ایں اعمال از شیخے فرا گرفتہ اند آں را عین کرامات می دانند،

میں نے بہت سے سادہ لوحوں کو دیکھا ہے کہ کسی شیخ سے جب اس قسم کے عمل وغیرہ کو سیکھ چکتے ہیں، تو ان باتوں کو ٹھیک کرامت قرار دیتے ہیں،

لیکن واقعہ یہ ہے کہ

صلاح و فجور، مقبول بودن یا مردود بودن دریں جا ہیچ فرق پیدا نمی کند۔

نیکوکاری یا بدکاری اسی طرح مقبول ہونا یا مردود ہونا اس معاملہ میں اس اختلاف حال سے کوئی فرق نہیں پڑتا یعنی

ان روحانی درزشوں سے یہ نتائج ہر ایک میں پیدا ہوتے ہیں خواہ شقی ہو یا سعید

نود وانود کا فتنہ

خصوصًا جو زمانہ شاہ صاحب کا تھا طرح طرح کے طریقے، اور نئی نئی شکلوں میں تصوف پیش ہو رہا تھا آپ ہی کے عہد میں دلی کا وہ مشہور مردود معروف بہ "نود وانود" ایک خاص بھیس میں ان ہی طلسمی برزخی جوگیانی طریقوں کو سیکھ کر نمودار ہوا تھا جس نے ایک خاص زبان اور اس کے قواعد ایجاد کئے تھے، اور اپنے ایک ساتھی کو محرم اسرار بنا کر "آموزہ مقدسہ" نامی کتاب کے الہام کا دعویٰ کیا تھا مدعی تھا کہ نبوت اور وصیت کے درمیان ایک اور لاہوتی عہدہ ہے، جس کی تعبیر وہ "بیگوکت" کے لفظ سے کرتا تھا کہتا تھا کہ ہر اولو العزم پیغمبر کے ساتھ ہمیشہ نو بیگوک ہوا کئے ہیں اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی نو ہی بیگوک کا پایا جانا ضروری ہے پھر شیعوں کی جماعت میں تو یہ کہتا کہ بیگوک اول حضرت علی کرم اللہ وجہہ تھے، ان کے بعد آٹھ اماموں تک یعنی حضرت علی رضا علیہ السلام تک امامت اور بیگوکت کے عہدے ایک ہی ذات میں جمع ہوتے رہے ان کے بعد صرف امامت رہ گئی، اور نواں آخری بیگوک کا منصب مجھے حاصل ہوا ہے مجھ ہی پر یہ عہدہ ختم بھی ہوتا ہے اور سنیوں سے کہتا کہ چار بیگوک تو خلفاء راشدین تھے، اور باقی چار بیگوکوں کے لئے بنی امیہ اور عباسیہ کے بعض ایسے خلفا کا نام لیتا، جو گونہ نیکی اور دینی حیثیت میں امتیاز رکھتے تھے اور نواں بیگوک اپنے کو ٹھیراتا، اس نے عوام کو فریب دینے کے لئے اپنے مریدوں، اور لڑکوں لڑکیوں کے خاص خاص مجہول المعنیٰ نام رکھتے تھے، مثلاً وہی محرم اسرار جو گویا اس کا خلیفہ تھا اس کا نام دوجی یاڑ تھا نما نود فغار نمود یہ اس کے لڑکوں کے اور رنما کلاں نما خورد" لڑکیوں کے نام تھے، مریدوں کو "فربود" کہتا تھا، اس نے پنجوقتہ نمازوں کے سوا "وید" نامی عبادت کا طریقہ جاری کیا تھا، جو طلوع وغروب واستواء شمس کے وقت ایک خاص طریقہ سے ادا کی جاتی تھی علاوہ اسلامی عیدوں کے چند مزید تہواروں کا اضافہ کیا تھا، یعنی جن دنوں میں (العیاذ باللہ) "وحی" کی اس پر ابتدا ہوئی۔

ملعون مدعی تھا کہ اس پر بھی وحی دو طریقوں سے آتی ہے، ایک میں آفتابی قرص اس کے سامنے نمودار ہوتا ہے اور اسی پر حروف لکھے ہوتے نظر آتے ہیں، اور دوسری میں آواز آتی ہے، الغرض خرافات کا ایک سیلاب تھا جو تیرہ درون نے مل کر بہا یا تھا، چونکہ بعض امرا بھی اس کے معتقد ہو گئے تھے، اس لئے عوام کا میلان بھی اس کی طرف بتدریج بڑھتا جا تا تھا حتیٰ کہ فرخ سیر بادشاہ بھی اس کی استجابت دعاء کی شہرت سُن کر تنہائی میں ملاز مکار نے یہ سُن کر کہ بادشاہ ملنے آرہا ہے کمرہ کا دروازہ بند کر دیا، ہزار منت وساجت کے بعد جب دروازہ کھلا، تو بادشاہ کے سامنے اسا مرگ چھالے کو پھینک کر جس پر خود بیٹھا ہوا تھا بولا

پوست تخت گدائی وشاہی	ہمہ داریم انچہ می خواہی

بادشاہ اپنے ساتھ روپیوں اور اشرفیوں کی تھیلیاں نذر کے لئے لے گیا تھا، ٹھوکر مار کر کنارہ کر دی جب فرخ سیر نے بہت اصرار کیا، تو خود نوشتہ قرآن دے کر اس کی اجرت کل سترہ روپیہ اس نے قبول کی، بادشاہ پر اس کی مصنوعی بے نیازی واستغنا کا پورا اثر ہوا نتیجہ یہ ہوا کہ اب تک تو کچھ علما اور عام پبلک کے خوف سے اپنے مزخرفات

کے علانیہ اظہار کی اسے جرأت نہ ہوتی تھی، لیکن بادشاہ کی عقیدت مندی کے بعد خوب کھل کھیلا، ایک خاص قسم کی لمبی ٹوپی سر پر رکھے آگے آگے، وجھنڈوں کے ساتھ اس کے "زبود" اس کی سواری نکالتے تھے، باہم ایک دوسرے پر عبیر و گلاب چھڑکتے جاتے اور یہی مجہول المعنی اختراعی الفاظ والے منتر جپتے جاتے تھے اور اب ان کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ دلی کی ایک بڑی مخلوق اس کی معتقد اور اس کی اصطلاح میں اس کی "زبود" ہو گئی تھی۔ فرخ سیر کے عہد تک اس کا یہی حال رہا۔ محمد شاہ کے زمانہ میں جب محمد امین خاں[1] منصب وزارت سے سرفراز ہوئے تو منجملہ اور کاموں کے اس "نمود با نمود" کی بھی خبر لینی چاہی لیکن اتفاق دیکھئے جیسا کہ طباطبائی نے لکھا ہے ٹھیک ان ہی دنوں میں جب اس کی گرفتاری کے احکام جاری ہوئے۔ امین خاں جو مرض قولنج میں پہلے ہی سے مبتلا تھے انتقال کر گئے، مردود "نامنود" کے لئے ان کی موت استدراج کا ذریعہ بن گئی، اب کیا تھا، خوب لن ترانیوں کی لینے لگا۔ اگرچہ دو تین سال بعد خود بھی مرگیا اور اسی کے بعد اس کے خلیفہ اول "دوجی یار" اور صاحبزادے بلند اقبال "نامنود" میں نصف بی و نصف لک کے قصہ میں جھگڑا ہو گیا۔ دوجی یار نے آخر ایک دن جب اس کے اکثر "زبودوں" کا مجمع تھا، کھڑے ہو کر "سازش" کا سارا قصہ سنا دیا، دونوں ملکر جو مسودات بناتے اور کاٹ پیٹ کر درست کرتے تھے ان کا طومار لوگوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اگر

از جانب خدا می بود حاجت بحک و اصلاح ہمدیگر نداشت . سیر المتاخرین ج ۲ ص ۴۴۶

اگر اللہ میاں کی طرف سے یہ کتاب ہوتی تو اس میں کانٹ چھانٹ اور اصلاح کی ضرورت نہ ہوتی۔

دونوں کے حروف کے پہچاننے والے کثرت سے موجود تھے، راز کھل گیا اور بیچارے عوام کو اس کے فتنہ سے نجات میسر آئی۔ اگرچہ "نامنود" نے کچھ دن اپنے باپ کی بیگو گت کو بجائے دہلی کے ایک دیہات میں جا کر چلایا اور "نیلا نمود" کے بعد "نغار" صاحب دوسرے بیٹے نے بھی کچھ دن اس تحریک کو چند لوگوں میں باقی رکھا، یہاں تک کہ بالآخر "نغار" کے مرنے کے بعد چند بقیۃ السیف اس کے اعزہ بنگال میں پناہ گزیں ہوئے اور مشہور اشقی القوم میر جعفر کے بیٹے میرن کی سرپرستی میں کچھ دن گزارے۔ خدا جانے ان منحوسوں کے نام لیوا اب بھی بنگال میں پائے جاتے ہیں یا نہیں، تاہم ایک مدت تک خصوصاً اس زمانہ میں جس میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ دلی میں تھے، ہندوستان کے مسلمان اس خبیث فتنہ کے شکار ہو رہے تھے، اور واقعہ کچھ بھی نہ تھا، عالمگیر کے عہد میں کابل کا صوبہ دار امیر خاں تھا، اس کے یہاں ایران سے یہی "نمود و انمود" جس کا اصلی نام محمد حسین تھا آیا[2] اور سید ہونے کا مدعی ہوا، امیر خاں کی بیوی جو لاولد تھی اس نے ایک لڑکی پال رکھی تھی اسی سے اس کا نکاح ہو گیا امیری سے گزرنے لگی، امیر خاں جب مر گیا، تو محمد حسین جو امیر خاں کے خوشبو خانہ کا داروغہ بھی تھا، عطر و گلاب کا تحفہ لیکر دلی چلا لاہور میں عالمگیر کی وفات اور خانہ جنگی کی خبر ملی امراء کے ہاتھ اسی عطر و گلاب کو بیچکر اس نے سا لھ ستر ہزار روپئے کھرے کئے اور اسی "دوجی یار" سے سازش کر کے کر و فریب کا یہ طلسم کھڑا کیا تھا

[1] حضرت آصف جاہ اول بانی سلطنت آصفیہ کے عم زاد بھائی تھے ان کے قصے آگے بھی آرہے ہیں ۱۲

[2] میں نے اس مردود "نمود و انمود" کے حالات میں ذرا زیادہ بسط سے قصداً کام لیا ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ اس زمانہ میں بھی بعض لوگ اپنے مریدوں اور عزیزوں کو جو عجیب غریب خطابات تقسیم فرماتے ہیں، یا نبوت و مسیحیت، مہدویت وغیرہ کے معجون سے بروزی "مثالی" اور خدا جانے کس کس قسم کی جو تیر تراش رہے ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہندوستان ان تماشوں کو پہلے بھی دیکھ چکا ہے ۱۲ منہ

مسلمانوں کی یہ زہر اعتقادیاں، جو غلط تصوف کے رواج کا نتیجہ تھیں، حتیٰ کہ بادشاہ تک ان ہی اوہام میں مبتلا تھا، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک صاحب بصیرت روح کے لئے کس درجہ سوہان روح بنی ہوئی ہوں گی۔

اور بات کچھ اسی پر ختم نہیں ہو گئی تھی، یہ تو ایک فرقہ تھا، اور بھی اس قسم کے مختلف فرقے مختلف ناموں سے تصوف و عرفان کے بلند آہنگ دعووں کے ساتھ پیدا ہو رہے تھے، اور مختلف قسم کے شعبدوں اور کرشموں سے عوام کو اپنی طرف مائل کر کے گمراہ کر رہے تھے، شاہ صاحب خود اپنا ذاتی تجربہ بیان فرماتے ہیں۔

نجوم کے شعبدے اور کہانت کے کرشمے

ما تجربہ کردہ ایم کہ ماہر در فن نجوم چوں دانست کہ الحال کدام دقیقہ است از دقائق روز از یں جا ذہن او منتقل می شود بطالع: ہمہ بیوت و مواضع کواکب در خاطر حصول صورت می بندد گویا صفحہ تسویۃ البیوت، مقابل او استادہ است: ہم چنیں ماہر در فن رمل گاہے در دل خود معین می کند کہ فلاں انگشت را لحیان قرار دادہ ام و فلاں انگشت را فلاں شکل در ذہن صورت می بندد از یں اشکال کدام متولد می شود، تا ایں کہ زائچہ پیش او حاضر می شود۔

میں نے خود تجربہ کیا ہے کہ نجوم کے فن میں جن لوگوں کو مہارت ہوتی ہے، جب انھیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اس وقت دن کے دقیقوں میں سے کون دقیقہ ہے تو مطالع اور ہر ہر برج و مقامات کواکب کی طرف اس کا ذہن منتقل ہو جاتا ہے اور یہی حال ان لوگوں کا ہے جو فن رمل کا ماہر ہوتے ہیں اپنے دل میں یہ خیال جاتے ہیں کہ فلاں انگلی کو میں نے لحیان قرار دیا ہے، اور فلانی انگلی فلاں شکل اور ان سب کے ذہن میں ایک صورت قائم کر کے سوچتے ہیں کہ ان میں ظاہری شکل صورت میں بچہ کس کے مناسب ہوگا اس طرح زائچہ سامنے ہو جاتا ہے۔

اور یہ نجوم کا حال ہے شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ کہانت جس کی بہت سی قسمیں ہیں، جن میں کبھی جن اور ارواح کو حاضر کیا جاتا ہے (یعنی موجودہ زمانہ کا اسپریچولزم) نیز توجہ کو کسی خاص نقطہ پر مرکوز کر کے معمول کو متاثر کرنا جسے مسمرزم کہتے ہیں، شاہ صاحب لکھتے ہیں۔

ہمت بستن بر کارے و بشکل مہیب بر آمدن در دل میر دل کسے داشتن و طالب را مسخر کردن ہمہ از فنون نیرنج است۔ (وصیت نامہ مذکورہ)

کسی کام کے متعلق ہمت کو قوی کرنا اور ڈراؤنی شکل میں لوگوں کے سامنے اپنے کو نمایاں کرنا کسی کے دل پر دل رکھنا اور طالب کو مسخر کرنا یہ ساری باتیں علم نیرنگ سے تعلق رکھتی ہیں

لیکن غلط تصوف نے عوام کو یاور کرا یا تھا کہ یہ ساری باتیں قرب الٰہی کے دلائل ہیں۔

اس زمانہ کا "ہیپناٹزم" جس میں اپنے اوپر وجد کی حالت طاری کر کے غیبی باتیں بتائی جاتی ہیں کچھ لوگ اس راہ سے بھی شکار پھنسا رہے تھے، حضرت شاہ صاحب ہی کا بیان ہے:-

ہم چنیں توجد و شوق و قلق در سرایت ایں حالت در حاضراں۔

اسی طرح وجد، شوق و بےچینی اور جو لوگ موجود ہوں ان میں اس حال کا ساری و طاری ہو جانا۔

حالانکہ اس حال کو بھی مقبولیت حق سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ بقول حضرت

منشاء آں حدت قوت بہیمیہ است	اس کا منشا بہیمی قوت کی شدت اور تیزی ہے

اور یہ تو زندہ پیروں کی کرامات شمار ہوتے تھے، وہمی تخیلات نے گزشتہ روحوں کے متعلق عجیب و غریب خیالات پیدا کر دیئے تھے، فاتحہ جو عموماً اس لئے کیا جاتا تھا کہ بزرگوں کی روح کو کچھ قرآن پڑھ کر اور غربا و مساکین کو کھلا کر اس کا ثواب بخشا جائے، لیکن سرزمین ہند میں اس فاتحہ نے بتدریج ایصال ثواب کے مقصد کو چھوڑتے ہوئے، قریب قریب وہی شکل اختیار کر لی تھی، جو ہندوؤں میں چڑھاوے کی ہے، یعنی مختلف قسم کے پھل پھول پکوان وغیرہ دیوتاؤں اور دیویوں پر اس لئے چڑھائے جاتے ہیں کہ ان دیوتاؤں کی روحیں چڑھانے والوں کے اس تحفہ سے خود متمتع اور لذت گیر ہوتی ہیں، جاہل مسلمانوں میں اس فاتحہ کا بھی قریب قریب یہی مطلب ہو گیا تھا، اور عوام ہی کیا بعض خواص تک کا خیال یہ تھا کہ جو کھانا کسی بزرگ کے نام فاتحہ دیا جاتا ہے، اس پر اس بزرگ کی روح خود حاضر ہوتی، اور اس سے لذت گیر ہوتی ہے، مولوی غلام حسین طباطبائی جنہوں نے سیر المتاخرین جیسی کتاب لکھی ہے، اور جو ان کے علم و فضل کی کھلی دلیل ہے خود اپنے متعلق ایک موقعہ پر اسی کتاب میں لکھتے ہیں، کہ

بعضے مردم کہ دسترخوان حضرت شاہ مرداں می نمائند بر آں نشانے از غیب می شود، چنانچہ در ہند معمولی دیگر مردم ہوشیار بچشم خود نشانہا دیدہ سرمہ اعتقاد و بصیرت در دیدہ دل کشیدہ اند و ایں کرامت ازاں جناب بنظر احقر ہم الحمد للہ مکرر در آمدہ ص ۳۲۵ ج ۲	بعض لوگ جو حضرت شاہ مرداں (یعنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ) کے دسترخوان کی تقریب کرتے ہیں، اور اس دسترخوان پر غیب سے آپ ہی آپ ایک نشان نمایاں ہو جاتا ہے، چنانچہ ہندوستان میں اس کا رواج ہے اور بڑے اچھے ہوش گوش والوں نے بار بار اپنی آنکھوں سے

ان نشانوں کو دیکھا اور اپنی آنکھوں میں اعتقاد و بصیرت کا سرمہ لگایا بلکہ (دسترخوان والی کرامت حضرت کی) اس کا معائنہ تو الحمد للہ متعدد بار اس احقر کو بھی ہوا ہے۔

جس کے معنے بجز اس کے اور کیا ہو سکتے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے نام سے جو فاتحہ دیجاتی تھی اس کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ فاتحہ کے اس کھانے پر خود حضرت تشریف فرما ہوتے ہیں اور اسی لئے "قبولیت" کی علامت اس پر بنا دیتے ہیں، بتایا جائے کہ کہاں فاتحہ کا وہ مقصد کہ بزرگوں کی روح کو اس کا ثواب بخشا جاتا ہے اور کہاں یہ اعتقاد کہ اس کھانے پر ان بزرگوں کی روح خود حاضر ہوتی ہے، یہ نشانات کس طرح بنتے تھے، اس سے خدا ہی واقف ہے، لیکن طباطبائی صاحب ہی نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک شخص نے جو ان کے نزدیک خارجی العقیدہ تھا شیعوں کے علی الرغم ان غیبی نشانوں کی خبر سن کر دعویٰ کیا کہ ہم بھی یزید وغیرہ کے نام کا فاتحہ دیتے ہیں، اور اسی قسم کے دسترخوان کا انتظام کرتے ہیں چونکہ ان کی روحوں سے مجھے اخلاص ہے اس لئے وہ بھی ضرور آکر دسترخوان پر نشان بنائیں گے یہ ارادہ کر کے اس نے دسترخوان کا انتظام کیا، اور ایک عورت کو حکم دیا کہ کمرہ میں دسترخوان کو بند کر کے باہر اس کی کنجی لے کر بیٹھ جائے تھوڑی دیر بعد دروازہ کھولے اور جب نشانات دسترخوان پر نمایاں ہوں تو مجھے خبر دے تاکہ دوسروں کو بھی اس کا تماشا دکھایا جائے۔

اب طباطبائی صاحب لکھتے ہیں کہ

زن در باطن شیعہ بود و مذہب خود مخفی داشت بعد از ساعتے حسب الامر در را کشود دید کہ سگے سیاہ گرگیں دراں جائیگاہ بر سر دستر خوان نشستہ از ہر گونہ طعام اندک اندک چشیدہ و می چشد از شدت شغف خودداری نتوانست بے اختیار دوید و بشارت رسانید کہ زنہار چہ معنی دارد خود تشریف آوردہ نوش جان می نمایند۔

وہ عورت اندر سے شیعہ مذہب اور تقیہ کئے ہوئے تھی تھوڑی دیر بعد اس نے جب دروازہ کھولا تو کیا دیکھتی ہے کہ ایک کالا کھجلی والا کتا وہاں پر دسترخوان پر ہر قسم کے کھانے کو تھوڑا تھوڑا چکھ چکا اور چکھ رہا ہے عورت کو اپنے مذہب سے جو محبت تھی اس نے اپنی خودداری پر اس کو باقی نہ رکھا اور بے اختیار ہو کر دوڑی امیر کو اس نے بشارت پہنچائی کہ نشان کا کیا پوچھتے ہیں وہ تو خود ہی تشریف لا کر نوش جان فرما رہے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ حرکت "زن در باطن شیعہ بود" ہی کی تھی، بس اسی واقعہ سے ان نشانوں کے بتانے والوں کا سراغ مل سکتا ہے، آج بھی ہندوؤں میں جب مُردے گنگا میں بہانے کے لئے بھیجے جاتے ہیں تو ان کے بہنے کے بعد دوسرے دن عموماً پنڈت یہ اعلان کرتے ہیں کہ جس گھاٹ سے مُردہ بہایا گیا اس کے کنارے کی ریت پر فلاں جانور کے پاؤں کے نشانات دیکھے گئے، اور اسی سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ مرنے والے نے اسی جانور کے چولے میں جنم لیا جس کے نشانات نظر آئے ہیں، مجھ سے بعض معتبر برہمنوں نے بیان کیا کہ یہ کارستانی خود ان پنڈتوں کی ہوتی ہے کہ جو گنگا کے کنارے مردوں کے بہانے کی رسم انجام دیتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ اس کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا ہے یا ممکن ہے کہ رات کو ہر قسم کے جانور چلتے ہیں ان ہی کو مُردے کے قدم کا نشان فرض کر لیا جاتا ہے یا وہم کی خلاقی ہو، بہرحال طباطبائی صاحب نے "کتے" کا جو واقعہ نقل کیا ہے اور یہ کہ ہر قسم کے کھانوں کو "اندک اندک" اسے چکھتے پایا گیا، اس سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ صاحب فاتحہ کے متعلق لوگوں کا عام خیال یہی تھا کہ تھوڑا تھوڑا ہر کھانے سے مردہ کی روح چکھتی ہے، گو بحمد اللہ اب بہت کم لوگ فاتحہ کے متعلق یہ خیال رکھتے ہیں اور عموماً اب یہی سمجھا جاتا ہے کہ مقصود بزرگوں کی روح کو ثواب پہنچانا ہے، لیکن بعض لوگ اب بھی ایسے ہیں جنہوں نے مجھ سے خود کہا کہ "کھانے کی روح کو بزرگوں کی روح آکر کھا جاتی ہے، اور اس کے مادی وجود کو ہم لوگ کھاتے ہیں، اسی بنیاد پر ہم اس کھانے کو بزرگوں کا اُلش خیال کرتے ہیں"، الغرض غلط تصوف اور جھوٹے "تشیع" کی راہوں سے اعتقادی و عملی تباہیوں کا سیلاب مختلف شکلوں میں ملک کے مختلف گوشوں میں مسلمانوں کی خالص اسلامی و دینی زندگی کے "ایوان" کو دھمکیاں دے رہا تھا۔

ام الفتن یعنی خانہ جنگی

اور سچ پوچھئے تو باہر کے فتنوں کے جگانے میں در اصل جو حقیقی اسباب کام کر رہے تھے ان کا باہر سے نہیں بلکہ بالکلیہ تعلق ہمارے "اندر" ہی سے تھا، کچھ آج ہی نہیں بلکہ جب کبھی جہاں کہیں یہ صورت پیش آئی ہے تحلیل و تجزیہ کے بعد یہی ثابت ہوا کہ جو کچھ ہوا ۔

ماظلمناھم ولکن کانوا انفسھم یظلمون		نہیں ظلم کیا ہم نے بلکہ وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے

کہ ازلی قانون ہی کی تحت ہوا خصوصاً امت محمدیہ صلی اللہ علی صاحبہا صلوٰۃً وسلاماً کے متعلق تو صحیح حدیثوں میں آ چکا تھا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بارگاہِ الٰہی میں درخواست پیش کی

لا تسلط علیہم عدواً من انفسہم

(میری امت پر) ان ہی میں سے ان پر کوئی دشمن نہ مسلط کیا جائے۔

تو الحکیم الغنی کی طرف سے آپ کو جواب ملا،

لا اسلط علیہم عدواً سوی انفسہم فیستبیح بیضتہم ولو اجتمع علیہم من باقطارہا حتی یکون بعضہم یہلک بعضہا۔

میں ان پر ان کے سوا کسی (بیرونی دشمن) کو مسلط نہیں کروں گا بلکہ یہی اندرونی دشمن ان کے قلمرو میں تباہی پھیلائیگا اور خارجی دشمن مسلمانوں پر مسلط نہیں ہو سکتے اگرچہ زمین کے کناروں سے سمٹ کر کیوں نہ وہ آ جائیں بلکہ مسلمان ہی باہم بعض بعض کو ہلاک کریں گے۔

صحاح کی مختلف کتابوں مثلاً مسلم ابوداؤد و ترمذی میں الفاظ کی کچھ کمی بیشی کے ساتھ یہ حدیث موجود ہے اور اسلام کی تاریخ شاہد ہے جو مصیبت مسلمانوں پر جس شکل میں بھی آئی دراصل اس کی ابتدا گھر والوں سے ہوئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اکثر فرمایا کرتے،

اخشی علیکم الدنیا فتنافسوا فیہا (بخاری)

میں تم پر دنیا سے ڈرتا ہوں کہ اس کے معاملہ میں باہم نفسانیت میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس جب فارس کے اموال غنیمت آئے آپ نے ان کو مسجد نبوی کے چبوتروں پر ڈلوا دیا، صبح ہوئی تو جو کچھ آیا تھا اس پر سے چادر ہٹائی گئی، راوی کا بیان ہے۔

فنظر عمر الی شیء لم تر عیناہ مثلہ من الجوہر واللؤلؤ والذہب والفضۃ فبکی۔

عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایسی چیزیں دیکھیں جنھیں انکی آنکھوں نے نہیں دیکھا تھا۔ یعنی جواہرات، موتی اور سونے چاندی وغیرہ پس عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رو پڑے

عبدالرحمن بن عوف حاضر تھے بولے:۔

ہذا من مواقف الشکر فما یبکیک

یہ تو شکر کی جگہ ہے پھر آپ کو کس خیال نے رُلایا،

فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب میں فرمایا:۔

اجل ولکن اللہ لم یعط قوماً ہذا الا القی بینہم العداوۃ والبغضاء (کتاب الخراج لابی یوسف)

ہاں! لیکن اللہ تعالیٰ نے کسی قوم کو یہ چیز نہیں دی، مگر اسی کے ساتھ ان میں باہم عداوت وبغض وکینہ پیدا ہو گیا۔

مغل حکومت بھی عہد عالمگیری کے بعد فتنوں کے جس طوفان میں گھر گئی تھی جس کا ایک اجمالی نقشہ آپ کے سامنے پیش کیا گیا، جاننے والے جانتے ہیں کہ باہر سے جتنے سیلاب آئے ان کا سرچشمہ بھی اندر ہی تھا جس کا افسانہ طویل ہے اور عام طور سے تاریخ کی کتابوں میں مسطور ہے، میرا اشارہ اس اندرونی فتنہ کی طرف ہے جس کی تعبیر عام کتابوں میں

"سادات بارہ"[۱] کے فتنہ سے کی جاتی ہے۔

سادات بارہ کا فتنہ

عالمگیر کے لڑکے بہادر شاہ کے انتقال کے بعد معز الدین جہاندار شاہ اور فرخ سیر میں جنگ ہوئی، اس معرکہ میں فرخ سیر کی کامیابی چونکہ بالکلیہ بارہ کے سیدوں میں سے دو بھائی حسین علی خاں اور حسن علی خاں کی رہین منت تھی، اسی بنیاد پر فرخ سیر کے عہد میں حکومت پر ان ہی دونوں بھائیوں کا اقتدار قائم ہوگیا اور ایسا اقتدار کہ بادشاہ بیچارہ "شاہ شطرنج" ہو کر رہ گیا، قدرتاً فرخ سیر کے لئے یہ صورت حال ناقابل برداشت بنتی چلی جارہی تھی، سید بھائیوں اور فرخ سیر میں ان بن ہوگئی اور اسی مخالفت اور معاندت نے بالآخر ان نتائج کو پیدا کیا جن کا خمیازہ آج ہندوستان کے مسلمان بھگت رہے ہیں، طباطبائی جو ہم مشربی کی وجہ سے بجائے فرخ سیر کے سید بھائیوں کے سخت ترین طرفداروں میں ہیں، ان کو بھی لکھنا پڑا کہ یہی فسادات سادات۔

بلکہ در تمام مملکت ہندوستان فرو گرفتہ اقتدار سلاطین تموریہ بالمرہ بباد فنا رفت (ج ۲)	آہستہ آہستہ ہندوستان کی ساری مملکت کا اس نے احاطہ کرلیا، اور تیموری سلاطین کا اقتدار قطعی طور سے فنا کی آندھی کے نذر ہوگیا۔

اس فتنہ کی اصل جڑ شیعہ سنی اختلاف تھا

اگرچہ بظاہر یہ مخالفت بادشاہ اور ان سید برادران کے درمیان تھی لیکن جو واقعات کے عالم ہیں وہ جانتے ہیں کہ "سادات بارہ" کے اقتدار نے در اصل اسی فتنہ کی آگ کو ہوا دیکر تیز کردیا جس کی ابتدا ہمایوں کے عہد سے اس ملک میں شروع ہوئی تھی، — سب جانتے ہیں کہ یہاں اسلام کا داخلہ (عربی حملوں کے بعد) ترکستانی مسلمانوں کے ذریعہ سے ہوا۔

اور یہ عجب اتفاق ہے کہ غوریوں سے لودیوں تک جتنے خانوادے دلی کے تخت پر قابض ہوئے سب کے سب سنی حنفی مسلمان تھے، جب تک یہ دور رہا ہندوستانی مسلمان اس وقت تک بڑے خوش قسمت رہے

ہندوستان میں شیعیت کے قدم

لیکن مغلی عہد میں ہمایوں کو شیر شاہی حکومت کے مقابلہ میں جب ایرانی حکومت کی امداد سے کامیابی حاصل ہوئی تو اس ملک میں تورانیوں کے ساتھ ایرانیوں کا اقتدار بھی بڑھنے لگا، ہمایوں بلکہ ہمایوں کے بعد جتنے مغل بادشاہ تھے وہ بطور سنت شناسی کے ایران سے آنے والوں کو بڑی قدر و عزت کے ساتھ ہاتھوں ہاتھ لینے لگے، اور اسی زمانہ سے بڑے بڑے عہدوں پر حتی کہ صوبہ داریوں اور گورنریوں پر بھی ایرانی حکام کا تقرر ہونے لگا، عالمگیر کے عہد تک مغل

---

[۱] کہا جاتا ہے کہ سید ابو الفرح واسطی اکبر کے عہد سے پہلے عراق کے مشہور شہر واسط سے ہندوستان تشریف لائے ابتداء میں پٹیالہ (پنجاب) کے گرد و نواح میں آپ کی اولاد آباد ہوئی، جن گاؤں میں ان کی اولاد آباد ہوئی تھی ان کے نام چھت بانور، تہنپور، اور جگت نیر تھے پھر سادات کا یہ خاندان آگے بڑھا وہاں سے آباد ہوا، ضلع مظفر نگر میں جانسٹھ اب بھی ایک مشہور قصبہ ہے اس میں اس خاندان کے کچھ لوگ آباد ہوئے اور وہی سادات بارہ کے نام سے مشہور ہیں، یہ بارہ کیوں کہلاتے ہیں؟ مورخین اس کی توجیہ میں مختلف ہیں لیکن ابو الفرح واسطی کی جو اولاد جگ نیر میں آباد ہوئی تھی اور بعد کو وہ جاجنیری سادات کے نام سے مشہور ہوئی ان کا ایک سلسلہ بہار ضلع مونگیر میں پایا جاتا ہے اور چونکہ بارہ گاؤں میں یہ آباد ہیں اس لئے یہ سادات بارہ گاؤں کہلاتے ہیں خاکسار مناظر احسن گیلانی کا تعلق بھی ان ہی جاجنیری سادات سے ہے بارہ کی وجہ یہاں بھی ممکن ہے بارہ گاؤں سے ہو ۱۲

حکومت شباب کے دور میں تھی، جو زہر اندر داخل ہو گیا تھا اس کے نتائج محسوس نہیں ہوتے تھے، لیکن عالمگیر کے بعد عناصر کے اعتدال میں ضعف پیدا ہوا، اور ان دو متضاد عناصر کے اندرونی تصادم نے رنگ لانا شروع کیا، سادات بارہ اگرچہ وطناً ایرانی نہ تھے، لیکن ان کا مسلک وہی تھا جو ایرانیوں کا تھا، قدرتی طور پر ان کے زمانہ اقتدار میں ایرانی امرا کو تورانی یا دوسرے لفظوں میں "سنی" امرا پر برتری حاصل ہونے لگی، اور اتنی برتری کہ بعض بعض بڑے بڑے تورانی امیر تو حکومت اور حکومت کے تعلقات سے دستکش ہو کر گھر بیٹھ گئے، جن میں حضرت آصف جاہ اول بانی حکومت آصفیہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، میر غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:-

کہ بنا بر گرمی بازار امراء جدید و کساد بازاری امراء قدیم از نوکری استعفاء دادہ بدار الخلافہ شاہجہان آباد آمد و بلباس درویشانہ پوشیدہ خانہ نشین شد ص۲	نئے امیروں کی گرم بازاری اور پرانے قدیم امراء کی کساد بازاری کو دیکھ کر حضرت آصف جاہ اول مغلی حکومت کی ملازمت سے مستعفی ہو کر شاہجہان آباد پہنچے اور درویشانہ لباس اختیار کر کے خانہ نشین ہو گئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ سارے فتنوں کی بنیاد اگر سچ پوچھیے تو ہندوستان میں بھی وہی مسئلہ رہا ہے جس سے ہر جگہ حتیٰ کہ پہلی صدی ہجری میں فتنوں کی ابتدا ہوئی، یعنی یہی شیعیت و سنیت کا جھگڑا۔ ابتداء تاریخ اسلام سے جس کسی کے دل میں دنیا طلبی کی انگیٹھی سلگی اس نے دین کے اسی مسئلہ کی آڑ لے کر اپنے حرص و ہوا کی جہنم روشن کی۔ اور آج تک حال یہ ہے کہ جس واقعہ پر اس اختلاف کی بنیاد قائم ہے حالانکہ اس پر تیرہ سو سال گزر چکے، لیکن جب کسی کا جی چاہتا ہے اس کو تر و تازہ کر کے اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنا لیتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ اسی وقت پیش آ رہا ہے، فریقین کو دو صورتوں میں سے کسی ایک صورت کو ابھی طے کرنا ہے۔

اسلامی عقائد کے متعلق ایک عام غلط فہمی، کتنی عجیب بات ہے کہ قرآنی تعلیمات کے بے شمار بینات و محکمات مثلاً یہ کہ کسی مومن کے لئے قطعاً یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے کو کسی حال میں اکیلا اور تنہا خیال کرے اس پر یہ اعتقاد حتمی طور پر واجب ہے کہ ہر حال میں ایک لامحدود قوت کو انتہائی رحم و کرم کے ساتھ اپنے قریب یقین کرے، محسوس کرے کہ یہ قوت اس کے ظاہر و باطن اول و آخر کو محیط ہے، بغیر کسی دغدغہ کے اس واقعہ پر بھروسہ کرے کہ اس کی ایمانی صفت کی وجہ سے یہی لامحدود طاقت ہر لمحہ اور ہر حال میں اس کی طرف سے مدافعت پر آمادہ ہے جب مومن مخلوقات کی ربوبیت سے اپنے دل و دماغ کو آزاد کر کے خالق کی ربوبیت پر قدم جماتا ہے، تو اس کو باور کرنا چاہئے اور قطعاً بغیر کسی شک و شبہ کے باور کرنا چاہئے، کہ غیبی قوتیں یعنی ملائکۃ اللہ اس پر نازل ہو رہے ہیں۔ اور دنیا و آخرت میں اس کی امداد و اعانت ان کے فرائض میں سے ہے علی ہذا مثلاً ہر مومن کا فرض ہے کہ اپنے ماں، باپ، اموال و تجارت، گھر در، الغرض ہر چیز سے زیادہ اپنے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام سے محبت رکھے، ظاہر ہے کہ یہ اور ایسی بیسیوں باتیں ہیں جو قرآن کے نصوص صریحہ سے بغیر کسی تاویل کے ماخوذ ہیں، اسی طرح حمد و شکر توکل و تفویض، توبہ استغفار، انابت و اطاعت وغیرہ وغیرہ ان کے قرآنی حقائق ہونے میں کون شک کر سکتا ہے، بلاشبہ یہ ساری چیزیں ایسی ہیں کہ ان کا

انکار کرنے والا کافر ہوجاتا ہے اور ظاہر ہے کہ ان ہی چیزوں کا نام عقائد ہے لیکن بجائے ان کے ایسی باتیں کہ خدا کے صفات قائم بذات ہیں یا عین ذات، صفات حقیقی نسبات ہیں یا آٹھ، پھر ہر صفت کی نوعیت کیا ہے خصوصاً کلام کی قسمیں اور اس کے مباحث ازیں قبیل یہ مسئلہ کہ دنیائے اسلام کے کس علاقہ کے کن باشندوں کو اور ان باشندوں میں کس قبیلہ کو اس قبیلہ میں سے کس بطن کو اس بطن سے کس فخذ کو اس فخذ سے کس گھرانے والوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی اور خلافت کا صرف استحقاق نہیں بلکہ پہلا استحقاق حاصل ہے، ان مسائل کو عقائد کی کتابوں میں مجبوراً اس لئے شریک کرنا پڑا کہ مختلف لوگوں نے مختلف زمانوں میں ان ہی مسائل کو اپنے فساد و زیغ کا ذریعہ بنایا، اگر بنی امیہ خلافت کے مباحث کا سب وشتم کے ساتھ برسر منبر فیصلہ کرنے کی ابتدا نہ کرتے تو جو واقعہ ہوچکا تھا اور جن لوگوں کا اس سے تعلق تھا جب وہ گزر چکے تھے پھر ان کو کوئی خواہ مخواہ کیوں چھیڑتا، لیکن چھیڑنے والوں نے ان ہی چیزوں کو زیادہ دم دار کرکے اسلام کیطرف منسوب کرنا شروع کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ کتابوں میں آخر ان ہی مباحث کی طرف زیادہ توجہ کرنی پڑی، اور قرآن کے سیکڑوں بینات و محکمات نگاہوں سے اوجھل ہوگئے، اور ایسے اوجھل کہ بجائے اعتقادیات میں شریک کرنے کے سمجھا جاتا ہے کہ اچھے مسلمان ہونے یا دوسرے لفظوں میں صوفی مسلمان ہونے کے لئے ان کی مشق و مزاولت ایک پیشہ کی حیثیت رکھتی ہے اور بس ـــــ حالانکہ ان میں ہر مسئلہ قرآن کا تھا، جس کا انکار آدمی کو اسلام کے دائرہ سے خارج کر دیتا ہے، یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے کہ عقائد کی کتابوں میں جن چیزوں کو عقائد کے ذیل میں علمائے شریک فرمایا ہے میں ان کو اعتقادیات قرار دینے سے انکار کر رہا ہوں، بلکہ مجھے کہنا یہ ہے کہ مختلف زمانوں میں مختلف اغراض سے لوگوں نے بعض خاص چیزوں پر جو زور دیا، تو اس کا آج یہ نتیجہ ہے کہ بہت سے اعتقادی امور ان کتابوں میں شریک نہ ہوسکے، جو اسی لئے لکھی گئی ہیں کہ ہر مسلمان کا اس کے ہر مسئلہ پر اعتقاد رکھنا ضروری ہے۔ لوگوں کو غلط فہمی یہ ہوگئی، کہ جو کچھ ان کتابوں میں نہیں، گویا وہ اعتقادیات سے تعلق ہی نہیں رکھتا، حالانکہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ واقعہ نہیں ہے کم از کم قرآن کی ہر تعلیم کی حیثیت تو یہی ہے کہ اس کا انکار کفر ہوجاتا ہے خواہ وہ توکل کے سلسلہ کی چیز ہو، یا تسلیم و رضا، و صبر و شکر کے باب کی ہو۔

شہزادہ فرخ سیر کا بے دردانہ قتل

میں اپنے مقصد سے بہت زیادہ دور ہٹتا چلا جارہا ہوں، کہہ یہ رہا تھا، کہ بالآخر سادات بارہ کے اقتدار کے زمانہ میں پھر اسی پرانے مسئلہ نے ہندوستان میں سر اٹھایا، اور بالآخر اس کا انجام اس پر ہوا کہ ان ہی بادشاہ گر سید بھائیوں کے ہاتھ فرخ سیر مقتول ہوا، اور انتہائی بے دردی و قساوت قلبی کے ساتھ تسمہ میں اس کی گردن کھینچ دی گئی۔ حضرت آصف جاہ اول کے استاذ میرزا عبد القادر بیدل عظیم آبادی نے تاریخ لکھی:

دیدی کہ چہ بادشاہ گرامی کردند | صد جور و جفا از رہ خامی کردند
تاریخ چو از خرد بجستم فرمود | سادات بوے نمک حرامی کردند

۱۱۳۱

مغل بادشاہ کا ارباب حکومت کے ہاتھ سے مارا جانا غالباً پہلا واقعہ تھا جو دلی میں پیش آیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اس وقت جوان ہوچکے تھے۔

شاہ عبدالرحیم کا ایک عجیب خواب | "انفاس العارفین" میں آپ نے فرخ سیراور سید بھائیوں کے اس تنازعہ کا ذکر فرمایا ہے اور ایک خاص بات یہ لکھی ہے کہ آپ کے والد شاہ عبدالرحیم کی خدمت میں اس جھگڑے کے قصے جب پیش ہوئے تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ

در واقعہ دیدم کہ گویا مسند فرخ سیر را مردم می خواہند کہ برہم زنند	میں نے (کشفی) واقعہ میں دیکھا کہ فرخ سیر کی مسند کو لوگ الٹ دینا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد شاہ ولی اللہ نے جو واقعہ نقل فرمایا ہے عقلی دنیا اس کے ماننے کے لئے شاید تیار نہ ہوسکے جیسا کہ ابدالی اور مرہٹہ کی جنگ کا غیب میں کسی اور سے تعلق تھا، فرخ سیر کا ایک زمانہ تک سید بھائیوں کے حملے سے محفوظ رہنا اس میں جس کا ہاتھ کام کر رہا تھا، وہ شاہ ولی اللہ کی زبانی سنئے۔ فرماتے ہیں کہ میرے والد نے ان لوگوں سے جو بادشاہ کی مسند الٹنا چاہتے تھے فرمایا کہ

برائے من ایں نا ہم چنیں بگذارید	میری خاطر سے اس بادشاہ (فرخ سیر) کو اسی حال میں چھوڑ دو (یعنی اسیر ظلم وزیادتی نہ کرو)

شاہ ولی اللہ کا بیان ہے کہ جب تک ان کے والد زندہ رہے فرخ سیر پر آنچ نہ آنے پائی لیکن جوں ہی ان کا انتقال ہوا۔ کل

بعد پنجاہ روز از وفات حضرت ایشاں اسیر شد	پچاس دن آپ کی وفات کے بعد فرخ سیر قید ہو گیا

اور جیسا کہ میں نے عرض کیا اور تاریخوں میں اس کی تفصیل لکھی ہوئی ہے کہ فرخ سیر کا ان بھائیوں کے ہاتھ قتل ہونا تھا کہ ملک میں ایک ایسا زلزلہ برپا ہوا کہ بھر نہ تھا، شاہ ولی اللہ اپنی چشم دید شہادت یہ درج فرماتے ہیں:-

ہرج و مرج عظیم دست داد سخت کشت وخون کی گرم بازاری ہوئی

خصوصاً تورانی امرا اپنے ہم مذہب بادشاہ کے اس دردناک مظلومانہ قتل سے سخت برہم ہوئے، جیسا کہ میں نے لکھا تھا، حضرت آصف جاہ رحمۃ اللہ علیہ نے ترک دنیا کر کے "ایں جنوں ترک منصبہا" کو اختیار فرمالیا تھا، جو شاہ ولی اللہ کا مسلک تھا، لیکن اس واقعہ نے ان کی رگ حمیت میں جوش پیدا کر دیا، اور لباس فقیری اتار میدان میں اتر آئے سادات بارہ نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح ان کو رام کر لیا جائے، لیکن دلی چھوڑ کر دہ مالوہ اور دکن کے جنگلوں میں جوش انتقام میں بھرے ہوئے شیر ژیاں کی طرح ڈکارتے پھرتے تھے، مظلوم بادشاہ کی تڑپتی ہوئی لاش ان کو چین لینے نہیں دیتی تھی، مشہور ہے کہ حسین علی خاں نے ایک خط بڑی منت سماجت کا ان کو مالوہ لکھا جواب میں صرف یہ شعر لکھ کر حضرت آصف جاہ نے بھیجدیا

من بے وفانیم بوفا می خورم قسم
من چو شمانیم بشامی خورم قسم

رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ کی تخت نشینی اور چند ہی روز میں ان کے انتقال کے بعد محمد شاہ کا دور

بہر حال فرخ سیر کو ختم کرکے ان بھائیوں نے پہلے رفیع الدرجات پھر رفیع الدولہ کو دلی کے تخت پر اپنے نوکر ہونے کی حیثیت سے تخت نشین کیا، دونوں چونکہ مدقوق تھے تین چار مہینے کے اندر اندر دونوں کا خاتمہ ہو گیا، تب سید برادران نے محمد شاہ بادشاہ کو اپنا نوکر بنا کر مغل تخت پر بٹھایا، اور اسی کو حسین علی خاں اپنے ساتھ لے کر تورانیوں کے سردار آصف جاہ کو ختم کرنے کے لئے ایک فوج لے کر دکن کی طرف روانہ ہوا، جہاں آصف جاہ نے قبضہ جما لیا تھا مگر چند ہی منزل دلی سے آگے بڑھے تھے کہ آخر جس شاہین بلند آشیانہ کے شکار کے لئے نکلے تھے، اس کی دعا یا نیم شبی کہئے یا دعا کے ساتھ اس کی دوا کے بھی وہ شکار ہو گئے، حضرت آصف جاہ کے چچا زاد بھائی محمد امین خاں کے اشارہ سے میر حیدر کاشغری نے حسین علی خاں کا کام تمام کر دیا، سفر میں جب حسین علی خاں کی بارگاہ لوٹی گئی تو طباطبائی کا بیان ہے کہ اس وقت خزانہ میں ایک کروڑ روپیہ تھا۔ اس بازو کا ٹوٹنا تھا کہ دوسرا بازو بھی ایرانیوں کا بظاہر ٹوٹ گیا، یعنی دوسرے بھائی حسن علی خاں الملقب بہ قطب الملک نے بھی محمد شاہ کے ہاتھ گرفتار ہو کر قید خانہ میں آخری سانسیں پوری کیں، تورانی امیروں کی مغل دربار میں یہ بڑی کامیابی تھی، محمد شاہ جو شاہی کرنے کیلئے نوکر تھا اب اس کی جان میں جان آئی، کچھ دن تو محمد شاہ واقعی حضرت آصف جاہ کو وزیر اعظم بنا کر محمد شاہ بنے رہے، لیکن یاروں نے اس غریب کو بجائے تورانیوں کے پھر ایرانیوں کے زیر اثر ڈال دیا، بادشاہ نے مذہب تو نہیں بدلا، لیکن مشرب بدل دیا، ریسیا ان کا نقیب قرار پایا، عام حکم تھا کہ ادھر ہمالیہ کے دامن سے گھٹا اٹھے بادل گرجے، کہ میرا خیمہ، خرگاہ صحرا روانہ ہو، ہر طرف ؎

می دید صبح کلبستہ سحاب	الصبوح الصبوح یا اصحاب
ژالہ باریدہ بر رخ لالہ	المدام المدام یا احباب

کا شور تھا، اسی لئے بیچارا آخر میں رنگیلے کے نام سے بدنام ہو گیا۔ آصف جاہ دربار کے اس رنگ کو دیکھ کر پھر دکن کی پہاڑیوں اور جنگلوں کی طرف روانہ ہو گئے۔

حریف بظاہر بادشاہ سے ملے ہوتے تھے، لیکن ایرانیوں کو جو زخم تورانیوں سے پہنچا تھا، اس کی آگ اندر اندر بھڑکی رہتی تھی، آخر وہ آگ بھڑکی، اور طے کر لیا گیا، کہ اب اس تورانی امیر اور اس کے ساتھیوں، ہمنواؤں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا جاتے تاریخ میں واقعات کو بکھیر کر بیان کیا گیا ہے، لیکن تاڑنے والے تاڑ جاتے ہیں کہ اندر اندر کارروائی کیا ہوئی، محمد شاہ کا عہد ہے، بذات خود وہ جو کچھ بھی تھا، لیکن اگر شاہ عبدالعزیز صاحب کی یہ روایت صحیح ہے اور صحیح نہ ہونے کی وجہ ہی کیا ہو سکتی ہے کہ ان کی چشم دید گواہی کے قریب قریب ہے

در عہد محمد شاہ بادشاہ بست و دو بزرگ صاحب ارشاد	محمد شاہ کے زمانہ میں بائیس بزرگ صاحب ارشاد

ط کہا جاتا ہے کہ داڑھی رکھنے والے اس تورانی امیر پر خلیع العذار ایرانی امراء فقرے چست کرتے تھے، قلعہ میں جب داخل ہوتے تو بڑھا بندر کا جھوم

از ہر خانوادہ در دہلی بودند ایں چنیں اتفاق کم می شود — سلسلہ اور طریقہ کے دلی میں تھے ایسا اتفاق کم ہوتا ہے

ملفوظات عزیزیہ صفحہ ۱۱۔

ظاہر ہے کہ محض رسمی یا خاندانی پیرزادوں کے متعلق یہ بیان نہیں ہے بلکہ شاہ صاحب کے خیال میں بھی جو واقعی ارشاد و ہدایت کے سزاوار تھے ان کی محض دلی شہر میں اتنی تعداد تھی۔ یقیناً اس قسم کا اتفاق کم ہوا کرتا ہے اور اس پر معلوم ہوتا ہے کہ باایں ہمہ رندی دخراباتی محمد شاہ میں ایک دوسری اٹک بھی ضرور تھی کہ بہرحال حکومت کی قدر دانیاں اور جوہر شناسیوں سے اس قسم کے اجتماعات کو بہت کچھ تعلق ہے۔

خصوصاً حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ تو اسی رنگیلے نے وہ رنگین سلوک کیا ہے کہ اگر مسلمان اس غریب کو محض اس کی اسی خدمت کی بنیاد پر بخش دیں، تو وہ اس کا مستحق قرار پا سکتا ہو اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ جن مقاصد اور خیالات کو لے کر حجاز تشریف لے گئے، اور حرمین کے جن "فیوض" سے مالا مال ہو کر وہ پھر ہندوستان واپس ہوئے، اور کچھ طے کر کے واپس ہوئے جیسا کہ ان کے اس وداعی بیان سے معلوم ہوتا ہے جو رخصت ہوتے ہوئے مدینہ منورہ میں اپنے استاذ حدیث سے آپ نے ارشاد فرمایا تھا۔

ہرچہ خواندہ بودم فراموش کردم الا علم دین یعنی حدیثا — جو کچھ میں نے پڑھا تھا سب کچھ بھلا دیا بجز علم دین یعنی علم حدیث کے۔

(ملفوظات عزیزیہ صفحہ ۹۳)

اور اسی بنیاد پر جیسا کہ سب جانتے ہیں، حضرت شاہ صاحب ہی کی بدولت آج ہندوستان میں "علم حدیث" کا بحمد اللہ مینارہ اتنا بلند ہے کہ بلا مبالغہ اب اسلامی ممالک میں کوئی ملک، اس حیثیت سے اس کی ہمسری نہیں کر سکتا، کسی معمولی آدمی کی نہیں بلکہ الازہر کے ہم وطن مشہور ناقد و بصیر عالم رشید رضا مرحوم مصری کی شہادت ہے اور ان کو مجبوراً واقعات کی بنا پر یہ اعتراف کرنا پڑا ہے کہ:

ولولا عنایۃ اخواننا علماء الھند بعلوم الحدیث فی ھذا العصر لقضی علیھا بالزوال۔ (مقدمہ مفتاح کنوز السنۃ صفحہ ۱)

اگر ہمارے بھائی ہندوستان کے علماء کی توجہ اس زمانہ میں علوم حدیث کی طرف مبذول نہ ہوتی تو اس علم کے زوال اور فنا کا فیصلہ ہو چکا تھا۔

اور ظاہر ہے کہ یہ ساری برتری براہ راست بلا شرکت غیرے حضرت شاہ ولی اللہ ہی کی زیر منت ہے، آج ہندوستان کے جس طبقہ میں بھی جو کچھ حدیث کا چرچا پایا جاتا ہو "ہمہ آوردہ اوست" شاہ عبد العزیز صاحب اسی بنیاد پر کبھی کبھی فرماتے تھے۔

(بسلسلہ صفحہ گزشتہ) لطیفہ اس نیک دل وفادار بزرگ کی شان میں استعمال کیا جاتا، سنا گیا ہو کہ جھلا کر ایک دن حضرت آصف جاہ نے فرمایا کہ مجھے جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہہ لو، لیکن میری آنکھیں اس دن کو دیکھ رہی ہیں جب لال قلعہ کی دیوار دل پر ہند را آتھتے پھیر میں گے، اور یہی فرمانے کے بعد دربار سے علیحدگی کا انہوں نے مصمم ارادہ فرما لیا ۱۲۔

علم حدیث پدر من از مدینہ آورد، چار دہ ماہ در حرمین بودہ سند کردہ (ملفوظات صہ ۹۳)

میرے والد ہی مدینہ منورہ سے علم حدیث لائے چودہ ماہ حرمین شریفین میں رہ کر آپ نے سند حاصل فرمائی تھی

لیکن دنیا کو شاید یہ معلوم نہیں کہ شاہصاحب نے مدینہ سے واپسی کے بعد جب درس حدیث کا افتتاح فرمایا تو اس وقت پرانی دلی میں جہاں اب ان بزرگواروں کے مزارات ہیں، واں اپنے والد کے پرانے مکان میں پڑھانے کی جو مختصر سی جگہ تھی اسی سے کام شروع کر دیا لیکن چند ہی دنوں میں اطراف واکناف سے طلبہ کھینچ کھینچ کر جب پہونچنے لگے تو ظاہر ہے کہ شاہ عبدالرحیم کی درسگاہ "سندالوقت" کے دارالعلوم بننے کا کام کیسے انجام دے سکتی تھی اور یہ سعادت محمد شاہ بدنام کے نام قدرت نے لکھی تھی کہ اُس نے

محمد شاہ نے شاہ ولی اللہ کے درس حدیث کیلئے عالیشان مکان دیا

"مولینا کو بلا کر شہر میں ایک عالی شان مکان دے کر آپ کو اندرون شہر رکھا قدیم جگہ غیر آباد ہوگئی"

(دارالحکومت دہلی صہ ۲۸۶/ج ۲ مولنٰا مولوی بشیر صاحب)

دلی کے پرانے کھنڈروں کا یہ سب سے بڑا ماہر دوسری جگہ اسی محمد شاہی عطیہ کا ذکر ان لفظوں میں کرتا ہے:-

"یہ مدرسہ کسی زمانہ میں نہایت عالی شان اور خوبصورت تھا اور بڑا دارالعلوم سمجھا جاتا تھا"!

دارالعلوم کی پختگی اور استحکام کا اندازہ تو اسی سے ہو سکتا ہے کہ غدر تک وہ اپنی اصلی حالت پر قایم تھا، اگر اسکے ساتھ یہ واقعہ پیش نہ آتا کہ

ولی اللہی دارالعلوم کی عمارت غدر میں برباد ہوئی

"غدر میں مکانات لوٹ لئے گئے، کڑی تختے تک لوگ اٹھا لے گئے"

تو آج بھی وہ شاید باقی رہتا، —— رہی اس کی وسعت اور کشادگی، کاش! مکان موجود ہوتا تو صحیح رائے قایم ہو سکتی تھی، لیکن مولوی بشیرالدین صاحب کتاب مذکور کا یہ بیان کہ

"اب متفرق لوگوں کے مکانات اس جگہ بن گئے ہیں مگر محلہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے مدرسہ کے نام سے آج تک پکارا جاتا ہے"۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بڑی جگہ تھی اسی لئے "متفرق لوگوں کے مکانات" اس میں بن سکے، بلکہ جو محلہ "مدرسہ شاہ عبدالعزیز"، کے نام سے مشہور ہے اگر اس کی کل آبادی اسی مدرسہ کی زمین پر قایم ہوئی ہے تو اس کے یہ معنے ہیں کہ وہ مکان بجائے خود ایک محلہ کی گنجایش اپنے اندر رکھتا تھا اور یوں بھی تو سمجھنا چاہئے کہ جس مکان میں شاہ ولی اللہ اور ان کے بعد شاہ عبدالعزیز رح پھر شاہ عبدالعزیز رح کے بعد آخر میں شاہ اسحاق رح تک کے مشہور عظیم ترین حلقہ کے طلبہ بھی اسی میں پڑھتے رہے، خیال کیا جا سکتا ہے کہ محمد شاہ کا دیا ہوا یہ مکان مکان نہیں بلکہ غالبًا کوئی بڑی ڈیوڑھی یا حویلی ہوگی، جس میں اتنی گنجایش پیدا ہو سکی،

مغلی عہد کی حویلیوں اور ڈیوڑھیوں کا اندازہ موجودہ زمانہ کے ہندوستانیوں کو نہیں ہو سکتا، لقوڑے بہت اس کے نشانات اب بھی حیدرآباد میں پائے جاتے ہیں، کہ ایک ایک امیر کی بعض ڈیوڑھیاں اس وقت بھی بحمداللہ شاید ایک ایک مربع میل سے کم زمین میں نہ ہوں گی، بہرحال مولوی بشیرالدین صاحب کتاب مذکور ہی نے لکھا ہے کہ

"شاہ ولی اللہ کے بعد ان کے چاروں صاحبزادوں نے وہی مشغلہ (درس تدریس) کا جاری رکھا اور اس مدرسہ نے تعلیم دینیات میں وہ نام پایا کہ ہندوستان میں شہرہ ہو گیا، جب شاہ صاحب کے صاحبزادوں میں کوئی نہ رہا تو مولنا محمد اسحاق (مہاجر مکی) نے مدرسہ کی خدمت اپنے ذمہ لی۔"

جو لوگ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اور بالخصوص حضرت شاہ اسحاق صاحب کے حلقہ درس کی وسعت سے واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ ایک زمانہ ہندوستان پر وہ بھی گزرا ہے کہ جس طرح آج ہر صوبہ اور تقریباً ہر صوبہ کے ہر ضلع اور ہر ضلع کے ہر تعلقہ (سب ڈویزن) میں دیوبند کا کوئی نہ کوئی طالب العلم ضرور پایا جاتا ہے ٹھیک اسی طرح حضرت شاہ اسحاق صاحب کی درسگاہ کی بھی اپنے زمانہ میں یہی نوعیت تھی۔ وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس مدرسہ کی وسعت کیا ہوگی اس کا پتہ تو نہ چلا کہ اس مدرسہ میں طلبہ کے قیام کا بھی بندوبست تھا یا نہیں، ظاہر تو یہی ہے کہ اس زمانہ میں جب مسلمانوں نے ہر طالب العلم کے لئے قیام و طعام (لاجنگ بورڈنگ) کے مسئلہ کو فری (اور مفت) کر رکھا تھا تو اسی دستور کے مطابق طلبہ مساجد اور ان مقامات میں رہتے ہوں گے، جن کا نام اس زمانہ میں جاگیر تھا، تاہم شاہ عبدالعزیزؒ صاحب کے ملفوظات میں ایک جگہ اپنے اسی مدرسہ کی مسجد کا حال بیان فرماتے ہوئے جو یہ فقرہ پایا جاتا ہے کہ۔

دراں ہنگام بزرگان بسیار و اولیاء بسیار از یاران والد ماجد۔۔۔ معتکف مسجد بودند ص۱۹	اس زمانہ میں بہت سے بزرگ اور بہت سے اولیاء اللہ والد ماجد کے دوستوں میں سے مسجد میں معتکف تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مدرسہ کی خانقاہی حیثیت بھی تھی، رمضان کے مہینہ میں بھی جو عموماً عربی تعلیم کی عطلت کا زمانہ ہے "بزرگان بسیار و اولیاء بسیار" اس مدرسہ کی مسجد میں معتکف ہوتے تھے تو عام واردین و صادرین کا اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے،

چونکہ محمد شاہ کی ایک اسلامی خدمت کا اظہار مقصود تھا اس لئے قصداً میں نے ذرا طول بیانی سے کام لیا، اور اس سے گونہ شاہ صاحب کے مدرسہ کی حالت پر بھی روشنی پڑ گئی، نیز اسی مدرسہ کے کچھ حالات آخر مضمون میں بھی انشاء اللہ آئیں گے، اسی سلسلہ میں میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ جب خود محمد شاہ نے حضرت

شاہ صاحب کو بلوا کر یہ مدرسہ حوالہ کیا تھا، تو عقل کا تقاضا ہے کہ حکومت نے ان طلبہ کے لئے بھی ضروری وظائف منظور کئے ہوں گے، جو اس مدرسہ میں دور دور سے آتے تھے، کیونکہ بادشاہ تو بادشاہ، عام امراء کے خزانوں پر مدد وظائف طلبہ میں کافی رقموں تک کے دینے کا عام دستور تھا، حافظ الملک رحمت خاں والی بریلی کے متعلق ان کی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ ماہوار سیکڑوں طالب العلموں کو ان کی سرکار سے امداد ملتی تھی، نجیب الدولہ کی علم دوستی کا حال تو خود شاہ عبدالعزیز صاحب نے یہ بیان کیا ہے کہ۔

نزد نجیب الدولہ نہ صد عالم بود ادنیٰ پنج روپیہ و اعلیٰ ... نجیب الدولہ کے پاس نو سو عالم رہتے تھے جن میں پانصد روپیہ ... ادنیٰ درجہ کے علما کو پانچ روپیہ اور اعلیٰ کو پانچسو روپیہ ملتے تھے

میرا اندازہ ہے کہ یہ پانچ اور پانچسو روپیہ ماہوار نہیں بلکہ "یومیہ" تھا، حیدرآباد دکن میں بحمداللہ ان کی نشانیاں اب تک باقی ہیں ... اور جس زمانہ میں مسلمانوں کی دولت کا حال یہ تھا کہ زیادہ دن پہلے نہیں بلکہ انگریزوں کے تسلط سے کچھ ہی پہلے دلی کا حال بیان کرتے ہوئے حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

کہ بخانہ قمرالدین خاں عورات غسل اخیر از گلاب می ... قمرالدین خاں کے گھر میں عورتیں آخری غسل گلاب کردند و بخانہ دیگر نواب سہ صد روپیہ گل و پان برائے ... سے کرتی تھیں، اور ایک دوسرے نواب کے یہاں عورات می رفت ... تین سو روپیہ روز کا صرف پھول، پان عورتوں میں جاتا تھا

اور وہی "سید برادران" جن کا حال ابھی گزر ان میں کے بڑے بھائی حسین علی خاں جب اورنگ آباد دکن کے صوبہ دار تھے تو میر غلام علی آزاد بلگرامی کا بیان ہے کہ۔

مردم اورنگ آباد بالاتفاق بیان می کنند در عہد امیر الامرا اکثر مردم در خانہ خود طعام نمی پختند طباخان سرکار امیر الامرا حصہ خود می فروختند و قاب پلاؤ مکلف بچند پل می دادند۔
(مآثر الکرام جلد اول ص...)

اورنگ آباد کے لوگ بالاتفاق بیان کرتے ہیں کہ امیر الامرا (حسین علی خاں) کے زمانہ میں اکثروں کے یہاں کھانا نہیں پکتا تھا بلکہ امیر الامرا کی سرکار کے باورچی اپنے حصہ کا کھانا بیچ دیتے تھے پلاؤ کا ایک کلف قاب چند پیسوں میں دیتے تھے۔

خیر بات بہت طویل ہوئی جاتی ہے، لیکن "فاقصص القصص" بھی چونکہ عبادت ہے اور اس سے بھی زیادہ "لعلہم یتفکرون" (پہلوں کے حالات سن کر شاید پچھلوں میں چونک پیدا ہو) اس لئے اس معترضہ جملہ کے بیان کرنے میں مضائقہ محسوس نہ ہوا۔ اب اصل مدعا کی طرف آتا ہوں، تو قصہ یہ ہو رہا تھا کہ حجاز سے سند حدیث لے کر جب شاہ صاحب دلی واپس ہوئے اور طلبہ کے عام رجحان کو دیکھ کر محمد شاہ نے آپ کو یہ حویلی کہئے یا اس زمانہ کی زبان میں دارالعلوم (کالج) قرار دیجئے۔ حوالہ کیا تو شاہ صاحب اپنے منصوبوں کو دل میں لے کر اس کے مطابق سرگرم عمل ہوگئے ہی تھے

حافظ رحمت خاں والی بریلی اور نجیب الدولہ کی قدر دانی علم و علماء

کہ اچانک ہندوستان خصوصاً دلی کی زمین پر نادر شاہ درانی کی مشہور مصیبت کا آسمان ٹوٹ پڑا۔

حجاز سے واپسی پر شاہ صاحب کے اصل کام کا آغاز، اور دلی پر خونی نادر کی یلغار اور اسکے اسباب و اثرات

شاہ صاحب ۱۱۴۵ء میں حجاز سے دلی پہونچے تھے اور ۱۱۵۱ء میں نادر گردی کی دلی شکار ہوئی، مورخین کا اس حملہ کے اسباب میں اختلاف ہے میاں بشیر مرحوم نے تو آصف جاہ مرحوم کو نادر کا داعی قرار دیا ہے لیکن سچ یہ ہے اور واقعات اس کے موید ہیں کہ ایرانیوں کی قوت سادات کی تباہی سے جو کمزور ہو گئی تھی، اسی کی تلافی کے لئے غریب تورانیوں پر نادر شاہ اکسا کر بلایا گیا تھا۔[1] اور بالفرض یہ سب نہ بھی ہو، جب بھی واقعہ یہ ضرور پیش آیا کہ ہمایوں نے ایرانی جراثیم کے لئے جو سوراخ پیدا کر دیا تھا نادر گردی نے اس سوراخ کو وسیع سے وسیع تر کر دیا۔ یعنی اب تک ہندوستانی حکومت اپنے جذبہ منت شناسی کا اعتراف ایرانیوں کو مناصب و خدمات دے کر کر رہی تھی۔ لیکن نادر شاہی اور قزلباشی افواج کے عسکری اور سیاسی تفوق نے ہندوستانی دماغوں میں مرعوبیت کی اسی کیفیت کو پیدا کر دیا جس کا مشاہدہ آج مغربی حکومت کی مرعوبیت اور اس کے نتائج کی شکل میں ہم کر رہے ہیں۔

سیاسی شکست کا لازمہ ذہنی غلامی

ہمارا ظاہر و باطن و اندر باہر، صرف محکومیت اور تعبد کی تجلی گاہ بنا ہوا ہے مبالغہ نہیں بلکہ واقعہ ہے کہ ہمارا بال بال یورپ کی غلامی کے سحر سے مسحور ہے، سروں کے بال اور مونچھ داڑھی کی تراش و خراش میں بھی ہماری آنکھیں اپنے مغربی آقاؤں کے چہروں کو تاکتی رہتی ہیں اب ہم خود کچھ نہیں دیکھتے، بلکہ جو یورپ دکھاتا ہے وہی دیکھتے ہیں جو کچھ وہ سوچاتا ہے وہی سوچتے ہیں، جو وہ سمجھاتا ہے وہی سمجھتے ہیں، جو کچھ وہ کھلاتا ہے وہی کھاتے ہیں جو کچھ وہ پلاتا ہے وہی پیتے ہیں، انتہا یہ ہے کہ ہم میں کتنے ہیں جو استنجا اور قضاء حاجت کی شکلوں میں بھی آج یورپ کی راہنمائی کا اپنے کو دست نگر بنائے ہوئے ہیں، یہ کوئی تاریخی واقعہ نہیں ہے بلکہ وہ تماشا ہے جو حکومت کی سحر طرازیاں ہمیں اس وقت ملک کے ہر صوبہ اور ہر علاقہ بلکہ دور دست ریاستوں تک میں دکھلا رہی ہیں۔

نادری حملہ سے ہندوستانی مسلمانوں کی مرعوبیت کا حال شاہ ولی اللہ کی زبانی

نادر سے ہندوستانیوں نے شکست کھائی تھی اور ایسی شکست کھائی تھی جس کی نظیر کم از کم ہندی مسلمانوں کی آنکھوں نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی، حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے جامع ملفوظات نے ایک موقع پر یہ نقل کیا ہے کہ شاہ صاحب نے ایک دن

تذکرہ قتل نادر شاہی و عزم جوہر شدن شرفا کہنہ شہر و جواب والد ماجد و قصہ امام علیہ السلام

نادر شاہی قتل، اور پرانی دلی کے شریفوں کے اس ارادہ کا ذکر فرمایا کہ وہ "جوہر" کا قطعی طور پر ارادہ کر چکے تھے

[1] عام تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ آصف جاہ بہادر نادر سے دوسرے دن مقابلہ کی تیاریاں کر رہے تھے بادشاہ محمد شاہ کو بھی یہی مشورہ دیا تھا لیکن برہان الملک یعنی شاہان اودھ کے مورث نے ان کے منشا کے خلاف تنہا لڑائی چھیڑ دی اور خود اپنے کو نادر کے ہاتھ گرفتار کرکے نادر کو دلی لے گیا اور کروڑہا کروڑ روپیہ تخت طاؤسی کے ساتھ جو گیا سو گیا لاکھوں انسانوں کا خون بھی بہا ۱۲

پھر والد نے جو جواب اُن کو دیا اور امام علیہ السلام کے قصہ کو بیان فرمایا۔

اس "جوہر" کی رسم سے شاید عام لوگ واقف نہ ہوں لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ ہندوستان کی ایک قدیم رسم تھی " جب دشمن کا غلبہ اور تسلط اس حد کو پہونچ جاتا تھا کہ نجات و خلاصی کی راہ مسدود ہو جاتی تھی تو پاس ناموس و عزت کے لئے آگ کا الاؤ جوڑ کر عورتیں مرد بچے سب اس میں کود جاتے تھے،

شاہ صاحب کی اس شہادت سے ثابت ہوتا ہے کہ "نادرگردی" کی دہشت اس حد کو پہنچ چکی تھی کہ پرانی دلی کے شرفا آگ میں پھاندنے کی تیاریاں کر چکے تھے، لیکن جیسا کہ آگے کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، اس موقعہ پر شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے جب مسلمانوں کو واقعہ کربلا اور حسین علیہ السلام کے مصائب یاد دلائے اور بتایا کہ وہاں بھی تو جان و مال کے ساتھ ساتھ اہل بیت کی عزت و ناموس خطرہ کی آخری شکل میں گھر چکی تھی، لیکن حضرت امام نے "جوہر" کا فیصلہ نہیں فرمایا، بلکہ صبر و رضا کی راہ اختیار کی تو اس ارادہ سے لوگ باز آئے

بہر حال اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ دلی اور دلی کے ساتھ سارے ہندوستانیوں کی ایرانیوں سے مرعوبیت کا کیا حال ہوا ہوگا، یہ نہ خیال کرنا چاہئے کہ اس "مرعوبیت" نے ہندوستانیوں کے اندر صرف ایرانی اعتقادات اور دینی مسلک کے میلان کے راستہ کو صاف کیا بلکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا "محکومیت" ہر قسم کے انفعالات و تاثرات کو اپنے ساتھ لاتی ہے ہمایوں کے بعد ہندوستانی مسلمان یوں بھی ایران کی شاعری، ایرانی مفکرین اور ایرانی ارباب علم و دانش سے بہت کچھ متاثر ہو چکے تھے۔ مغل دربار زیادہ تر ایرانی ہی شعرا، حکما، اور فلاسفہ سے معمور تھا، جس کی تفصیل عام تذکروں اور تاریخ کی کتابوں میں پڑھی جا سکتی ہے، ورنہ مغل حکومت سے پہلے اگرچہ "ولائت" یعنی بیرون ہند سے ہر قسم کے لوگوں کا اس ملک میں تانتا بندھا ہوا تھا، اور ان میں اکثر تھوڑی کد و کاوش کے بعد اپنی اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر کسی نہ کسی عہدہ اور مرتبہ تک پہونچ ہی جاتے تھے، لیکن اس میں ان "ولایتی ممالک" میں سے کسی خاص ملک کی تخصیص نہ تھی۔ ترکستان۔ خراسان۔ ایران۔ عرب بلکہ روم وغیرہ تک کے لوگ آتے رہتے تھے اور اگر کچھ غلبہ حاصل تھا تو خراسانی اور تورانی ممالک کے اہل علم و فضل کو تھا، اور چونکہ ان علاقوں میں زیادہ تر تصوف فقہ و اصول فقہ کا چرچا تھا اسی لئے مغل عہد سے پہلے ہندوستان میں ان ہی علوم کا زیادہ چرچا پھیلا ہوا تھا۔ فلسفہ، منطق کی طرف لوگوں کا کم میلان تھا، لیکن ہمایوں کے بعد ہم بہ تدریج ہندوستان کے علمی مذاق میں ایک جدید تغیر کو محسوس کرتے ہیں یعنی آہستہ آہستہ فلسفہ اور منطق کو اہمیت حاصل ہوتی جاتی ہے، اور اس کے بعد ان دونوں "علموں" کے ساتھ ہمارا ملک جس شدت سے چمٹ گیا، اس کا حال کس کو معلوم نہیں،

اس تغیر کی تاریخ یہ ہے ــــ کہ جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد میں ایران میں خاص دل و دماغ کے کچھ لوگ پیدا ہو گئے تھے، انہی میں عجیب و غریب شخصیت میر باقر داماد نامی ایک ملا کی تھی،	ہندوستان کے علماء پر منطق و فلسفہ کے تسلط کی تاریخ

میر باقر داماد کا کچھ تعارف یہ استرآباد کا رہنے والا تھا، مشہد میں تعلیم حاصل کی تھی، اور اصفہان میں سکونت اختیار کر لی تھی، شاہ عباس صفوی اس کا بڑا قدر دان تھا اور اسی کی قدر دانیوں نے اس کو شہرت و عزت کے اس مقام پر پہونچایا تھا، لیکن یہ صحیح نہیں ہے جو ہمارے مدرسوں میں مشہور ہے کہ "باقر داماد" بادشاہ کا داماد تھا اسی لئے داماد کے لقب سے مشہور ہوا، بلکہ داماد درحقیقت ان کے والد کا لقب تھا جن کا نام سید محمد تھا، سید محمد کی شادی اس زمانہ کے ایک بڑے فقیہ شیخ علی بن عبد العالی سے ہوگئی تھی اسی لئے لوگ سید محمد کو سید محمد داماد کہنے لگے، سید محمد کے بعد یہی لقب دامادی کا ان کے بیٹے میر باقر کو وراثت میں ملا، بہرحال باقر داماد جیسا کہ میں نے عرض کیا ایک خاص قسم کا آدمی تھا، جہاں تک میرا خیال ہے اس کو فلسفہ سے زیادہ ادب میں مہارت حاصل تھی، وہ فطرۃً شاعر تھا اور اگرچہ عام طور پر لوگوں کو معلوم نہیں لیکن فارسی زبان میں وہ شاعری بھی کرتا تھا، اشراق تخلص تھا مگر بیچارے کے لئے دشواری یہ ہوگئی تھی کہ پیدا ہو گئے تھے ملا گھرانے میں، جس کے لئے شعر و شاعری کے مشاغل کسی طرح مناسب نہ تھے۔ آخران کی فطرت نے ایک دوسری راہ بتائی، دینیات اور مذہبیات سے تو اس شخص کو کبھی دلچسپی نہ ہوئی اگرچہ برائے نام بعض مختصر رسالے دینی موضوع پر بھی لکھے ہیں، لیکن اپنے دماغ کو فلسفۂ الٰہیات کی طرف پھیر دیا اور اس زمانہ کی ایرانی ادبیات میں الٰہیات کا جو سرمایہ تھا، خصوصاً متاخرین کے لفظی جھگڑوں نے بات کو بتنگڑ بنا کر اوہام کی جو بھول بھلیاں تیار کر دی تھیں میر باقر نے ان ہی چیزوں کو لے کر ایک خاص قسم کے ادیبانہ رنگ میں جس میں لغت کے نامانوس غریب الفاظ، عربی زبان کے ایسے مصادر جن کا عام بول چال میں کم استعمال ہوتا ہی، مثلاً باب اخشیشان، اجلواذ، احرنجام، تشعرار وغیرہ کے وزن پر زبردستی الفاظ کو تراش خراش کر لاتا، نون تاکید اور باب تفعیل وغیرہ کی تشدید سے کلام میں زور پیدا کرنا، ایسی چیزوں کی جمع بنانا جن کی طرف بآسانی ذہن منتقل نہ ہو سکے مثلاً عام طور سے منطقی اور کلامی طبقوں میں "لانسلم" (ہم یہ نہیں مانتے) یا لم لا یکون کذا (آخر ایسا کیوں نہیں ہو سکتا) وغیرہ الفاظ کا استعمال بکثرت کیا جاتا ہی، خصوصاً ارباب جدل و مناظرہ کی زبانوں پر تو گویا یہ الفاظ بطور سخن تکیہ کے چڑھے رہتے ہیں میر باقر نے ان لوگوں کا نام ہی "لانسلمیون" اور "لم لایکونیون" رکھ دیا، ظاہر ہے کہ اس جمع کو دیکھ کر بآسانی کس کا دماغ ان کے مفردات کی طرف منتقل ہو سکتا ہے، بہرحال اس زمانہ کے شروح و حواشی، خصوصاً دوانی اور صدر معاصر نے شرح تجرید کے حاشیوں میں قدیمہ، جدیدہ، اجد وغیرہ کے ناموں سے بے معنی مباحث کا جو طوفان پیدا کیا تھا، اور اس پر مرزا جان، اخوند یوسف، آقا حسین خونساری وغیرہ نے جو "کوہ کندن کاہ برآوردن" کی خدمتیں انجام دی تھیں، میر باقر نے ان ہی سب کو سامنے رکھ کر اپنے جدید انشا اور ادب کا ان کو تختۂ مشق بنایا، گویا ایک قسم کے منطقی و الٰہی ادب کی اس نے ایجاد کی، اسی کے ساتھ میر داماد نے اپنی کتابیں جن میں تقریباً ایک ہی قسم کے مضامین ہیں ان کے نام بھی عجیب و غریب قسم کے رکھے جن کے سننے کے ساتھ ہی آدمی پر ایک رعب سا چھا جاتا ہے، مثلاً

"الافق المبین" "الصراط المستقیم"، ایماضات، تقدیسات، قلبیات از قبیل اور بھی چند کتابیں ہیں۔

غرض میرے نزدیک تو میر باقر پر بجائے فلسفہ اور منطق کے فی الحقیقت ادب و شعر ہی غالب تھا اس کا اندازہ علاوہ ان تدبیروں کے اس سے بھی ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں نظامی گنجوی کی پانچ نظم کی کتابوں کا شمار فارسی شاعری کے جواہر پاروں میں تھا، اور "جواہر خمسہ نظامی" کے نام سے یہ مجموعہ عام طور پر مشہور ہے۔ میر باقر نے بھی اپنی پانچ کتابوں کو "جواہر خمسہ" کے نام سے ملقب کیا۔

میر باقر کے ایک شاگرد صدر شیرازی

میر باقر کے بعد ان کے شاگردوں میں ایک اور صاحب قلم (بلکہ "صاحب قلم" سے زیادہ "صاحب سیاہی و روشنائی" کا خطاب ان کو دیا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا) پیدا ہوئے یعنی ملا صدرالدین شیرازی جن کی کتاب شرح ہدایت الحکمۃ صدرا کے نام سے مدرسوں میں آج بھی مشہور ہے، یہ شخص بلا کا لکھنے والا تھا، ہزارہا صفحات کی بیسیوں کتابوں مثلاً تعلیقات شفا یا حواشی شرح حکمت الاشراق "شواہد ربوبیت" وغیرہ کے علاوہ ایک بسیط کتاب اسی لفظی فلسفہ کے متعلق چار ضخیم جلدوں میں اس شخص نے تیار کی جس کا نام "اسفار اربعہ"[۱] ہے اس کے زمانہ تک لایعنی مباحث کا جو ذخیرہ جمع ہو چکا تھا، سب کو تلاش کر کے اس نے اپنی کتاب میں جمع کیا، اور اس کے ساتھ بعض مسائل میں اپنے خاص نظریات بھی قائم کئے، استاد سے ان کا رنگ اس اعتبار سے جدا ہے کہ ثقیل و غریب لفظوں کے طمطراق سے ان کی کتابیں خالی ہیں صرف اسفار کے عنوانوں میں میر باقر کی کچھ جھلک پائی جاتی ہے مثلاً "لمعۂ اشراقیہ"، "حکمۂ عرشیہ" وغیرہ

بہرحال جس وقت ہندوستان میں عہد شاہجہانی و عالمگیری گزر رہا تھا، ایران کی زمین ان لفظی فلسفیوں کی علمی جلالت شان کے غلغلوں سے گونج رہی تھی، اور ہندوستان وہی ہندوستان جس نے ہمایوں کی راہ سے اپنا رشتہ ایران سے جوڑ لیا تھا اس میں ان غلغلوں کی صدائے بازگشت آ آ کر ٹکراتی تھی، اب تک کسی میدان میں اسلامی ہند نے چونکہ شکست کی رسوائی نہیں اٹھائی تھی اس لئے ایران کی ان آوازوں سے اتنا تو متاثر نہیں ہوا جتنی کوئی محکوم مفتوح قوم متاثر ہو سکتی ہے، لیکن میل ملاپ اور احسان مندی کے جذبات نے ہندوستان کو اتنا متفعل ضرور کر دیا، کہ جو ملک اب تک صرف تصوف و فقہ کی جولانگاہ تھا، اب ان علوم سے ہٹا کر آہستہ آہستہ اس کا میلان ایرانیوں کے ان لفظی گورکھ دھندوں کی طرف فلسفہ اور منطق یا عقلیات کے پرشوکت ناموں سے بڑھنے لگا۔ زیادہ دن نہیں گزرنے پائے کہ

---

[۱] حکومت آصفیہ کے دارالترجمہ نے فلسفہ کی اس ضخیم کتاب کا اردو میں ترجمہ کرا دیا ہے جس کی پہلی جلد کا ترجمہ خاکسار نے اور باقی جلدوں میں سے ایک حصہ کا مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اور دوسرے حصہ کا مولوی میرک شاہ کشمیری نے کیا ہے دنیا کی کسی زبان میں فلسفہ کی اتنی بڑی کتاب شاید ہی موجود ہو گی اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فلسفہ چونکہ نام ہی وسوسہ کا ہے مشرقی ہو یا مغربی لیکن اگر علم اس کا نام ہے تو صدر شیرازی کی یہ ایسا کام ہے جس میں ڈھونڈھنے والے فلسفہ کے ہر مکتب خیال والوں کے خیالات تلاش کر کے نکال سکتے ہیں ۱۲- منہ

بالآخر پرانے ذوق پر یہ جدید شوق غالب آگیا، اور ایسا غالب آیا کہ عالمگیر کے عہد کے ایک مشہور عالم جو عالمگیری فوج میں ایک بڑی مذہبی خدمت یعنی فریضۂ احتساب پر ملازم تھے، جس کا براہ راست تعلق فقہ اور فقہی مسائل کی تفصیلات ہی سے ہر فقہ اور اس کے جزئیات سے جو پورے طور پر واقف نہ ہو صحیح طور پر اس فریضہ کا انجام پانا اس سے مشکل ہی میری مراد میرزا زاہد سے ہے جو اس وقت تک عربی مدارس میں اپنے "زواہد ثلثہ" کی بدولت خاصی شہرت رکھتے ہیں اور منطق و فلسفہ میں حضرت شاہ ولی اللہ کے والد حضرت شاہ عبدالرحیم کے استاد ہیں، ان ہی میرزا ہد صاحب کے متعلق جو اگرچہ میں صدر محتسب عساکر عالمگیر تھے، مولانا شاہ عبدالعزیز راوی ہیں کہ۔

امیرے شرح وقایہ می خواند پیش حضور جد بزرگوار سبق نمی فرمود۔ ملفوظات ص۸۲	ایک امیر میرزاہد سے شرح وقایہ پڑھتا لیکن فقہ میں میرزاہد کو اپنے اوپر چونکہ اعتماد نہ تھا) اس لئے جب تک دادا (حضرت شاہ عبدالرحیم) نہ آجاتے میر صاحب سبق نہیں پڑھاتے تھے	میرزا زاہد ہروی کا در علم فقہ میں انکی کمزوری

شرح وقایہ پڑھانے میں تو محتسب صاحب کا یہ حال تھا لیکن اسی کے مقابلہ میں معقولات سے آپ کے تعلق کی جو نوعیت تھی شاہ عبدالعزیز ہی نے ان کا یہ دلچسپ فقرہ نقل کیا ہے کہ میرزا جان اور اخوند یوسف جن کے دوانی کے حواشی پر حواشی ہیں ان دونوں کے متعلق میرزا زاہد[1] کہا کرتے۔

تقریر میرزا جان جان من ست و تقریر اخوند جان جان من ست ص۸۳	مرزا جان کی تقریر تو میری جان ہے اور اخوند کی تقریر میری جان جاناں ہے۔	معقولات میں میرزا صاحب کا غلو

اور یہ اس زمانہ میں کچھ بیچارے میرزا زاہد ہی کا حال نہ تھا، تقریباً علماء کے اکثر افراد پر یہی کیفیت طاری تھی تاہم "حملہ نادری" سے پہلے ہندوستان کے علماء ایرانی فضلاء میں فانی نہیں ہوئے تھے، ان کے اعتراف فضل و مہارت کے ساتھ اپنی کمتری کا احساس ان میں نمایاں نہ ہوا تھا، اسی لئے بجائے تقلید جامد کے ان کے انفعالی تاثرات بظاہر مقابلہ کے رنگ میں ظاہر ہوتے تھے جیسے باقر نے اپنی کتاب "الافق المبین" کا نام قرآن سے انتحال کیا تھا، ٹھیک اسی کے توڑ پر شاہجہان کے عہد میں جونپور کے مشہور فلسفی ادیب ملا محمود جونپوری نے بالکل اسی طمطراقی طرز تحریر تو نہیں جو ملا باقر کی خصوصیت ہے لیکن اچھے خاصے بلند انشائی رنگ میں فلسفہ کی ایک کتاب تصنیف کی، اور انہوں نے بھی قرآن مجید ہی سے اس کا نام "الشمس البازغہ" اقتباس کیا، اسی طرح اورنگ زیب کے عہد میں ملا محب اللہ بہاری نے

---

[1] مگر باوجود اتنی معقولیت کے اس زمانہ کے معقولی کا یہ حال تھا کہ شاہ عبدالرحیم صاحب کی میرزاہد سے رمضان میں ایک دن دعوت کی اس عرصہ میں ایک کبابی نے کبابوں سے بھرا ہوا خوانچہ مرزا کے پاس لاکر رکھا کہ "نیاز در دو دام" مرزا نے کہا اے عزیز! پیر تو نہ ام استاد تو نہ ام نیاز چہ معنی؟ آخر دو دن کے بعد معلوم ہوا کہ اس کی دوکان کو مرزا کے سپاہی غلط جگہ پر ہونے کی وجہ سے اٹھانا چاہتے ہیں اسی کی رشوت میں دیا ہو آخر دام نے کر بیٹھا ملے ہوا لیکن ڈہائی روپیہ کے کباب آٹھ آنہ میں دے رہا تھا مرزا کو معلوم ہوا سخت برہم ہوئے اور پورے دام ادا کئے ۱۲ انفاس ص۳۳

اپنی مشہور دونوں درسی کتابوں یعنی مسلّم وسلّم کے نام میں بھی ایک ادیبانہ پہلو ملحوظ رکھا یہ دونوں کتابوں میں ڈھلے ڈھلائے ترشے ترشائے فقرے جہاں تک میرا خیال ہے ۔ میر باقر ہی سے ۔ شعوری یا غیر شعوری اثر پذیری کی بنا پر داخل کئے گئے ہیں مگر اب تک دونوں ممالک کے فضلاء گویا ایک حد تک "رقیبانہ" تعلقات رکھتے تھے ، اگرچہ سچ یہ ہے کہ غیر محسوس طور پر ایران کے تفوق کو وہ اپنے طرزِ عمل سے گونہ تسلیم کرتے جاتے تھے ۔

نادری حملہ کے بعد یہاں کے علماء ایرانی علوم و نظریات سے بری طرح متاثر ہوئے

لیکن نادری حملہ نے تو اس نامحسوس کو محسوس اور غیر شعوری انفعال کو شعوری بنا دیا بلکہ جیسا کہ تمام مفتوح ہزیمت خوردہ اقوام کا قاعدہ ہے انھوں نے اپنے اس انفعال و تاثر کو سرمایہ صد افتخار ، اور موجب ہزار نازش و امتیاز قرار دے دیا جس کا اندازہ ہندی علماء کی ان کتابوں سے ہو سکتا ہے ۔ جو حملہ نادری کے بعد ہندوستان میں لکھی گئیں ، میر باقر کا نام اسی کے بعد "خیر اللحقہ بالمہرۃ" "سید الاذکیاء"[1] اور خدا جانے کیا کیا ہو گیا ۔

اس بحث میں ذرا زیادہ بسط سے میں نے قصداً کام لیا ہے ، کیونکہ آئندہ جیسا کہ معلوم ہوگا حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے قلم نے جہاں اور کام انجام دیئے ہیں ایران کی اس ذہنی مرعوبیت کے ردِ عمل میں بھی اس نے کامیاب کوشش کی ہے ، حضرت کی اس خدمت کا صحیح اندازہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اس عہد کی اس ذہنی و علمی کیفیت کا کم از کم اجمالاً حال لوگوں کو معلوم نہ ہو ، جس کا میں نے اس وقت ذکر کیا ، اب میں پھر اصل بحث کی طرف توجہ کرتا ہوں ، کہ نادر ہندوستان سے لیجانے کو تو جو کچھ بھی لے گیا لیکن اسی کے ساتھ ملک میں ایک مصیبت بھی چھوڑ گیا ، یعنی ایران کے دینی رجحانات اور ذہنی اور دماغی میلانات میں قدرتاً مفتوح ہندوستانیوں میں جو پہلے سے بھی بہت کچھ متاثر تھے اور بھی شدت پیدا ہو گئی ، بلکہ نادر شاہ اگر یوں ہی مار پیٹ اور تاخت و تاراج کر کے نکل بھاگتا تو شاید عداوت و بغض کی وجہ سے کوئی دوسری کیفیت پیدا ہوتی ، لیکن ہوا یہ کہ ۔

نادر شاہ کا بے پناہ رعب

ساری خواری و ذلت اور بربادی و تباہی ، کے باوجود دیکھے ہوئے بادشاہ محمد شاہ نے نادر شاہ کی باضابطہ ہفتوں مہمانی کی دربار کے بڑے بڑے امراء نادر شاہ کی خدمت پر مقرر ہوئے عمدۃ الملک جیسا امیر کبیر بیچارہ نادر کو قہوہ پلانے پر مامور ہوا تھا ، اور یہی حال دوسرے امیروں کا تھا ، بہرحال محمد شاہ ضیافت نادر شاہ بکمال تکلف قرار داد "اور بات اسی پر ختم نہ ہوئی بلکہ اسی کے ساتھ نادر شاہ نے ۔

نادر شاہ کے لڑکے کے نکاح میں شاہجہاں کی پوتی ۔

دخترے از احفاد شاہجہاں بادشاہ بحبالہ نکاح پسر کوچک خود نصر اللہ مرزا کہ ہمراہ داشت درآورد ۔
سیر المتاخرین

شاہجہاں بادشاہ کی پوتیوں میں سے ایک لڑکی نادر کے چھوٹے لڑکے نصر اللہ مرزا کے نکاح میں دیدی جو اسکے ساتھ ایران سے ہندوستان آیا تھا ۔

---

[1] یعنی پچھلے لوگوں میں ماہرین فن کی صف میں سب سے بہتر آدمی جو شریک ہوا وہ میر باقر ہے ۱۲

ہندوستانی امرا بلکہ خود شاہی خاندان والوں سے صدیوں کے ناز و تنعم نے حمیت و غیرت کی حرارت یوں بھی بجھادی تھی اب یہ عزیز داری کا رشتہ جوش انتقام کو فرو کرنے کے لئے ان کے بزدل قلوب کے لئے بہانہ مل گیا۔ اور یوں بزدلی کے رذیلہ پر جذبہ رواداری اور وسعت چشمی کی چادر اڑھادی گئی، نادر نے جو کچھ کیا دہرا تھا سب بھلادیا گیا" آقا جوش آمدید کے ساتھ ہر ایرانی کا ہندوستان میں خیر مقدم ہونے لگا، ان کی کتابیں، شوق سے پڑھی جانے لگیں ان کے علما کی باتیں دلچسپی سے لوگ سننے لگے اور اس کے جو نتائج ہو سکتے ہیں وہ ظاہر ہے۔

نادر شاہ ہی کے طفیل ہندوستان میں روہیلہ پٹھانوں کا سیلاب۔

لیکن معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوجاتا ہے، ظاہر ہے کہ نادر کابل و قندھار کے راستہ سے ہندوستان میں داخل ہوا تھا، راستہ میں ان علاقوں کے باشندوں نے مزاحمت کی لیکن باوجود اپنی مشہور جلادت و شجاعت کے قزلباشوں کی ضرب کی تاب نہ لاسکے، ہر جگہ ان کے پاؤں اکھڑتے چلے گئے اور نہ صرف کابل و قندھار بلکہ سرحد کے آفریدی و مہمندی مسعودی، اور دوسرے جاں باز و جاں فروش قبائل بھی نادر کے بڑھنے کو روکنے میں کامیاب نہ ہو سکے ایسا عجیب و غریب واقعہ کیسے پیش آیا، تاریخ کا یہ اہم سوال ہے اور ہماری بحث سے خارج ہے۔ تاہم بعض اشارات تورانی و ایرانی تنازعات کے قصہ میں مل سکتے ہیں، غور کرنیوالے شاید ان کی مدد کر صحیح نتیجہ تک پہونچ سکتے ہیں۔

بہر کیف یہ واقعہ تھا کہ ہر جگہ کابل و قندھار و سرحد کے پٹھانوں کو بھی نادر کے مقابلہ میں زک اٹھانی پڑی اور ہر جگہ خوب نادر نے ان پر عافیت تنگ کی، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ہزیمت خوردہ پراگندہ قوم اپنے علاقوں سے بھاگ بھاگ کر ہندوستان میں پناہ ڈھونڈھنے لگی، اور

جمعے ازاں قوم پراگندہ بہ ہندوستان درآمدہ در ہر جا سکنی و اکثر در سرکارات ملازم شدہ داخل سپاہ گشتند سیر ۸۰۴

اس پراگندہ پریشان قوم کا ایک حصہ " ہندوستان " پہونچا، اور ہر جگہ انہوں نے سکونت اختیار کی اور ملک کی مختلف سرکاروں (علاقوں) میں انہوں نے ملازمت اختیار کرلی۔

اور مختلف سرداروں کی ماتحتی میں جتھے بنا بنا کر انھوں نے چند دنوں میں اپنے مختلف مرکز قائم کرلئے خصوصاً

محمد خاں معروف بہ روہیلہ مورد التفات اعتماد الدولہ گردیدہ بعضے محالات جاگیرات و خالصہ را بطور ملکیت قابض و متصرف بہ توجہات وزیر گشت۔

محمد خاں جو روہیلہ کے نام سے مشہور ہے وہ اعتماد الدولہ (امین خاں) کی نظر التفات سے سرفراز، اور اسی وزیر کی توجہ سے بعض محالات اور جاگیروں خالصہ وغیرہ پر بطور مالک ہونیکے قابض ہوگیا۔

چوں صاحب جرأت و شخص صاحب ارادہ و شعور بود میں

چونکہ محمد خاں جرات و ہمت والا آدمی تھا اور ارادہ و عزم

افغانان و روہیلہ ہائے گریختہ قندہار و اطرافش را باخود رفیق ساختہ بنام روہیلہ اشتہار و از اجتماع انہا اقتدار یافت ملک بسیار سے راش آنولہ و سنبھل و مرادآباد و بداؤں و روہیلہ کے نام سے اس کی شہرت ہوئی۔ بریلی وغیرہ متصرف گشت ۔ صلاحہ

اور تمیز و شعور کا بہرہ رکھتا تھا اس نے قندہار اور اس کے گرد و نواح کے بھاگے ہوئے روہیلوں کو اپنے ساتھ کرلیا اور ان لوگوں کے جمع ہوجانے سے اس شخص کو اچھی خاصی قوت حاصل ہوگئی ملک کا ایک بڑا علاقہ مثلاً آنولہ سنبھل ۔ مرادآباد ۔ بدایوں ۔ بریلی وغیرہ کو اپنے تصرف میں لے آیا۔

یہ مطلب نہیں ہے کہ اس سے پہلے اس علاقے کے باشندے ہندوستان میں نہیں پائے جاتے تھے ، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اپنے ملک کو چھوڑ کر اس بے سر و سامانی کے ساتھ روہیلوں کی ایک بڑی تعداد یکایک جو ہندوستان کے بالائی علاقوں اور خصوصًا دہلی میں پھیل گئی ، تو اس کا سبب یہی نادر اور اس کی عجیب و غریب لشکر کشی تھی ، اب ہوا یہ کہ ایک طرف نادر کی وجہ سے ایرانی اور ایرانی مذہب و ذہنیت رکھنے والوں کو ملک میں تفوق حاصل ہوا ، اور ان ہی کے ساتھ ایک اور جدید عنصر بالکل ان کے مقابل یعنی روہیلوں کا بھی اقتدار بہ تدریج جڑ پکڑنے لگا تیسرا عنصر تورانیوں کا تو پہلے ہی سے موجود تھا، کہ حکومت ہی تورانیوں کی قایم کی ہوئی تھی ۔ —— جیسا کہ میں نے عرض کیا آخر زمانہ میں اورنگ زیب کے بعد تورانی اور ایرانی سوال میں کافی شدت پیدا ہوتی چلی جاتی تھی جس کی بظاہر تعبیر تورانی و ایرانی سے کیجاتی تھی ، لیکن در اصل یہ مقابلہ سنیوں اور شیعوں میں تھا ، سنیوں ہی کا نام تورانی رکھا گیا تھا اور شیعوں کو کبھی ایرانی اور کبھی "سادات" کے نام سے خصوصًا "سیر المتاخرین" کے مصنف جو خود شیعی ہیں ، یاد کرتے ہیں ، ایک موقعہ پر طباطبائی نے ان تورانی بیچاروں کے متعلق جن میں سب سے زیادہ بدنام آصف جاہ بہادر کا خاندان تھا اُن کے خاص چچازاد بھائی اعتماد الدولہ کے متعلق طباطبائی لکھتے ہیں ۔

اعتماد الدولہ وغیرہ تورانیاں کہ عداوت سادات را سرمایہ سعادت خود دانستہ (۴۷۸)

اعتماد الدولہ وغیرہ تورانی جو سادات کی دشمنی کو اپنی سعادت کی پونجی خیال کرتے ہیں ۔

الغرض یہ دو متقابل عناصر تو ہندوستان میں پہلے ہی سے موجود تھے ، اور گو طباطبائی دونوں فرقوں کی باہمی عداوتوں کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں ، لیکن سچی بات یہ ہے کہ تورانی جن لوگوں کا نام رکھا گیا تھا یہ عمومًا ترکستان یعنی بخارا ۔ سمرقند ۔ تاشقند ۔ خیوہ ۔ کاشغر وغیرہ کے لوگ تھے ، اور جن لوگوں کو ان ممالک کے حالات کا خصوصًا جس زمانہ سے ہم بحث کر رہے ہیں علم ہے ، وہ جانتے ہیں کہ اس وقت اس ملک کے مسلمان بہ نسبت فقہاء اور علماء کے زیادہ تر حضرات صوفیہ کرام کے زیر اثر تھے ، اور تصوف کی لوگ جو کچھ بھی خرابیاں بیان کریں لیکن اتنا تو ہر شخص کو ماننا پڑے گا کہ صوفیانہ مسلک رکھنے والے نفوس بجائے تنگ چشم ہونے کے وسیع المشرب ضرور ہوتے ہیں حتیٰ کہ اسی بنیاد پر "الصوفی لا مذہب لہ" کا مقولہ مشہور و معروف ہوگیا ہے ، بلکہ بعضوں کا تو خیال ہے کہ صوفیوں اور شیعوں میں بجائے تخالف اور تصادم کے توافق کے جہات زیادہ ہیں ، اور اسی لئے سمجھا جاتا ہے کہ تصوف کا بہت کچھ میلان تشیع کی طرف رہا ہے ۔ جس کی

ایک مثال شاید خود حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی بھی ہو سکتی ہے کہ مسئلہ خلافت کے متعلق کہاں تو آپ کی رائے یہ ہے کہ عام اشاعرہ جو

تقریر می کنند کہ خلافت ایشاں بہ نص نیست مطلقاً یا بہ نص جلی نیست بلکہ امر اجتہادی ست کہ اہل عصر بنا بر اجتہاد بر آں اتفاق نمودند۔

یہ کہتے ہیں کہ (حضرات خلفاء) کی خلافت مطلقاً کسی نص سے ثابت ہی نہیں ہے یا نص صریح واضح سے ثابت نہیں ہے بلکہ ایک اجتہادی بات ہے اس زمانہ کے لوگ اپنے اجتہاد اور غور و فکر سے ان لوگوں کی خلافت پر متفق ہو گئے۔

تو اشاعرہ کا یہ خیال شاہ صاحب کے نزدیک درست نہیں ہے بلکہ

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ازاں علم شریف نصاً و اشارۃً خبر دادند تا آں کہ تکلیف عباد باستخلاف ایں بزرگواراں عملاً و اعتقاداً متحقق شد و پردہ از روی کار بر انداختہ گشت۔

بلکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اس شریف علم کی نص اور اشارہ ہر طریقہ سے خبر دی ہے، حتیٰ کہ اسی بنیاد پر اللہ کے بندے اس بات کے مکلف ہوئے کہ ان بزرگوں کو خلیفہ مقرر کریں اور عملاً و اعتقاداً یہی بات واجب ہوئی

یہ اس ازالۃ الخفاء کے مصنف علام کی رائے ہے جس کو پڑھکر وہی نہیں جو خاندان ولی اللہی کے حلقہ بگوشوں میں ہیں بلکہ وہ بھی جن کے متعلق مشہور کیا گیا ہے کہ بجائے عقیدت و نیاز کے ہمیشہ نسلاً بعد نسل اپنے کو وہ علم کے اس سلسلہ اور خانوادہ کے حریف مقابل سمجھا کئے میری مراد مولانا فضل حق خیرآبادی سے ہے۔ ان کے بڑے مداح شاگرد مولانا محسن بہاری رحمہ اللہ خود اپنی براہ راست سنی ہوئی شہادت ادا کرتے ہیں کہ جب الور میں مولانا فضل حق سے وہ پڑھا کرتے تھے تو اسی زمانہ میں۔

وقعت فی یدہ نسخۃ من کتاب ازالۃ الخفاء فکان اولع بھا و یکثر النظر فیھا و ان فراغ من درسہ وسائر ما یشغلہ من شأنہ فلما وقف علی شیٔ کثیر منھا قال بمحضر من الناس وکنت فیھم ان الذی صنف ھذا الکتاب لبحر زخار لا یری لہ ساحل (الیانع ص۳۹ مطبوعہ علی مجال الطابع)

مولانا فضل حق کے ہاتھ ازالۃ الخفاء کا ایک نسخہ کہیں سے لگا مولانا اس کے مطالعہ کے حریص تھے، اور جب درس و تدریس یا دوسرے مشاغل سے فرصت ملتی تو بکثرت اسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف رہتے، جب مولانا اس کتاب کے بڑے حصہ کو پڑھکر فارغ ہوئے تب آپنے سب کے سامنے جن میں میں بھی شریک تھا یہ فرمایا کہ جس شخص نے یہ کتاب تصنیف کی ہے وہ تو ایک دریائے بے کراں ہے، جس کے ساحل کا پتہ نہیں چلتا۔

مگر اسی ازالۃ الخفاء کے مصنف نے فیوض الحرمین میں جو یہ لکھا ہے کہ

ان طبیعتی وفکرتی اذا ترکتا و انفسھما فضلتا

میری طبیعت اور میری فکر کو جب اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے

علیا کرم اللہ وجہہ واحببتہ اشد محبۃ تو دونوں حضرت علی کرم اللہ وجہ کو فضیلت دیں اور دونوں کو حضرت سے شدید محبت ہے[1] —

تو کیا آپ کی طبیعت و فکرت کا یہ رنگ اسی تصوف کا نتیجہ نہیں ہے جس کے آپ "کابراعن کابر" وارث تھے وہ تو غنیمت ہوا کہ دربار رسالت سے جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں الوصاۃ بتفضیل الشیخین یعنی شیخین (حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالے عنہما) کو فضیلت دینے کی وصیت ہوئی اس لئے فرماتے ہیں کہ یہ تفضیل شیخین کا اعتقاد شیٔ طلب منی التعبد بہ خلاف المشتہی ایک ایسی چیز ہی کہ میری ذاتی خواہش کے خلاف مجھے اس کے ماننے وھیہات ھذہ المناقضات من لولا ان اور عبادت خدا سمجھکر ماننے کا حکم دیا گیا ہی۔ افسوس مجھ میں یہ شدۃ الجامعیۃ ھی التی اوقعتنی فی کس قسم کی متناقض اور متضاد باتیں ہیں لیکن مجھ میں شدید ذالک جامعیت کا جو رنگ پایا جاتا ہی اسی نے اس حال تک مجھے پہونچایا ہے۔ (فیوض الحرمین ص۶۲)

خیر یہ تو بیچ کا ایک جملہ معترضہ تھا، میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ ہمایوں کے بعد مغل دربار میں تورانیوں اور ایرانیوں یا دوسرے لفظوں میں سنیوں اور شیعوں دونوں کی آمد ہورہی تھی، دونوں طبقوں کے اُمرا حکومت کی مشین میں داخل ہو ہو کر اپنی اپنی فراخور قابلیت کے لحاظ سے پرزے بنتے چلے جاتے تھے، اور گو ان دونوں میں رقابتیں ضرور رہتی تھیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ محض سُنی ہونے یا شیعہ ہونے کی وجہ سے اس اختلاف نے کبھی کسی سخت خطرناک فساد کی شکل اختیار نہیں کی۔

جہاں تک واقعات سے معلوم ہوتا ہے، اولاً تو باہم مذہبی مناقشوں کا کوئی ایک دوسرے کو موقعہ ہی نہیں دیتا تھا، بلکہ حتی الوسع ہر ایک دوسروں کے جذبات کا عموماً خیال کیا کرتا تھا اور گاہے ماہے اگر کوئی ناخوش گوار گفتگو اس سلسلہ میں ہو بھی جاتی تو اُسے غیر معمولی اہمیت نہیں دیجاتی تھی اور بات وہیں رفع دفع ہوجاتی تھی اور خواہ مخواہ اس کو جماعتی جھگڑا بنانے کی کوشش نہیں کیجاتی تھی، باقی پچھلے دنوں میں سادات بارہ کا جو قضیہ نامرضیہ پیش آیا اس میں شک نہیں کہ یاروں نے اس میں ایک حد تک شیعہ سنی کے اختلاف کا رنگ ضرور بھرا اور خوب بھرا۔ امیر الامراء حسین علی خاں کے قتل پر مرثیے لکھے گئے، اور بڑے دردناک مرثیے لکھے گئے۔ گویا اس واقعہ کو کربلا ثانی ٹھرایا گیا۔ میر عبد الجلیل بلگرامی کا مرثیہ تو اسی مشہور مصرعہ سے شروع ہوتا ہے۔ ؎ آثار کربلاست عیاں از زمین ہند

---

[1] الفرقان۔ شاہ صاحب کی طبیعت کا یہ میلان اسی قسم کا تھا جیسا کہ عموماً لوگوں کو اپنے روحانی بزرگوں کے اعزہ و اقارب خصوصاً انکی اولاد کی طرف ہوتا ہے جو صرف "طبیعت" ہی کا اقتضا ہوتا ہے اور امور دین میں طبیعت کے اس اقتضا کو کوئی دخل نہیں بلکہ یہاں اصل چیز کتاب و سنت کے دلائل ہیں۔ تو چونکہ دلائل کا فیصلہ تفضیل شیخین کے حق میں تھا جیسا کہ خود شاہ صاحب نے ازالۃ الخفاء اور قرۃ العینین میں پورے شرح و بسط کے ساتھ اس کو ثابت فرمایا ہے اسلئے شاہ صاحب نے اپنی ذاتی چاہت اور طبعی میلان کے خلاف اسکو اختیار فرمایا پھر روحانی مکاشفہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بھی آپ کو تفضیل شیخین ہی کی وصیت ہوئی ۱۲

اس باب میں اتنے غلو اور مبالغے سے کام لیا گیا کہ جب جانسٹھ کی جنگ میں حسین علی خاں کے ایک عزیز سیف الدین خاں لڑتے ہوئے کام آئے، تو طباطبائی جیسے روشن خیال بزرگ نے بھی اس کے واقعات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جن دنوں یہ واقعات پیش آئے:۔

از معتمداں مسموع افتاد کہ دراں ایام علی التواتر سرخی شفق صبح و شام بمرتبہ ازدیاد و اشتداد داشت کہ گویا دامن فلک جفاکار آلودۂ خون مظلوماں و دیدہ لیل و نہار بر ماتم آں ابرار خوں فشاں ست ص ۴۶۴ ج ۲

معتبر لوگوں سے یہ بات سنی گئی کہ ان دنوں میں مسلسل صبح و شام کے شفق کی سرخی اتنی زیادہ تیز ہو جاتی تھی کہ گویا فلک کا دامن مظلوموں کے خون سے آلودہ ہو رہا ہے اور دن و رات کی آنکھیں ان عزیزوں کے ماتم میں خوں فشاں ہیں

لیکن جو اصل واقعات سے واقف ہیں اور اجمالاً میں بھی کچھ پہلے ذکر کر چکا ہوں، کیا ان کے دیکھنے والے ایک لمحہ کے لئے بھی "سادات بارہ" کے جھگڑوں کو واقعی کسی مذہبی سوال کا نتیجہ قرار دے سکتے ہیں؟ تاریخ اسلام میں یہ کوئی نئی بات نہیں تھی، اس سے پہلے بھی مختلف مواقع پر جاہ و اقتدار کے متوالوں نے اپنے اپنے ہم خیالوں میں ہمدردی کا نشہ پیدا کرنے کے لئے اپنی اپنی خواہشوں پر مذہب کا نقاب چڑھایا تھا والقصۃ بطولہا۔)

بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا کہ نادر شاہی تلوار کی شرر باریوں، اور برق افشانیوں نے روہیلوں کی ایک بڑی تعداد کو جب اپنے اپنے علاقوں سے منتشر اور پراگندہ کرکے ہندوستان کی طرف دھکیل دیا، تو ایرانی و تورانی عناصر کے ساتھ اب ملک اور دربار دونوں میں ایک جدید موثر عنصر کا اضافہ ہو گیا، اور بات اسی پر ختم نہیں ہو گئی بلکہ نادر شاہ کی واپسی اور راستہ میں اچانک اس کے قتل کیوجہ سے جب شاہ ابدالی کو کابل و قندھار کے علاقوں میں تسلط حاصل ہوا اور مختلف اسباب و وجوہ کی بنا پر ایک دفعہ نہیں بلکہ مسلسل تھوڑے تھوڑے وقفہ کے ساتھ صرف روہیلوں کے جرگوں کو ساتھ لیکر شاہ ابدالی نے ہندوستان پر سات حملے کئے جن میں آخری حملہ وہی تھا جو "پانی پت کی مرہٹہ جنگ" کے نام سے مشہور ہے جس کا اجمالاً ذکر میں پہلے کر چکا ہوں اس طرح نادر شاہ کے ستائے ہوئے خانہ برباد روہیلوں کیلئے شاہ ابدالی نے زمین تیار کر دی کہ وہ ہندوستان کی اس حکومت میں جس پر عالم سکرات طاری تھا، اور ہر طرف طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا اپنے لئے مواقع فراہم کریں۔
علی محمد روہیلہ تو پہلے ہی سے ایک مرکز تیار کر چکا تھا، اور وہی علاقہ جو آج روہیل کھنڈ کے نام سے موسوم ہے ان کے تسلط کی آماجگاہ بنا ہوا تھا ان کے نفوذ و اثر کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ علاقہ ان ہی کے نام سے مشہور ہو گیا اور اب تک اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔ خصوصاً "مرہٹی فتنہ" کے استیصال کے بعد شاہ ابدالی رحمۃ اللہ علیہ نے سلطنت دہلی کا جو نظم قائم کیا، یعنی بادشاہ شاہ عالم (جو اس وقت شاہزادہ عالی گہر کے نام سے مشہور تھے) یہ تو بادشاہ رہیں گے اور امیر الامرائی کی خدمت نجیب الدولہ روہیلہ کو اور وزارت کا چارج نواب وزیر اودھ کے سپرد ہوا، اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ روہیلوں کا ملک پر ایسا اقتدار قائم ہو چکا تھا جس سے قطع نظر ناممکن تھا۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا

اب ملک میں تین عنصر پیدا ہو گئے تھے یعنی ایرانی تورانی روہیلے اسی لئے شاہ ابدالی نے بادشاہی تو تورانیوں میں رکھی کہ وہی اب تک اس کے خاندانی طور پر مستحق تھے، وزارت ایرانیوں کو کہئے یا شیعوں کو دی گئی، اور امیر الامرائی کا عہدہ ایک روہیلہ امیر نجیب الدولہ کے سپرد ہوا۔

روہیلوں کا حکومت دہلی کے ایسے جلیل منصب پر اقتدار حاصل ہونے کا لازمی نتیجہ تھا کہ روہیلے جو اب تک اپنا ماوی الملجا زیادہ تر روہیل کھنڈ کو بنائے ہوئے تھے، اب دلی میں بھی اقتدار و قوت کے مظہر بن کر اپنے وجود کو محسوس کرانے لگے، علامہ محسن البہاری الترہتی "الیانع" میں لکھتے ہیں:-

لما استولی احمد الابدالی المعروف بالدرانی احد ملوک جبال الافاغنہ علی دہلی وکثر فی سککہا جماعات من قومہ وکانوا اکثر حصی من شعرات غنم کلب	جب احمد ابدالی جو درانی کے لقب سے مشہور ہیں، اور افغانی کوہستانوں کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ ہیں ان کا تسلط دہلی پر ہو گیا، اور دلی کی گلیوں میں بکثرت ان کی قوم کے لوگ بھر گئے اور یہ لوگ قبیلہ کلب کی بکریوں کے بالوں سے بھی زیادہ تعداد میں تھے۔[1]

اسی کا اثر تھا کہ بریلی میں حافظ الملک رحمت خاں، نجیب آباد میں نجیب الدولہ اور ان کے سوا اور بھی دوسرے دوسرے مقامات میں روہیلوں کی چھوٹی بڑی ریاستیں قایم ہو گئیں حتی کہ اس وقت تک رامپور، ٹونک[1]، بھوپال ان ہی روہیلوں کی یادگاریں نیم آزاد ریاستوں کی صورت میں موجود ہیں، بہرحال نادر شاہ نے دشمن بن کر اور شاہ ابدالی نے دوست بن کر ان روہیلوں کو ہندوستان خصوصاً بالائی علاقوں میں بھر دیا۔ ظاہر ہے کہ روہیلے عموماً صرف سنی مسلمان ہی نہیں بلکہ پکے حنفی بھی ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ یہ اپنے اندر چند مخصوص قومی خصوصیات رکھتے ہیں۔ جن کی وجہ سے یہ ان دونوں قدیم عناصر تورانی و ایرانی سے الگ نظر آتے تھے۔ اور مختلف وجوہ و اسباب نے ایک حد تک ان کو ایک الگ عنصر کی حیثیت سے ملک میں قایم کر دیا تھا۔ خصوصاً ان کے مزاج میں فطرتاً جو ایک قسم کی سختی اور کرختگی پائی جاتی ہے جو نہ ایرانیوں میں تھی اور نہ تورانیوں میں۔ اور اسی کے ساتھ باوجود سنی مسلمان ہونے کے تورانیوں اور ان میں ایک نمایاں فرق یہ تھا جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کیا ہے کہ تورانی زیادہ تر صوفی مشرب، اور حضرات صوفیائے کرام و اولیائے عظام کے زیر اثر تھے[2] اُن کے برخلاف روہیلے مسلمانوں پر بجائے صوفیوں اور ارباب باطن کے زیادہ تر تنگ نظر ظاہر بین، "جزئیاتی فقہا" کا پنجہ سختی سے جما ہوا تھا

---

[1] انگریزوں کے تسلط کے بعد سنبھل کے ایک پٹھان میر خاں نے اسی "اکثر حصی من شعرات غنم کلب" کے لوگوں کو جمع کر کے جن میں مختلف امراء کے تکیل یافتہ فوج کے سپاہی بھی شریک ہو گئے تھے مختلف علاقوں خصوصاً راجپوتانہ مالوہ کی ریاستوں پر چھاپہ مارنا شروع کیا آخر میر خاں سے انگریزوں نے ایک معاہدہ کر لیا اور راجپوتانہ مالوہ کی ریاستوں سے اضلاع کاٹ کاٹ کر ایک ریاست بنا دی گئی جن کا مرکز حکومت ٹونک ہے جاورہ کی ریاست بھی میر خاں ہی کے ایک رفیق عبدالغفور خاں کو حاصل ہوئی ۱۲۔

[2] اس وقت کتاب تو میرے سامنے نہیں ہے لیکن نواب صدر یار جنگ مولینا حبیب الرحمن خاں شروانی مدظلہ العالی نے ظہیر الدین بابر پر جو مقالہ لکھا ہے اس میں بابر کے باپ کا ایک واقعہ درج ہے کہ حضرت عبید اللہ احرار کی مجلس میں ایک دن حاضر ہوا اور دیکھنے ہڈی پر اتفاق سے بیٹھ گیا گھٹنوں پہ ہڈی چبھتی رہی لیکن ادباً اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں ۱۲۔

پشتہا پشت سے وہ اپنے ان ہی مذہبی پیشواؤں کے زیر اثر جنھیں یہ ملا کہتے ہیں ، زندگی گزار رہے تھے ، صاحب لیالی الجنی لکھتے ہیں :-

وکانوا اشد قوم عصبیۃ لما ینتحلونہ من آراء فقہائھم رحمھم اللہ تعالیٰ واشد الناس جمودا علیہا ۔

جن فقہاء رحمہم اللہ کی آراء کی پیروی کو ان لوگوں نے اپنا مشرب اور مسلک قرار دیا تھا ان کے معاملہ میں اپنے اندر سخت تعصب رکھتے ہیں اور اس پر جمے رہنے میں روہیلے سخت ترین قوموں میں ہیں۔

یہ تو بیچارے کسی شاعر نے شاعری کی ہے کہ اس کے معشوق کی محفل میں ——— " بات پریاں زبان کٹتی ہے "

لیکن اس قوم کا یہ واقعہ ہے کہ کیدانی جیسی معمولی کتاب کی ایک فقہی روایت یعنی 'چاہیے کہ تشہد میں اہل حدیث کے مانند شہادت کی انگلی نمازی نہ اٹھائے' ، اس مسئلے صدیوں بلکہ سنتے ہیں کہ اب تک یہ اہمیت حاصل کر لی ہے کہ اگر اتفاقاً نماز میں کسی کی انگلی اٹھ گئی اسی وقت اس کی انگلی تراش دی جاتی تھی علامہ رشید رضا مصری نے مغنی کے مقدمہ میں بنا یہ بیان درج کیا کہ

سمعتہ باذنی من بعض طلاب الافغانین فی مسجد لاھور الجامع فی ھذا وقد سالتھم عن صحتہ ما نقل عن بعض اھل بلادھم فی ذلک فقالوا انعم وعللوہ بانہ عقاب علی مخالفۃ الرسول وترک سنۃ ۔

میں نے اپنے کان سے بعض افغانی طلبہ سے لاہور کی جامع مسجد میں جو ہندوستان میں واقع ہے یہ سنا ہے میں نے دراصل ان سے دریافت کیا تھا کہ (انگلی تراشنے کا قصہ) کیا صحیح ہے؟ اس کے جواب میں ہاں کہا اور اسکی توجیہ یہ کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور ترک سنت کی یہ سزا دی جاتی ہے

تمباکو جیسی غیر منصوص چیز کی حرمت و حلت پر جو جھگڑا یہاں کے ملاؤں میں چھڑا سنا جاتا ہے کہ پچھلے چند سالوں تک یہ قصہ ختم نہیں ہوا تھا ، بیچارے کوٹہ ملا نے تمباکو کی حلت کا فتوے دیدیا تھا ، پھر کیا تھا ، مختلف جرگوں کے مجاہد دینی حمیت و غیرت کے نشہ میں چور ، اپنے ملاؤں کے زیر کمان باضابطہ مسلح ہو ہو کر کوٹہ ملا پر چڑھ دوڑے راستہ میں اس " دینی جہاد " کی ہم پر جو رجز پڑھا جاتا تھا میرے ایک دوست نے ہم سے بیان کیا تھا کہ وہ یہ تھا ۔

کوٹہ ملا کا پرد دی جو ساک شدہ ہم کا پرژدی ! (یعنی ، کوٹہ ملا کافر ہے اور جو اسکے ساتھ وہ بھی کافر ہے !

میرے ایک اور سرحدی ہم سبق کہتے تھے کہ تمباکو کی حرمت کے جو لوگ قائل تھے ان کا تشدد اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ جس کھیت میں تمباکو بویا جائے اس کھیت کے اطراف سے بیلوں پر غلہ لاد کر جو کوئی گزرے گا اس کا غلہ بھی حرام ہو جائے

بہر حال اس قوم کے اسی فطری " بطش شدید " اور ملاکیشی ، کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان اور مغلی حکومت جس میں ایرانی و تورانی اب تک گونہ رواداری اور باہمی مدارات کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے ، اس میں روہیلوں کی شدید ملایانہ ذہنیت نے بتدریج تلخی اور تندی کا اضافہ کرنا شروع کر دیا ، یہ تو ظاہر ہے کہ واقعی طور پر سرحدی پٹھان یا روہیلے نہ کبھی خارجی تھے نہ کبھی ہوئے اور نہ اب تک ہیں ۔ لیکن ان کی صوفیانہ سنیت " نہیں بلکہ شدید ملایانہ " سنیت " کا اندازہ اس سے

ہوسکتا ہی کہ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ جیسے بزرگ جو آج تک شیعوں میں اپنی مشہور کتاب "تحفہ اثنا عشریہ" کی وجہ سے بدنام اور حد سے زیادہ بدنام ہیں جس دن سے یہ کتاب لکھی گئی ہو، نہ صرف ہندوستان بلکہ سنا گیا ہو کہ ایران میں بھی اس کے جواب دینے کی بارہا کوشش کی گئی، لکھنؤ کے مجتہد مولوی سید محمد صاحب کے متعلق معتبر لوگوں سے معلوم ہوا ہو کہ انھوں نے بہت سی جلدوں میں اس کا جواب لکھا ہی، اور بھی بہت سے چوٹی کے مجتہدوں نے اسکے جواب لکھنے کی کوشش کی اور آج تک یہ کوششیں ہو رہی ہیں۔ بہر کیف شاہ صاحب کا سنیت کی حمایت میں جو شہرہ ہی وہ محتاج بیان نہیں، لیکن خود شاہ عبدالعزیز صاحب اپنا ذاتی واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک روہیلہ پٹھان جن کا نام حافظ آفتاب تھا اور شاہ صاحب کے وہ شاگرد تھے۔

"وہمیشہ حاضر درس می شد" فرماتے ہیں کہ

روزے ذکر حضرت امیر علیہ السلام بود چنانچہ عادت ما سنیان است کہ ہر صحابی کہ اند بجان و دل مناقب و فضائل او بیان می کنیم ہمچنیں کردم۔ (ایک دن حضرت امیر علیہ السلام کا تذکرہ تھا، پھر جیسا کہ ہم سنی لوگوں کی عادت ہو کہ جو صحابی بھی ہوں دل و جان سے ان کے فضائل اور مناقب کو ہم بیان کرتے ہیں حسب دستور اس تذکرہ میں بھی میں نے یہی کیا)

لیکن شاہ صاحب کے اس روزانہ حاضر باش روہیلہ تلمیذ رشید کا حال سنئے کہ محض اس لئے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ اس وقت شاہ صاحب نے دوسرے اصحاب و خلفاء کے مناقب و محامد کا چونکہ ذکر نہیں فرمایا تھا اس لئے باوجود سنی ہونے کے اور کسی کو نہیں بلکہ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق بے تحاشہ اس نے "شیعہ" ہونے کا فتویٰ صادر کر دیا خود شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ

بندہ را شیعہ فہمیدہ (بندے کو اس نے شیعہ سمجھ لیا)

اور اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اسکی "ملائی سنیت" نے شاہ صاحب کی جانب سے ایسی شدید نفرت اسکے دل میں پیدا کر دی کہ

آمدن درس موقوف کرد (کہ درس میں آنا بھی اس نے بند کر دیا۔)

یہ فتویٰ تو "تحفہ اثنا عشریہ" کے مصنف پر اس روہیلہ پٹھان نے لگایا، "ازالۃ الخفاء" اور "قرۃ العینین" وغیرہ کتابوں کے مصنف حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ بھی انکے ناوک تعصب سے محفوظ نہ رہ سکے، شاہ عبدالعزیز صاحب ہی کی روایت ہے فرماتے ہیں۔

ہم چنیں شخصے از والد ماجد مسئلہ تکفیر شیعی پرسید آنحضرت اختلاف حنفیہ کہ دریں باب ست بیان کردند۔ (یوں ہی ایک شخص نے والد ماجد سے شیعوں کے کافر قرار دینے کے متعلق فتویٰ پوچھا حنفی فقہاء کا اس باب میں جو اختلاف ہی والد ماجد نے اس کو بیان فرمایا۔)

"ملا کیش" غریب روہیلہ پہلی دفعہ تو یہ سن کر چپ ہو رہا اور پھر دہرا کر ذرا اصرار سے اپنے منشا کو ظاہر کرتے ہوئے

چوں مکرر پرسید ہماں شنید — جب اس نے دوبارہ وہی بات پوچھی تو جواب میں پھر وہی سنا

۔ یہ تیسری دفعہ اس کا یہ سننا تھا کہ آگ بگولا ہو گیا، جن کو وہ قطعی کافر سمجھتا تھا ان کے کفر کے متعلق اختلاف کا سننا اور دوبارہ پوچھنے کے بعد بھی سننا ناقابل برداشت ہو گیا، گیا تھا خود حضرت سے فتویٰ پوچھنے، لیکن اُلٹ کر خود مفتی بن بیٹھا

شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

شنیدم می گفت ایں شیعی ست — میں نے سنا وہ کہتا تھا کہ یہ (یعنی شاہ ولی اللہ) شیعی ہے

اور یہ حالت تو ہمارے سرحدی اور افغانی بھائیوں کی "سنیت" کی تھی، باقی رہی ان کی "حنفیت" سو اسکا کچھ اندازہ "رفع سبابہ" اور تبناک "کے مذکورہ بالا مسائل ہی سے ہو سکتا ہے" الیانع الجنی "کے مولف تحریر کرنے حضرت شاہ ولی اللہ کے زمانہ کے ان حنفی روہیلوں کی "حنفیت صلبۃ" یا "سنگین ملایانہ حنفیت" کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

وکانوا اذا قرع صماخہم ما ینابذ مقلدھم الذی استطابوا غلاکان احدھم یکاد یسطو بالذی خرجت منہ القولۃ وامتلاء علیہ غیظًا قد انتفخت اوداجہ واحمرت وجنتاہ کا نما اضرام العرفج صف ۵۳۔

ان کا حال یہ تھا کہ جب ان کے کان میں کوئی ایسی بات پہونچتی، جو ان کے اس تقلیدی امر کے خلاف ہوتی، جسے کل وہ اچھا سمجھتے تھے تو ان میں جو کوئی ہو، قریب ہوتا کہ اس شخص پر چڑھ بیٹھے جس کے منہ سے ایسی مخالفانہ بات نکلی ہوتی، غصہ سے اس کے مقابلہ میں بھر جاتا، اس کی گردن کی رگیں پھول جاتیں اس کے رخسارے سرخ ہو جاتے۔ اور ایسا معلوم ہوتا کہ جھاؤ کی لکڑی کے انگارے ہیں۔

ہندوستان میں رہ پڑنے کے بعد اگرچہ اب ان کی پچھلی نسلوں میں نسبتاً وہ کرختگی اور تصلب تو باقی نہیں رہا ہے جس میں کچھ تو اس ملک کی آب و ہوا کا اثر ہے۔ نیز اس کے سوا اور اسباب بھی ہیں جن کا کچھ ذکر شاید آئندہ آئے ورنہ جو اب تک ان ہی پتھریلے، کوہستانوں میں رہتے ہیں، ان کی دینی سختی کا حال جیسا کہ سید رشید رضا مصری نے لکھا ہو وہی ہو، وہ لکھتے ہیں:۔

ومن ذلک ان بعض الحنفیۃ من الافغانین سمع رجلا یقرء الفاتحۃ وھو بجانبہ فی الصف فضربہ بجمع یدہ علی صدرہ ضربۃ وقع بہا علی ظہرہ فکاد یموت وبلغنی ان لبعضہم کسر سبابۃ مصل لرفعہ ایاہ فی التشہد۔۔

(مقدمہ مغنی)

ان کی سختیوں کی داستانوں میں ایک قصہ یہ ہی جو بعض افغانی حنفیوں کے متعلق سنا جاتا ہو کہ اس نے جماعت میں اپنے برابر والے کو دیکھا کہ وہ سورہ فاتحہ (امام کے پیچھے) پڑھ رہا ہے، تو اس افغانی نے اس بیچارے فاتحہ پڑھنے والے کے سینہ پر اس زور سے دو ہتڑ مارا کہ وہ بیچارا پیٹھ کے بل زمین پر گر پڑا، اور قریب تھا کہ مر جائے اور مجھے یہ خبر بھی ملی ہو کہ ایسے ہی ایک شخص نے تشہد کی انگلی نماز میں اٹھائی تو بعض افغانوں نے اس کی انگلی توڑ دی

بہر حال فتنوں والی تاریکیوں کی جس "خونی موج کے آغوش" اور اسلامی ہند کے جس شدید طوفانی عہد کے ذکر کو

میں نے ناصیہ مضمون پر ثبت کیا ہے، غالباً اہل نظر کے سامنے اگرچہ جیساکہ چاہیئے میں کوئی تفصیلی بیان نہ پیش کرسکا ، لیکن ایک مجلاتی مقالہ میں اس تصویر کے جتنے خط و خال کو نمایاں کیا جاسکتا تھا، اپنے محدود معلومات اور کوتاہ رسائی کی حد تک ممکنہ کوشش کی گئی ہے ، کیونکہ بغیر اس کے سچی بات یہی ہے کہ اس "درتابندہ" کی حقیقی قدر و قیمت قطعاً نہیں پہچانی جاسکتی جس نے ابتلا و امتحان کی ان ہی خونی موجوں میں پرورش پائی اور طوفان کے ان ہی ہنگاموں میں انتہائی دانائی و فرزانگی کے ساتھ وہی جس کی محبت میں وہ ہر چیز کی محبت سے دست بردار ہو چکا تھا، اسی کی ملت مقدسہ اور امت مرحومہ کی کشتی کو اپنی وسعت و طاقت کی حد تک منجدھار سے نکالنے میں قطعاً کامیاب ہوا، (فصلی اللہ تعالیٰ علی نبینا و نبیہ و رسولنا و رسولہ وجزاہ اللہ عنا و عن امتہ نبیہ خیر الجزا)

یہاں تک کے تاریخی مباحث کا مقصد اور حاصل

میرا مطلب یہ ہے کہ گزشتہ بالا اوراق کے پڑھنے والے اب صحیح طور پر اندازہ کرسکتے ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ جس زمانہ میں پیدا ہوئے ، اور جن دنوں میں وہ سرزمین ہند میں زندگی گزار رہے تھے، اس وقت ہر چہار طرف سے اسلام نرغہ میں گھرا چلا جاتا تھا، شمالی مغربی علاقوں میں سکھوں کی آتشیں قوت سر اٹھا رہی تھی جنوبی ہند سے مرہٹوں کا سیلاب ٹھاٹھیں مارتا ہوا ملک کے "اعزہ کو اذلہ" بنانے میں بے دردی سے سرگرم تھا دونوں قوتوں میں باہم جو کچھ بھی اختلاف ہو، لیکن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے آثار و نشانات ان کے نام لیواؤں اور وابستوں حلقہ بگوشوں کا بالکلیہ قلع قمع کرنے پر دونوں ادھار کھائے بیٹھے تھے، تیسری طرف خلیج بنگال کے ساحلی علاقوں سے مغربی قومیں بتدریج اپنا پنجہ ملک پر جماتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھیں ـــــ اور یہ تو بیرونی فتنے تھے، اندر ایرانیوں اور تورانیوں، پھر ان کے ساتھ روہیلوں کے باہمی تصادم اور مختلف اغراض و مقاصد کی کش مکش سے "اسلامی حکومت ہند" کی قبا تار تار ہو رہی تھی ان سیاسی مفاسد کے ساتھ ساتھ صوفیائے غلط تصوف ، اور فقہا کے غلط تفقہ ، حد سے گزری ہوئی عصبیت، اور جاہلی حمیت نے امت کے شیرازوں میں الگ انتشار پیدا کر رکھا تھا ـــ اسی کے ساتھ ساتھ ایرانی علما، اور شعراء و ادباء کا دباؤ مختلف وجوہ سے ہندوستانی علماء ارباب فکر و نظر اور تعلیم و تدریس و تصنیف و تالیف کے نظام پر پڑ رہا تھا، اس کی وجہ سے آہستہ آہستہ یہاں کے اہل علم کا تعلق قرآن و حدیث تحقیقی فقہ و اصول فقہ اور عقائد و کلام سے ہٹ کر بے معنی لاطائل ذہنی اور لفظی مباحث کے گورکھ دہندوں میں الجھ کر "خسر الدنیا والآخرۃ" کی صورت پیدا کر رہا تھا کہ ان لاحاصل مساعی کا کوئی نتیجہ نہ ان کو دنیا میں مل سکتا تھا نہ آخرت میں، خصوصاً ایک ایسے زمانہ میں جب "مغل دربار" اور مغل دربار کے امرا، جو ان لفظی نکتہ نوازیوں اور دماغی عیاشیوں کے قدرداں تھے اور ان سے گونہ محظوظ بھی ہوتے تھے ، خود ان غریبوں کا اقتدار ہی اندر اندر کھوکھلا ہوتا چلا جا رہا تھا ان کے تختے خود ہی الٹ رہے تھے پھر وہ بیچارے دوسروں کی قدردانی کیا کرتے ، اور ملک میں جو نئی قومیں ابھر رہی تھیں، ان کے سامنے ان ایرانی نژاد لفظی کج بحثیوں کی کوئی قیمت نہیں تھی۔

غالباً ان حالات کو سب دیکھ رہے تھے کیونکہ سبھوں کے سامنے گزر رہا تھا جو کچھ گزر رہا تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا جو کچھ انجام ہونیوالا تھا وہ مشکل ہی سے کسی کو سوجھ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے عقل و حواس کو معطل کرکے ہر ایک اسی دھارے پر بہا چلا جا رہا تھا جدہر زمانہ کے تھپیڑے انھیں بہلئے لئے جا رہے تھے لیکن حیرت نہ کرنی چاہیئے خصوصاً اسلامی تاریخ کے مطالعہ کرنے والوں کو ششدر نہ ہونا چاہیئے کہ پہلی دفعہ نہیں بلکہ تیرہ سو سال سے اسلامی حدود کے جس علاقہ میں اس قسم کے واقعات پیدا ہوئے ہیں۔ تو کائنات کی وہی آخری قوت جس کے پیغام کا نام اسلام ہے، اور جس پر خدا نے اپنی پیام بری کے سلسلوں کو ہمیشہ کے لئے مختتم فرمایا ہے اسی کا کوئی معجزہ ضرور ایسے وقت میں ظاہر ہوا ہے اور ان منصوبوں کو خاک میں ملا دیا ہے جو دشمن اپنے دلوں میں سوچا کرتے تھے اور جن کا خیال کر کرکے ایمان والے سہمے جاتے تھے، یہی واقعہ ہندوستان میں بھی پیش آیا۔

فتنوں کے اس دور میں شاہ ولی اللہ کی آمد — ایک ایسے باپ سے جو مشرباً صوفی اور تعلیماً مشہور معقولی و منطقی عالم میرزا زاہد ہروی صاحبؒ زوائد ثلثہ[1] کے رشید شاگردوں میں تھے، اور کیسے رشید شاگرد کہ شاہ ولی اللہ نے خود اپنے والد کے زبانی نقل کیا ہے کہ ایشان با من التفات بسیاری کردند بحدے کہ اگری گفتم کہ امروز مطالعہ نہ کردہ ام می گفتند یک سطر یا دو سطر خوانید کہ ناغہ نشود (انفاس ص۳۲)

کہ مرزا زاہد کی توجہ میری طرف اس حد تک مبذول تھی کہ میں کہتا کہ آج میں نے مطالعہ نہیں کیا ہے اس لئے نہیں پڑھونگا تو میرزا کہتے کہ ایک یا دو سطر ہی پڑھ لو تاکہ ناغہ تو نہو

میرزا زاہد کی سب سے بڑی معرکۃ الآرا تصنیف حواشی امور عامہ شرح مواقف کے متعلق شاہ ولی اللہ کا بیان ہے ظاہراً تسوید حاشیہ شرح مواقف بتقریب قرأۃ حضرت ایشاں بود ص۳۲

حاشیہ شرح مواقف کی مسودہ نگاری کا کام میرزا نے اسی سلسلہ میں کیا جب والد ان سے یہ کتاب پڑھتے تھے

بہرحال اسی معقولی فلسفی کے ایک صوفی شاگرد کے صلب مبارک سے حق تعالے نے محض اپنے فضل و کرم سے بڑے سخت وقت اور کٹھن گھڑی میں ہندی مسلمانوں کو وہ گرامی ہستی عطا فرمائی، جس کا نام

---

[1] تقریباً ڈھائی سو سال سے اس ہراتی ہندی عالم کی تین کتابیں ہندوستان بخارا کابل وغیرہ کے مدارس میں داخل نصاب ہیں ان کتابوں کو اتنی اہمیت حاصل تھی کہ عالم ہی نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک کہ میرزا زاہد کی کتابوں میں سے کسی ایک پر یا سب پر کوئی حاشیہ نہ لکھا ہو مبالغہ نہیں ہے کہ ان تین کتابوں کے حواشی کی تعداد ہزاروں تک پہونچی ہوئی ہوگی، ہندوستان دراصل میرزا زاہد کے والد قاضی اسلم ہرات سے عہد جہانگیر میں آئے۔ بادشاہ نے قاضی القضاۃ کے عہدہ پر قاضی اسلم کا تقرر کر دیا تھا۔ قاضی اسلم ملا فاضل کے اور وہ میرزا جان شیرازی مشہور منطقی عالم کے شاگرد تھے۔ بہرحال انہی قاضی اسلم کے صاحبزادے کا نام میرزا زاہد ہے۔ معلوم نہیں کہ عام مدارس میں بجائے میرزا زاہد کے میر زاہد کیسے مشہور ہو گیا غالباً یہ تصحیفی غلطی ہے، بلکہ لوگوں کے اس غلطی پر دوسری غلطی یہ کی کہ "قال السید الزاہد" اور "قال السید السند" وغیرہ لکھنا شروع کیا۔ میرزا زاہد بچپن سے بڑے ذہین تھے کل تیرہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے عالمگیر کے زمانہ میں مختلف خدمتوں پر بحال ہوئے شاہ عبدالرحیم میں زمانہ میں ان سے پڑھتے تھے آگرہ میں فوج کے محتسب تھے علاوہ زوائد ثلثہ کے میرزا زاہد کا ایک حاشیہ شرح تجرید پر بھی ہے اور اشراقیوں کی کتاب "ہیاکل النور" پر بھی ایک شرح لکھی ہے شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے از مشرب صافی صوفیہ نیز بہرہ تمام داشتہ اند

شاہ ولی اللہ کے والد شاہ عبدالرحیم کی شخصیت

اگرچہ واقعہ یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ جو کچھ ہونے والے تھے اور ہندوستان میں جس دینی و علمی موسم کو ان کی مخلصانہ کوششوں نے پیدا کیا، اس موسم کی بہار کی ابتدا خود ان کے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم رحمۃ سے ہو چکی تھی، پہلی بازی جو شاہ عبدالرحیم نے جیتی وہ اس وقت کی بات ہے جب وہ طالب علم تھے اور فتاوی عالمگیری کی تدوین ہو رہی تھی ان کے ایک ساتھی جن کا شیخ حامد نام تھا ان کو بھی کام کا کچھ حصہ دفتر تدوین سے عطا ہوا تھا براہ محبت و دوستی شیخ حامد نے شاہ عبدالرحیم صاحب کو شریک کار کر کے کچھ یومیہ (تنخواہ) کی اُمید دلائی لیکن جو کسی آنے والے سال نکو کی بہار تھا، اس نے ملتی ہوئی تنخواہ سے انکار کر دیا اس انکار کی خبر جب شاہ عبدالرحیم کی بیوہ والدہ کو ہوئی تو برہم ہوئیں اور اصرار کر کے حکماً نوکری قبول کرنے پر مجبور کیا نوکر ہو گئے۔ مگر جب اس ملازمت کی خبر آپ کے مرشد خلیفہ ابوالقاسم کو ہوئی تو اب یہ برہم ہوئے اور ترک ملازمت پر تدغن شروع کیا شاہ صاحب نے والدہ کے حکم کا عذر پیش کیا۔ لیکن "پیر نے" اپنے حکم کی پیروی کا فیصلہ صادر فرمایا۔ پھسل جانے کا شاید موقعہ تھا لیکن شاہ عبدالرحیم سنبھل گئے، اور مرشد سے عرض کیا کہ آپ ہی دُعا فرما دیں کہ نوکری خود چھوٹ جائے ورنہ یوں چھوڑونگا، تو والدہ کی سخت آزردگی کا اندیشہ ہے، حصول ملازمت کیلئے نہیں بلکہ ترک ملازمت کی دُعا کرائی گئی اور کی گئی قبول ہوئی، عالمگیر کے پاس تدوین فتاوی کے ملازموں کی فہرست وقتاً فوقتاً پیش ہوتی رہتی تھی حسب دستور پیشی کا عالمگیر نے حکم دیا اور بلاوجہ شاہ عبدالرحیم کے نام پر قلم پھیر دیا۔ مگر ابھی امتحان کی ایک منزل باقی تھی اورنگ زیب نے تنخواہ بند کر کے اس سے بھی بڑا لقمہ پیش کیا فرمان ہوا کہ

اگر خواستہ باشد ایں قدر زمیں بدہید   اگر چاہیں تو اتنی زمین ان کو دی جائے

نوکری چھوٹی، جاگیردار بنائے گئے، قدرت جس کا ارادہ کچھ اور تھا اس کی توفیق نے پھر ان کے بازو تھام لئے شاہ عبدالرحیم صاحب سے "شاہی فرمان" کے بموجب جب استصواب کیا گیا تو باوجود تنگی معاش اور محض بے وسیلہ ہونیکے خود فرماتے ہیں

قبول نہ کردم و شکرانہ بجا آوردم و حمد خدا تعالےٰ گفتم   میں نے قبول نہیں کیا اور شکر ادا کیا اور حق تعالیٰ کی حمد کی

---

[1] شاہ عبدالرحیم کے اس قول سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اور آپ کے خاندان والوں کو جیسا کہ اس زمانہ کا عام دستور تھا حکومت کی کسی قسم کی کوئی جاگیر منصب وظیفہ مدد معاش وغیرہ نہیں ملی تھی، شاہ ولی اللہ کے متعلق میں نے بہت تلاش کیا بجز اس حویلی کے جو مدرسہ کے لئے محمد شاہ بادشاہ نے آپ کو پیش کی تھی اور کسی حکومتی امداد کا پتہ نہیں چلا شاہ عبدالرحیم تک تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے خاندان میں قدیم سے طبابت کا پیشہ چلا آتا تھا لیکن جیسا کہ شاہ عبدالعزیز کے ملفوظات میں ہے

"حکمت ہم در خاندان معمول بود چنانچہ جد بزرگوار عم فقیر دوامی کردند والد ماجد بندہ موقوف ساختہ ص"

شاہ ولی اللہ کے بعد بھی خاندان میں کوئی جاگیر وغیرہ آئی اس کے متعلق صرف مرحوم امیر شاہ خاں صاحب کی امیرالروایات میں ایک حکایت ہے کہ ضلع بلند شہر تحصیل سکندرہ میں حسن پور نامی ایک گاؤں اس خاندان کا تھا امیر شاہ خاں نے اس گاؤں کو خود بھی دیکھا ہے فرماتے تھے کہ اچھا خاصہ بڑا گاؤں ہے، ان ہی خانصاحب کا بیان ہے کہ عموماً مالگذاری وغیرہ وصول کرنے کے لئے مولانا اسمٰعیل شہید جایا کرتے تھے ایک

(باقی بر صفحہ آئندہ)

ذکری چھوٹی، جاگیر سے محروم ہوئے، لیکن اس پر بھی "حمد خدا گھانے گفتم"، جس کا یہ مقام ہو، اگر اس کا اور اس کی ذریت طیبہ کا قدرت کسی اہم خدمت کیلئے انتخاب کرے۔ تو

لئن شکرتم لازیدنکم اگر تم شکر کرو گے تو میں تمھیں بڑھاتا چلا جاؤں گا۔

کے وثیقہ محکمہ اور بوعدہ موکدہ والے سے اور کس بات کی توقع کی جاسکتی تھی، زیادہ تو نہیں لیکن اتنا حال تو ہمیں بھی معلوم ہے کہ اس امتحان سے کامیاب ہونے کے بعد شاہ عبدالرحیم کے مرشد خلیفہ ابوالقاسم جو آگرہ میں رہتے تھے اور شاہ صاحب بھی ان دنوں آگرہ ہی میں تھے، خلیفہ صاحب نے شاہ صاحب کو حکم دیا کہ شاہ عظمت اللہ نامی بزرگ کے پاس جاکر حاضری دو، جو سلسلہ طریقہ چشتیہ کے ایک کہنہ سال معمر ترین بزرگ اس زمانہ میں آگرہ میں تھے، مرشد کے بار بار اصرار کے بعد آخر ایک دن شاہ عبدالرحیم، عظمت اللہ شاہ صاحب کے پاس حاضر ہوئے وہ بیمار تھے پلنگ پر لیٹے لیٹے باتیں کرتے رہے۔ سلسلۂ گفتگو میں شاہ عبدالرحیم صاحب نے اپنا خاندانی تعلق "شیخ عبدالعزیز شکربار"[1] سے ظاہر کیا، معاً عظمت اللہ شاہ صاحب یہ سنتے ہی پلنگ سے زمین پر آگئے اور شاہ عبدالرحیم کو گلے سے لگایا، پھر ایک سوال کیا، جواب پایا، اس کے بعد شاہ عظمت اللہ صاحب نے یہ قصہ کہنا شروع کیا کہ "میرے دادا صاحب کو شیخ عبدالعزیز شکربار نے

(حاشیہ صفحہ گزشتہ)۔ دفعہ مولوی موسیٰ بن مولانا رفیع الدین بھی گئے تھے۔ امیر الروایات میں دوسری جگہ یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ "انگریزی عہد میں شاہ اسحاق و شاہ یعقوب سے حکومت نے یہ جاگیر ضبط کرلی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس دن دونوں بھائی جتنے مسرور دیکھے گئے کبھی اس حال میں لوگوں نے آپ کو نہیں پایا تھا"۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ گاؤں غالباً شاہ عبدالعزیز کے زمانہ میں کسی ذریعہ سے اس خاندان میں آیا تھا ورنہ اس سے پیشتر ان حضرات کا معاشی ذریعہ وہی توکل تھا جس پر سلفاً عن خلف عموماً اہل اللہ کا مدار رہا، اگرچہ ادھر کچھ دنوں سے مغرب زدوں کے فقروں سے تنگ آکر لوگوں میں اس سے گونہ کراہیت پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے تائید میں صحابہ کرام کو پیش کیا جاتا ہے جن کی ظاہر ہے کہ حیثیت مریدوں کی تھی لیکن مشائخ واکابر صوفیہ جس ذات گرامی کی نیابت کرتے ہیں سوال ان کے متعلق ہے کہ نبوت کے بعد اور فتوحات سے پہلے درمیانی زندگی حضور کی جو گزاری کیا اس کے لئے آپ نے کوئی کسب اختیار فرمایا تھا اصل یہ ہے کہ مشائخ ان فتوحات سے دینی جہات میں کام لیتے تھے اب اگر کوئی ان کو اپنے اغراض نفسانی پر صرف خرچ کرتا ہو تو اس کا وہ خود ذمہ دار ہے لیکن محض اس غلط استعمال کی وجہ سے فتوحات مشائخ کے عدم جواز کا فتوے صادر کرنا کیا صحیح ہو سکتا ہو، کچھ بھی ہو میرے نزدیک تو اس زمانہ کی چندہ بازیوں اور اس کی خواریوں سے پہلے زمانہ کی فتوحات سازیوں کی عزت بہرحال بہتر تھی چندہ گر لیڈروں کی ریس میں جو مولوی یا مشائخ فتوحات سے کارہ ہیں۔ اتستبدلون الذی ھو ادنیٰ بالذی ھو خیر کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ ۱۲ منہ

[1] انفاس میں ہے کہ "ایشاں جد اعلیٰ حضرت والد بزرگوار اند از جہت والدہ ایشاں" یعنی یہ شاہ عبدالرحیم کے نانا تھے شیخ عبدالعزیز کے والد کا نام حسن تھا، حسن کے والد کا نام طاہر تھا، شیخ طاہر اگرچہ اچھہ ملتان کے رہنے والے تھے لیکن شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ "ناحیہ پورب اقامت گزیدہ ایشاں شد" پورب سے کیا مراد ہو صاف طور سے معلوم نہ ہو سکا۔ البتہ شیخ طاہر کی تعلیم اور شادی کا ذکر فرماتے ہوئے شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے "کہ تحصیل علم ایشاں بہ بلدہ بہار کہ مجمع علما بود" میں ہوئی اور "بعد فراغت قاضی بہار صبیہ خود ایشاں را داد" شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں لکھا ہو کہ "شیخ طاہر از ملتان بہ طلب علم بایں دیار افتاد و مدتے در بلدہ بہار سکونت کرد و پیش شیخ بدھ حقانی تحصیل علم نمود و ہم در بہار شیخ حسن از خلوت خانہ عدم بہ جہاں سرائے وجود رسید" ص۱۹۵ جس کے یہی معنے ہوئے کہ شاہ عبدالرحیم کے نانا کے والد بہار ہی میں پیدا ہوئے تھے اور غالباً قاضی بہار۔ جس کی لڑکی سے شیخ طاہر کی شادی ہوئی وہ شیخ بدھ حقانی ہیں" واللہ اعلم بالصواب ۱۲

آخر میں شیخ عبدالعزیز اپنے مرشد قاضی خاں ظفرآبادی کے حکم سے دلی آئے اور "مونس قوانین ارشاد گشت" ۱۲

وصیت فرمائی تھی اور کچھ تبرکات دیئے تھے اور کہا تھا کہ میری اولاد میں سے اگر کوئی تمہارے پاس آکر فلاں سوال کا فلاں جواب دے تو میرے یہ تبرکات اس تک پہونچا دینا یہ تبرکات دادا کے زمانہ سے اس وقت تک اسی وصیت کے ساتھ محفوظ چلے آرہے ہیں، شاہ عظمت اللہ نے فرمایا کہ چونکہ سوال کا جواب تم نے دیدیا اس لئے وصیت پوری کرنیکا وقت آگیا یہ کہکر شاہ عبدالرحیم کے سر پر انھوں نے عمامہ باندھا اور اپنے طریقہ کی اجازت بھی عطا فرمائی جب چلنے لگے، تو کچھ مٹھائی اور نقد روپے بھی ساتھ کر دیئے شاہ عبدالرحیم صاحب وہاں سے ان سب چیزوں کو لئے ہوئے اپنے مرشد خلیفہ ابوالقاسم کے پاس پہونچے، اور مٹھائی، روپے خلیفہ صاحب کے آگے رکھدیئے، ماجرا بیان کیا بربشاشت قلبی تلقی کردند" اور آخر میں خلیفہ ابوالقاسم نے شاہ عبدالرحیم صاحب کو یہ بشارت سنائی۔

نقد اشارت بہ جمعیت ظاہر و عمامہ اشارت بہ اجازت و جمعیت باطن ۔　　روپیہ تو ظاہر حال کے اطمینان اور فراغبالی کی طرف اشارہ ہے اور عمامہ باطنی اطمینان اور فراغبالی اور اجازت کا اشارہ ہے۔

اس جمعیت ظاہر کی بشارت کے بعد خود شاہ عبدالرحیم کا بیان ہے کہ معاشی پراگندگی کا سوال ان کی زندگی میں سرے سے کبھی پیدا ہی نہیں ہوا اور نہ "جمعیت باطن" کی اس خوش خبری کے بعد انھیں "معادی حیات" کیلئے کبھی دشواری اُٹھانی پڑی "فتوحات" کی یہی شکل کہ دل سے نکال دینے کے بعد آنکھوں کے سامنے آئے تب تو وہ واقعی فتوحات ہیں لیکن جو لوگ بہ ظاہر ان سے آنکھیں چُراتے ہیں، لیکن ان کے دلوں میں چوبیس گھنٹے ان ہی فتوحات کے بت براجمان ہیں یقیناً یہ فتوحات نہیں عقوبات ہیں قرآن کی اس آیت کا ایک مصداق اگر یہ "فتوحات" بھی ہوں تو کیا تعجب

ان کثیرا من الاحبار والرہبان لیاکلون اموال الناس بالباطل ویصدون عن سبیل اللہ والذین یکنزون الذہب والفضۃ ولاینفقونہا فی سبیل اللہ فبشرہم بعذاب الیم یوم یحمی علیہا فی نار جہنم فتکوی بہا جباہہم وجنوبہم وظہورہم ھذا ما کنزتم لانفسکم فذوقوا العذاب بما کنتم تکنزون

قطعاً بہت سے احبار (علماء یہود) اور رہبان (مشائخ نصاریٰ) لوگوں کے مال باطل راہ سے کھاتے ہیں اور روکتے ہیں اللہ کی راہ سے اور جو سونے چاندی کو سینت سینت کر رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں اسے خرچ نہیں کرتے ایسے لوگوں کو دکھ بھرے عذاب کی بشارت سنا دو جس دن تپایا جائے گا چاندی سونے کو جہنم کی آگ پر پھر داغی جائیگی پیشانی ان کے پہلو اور ان کی پیٹھ یہی ہے جو تم نے جمع کیا تھا اپنے لئے پس لو چکھو عذاب اس کا جو جمع کیا تم تے

انفاس العارفین اور بعض دوسری کتابوں میں شاہ عبدالرحیم کی جس صاف ستھری زندگی کے پڑھنے سے دل کو راحت ملتی ہے، اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ "ولی اللہی حقیقت" دراصل قدرت کے اسی قانون کا مظہر ہے جو کسی شاعر نے کہا ہے

کذلک ننشاء لبنۃ ہو عن تھا وحسن نبات الارض من کرم البذر

شاہ ولی اللہ کی ولادت سے پہلے شاہ عبدالرحیم کو انکے کمالات کی بشارت

بلکہ شاہ ولی اللہ نے خود بھی اور دوسروں نے بھی لکھا ہے کہ شاہ ولی اللہ اور ان کے کمالات ومقامات کی بشارت شاہ عبدالرحیم کو پہلے سے مل چکی تھی ایک واقعہ انفاس العارفین میں درج ہے اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ محض شاہ ولی اللہ کی ولادت کے لئے شاہ عبدالرحیم نے کسی غیبی اشارہ کے ماتحت ہی ساٹھ سال کی عمر میں دوسری شادی کی تھی بعض لوگوں کو اس پر اعتراض بھی ہوا کہ

دریں عمر کدخدائی مناسب نبود	اس عمر میں شادی مناسب نہ تھی

شاہ عبدالرحیم نے سنکر فرمایا کہ

مدتے دراز از عمر من باقیست وفرزنداں بوجود خواہند آمد۔	میری عمر کا بڑا حصہ ابھی باقی ہے اور انشاء اللہ چند لڑکے ابھی اور پیدا ہوں گے

شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ اس کے بعد والد سترہ سال زندہ رہے ، اور دو لڑکے حضرت کے تولد ہوئے جن میں ایک خود شاہ صاحب ہیں ، اسی طرح انفاس ہی میں ہے کہ تہجد کی نماز شاہ عبدالرحیم اور شاہ ولی اللہ صاحب کی والدہ پڑھ رہی تھیں ، نماز کے بعد شاہ عبدالرحیم نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھایا اور بیوی صاحبہ سے آمین کہنے کے لئے کہا ، دعا ہو رہی تھی اور اس وقت ہو رہی تھی کہ ابھی شاہ ولی اللہ عالم وجود میں نہیں آئے ہیں ۔ بہرحال عین دعا کی حالت میں۔

درمیان ایشاں دو دست دیگر ظاہر شد	ان دونوں کے درمیان میں دو ہاتھ اور ظاہر ہوئے

شاہ عبدالرحیم نے فرمایا کہ

ایں دو دست فرزند ماست	یہ دونوں ہاتھ ہمارے لڑکے کے ہیں

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ سات سال کی عمر میں اپنے والدین کے ساتھ نماز تہجد میں ٹھیک اسی شکل کے ساتھ دعا کرنے کا موقع میسر آیا "وھذا تاویل رویای قد جعلہ ربی حقا" شاہ ولی اللہ جس لئے پیدا ہوئے تھے اس کا اشارہ بچپن ہی میں ان کے والد نے ایک خاص طرز سے فرمایا تھا خود ہی لکھتے ہیں۔

ایں فقیر بموافقت احبا و اقربا روزے بتفرج بوستانے رفت چوں باز آمد حضرت ایشاں فرمودند اے فلانے دریں شبانہ روز چہ حاصل کردی کہ باتو باقی ماند	فقیر اپنے دوست احباب اور بعض عزیزوں کے ساتھ ایک دن ایک باغ کی سیر کو گیا جب واپس ہوا تو حضرت (والد) نے فرمایا اے فلاں رات دن میں تمنے کیا چیز ایسی حاصل کی جو تمہارے ساتھ باقی رہے گی

"چہ حاصل کردی کہ باتو باقی ماند" والد بزرگوار کے سوال کا یہی تیر تھا، جو سعادت مند فرزند کے قلب نہ ایہ میں جاکر

ترازو ہوگیا۔ اور ایسا ترازو ہوا کہ پھر عمر بھر نہ نکلا، خود فرماتے ہیں:

بمجرد ایں کلام دل نقیر از تفرج بوستانہا سرد شد باز مثل ایں داعیہ بوجود نیامد۔	بس اتنی بات کے سننے کے ساتھ ہی فقیر کا دل باغوں کے سیر سپاٹے سے سرد ہوگیا پھر کبھی اس قسم کی خواہش پیدا نہ ہوئی۔

کل اکسٹھ سال کی عمر میں شاہ ولی اللہ کا محیر العقول کام

اور واقعہ یہ ہے کہ کل ساٹھ اکسٹھ سال کی عمر میں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے "از تو باقی ماند" والے جو کام کئے ہیں کم از کم ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں اس کی نظیر موجود نہیں ہے، لکھنے پڑھنے کے بعد "از تو باقی ماند" کے خدمات کا یہی ذوق تھا جس نے ان کو اس دھارے میں بہتے ہوئے نہ چھوڑا جس میں ان کے اپنا عصر تقریباً ہر طبقہ کے بہ رہے تھے۔ جس کی وجہ کچھ تو حضرت کے والد کی خاص تربیت تھی، ماسوا اس کے شاہصاحب فطرۃً "رسم عام" کی پابندی سے نفور تھے، حتیٰ کہ ائمہ مجتہدین تک کی تقلید جس پر انھوں نے اپنی مختلف کتابوں میں مختلف حیثیت سے محض خوش اعتقادی کے طور پر نہیں بلکہ تحقیقی نقطہ نظر سے زور دیا ہے، لیکن بایں ہمہ اپنے فطری میلان کا حال بیان کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

وجبلتی تابی التقلید وتانف منه راساً (فیوض الحرمین)	تقلید سے میری جبلت اور سرشت انکار کرتی ہے اور بالکلیہ اس سے بھڑکتی ہے۔

مگر وہی آپ کی "نسبت اویسی" اس فطری میلان کے صحیح استعمال میں کام آئی خود فرماتے ہیں کہ حضرت رسالت پناہی صلے اللہ علیہ وسلم سے مجھے براہ راست جن امور کی وصیت کی گئی (جن میں سے ایک کا ذکر پہلے کر چکا ہوں) ان میں ایک چیز یہ بھی تھی کہ

التقلید بھذہ المذاھب الاربعة لاأخرج منھا والتوفیق ما استطعت	ان چار مذاہب مروجہ کی تقلید سے کبھی باہر قدم نہ رکھوں اور جہاں تک ممکن ہو سب میں تطبیق کی کوشش کروں۔

پھر شاہصاحب ترک تقلید کے متعلق اپنے نفسی میلان اور طبعی رجحان کا ذکر کرنے کے بعد اپنی مجبوری کو اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ۔

ولکن طلب منی التعبد به بخلاف نفسی	لیکن میں کیا کروں کہ میرے اقتضائے نفسی کے

خلاف ان مذاہب اربعہ کی پابندی ہی کا مجھ سے مطالبہ ہے اور اس بارہ میں مجھے سر نیاز جھکا دینے ہی کا حکم ہے آگے چل کر اپنے میلان نفس بسوئے عدم تقلید اور وصیت نبوی دربارہ اختیار تقلید کے اصل راز کے متعلق صرف اتنا فرماتے ہیں کہ

وھھنا نکتۃ طویت ذکرھا وقد تفطنت بحمد اللہ بسر ھذہ الجبلۃ وھذہ الوصاۃ (فیوض صفحہ ۶۵)

یہاں ایک باریک راز ہے جس کے ذکر کو میں نے بالقصد قلم انداز کر دیا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ اپنی فطرت اور آنحضرت کی اس وصیت کے اس راز کو میں نے سمجھ لیا ہے۔

جب شاہ صاحب تے ہی اس نکتہ کا ذکر نہیں فرمایا تو میں کیا کہہ سکتا ہوں، لیکن اتنی بات تو سمجھ میں آتی ہی ہے کہ آپ کے اس فطری میلان، اور طبعی رجحان کا یہ نتیجہ ہوا کہ آپ کے سامنے وہ چیزیں مسلسل آتی رہیں، جن سے آپ کے معاصرین غافل تھے، سب سوئے ہوئے تھے، لیکن خدا نے آپ کو بیدار رکھا، اسلام اور مسلمانوں کی جو حالت اس ملک میں ہو رہی تھی، اس کے تمام پہلوؤں پر آپ کی نظر پہونچی، دماغ نے مخلصی اور نجات کی راہ ڈھونڈھنی شروع کی، یہ ہو سکتا تھا کہ کفر کے اس غلبہ و استیلا اور ارباب حکومت کی خود غرضیوں اور نااہلیوں کو دیکھ کر آپ آستین چڑھا لیتے اور ایک دفعہ آستین چڑھا کر "الجہاد ثم الجہاد" کا نعرہ لگا کر مسلمانوں کی کسی جماعت کو اپنے ساتھ لے کر سیاسی کش مکش میں مبتلا ہو جاتے، اور جب دنیا کے نام پر مختلف گوشوں سے مختلف قوتیں اپنے گرد لوگوں کو جمع کر رہی تھیں تو دین کے نام پر نیم مردہ مسلمانوں کو بھی کیوں نہ زندہ کیا جا سکتا تھا خصوصاً جب ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ شاہ صاحب کا خاندانی تعلق جس قبیلہ اور نسل سے تھا علم و تصوف کے ساتھ اس خاندان کے لوگ فوجی کاروبار میں بھی یگانۂ روزگار تھے، بلکہ شاہ عبد الرحیم سے پہلے تو شاہ صاحب کے خاندان میں علم و تصوف کی محض ثانوی حیثیت تھی، اصلی کام اس خانوادہ کا جہاد ہی تھا۔

(جملہ معترضہ) شاہ صاحب کے جد امجد شاہ وجیہ الدین کی تاریخی شجاعت

آپ کے براہ راست جد امجد یعنی شیخ وجیہ الدین کے واقعات تو خود شاہ صاحب نے اپنی مختلف کتابوں میں درج کئے ہیں، جن کو سنکر حیرت ہوتی ہے، عالمگیر کی فوج جب شاہ شجاع سے نبرد آزما ہوئی اور شجاع نے ہاتھیوں سے حملہ کیا تو شاہ صاحب کے ان دادا ہی نے گھوڑے پر بیٹھ کر ان زرہ پوش ہاتھیوں پر حملے کئے اور ان کی سونڈ کاٹ ڈالی، نتیجہ یہ ہوا کہ گھوڑے ہاتھیوں نے شجاع ہی کی فوج کو کچل کر رکھ دیا، ایک اور موقعہ پر مسلسل تین مرد میدان راجپوتوں کو ایک ایک وار سے ختم کیا، یہ تینوں راجپوت حقیقی بھائی تھے یہ قتل ہونے کے بعد ان کی ماں شیخ وجیہ الدین سے آکر ملی اور اپنا منہ بولا بیٹا بنایا جسے شاہ وجیہ الدین نے بھی تسلیم کر لیا۔ شاہ عبد الرحیم صاحب فرماتے تھے کہ۔

من بارہا بخانہ او رفتم و او راجدہ می گفتم و وے در شفقت دقیقہ فرو نمی گزاشت بلکہ من جدہ خود را ندیدہ بودم در صغر نمی دانستم کہ مرا بجز ایں عجوزہ جدہ دیگر بودہ است۔

بارہا میں اس بڑھیا کے گھر جاتا تھا اور اس کو میں دادی دادی کہتا تھا، وہ بھی مہربانی اور شفقت میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھتی تھی۔ بلکہ اپنی واقعی دادی کو چونکہ میں نے نہیں دیکھا تھا اس لئے بچپن میں اس

بڈھی کے سوا میں اپنی دادی کسی اور کو نہیں جانتا تھا۔

ایک مشہور بہادر سید شہاب الدین نے آپ سے بدمعاملگی کی شاہ عبدالرحیم کا بیان ہے کہ میرے سامنے والد نے اسے ایک طمانچہ رسید کیا جس سے وہ بیہوش ہو کر گر گیا ۔۔۔۔۔ بہر حال شیخ وجیہ الدین کا مدت العمر مشغلہ یہی فوجی خدمت تھی، اگرچہ آخر عمر میں نوکری چھوڑ دی تھی، لیکن بڑھاپے میں پھر گھوڑا خرید کر جہاد کے لئے دکن روانہ ہوئے اور راہ میں شہادت میسر آئی، بیان کیا جاتا ہے کہ جسم پر بائیس گہرے زخم تھے، سر کٹ جانے کے بعد بھی ایک غلیل کی زد تک آپ کی بے سر لاش دشمن کا تعاقب کرتی رہی ۔۔۔۔۔ تقریباً یہی حال شاہ ولی اللہ نے اپنے پردادا شیخ معظم کا لکھا ہے اور مسلسل پشتہا پشت تک ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاندان فوجی مہمات میں نام آور اور دیدہ ور رہا ہے شاہ ولی اللہ خود اپنے والد کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

ایشاں باخلاق سلیمہ مرضیہ از شجاعت و فراست وکفائت وغیرت بوجہ اتم متصف بودند۔

حضرت دیگر اخلاق سلیمہ پسندیدہ کے ساتھ شجاعت بہادری اور غیرت وغیرہ صفات سے بوجہ اتم موصوف تھے

اگرچہ شاہ عبدالرحیم صاحب کو فوجی خدمت انجام دینے کا کوئی موقعہ اپنے اسلاف کے مطابق نہ ملا لیکن اس فقرہ سے ان کی شجاعت اور بہادری کا حال بھی معلوم ہوتا ہے[1] اور خود شاہ ولی اللہ صاحب کے متعلق تو مشہور ہی ہے کہ "ترجمہ قرآن کی بنیاد پر ولی کے بعض پڑھے خیال کے مولویوں نے جب آپ سے اختلاف کیا اور اختلاف کو اس حد تک پہنچا دیا کہ عوام میں کافی بدظنی و برہمی پیدا ہوئی، اسی سلسلہ میں بیان کیا جاتا ہے کہ فتح پوری کی مسجد میں تقریباً سو سوا سو لچوں اور بدمعاشوں کو لے کر بعض ملاؤں نے آپ کو گھیر لیا، شاہ صاحب کے ساتھ صرف چند تھا اور آپکے ہاتھ میں صرف ایک پتلی لکڑی تھی اسی لکڑی کو لے کر اس خونی مجمع میں جو باضابطہ تلواروں اور دوسرے ہتھیاروں سے مسلح تھا۔

"غیر معمولی جوش کی حالت میں اللہ اکبر کا ایک نعرہ مارا اور اس جماعت کو چیرتے پھاڑتے نکلے چلے گئے" (انجاث طیبہ)

یوں بھی شاہ صاحب کو سیاسی مسائل اور حکومتی نظامات کے متعلق جو دلچسپی تھی اس کا اندازہ ان کی مختلف کتابوں مثلاً ازالۃ الخفا اور حجۃ اللہ وغیرہ کے سیاسی مباحث سے ہوتا ہے، سیاسیات میں ان کی رائے کتنی عمیق اور دوررس ہے افسوس ہے کہ اس کے لئے مستقل مضمون کی ضرورت ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں، شاہ صاحب کی عام متداول کتابوں میں اس کا کافی مواد موجود ہے، کوئی چاہے تو ان کو موجودہ اصطلاحات اور تعبیروں کے قالب میں ڈھال کر بیان کر سکتا ہے ممکن ہے

---

[1] "الفرقان" سیرت سید احمد شہید کے مقدمہ میں مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ نے شاہ عبدالرحیم صاحب ہی کے تذکرہ میں ارقام فرمایا ہے کہ حضرت شاہ عبدالرحیم کے جہادانہ جذبات کا پتہ ان کے خطوط سے ملتا ہے۔ ان کے مکاتیب کا ایک نسخہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے کتب خانہ میں میری نظر سے گزرا ہے۔ اس میں ان کا خط نظام الملک آصف جاہ اول کے نام ہے جس میں انھوں نے نواب مرحوم کو مرہٹوں سے جہاد کی ترغیب دی ہے۔ م

کہ اگر فرصت ہمدست ہوئی تو شائد اس کام کو میں ہی کبھی انجام دوں۔ بالفعل صرف ان کی طرف اشارہ کر کے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ باوجود ایسے ماحول اور اسباب کے شاہ صاحب نے سنانی اور سیفی مجاہدہ کی راہ کیوں اختیار نہیں کی۔[1]

یہ تو قطعاً غلط ہے کہ وہ اس مسئلہ کے متعلق جس پر " ماض الی یوم القیمۃ " (یعنی جہاد کا قانون قیامت تک کے لئے نافذ ہے) کی مہر نبوت کندہ ہے، اس قانون کو شاہ صاحب خدانخواستہ کسی خاص زمانہ تک محدود سمجھتے تھے، بلکہ اپنے اجداد کے حالات کو درج فرماتے ہوئے جہاں اپنے جد امجد کی بہادری کے واقعات لکھنے لگے ہیں تو اس سے پہلے آپ نے یہ بھی ارقام فرمایا ہے۔

کہ چندے از یں باب دریں کتاب می نویسم کہ تنبیہے باشد اہل ایں خاندان را

چند واقعات میں اس لئے اس کتاب میں درج کرتا ہوں تاکہ اس خاندان کے لئے وہ بیداری کا پیغام اور سبب ہوں۔

اور کون کہہ سکتا ہے کہ دوسری ہی پشت میں حضرت شاہ صاحب کے گھرانے سے جو وہ مرد غازی مولانا اسمٰعیل شہید اٹھے، اور ایک مدت تک بجائے قلم کے تلوار کو کمر سے لگائے رہے تا ایں کہ اسی راہ میں بالآخر جان عزیز بھی نذر کی، یہ شاہ صاحب کی کسی اندرونی تربیت کا نتیجہ نہ تھا، جس کا رواج ان کے خاندان میں چلا آرہا تھا،

باوجود ان تمام باتوں کے پھر میں صحیح طور پر نہیں کہہ سکتا کہ شاہ صاحب نے آخر یہ راہ خود کیوں اختیار نہیں فرمائی، مجھے اب تک ان کے کلام میں کوئی چیز صراحۃً نہیں ملی ہے، آئندہ اگر کوئی چیز ہاتھ آئی تو انشاءاللہ پیش کی جائے گی بالفعل ان کے مسلک کے متعلق اس باب میں جن وجوہ تک پہونچ سکا ہوں انھیں درج کرتا ہوں فیوض الحرمین میں شاہ صاحب نے " تحقیق شریف " کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے اگرچہ کچھ طویل ہے لیکن جب تک پورا مضمون نقل نہ کیا جائے مطلب سمجھ میں نہیں آسکتا میرے نزدیک شاہ صاحب نے اس مضمون میں خدمت دین کا جذبہ رکھنے والوں کے لئے خاص ایسے وقت کے واسطے جبکہ کسی وجہ سے اعلاء کلمۃ الحق کیلئے " جہاد بالسیف " کا امکان نہ ہو کام کا پورا پروگرام پیش کر دیا ہے ـــــ ارقام فرماتے ہیں۔

خلافت ظاہرہ اور خلافت باطنہ

ان للامۃ المرحومۃ اسوۃ حسنۃ برسولہ صلی اللہ علیہ وسلم لاصحاب الخلافۃ الظاہرۃ اعنی المعتنین باقامۃ الحدود واعلاء ادوات الجہاد وسد الثغور

رسول اللہ صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی زندگی میں امت مرحومہ کیلئے اسوہ اور نمونہ ہے (پھر اس نمونہ کی تقسیم یوں کرتے ہیں) ظاہری خلافت والے یعنی جو شرعی حدود اور جہاد کے ساز و سامان کی تیاری اور سرحدی علاقوں

[1] الفرقان: حضرت شاہ صاحب نے تفہیمات الٰہیہ میں ایک جگہ " جہاد بالسیف " کے بارہ میں اپنی اسی قابلیت کو خود ہی بیان فرمایا ہے ملاحظہ ہو تفہیمات ۔۔۔ اور وہیں سے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ آپ نے یہ راہ کیوں اختیار نہیں کی ۱۲۔

واجازة الوفود وجباية الصدقات والخراج
وتفريقها على مستحقيها وفصل الاقضية والنظر
في اليتامى واوقاف المسلمين وطرقهم ومساجدهم
واشباه هذه الامور فمن كان مشتغلا
بهذه الامور نسميه بالخليفة الظاهرة
لهم اسوة حسنة برسول الله صلى الله عليه
وسلم فيما سن في هذا الباب بالتفصيل
المذكور في كتب الحديث — واصحاب
الخلافة الباطنية اعني المعتنين
بتعليم الشرائع والقرآن والسنن و
الآمرين بالمعروف والناهين
عن المنكر والذين يحصل بكلامهم
نصرة الدين اما بالمجادلة كالمتكلمين
او بالموعظة كخطباء الاسلام او بصحبتهم
كمشايخ الصوفية والذين يقيمون
الصلوة والحج والذين يدلون على
طريق اكتساب الاحسان والمرغبون في
التنسك والزهد والقائمون بهذا الامر هم
الذين نسميهم بالخلفاء الباطنين لهم
اسوة حسنة برسول الله صلى الله عليه وسلم
فيما سن من هذا لنا بالتفصيل المذكور في كتب الحديث

کی ناکہ بندی وحفاظت اور وفود کو اکرام وانعام دینے
کی خدمت اور صدقات، محصول، مالگذاری وغیرہ
کی وصولی پھر ارباب استحقاق پر ان کی تقسیم، مقدمات
کے فیصلے، یتیموں کی نگرانی، مسلمانوں کے اوقاف
کے انتظام، نیز راستوں سڑکوں اور مساجد وغیرہ کی
تعمیر، اور اسی قسم کے اور کاموں کے لئے مقرر ہیں
غرض مسلمانوں میں جو ان خدمات اور مشاغل میں مصروف
ہیں انھیں کو میں خلافت ظاہری والوں کے نام سے
موسوم کرتا ہوں، ان لوگوں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی سیرت میں بہترین نمونے ہیں جنھیں حضور
صلی اللہ علیہ وسلم نے ان امور کے متعلق جاری فرمایا
اور حدیث کی کتابوں میں جن کی تفصیل مذکور ہے،
اور جو لوگ باطنی خلافت والے ہیں، یعنی جو اس کام
پر مقرر ہیں کہ شرائع اور قوانین اسلامی قرآن اور
سنن وآثار کی تعلیم دیں، اور معروف یعنی اچھی
باتوں کا لوگوں کو حکم دیں بری اور منکر باتوں سے
روکیں، اسی طرح وہ لوگ جن کے کلام سے دین کی
تائید ہوتی ہے خواہ مناظرہ اور مباحثہ کی راہ سے
جیسا کہ متکلمین اسلام کا حال ہے: یا وعظ و
پند کے طریقے سے جیسا کہ اسلام کے مقررین اور
خطباء جس خدمت کو انجام دیتے ہیں یا وہ
لوگ جو اپنی صحبت اور توجہ وہمت سے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرتے ہیں، جیسا کہ مشائخ صوفیہ کا حال
ہے اسی طرح جو نمازیں قائم کراتے ہیں حج کراتے ہیں اور جو احسان (دوام حضور) کے حصول کی راہ لوگوں
کو بتاتے ہیں، اور زہد وتقوے کی طرف لوگوں کو راغب کرتے ہیں۔ بہرحال جو لوگ ان دینی خدمات کو انجام
دیتے ہیں ان ہی لوگوں کو ہم خلفاء باطنی کے نام سے موسوم کرتے ہیں ہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں

ان گوں کے لئے بھی بہترین نمونے ہیں یعنی اس باب میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے جو طریقہ عمل اختیار فرمایا۔ اور حدیث کی کتابوں میں جس کی پوری تفصیل موجود ہے "

اس کے بعد شاہ صاحب نے خلافت کی دونوں صورتوں اوران کے لوازم و آثار سے بحث کی ہے جس کے درج کرنے کی سردست ضرورت نہیں ہے۔

شاہ صاحب کی مذکورہ بالا عبارت ہی سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نیابت و نمائندگی اور" خلافت" کا انحصار محض سیاسی اقتدار کے مظاہر کی حد تک محدود نہیں ہے، بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی جو نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کو بھی" خلافت" کا ایک حصہ ملا ہے جیسے سیاسی اقتدار رکھنے والوں اور حکومتی خدمات انجام دینے والوں کو بھی اس کا ایک ہی شعبہ ملتا ہے ــــ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ شاہ صاحب کے نزدیک قدرت نے جس کسی کو جس قسم کی" خلافت" اور نیابتِ نبوّت کے مظہر بننے کا موقعہ عطا فرمایا ہے وہ اسی اعتبار سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے نمونوں کو اپنے سامنے رکھ کر اپنے کاروبار کی تنظیم کرے اور اسی شعبہ کے اسوہ نبوّی کو شمع راہ بنا کر اپنے فرائض" خلافت" کو انجام دے ــــ گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ اسلام نے مثلاً امرار کو بھی مخاطب کیا ہے اور غربار کو بھی تندرستوں کو بھی اور بیماروں کو بھی احرار کو بھی اور عباد و امار کو بھی، ظاہر ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان سب کے فرائض بالکل یکساں ہیں بلکہ امرار جنہیں قدرت نے مال و دولت عطا کی ہے ان ہی کے ساتھ ان احکام کا تعلق ہے جو مالیات سے متعلق ہیں اور جو صحت کی دولت سے سرفراز ہیں ان ہی تک وہ احکام محدود رہیں گے جن کی ادائیگی صحت کے ساتھ مشروط ہے پس اسی طرح گو قرآن نے ہر قسم کے احکام کی تبلیغ کی ہے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی جامع زندگی سے تقریباً ہر حکم کے متعلق تشریحی نمونے پیش فرمائے ہیں، لیکن اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ قرآن کے ہر حکم اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ہر نمونہ کی اتباع پر ہر مسلمان مساوی طور پر مجبور کیا گیا ہے بلکہ جو خوش بخت خلافت ظاہرہ کے اسباب وادوات سے سرفراز ہیں وہ اس باب میں مکلف ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے طرز حکومت اور طریقہ سیاست، کو اختیار کریں اور اس کو دنیا میں سربلند کرنے کے لئے تدابیر عمل میں لائیں ــــ علیٰ ہذا جس کسی کو خلافت باطنہ کا جو حصہ عطا ہوا ہے۔ وہ اسی پہلو میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرے۔ غالباً یہی وجہ ہے، کہ" تفہیماتِ الٰہیہ" میں شاہ صاحب نے اپنے جس طویل خطاب سے مسلمانوں کو مخاطب فرمایا ہے جس کا ترجمہ پہلے درج کر چکا ہوں اس میں آپ نے مسلمانوں کے مختلف طبقات کو الگ الگ کر کے پکارا ہے، اور بجائے اس کے کہ ہر مسلمان پر اس عام دعوت کو پیش فرماتے خصوصیت کے ساتھ" ملوک اسلام" کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں :۔

ایھا الملوک! المرضی عند الملاء الاعلیٰ فی ھذا الزمان ان تسلوا السیوف ثم لا تغمدوھا حتی یجعل اللہ فرقاناً۔ بین المسلمین والمشرکین وحتی یلحق مردۃ الکفار والفساق بضعفائھم لا یستطیعون لانفسھم شیئاً وھو قولہ تعالیٰ وقاتلوھم حتیٰ لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہ اللہ	بادشاہو! ملاءِ اعلیٰ کی مرضی اس زمانہ میں تمہارے متعلق یہ ہے کہ تلواریں سونت لو پھر انھیں نیام میں نہ کرو جب تک اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو مشرکوں سے بالکل جدا نہ فرما دے اور کفار کے سرکش افراد نیز فساق کمزوروں میں جاکر شریک نہ ہوجائیں اور خود اپنے لیے ان میں کچھ کرنے کی سکت باقی نہ رہے یہی مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے اس قول کا کہ جنگ کرو کافروں سے اس حد تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین "قانون" صرف اللہ کے لئے مخصوص ہوکر رہ جائے،

الغرض خصوصیت کے ساتھ بجائے عام مسلمانوں کے اس خطاب میں شاہ صاحب نے ملوک یعنی ان ہی لوگوں کو مخاطب کیا ہے، جو کسی نہ کسی حیثیت سے سیاسی اقتدار اور عسکری قوت کے مالک ہیں، پھر آپ نے ان کو صرف اسی سلبی کام" ہی کا مخاطب نہیں بنایا ہے" بلکہ اس کے بعد حکومت کے ایجابی احکام کا مکلف بھی ان ہی کو قرار دیتے ہیں فرماتے ہیں

فاذا ظھر الفرقان فرضاء الملاء الاعلیٰ ان تنصبوا الی کل ناحیۃ وفی کل مسیرۃ ثلثۃ ایام و اربعۃ ایام امیراً عادلا یاخذ المظلوم حقہ من الظالم ویقیم الحدود ویجتھد ان لا یحصل فیھم بغی ولا قتال ولا ارتداد ولا کبیرۃ ویفشو الاسلام وتظھر شعائرہ ویاخذ بفرائضہ کل احد ویکون لامیر کل بلد شوکۃ یقدر بھا علی اصلاح بلدہ ولا یکون لہ شوکۃ یتمتع لسببھا ویعصی علی السلطان وینصب فی کل اقلیم کبیراً امیراً یقلدہ القتال فقط یکون جمعہ اثنا عشر الفا من المجاھدین لا یخافون فی اللہ لومۃ لائم یقاتلون کل باغ وعاد فاذا کان ذلک فرضاء الملاء الاعلی ان یفتش	جب مسلم و کافر میں اس طرح جدائی پیدا ہولے تو اس کے بعد ملاءِ اعلیٰ کی رضا یہ ہے کہ تم اے بادشاہو! ہر علاقہ اور تین دن یا چار دن کی ہر مسافت پر ایک، صاحب عدل امیر کو مقرر کرو، جو ظالم سے مظلوم کا حق لے سکتا ہو اور شرعی حدود قایم کر سکتا ہو اور اس کی کوشش کرے کہ ان کی طرف سے پھر سرکشی اور فساد پیدا نہ ہو اور ارتداد اور کبیرہ کا ارتکاب نہ کر سکیں۔ اسلام بالکل فاش اور علانیہ ہوجائے اس کے شعائر کھلم کھلا ظاہر ہوں اور اپنے منصبی فرائض کو ہر شخص اختیار کرلے، چاہیے کہ ہر شہر کے امیر کے پاس اتنی قوت و شوکت ہو جس کے ذریعہ سے اپنے شہر کی اصلاح پر وہ قابو پاسکے مگر اتنی شوکت و قوت اس کے پاس نہ ہو کہ ان سے خود نفع اٹھانے لگے، اور بادشاہ وقت سے سرکشی کرنے لگے چاہیے کہ ہر اقلیم (صوبہ) میں ایک بڑا امیر بھی مقرر ہو، جس کے ذمہ فقط جنگ کی ذمہ داری عائد کی جائے چاہیے کہ اس کی

حینئذ من النظامات المنزلیۃ، والعقود ... فوجی جمعیت ایسے بارہ ہزار مجاہدوں کی ہو جو اللہ کی راہ
ونحوہ حتی لا یکون شیئ الا موافق الشرع ۔ میں کسی ملامت سے خوفزدہ نہ ہوں اور ہر سرکش باغی سے
حتی یامن الناس من کل وجہ ... جنگ کر سکتے ہوں جب یہ ہو چکے تب چاہیے کہ منزلی نظامات
(تفہیمات الٰہیہ صفحہ [illegible]) (اور معاشرتی قوانین) اور عقود و معاملات کی جانچ پڑتال کی
جائے اور اسی قسم کی دوسری باتوں کی (پھر ایسی صورت اختیار کی جائے، کہ کوئی بات ایسی باقی نہ رہ سکے جو شریعت کے مطابق نہ ہو) تاکہ لوگ ہر لحاظ سے امن وعافیت کی زندگی بسر کرنے لگیں"۔

اس قسم کے خاص خاص خطابات اور مخصوص دعوات کا ذکر شاہ صاحب کے کلام میں دوسرے مقامات پر بھی ملتا ہے لیکن ہم سردست اسی پر اکتفا کرتا ہوں شاہ صاحب کا اس کے بعد جو مسلک منقح ہوتا ہے میں اب اس کی اس سے زیادہ تصریح نہیں کرنا چاہتا اور نہ اب مزید کی ضرورت ہے۔

سیاست اور اسلام کا واقعی تعلق شاہ صاحب کی نظر میں

آج جب دنیا کا ہر طبقہ ایک قسم کے سیاسی بحران میں مبتلا ہے اور "انسانیت" کے اول و آخر ظاہر و باطن میں اب بجز "سیاست" کے اور کچھ نہیں رہ گیا ہے، جس کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں بھی ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو اسلام کو صرف "سیاست" اور "سیاست" کو صرف "اسلام" قرار دینے پر مصر ہے گویا ان کے غلاۃ کے نزدیک ہر شخص کے اسلام وایمان دینی خدمات کی بھلائی و برائی کا سارا دارومدار اسی پر رہ گیا ہے ان کے خیال میں "اب خیر" بلکہ ایمان بھی صرف اس میں ہے جو موجودہ سیاسی قصوں میں اپنا کچھ نہ کچھ پارٹ ادا کرتا ہو اور جو بیچارے کسی وجہ سے (اگرچہ آج کل کی سیاست کی گندگی ہی کی وجہ سے) ان "سیاسی مشاغل" سے محروم ہیں خواہ دوسرے نقطہ نظر سے یعنی شاہ ولی اللہ کی اصطلاح میں "خلافت باطنیہ" کی راہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے بہترین نمونے کیوں نہ پیش کرتے ہوں وہ بزدل، ناکارہ اور بعضوں کے نزدیک تو مخذول و مردود ہیں بلکہ ان کی موت بھی ان کے خیال میں جاہلیت کی موت ہے اور ان کی زندگی بھی جاہلیت کی زندگی ہے۔

مجھے اس سے بحث نہیں، کہ ارباب سیاست کا یہ اجتہاد واقعی اسلامی نصوص و نبوی آثار و سنن اور فقہاء اسلام کے مجتہدات پر کس حد تک منطبق ہے، بلکہ کہنا یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کا نقطہ نظر جیسا کہ ان کی مذکورہ بالا تصریحات سے معلوم ہوتا ہے اس باب میں جو ہے اس کو دیکھ کر کیا یہ حضرات اپنے اس طرز عمل میں کچھ تغیر فرما سکتے ہیں؟

اسی طرح جو لوگ ہندوستان یا بیرون ہند کی بعض بچی کھچی ملوکی اور سیاسی قوتوں کے بالکل استیصال یا "فک کل نظام" کا مشورہ محض اس لئے دے رہے ہیں کہ ان کے یہاں غربی نظامات اور عقود و معاملات یا دوسرے لفظوں میں بعض معاشرتی اور معاشی قوانین ایسے مروج ہیں جو شریعت اسلامیہ کے دفعات پر منطبق نہیں ہیں، اگرچہ زیادہ تر ان مشوروں کا محرک اس زمانہ میں شریعت کا درد نہیں بلکہ مغربی مکاتب خیال میں سے کسی مکتب خیال کے تاثر و انفعال کا یہ نتیجہ ہے، خواہ اس تاثر کا دعویٰ کرنے والوں کو شعور رہا یا نہ ہو تاہم یہ مان بھی لیا جائے کہ "انقلاب" "بالکل انقلاب" کے ان نعروں کی چیخ پکار کے پیچھے شریعت محمدیہ ہی کا درد

اور اسی تک کے اعتبار کا صادق جذبہ کارفرما ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ شاہ صاحب نے دعوت کی جو ترتیب پیش کی ہے اور یہی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے عیسائی بادشاہوں، اور مجوسی ملوک وعظماء کو شروع ہی میں شریعت کے منزلی نظامات اور عقود ومعاملات کی پابندی کی دعوت نہیں دی، اور نہ ان کے جمہوری یا شخصی نظامات حکومت کی تبدیلی کا ابتداءً مطالبہ کیا۔ بلکہ آپ کی اول دعوت توحید اور اسلام کی تھی، یقیناً حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا یہی نقطۂ نظر تھا کہ اگر وہ اسلام کو قبول کرلیں گے تو ان کی زمین، جائداد، اموال وخراج سے پوری طور پر کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔ البتہ بتدریج ان کے معاشرتی اور معاشی مفاسد کی اصلاح کی جائے گی۔ آخر نجاشی ابی سینیا کا عیسائی بادشاہ جیسا کہ کہا جاتا ہے مسلمان ہوگیا تھا، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کے ساتھ جو طرزِ عمل اختیار فرمایا تھا کیا اس میں ہمارے لیے کوئی اسوۂ حسنہ نہیں؟ کیسی عجیب بات ہے کہ آج جن علاقوں میں مسلمانوں کی تھوڑی بہت سیاسی قوت خواہ وہ کسی حال میں ہو باقی ہے، مسلمانوں کو ان کے متعلق مشورہ دیا جاتا ہے کہ ان حکومتوں کے بعض معاشرتی اور معاشی قوانین چونکہ شرعی قوانین سے مختلف ہیں اس لیے چاہیئے کہ ان کا تختہ الٹ دیا جائے اور کوئی مسلمان ان کے ساتھ کسی قسم کی ہمدردی نہ رکھے ان کا وجود وعدم برابر ہے، اور پھر اسلام کے ان احکام واوامر جن کی تعمیل کے لیے خلافت ظاہرہ یا سیاسی قوت کی ضرورت ہے۔ عمل پیرا ہونے کا مطالبہ ان غریب مسلمانوں سے کیا جائے جو بیچارے قدرتاً ان کی سرانجامی سے مجبور ہیں گویا اس کے معنے یہ ہوئے کہ امراء چونکہ اپنے اموال شرعی طریقوں پر خرچ نہیں کرتے اس لئے بجائے اس کے کہ ان کو شرعی طریقوں کی پابندی کی دعوت دی جائے یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ ان کو بھی غریب بنا دیا جائے اور پھر مفلسوں پر زکوٰۃ اور عشر صدقات کے ٹیکس عائد کیے جائیں۔۔۔

اس باب کی ایک اور غلطی پر انتباہ۔

ایسے ہی میرے خیال میں جو لوگ آج کل یہ تعبیر پھیلا رہے ہیں کہ اسلام صرف حاکموں کا مذہب ہے محکوم ہوکر زندہ رہنے کی اسلام میں گنجائش نہیں ہے۔ اور دلیل میں اسلام کے ان قوانین و اوامر کو پیش کرتے ہیں جو بغیر حکومت کی قوت کے سرانجام نہیں پا سکتے، ان کی مثال ایسی ہے کہ زکوٰۃ وعشر کے احکام دیکھ کر اعلان کر دیا جائے کہ غریب ہوکر جینے کی اسلام میں قطعاً گنجائش نہیں، یا روزہ، حج، وغیرہ کے فرائض کو دیکھ کر دعویٰ کر دیا جائے کہ بیماروں اپاہجوں کے وجود کا اسلام روادار نہیں کیونکہ غریب اسلام کے اہم احکام مثلاً آتوا الزکوٰۃ کی بجا آوری نہیں کر سکتا اور بیمار فلیصمہ، وللہ علی الناس حج البیت کی تعمیل نہیں کر سکتا، میرا ہرگز اس سے یہ منشا نہیں ہے کہ اسلام کو محکومی مطلوب ہے، یا حکومت واقتدار کو اسلامی نظام میں کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہے ـــ نیز یہ بھی میرا مطلب نہیں ہے کہ جو مسلمان امراء اسلامی دولی نظام اور اسلامی احکام کے پابند نہیں ہیں ان کے اس حال کی اصلاح کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ میرا مطلب صرف اس قدر ہے کہ دوسرے معاملات کی طرح ان چیزوں میں بھی غلو نہ کیا جائے اور مغربی احوال وتحریکات سے متاثر ہونے اور ان کے طرق کا اتباع کرنے کے بجائے اسوۂ حسنہ نبوی ہی کو ان کاموں میں

بھی شمع راہ بنایا جائے میں یہاں ان معاملات میں اپنی کوئی خاص رائے پیش نہیں کر رہا ہوں اور سچی بات یہ ہے کہ ان اُمور میں کسی رائے کے قائم کرنے کا مجھے مقام بھی حاصل نہیں، بلکہ میں تو حضرت شاہ صاحبؒ کے کلام سے جو بات سمجھ میں آ رہی ہے صرف بطور تشریح اُس کا اظہار کر رہا ہوں۔ اور وہ بھی اس بنیاد پر کہ اب تک اس کے خلاف مجھے ان کی کتابوں میں کوئی دوسری چیز نہیں ملی ہے اور خود آپ کی زندگی میں بھی اُس کے سوا کسی دوسرے پہلو کی شہادت نہیں ملتی، ممکن ہے کہ یہ میرے محدود معلومات اور قلت فکر و نظر کا نتیجہ ہو، لیکن میں اب تک یہی سمجھے ہوئے ہوں کہ "اسوۂ حسنہ نبوت کبریٰ" کی پیروی کو شاہ صاحب صرف "خلافت ظاہرہ" کے اور اس کے مظاہر و آثار کے ساتھ وابستہ نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اسی کے ساتھ ان کے نزدیک اُسوۂ حسنہ کی پیروی کی ایک دوسری راہ خلافت باطنہ کے ذریعہ سے بھی تھی، اور انھوں نے اپنے گرد و پیش کے واقعات، اپنے ماحول، خود اپنی اندرونی اور بیرونی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ کر کے بجائے خلافت ظاہرہ کے میدان میں اُترنے کے "خلافت باطنہ" ہی کی راہ سے اسوۂ حسنہ کی پیروی کے امکانات اپنے لئے پیدا کئے اور ان ہی طریقوں سے اپنی وسعت و طاقت کی حد تک وہ اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے لئے آستین چڑھا کر حق تعالےٰ کی غیبی نصرتوں کے بھروسہ پر تیار ہو گئے، پھر اس سلسلہ میں ان کے متوازن دماغ اور معتدل مزاج نے اس کی اجازت نہیں دی کہ خلافت باطنہ کے جتنے شعبے ابتداء تاریخ اسلام سے ان کے زمانہ تک کھلے ہوئے تھے اور جن میں سے ہر ایک کا "اسوۂ حقیقت جامعہ محمدیہ" (علی صاحبہا الف سلام و تحیہ) میں پایا جاتا تھا، ان میں سے کسی شعبے کی واقعی قدر و قیمت کا انھوں نے انکار کیا ہو، اور جیسا کہ عموماً ہر طبقہ کے غلاۃ، اور تشدد پسندوں کا عام شیوہ ہے کہ اپنی وہی کے سوا ہر ایک کے دماغ کی ترشی کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں، متکلم صوفی کو خشک دماغ مبتلائے مالیخولیا قرار دیتا ہے، صوفی متکلم کو حقائق و اسرار کی دنیا سے اندھا اور محروم ٹھیراتا ہے، فقیہ محدث پر تیوریاں چڑھاتا ہے، ایسے ہی محدث فقیہ پر تنگ نظری، اور تقلید جامد کا الزام لگاتا ہے۔ مگر حضرت شاہ صاحب سب کی تصحیح فرماتے ہیں، ہر ایک کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی باطنی خلافت کا حصہ دار سمجھتے ہیں۔ (۱)

شاہ صاحب کی جامعیت | اور یہ شاہ صاحب کی اسی "جامعیت" اور ہمہ گیر فطرت کا ثمرہ ہے جو خدائے بخشندہ نے ان کو بخشی تھی جس کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے یعنی

وھیہات ھذہ المناقضات منی لولا ان	آہ اگر میری فطرت میں یہ متضاد و متناقص امور پائے جاتے ہیں
شدۃ الجامعیۃ اوقعتنی فی ذلک	لیکن کیا کروں میری ہمہ گیر جامعیت نے مجھے اس حال میں
(فیوض الحرمین)	مبتلا کیا ہے۔۔

غالباً یہ ہمہ جہتی مناسبت شاہ صاحب کو اپنے والد سے ترکہ میں ملی تھی۔ "انفاس العارفین" میں ایک موقعہ پر حضرت شاہ عبدالرحیم کے متعلق ارقام فرماتے ہیں۔

از ہر علم بہرہ معتد بہ داشتند و بہ ترک مناسبت بفنے ... ہر علم سے کافی مقدار کے حصہ دار تھے اور فنون میں سے
از فنون طبع ایشان رضا نمی داد ... کسی فن کے متعلق مناسبت ترک کرنے پر آپ کی طبیعت
... راضی نہ تھی

شاہ عبدالعزیز کی جامعیت

... بتایا جاتا ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ تک جامعیت کا یہ ذوق اس خاندان میں باقی رہا۔ ملفوظات
عزیزیہ کے جامع نے تو براہ راست شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ایک کتاب کا ذکر ہو رہا تھا۔ اس وقت حضرت
نے ارشاد فرمایا ...
علمے کہ دیدہ ام و یاد ہم بقدر خود دارم یک صد و پنجاہ ... جن علوم کا میں نے مطالعہ کیا ہے اور اپنی وسعت بھر مجھے یاد
علم است ... بھی ہیں ان کی تعداد ایک سو پچاس ہے ...
... پھر اس میں دینی علوم کی خصوصیت بھی خود شاہ صاحب کی زبانی اس کی تشریح منقول ہے کہ ...
نصف ایں مردمان سابق تصنیف و نصف دریں امت تصنیف ... ان علوم میں سے آدھے تو ایسے علوم ہیں جو گزشتہ امتوں
... شدہ ... اور قوموں میں پیدا ہوئے اور نصف وہ ہیں جو اسلامی
... امت کی تصنیف ہیں ...

... طلب کا دائرہ کتنا وسیع تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جو جامع ملفوظات نے نقل کیا ہے یعنی حسب دستور
شاہ صاحب پیادہ پا ٹہلتے ہوئے جا رہے تھے کسی مکان سے گانے کی آواز آ رہی تھی فرمایا "یہ دھنا سری" ہے (یہ ہندی
راگ کی کوئی قسم ہے) آگے ایمن ملتانی وغیرہ راگوں اور گتوں کا ذکر فرماتے جاتے تھے اور آخر میں ارشاد ہوا کہ
سابق مرا دریں فن دخلے بسیار بود چنانچہ ناموران ایں ... پچھلے دنوں میں اس فن (موسیقی) میں مجھے بڑا دخل تھا
فن برائے تحقیق می آمدند حالا موقوف کردم لیکن می آیند ... چنانچہ اس فن کے نامور لوگ اس فن کے مسائل کی تحقیق کے
حالا مرا ضرر می کند یعنی قلب جوش می کند و بعد ازاں ... لئے میرے پاس آتے تھے۔ لیکن ابھی میں نے اس سلسلہ کو
مرض ہم حائل گردد ... موقوف کر دیا ہے مگر پھر بھی لوگ میرے پاس آتے ہیں،
مگر اب مجھے اس کا اشتغال ضرر پہنچاتا ہے یعنی دل میں جوش پیدا ہو جاتا ہے اور اس کے بعد بیماری بھی حائل ہو جاتی ہے۔[1]

... بہرحال "ایں خانہ تمام آفتاب است" کا مصداق بفضل و علم کا یہ گھرانا بنا رہا ہے۔ سچ یہ ہے کہ اس کی نظیر ہندوستان ہند کیا بیرون ہند
کی اسلامی دنیا میں بھی مشکل سے میسر آ سکتی ہے طوالت جواب حد سے زیادہ تجاوز ہو رہی ہے اس کا خوف نہ ہوتا تو کچھ دوسروں

[1] غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ شاہ صاحبؒ اپنی زندگی کے کسی دور میں العیاذ باللہ ان منکرات شرعیہ میں مبتلا تھے۔ ملفوظات میں ہے کہ کسی نے دریافت کیا سیل حرام
کا ہے فرمودہ اند جواب میں ارشاد فرمایا گیا آرے زد و باز اتفاق بود کہ در جوانی شنیدم کہ قصہ خوانے خوش گراہ است بہ ترغیب قصد کردم ناگاہ آواز مزامیر در گوش
گوش رسید خواستم کہ زیر دیوار نشستہ شنیدہ را بی مقصد شوم بمجرد نشستن خواب غلبہ کرد و چون چشم باز کردم صبح بود باز دگر ہمیں ما جرا پیش آمد[99]
اس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ بعض سرود کی مجلس میں نہیں بلکہ سرود ہمسایہ کے طور پر بھی آپ سمیں شریک ہوئے اسی ملفوظ سے پہلے شاہ صاحبؒ کا ایک فقرہ یہ بھی ہے از دف
بغہ شبابہ از رقص وغیرہ ممنوعات نفرت طبعی داشتم ص[99] لہذا مطلب یہ ہے کہ فن موسیقی کو شاہ صاحبؒ صرف علمی طور پر جانتے تھے ۱۲

کا بھی اس سلسلہ میں ذکر کرتا۔

بہرحال میں گفتگو شاہ صاحب کے توازن صادق، اور اعتدال صحیح کے متعلق کر رہا تھا کہ اسی کی بدولت اسلام کے علمی و دینی خادموں کے ہر طبقہ کی صحیح قیمت و پہچان سکے؛ دوسروں کی طرح انہوں نے اپنے طبقہ کے سوا اور دوں کو ناکارہ نہیں ٹھیرایا ان کے نزدیک فقیہ، صوفی اور محدث و متکلم سب کے سب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے باطنی خلفاء ہیں، البتہ اسی کے ساتھ طول امد کی وجہ سے قدرۃً دلوں میں جو ایک قسم کی بے حسی یا قساوت پیدا ہوجاتی ہے اس نے ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ دوسرے اسلامی خطوں میں بھی ہر شعبہ کو اسوۂ حسنہ کے حدود سے بہت آگے نکال دیا تھا، اور اس کی شکایت شاہ صاحب کو ہر طبقہ سے ہے جس کی کچھ مثالیں میں اوپر بیان کر آیا ہوں۔

علماء دین میں شاہ ولی اللہ کی امتیازی شان اور آپ کے خاص کارنامے

اب تک میں جو کچھ لکھ چکا ہوں ان ہی متفرق و منتشر امور نے میرے دل میں اس خیال کو پیدا کیا ہے کہ عام اہل علم یا ارباب درس و تدریس و تالیف و تصنیف کے مساعی کی جو نوعیت ہوتی ہے، حضرت شاہ ولی اللہ کے علمی خدمات کی نوعیت ان سے مختلف ہے۔ میں نے تمہید ہی میں عرض کر دیا تھا کہ شاہ صاحب کی علمی سرگرمیوں خصوصاً ان کے تصنیفی کاروبار کے پیچھے بعض اہم مقاصد اور اغراض کم از کم مجھے چھپے ہوئے نظر آتے ہیں، یہ مقاصد اور منصوبے ان کے دل میں جن اسباب و علل سے پیدا ہو سکتے تھے، در اصل اس وقت تک اجمالاً ان ہی کا ذکر کیا گیا۔ اب میں شاہ صاحب کے ہر منصوبہ اور اس منصوبہ یا نصب العین کے لحاظ سے جو کام کر کے وہ چلے گئے ہیں میں ترتیب کے ساتھ اس سے بحث کرنا چاہتا ہوں، لیکن یہ بحث کوئی واقعی تفصیلی بحث نہ ہوگی کہ اس کا یہاں نہ موقعہ ہے اور نہ گنجائش، محض ان کی ایک اجمالی فہرست پیش کر رہا ہوں۔

فقہی اختلافات میں نقطۂ عدل

آپ کی کتابوں میں ایک بڑا ذخیرہ تالیفات کا تو وہ ہے جن سے اس مکروہ خانہ جنگی کو ختم کرنا مقصود ہے جو پچھلے چند دنوں سے ہر مذہب کے متصلب متقشف فقہا کی بدولت ملک میں شدت اختیار کرتی جا رہی تھی اگرچہ یہ تو صحیح نہیں ہے جیسا کہ اس زمانہ میں مشہور کیا جا رہا ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالیوں کی زیادہ تر ذمہ داری ان ہی فروعی اختلافات کی طرف عائد ہوتی ہے، سمجھا یا جا رہا ہے کہ حنفیت شافعیت، مالکیت و حنبلیت کی اختلافات کی نوعیت اسی قسم کی ہے جیسے یورپ میں عرصوں کلیسا اور عوام کے باہمی مذہبی اختلافات کی رہی، حالانکہ یہ نسبت خاک باعالم پاک کجا یورپ کی وہ مذہبی خانہ جنگیاں جن میں کہا جاتا ہے کہ تقریباً دس لاکھ آدمی مختلف ظالمانہ طریقوں سے موت کے گھاٹ اتارے گئے، ہزاروں کو پھانسیاں دی گئیں، لاکھوں زندہ جلائے گئے، فرانس کے بار تھلمی ہنگامہ میں رومن کیتھولک والوں نے پروٹسٹنٹوں پر جو مظالم توڑے ہیں ان کی داستان سن کر اس وقت تک انسانیت کا کلیجہ پھٹا

ہے مسیح علیہ السلام کی ان مسکین بھیڑوں نے زندہ بچوں کو ماؤں کے پیٹ سے چاک کر کر کے نکالا اور اپنے کتوں کو کھلایا، نوروز تک پیرس کی گلیوں میں صرف خون بہتا تھا۔ دریائے سین کا پانی ان ہی کے لہو سے سرخ ہو گیا تھا (القصۃ بطولہا) یورپ اگر اپنے مذہب کے ان ہی نمونوں سے ڈر کر مرنے سے مذہب ہی کے نام سے پناہ مانگنے لگا۔ تو واقعہ یہ ہے کہ شاید یہ کچھ بیجا بھی نہیں ہے اور موجودہ مغربی الحاد و زندقہ کی پیدائش میں مسکین سائنس اور بدنام کیمیا سے زیادہ دخل سچ پوچھیے تو مذہبی نمائندوں کے ان ہی خونچکاں کارناموں کو ہے اگرچہ مسلم عوام کو دھوکہ دیا جاتا ہے کہ سائنس نے یورپ میں مذہب کی چولیں ڈھیلی کر دیں، حالانکہ اس دھوکہ کے وہی شکار ہوتے ہیں اور ہو رہے ہیں جو سائنس سے واقف ہیں اور نہ مذاہب سے۔ ورنہ اہل بصیرت جانتے ہیں کہ یورپ کی موجودہ بے ایمانیوں یا ہٹ دھرمیوں کے پیچھے ان کے مذہب اور مذہبی پیشواؤں کی وہ چیرہ دستیاں چھپی ہوئی ہیں جن کے نیچے صدیوں یورپ کے عوام سسکتے رہے ہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ یورپ کی ان ہی مذہبی خانہ جنگیوں کو بلا وجہ اسلام کے ان فروعی اختلافات پر منطبق کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اسلام زمین کے کرہ پر آج چودہ صدیاں گزار چکا ہے کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ محض حنفی اور شافعی ہونے کے اختلاف نے ہر جگہ نہیں تو اسلامی ممالک کے کسی خاص خطہ میں بھی کبھی اس قسم کی خوفناک شکل اختیار کی ہے، زیادہ سے زیادہ اگر اس اختلاف نے کبھی حد سے تجاوز کیا ہے، تو قلمی لڑائیوں یا زیادہ سے زیادہ شخصی حملوں سے کبھی نہیں بڑھا ہے، شیعیت اور سنیت کے جھگڑوں سے اس وقت بحث نہیں کہ اس کا معاملہ ہی دوسرا ہے، میری گفتگو کا تعلق صرف ان فروعی اختلافات تک محدود ہے جن کو حنفیت اور شافعیت وغیرہ کے الفاظ سے تعبیر کی جاتی ہے انشاء اللہ تعالیٰ اسلامی تاریخ کے اس طویل زمانہ میں کوئی ایسا اہم واقعہ ان اختلافات کی بنیاد پر پیش نہیں آیا ہے جسے یورپ کی ان خونی داستانوں کے مقابلہ میں سامنے لایا جا سکتا ہو۔

مگر جو کچھ بھی ہو، اس میں شک نہیں کہ پچھلی صدیوں میں بعض خاص حالات خصوصًا اسلام کے اصلی سرچشموں یعنی قرآن و حدیث کی تعلیم سے اسلامی مدارس جس حد تک بیگانے ہوتے چلے گئے بتدریج یہ اختلاف بہت غلط صورت اختیار کرتا چلا جاتا تھا۔ خصوصًا ماوراء النہر (ترکستان و خراسان) کے حنفی فقہاء کا غلو اس باب میں آہستہ آہستہ بہت آگے بڑھ گیا تھا اور ہندوستان میں وطن بنانے کے لئے اسلام جس راستہ سے آیا چونکہ وہ ان ہی ممالک کا راستہ تھا اس لئے قدرتاً ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنیت ان ہی ممالک کے علما کی ذہنیت سے متاثر تھی۔

پھر جیسا کہ میں نے عرض کیا نادری اور ابدالی حملوں نے جب اس ملک میں روہیلوں کے جدید عنصر کا اضافہ کر دیا تو تشدد و تصلب کی یہ شراب دو آتشہ ہو چکی تھی۔

شاہ صاحب نے بڑی دانشمندی اور گہرے مطالعہ کے بعد فقہا: اصول فقہ کی بنیادوں

سے پردہ ہٹایا ائمہ مجتہدین اور ان کے اجتہادات کا جو صحیح مقام تھا اسے واضح فرمایا، بعضوں کو تو شاہ صاحب سے شکایت ہے کہ ہندوستان میں غیر مقلدیت کی ابتدا آپ ہی سے ہوئی، اور خود غیر مقلدوں کا طبقہ اس باب میں گو نہ آپ کو اپنا پیشوا مانتا ہے۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اگر اُمت یا کم از کم ہندی مسلمانوں کے ہاتھ میں اس وقت وہ معلومات نہ ہوتے جنہیں شاہ ولی اللہ کی عرق ریزیوں نے وقف عام کیا ہے: تو سرزمین نجد اور نجد سے آگے بڑھ کر حجاز میں جو تحریک "وہابیت" کے نام سے چل پڑی تھی۔ اور یورپ والوں نے اپنے خاص اغراض کے تحت اس تحریک اور اس تحریک کے چلانے والوں کو مختلف طریقوں سے اچھالنا شروع کیا تھا (؟)[1]، واقعہ یہ ہے کہ غلامی کے ان دنوں میں جن میں کم ہیں جو اپنی زبان سے اپنی بات ادا کرتے ہوں اور اپنے دماغ سے اپنے خیالات سوچتے ہوں مشکل ہی سے غلام ہندوستان میں اس وقت کوئی حنفی نظر آتا، اس میں شک نہیں کہ اندرونی طور پر مغربی دجل وکید نے جو دام بچھایا تھا اور ذم کی صورتوں میں اس تحریک کی مدح کا جو گیت مختلف لہجوں میں گایا جاتا تھا جس کا افسانہ طویل ہے، اس میں بیچارے کچھ سادہ لوح ابتدا میں پھنس گئے، لیکن اہل علم کو معلوم ہے کہ صرف شاہ ولی اللہ کے تحقیقی طرز عمل نے اس تحریک کو ہندوستان میں زیادہ پھلنے پھولنے نہیں دیا۔ ولی اللہی مکتب خیال کے علمار کی کوششوں کا آج یہ نتیجہ ہے کہ "مشتے من سلار من قلیل" کے سوا اب عمل بالحدیث کے مدعیوں کی آبادیاں اپنے اندر اور کچھ نہیں رکھتیں۔

اس سلسلہ میں حضرت کی کتابیں انصاف عقد الجید۔ حجۃ اللہ البالغہ کے بعض ابواب تفہیمات الٰہیہ کی بعض تفہیمات، ازالۃ الخفار کی بعض ضمنی چیزیں اور سب سے زیادہ موطا کی شرحوں نے حدیث فہمی کا جو معیار پیش کیا ہے اور فقہ وحدیث میں تطبیق کی جو راہیں اشاروں اشاروں میں شاہ صاحب نے اہل فہم کے سامنے کھولی ہیں، سچی بات یہ ہے کہ آج حنفیت علی بصیرۃ من ربہ ان ہی بنیادوں پر قایم ہے[2]

---

[1] "الفرقان" میرے نزدیک مولانا کا یہ بالکل جدید "انکشاف" ہے میرے معلومات اس بارہ میں ان کے بالکل برعکس ہیں، مگر افسوس کہ یہ بحث بڑی تفصیل اور تطویل کو چاہتی ہے جس کی اس وقت گنجائش نہیں۔ انشاء اللہ آئندہ کبھی "الفرقان" ہی میں اس موضوع پر مفصل اظہار خیال کی نوبت آئے گی ۱۲م

[2] اس موقع پر ناظرین سے میں سفارش کروں گا کہ جناب مفتی عبد اللطیف صاحب رحمانی سابق صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حال صدر شعبہ اسلامیات جامعہ اسلامیہ علی گڑھ کی کتاب "تذکرۂ اعظم" کا مطالعہ کریں مفتی صاحب نے شاہ صاحب کی چیزوں کو اس میں بڑے سلیقہ کے جمع کر دیا ہے ۱۲م

ایک بڑی دانشمندی شاہ صاحب نے یہ بھی فرمائی کہ حنفی فقہ کے ساتھ ساتھ آپ نے درسی طور پر شافعی فقہ کے مطالعہ کو بھی ضروری قرار دیا ہے، اپنے مسلک کی تشریح میں ایک موقعہ پر اپنے کو "الشافعی درسًا" جو فرمایا ہے اس کا یہی مطلب ہو، جو جانتے ہیں کہ حنفی اور مالکی فقہ کی حیثیت اسلامی قوانین کے سلسلہ میں تعمیری فقہ کی ہے اور شافعی و حنبلی فقہ کی زیادہ تر نوعیت ایک تنقیدی فقہ کی ہے حنفیوں کی فقہ کو مشرق میں اور مالکیوں کی فقہ کو مغرب میں چونکہ عمومًا حکومتوں کے دستور العمل کی حیثیت سے تقریبًا ہزار سال سے زیادہ مدت تک استعمال کیا گیا اس لئے قدرۃً ان دونوں مکاتب خیال کے علماء کی توجہ زیادہ تر جدید حوادث و جزئیات و تفریعات کے ادھیڑ بن میں مشغول رہی، بخلاف شوافع اور حنابلہ کے کہ بہ نسبت حکومت کے ان کا تعلق زیادہ تر تعلیم و تعلم، درس و تدریس اور تالیف و تصنیف سے رہا اس لئے عمومًا تحقیق و تنقید کا وقت ان کو زیادہ ملتا رہا، بہر حال یہ افسانہ تو دراز ہے مجھے کہنا یہ ہے کہ فقہ اور اسلامی قوانین کا جو تعلق ان کے سرچشموں یعنی کتاب و سنت سے تھے، جو چاہتے ہیں کہ یہ تعلق مسلسل تر و تازہ حالت میں رہے، ان کیلئے شاہ صاحب کا یہ طریقہ عمل کہ شوافع اور حنابلہ کی فقہ اور ان کے ادبیات کا بھی مطالعہ جاری رکھیں بہت کچھ مفید ثابت ہو سکتا ہو یا کم از کم حدیث کے درس میں خصوصیت کے ساتھ فقہاء امصار کے خلافیات اور ان کے وجوہ و دلائل کے بیان کرنے سے مسائل فقہیہ میں زندگی باقی رہتی ہے ہر مذہب کا پیرو ان علل و اسباب سے واقف رہتا ہے جن کی روشنی میں اسکے امام نے اپنی رائے قائم فرمائی ہے نیز چونکہ اس کے ساتھ دوسرے ائمہ مجتہدین کے دلائل و وجوہ بھی اس کے سامنے آتے رہتے ہیں اس لئے قدرتی طور پر "جاہلی حمیت" کا زہر ان میں پیدا ہونے نہیں پاتا، "عقد الجید" میں شاہ صاحب ائمہ مجتہدین کے قیاسی نتائج کے متعلق بجائے اس نظریہ کے کہ حق ان میں سے ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اس خیال کو جو ترجیح دی ہے کہ سب ہی حق پر ہیں، تو فروعی اختلافات کی اہمیت کے سارے قصہ ہی کو ختم فرما دیا ہو اس باب میں شاہ صاحب کے مباحث قابل دید ہیں، جس قسم کا اجمال پیش نظر ہے اس کے لحاظ سے گنجائش نہیں ورنہ ان چیزوں کا ذکر کرنا چاہئے کہ لوگ اس کا عام طور پر مطالعہ کریں، اردو میں بھی اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

(۲)

صوفیائے عصر اور تصوف کی اصلاح

دوسرا ذخیرہ آپ کی کتابوں کا وہ ہے، جس میں مشائخ زمانہ اور صوفیہ عصر کو آپ نے جو ٹکانے کی کوشش کی ہو، تصوف کا کتنا ہی حصہ خالص اسلامی ہے اور زمانہ کی ضرورتوں سے جس طرح متکلمین اسلام نے وقتاً فوقتاً غیروں کی چیزوں کو اپنی کتابوں میں شریک کر لیا تھا حتی کہ شرح مقاصد و مواقف میں عنصریات و کائنات جوّیہ کے مباحث درج ہو گئے ہیں اسی طرح تصوف میں بھی اجنبی عناصر کا اضافہ مختلف وجوہ سے جو ہوتا رہا ہے اپنی مختلف کتابوں خصوصًا الطاف القدس، ہمعات، سطعات (؟) وغیرہ میں اسی کی آپ نے تفصیل بیان فرمائی ہو، تصوف کے متعلق بھی بعض لوگوں کا خیال ہو کہ سب سے پہلے ہندوستان میں اس کے خلاف میں شاہ ولی اللہ ہی نے قلم بغاوت اٹھایا، حالانکہ عالم

اس کے برعکس ہے، آج جبکہ یورپ تحقیق و ریسرچ کے نام سے اسلامی چیزوں کو غیروں کی طرف مختلف شاطرانہ چابکدستیوں سے منسوب کرنے میں منہمک ہو اگر شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیقی کتابیں اس وقت ہمارے پاس نہ ہوتیں تو کون کہہ سکتا ہو کہ اس دجالی ہنگامہ میں تصوف کا اسلام سے دور کا بھی رشتہ باقی رہ سکتا تھا ؟

یورپ زدوں کا ایک بڑا گروہ باوجود اس کے بھی جاہلوں کو جو بہکا رہا ہے کہ اسلامی صوفیہ کے پاس اپنا کچھ نہیں ہے بلکہ مصری اشراقیوں، عیسائیوں، صابیوں، یونانیوں، ایرانیوں اور آخر میں ہندوستانی یوگیوں سے مختلف چیزیں لے لے کر مسلمان صوفیوں نے تصوف کی عمارت کھڑی کی ہے۔

خدا جزائے خیر دے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کو مختلف کتابوں میں مختلف پیرایوں سے آپ نے اسلام کے حقیقی تصوف، اور اجنبی اجزاء کو جدا کر کے دکھایا ہے اور اس سلسلہ میں تو آپ نے اتنا کام کیا ہے کہ جن جن چیزوں کا تصوف سے محض برائے نام تعلق تھا، مثلاً جھاڑ پھونک تعویذ وغیرہ اس کے متعلق بھی آپ نے مستقل کتابیں تالیف فرمائیں "القول الجمیل" اور حزب البحر کی شرح وغیرہ اسی سلسلہ کی چیزیں ہیں، اس طرز عمل کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ جس طرح نمبر ایک کی کتابوں سے حنفی و شافعی اختلافات کی شدت کم ہوتی ہے، ان کتابوں سے ملا اور صوفی کے جھگڑوں کا بشرطیکہ انصاف سے کام لیا جائے خاتمہ ہو جاتا ہے، شاہ ولی اللہ نے تصوف کے مسائل کو خالص اسلامی تعبیروں میں پیش کر کے "مولویوں" کی اس بھڑک کو مٹا دیا ہے جو ان بیچاروں میں صوفی و صوفیت کے متعلق پائی جاتی ہے۔

(۳)

شیعہ سنی نزاع کے متعلق شاہ صاحب کا کام جیسا کہ میں نے عرض کیا ہو ہندوستان میں پہلے تورانی سنی، پھر ایرانی شیعہ، اور آخر میں متشدد سنی روہیلوں کی شکل میں داخل ہوئے ان تینوں عناصر کے امتزاج سے تسنن و تشیع کے سلسلہ میں عجیب افراط و تفریط کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ شاہ صاحب نے اس سلسلہ میں بھی بڑا کام کیا بڑی محنت سے ہزارہا ہزار صفحات کو پڑھ کر آپ نے چاروں خلفاء کے واقعی حالات "ازالۃ الخفاء" میں ایسے دل نشین طریقہ سے مرتب فرمائے کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اگر شیعوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے، تو اسی کے ساتھ ان شالی سنیوں کی شدت و تیزی میں بھی کمی پیدا ہوتی ہے جو محض اس لئے کہ شاہ عبدالعزیز نے تنہا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مناقب کیوں بیان کئے، یا شاہ ولی اللہ نے شیعوں کی تکفیر میں فقہاء حنفیہ کے اختلاف کو کیوں بیان کیا، ان پر بھی شیعیت کا فتوے صادر کر دیتے ہیں .. ۔ اور اس کے لئے بجائے مناظرے اور مجادلے کے شاہ صاحب نے ایک ایسی راہ دریافت فرمائی جس سے بہت سے فتنوں کا سدباب ہو گیا، مولوی شبلی صاحب نے اسی کی پیروی میں "الفاروق" لکھی جو زیادہ تر ازالۃ الخفاء ہی سے ماخوذ ہے اور اس سے دونوں فرقوں کے اہل انصاف پر مفید اثر مرتب ہوا،

(۴)

یونانی فلسفہ کے بجائے ایمانی فلسفہ

اسی سلسلہ میں شاہ صاحب نے اپنے زمانہ کے ان معقولی علماء کی اصلاح کو بھی پیش نظر رکھا ہے، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ وہ لفظی گورکھ دھندوں میں مبتلا تھے۔ آپ نے بجائے اوہام و خرافات کے قرآن و حدیث کے کلیات سے خود ایک فلسفہ تیار کیا اور جو لوگ ذہنی تمرین و تشحیذ کے لئے لایعنی خیالات میں وقت ضائع کرتے تھے ان کے لئے شاہ صاحب نے فکر و غور، کا ایک بڑا میدان پیش کر دیا۔ اس سلسلہ میں آپ کی سب سے بہتر کتاب الخیر الکثیر ہے نیز حجۃ اللہ و البدور البازغہ کے اکثر مباحث کا رخ بھی اسی نصب العین کی طرف ہے اس سلسلہ میں شاہ صاحب کے سامنے ہندوستان کی وہ مرعوب طبائع بھی ہیں، جو میر باقر داماد اور صدر شیرازی وغیرہ ایرانی لفاظوں کے لقبقوں اور تشقشقوں سے متاثر ہو کر اپنی جگہ پر گویا کانپ رہے تھے شاہ صاحب کی بعض کتابوں میں میر باقر وغیرہ کی عبارتوں کی جو جھلک نظر آتی ہے تو میں اس کو کوئی اتفاقی واقعہ نہیں سمجھتا بلکہ میرا خیال ہے کہ آپ نے قصداً اس طرز عمل کو اختیار کیا ہے اور مقصود وہی ہے جو میں نے عرض کیا

(۵)

مغربی الحاد کے زہر کا تریاق اور امروزہ شبہات کا پیشگی جواب

پانچویں چیز جو مجھے شاہ صاحب کے خدمات میں نظر آتی ہے، ممکن ہے کہ لوگوں کو اس باب میں مجھ سے اختلاف ہو لیکن بہر حال میں یہ سمجھتا ہوں کہ انگریزی حکومت کے بعد ہندوستان میں مذہب اور مذہبی امور کے متعلق شک و ارتیاب کا جو دور آنے والا تھا شاہ صاحب کے کاموں کا ایک بڑا حصہ اس سے بھی تعلق رکھتا ہے، خصوصاً حجۃ اللہ البالغہ، اور البدور البازغہ میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو سوالات آئندہ پیدا ہونے والے ہیں، ان کا جواب پہلے سے تیار کر کے ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا کے مسلمانوں کو سپرد کر رہے ہیں جیسا کہ میں نے خود لکھ چکا ہوں، شاہ صاحب کے زمانہ تک انگریزی حکومت کا اثر دلی تک نہیں پہنچا تھا، لیکن جب بنگال اور مدراس میں ان کے قدم جم چکے تھے اور اپنے اسی اقتدار و اختیار کی قوت کو محسوس کر کے عیسائی مذہب کے پوادر بو نظارتہ مغربی خیالات کو کسی نہ کسی شکل میں، ملک میں پھیلانے کی تیاریاں کر رہے تھے، عوام کو ان کا احساس نہ ہوا ہو، لیکن کوئی تعجب نہیں کہ شاہ صاحب تک اس کی لہریں پہونچی ہوں، ما سوا اس کے جب حجۃ اللہ کے دیباچہ میں وہ خود یہ فرماتے ہیں

بینا انا جالس ذات یوم بعد صلاۃ العصر، متوجھا الی اللہ اذ ظھرت روح النبی صلی اللہ علیہ وسلم وغشیتنی من فوقی بشی خیل الی انہ ثوب القی علی و نفث فی روعی فی تلک الحالۃ انہ اشارۃ الی نوع بیان للدین وو جدت

اس حال میں کہ ایک دن عصر کی نماز کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کر کے بیٹھا ہوا تھا اچانک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک ظاہر ہوئی اور مجھے اوپر سے اس نے ڈھانک لیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا مجھ پر

عند ذالک فی صدری نور الویزل یتفیح کل حین — کوئی کپڑا اڑھا دیا گیا ہے اسی کیفیت میں میرے اندر یہ بات پھونکی گئی کہ دین کی تشریح کے ایک خاص طریقہ کی طرف مجھے اشارہ کیا جارہا ہے میں نے اپنے اندر اس حال میں ایک روشنی پائی جو لحہ بہ لحہ پھیلتی چلی جاتی تھی۔

اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کے بعد کا جو یہ فقرہ ہے کہ شاہ صاحب کو یہ محسوس ہوا کہ

ان الشریعۃ المصطفویۃ اشرفت فی ھذا الزمان علی ان تبرز فی قمص سابغۃ من البرھان — مصطفوی شریعت کے لئے وقت آگیا ہے کہ برہان اور دلیل کے پیراہنوں میں ملبوس کرکے اسے میدان میں لایا جائے۔

آئندہ انگریزی عہد میں وساوس واوہام اور شکوک وشبہات کے جو سیاہ بادل امنڈنے والے تھے، اگر ان کی طرف اس میں اشارہ نہیں ہے، تو بتایا جائے کہ حجۃ اللہ کی تصنیف کے بعد انگریزی عہد کے سوا ایسا کون سا دور آیا جس میں ضرورت تھی کہ اسلامی شریعت کو دلیل" "وبرہان" کے پیراہنوں میں آراستہ کرکے پیش کیا جائے۔ بہرحال میرا خیال ہے، اور یہ خیال شاہ صاحب کی کتابوں سے پیدا ہوا ہے کہ جو کچھ ہونے والا تھا اور مسلمانان ہند پر جو افتاد پیش آنے والی تھی، کسی نہ کسی ذریعہ سے شاہ صاحب کو اس کی اطلاع ہو چکی تھی، اور اپنے تصنیفی کاروبار میں ان کے سامنے جہاں اور مقاصد واغراض تھے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آنے والے خطرات کے انسداد کی بھی انہوں نے اپنی کتابوں میں پوری کوشش کی ہے، اور میں سمجھتا ہوں وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوئے ہیں؛ جوں جوں نئی روشنی کی تاریکی بڑھتی چلی جارہی ہے، حضرت شاہ ولی اللہ کی جلائی ہوئی علمی شمع کی قیمت اسی نسبت سے بڑھ رہی ہے مغربی الحاد وزندقہ کے زہر کا تریاق شاہ ولی اللہ کا کلام ہے، اب یہ ایک ایسی مسلم بات ہوگئی ہے کہ صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ مصر اور اب تو عرب وترکی ایران وافغانستان سب ہی کو اس کا احساس ہو رہا ہے، اور بحمد اللہ ان تمام اسلامی ممالک میں شاہ صاحب کی کتابیں کافی مقبولیت حاصل کر رہی ہیں؛ چونکہ میں سردست صرف ولی اللہی کارناموں کی ایک اجمالی فہرست بنا رہا ہوں اس لئے مزید گفتگو کی گنجائش نہیں انشاء اللہ اگر تفصیل کا موقعہ کبھی ملا تو یہ دکھلایا جا سکتا ہے کہ آج جو کچھ پوچھا جارہا ہے سب کے جواب سے ولی اللہ القطب الحکیم کا قلم مدت ہوئی کہ فارغ ہو چکا ہے۔

(۶)

قرآن وحدیث کے تراجم کی بنیاد اور سب سے بڑا کام کم از کم میرے ناچیز خیال میں شاہ صاحب کا یہ ہے کہ سب سے پہلے ان ہی نے ہندوستان میں قرآن؛ حدیث کے ترجمہ کی بنیاد بڑی جرأت اور ہمت سے کام لے کر بالآخر ڈال دی تھی اگرچہ دو

انھوں نے فارسی میں قرآن کا بھی ترجمہ کیا اور حدیث کی قدیم ترین کتاب موطا مالک کا بھی ترجمہ فارسی ہی میں کیا، کہ ان کے زمانہ تک غالباً اردو عام طور سے لکھنے پڑھنے کی زبان نہیں بنی تھی، جو بھی لکھنا پڑھنا جانتے تھے وہ فارسی ہی میں لکھتے پڑھتے تھے۔ لیکن جوں ہی کہ اردو نے قدم آگے بڑھایا اور اس راہ میں اس نے بڑی تیزی دکھائی، تو محض اس لئے کہ شاہ صاحب کا نمونہ فارسی میں موجود تھا آپ کے صاحبزادوں میں سے حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے بامحاورہ اردو میں، اور شاہ رفیع الدین صاحب نے لفظی ترجمہ کرنے کی سعادت حاصل فرمائی۔

یہ بات کہ ان حضرات کو ترجمہ کرنے کا خیال اپنے والد کے ترجمہ ہی کی بنیاد پر ہوا، موضح القرآن میں اس کے متعلق شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں۔

"بندے عاجز عبدالقادر کے خیال میں آیا کہ جس طرح ہمارے بابا صاحب بڑے حضرت شیخ ولی اللہ عبدالرحیم صاحب کے بیٹے، سب حدیثیں جاننے والے ہندوستان کے رہنے والے نے فارسی زبان میں قرآن کے معنے آسان کر کے لکھے ہیں اسی طرح اس عاجز نے ہندی زبان میں قرآن شریف کے معنے لکھے۔"

اور ان دونوں حضرات کے بعد پھر اس وقت تک اردو میں قرآن بلکہ حدیث کے بھی جتنے ترجمے ہوئے یا آئندہ ہوں گے کم از کم ہندوستان کی حد تک اس سنت حسنہ کے تسنن کا سہرا حضرت شاہ ولی اللہ رح ہی کے سر بندھا ہے۔ قرآن و حدیث کے ترجمہ سے مسلمانوں کو خصوصاً ایسے زمانہ میں جب اسلام سے ان کا وہ ملکی اور حکومتی تعلق باقی نہیں رہا جس کی وجہ سے مسلمان تو مسلمان نامسلم بھی اسلامی زندگی کی اتباع میں فخر محسوس کرتا تھا، ایسے زمانہ میں ان ترجموں نے ہم مسلمانوں کے اسلام و ایمان کی حفاظت میں کیا کام کیا ہے، اس کا صحیح اندازہ کرنا آسان نہیں ہے اور خواہ میری یہ خوش اعتقادی قرار دی جائے یا جو کچھ بھی سمجھا جائے میں تو ایسا سمجھتا ہوں کہ اس سلسلہ میں بھی شاہ صاحب کو اس مصیبت، کا کسی نہ کسی حد تک اندازہ ہو چکا تھا جس میں انقلاب حکومت کے بعد بیچارے مولوی اور مشائخ مبتلا ہونے والے تھے۔

میرا اشارہ اس طریقہ عمل کی طرف ہے جسے اس زمانہ کے ارباب تشکیک وارتداد نے اسلام کے خلاف بڑی چالاکی سے اختیار کیا ہے، وہ چاہتے ہیں کہ اسلام کی کسی تعلیم کا انکار کریں لیکن ڈرتے ہیں کہ عام مسلمانوں میں اس سے برہمی پیدا ہوگی یا کم از کم صاف انکار اگر کر دیا جائے گا تو عوام ہمارے قبضہ سے نکل جائیں گے، اس لئے "مولوی کا مذہب" ایک لفظ تراشا گیا ہے، اور ہر وہ چیز جو واقعی قرآن کی یا حدیث کی ہوتی ہے مولوی کی طرف منسوب کر کے اس کا انکار کر دیا جاتا ہے کہدیا جاتا ہے کہ ہم نے مولوی کے خیال کا انکار کیا ہے، قرآن کا انکار نہیں کیا ہے، حد یہ ہے کہ آج جنت و دوزخ۔ حور ملائکہ شیاطین وغیرہ ایسے حقائق کا علانیہ انکار کیا

جارہا ہے جن کے ذکر سے قرآن معمور ہے، لیکن سادہ لوحوں کو کتنی دیدہ دلیری سے یہ باور کرا دیا جاتا ہے کہ ان چیزوں کا ثبوت کہیں بھی قرآن میں نہیں، بلکہ یہ عربی کند نظرت مولوی ان کا قائل ہے، الغرض اس پردہ میں قرآن کے جس عقیدے سے چاہا جاتا ہے انکار کر دیا جاتا ہے۔

اور یہ واقعہ ہے کہ اگر اس وقت شاہ ولی اللہ قرآن وحدیث کے ترجمہ کی بنیاد ڈال کر نہ چلے جاتے اور اس وقت بھی قرآن عوام کی دسترس سے عربی زبان میں ہونے کی وجہ سے بالکل باہر ہی ہوتا، تو بیچارہ مولوی اس مغالطہ کا کیا جواب دے سکتا تھا، صبر وسکون کے ساتھ الحاد و بے دینی کے ان طمانچوں کو برداشت کرتا رہے، اس کے لئے اس کے سوا چارہ کار ہی کیا تھا۔

لیکن بحمد اللہ شاہ ولی اللہ ایک ایسا کام کر کے چلے گئے ہیں کہ جو نہیں سمجھنا چاہتے ان سے تو بحث نہیں لیکن واقعی جو حقیقت کے طالب ہیں، ان کے لئے "مولوی کے مذہب" کا پرانا جال اب بیکار ہو چکا ہے، قرآن تمہاری زبان میں بہ شکل ترجمہ موجود ہے، خود پڑھ جاؤ، اور پڑھنے کے بعد خود انصاف کر سکتے ہو، کہ مثلاً آج جس جنت و دوزخ حور و غلمان، اشجار و انہار کا دار آخرت میں انکار کیا جارہا ہے، یہ کسی غریب مولوی کی بات کا انکار ہے، یا براہ راست قرآن کا انکار ہے۔

غرض یہ ایک بڑی پر فریب دجالیت تھی جس کا قلع قمع کم از کم انصاف پسندوں کی حد تک ہو چکا ہے اور سچ پوچھئے تو انحطاط و نا قدری کے اس زمانہ میں بیچارے مولویوں کے لئے بھی قرآن وحدیث کے یہ تراجم آج اکسیر کا کام دے رہے ہیں، عربی مدارس میں ٹوٹی پھوٹی ہمتوں والے طلبہ آج جو کچھ پڑھتے ہیں یہ واقعہ ہے کہ ان میں ایسے بہت کم پیدا ہوتے ہیں، جو بغیر ترجمہ کی مدد کے قرآن یا حدیث کا پورا مطلب خود سمجھ سکتے ہوں، اگر یہ کہوں تو شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ نوے فیصدی مولویوں کی آبرو محض ان ہی ترجموں کی بدولت بچی ہوئی ہے، اور سچی بات یہ ہے کہ محض زبان سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اللہ کے جو بندے اپنے مالک کے براہ راست مخاطب بننے کی سعادت سے محروم تھے یا براہ راست اپنے رسول کے ملفوظات وارشادات کے سمجھنے سے معذور رہتے، اس نعمت

کا کون اندازہ کر سکتا ہے کہ ان تراجم کی بدولت اب وہ بھی اپنے خدا کے سامنے کھڑے ہوگئے اور خود ان آنکھوں سے بغیر کسی مولوی عالم کے واسطہ کے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا مطالعہ کررہے ہیں، اور جیسا کہ شاہ عبدالقادر صاحب نے لکھا ہے کہ

"بتلانے والے بہتیرا بتائیں، جیسا خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں آپ بتایا ہے، ویسا کوئی نہیں بتا سکتا، اور جیسا اثر اور راہ پانا خدا کے کلام میں ہے، کسی کے کلام میں نہیں"[۱]

درحقیقت جو منافع ان تراجم کے پڑھنے سے پڑھنے والوں کو حاصل ہوسکتے ہیں اور ہورہے ہیں، وہ لاکھ مولوی ملا کی زبان سے ہم سنیں کبھی حاصل نہیں ہوسکتے۔ بلکہ ترجمہ پڑھنے والے عوام میں ایسے کتنے ہیں، جنھوں نے انہی ترجموں کی مزاولت سے آہستہ آہستہ عربی زبان سے ایسا لگاؤ پیدا کرلیا کہ براہ راست خود کلام اللہ ان کی سمجھ میں آرہا ہے،

خلاصہ یہ ہے کہ شاہ صاحب کے کارناموں میں ترجمہ کی خدمت کو میں سب سے بڑی خدمت قرار دیتا ہوں اس وقت چونکہ سرسری فہرست کی حیثیت سے اس کا تذکرہ مقصود ہے، اس لئے بالفعل اسی پر بس کرتا ہوں، انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ جیسا کہ عرض کرچکا ہوں، آپ کے ان شش گانہ خدمات قیمہ پر الگ الگ مقالہ میں چاہتا ہوں کہ بحث کروں اور اسی سلسلہ میں ایک مقالہ تراجم کا بھی ہوگا، خود شاہ صاحب نے اپنے ترجمہ کے متعلق کیا ارقام فرمایا ہے، اور کن مقاصد کو پیش نظر رکھ کر اس کام کو آپ نے انجام دیا۔ نیز ترجمہ کیساتھ قرآن کے حاشیہ پر بزبان فارسی آپ نے مختصر لفظوں میں جو جواہر پارے بکھیرے ہیں، اور "الفوز الکبیر" وغیرہ رسائل میں تفسیر کے جو اصول آپ نے وضع فرمائے ہیں، ان سب کا تذکرہ تراجم ہی کے اس مقالہ میں انشاء اللہ کیا جائے گا۔

شاہ صاحب کے ان شش جہتی کارناموں پر اجمالی نظر

واقعہ یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی حیرت انگیز فقید النظیر کوششوں کی جو نوعیت ان شش جہتی کارناموں میں نظر آتی ہے۔ ان میں ہر ایک بجائے خود ایک ایسا مستقل موضوع ہے کہ ایک کیا، اگر علماء کی کوئی جماعت بھی ان سے عہدہ برا ہونا چاہتی تو جتنی کامیابی

[۱] مقدمہ موضح قرآن از شاہ عبدالقادر رح ۱۲

حضرت شاہ صاحب کو ان میں سے ہر ایک شعبہ میں ہوئی ہے۔ کسی ایک شعبہ میں بھی اتنا کامیاب ہونا آسان نہیں تھا انھوں نے قرآنی آیات کی جن مشکلات کو حل کیا ہے، قرآن فہمی کے متعلق جن کلیات کی انھوں نے خود تاسیس فرمائی ہے حدیث و فقہ کے باہمی تعلقات کو صحیح تاریخی وثائق کی روشنی میں جس طرح انھوں نے حل فرمایا ہے، پھر خصوصیت کے ساتھ "علم اسرار الدین" کے سلسلہ میں حدیث اور فقہ کے تقریباً تمام ابواب میں جن حقائق و رموز کو انھوں نے بے نقاب کیا ہے، اس باب میں واقعہ یہ ہے کہ ان کے اس دعوے کی کوئی تردید نہیں کرسکتا کہ

اسرار حدیث و مصالح احکام و ترغیبات و سائر آنچہ حضرت پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم از خدائے تعالیٰ آوردہ اند و تعلیم فرمودہ اند و آں فنے ست کہ پیش ازیں فقیر مضبوط تر از سخن ایں فقیر کسے آنرا نہ کردہ است باوجود جلالت آں فن اگر کسے را دریں حرف شبہ باشد گو کتاب قواعد بہ بین کہ شیخ عز الدین آنجا چہ جہد ہا کردہ بعشر عشیر ایں فن فائز نشدہ (انفاس ص ۱۹۶)

حدیث کے اسرار اور اخلاقی احکام و قوانین کی مصلحتیں اور ترغیبات کی حکمت اور وہ ساری باتیں جو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے ہیں اور جن کی آپ نے تعلیم دی ہے، ان سب کے اسرار و رموز کا بیان کرنا دراصل ایک مستقل فن ہے، اس فقیر سے پہلے جتنی پختہ بات میں نے کہی ہے کسی سے یہ نہ بن آیا، اس فن کے بلندی مقام کے باوجود اگر کسی کو میرے بیان میں شبہ ہو تو چاہیے کہ کتاب "قواعد" کو دیکھے شیخ عز الدین بن عبد السلام نے اس میں کیا کچھ کوشش نہیں فرمائی ہے مگر اس فن کے عشر عشیر تک ان کی رسائی نہ ہو سکی۔

اسی طرح فن معارف و حقائق اور تصوف کے متعلق جن تحقیقی مباحث تک وہ پہنچے ہیں، نیز اہل السنت والجماعت کے عقائد کی تشریح، اور تطبیق منقول بر معقول کے سلسلہ میں انھوں نے جو خدمتیں انجام دی ہیں جیسا کہ خود ارشاد فرماتے ہیں۔

عقائد قدماء اہل سنت بدلائل و حجج اثبات کردہ آں را از خس و خاشاک معقولیاں پاک ساخت و بوجہے مقرر نمود کہ محل بحث نماند

قدماء اہل سنت کے عقائد کو دلائل و براہین کی روشنی میں جس طرح ثابت کیا گیا ہے، اور معقولیوں کے خس و خاشاک سے جیسا ان کو

پاک کیا ہے اور ایسے طریقہ سے ان کی بنیاد قایم کی ہے کہ اب بحث و مباحثہ کی ان میں گنجائش ہی باقی نہ رہی"

ماسوا اس کے انہوں نے قرآنی نصوص اور نبوی ارشادات کی روشنی میں دو مستقل فن جو ایجاد کئے ہیں جس کی تعبیر ان ہی کے الفاظ میں یہ ہے یعنی ایک تو علم کمالات اربعہ یعنی ابداع و خلق و تدبیر و تدلی با این عرض و طول"

اور دوسرا علم ان ہی کی اصطلاح میں ـــ "علم استعداد نفوس انسانیہ بجمیعہا و کمال و مآل ہر کسے"

شاہ صاحب کا ان دونوں علوم کے متعلق دعوی ہے اور بجا دعویٰ ہے کہ "ایں ہر دو علم جلیل اند کہ پیش ازیں فقیر کسے برگرد اں نہ گشتہ"

نیز شاہ صاحب نے علم کلام اور تصوف کے نظری حصہ کے مباحث کو مخلوط کر کے ایک نیا "فلسفہ" تیار کیا اور ایسا "فلسفہ" جس کو "فلسفہ" قرار دینا، میرے خیال میں اس کی تحقیر ہے کیونکہ اس باب میں ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ ایسی کسی چیز کو اسلامی کلام اور اسلامی تصوف میں وہ دیکھنا نہیں چاہتے جس کی تائید قرآن و حدیث اور آثار صحابہ و سلف صالح کی شہادتوں سے نہ ہوتی ہو، خود فرماتے ہیں کہ اس قسم کے تمام مسائل میں حق تعالے نے ان کو

توفیق تشئید آں بہ کتاب و سنت و آثار صحابہ داوند	اس بات کی توفیق دی کہ کتاب و سنت و آثار صحابہ
و بر تمیز انچہ علم دیں سنت منقول از حضرت پیغامبر	سے اسکی بنیادوں کو مستحکم کریں نیز وہ علم دین جو
صلے اللہ علیہ وسلم وانچہ بدخول تست و محرف وانچہ	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے
سنت است وانچہ ہر فرقہ بدعت کردہ است	اور جو دین میں باہر سے چیزیں داخل ہو گئی ہیں
افادہ ساختند (انفاس)	ان دونوں میں تمیز کا جو سلیقہ اور یہ کہ ان میں کونسی باتیں تحریفی

ہیں، کون کون سی چیز سنت ہے اور اسلام کے مختلف فرقوں نے کن نئی بدعتوں کو شریک کیا (ان تمام امور کا انکشاف جیسا شاہ صاحب نے کیا شاید ہی کسی نے کیا ہو)

الغرض اس قسم کے مختلف الاطراف والجوانب مباحث مہمہ کو انھوں نے اپنی چھوٹی بڑی کتابوں اور رسالوں میں جو جمع کیا ہے، جن کی تعداد "حیات ولی" کے مصنف نے (۵۱) بتائی ہے، اگرچہ اسی کے ساتھ یہ بھی لکھدیا ہے۔

"آپ کی تالیفات کے سلسلہ میں اور بھی بہت سی کتابیں ہیں، جو قدیم کتب خانوں میں موجود ہیں، مگر ہم نے صرف ان ہی کتابوں کا ذکر کیا ہے جو مطبوع ہو کر شرق سے غرب تک نہایت وقعت کے ساتھ مشہور ہو چکی ہیں"

شاہ صاحب کے طرز انشاء میں زبان نبوت کی جھلک اور پھر یہی نہیں کہ ان کی توجہ اپنی ان کتابوں میں محض معنی پر رہی ہے، بلکہ عربی زبان میں انھوں نے جتنی کتابیں لکھی ہیں، ان میں ایک خاص قسم کی انشاء کی جو ان کا مخصوص اسلوب ہے پوری پابندی کی ہے، شاہ صاحب نے عربی انشار و ادب کا جو نیا قالب تیار کیا ہے یہی نہیں کہ ہندوستانی مصنفین میں اس کی نظر نہیں پائی جاتی بلکہ جہاں تک میری محدود رسائی کا تعلق ہے، میں نہیں جانتا کہ آغاز اسلام سے اس وقت تک کسی اسلامی علاقہ کے ارباب تصنیف نے اس کو اختیار کیا ہے، شاہ صاحب کے اس "اسلوب بدیع" کی کیا خصوصیتیں ہیں اس کے لئے بھی ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے لیکن مختصر لفظوں میں شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاہ ولی اللہ پہلے آدمی ہیں، جنھوں نے اپنی عبارتوں میں زیادہ تر صاحب "جوامع الکلم" "النبی الخاتم" صلے اللہ علیہ وسلم کے طرز گفتگو کی پیروی کی ہے، حتی الوسع وہ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے مدعا کا اظہار ان ہی لغات اور ان ہی محاوروں میں کریں، جو لسان نبوت اور زبان رسالت سے خاص تعلق رکھتے ہیں، اور اس میں خدا نے ان کو خاص مہارت عطا فرمائی ہے، ان سے پہلے تو کسی کو عبارت کے اس ڈھنگ کی طرف توجہ ہی نہیں ہوئی، لیکن ان کے بعد بھی اس کی تقلید آسان نہیں ہے حدیث کے بعد ان کی عبارت میں قرآنی طرز تکلم کا بھی اثر ہے، لیکن قرآن سے زیادہ اس باب میں وہ حدیث ہی کے تتبع نظر آتے ہیں اور اسی چیز نے ان کی کتابوں کے رنگ کو عربی زبان کے تمام دوسرے مصنفین سے ممتاز کر دیا ہے، فارسی میں شاہ صاحب نے اگرچہ کم لکھا ہے، لیکن جو کچھ لکھا ہے کم از کم اس میں ان علماء کے لئے درس عبرت ہے جو اپنے زمانہ کی عام طریقہ انشار و کتابت میں لکھنے پڑھنے کو اپنی علمی شان سے ایک گری ہوئی بات خیال کرتے ہیں، شاہ ولی اللہ شاہ عبدالعزیز کی کتابوں کو پڑھیے اور اس زمانہ کے بڑے بڑے ارباب انشار کی کتابوں کا بھی مطالعہ کیجیے، مشکل ہی سے ان حضرات کی عبارات ان سے دب سکتی ہیں۔

شاہ صاحب کے اس سارے کام کی کل مدت لیکن یہ سارا کام کتنی مدت میں انجام پایا، شاید ہی کسی نے اس پر غور کیا ہو، واقعہ یہ ہے کہ شاہ صاحبؒ کی عمر کا ایک بڑا حصہ یعنی سفر حج سے پہلے کا جو حصہ ہے، اس میں تصنیف و تالیف کا بظاہر آپ نے کچھ کام نہیں کیا، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت آپ کو اس کا خیال بھی نہ تھا،

والد ماجد یعنی حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کی وفات کے وقت آپ سترہ سال کے تھے اسی عمر میں علوم متداولہ سے فارغ ہو چکے تھے، ان کی وفات کے بعد اپنے والد کے پرانے مدرسۂ رحیمیہ میں درس تدریس کا کام تقریباً ایک قرن تک انجام دیتے رہے خود فرماتے ہیں کہ

بعد از وفات حضرت ایشان دوازدہ سال کم بیش بدرس کتب دینیہ وعقلیہ نمودہ در ہر علمے خوض اتفاق افتاد۔ (انفاس)

حضرت والد کے انتقال کے بعد کم دبیش بارہ سال تک دینی اور عقلی علوم کی کتابوں کا درس دیتا رہا اور ہر علم میں غور و فکر کا مذاق پیدا ہوا۔

جس کے معنی یہی ہوئے کہ قریب قریب انتیس تیس سال کی عمر تک شاہ صاحبؒ کا بجائے تالیف و تصنیف کے زیادہ تر درس تدریس سے ہی تعلق رہا اسی زمانہ میں یکایک سفر حجاز کا سودا سر میں سمایا، فرماتے ہیں

بعد ازاں دوازدہ سال شوق زیارت حرمین محترمین در سر افتاد۔

اس بارہ سال کے بعد حرمین محترمین کی زیارت کا شوق سر میں سمایا۔

۱۱۴۳ھ و ۱۱۴۵ھ یہ تین سال اسی سفر کے نذر ہوئے جس میں تقریباً چودہ مہینے حرمین شریفین میں قیام کا موقعہ میسر آیا شاہ عبدالعزیز کا بیان گزر چکا ہے کہ

والد ماجد چہاردہ ماہ در حرمین بودند (ملفوظات ص۹۳)

والد ماجد چودہ مہینے حرمین میں رہے۔

اور باقی مدت آمد و رفت میں صرف ہوئی اس سلسلہ میں شاہ صاحب کو دو حج ملے ایک اس وقت جب حجاز پہنچے، اور دوسرا اس وقت جب واپسی کے قصد سے عرب سے روانہ ہونے والے تھے۔

اس حساب سے حضرت کی عمر کے بتیس چونتیس سال ان ہی شغلوں میں ختم ہو گئے آپ کی پوری عمر کتنی ہوئی، اس میں اگرچہ تھوڑا سا اختلاف ہے "حیات ولی" کے مصنف نے گو یہ لکھا ہے کہ

شاہ صاحب کی عمر کے بارہ میں اختلاف

جناب شاہ ولی اللہ عمر کے تریسٹھ سال مرحلے طے کر چکے تو چند روز خفیف سی بیماری میں مبتلا ہو کر ۱۱۷۶ھ میں عازم سفر آخرت ہوئے۔ (ص۳۱۰)

لیکن اس کے برخلاف ملفوظات عزیزیہ کے جامع نے حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ کا یہ قول نقل کیا ہے:۔

شاہ صاحب کی تاریخ ولادت و وفات شاہ عبدالعزیز کی زبانی

عمر شریف شصت و یک سال و چہار ماہ شد، چہارم شوال تولد گشت و در بست و نہم محرم وفات یافت، تاریخ تولد چہارم ماہ شوال چہار شنبہ ۱۱۱۴ھ بود۔ تاریخ وفات او بود امام اعظم دیں ۱۱۷۶ھ

و دیگر تاریخ:۔ ہائے دل روزگار رفت ۱۱۷۶ھ بست نہم محرم وقت ظہر

(ملفوظات عزیزیہ ص۔۔)

تاریخوں کے ملانے سے جیسا کہ یوں بھی چاہیئے شاہ عبدالعزیز ہی کے بیان کی توثیق ہوتی ہے، بہرکیف

میرا مقصود تو یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ کی عمر جب کل اکسٹھ سال چار مہینے مانی جائے تو اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ اس اکسٹھ میں سے تقریباً تینتیس چونتیس اپنی مشغولیتوں میں بسر ہوگئی اب کل ستائیس اٹھائیس سال کی مدت رہجاتی ہے جس میں وہ سارا کام انجام پایا ہے' جسے دنیا شاہ ولی اللہ کا کام سمجھتی ہے' بلکہ اسی کے ساتھ مرحوم حضرت امیر شاہ خاں صاحب جو ولی اللہی خانوادہ کے گویا "راویہ" تھے اگر ان کے اس بیان کا بھی اضافہ کرلیا جائے کہ

"دہلی میں نجف علی خاں کا تسلط تھا جس نے شاہ ولی اللہ صاحب کے پہنچے اتروا کر ہاتھ بیکار کر دئے تھے تاکہ وہ کوئی کتاب یا مضمون نہ تحریر کرسکیں۔ (امیر الروایات ص۱۰۹)

اگرچہ اب تک اس واقعہ کی تاریخی شہادت مجھے میسر نہیں آئی ہے' لیکن امیر شاہ کا بیان کم از کم میرے نزدیک خود ایک زندہ شہادت ہے' پھر چونکہ یہ نہیں معلوم کہ یہ ناگوار سانحہ حضرت کے ساتھ کس وقت پیش آیا' اس لئے کوئی معین مدت تو مقرر نہیں کی جاسکتی لیکن بقیہ ستائیس اٹھائیس سال والی وہ مدت لامحالہ اس بنیاد پر اور گھٹ کر رہ جاتی ہے'

اتنی قلیل مدت میں ایسے عجیب و غریب گوناگوں کام کیسے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بن آئے؟ یہ یقیناً محل حیرت ہے' کوئی شبہ نہیں کہ اس میں بہت کچھ دخل خود ان کی خداداد فطرت اور خاص دل و دماغ کو بھی ہے' بھلا جس شخص کی ختنہ اور جس کا ختم قرآن ساتھ ساتھ ہوا ہو' جیساکہ خود فرماتے ہیں

در سال ہفتم حضرت والد بزرگوار بر نماز ایستادہ کردند و بروزہ داشتن فرمودند و تطہیر نیز در ہمیں سال واقع شد و چناں در خاطر ماندہ کہ آخر ہمیں سال قرآن عظیم ختم کردم۔ (انفاس ص۱۹۴)

عمر کے ساتویں سال میں والد بزرگوار نے مجھے نماز پر کھڑا کیا اور روزہ رکھنے کا حکم دیا اور ختنہ بھی اسی سال میں واقع ہوئی اور خیال ایسا ہوتا ہے کہ اسی سال کے آخر میں قرآن مجید بھی میں نے ختم کیا۔

اور دس سال کی عمر میں جو شرح ملا تک پہنچ گیا ہو' اور کس طرح پہنچا ہو' کہ مطالعہ کی قوت بھی پیدا ہوچکی ہو فرماتے ہیں :۔

در سال دہم شرح ملا می خواندم و راہ مطالعہ فی الجملہ کشادہ شد۔

میں دسویں سال شرح ملا پڑھ رہا تھا فی الجملہ اسی وقت سے مطالعہ کی راہ مجھ پر کھلی'

اور ٹھیک عمر کے پندرہویں سال میں باضابطہ دستار فضیلت جس کے سر پر بندھ گئی ہو جیساکہ ان ہی کا بیان ہے کہ :۔

بالجملہ از فنون متعارفہ بحسب رسم ایں دیار پانزدہم

خلاصہ یہ ہے کہ تمام متداول علوم اس ملک کے درس

فراغ حاصل ... میں جن کا رواج ہے ان نے پندرھویں سال
... فراغت حاصل ہو گئی ...

ان علوم متداولہ میں صرف درس نظامیہ کی کتابیں ہی داخل نہیں ہیں، بلکہ ان عام کتابوں کے سوا طب اور تصوف کی ایک نہیں چند چند کتابیں چھوٹی بڑی بھی شریک ہیں بلکہ شائد علم خواص الاسماء وغیرہ کے طرز کی بعض چیزیں بھی اپنے والد سے آپ نے پڑھ لی تھیں اور پھر سترہ سال کی عمر سے ہر قسم کے علوم وفنون عقلی ونقلی کا درس دینا شروع کر دیا تھا ظاہر ہے کہ یہ باتیں ان کی خاص دماغی اور ذہنی قابلیت پر دلالت کرتی ہیں۔

عرب بھی جو وہ گئے، تو اس میں شک نہیں کہ وہاں کے اہل علم وفضل کی صحبتوں سے کافی فائدہ ان کو پہنچا اور سب سے بڑی چیز جو وہاں سے لائے وہ حدیث کی سند تھی، کیونکہ گو ہندوستان میں بھی قبل سفر حجاز کے اپنے والد سے پوری مشکوٰۃ اور بخاری کا کچھ حصہ پڑھ چکے تھے لیکن صحاح اور صحاح کے سوا دوسری حدیث کی کتابوں کی سند آپ کو عرب ہی سے حاصل ہوئی، لیکن خود ان کے بعض جلیل القدر اساتذہ بلکہ آپ کے سب سے بڑے استاذ حدیث علامہ طاہر بن ابراہیم کردی ہی فرماتے تھے ...

یسند عنی اللفظ وکنت اصحح المعنیٰ ... مجھ سے وہ لفظوں کی سند لیتے ہیں اور میں ان سے حدیث کے معنی کی تصحیح کرتا ہوں ...
منہ ... (الیانع الجنی) ...

بلاشبہ یہ ساری باتیں ان کی فطری ذہانت وذکاوت پر دلالت کرتی ہیں اور شاہ عبدالعزیز صاحب سے منقول بھی ہے فرمایا کرتے تھے "مثل والد ما جد شخصے کم نظر آید" حافظہ کے متعلق ان ہی کی شہادت یہ ہے کہ "مثل والد ماجد حافظ ندیدہ ام" صدا

اور ایک خاص بات شاہ عبدالعزیز نے ان کے متعلق یہ بھی بیان کی ہے کہ — "مریض ہم کم می شدند" صلا بہرحال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شاہ صاحب کی ان علمی جدات ومجتہدات میں ان کی فطری خصوصیتوں کو بھی بہت زیادہ دخل ہے۔

لیکن جو کام جتنی قلیل مدت میں ان سے بن پڑا ہے، اور ایسا کام جس کے اکثر حصہ کے وہ موجد ہیں ان کی کتابوں سے اگر ان "باکورات" و "بدائع" کا انتخاب کیا جائے جن کے ابتداع وابتکار کا فخر صرف ان کے نوک خامہ کو حاصل ہے، تو بلا مبالغہ ہزار ہا ہزار سے وہ متجاوز ہو سکتے ہیں تو کیا شاہ صاحب کی اس عبقریت اور نابغیت میں صرف ان کے دل ودماغ کو دخل ہے ممکن ہے کہ لوگ ایسا ہی خیال کرتے

ہوں خصوصاً اس زمانہ میں "جینیس" کا ایک لفظ تراش لیا گیا ہے اور جب کسی شخص کے کام کے متعلق اس قسم کی مدہش اور حیرت انگیز اعجوبہ طرازیوں کا تجربہ ہوتا ہے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ "اس فن" کا فلاں شخص جینیس ہے اگر شاہ صاحب کے متعلق کوئی وثیقہ مجھے نہ ملا ہوتا تو شاید میں بھی کچھ اسی قسم کی بات کہہ کر یا سُن کر چپ ہو جاتا، لیکن الحمد للہ کہ سفر حجاز سے پہلے اور سفر حجاز کے بعد کی شاہ صاحب کی دونوں زندگیوں اور ان کے کارناموں میں جو نمایاں فرق پیدا ہو گیا ہے اس کے تہہ میں جو حقیقی سبب کار فرما ہے، وہ اس سے بہت زیادہ بلند ہے جو سمجھا جاتا ہے۔

جیسا کہ میں نے ابتدا مضمون میں عرض کیا تھا کہ حجاز پہنچکر شاہ صاحب نے ایک خواب دیکھا تھا اور ایسا خواب کہ اگر اسکی تعبیر پوری نہ ہوتی تو آج ہندوستان کی تاریخ وہ نہ ہوتی جو اس وقت ہے، تفصیل سے بتا چکا ہوں کہ اس خواب میں شاہ صاحب کو حضرت السلطان الغازی الابدالی اور ان کی فیصلہ کن جنگ جو مرہٹوں سے ہوئی اس کا نقشہ دکھایا گیا تھا۔

شاہ صاحب کی ان محیرالعقول علمی خدمات کا اصل راز

ساری دنیا جانتی ہے کہ "پانی پت" کے میدان میں اگر اس دن قدرت ابدالی کے حق میں فیصلہ نہ کرتی تو یقیناً ہندوستان میں مرہٹوں کی حکومت قائم ہو چکی ہوتی اور مرہٹوں کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد اس ملک میں مسلمانوں کا جو ہنجار ہوتا وہ یوں بھی ظاہر ہے پیشتر اس قوم کے جن نصب العینوں کا تذکرہ بہت ذکر آچکا ہے ان سے بھی اس کا اندازہ ہو سکتا ہے، لوگ کچھ ہی خیال کریں لیکن میں تو سمجھتا ہوں کہ ان ہی مرہٹوں کے مظالم سے تنگ آکر جو حجاز بھاگا تھا اس کو اس فتنہ کے قلع قمع کی بشارت اس خواب کے ذریعہ سے دی گئی تھی، اور جس طرح کفر کے اس استیصال کی خبر سے وہ مبشر ہوئے۔ ٹھیک اسی سفر میں ان کو ایک اور مژدہ اور کامیابی کی خوشخبری سے سرفراز فرمایا گیا تھا جس کا ذکر شاہ صاحب نے حالانکہ اپنا ایک نہیں بلکہ متعدد کتابوں میں کیا ہے لیکن لوگ اس کو پڑھتے ہیں اور گزر جاتے ہیں حالانکہ جہاں تک میں خیال کرتا ہوں شاہ صاحب کی ساری انقلابی زندگی اور حجاز سے واپسی کے بعد ان سے اسلام کی جو عظیم خدمتیں بن آئیں، ان سب کا قصہ اسی وقت ختم کر دیا گیا تھا۔ واقعہ اسی وقت ہو چکا تھا، صرف اس کا ظہور ہندوستان آکر ہوا۔ میرا اشارہ شاہ صاحب کے اس مشہور خواب کی طرف ہے جس کا ذکر حجۃ اللہ البالغہ کے دیباچہ میں بھی کیا گیا ہے اور فیوض الحرمین و درثمین دونوں کتابوں میں ہوا ہے، میں پہلے اس خواب کو درثمین سے بجنسہ ان ہی کے الفاظ میں نقل کرتا ہوں فرماتے ہیں:۔ ۔

حضرت حسینؓ نے شاہ صاحب کو اپنے جدِ امجد کا قلم عطا فرمایا اور معنوی کمالات سے سرفراز فرمایا۔ کان حسین والحسن علیهما السلام نزلا فی بیتی وبید الحسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ قلم قد انکسر لسانہ فبسط الی یدہ لیعطینی وقال ھذا	گویا حسین اور حسن علیہما السلام میرے گھر تشریف لائے ہیں اور حسن علیہ السلام کے دست مبارک میں ایک قلم ہے جس کی زبان (نوک) ٹوٹی ہوئی ہے ۔ حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا ہاتھ بڑھایا تاکہ وہ قلم مجھے عطا فرمائیں اور

قلم جدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم قال حتی یصلحہ الحسین فلیس ما اصلحہ الحسین کما لم یصلحہ فاخذہ الحسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ واصلحہ ثم ناولنیہ فسررت بہ ثم جیئ برداء مخطط فیہ خط اخضر وخط ابیض فوضع بین یدیہما فرفعہ حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ وقال ہذا رداء جدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم البسنی فوضعتہ علی راسی تعظیما وحمدت اللہ تعالیٰ۔

فرمایا کہ یہ قلم میرے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، مگر پھر آپ بولے کہ حسین اسے درست کریں (تب دوں گا) اور فرمایا کہ حسین جیسا درست کر سکتے ہیں، کوئی دوسرا اتنا درست نہیں کر سکتا۔ پھر حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس قلم کو لے لیا اور درست فرمایا اور اس کے بعد مجھے عطا فرمایا، میں اس (انعام) سے بہت مسرور ہوا۔ پھر ایک چادر لائی گئی جس پر دھاریاں بنی ہوئی تھیں ایک دھاری سبز ایک سفید، پہلے یہ چادر ان دونوں حضرات کے سامنے رکھی گئی پھر حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے اٹھایا اور فرمایا کہ یہ چادر میرے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے پھر وہ چادر مجھے اڑھا دی گئی، تب میں نے تعظیماً اس کو اپنے سر پر رکھ لیا اور حق تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

شاہ صاحب کے اس خواب کی تشریح اور تعبیر

شاہ صاحب نے یہ کیا خواب دیکھا؟ ظاہر ہے کہ اس خواب میں چند اجزاء ہیں (۱) حسنین علیہما السلام کا تشریف لانا (۲) حسن علیہ السلام کے ہاتھ میں ایک ایسے قلم کا ہونا جس کی نوک ٹوٹی ہوئی ہے (۳) شاہ صاحب کو دینے کا ارادہ فرمانا مگر پھر حضرت حسین علیہ السلام سے اس قلم کو بنوانا (۴) اور یہ فرمانا کہ "فلیس ما اصلحہ الحسین کما لم یصلحہ" یعنی جیسا قلم حسین علیہ السلام بنا سکتے ہیں وہ قلم اور دوسرا ان کا درست کیا ہوا ہرگز برابر نہیں ہو سکتے (۵) بن جانے کے بعد اس قلم کو شاہ صاحب کے سپرد فرمانا (۶) اس قلم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب فرمانا (۷) پھر شاہ صاحب کو ایک چادر جو "دو رنگی" کے صفات سے موصوف ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہے عطا فرمانا (۸) اس کا اڑھا دینا۔

حضرات حسنین رض کی زندگیوں کا انطباق شاہ صاحب کی زندگی پر

میں نے ہر جز کو الگ الگ کر کے اس لئے لکھ دیا ہے تاکہ غور کرنے میں آسانی ہو، میں نہیں کہہ سکتا کہ اس خواب سے میری سمجھ میں جو کچھ آیا ہے وہی اس کی واقعی تعبیر بھی ہے لیکن بہر حال میرا ذہن اس خواب سے جن امور کی طرف منتقل ہوا ہے اب اسے عرض کرتا ہوں۔

حضرات حسنین علیہما السلام کی اصل خصوصیت یہی ہے کہ ملت اسلامیہ جب شدید نرغہ میں آئی ہے تو ان میں بڑے صاحب نے اپنی صلح کی روش سے اور چھوٹے صاحب نے مقابلہ اور مقاتلہ کے طریقہ سے اس

فتنہ کا مقابلہ کیا، پھر یہ کیوں نہ سمجھا ئے کہ اس وقت ہندوستان میں اسلام جن زعوں میں گھر گیا تھا اسی کے مقابلہ کے لئے شاہ صاحب کا انتخاب کیا گیا، اشارہ ادہر تھا کہ شاہ صاحب سے جس مقابلہ کا کام لیا جائے گا اس میں صلح و جنگ دونوں طریقوں کو دخل ہوگا، شاہ ولی اللہ نے آنے والے خطرات کے مقابلہ میں مذکورہ بالا جن کششں جہتی کارناموں کو پیش کیا، بہ ظاہر تو اس کی صورت جنگ کی نہیں بلکہ ایک مصلحانہ مقابلہ کی تھی کیونکہ یہ تلوار سے نہیں بلکہ قلم کی جنگ تھی، لیکن اس جہاد میں شاہ صاحب اوران کے خاندان والوں کو دشمنوں کی جانب سے جو اذیتیں برداشت کرنی پڑیں، کون کہہ سکتا ہے کہ اس میں کربلائی قربانیوں کے نشانات نہ تھے ابھی گزر چکا کہ نجف خاں نے شاہ صاحب کے پہنچے اتروادئے تھے، صاحب الیانع علامہ محسن البہاری رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ جس وقت شاہ صاحب نے فقہ وحدیث کے صحیح تعلقات کی تنقیح فرماکر کتابیں شایع کیں، جن میں ظاہر ہے کہ "اس تقلید جامد" کی مخالفت کی گئی تھی جس میں عموماً سرحدی پٹھان اور روہیلے مبتلا تھے، تو قدرتاً ان پر شاہ صاحب کی باتیں سخت شاق گزرتی تھیں، دلی اس وقت ان ہی لوگوں سے بھری ہوئی تھی بقول مولنا محسن[1] کے کہ "غنم کسب" کے بالوں سے زیادہ ان کی تعداد تھی یہ لوگ ہر طرح سے شاہ صاحب کے درپے آزار ہوئے لیکن وہ لکھتے ہیں :-

لم یصدہ شی من ذلک مما کان علیہ من ترجیح ما وافق من اقوال الفقہاء ظواھر السنن والاثار، ومن بیان ماصفا مورده من ذلک عما ترنق وکان یصرح بما بین ظهرانیهم نصحًا للامة ووفاء بعهد الله الذی واثق بہ العلماء ۔ (الیانع)

ان لوگوں کی مخالفتیں شاہ صاحب کو اس طرز عمل سے نہ روک سکیں جو ظاہر سنن و آثار کے مطابق فقہا کے اقوال کو ترجیح دینے کا تھا اور اس سلسلہ میں جو مسلک صاف ستھرا تھا اس کو مکدر طریقہ سے وہ جدا کرتے تھے شاہ ولی اللہ ان متصلب سخت پٹھانوں کے درمیان علانیہ اپنے اس مسلک کا اظہار فرماتے تھے مقصد امت کی بھی خواہی تھی اور خدا کے اس عہد کو پورا کرنا تھا جس کا علماء سے وعدہ لیا گیا ہے۔

فتحپوری کی مسجد میں قتل کے ارادہ سے شاہ صاحب کا جو محاصرہ کیا گیا اس کا ذکر بھی گزر چکا پھر اس کے بعد آپ کے خاندان پر جو مظالم توڑے گئے اس کا اندازہ شاہ عبدالعزیز صاحب کی بعض روایتوں سے ہوتا ہے مثلاً ملفوظات میں ہے:-

[1] یہ مولنا محسن بہار کے شمالی حصہ ترہت کے رہنے والے تھے خفر چک ضلع مونگیر میں ان کا عجب کتب خانہ اب تک موجود ہے اگرچہ بڑا حصہ اس کا بقرعیہ کی قربانی کے جھگڑے میں ہندوؤں کے ہاتھ برباد ہوگیا مولنا محسن نے ہندوستان میں تحصیل علم کے بعد حجاز اور دوسرے اسلامی ممالک میں بھی کچھ دن تھا فاکسار کو آپ سے اور آپ کے خاندان سے قرابت قریبہ کے تعلقات ہیں ۔

چوں شہر کہنہ بودم بسیار از رفضا و فساق و برادران — جب ہم پرانی دلی میں تھے تو رافضیوں اور فاسقوں
حسود تکلیفہای کشیدم — اور حسد کرنے والے بھائیوں سے بہت تکلیفیں ہم نے
اٹھائیں۔

پھر ان "تکلیفہا" میں سے ایک تکلیف کا ذکر ان الفاظ میں فرماتے ہیں:-

بعضے قریب خانۂ ما تعزیہ بر سقف می کردند و تبرا — بعض لوگ میرے گھر کے پاس اپنے کوٹھے اور بالاخانوں
و سب ہم می نمودند — پر تعزیہ رکھتے اور تبرا کہتے (اور خلفاء ثلثہ کو گالیاں
دیتے اور اس طرح مجھے ایذا پہنچاتے۔

یہ تو خیر شیعوں کا سلوک تھا۔ فساق کا برتاؤ کیا تھا اس کی مثال یہ ہے کہ:

روزے فاجرہ شراب خوردہ در وقت تراویح در عین — ایک دن ایک فاحشہ عورت نے شراب پی کر تراویح کے
قرات قرآن شعر حافظ شیراز — وقت عین قرات قرآن کے درمیان حافظ شیراز
"در کوئے نیک نامی ما را گذر ندادند — کا یہ شعر گانا شروع کر دیا۔
گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را" — در کوئی نیک نامی مارا گذر ندادند۔ گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را
خواندو بعضے دہل و آواز ہا می زدند کہ قرات مشتبہ — اور بعض لوگ ڈھول تاشے بجاتے اور شور پکار بلند کرتے
شود (ملفوظات ص۵۵) — تاکہ میری قرات میں گڑبڑ پیدا ہو۔

شاہ صاحب کے خاندان پر کربلائی مصائب — اور یہ تو خیر معمولی باتیں ہیں حضرت قبلہ امیر شاہ خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے
تو جس واقعہ کا ذکر فرمایا ہے سن کر کلیجہ دہل جاتا ہے فرماتے ہیں کہ وہی نجف خاں[۱] جس نے شاہ ولی اللہ کے پہنچے اتروائے
تھے اسی نے

"شاہ عبدالعزیز و شاہ رفیع الدین کو اپنے قلمرو سے نکالدیا تھا اور یہ ہر دو صاحبان مع زنانوں کے
شاہدرہ تک پیدل آئے تھے"

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی مستورات کیساتھ میدان کربلا میں جو فاضحات ناگفتہ بہ پیش آئے تھے کیا اس کی جھلک اس واقعہ میں نہیں
پائی جا رہی ہے شاہ ولی اللہ کی بہوئیں اور پوتیاں اس بے سر و سامانی کیساتھ دلی سے پیادہ پا آئی ہیں آگے راوی کا بیان ہے کہ
شاہدرہ سے زنانوں کی سواری کا نظم تو حضرت مولانا فخر رحمۃ اللہ علیہ کی سفارش سے ہو گیا لیکن

"شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین کو سواری بھی نہ ملی تھی اور شاہ رفیع الدین صاحب تو
پیدل لکھنؤ چلے گئے تھے اور شاہ عبدالعزیز صاحب پیدل جونپور چلے گئے تھے"

[۱] مغل دربار کا آخری امیر تھا جس کے بعد ہی لال قلعہ پر غیروں کا قبضہ ہو گیا در اصل یہ شروع میں نواب وزیر اودھ کی وزارت کا دلی میں نائب تھا، لیکن بعد
خود مستقل بن بیٹھا اور آخری بانڈی حکومت کی اسی کے سر پھوٹی ۱۲

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے امام زین العابدین "بیمار" کے ساتھ جو برتاؤ کیا گیا تھا کیا اسی کا ظل ولی اللہ کے بیمار صاحبزادے شاہ عبدالعزیز صاحب میں نہیں ہے ملفوظات میں ہے کہ شاہ صاحب کو بائیس قسم کی بیماریاں تھیں لیکن ظالموں نے رحم نہیں کیا اور دلی سے پیدل جون پور دوڑا دیا۔ دونوں بھائی سفر میں ساتھ ہوتے تو شاید گونہ تسلی ہوتی لیکن امیر شاہ خاں صاحب کا بیان ہے کہ

"ان دونوں کو نہ سوار ہونے کا حکم تھا اور نہ ساتھ رہنے کا"۔

خاں صاحب نے اسی سلسلہ میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ

"دو دفعہ روافض نے شاہ عبدالعزیز صاحب کو زہر دیا تھا اور چھپکلی کا ابٹن ملوا دیا تھا۔ جس سے شاہ صاحب کو برص کا مرض ہو گیا تھا"

مجھے یاد آتا ہے کہ میر شاہ خاں صاحب ہی سے میں نے یہ بھی سنا تھا کہ جس وقت شاہ عبدالعزیز پیدل جون پور بھیجے گئے، یہ موسم ٹھیک جیٹھ کا تھا سخت لُو کے دن تھے، امیر الروایات میں بھی اتنا موجود ہے کہ

"جونپور کے سفر میں شاہ صاحب کو لو بھی لگی تھی جس سے مزاج میں سخت حدت پیدا ہو گئی تھی جس سے جوانی ہی میں بینائی جاتی رہی تھی اور ہمیشہ سخت بے چین رہتے تھے"[1]

اور آخر میں تو شاہ ولی اللہ کے پوتے مولانا اسماعیل صاحب اور اسی خاندان کے تربیت یافتہ بزرگ حضرت سید احمد بریلوی (رحمۃ اللہ علیہما) نے بالاکوٹ میں جس واقعہ کی تصویر پیش کی اس پر تو کربلا کی ظلیت کا خاتمہ ہی ہو جاتا ہے۔

بہرحال اس خواب میں حسنین علیہما السلام کے دیدار سے شاہ صاحب کا مشرف ہونا محض اتفاقی واقعہ تھا اس کے بعد حضرت حسن علیہ السلام کے دست مبارک میں ٹوٹے ہوئے قلم کا ہونا جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مدت سے ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ تمام دنیا اسلام کے اہل علم و فضل پر ایسا جمود طاری ہو گیا تھا کہ پچھلی چند صدیوں میں ایک بھی قابل ذکر مصنف نہیں پیدا ہوا تھا۔ تصنیف کا ذوق و شوق تو باقی تھا، لیکن کتابوں میں صرف لفظوں کی بھرمار ہوتی تھی، انتہا یہ تھی کہ تاریخ جس کا سرمایہ صرف واقعات ہیں۔ اس کی کتابوں میں بھی ادھر دو تین صدیوں سے یہ آفت آئی ہوئی تھی، کہ محض لفظوں کی دھڑا بندی کی جاتی تھی، علمائے اسلام کے جو تذکرے ادھر تیار ہوئے ان میں یہ لکھئے بقول نواب علامہ مولانا حبیب الرحمٰن شروانی سوائے "الحبر العلام والبحر القمقام" کے ہم قافیہ الفاظ کے

[1] دار العلوم دیوبند کے متوسلین میں شاید ہی کوئی ہوگا جو حضرت امیر شاہ خاں سے واقف نہ ہو، خاکسار پر بڑی نظر عنایت تھی بلکہ ولی اللّٰہی خاندان سے خاص نیاز خاں صاحب ہی کی بدولت ابتداء میں حاصل ہوا ایعنی حضرت شیخ الہند کی غلامی بیعت سے سرفرازی بھی انہی کی بدولت میسر ہوئی

سوانح وحالات کی ایک سطر نہیں ملتی، بے مائگی میں یہی حال دوسرے علوم وفنون کی کتابوں کا بھی تھا تو میرے خیال میں گویا اسی کی طرف ٹوٹے ہوئے قلم سے اشارہ کیا گیا تھا اور اب یہ "قلم" شاہ ولی اللہ کے سپرد ہو رہا تھا، لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا اصلاح کی راہ میں شاہ صاحب کو جو قلم دیا جا رہا تھا، اس میں اشارہ کر دیا گیا تھا کہ حسنی رنگ کے ساتھ ساتھ حسینی واقعات کے تجربے بھی پیش آئیں گے، رہی جو امام حسن علیہ السلام نے فرمایا کہ "حسین جیسا بناتے ہیں ویسا دوسرا بنا نہیں سکتا" تو اس میں گویا اشارہ تھا کہ ہر چیز سے بے پروا ہو کر صرف حق کی حمایت میں میدان میں کود جانا چاہیے، اور میں بیان کر چکا کہ شاہ صاحب نے اس راہ میں کیسی جرأت دکھائی، اپنی تصوف کی کتابوں میں جب مشائخ عصر پر وہ تنقید فرماتے ہیں، جانتے ہیں کہ ملک ان ہی لوگوں کے زیر اثر ہے، ان کا ایک اشارہ فتنہ کی آگ کو روشن کر دینے کے لئے کافی ہے۔ لیکن متعدد مقامات پر یہ ارقام فرماتے جاتے ہیں :-

هر چند ایں سخن بر بسیارے از صوفیہ زماں دشوار خواہد بود امّا مرا کارے فرمودہ اند بر حسب آں می گویم بازید وعمرو کارے نیست۔ (وصیت نامہ صفحہ)

ہر چند میری یہ بات اس زمانہ کے صوفیوں پر گراں گزرے گی لیکن مجھے ایک کام کا حکم دیا گیا ہے اس کے مطابق کہہ رہا ہوں مجھے زید وعمرو سے کوئی سروکار نہیں

آخر میں شاہ صاحب کو بُردِ یمانی کے نیچے دونوں حضرات بے آتے ہیں یعنی یہ فرماتے ہوئے کہ

هذا رداء جدی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم

یہ میرے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر ہے،

وہ چادر حضرت شاہ ولی اللہ کو اڑھا دیتے ہیں، غالباً یہ دوہرا اشارہ تھا کہ سب کچھ ہوگا، مخالفین بھی ہوں گے دشمن ستائیں گے بھی لیکن زیر سایہ عاطفت نبوت کبریٰ علی صاحبہا الف سلام وتحیۃ چونکہ شاہ صاحب کی زندگی گزرے گی، اس لئے ردائے محمدی کے سایہ میں پناہ لینے والوں پر انشاء اللہ مخالفین کی کچھ پیش نہ جائیگی اور ان کو خائب وخاسر ہو کر واپس ہونا پڑے گا۔ اور شاہ صاحب کے قلمی آثار کو دنیا میں فروغ ہوگا، بلکہ ٹوٹے ہوئے "قلم" کے بعد اسلامی دنیا میں ایک نیا دور تصنیف وتالیف کا شروع ہوگا، جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ یہی ہوا خود شاہ ولی اللہ صاحب نے درثمین میں جہاں اس خواب کو نقل فرمایا ہے اس کے بعد آخر میں فرماتے ہیں

فمن یومئذ انشرح صدری للتصنیف فی العلوم الشرعیۃ صفحہ ۳

اسی دن سے میرا سینہ شرعی علوم میں تصنیف کے لیے کھل گیا۔

جس کا صاف اور کھلا ہوا مطلب یہی ہے کہ شاہ صاحب کی آئندہ زندگی میں تصنیفی کوششوں کا جو سلسلہ شروع ہوا، اور وہ بڑھا اور اس حد تک بڑھا کہ اب نہ صرف ہندوستان بلکہ مصر، ترکی، حجاز اور کابل تک کے جامعات ومدارس میں آپ کی کتابیں داخل درس ہیں، اور ان ہی ممالک کے مطابع سے آپ کی کتابیں چھپ چھپ کر

ہندوستان آرہی ہیں، ان تمام کوششوں کی تہہ میں "حقیقی موثر" حنیب کی یہی قوت تھی۔

شاہ صاحب کے تجدیدی کارناموں میں فیض روح القدس کا دخل

بے شک شاہ صاحب بچپن ہی سے غیر معمولی طبیعت وفطرت کے بھی مالک تھے لیکن آپ کے ان حکیمانہ ومجددانہ کارناموں میں صرف آپ کی طبیعت ہی کو دخل نہیں ہے اور نہ آپ کے والد ماجد ودیگر اساتذہ کی تعلیم وتربیت ہی کا اس کو نتیجہ کہا جا سکتا ہے بلکہ کسی کی نگاہ انتخاب نے اب شاہ ولی اللہ کو وہ ولی اللہ باقی نہیں رکھا تھا اب شاہ صاحب کی زبان پر کوئی اور بول رہا تھا اور ان کی انگلیوں میں اب کسی اور کا قلم چل رہا تھا۔ ع سالے کہ نکوست از بہارش پیداست

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب ایک دن اپنے والد کے اس خواب کا تذکرہ فرما رہے تھے جامع ملفوظات نے لکھا ہے کہ آخر میں شاہ صاحب نے فرمایا کہ اس واقعہ کے بعد

حال نسبت وعلم وتقریر دگرگوں شد	والد کی نسبت باطنی اور علم وتقریر ساری باتوں کی حالت کچھ اور ہی ہو گئی۔

شاہ ولی اللہ کا رنگ اس کے بعد اتنا بدل گیا تھا کہ شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں کہ ان کے والد کے جو پرانے شاگرد تھے وہ سفر حجاز سے واپسی کے بعد آپ کی حالت کو دیکھ کر یہ محسوس کرتے تھے کہ پہلی بات ان کی باقی نہیں رہی ہے شاہ عبدالعزیز کے اپنے الفاظ یہ ہیں:-

چنانچہ مستفیضان سابق ہرگز احساس نسبت سابق نمی کردند۔	چنانچہ جن لوگوں نے شاہ صاحب سے پہلے فیض پایا تھا (یعنی شاگرد ومرید) وہ پہلی نسبت کا آپ میں بالکل احساس نہیں کرتے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان کا ایک مصیبت زدہ مسافر حجاز پہنچا تھا، اخلاص وصداقت کے ساتھ پہنچا تھا جو رنگ لاکر، یا خود شاہ ولی اللہ کا بیان ہے کہ جب مدینہ منورہ کی حاضری کی سعادت نصیب ہوئی تو

دراں میان بروضہ منورہ حضرت سید البشر علیہ افضل الصلوات واتم التحیات متوجہ شد وفیضہا یافت (انفاس)	اس عرصہ میں حضرت سید البشر (علیہ افضل الصلوات واتم التحیات) کے روضہ منورہ کی طرف متوجہ رہتا تھا اور اس سے بڑے بڑے فیض حاصل کئے۔

ان ہی "فیضہا" کی شرح وتفصیل میں شاہ صاحب نے ایک مستقل کتاب "فیوض الحرمین" ارقام فرمائی ہے، شاہ صاحب کے ساتھ کیا کیا نوازشیں ہوئی ہیں، ان کی تفصیل اسی کتاب میں پڑھنا چاہیئے، مجھے تو اس وقت صرف یہ کہنا ہے کہ مرہٹوں کے فتنہ کا ازالہ اور آئندہ ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق جو سوالات پیدا ہوئے تھے اور پیدا ہونے والے تھے ان کے جوابات اور ان مشکلات کا جو حل شاہ ولی اللہ کے قلم نے پیش کیا، یہ

درحقیقت انہی مدنی "فیضہا" کا کرشمہ تھا ــــ اور شاہ صاحب نے اس فیوض الحرمین ہی میں اپنے متعلق جو یہ دعویٰ کیا کہ

شاہ صاحب کی اویسیت اور سرکار نبوت سے بلا واسطہ استفادہ

سلکنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وربانی بیدہ فانا اویسیہ وتلمیذہ بلا واسطۃ بینی وبینہ (فیوض ص۶۴)

مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود سلوک کا راستہ طے کرایا اور اپنے دست مبارک سے میری تربیت فرمائی اس لئے میں آپ کا اویسی ہوں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بلا واسطہ شاگرد ہوں۔

تو اس کی حقیقت بھی ان فیوض پر غور کرنے سے کھل جاتی ہے۔

سفر حجاز کے بعد شاہ صاحب کی زندگی کا خاص دور

بہرحال شاہ صاحب میں جو نشہ حجاز میں بھر گیا تھا اس نے مست ہو کر جب وہ ہندوستان واپس ہونے لگے ہیں اس وقت ان کے دل میں کن کن ولولوں کا زور تھا اور کن حوصلوں کو لے کر چلے تھے۔ انفاس العارفین کے ایک واقعہ سے اس کا اندازہ ہوتا ہے، اپنے سب سے بڑے شیخ الحدیث علامہ ابو طاہر محمد بن ابراہیم الکردی المدنی سے جب آخری دفعہ رخصت ہونے کے لئے ملنے تشریف لے گئے، تو خود فرماتے ہیں:۔

ایں فقیر برائے وداع نزدیک شیخ ابو طاہر رفت ایں بیت برخواند

فقیر رخصت ہوتے وقت شیخ ابو طاہر کے پاس حاضر ہوا، اور یہ شعر میں نے پڑھا

نسیت کل طریق کنت اعرفہ ۔ الا طریقا یؤدینی الی ربعکم

ہر راہ میں بھول گیا بجز اس راہ کے جو تمہارے گھر تک مجھے پہنچائے۔

کسی ایسے حال سے معمور ہو کر شاہ صاحب نے یہ شعر پڑھا کہ

بہ مجرد شنیدن آں بکا بر شیخ غالب آمد و بغایت متاثر شد

کہ سننے کے ساتھ شیخ پر گریہ طاری ہوا اور بہت زیادہ متاثر ہوئے۔

الغرض ہر چیز سے دست بردار ہو کر صرف ایک "منصب العین" کو سامنے رکھ کر انھوں نے ہندوستان کی زمین پر قدم رکھا، وہ سالہا سال کا پرانا اور موروثی ذوق درس و تدریس قطعاً غائب ہو چکا تھا اور بسر چونکہ باقی تھا اور اس کو باقی رکھنا چاہتے تھے، آپ کے نام پر طلبہ آیا کرتے تھے، لیکن اب جو کام پیش نظر تھا اس کے ساتھ "معلم الصبیانی" کی زق زق بق بق کی گنجائش نہ تھی، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ بجائے خود پڑھانے کے

حضرت والد ماجد از ہر یک فن شخصے تیار کردہ بودند طالب ہر فن با وسے می سپردند۔

والد ماجد نے ہر فن کے لئے ایک شخص تیار کر لیا تھا جس فن کا جو طالب ہوتا اس کو اسی فن کے استاد کے سپرد فرما دیتے۔

غالباً دوازدہ سالہ تدریس" کے یہ تیار کئے ہوئے لوگ تھے اب مدرسہ ان ہی کے سپرد تھا اور خود اپنے لئے کیا شغلہ باقی رکھا تھا کل تین چیزیں جیساکہ شاہ عبدالعزیز کا بیان ہے۔

خود مشغول معارف گوئی و نویسی بودند و حدیث می خوانیدند۔ — خود معارف کے بیان کرنے اور لکھنے کا کام کرتے اور صرف حدیث پڑھاتے۔

کس شوق کس ذوق، کس اہتمام واستغراق کے ساتھ حجاز سے واپسی کے بعد ان تین شغلوں میں شاہ صاحب نے زندگی گذاری اس کے متعلق بھی حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی عجیب وغریب شہادت ہے فرماتے ہیں:۔

بعد اشراق کہ می نشست تا دوپہر زانو بدل نمی کرد وخارش نمی نمود وآب دہن نمی انداخت ص۳۷۔ — اشراق کے بعد جو بیٹھ جاتے تو دوپہر تک نہ زانو بدلتے نہ کھجلاتے، نہ دہن مبارک سے تھوک پھینکتے۔

ولی اللٰہی فیوض کی وسعت ونوعیت شاہ صاحب ۱۱۴۴ھ میں حجاز سے ہندوستان واپس ہوئے اور اپنے کام میں مشغول ہوئے، ٹھیک چار سال بعد دلی کی زمین پر نادرگردی کا وہ آسمان ٹوٹا، جس کے خونی انسانوں سے اب تک ملک کے کوچہ وبرزن معمور ہیں، لیکن شاہ صاحب پر جو دھن سوار تھی اس حادثہ کا بھی ان پر کوئی اثر نہیں پڑا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نادر ہی کے چلے جانے کے بعد محمد شاہ نے طلبہ کے ہجوم وکثرت یا کسی اور سبب کی بجائے پرانی دلی کے نئے شہر میں خود بلاکر مدرسہ کے لئے وہ حویلی عطا کی جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے اور اسی مدرسہ سے علم کا وہ سیل جرار جاری ہوا کہ آج عرب وعجم میں کم ازکم علم حدیث کا جو زور شور ہے، بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کی انتہا حضرت شاہ ولی اللہ ہی کے مخلصانہ مجاہدوں پر ختم ہوتی ہے۔ مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ سے امیر شاہ خاں نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ سفر حج میں حضرت کا جہاز یمن کے ساحل کے کسی بندرگاہ پر ٹھہر گیا، معلوم ہوا کہ چند دن ابھی رکا رہیگا حضرت نانوتوی کو کسی نے خبر دی کہ اس بندرگاہ کے شہر میں ایک کہنہ سال معمر بزرگ محدث رہتے ہیں ان کی ملاقات کو حضرت تشریف لے گئے، مل کر مولانا نانوتوی ان کے علم سے بہت متاثر ہوئے اور درخواست کی کہ حدیث کی سند اجازت عطا ہو، اس پر محدث صاحب نے پوچھا تم کس کے شاگرد ہو؟ انھوں نے اپنے استاد مولانا عبدالغنی مجددی کا نام لیا محدث صاحب ناواقف تھے، پوچھا مولانا عبدالغنی کس کے شاگرد ہیں؟ جواب ملا شاہ اسحاق کے، شاہ اسحاق سے بھی وہ ناواقف تھے، پوچھا کہ وہ کس کے شاگرد تھے؟ کہا شاہ عبدالعزیز صاحب کے، شاہ عبدالعزیز کا نام سن کر محدث صاحب رک کے بولے ان کو میں جانتا ہوں اور اس کے بعد فرمایا:۔

ایک یمنی محدث کی شہادت "شاہ ولی اللہ طوبیٰ کا درخت ہے جس طرح جہاں جہاں طوبیٰ کی شاخیں ہیں وہاں

جنت ہے اور جہاں اس کی شاخیں نہیں ہیں وہاں جنت نہیں ہے یونہی جہاں شاہ ولی اللہ کا سلسلہ ہے وہاں جنت ہے اور جہاں انکا سلسلہ نہیں ہے وہاں جنت نہیں ص۱۵!

اور یہ تو یمن کے ایک گم نام محدث کی شہادت ہے اس موقعہ پر جی چاہتا ہے کہ پھر ازہر کے ہم وطن علامہ رشید رضا مصری مرحوم کا قول ذرا زیادہ تفصیل سے نقل کر دوں اس سے اس کا بھی اندازہ ہوگا کہ حضرت حسن علیہ السلام کے دست مبارک میں جو ٹوٹا ہوا قلم تھا اس کا کیا مطلب تھا۔ علم خصوصاً علم نبوت کی حالت اسلامی ممالک میں کیا ہو رہی تھی؛

علامہ رشید رضا مصری کا بیان کہ اس زمانہ میں علم حدیث صرف ہندستانی علماء کی توجہ سے زندہ ہے

ولولا عنائة اخواننا علماء الهند نعلوم الحديث في هذا العصر لقضي عليها بالزوال من امصار الشرق فقد ضعفت في مصر والشام والعراق والحجاز منذ القرن العاشر للهجرة حتى بلغت منتهى الضعف في أوائل هذا القرن الرابع عشر وانني لما هاجرت الى مصر سنة ۱۳۱۵ه رائيت خطباء مساجد الازهر وغيره يذكرون الاحاديث في خطبهم غير مخرجة ومنها الضعيف والمنكر والموضوع ومثلهم في هذا الوعاظ والمدرسون ومصنفو الكتب فكنت انكر ذلك عليهم كما يداعت بانكار مثله على اهل بلدي طرابلس قبلهم (مقدمہ مفتاح كنوز السنة)

ہمارے ہندستانی بھائیوں میں جو علماء ہیں اگر حدیث کے علوم کے ساتھ اس زمانہ میں ان کی توجہ نہ ہوتی تو مشرقی ممالک سے یہ علم ختم ہو چکا ہوتا کیونکہ مصر شام عراق حجاز میں دسویں صدی ہجری سے یہ علم ضعف کا شکار ہو چکا تھا، اور چودھویں صدی کی اوائل تک ضعف کی آخری منزل پر پہنچ گیا تھا میں نے جب ۱۳۱۵ھ میں مصر ہجرت کی تو ازہر کی مسجدوں کے خطیبوں کو اور دوسری مسجدوں کے خطیبوں کو دیکھا کہ اپنے خطبوں میں ایسی حدیثیں پڑھتے ہیں جن کا پتہ نہیں ان میں ضعیف منکر اور موضوع وجعلی روایتیں بھی ہوتی تھیں اور یہی حال واعظوں مصنفوں مدرسوں سب کا تھا میں ان کو ٹوکتا تھا جیسا کہ اپنے وطن طرابلس میں بھی یہی کرتا تھا۔

یہ مصر کے ایک فاضل جلیل اور چودھویں صدی کے ایک ناقد بصیر کی گواہی ہے جس سے ثابت ہو رہا ہے کہ کسی ایک ملک ہی میں نہیں بلکہ مصر شام عراق حجاز جو اسلام کے گہوارے ہیں ان سب میں دسویں صدی کے مسلمانوں کا یہ حال ہو گیا تھا اور صرف کسی ایک طبقہ ہی میں جہل کی حکومت قائم نہیں تھی بلکہ دین وعلم کے جو جو گروہ خادم تھے یعنی واعظ، خطیب، مدرسین ومعلمین حتیٰ کہ مصنفین ومولفین سب ہی کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ نبوت کے علم سے بے پروا ہو چکے تھے غلط سلط غیر معتبر اور گڑھی ہوئی حدیثوں پر لوگوں کا دارومدار رہ گیا تھا شاہ ولی اللہ صاحب کو علم نبوت (حدیث)

کے اسی حال کا تمثل اگر ایسے قلم کی شکل میں ہوا جس کی نوک ٹوٹی ہوئی تھی تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی تھی اور جب مصر و حجاز عراق و شام جیسے ممالک علم حدیث سے دسویں صدی ہجری تک بے تعلق سے ہو گئے تھے تو پھر خراسان ترکستان ایران وغیرہ جہاں ایک مدت سے اس "علم" کا چرچا ہٹ چکا تھا ان کی جو حالت ہو گی وہ ظاہر ہے؛

۔ علامہ رشید رضا کا یہ اقرار کہ "اگر علماء ہند کی توجہ اس علم کی طرف نہ ہوتی تو اس علم کا مشرقی ممالک میں خاتمہ ہو جاتا" سب جانتے ہیں کہ یہ علماء ہند کی نہیں بلکہ براہ راست حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت کا اعتراف ہے، اس لئے کہ ہندوستان میں حدیث کا جو کچھ بھی چرچا پچھلے دنوں ہوا، سب کی انتہا بالآخر حضرت شاہ صاحب ہی کے وجود باجود پر ہوتی ہے گویا شاہ صاحب کو حسنین علیہما السلام نے جو قلم عطا فرمایا تھا یہ دراصل اسی قلم کے کارناموں کا اقرار ہے، کیونکہ شاہ صاحب کے وہ سارے علمی مجاہدات جن کے اثر سے بالآخر اس ملک میں حدیث کے فن کو اتنی اہمیت حاصل ہو گئی ان کا تعلق اسی قلم سے ہے، انھوں نے اس سلسلہ میں جو کچھ کیا اسی قلم کے ملنے کے بعد کیا، بلکہ عوام تو شاید خواب کے اس قلم کو خواب و خیال والا قلم خیال کر سکتے ہوں گے، لیکن جس شخص کا خود ذاتی مشاہدہ تھا کہ ان کے والد حضرت شاہ عبدالرحیم کو خواب ہی میں دربار رسالت پناہی سے محاسن ڈاڑھی مبارک کے دو بال عطا ہوئے تھے، شاہ ولی اللہ کا بیان ہے، کہ حالت بیداری میں یہ دونوں موئے مبارک ان کے والد کو ملے جو ایک مدت تک خود ان ہی کے پاس رہے اور جب تبرکات تقسیم ہونے لگے، تو

یکے ازاں دو موی بکاتب حروف عنایت فرمودند (انفاس ص۔۔)	تو ان دو موئے مبارک میں سے ایک موئے مبارک کاتب حروف کو عنایت فرمایا۔

حضرت شاہ ولی اللہ کی تصنیف کی ایک خاص خصوصیت ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز نے یہ بیان فرمائی ہے کہ

بعد مراقبہ ہرچہ بکشف می رسید می نگاشتند۔ (ملفوظات ۔۴۰)	کہ مراقبہ کے بعد جو چیز کشفی طور پر آپ کو معلوم ہوتی تھی اسے ارقام فرماتے تھے۔

کون کہہ سکتا ہے کہ "اس مراقبہ" میں شاہ صاحب کا رخ کس طرف ہوتا تھا اور اس سے کیا مقصود تھا ان تصانیف کے لئے آپ کو جس مقام سے قلم ملا تھا؟ کیا اسی طرف توجہ کر کے بیٹھ جاتے یا خواب والے قلم کو پھر اپنے اندر بیدار کرتے تھے، یا اس کے سوا کوئی اور چیز آپ کے پیش نظر تھی، بہرحال اس سے اتنا تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کی کتابوں کا ڈھنگ جو نرالا معلوم ہوتا ہے اس میں ان کی تصنیف و تالیف کی ان خاص خصوصیتوں کو بھی ضرور دخل ہے، بلکہ شاہ صاحب کی عبارت میں جیسا کہ عرض کر چکا ہوں "جوامع الکلم" کی جھلک جو

نظر آتی ہے۔ اس میں بھی قصد سے زیادہ ان کے اسی طریقہ عمل کو شاید دخل ہو۔

الغرض سفر حجاز سے واپس ہونے کے بعد جیسا کہ اپنے استاد سے رخصت ہوتے وقت فرمایا تھا اور غالباً اسی کا ترجمہ شاہ عبدالعزیزؒ نے یہ فرمایا ہے جو ان کے ملفوظات میں منقول ہے کہ

پدر من وقت رخصت از مدینہ از استاد خود عرض کرد و او خوش می شد کہ ہرچہ خواندہ بودم فراموش کردم الا علم دین یعنی حدیث ص ۹۳ — کہ میرے والد نے مدینہ منورہ سے رخصت ہوتے ہوئے اپنے استاد سے عرض کیا اور استاد اس سے بہت خوش ہوئے کہ میں نے جو کچھ پڑھا تھا بجز علم دین یعنی حدیث کے بھلا دیا ۵ (من آنچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم — الاحدیث یار کہ تکرار می کنیم)

گویا "جو لکھا پڑھا تھا نیاز نے سو وہ ایک دم میں بھلا دیا"۔ اب ان کا مشغلہ صرف یہی رہ گیا تھا کہ متوسلین و تلامذہ کے سامنے اسرار و حقائق پر تقریر فرماتے رہتے تھے، یا حدیث کا درس دیا کرتے تھے یا لکھتے رہتے تھے اور اس شان کے ساتھ لکھتے رہتے تھے کہ ہر مسئلہ "مراقبہ" کے بعد درج کتاب ہوتا تھا، حدیث کے ساتھ ساتھ شاہ صاحب کے درس کا ایک جزء اور بھی تھا جس کا ذکر شاہ عبدالعزیزؒ ہی نے دوسرے مقام پر فرمایا ہے، فرماتے ہیں کہ

شاہ صاحب کے یہاں دورہ حدیث سے پہلے دورہ قرآن

معمول والد ماجد آں بود کہ بعد ختم قرآن حدیث می شد ص — والد ماجد کا معمول یہ تھا کہ ختم قرآن کے بعد حدیث کا دورہ شروع کراتے۔

جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحاح کا درس جس کا نام اس زمانہ میں "دورہ حدیث" پڑ گیا ہے، اس سے پہلے شاہ صاحب قرآن کا دورہ بھی کرایا کرتے تھے اور بغیر تفسیر کے مجرد متن قرآن پڑھانے کی ترویج کم از کم ہندوستان میں شاہ ولی اللہ ہی کی ایجاد ہے، اگرچہ افسوس ہے کہ اب مدارس خصوصاً ولی اللہی مدارس میں بھی یہ طریقہ ترک کر دیا گیا، اور محض ان حلقوں تک جن میں محض عامی شریک ہوتے ہیں، بعض شہروں کی مساجد میں حضرت کی یہ "سنت" باقی رہ گئی ہے آپ نے وصیت نامہ میں طریقہ تعلیم کے متعلق جو ایک "نظام نامہ" مرتب فرمایا ہے اس میں فرماتے ہیں کہ

متن قرآن کے درس کے متعلق شاہ صاحب کی ہدایت

قرآن عظیم درس گویند بایں صفت کہ صرف قرآن بخوانند بغیر تفسیر و ترجمہ گویند و در آنچہ مشکل باشد در نحو یا در شان نزول متوقف شوند و بحث نمائند، بعد فراغ از درس تفسیر جلالین را بقدر — قرآن عظیم کا درس دینا چاہیے اس طریقہ سے کہ صرف قرآن پڑھا جائے یعنی تفسیر کے بغیر صرف متن قرآن اور ترجمہ پڑھایا جائے، پھر قرآن کے متن کے متعلق جو دشواری پیش آئے مثلاً نحو کے متعلق یا شان نزول کے متعلق تو

۵ "جزء اللطیف" میں شاہ صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بنیاد آپ کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم ڈال چکے تھے واللہ اعلم (نعمانی)

درس بخوانند دریں طریق فیضہاست — رک جانا چاہیئے کہ اس کی تحقیق کی جائے پھر جب قرآن ختم ہو جائے تب نصاب تک جلالین پڑھائی جائے اس طریقہ میں بڑے بڑے فیض ہیں۔

واقعہ ہے کہ آج جتنا زور عربی مدارس کے قدیم سلسلوں میں حمد اللہ اور میر زاہد کی عبارتوں کے حل پر دیا جاتا ہے یا نئے مدرسوں میں ادب و انشاء وغیرہ میں سر مارا جاتا ہے اگر اسی وقت کو قرآنی آیات کے حل ہی میں صرف کیا جائے تو جو کتاب صرف مغز ہی مغز ہے اس سے علماء اور طلبا کو کیسے کچھ فیوض پہنچ سکتے ہیں، تفسیروں کے درس میں عموماً آدمی حق تعالیٰ کے کلام سے ہٹ کر پھر اپنے ہی جیسے انسانوں کی تعبیروں میں الجھ جاتا ہے اور اسی کے مشکلات میں اتنا وقت صرف ہو جاتا ہے کہ قرآنی آیات کی طرف توجہ کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا صرف قرآن کے پڑھانے سے آدمی پر جن عجیب و غریب حقائق کا انکشاف ہوتا ہے شاہ عبد العزیز صاحب نے اس کے متعلق بڑے تجربہ کی بات فرمائی ہے کہ

مرداں چنانچہ در قرآن متلذذ می شوند در حدیث نہ، و ما را ہم چنانچہ در قرآن معنے ہائے عجیب و غریب دست می دہد و آمد می باشد در حدیث نہ، در حدیث موافق کتب بیان می کنم۔ (منہ)

لوگ جتنا قرآن سے لذت گیر ہوتے ہیں اتنی لذت ان کو حدیث میں نہیں ملتی اور خود ہمارا حال بھی یہی ہے کہ جتنے عجیب و غریب مطالب قرآن میں ہاتھ آتے ہیں اور اسمیں آمد معلوم ہوتی ہے، حدیث میں یہ بات حاصل نہیں ہوتی حدیث کے درس میں تو وہی بیان کرتا ہوں جو کتابوں میں ہے،

جس کا مطلب یہی ہوا کہ قرآن میں جب تدبر کیا جاتا ہے تو بغیر کتابی امداد کے خود بخود مطالب کے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں، بخلاف حدیث یا کسی دوسرے فن کے کہ اس کے درس میں عموماً شروح و حواشی کی ہی ریزہ چینی ہوتی ہے۔

شاہ صاحب کے باقیات صالحات

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق جو کچھ میں لکھنا چاہتا تھا خدا کا شکر ہے کہ وہ لکھا جا چکا اب آپ کے "باقیات صالحات" اولاد و امجاد کے مختصر تذکرہ پر اس سلسلہ کو ختم کرنا چاہتا ہوں سب ہی کو معلوم ہوگا کہ شاہ صاحب قدس سرہٗ کو حق تعالیٰ نے علاوہ اس اولاد کے جو صغر سنی ہی میں وفات پا کر آپ کے لئے "اجر و ذخر" بن چکی تھی چار فرزند عطا فرمائے تھے جو فرزندی کے علاوہ آپ کے صحیح جانشین بھی تھے۔ یعنی شاہ عبد العزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبد القادر، شاہ عبد الغنی۔

وفات سے پہلے چاروں صاحبزادوں کی خلافت

شاہ صاحب نے اس دنیا سے جاتے وقت باضابطہ طور پر بھی ان چاروں حضرات کو اپنا جانشین (خلیفہ) بنایا تھا۔ شاہ عبد العزیزؒ کے ملفوظات ہی میں ہے کہ وفات سے تھوڑی دیر پہلے

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی دستار بر سر ہر چہار فرزندان نہادہ بودند — آپ نے چاروں فرزندوں کے سروں پر دستار مبارک رکھدی تھی یا باندھ دی تھی

جس کا مطلب یہ ہی ہوا کہ حضرت نے اپنے چاروں صاحبزادوں کو اپنا خلیفہ و جانشین قرار دیا۔ سوچنے بلکہ عبرت کی ایک چیز یہ ہے کہ اسی دلی میں ایک زمین دار بادشاہ نے اپنے چند بیٹوں کو اسی طرح دنیا میں اپنا جانشین قرار دیا تھا جیسا کہ مورخ فرید آبادی رقم طراز ہیں کہ

اورنگ زیب نے اپنی زندگی میں بڑے بیٹے محمد معظم کو شمالی ہند اور کابل کی حکومت سونپ دی تھی، وسط ہند، گجرات باپ کے چاہیتے بیٹے محمد اعظم کے زیر انتظام تھے اور جنوبی ہندوستان شہزادہ کام بخش کے حوالہ کردیا گیا تھا۔

فرید آبادی اس کے بعد اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ

"اسی انتظام کے مطابق وہ سلطنت کو اپنے بیٹوں میں تقسیم کرنا چاہتا تھا"

لیکن دنیا کے ان تین بادشاہوں نے ہندوستان اور کابل جیسے وسیع و عریض علاقوں میں اپنے لئے گنجائش نہ پائی اور ہوا اس کے بعد جو کچھ ہوا۔

شاہ صاحب کے چاروں صاحبزادوں کے باہمی تعلقات

لیکن اسی دلی میں دین کا ایک سردار اپنے تین نہیں بلکہ چار بیٹوں کے سر پر خلافت کی دستار باندھتا ہے۔ پھر دین کے ان چار شہزادوں نے زندگی کس طرح گزاری اسکا اندازہ ان تعلقات سے ہو سکتا ہے جو ان چاروں بھائیوں میں آخر عمر تک باقی رہے، میر شاہ خاں کا بیان ہے کہ

"شاہ عبدالقادر کا کھانا اکبری مسجد روزانہ شاہ عبدالعزیز ہی کے گھر سے جاتا تھا وہی اپنے اس متوکل بھائی کے کپڑے بنا دیا کرتے تھے، شاہ عبدالعزیز باوجود بڑے ہونے کے شاہ عبدالقادر کی ولایت کے کس حد تک قائل تھے۔ اس کے متعلق وہی مشہور بات کہ عید کا چاند تیس کا ہوگا یا انتیس کا، اس کا پتہ چلانے کے لئے ہمیشہ حضرت شاہ عبدالعزیز رمضان کی پہلی تاریخ کو آدمی صبح کر دریافت کراتے کہ

"میاں عبدالقادر نے آج کے سپارے پڑھے ہیں؟ اگر آدمی یہ آکر کہتا کہ آج دو پڑھے ہیں تو شاہ صاحب فرماتے کہ عید کا چاند تو انتیس ہی کا ہوگا یہ بات دوسری ہے کہ ابر وغیرہ کی وجہ سے دکھائی نہ دے اور حجت شرعی نہ ہونے کی وجہ سے ہم رویت کا حکم نہ لگا سکیں

(امیر الروایات ص۱۰۵)

علیٰ ہٰذا شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ سے شاہ عبدالعزیز کو جو دلی تعلق تھا اس کا اندازہ بھی اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جب شاہ رفیع الدین کو لوگ دفن کر کے فارغ ہو نے اس وقت حضرت شاہ عبدالعزیز نے ایک

خاص کیفیت کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ رفیع الدین سے

مرا چار رشتہ بود یکے برادر حقیقی، دوم قبلہ گاہی (حضرت شاہ ولی اللہ) مرا بہ تقریبے داد کہ فرزند تست سیوم شیر دایہ من نوشیدہ چہارم شاگرد

رفیع الدین سے میرا چار طرح رشتہ تھا ایک توحقیقی بھائی تھے، دوسرے یہ کہ قبلہ گاہی (والد ماجد) نے ایک تقریب سے انھیں میرے سپرد کرکے کہا کہ یہ تمہارا لڑکا ہے تیسرے ہم نے اور انھوں نے ایک ہی دائی کا دودھ پیا تھا چوتھے وہ میرے شاگرد تھے۔

کسی نے اسی سلسلہ میں عرض کیا کہ "شاہ رفیع الدین سے اس خاندان کی بڑی علمی عزت تھی" شاہ عبدالعزیز نے اس وقت جو جملہ فرمایا وہ سچی اور خاص محبت کی کتنی اچھی تعبیر ہے فرمایا۔

اگر جاہل ہم می بودند مرا ہمچناں درد بودے

اگر وہ جاہل بھی ہوتے تو مجھے ان کا اسی قدر درد ہوتا

جامع ملفوظات نے مولانا رفیع الدین کے جنازے کی کیفیت، اور شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا باوجود نابینا ہونے کے ان کی چار پائی اٹھانے کی کوشش اور انتہائی ضبط کی کوشش کے باوجود بار بار بلبلا اٹھنا اور فرمانا کہ "چہ گویم من طاقتے ندارم" ایک ایسے دردناک پیرایہ میں ان حالات کو بیان کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں بھائیوں میں مودت و اخلاص کے کیسے گہرے مراسم تھے، یہ عجیب بات ہے کہ ان چاروں بھائیوں کی وفات عجیب ترتیب سے ہوئی شاہ عبدالعزیز ہی کا قول جامع ملفوظات نے یہ نقل کیا ہے کہ

چاروں صاحبزادوں کی وفات میں عکسی ترتیب

ترتیب منعکس در رحلت برادران واقع شد یعنی اول مولوی عبدالغنی کہ خورد ترین ہمہ ہا بودند بعد ازاں مولوی عبدالقادر از وشاں بعد مولوی رفیع الدین کلاں سال از وشاں ہم باری ماست

الٹی ترتیب بھائیوں کی وفات میں واقع ہوئی اول مولوی عبدالغنی کہ سب سے چھوٹے تھے ان کے بعد مولوی عبدالقادر ان کے بعد مولوی رفیع الدین، سب سے بڑا میں ہوں اب میری باری ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اپنے اپنے دائرہ عمل میں حضرت شاہ ولی اللہ کے ان چاروں صاحبزادوں نے بڑے باپ کے بیٹے ہونے کی شان کو بوجہ کمال آخر عمر تک باقی رکھا، شاہ عبدالغنی چھوٹے صاحب نے تو کم عمر پائی لیکن انکی تلافی قدرت نے ان کے نجل رشید حضرت شہید رحمۃ اللہ علیہ کی ذات سے کی، ناظرین الفرقان جن کے حالات سے شہید نمبر کے ذریعہ سے واقف ہو چکے ہیں اور دین بھی علم دین کے دائرہ کا ایسا کون ہے جو ان سے اور ان کے محیر العقول درخشاں کارناموں سے تھوڑا بہت واقف نہیں ہے شاہ عبدالقادرؒ نے اپنی زندگی کا اکثر حصہ اگرچہ عزلت میں گزار دیا، لیکن مرزا امیر شاہ صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی ایک صاحبزادی تھیں کہ جائداد زندگی ہی میں ان ہی صاحبزادی اور دوسرے بھائیوں پر تقسیم فرما کر اکبر آبادی مسجد کی ایک سہ دری میں اپنی زندگی بسر کردی، شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ عبدالعزیز دونوں متاہل ہوئے جن میں شاہ عبدالعزیز کی کوئی نرینہ اولاد نہ ہوئی صرف تین صاحبزادیاں تھیں اور شاہ رفیع الدین کے چار لڑکے مولوی موسیٰ مولوی عیسیٰ مولوی مخصوص اللہ مولوی حسن جان ہوئے ان میں سے مولوی عیسیٰ صاحب کی شادی شاہ عبدالعزیز کی ایک صاحبزادی سے ہوئی اور بقیہ دو صاحبزادیوں میں سے ایک مولوی افضل صاحب ہیں دوسری مشہور رفیق شہید مولانا عبدالحی الخطیب لمبا ہے سے ہوئی تھی مولوی فضل ہی کے دو صاحبزادے یعنی شاہ محمد اسحاق و شاہ محمد یعقوب ہیں،

دلی الٰہی خاندان کے آخری یادگار دلی میں رہ گئے تھے لیکن مسلمانوں کی دلی جب مسلمانوں کی دلی ہونے کی خصوصیت کو قطعی طور پر کھو چکی تو دونوں بھائی ۱۲۵۸ھ میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ حجاز ہجرت کر گئے اور اسی سرزمین پاک میں ہندستان کے یہ علمی خزانے مدفون ہیں۔

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسہ کا کچھ حال پہلے گزر چکا ہے آخر میں چاہتا ہوں کہ دلی ہی کے ایک چشم دید گواہ کے ایک بیان کو جو اس خاندان اور اس مدرسہ کے متعلق ہے درج کر کے اس مقالہ کو ختم کردوں اِنَّ فِی ذَالِکَ لَعِبْرَۃ

قفا نبک من ذکری حبیب و منزل

شاہ ولی اللہ کے مدرسہ کا حال اور غدر میں اس کی بربادی

دلی کے اس عجیب و غریب علمی و دینی خاندان اور اس خاندان کے دار العلوم کا آخری انجام کیا ہوا جو ہر اس چیز کا انجام ہے جس کا تعلق اس عبوری دور کی ابتدائی زندگی سے ہے دہلی کے آثار اور مقامات کے ذاتی تجربہ کار مولوی بشیر احمد مرحوم اپنی کتاب واقعات دار الحکومت دہلی میں لکھتے ہیں

جب شاہ صاحب (شاہ ولی اللہؒ کے صاحبزادوں میں کوئی نہ رہا تو مولانا محمد اسحاق صاحب نے مدرسہ کی خدمت اپنے ذمہ لی ۱۲۵۶ھ میں آپ نے ہجرت کی تو مولانا مخصوص اللہ صاحب اور مولانا موسیٰ صاحب خلف حضرت مولانا رفیع الدین صاحب اسکی نگرانی فرمانے لگے ان حضرات نے بھی ۱۲۷۳ھ میں انتقال فرمایا تو صرف مولوی محمد موسیٰ صاحب کے ایک صاحبزادے میاں عبدالسلام صاحب بہت صغر سن رہے اور ایک صاحبزادی رہ گئیں خاندان بھر میں کوئی ایسا نہ تھا جو عبدالسلام صاحب کو پڑھاتا لکھاتا غرض یہ سلسلہ جو کئی پشت سے اس خاندان میں جاری تھا بند ہو گیا غدر میں مکانات لوٹے گئے گرائے گئے کڑی تختے تک لوگ اٹھا لے گئے خانہ خالی را دیو می گیرد ایک شریف گردی تھی کہ الٰہی توبہ! جسکی لاٹھی اسکی بھینس جسکا جس پر قابو چلا قابض ہو گیا اب متفرق لوگوں کے مکان اسجگہ بن گئے ہیں مگر محلہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے مدرسہ کے نام سے آجتک پکارا جاتا ہے اس خاندان میں سوائے ایک آدھ خاتون عصمت کے اور کوئی نام لیوا اور پانی کا دیوا نہ رہا۔

مولوی بشیر مرحوم نے اس سے بھی زیادہ دردناک واقعہ ایک دوسری جگہ یہ درج کیا ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب نے اپنی زندگی میں اپنے نواسوں مولنا محمد اسحق اور مولنا یعقوب کو جو مکانات بنوا کر دیدیے تھے اور شاہ اسحق صاحب نے اس میں کچھ دن درس دیا تھا اب اس مدرسہ میں چھوٹے چھوٹے مکانات بنگئے ہیں جو بان کسان وغیرہ غریب لوگ رہتے ہیں بیچ میں ایک چھوٹی سی مسجد بھی ہے جو انہی کے نام سے مشہور ہے جسمیں آپ نماز پڑھتے تھے اب چونکہ یہ کل جائداد رائے بہادر لالہ شیو پرشاد صاحب کی ہے اس لئے

مولوی بشیر مرحوم نے اس کے بعد جو فقرہ لکھا ہے قلم اس کے لکھنے سے کانپتا ہے، لکھتے ہیں کہ اس لئے

دلی الٰہی دار العلوم پر مدرسہ رائے بہادر لالہ رام کشن داس کا تختہ

اس گلی پر مدرسہ رائے بہادر لالہ رام کشن داس کا تختہ لگا دیا گیا ہے۔" ۲۷ ص ۱

مسلمانان ہند کے لئے عموماً اور مسلمانان دہلی کے لئے خصوصاً اگرچہ یہ ایک شرمناک حادثہ ہے کہ "مدرسہ مولنا محمد اسحاق" پر "مدرسہ رائے بہادر لالہ رام کشن داس کا تختہ لگا دیا گیا ہے"۔

لیکن خدا کی وہ بات کہ اللہ کی راہ میں مرنے والے مرتے نہیں (بل احیاء ولکن لا تشعرون) اب بھی پوری ہو رہی ہے شمال سے جنوب تک آج ہندوستان میں حدیث اور دار الحدیث کا جو چرچا پھیلا ہوا ہے کوئی شبہ نہیں کہ ان ہی چند عشقبازوں کی عشق بازی کا نتیجہ ہے ولنعم ماقیل ؎

از صدائے سخن عشق ندیدم خوشتر　　یادگارے کہ دریں گنبد دوّار بماند

شاہ عبد القادر کی سکونت گاہ اکبر آبادی مسجد حضرت شاہ مولانا عبد القادر کی سکونت گاہ کے سلسلہ میں اکبر آبادی مسجد کا بھی ذکر آیا تھا، جی چاہتا ہے کہ اس کا حال بھی کچھ اسی کتاب سے اخذ کر کے آخر میں درج کر دوں اپنی مولوی بشیر مرحوم کا بیان ہے کہ یہ مسجد فیض بنیاد اعزاز النساء بیگم محل شاہجہاں بادشاہ نے ۱۰۶۰ھ مطابق ۲۳ جلوس بنائی ہے ان بیگم کا خطاب اکبر آبادی محل تھا اسی سبب سے یہ مسجد بھی اکبر آبادی مشہور ہو گئی اس مسجد کے تین گنبد اور سات در ہیں مسجد کی عمارت ۴۳ گز طول میں اور سترہ گز عرض میں نری سنگ سرخ کی اور اس کا پیش طاق سنگ مرمر کا پر چین کار ہے اور اس کے آگے ایک چبوترہ ۴۳ گز طول شمالاً جنوباً گز عرض اور تین گز اونچا اس پر سنگ سرخ کا کٹھرا لگا ہوا ہے اور اس کے آگے ایک حوض ۱۲×۱۲ گز کا چشمہ آفتاب و ماہتاب پر شرف لیجاتا ہے اور نہر کا پانی آتیں آتا ہے...... اس کے گرد حجرے بنے ہوئے ہیں لمبے ۱۵×۴ گز، اور ہر حجرے کے آگے ایک ایوان ہے اور اسکے سامنے سرتاسر چار گز عرض کا چبوترہ اس مسجد کے دو مینار بلند میں جملہ ان کے شمالی مینار برجی کے صدمے سے ٹوٹ گئی ہے"

معلوم نہیں مولوی بشیر مرحوم نے یہ عبارت کس کتاب سے نقل کی ہے غالباً "آثار الصنادید" سید احمد خاں سے ماخوذ ہے، اس لئے کہ خود مولوی بشیر مرحوم کے زمانہ میں اس مسجد کا جو حال ہے اس کے متعلق وہی رقم طراز ہیں،

"فیض بازار ہی میں یہ مسجد تھی جو غدر کے بعد ڈھایا ڈھوئی کی نذر ہوئی"

اور اب اس جلے ہوئے "دل" کو کس خاک میں ڈھونڈھنا چاہیئے؟ فرماتے ہیں:-

محل وموقع اس کا موجودہ ایڈورڈ پارک ہے"

آگے لکھتے ہیں "جس وقت اس کے لئے زمین ہموار کی جانے لگی تو مسجد کا چبوترہ اور بنیادیں جوں کی توں مثل گنج نہاں کے زمین میں مدفون تھیں ویسے ہی ڈھک دی گئی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خانہ خدا اور یہ بے نظیر عمارت نظروں سے پوشیدہ ہوگئی؟ فانا للہ وانا الیہ راجعون ؀

شاید کہنے والے نے اسی کے متعلق کہا تھا

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا　　کریدتے ہو جو اب خاک جستجو کیا ہے
(سکونت ؎ دین)

العبد الکئیب الاھمن الفانی السید مناظر احسن گیلانی
غفر اللہ لہ ولمن رباہ

رمضان المبارک ۱۳۵۹ھ ہجری

باسمہٖ سبحانہٗ

مزار شاہ ولی اللہ محدث دہلوی پر پہنچکر

(از جناب مولٰنا نسیم احمد صاحب فریدی فاروقی امروہوی)

مزار حضرتِ شاہ ولی اللہؒ پر ہمدم!
دل پر یاس و حسرت چشم گریاں لیکے آیا ہوں

نہیں آیا میں خالی ہاتھ اس درگاہ عالی میں
عقیدت کیشیاں نقد دل و جاں لیکے آیا ہوں

جو کمہلا جائیں دو اک روز میں وہ پھول کیا لاتا
میں اپنے باغِ دل کی چند کلیاں لیکے آیا ہوں

چڑھانے کو تری تربت پہ چادر ساتھ کیوں لاتا
میں اپنے سر پہ تیرا بار احساں لیکے آیا ہوں

مرے پیش نظر تصویر ہے "بزم محدث" کی
تصور میں گلستاں در گلستاں لیکے آیا ہوں

وہ دہلی اور اس کی شوکتیں پھر یاد آئی ہیں
خزاں کے دور میں یاد گلستاں لیکے آیا ہوں

بچایا راہزن سے رہنمائی نے تری اسکو
بحمد اللہ متاع دین و ایماں لیکے آیا ہوں

تری تعلیم کے صدقے سی ہے جسمیں تڑپ باقی
اسی حسّاس دل کو زیر داماں لیکے آیا ہوں

سنادے پھر وہی نغمے مجھے توحید و سنت کے
میں ان نغمات کے سننے کا ارماں لیکے آیا ہوں

فلک سے کہد اب شبنم کے قطروں کو نہ برسائے
میں قبر شیخ پہ اشکوں کی لڑیاں لیکے آیا ہوں

عقیدت، نقد الفت، یاد ماضی، سوز پنہانی
مزار شیخ پر کیا کیا میں ساماں لیکے آیا ہوں

سنائی ہے مجھے اک داستاں بزم تصور میں
میں اک دنیائے جذبات پریشاں لیکے آیا ہوں

فریدیؔ میں نہیں آیا ہوں تنہا مرقد شہ پر،
دعا ہائے فراواں، ذوق پنہاں لیکے آیا ہوں

حضرت شاہ عبدالرحیم، حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت شاہ عبدالعزیز رح کے مزارات۔
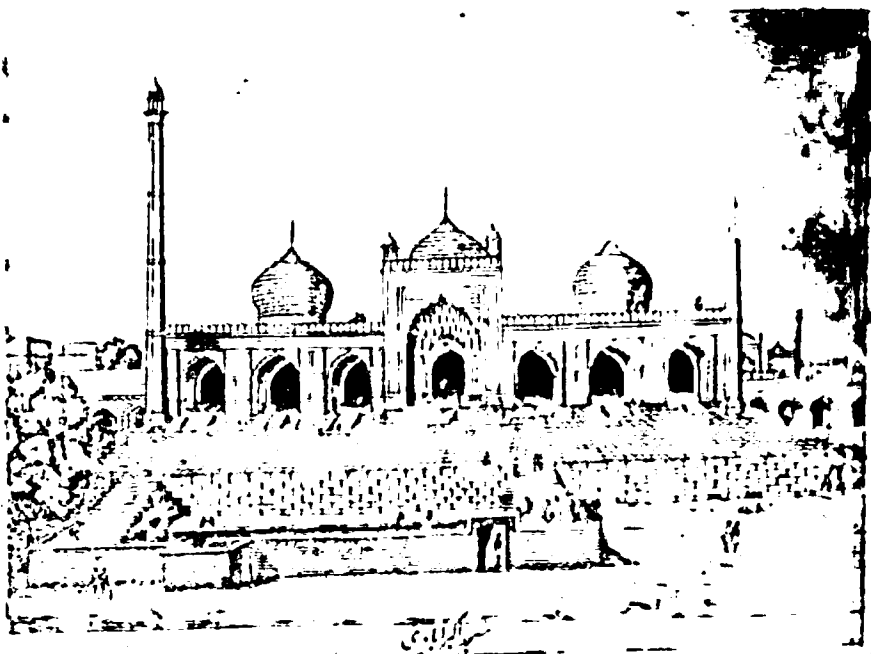
مولانا گیلانی کے مضمون کے آخر میں جس "اکبر آبادی مسجد" کا ذکر آیا ھے
یہ اسی کا عکس ھے جو سر سید احمد خاں کی "آثارالصنادید" سے لیا گیا ھے

الحمد لله قد قرأ علي هذه الرسالة كلها صاحب النسخة اخونا الصالح الشيخ محمد احسن الله
اليه واصلح حاله فاجزت له روايتها عني على ان فيها بعض شيء من الخلل في ضبط
الاسماء لاسيما اسماء المغاربة لم نتفرغ لتصحيحها من نسختنا هذه وعسى ان ييسر الله
لنا ذلك في الزمان المستقبل كتبه [illegible] الفقير ولي الله عفي عنه
اوائل محرم سنة ۱۱۶۰ [illegible] والحمد لله [illegible]

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کے دست مبارک کا لکھا ہوا اجازت نامہ جو کتاب خانہ خدابخش (پٹنہ) کے صحیح بخاوی کے ایک نسخہ سے حاصل کیا گیا ہے مفصل تعارف آئندہ صفحہ پر ملاحظہ ہو

این کتاب در مکه
به قیمت سه صد روپیه
از عبدالله دمشقی خریده شد
محمد ولی الله [illegible]
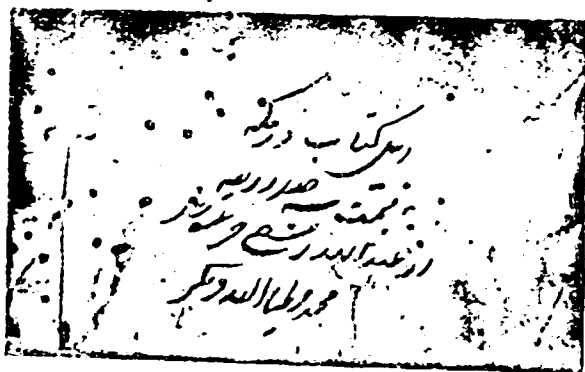
کتاب ''النہایہ فی غریب الحدیث والاثر'' علامہ ابن اثیر کی مشہور کتاب ہے جو مصر میں اب چھپ بھی چکی ہے اسکا ایک قلمی نسخہ دارالعلوم دیوبند کے کتبخانہ میں موجود ہے یہ نسخہ حضرت شاہ ولی اللہ کی ملکیت میں بھی رہ چکا ہے - اسکے آخری صفحہ پر حضرت شاہ صاحب کے دست مبارک سے یہ مختصر سی عبارت لکھی ہوئی ہے جسکا عکس آپ کے سامنے ہے ''نہایہ'' کا یہ نسخہ دارالعلوم کو ریاست رامپور کے مشہور عالم و مصنف مفتی سعد اللہ صاحب مرحوم کے ہاں سے حاصل ہوا تھا -

---

عکس کے پڑھنے میں شاید دقت ہو اسلئے وہ عبارت یہاں بھی لکھی جاتی ہے ملاحظہ ہو
'' این کتاب در مکہ بہ قیمت سہ صد روپیہ از عبداللہ دمشقی خریدہ شد
محمد ولی اللہ دہلوی -

عکس تحریر حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ

تعارف

(از جناب مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کتلاگر خدابخش لائبریری پٹنہ)

مقابل کے صفحہ پر حضرت شاہ صاحب کی جس تحریر کا عکس ہے اس کے متعلق چند سطریں پیش خدمت ہیں:۔

ہمارے یہاں مشرقی کتاب خانہ پٹنہ (خدابخش لائبریری) میں صحیح بخاری کا ایک مکمل نسخہ شیخ محمد بن شیخ پیر محمد بن شیخ ابوالفتح بلگرامی الہ آبادی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، یہ نسخہ اس لحاظ سے بہت قیمتی ہے کہ یہ شاہ صاحب کے حلقہ درس میں استعمال ہوا ہے اور اس پر ان کے دست خاص کا لکھا ہوا اجازت نامہ ثبت ہے، نیز شاگرد (محمد بن پیر محمد یہ پورا نسخہ جن کا لکھا ہوا ہے) کے آخری نوٹ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ استاذ کی نگرانی میں شاگرد نے اس کی تصحیح کی تھی، مزید برآں شاہ عالم بادشاہ (۱۲۲۱-۱۱۷۳ھ) کے حکم سے ۱۲۰۴ھ میں کسی محمد ناصح صاحب نے نسخہ کی مزید تصحیح کی اور اعراب لگایا، یہ اجمالی خاکہ تھا نسخہ کی اہمیت کے پیش نظر تھوڑی تفصیل اور دستخطی تحریر درج کے کچھ نمونے دیے جاتے ہیں:۔

صحیح بخاری کا یہ نسخہ دو جلدوں میں ہے پہلی جلد میں ۷۰۰ ورق ہیں دوسری جلد میں ۴۰۴ ورق (۸۰۰ صفحے) میں کتاب ص۸۰۴ پر ختم ہو جاتی ہے، اسی صفحہ کے آخر میں شیخ محمد بن پیر محمد کی مندرجہ ذیل دستخطی تحریر ہے:۔

"تم الکتاب الجامع الصحیح للامام ...... محمد بن اسمٰعیل ... الجعفی البخاری
فی المسجد الجامع الفیروزی علی ساحل نہر الجون فی محروسۃ الدہلی (کذا)
یوم الاربعاء سادس شعبان المعظم فی سنۃ ۱۱۵۹ ...... بید احقر العباد شیخ محمد بن
شیخ پیر محمد .... مع قراءتہ من الاول الی الآخر وتصحیحہ مرۃ بعد
اخری فی خدمۃ قدوۃ علماء الزمان ...... الشیخ ولی اللہ العمری" الخ

اسی صفحہ کے حاشیہ پر محمد ناصح کی یہ تحریر ہے:۔

"بحمد اللہ ...... تصحیح و اعراب صحیح بخاری بحکم اقدس حضرت شاہ عالم بادشاہ .... در سنہ یکہزار و
یک صد ہشتاد و چہار ہجری نفر محمد ناصح .... باتمام رسانید"

یہاں تک خط صاف نستعلیق ہے۔

اس کے بعد ص۵۵ سے ص۶۶ تک حضرت شاہ صاحب کے دستخطی اجازت نامے ہیں۔ ہر ہر کتاب کی الگ الگ اجازت ہے پوری سند کے ساتھ خط نہایت پاکیزہ، کشادہ صاف اور نسخ و نستعلیق کے درمیان ہے، روشنائی اب تک روشن ہے اول و آخر کا کچھ نمونہ دیا جاتا ہے :۔

"الحمد للہ الذی بنعمتہ تتم الصالحات .... اما بعد فان اخانا فی اللہ عزوجل الفاضل الصالح الشیخ محمد بن شیخ پیر بن الشیخ ابی الفتح ..... قرأ علی الجامع الصحیح ...... وقرأ علی ایضا اطرافا من سائر الکتب الستة ومن مؤطا الامام مالک بن انس ومن .... ومن .... فاجزت لہ ان یروی عنی کل ما صح عندہ انہ من مرویاتی .... کتبہ بیدہ الفقیر الی رحمۃ اللہ الکریم الودود ولی اللہ احمد بن عبد الرحیم بن وجیہ الدین بن معظم ...... العمری نسبا الدھلوی وطنا الاشعری عقیدۃ الصوفی طریقۃ الحنفی عملا و الحنفی الشافعی تدریسا خادما للتفسیر والحدیث والفقہ والعربیۃ والکلام ولہ فی کل ذلک تصانیف والحمد للہ اولا و آخرا ......

کان ذلک یوم الثلثاء الثالث والعشرین من الشوال (کذا) سنۃ ۱۱۵۹

ان اجازت ناموں کے بعد کتب خمسہ کی کچھ حدیثیں (اطراف) درج ہیں اور ص۷۷ سے ص۸۰ تک شاہ صاحب کی تالیف (الفضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الامین) ہے، جو شیخ پیر محمد کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے،

آخر میں پھر ایک مختصر اجازت نامہ ہے، جو شاہ صاحب کے دست خاص کا لکھا ہوا ہے، مختصر ہونے کے باعث اسی کا عکس لینا مناسب معلوم ہوا، خط کی شان اور زبان کی حلاوت یکساں ہے، صرف اس کے حروف کچھ اڑے ہوئے ہیں گیا ہی اپنی رونق کھو رہی ہے، ممکن ہے عکس کے پڑھنے میں کچھ دشواری ہو، اس لئے یہ مختصر اجازت نامہ یہاں بھی درج کر دیا جاتا ہے ـــ اس تعارف کا اس سے بہتر خاتمہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ ـــ:

الحمد للہ قد قرأ علی ھذہ الرسالۃ کلہا صاحب النسخۃ اخونا الصالح الشیخ محمد احسن اللہ تعالی الیہ واصلح حالہ فاجزت لہ روایتہا عنی علی ان فیہا بعض شیئ من الخلل فی ضبط الاسماء ولاسیما اسماء المغاربۃ لم نتفرغ لتصحیحہا ساعتنا ھذہ وعسی ان ییسر اللہ تعالی لنا ذلک فی الزمان المستقبل

کتب ھذہ السطور مؤلفہا الفقیر ولی اللہ عفی عنہ اوائل محرم سنۃ ۱۱۶۰ آخر ساعۃ من یوم الجمعۃ والحمد للہ تعالی اولا و آخرا وظاھرا و باطنا۔

امام ولی اللہ دہلوی

کی

حکمت کا اجمالی تعارف

از حضرت مولانا عبید اللہ سندھی مدظلہ

"خاص الفرقان کے ولی اللہ نمبر ہی کیلئے لکھا گیا"

باسمہ سبحانہ

تقریب

حضرت مولانا سندھی کا جو مقالہ آپ کے پیش نظر ہے اس کے متعلق چند باتیں عرض کرنی ضروری ہیں۔

(۱) یہ ایک عمیق علمی مقالہ ہے اور صرف اہل علم ہی اسکے مخاطب ہیں اسلئے عربی اور فارسی عبارات کے ترجمہ کی ضرورت نہیں سمجھی گئی

(۲) مولانا ممدوح نے یہ مقالہ املا فرمایا ہے اور ہمارے محترم مولانا نور الحق صاحب علوی نے اسکو قلمبند کیا ہے اور صرف چھ متفرق مجلسوں میں پورا مقالہ اس طرح تیار ہوا ہے اس لئے املا اور تحریر میں جو فرق ہو سکتا ہے وہ اس میں کہیں کہیں بہت نمایاں ہے

(۳) حواشی کا اضافہ بھی مولانا نور الحق صاحب ہی نے فرمایا ہے اور اسمیں کوئی شبہ نہیں کہ ان حواشی نے مقالہ کی علمی اور افادی حیثیت میں کافی اضافہ کر دیا ہے، اصل مضمون میں وفیات کی تعیین بھی آپ ہی کی محنت کا نتیجہ ہے۔

مولانا ممدوح نے اپنے ایک گرامی نامہ میں لکھا تھا کہ

"حوالہ جات اور وفیات کی تفتیش و تحقیق میں بہت وقت لگا، ایک ایک حوالہ کے لئے بسا اوقات پوری کتاب پڑھنی پڑی۔ وفیات کی تلاش میں بھی کافی محنت صرف ہوئی، لیکن یہ ضروری تھا، کیونکہ وفیات کی تعیین سے ہر تحریک کا دور معین ہو جاتا ہے"

بہر حال اب یہ مقالہ بحالت موجودہ حضرت مولانا سندھی اور محترم مولانا علوی کی گویا مشترک محنت کا نتیجہ ہے اور اسکے لئے میں ہر دو بزرگوں کا شکر گزار ہوں۔

(۴) جس جگہ ناچیز کو بھی اختلافی یا توضیحی نوٹ لکھنا پڑا ہے وہاں شروع میں "الفرقان" یا آخر میں لفظ "نعمانی" لکھ دیا گیا ہے تاکہ مولانا علوی کے حواشی کے ساتھ اشتباہ نہ ہو ——— فصلوں اور ابواب کے شروع میں جدولوں میں گھرے ہوئے جو عنوانات ہیں وہ قارئین کرام کی سہولت استفادہ کے لئے ناچیز کا اضافہ ہے، جو اس دوسرے ایڈیشن ہی میں کیا گیا ہے اس لئے انکی صحت و غلطی کی تمامتر ذمہ داری مجھ پر ہی ہے۔

(۵) مولانا علوی کے حواشی میں بکثرت اور کہیں کہیں اصل مضمون میں بھی کتاب التمہید فی ائمۃ التجدید کے حوالے دیئے گئے ہیں یہ حضرت مولانا سندھی مدظلہ کی ہی ایک غیر مطبوع تصنیف ہے اور متعدد جلدوں میں ہے۔

(۶) حضرات اہل علم خصوصاً اصحاب درس سے گزارش ہے کہ وہ اس مقالہ کو سرسری نظر سے نہیں بلکہ غور و تعمق کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں، نیز ہر بحث کو شروع سے آخر تک بالاستیعاب و تحقیق اور جہاں جہاں ضرورت سمجھیں ایکدفعہ سے زیادہ غور فرمائیں۔ میں نے خود بھی بعض مقامات کا چند چند بار اور بہت غور سے مطالعہ کیا تو صحیح مراد کو سمجھ سکا۔

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ مدیر "الفرقان بریلی"

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

باب اوّل (تحصیلی ملکات)

شاہ ولی اللہ دہلوی (متوفی ۱۱۷۶ھ) کے تحصیلی ملکات کی تشریح سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ایسے مشائخ کا اجمالی تذکرہ کر دیا جائے جنکی صحبت نے ان کی ذہنیت کو صاف کیا ہے۔

تحصیلی ملکات کی تشریح تحصیلی ملکات سے ہماری مراد ہے عربی زبان کا سیکھنا، منطقی اصطلاحات کا استعمال کرنا، سوسائٹی کے رائج الوقت قانون یعنی فقہ حنفی کے متون و شروح کا پڑھنا، اس قانون کے عقلی نظام یعنی اصول فقہ کا سمجھنا، متکلمین کے مختلف اسکول اور انکی باہمی سابقت سے شناسا ہونا، اس کے بعد حقائق کائنات پر اپنی صاف ذہنیت سے غور کرنا، اور اپنے کسبی اطمینان پر بھروسہ کرنا، یہ سب علوم و فنون تحصیلی ملکات کا ذریعہ ہیں اس وقت ہم آخری حصے پر سب سے پہلے بحث کرتے ہیں۔

آزاد ذہنیت سے حقائق کائنات کو سوچنے کا فلسفہ حقیقۃ الوجود اور اس کے تنزلات کو سمجھنے کا نام ہے، اس فن کے امام متاخرین صوفیہ میں حضرت شیخ اکبر (محمد بن علی محی الدین ابن عربی متوفی ۶۳۸ھ) ہیں، شاہ صاحبؒ کے مربی اصل میں سب سے پہلے ان کے والد شاہ عبدالرحیم (متوفی ۱۱۳۱ھ) ہیں وہ ابن عربی کے فلسفہ کے پورے ماہر استاذ تھے۔

شاہ عبدالرحیمؒ کا علمی سلسلہ شاہ عبدالرحیم[1] اپنے بھائی شیخ ابو الرضا محمد (متوفی ۱۱۰۱ھ) کے شاگرد ہیں، شیخ ابو الرضا مذکورہ بالا فلسفہ میں ایک مستقل امام کا درجہ رکھتے ہیں، شاہ صاحب کی یہ ذہنیت اپنے والد اور چچا سے خاندانی خصوصیات کے ضمن میں بلاقصد تکمیل پاتی ہے شاہ صاحب کے والد اور چچا[2] خواجہ عبید اللہ المعروف بہ خواجہ خورد (متوفی ۱۰۷۴ھ) کے خاص صحبتی ہیں۔ خواجہ خورد اپنے والد خواجہ رضی الدین محمد باقی عرف باقی باللہ

[1] قال الامام ولی اللہ فی القول الجمیل صفحہ ۱۳۰ قرء سیدی الوالد صفحا مما کتب علی اخیہ ابی الرضا محمد واکثرہا منہا علی میرزا محمد زاہد عن مرزا فاضل عن ملا یوسف الکوسج عن میرزا جان وغیرہ عن محمود الشیرازی عن المحقق جلال الدین الدوانی ۔ محمد نور الحق العلوی غفرلہٗ

[2] فی القول الجمیل صفحہ ۱۳۰ صحب سیدی الوالد شیوخا کثیرۃ اجلہم ثلثۃ اولہم خواجہ خورد و صحب الشیخ احمد سرہندی والشیخ اللہ داد والخواجہ تمام الذین صحبوا خواجہ محمد باقی الخ۔

دہلوی (متوفی ۔۔۔ھ) کے پانچ شاگردوں کے ہم صحبت ہیں (۱) حضرت امام ربانی شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی (متوفی ۱۰۳۴ھ) (۲) شیخ اللہ داد دہلوی (متوفی ۔۔۔) (۳) خواجہ حسام الدین دہلوی (متوفی ۱۰۴۳ھ) (۴) شیخ رفیع الدین متوفی ۱۰۵۲ھ (۵) شیخ تاج الدین سنبھلی مکی (متوفی ۱۰۵۰ھ) خواجہ باقی باللہ نظریہ وحدۃ الوجود کے بہت بڑے امام تھے، انکی امامت اشراقی طرز کی ہے، وحدت الشہود کا اسکول امام ربانی نے مرتب کیا ہے۔ خواجہ خورد[1]، اور شاہ صاحب کے والد اور چچا اگرچہ امام ربانی سے پورے مستفید ہوئے مگر انکا فکر وحدت الوجود کی طرف مائل ہے، امام ولی اللہؒ نے

---

[1] خواجہ خورد اور ان کے بھائی خواجہ کلاں ہر دو خواجہ باقی باللہ کی آخری عمر میں پیدا ہوئے تھے خواجہ محمد باقی باللہ بہ حضرت مجدد الف ثانی فرمودند امید از حیات کم ماندہ۔ از احوال اطفال خبردار باید بود (خواجہ خورد بعد از چہار ماہ از ولادت خواجہ عبید اللہ مشہور بخواجہ کلاں در ۱۰۱۲ھ از بطن مادر دیگر متولد گردید) ہر دو طفل را کہ در ایام رضاعت بودند در حضور مبارک طلبیدہ بحضرت مجدد سپردند۔ خواجہ خورد در بہر دو سایہ تربیت حضرت مجدد جاگرفت۔ و از معارف ایشان فراواں بہرہ بر داشت، و بہ تفویض خلافت و ارشاد ممتاز گردید، و در سال ۔۔۔ برحمت الٰہی پیوست۔ ماثر الکرام از آزاد بلگرامی ص ۔۔۔

فی انفاس العارفین خواجہ خورد و خواجہ کلاں ہر دو صغیر بودند کہ خواجہ باقی باللہ وفات یافتند بعد ازاں چوں بسن بلوغ رسیدند بخدمت شیخ احمد سرہندی رفتند و مدتے در آنجا باشیدند۔ حقیقت خواجہ کلاں معلوم نیست، اما خواجہ خورد از ایشان اخذ طریقہ کردند و اجازت یافتند، بعد ازاں بازگشتند۔ و از خواجہ حسام الدین و شیخ اللہ داد کہ ہر دو خلیفہ خواجہ بودند۔ استفادہ و استرشاد نمودند۔

خواجہ حسام الدینؒ در بادائل حال در سلک امرائے وقت انتظام داشتند، والد ایشان از اعاظم امرائے زمان بود۔ چوں بصحبت خواجہ رسیدند و جذب طریقت در ایشان اثر کرد ہمہ را ترک کردند۔ طوعاً و رغبۃً از ہمہ برآمدند۔ آنقدر مراعات خواجہ، در بارۂ اولاد ایشان و اتباع ایشان، و طریقہ ایشان و اشغال ایشان کہ ازیں دو عزیز (حسام الدین و اللہ داد) بظہور پیوست از دیگراں بوقوع نیامد۔

شیخ اللہ داد نخست از طریقہائے دیگر بہرہ یافتہ بودند۔ و بصحبت بزرگاں عصر رسیدہ چوں بخدمت خواجہ باقی باللہ رسیدند آں ہمہ دفتر را طے نمودہ بالکلیہ متوجہ ایشان گشتند و خدمات خانقاہ خواجہ برخود گرفتند چہ خدمت ظاہری از تعہد آب و نان و چہ باطنی از تفقد حال طالبان و توجہ بر ایشان و کیفیت بیخودی و استغراق کہ حاصل نسبت نقشبندیہ ہماں است۔ با وجود اشتغال بآں خدمات آں قدر تشکیف بودند کہ از دیگرے بظہور نہ پیوست۔

شیخ تاج الدین سنبھلی اول خلفا حضرت خواجہ بودند۔ و در آخر بمکہ معظمہ اقامت اختیار کردہ ہماں جا مدفون شدند۔ و ایں فقیر از متاخران اہل ہند ہیچ کس را ندید کہ اہل مکہ زیادہ از شیخ معتقد او باشند و کرامات وے روایت کنند در بیان اشغال شعبہ باقویہ کہ ہماں طریقہ نقشبندیہ است بے افراط و تفریط رسالہ دارند در عربیہ۔ و حضرت ایشان (یعنی شاہ عبد الرحیم) در ترجمہ آں رسالہ فارسیہ نوشتند ملتقط از عبارات سلف، ایں فقیر (ولی اللہ) ہر دو را بخدمت حضرت ایشان گزرانیدہ ھ۔ انفاس ص ۱۸-۱۹

(نور الحق غفرلہ)

"انفاس العارفین" میں اپنے والد اور چچا کے مقالات اور مقامات اسطرح ذکر کئے جس سے مذکورہ مقالات اور مقالات کی شرائع الٰہیہ سے تطبیق ہوجائے ہر دو بھائیوں کے خاص نظریات کا ماحصل ایک ایسی شاہراہ بنانے کی سعی ہے جس پر مسلمان فلاسفر (صوفیہ و متکلمین) اور فقہاء ساتھ ساتھ چل سکیں، کشف، عقل، نقل میں خصوصی مہارت پیدا کرکے جس طرح اہل علم فرقوں میں منقسم ہوگئے اسی طرح یہ افتراق فنا ہوجائے تاکہ اسلامی ذہنیت جو زنگ آلود ہو رہی ہے اپنے جوہر دکھا سکے، یہ شاہ صاحبؒ کی ذہنیت کا ایک اچھا مظاہرہ ہے، کہ وہ وحدۃ الوجود کے فلسفہ کو شرائع الٰہیہ کی تشریح و تفصیل میں استعمال کرسکتے ہیں۔

فصل (۲) شاہ ولی اللہؒ کی ذہنیت کا بنیادی مسئلہ

امام ولی اللہ حدیث شریف کی تکمیل کیلئے ۱۱۴۳ھ میں حرمین شریفین گئے[۱] پورے دو سال وہاں رہے سب سے بڑا استاد جس سے ان کو معنوی مناسبت پیدا ہوئی وہ شیخ ابوطاہر[۲] مدنی متوفی ۱۱۴۵ھ ہیں۔ شیخ مذکور زیادہ تر اپنے والد الشیخ ابراہیم[۳]

---

[۱] قال الامیر القنوجی فی ابجد العلوم ۹۱۲ "واقام ہناک عامین کاملین ثم عاد الی الہند ۱۱۴۵ھ" واضح رہے کہ شاہ عبدالرحیم (متوفی ۱۱۳۱ھ) کی وفات کے بعد کم و بیش بارہ سال امام ولی اللہ ہند میں رہے اور علوم دینیہ اور عقلیہ کی تدریس کرتے رہے خود فرماتے ہیں "بعد وفات حضرت ایشاں (والد الامام عبدالرحیم) دوازدہ سال کم و بیش بدرس کتب دینیہ و عقلیہ مواظبت نمود۔ و در ہر علم خوض واقع شد و توجہ بحضرت ایشاں پیش گرفت (یعنی بالطریقۃ المعہودۃ عندہم فی السلوک) و دراں ایام فتح توحید و کشادِ راہ جذب و جانبے عظیم از سلوک میسر آمد و علوم وجدانیہ فوج فوج نازل شد انتہیٰ (جزء اللطیف) زیادہ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو ابجد العلوم صفحہ ۹۱۲ و ما بعد۔

[۲] الشیخ ابوالطاہر محمد بن ابراہیم الکردی المدنی۔ لبس الخرقۃ من ابیہ واستجازلہ ابوہ من مشائخ کثیرین منہم الشیخ محمد بن سلیمان المغربی، اخذ النحو عن السید احمد ادریس المغربی واکتسب فقہ الشافعی عن الشیخ علی الطولونی المصری والمعقول من الملا محمد الباشی المرادمی والحدیث عن الحسن العجیمی الحنفی واحمد النخلی والشیخ عبداللہ البصری والشیخ عبداللہ اللاہوری وکان مجتہداً فی الطاعۃ مشتغلاً بالعلم والمذاکرۃ رقیق القلب کثیر البکاء توفی ۱۱۴۵ھ ابجد العلوم ۹۱۲ فی العجالۃ النافعہ ص۲۳ "و از حسن اتفاقات اینکہ شیخ ابوطاہر سند سلسل دارند بصوفیہ و عرفا تا شیخ زین الدین زکریا انصاری و ہوانہ اخذ من ابیہ الشیخ ابراہیم الکردی وہو عن الشیخ احمد القشاشی وہو عن الشیخ احمد الشناوی الخ"

[۳] الشیخ ابراہیم الکردی عارف بفنون العلم من الفقہ والحدیث والعربیۃ والاصلین۔ قال الشیخ عبداللہ العیاشی کان مجلسہ روضۃ من ریاض الجنۃ وکان یرجع کلام الصوفیۃ علی الحقائق الحکمیۃ ویقول ہولاء الفلاسفۃ فیما لو اعتنوا الی الحق ولم یہتدوا الیہ ایکۃ وفاتہ انا علی فراقک یا ابراہیم لمحزونون" ۔ ابجد العلوم ص۹۱۲

محمد نورالحق العلوی غفرلہ

کردی (متوفی ۱۱۰۱ھ) سے مستفید ہوئے۔

حسن اتفاق سے شیخ ابراہیم کردی اور شاہ عبدالرحیم کی ذہنیت متقارب تھی، کیونکہ ہر دو کا سلسلۂ تلمذ جلال الدین دوانی تک پہنچتا ہے بنابریں شیخ ابوالطاہر مدنی کی صحبت شاہ ولی اللہ کو بہت موافق آئی۔

ہم نے شیخ ابراہیم کردی کے بہت سے رسالے مطالعہ کئے، وہ شریعت اسلامیہ کو ابن عربی کے فلسفہ سے حل کرتے ہیں اور اس باب میں وہ ایک مستقل مفکر امام کا درجہ رکھتے ہیں، شیخ ابراہیم کی تاثیر شیخ ابوالطاہر کے ہر قول و فعل میں نمایاں نظر آتی ہے، ہماری سمجھ میں ان دو مختلف طریقوں کا (شاہ صاحب کے والد اور چچا کا طریق، اور دوسرا شیخ ابوالطاہر مدنی اور شیخ ابراہیم کے دوسرے شاگردوں کا طریق جو حرمین میں تھے) ایک فکر پر متحد ہونا شاہ صاحب کی ذہنیت کا بنیادی مسئلہ ہے، کوئی عالم خواہ کسی زمانے کا کسی مذہب و ملت کا ہو مگر اس کی تعلیمات شاہ صاحب کے اساسی فلسفہ پر پوری اترتی ہوں وہ سب عالم شاہ صاحب کے یہاں مصیب ہیں، ان کے مختلف اقوال کو جمع کرنا، ان میں تطبیق دینا شاہ صاحب کا علمی کمال ہے۔

(۱) اس کی ایک مثال یہ ہے کہ شیخ اکبر کی وحدت وجود اور امام ربانی کی وحدت شہود کو شاہ صاحب ایک دوسرے پر منطبق مانتے ہیں، تعبیرات کے اختلاف کو کچھ زیادہ وزن نہیں دیتے، اس مسئلہ کو شاہ صاحب نے مکتوب مدنی[۱] میں واضح کر دیا ہے، شاہ صاحب کی مذکورہ بالا تطبیق گو "ائمۂ مجددیہ" کو سخت ناگوار گزری ہے، تاہم وہ شاہ صاحب کے کمالات کے انھیں لفظوں میں معترف ہیں جن میں وہ اپنے ائمہ کا کمال بیان کرتے ہیں۔

(۲) ہم شاہ صاحب کے اس مسئلہ کو کہ وہ ائمہ فقہا میں حنفیہ اور شافعیہ کو ایک ہی درجہ پر قبول کرتے ہیں اسی اصول پر حل کرتے ہیں، انھوں نے دیکھا کہ ان کے والد اور چچا حنفی ہیں اور اس فلسفہ (وحدۃ الوجود) کو صحیح طریق سے جانتے اور چلاتے ہیں، نیز انھوں نے دیکھا کہ شیخ ابوالطاہر مدنی، اور شیخ ابراہیم کردی شافعی المذہب ہیں، پھر اس اصول کو اسی طرح مانتے ہیں، بنابریں ان کے نزدیک حقیقت شناسی کے نقطۂ نظر سے فقہ حنفی اور فقہ شافعی میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہئے۔ شاہ صاحب اپنے ملک میں، اپنی سوسائٹی میں، فقہ حنفی کے پابند ہیں، مگر انکی عقلیت فقہ شافعی کی توہین برداشت نہیں کرتی جیسے عام فقہا کے مشاجرات، بلاقصد، اتفاقاً مذکورہ پر منتج ہوتے ہیں۔

اب اسی مسئلہ کو ہم ذرا آگے بڑھاتے ہیں، شاہ صاحب فقہ حنفی کو امام ربانی محرر مذہب نعمانی، محمد بن الحسن الشیبانی (متوفی ۱۸۹ھ) کی کتابوں سے اخذ کرتے ہیں اور فقہ امام شافعی (متوفی ۲۰۴ھ) کو براہ راست امام ہی کی کتابوں سے لیتے ہیں، پھر ان ہر دو اماموں کو امام مالک (متوفی ۱۷۹ھ) کا شاگرد پاتے ہیں[۲] اخیر وہ یہ قاعدہ تجویز کر لیتے

---

[۱] ملاحظہ ہو "تفہیمات الہیہ" ج ۲ ص ۲۶۱ و کلمات طیبات ص ۱۲۵ مطبوعہ نورالحق

[۲] فی الجواہر المضیۃ عن ابن عبدالحکم سمعت الشافعی یقول قال محمد اقمت بباب مالک ثلاث سنین وسمعت من لفظہ سبع مائۃ حدیث ونیفا

ہیں کہ موطا مالک فقہ کی اصل ہے جس سے مالکی، شافعی، حنفی مذاہب پیدا ہوئے پھر آگے بڑھکر وہ اہل مدینہ کی فقہ کا مرکز حضرت فاروق اعظمؓ کو قرار دیتے ہیں۔ بنابریں ان مذاہب ثلثہ کو فاروق اعظم کے مذہب کی تشریح مانتے ہیں۔ ازالۃ الخفا میں وہ فاروق اعظم کو مجتہد مستقل اور ان ائمہ ثلثہ کو مجتہد منتسب کے درجے پر تسلیم کرتے ہیں۔ اس سے وہ ائمہ اہل سنت کے مذہب کو قرآن وسنت کی صحیح تشریح قرار دیتے ہیں، ہماری سمجھ میں یہ چیز اس رنگ میں جو متقدمین کی کتابوں میں بھی نظر نہیں آئی، شاہ صاحب کی اس مذکورۂ بالا عقلی ذہنیت کی صفائی کا نتیجہ ہے۔

فصل (۳) حکمت عملی کے باب میں شاہ ولی اللہ کا امتیاز اور اسکے اسباب

چشتی طریقہ میں حضرت شیخ عبدالعزیز دہلوی البحر المواج عرف شکر بار[۲]، مولف رسالہ عزیزیہ (یہ رسالہ انفاس العارفین میں پورا نقل ہے متوفی ۹۷۵ھ)، ایک بہت بڑے عالم، عارف، متشرع بزرگ گزرے ہیں، ان کے والد شیخ حسن بن طاہر (متوفی ۹۰۹ھ) سلطان سکندر لودی کے زمانہ میں دہلی آبسے تھے، شیخ عبدالعزیز کے پوتے شیخ رفیع الدین بن قطب العالم بن عبدالعزیز ہیں، جو خواجہ باقی باللہ کے خواص اصحاب سے تھے، شیخ رفیع الدین

---

[۱] قال الامام ولی اللہ فی ازالۃ الخفاء توسع فاروق اعظم در علم احکام کہ مسمے بہ فقہ مے شود۔ پس اکثر از آں ہست کہ بہ ضبط تقریر در آید، انتشر است علی الاطلاق اوست و آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم در مسائل فقہیہ باو اشارت فرمود تا از وے اخذ کنند، وصحابہ وتابعین بآں تصریح نمودند و در خارج ہمچنیں واقع شد۔ ونسبت فقہ او با فقہ سائر مجتہدین اہل سنت مانند نسبت متن است با شروح۔ ونسبت او با مجتہدان است مانند نسبت مجتہد مستقل است با مجتہدان منتسب و فائدہ ایں در حق عوام مسلمین آن است کہ مذاہب مجتہدین راشعب یک شریعت دانند و ہر مذہبے را دینے علیحدہ وملتے جداگانہ خیال نہ کنند و اختلاف امت مشوش یقین ایشاں باحکام ملت نشود۔ انتہی ملتقطاً ص۱۲۴ ج۱۔
مجتہد کے اقسام کے لئے شاہ صاحب کا رسالہ الانصاف اور عقد الجید ملاحظہ ہو۔ ۱۲ محمد نور الحق غفرلہ العلوی

[۲] شیخ عبدالعزیز کا ترجمہ شاہ صاحب نے انفاس میں، اور شیخ عبدالحق نے اخبار الاخیار ص۲۸۲ اور صاحب تذکرہ علمائے ہند نے ص۱۲۰ میں دیا ہے۔ "شیخ عبدالعزیز بن حسن بن طاہر دہلوی از مشاہیر مشائخ چشتیہ و اکابر علمائے صوفیہ عالم بود بعلوم شریعت وطریقت وحقیقت در اتباع مشائخ وحفظ قواعد وآداب ایشاں یگانہ عصر بود و مرید پدر خود۔ وہ در زمان خود یادگار مشائخ چشت بود، در دہلی بوجود او سلسلہ ارشاد ومشیخت بپا بود۔ وے در جونپور بسال ۸۹۸ھ متولد شد بعمر یک ونیم سالگی ہمراہ والد خود بدہلی تشریف آوردہ در جمادی الاخری ۹۷۵ھ وفات یافت، صاحب تصانیف مشہورہ است۔ از انجملہ است "رسالہ غینیہ" کہ در۔ قالہ۔ رسالہ غیریہ" شیخ امان پانی پتی نوشتہ وبسیارے از مسائل غوامض وحدت وجود موافق کشف در انجا بیان نمودہ انتہی، ملفوظات مولانا شاہ عبدالعزیز بن الامام ولی اللہ میں ہے "رسالہ عزیزیہ" تصنیف شاہ عبدالعزیز شکر بار خوش رسالہ ایست ونیز "رسالہ غینیہ" ہم در بیان وحدت وجود از وست۔ خوب گفتہ وتصنیفات دیگر مثل "آداب السلوک" خوب است، باز ارشاد شد کہ تصنیف شیخ حسن بن طاہر کتاب "مفتاح الفیض" در سلوک خوب تصنیف کردہ۔ انتہی ص۳۲۔
(شیخ قطب العالم: واانجب اولاد شیخ عبدالعزیز شیخ قطب العالم است۔ عالم وفاضل وصاحب اخلاق حمیدہ وصفات پسندیدہ، قدم صدق واستقامت بر سجادہ پدر نہادہ اوقات بطاعت وعبادت معمور دارد۔ واعظم خاندان اودشیخ عبدالعزیز ابجم الحق جامدہ است کہ در بیان

شاہ عبدالرحیم کے نانا ہیں۔ ان سے ویسی طریقے پر شاہ عبدالرحیم[1] کو فیض پہنچا، شاہ عبدالرحیم کی پیدائش سے دو سال پیشتر آپ شاہ عبدالرحیم کی خلافت کی سند لکھکر ان کی والدہ کو دے گئے تھے۔ یہ جملہ مشہور ہے کہ جسطرح مغلیہ خاندان میں سلطنت کا تسلسل رہا، اسی طرح شیخ عبدالعزیز کی اولاد میں شاہ ولی اللہ تک، پھر اُن کی اولاد تک جو سراج الدین بہادر شاہ ثانی (متوفی ۱۲۷۹ھ) کے زمانے تک رہی، علم وعرفان کا تسلسل رہا ہے۔

شاہ عبدالرحیم کے ایک استاد میر محمد زاہد ہروی[2] (متوفی ۱۱۰۱ھ) ہیں، ان کا سلسلہ تلمذ شیخ محقق جلال الدین

(بسلسلہ صفحہ گزشتہ) سائر خلفاو مریدان شیخ بہ اتحاد و محبت و عزت امتیاز دارد۔ وامروز جانشین شیخ اودرا میباشد انتہی اخبار الاخیار ص۲۰۲

[1] قال الامام ولی اللہ فی القول الجمیل ۔۔ تادب شیخنا عبدالرحیم علی روح جدہ لامہ الشیخ رفیع الدین محمد و اجازہ قبل ان یولد بسنتین لطریق خرق العادۃ عن ابیہ قطب العالم عن نجم الحق چاپنیلہ عن الشیخ عبدالعزیز ۔ ص۸۱ حضرت مولانا الشیخ ایک رسالے میں فرماتے ہیں ,,شاہ عبدالرحیم مادرزاد ولی تھے کیونکہ ان کو پیدا ہونے سے دو سال پہلے اجازت حاصل ہو چکی تھی۔'' شیخ عبدالعزیز اور شیخ رفیع الدین اوران کے خاندان کے حالات ''انفاس العارفین'' میں بھی ملاحظہ ہوں۔

(نکتہ) شیخ عبدالعزیز کا لقب ''شکر بار'' ہم نے شاہ عبدالعزیز دہلوی کے ملفوظات سے نقل کردیا ہے حضرت مولانا عمر فیضہم نے ,,کتاب التمہید فی ائمۃ التجدید'' میں ہر جگہ ان کو البحر المواج سے ملقب کیا ہے۔ ۱۲ محمد انور الحق غفرلہ العلوی

[2] میر محمد زاہد کا ترجمہ ''انفاس العارفین'' ص۱۳۳ اور مآثر الکرام ص۲۰۲ سے التقاط کرکے دیا جاتا ہے، میرزاہد علم از پدر بزرگوار و دیگر علمائے روزگار اخذ کرد۔ اما بہ قوت ادراک قدم از استاذان پیش گذاشت، میرزاہد در عمر سیزدہ سالگی از علوم فارغ شدہ بود، در جودت ذہن و استقامت عدیم النظیر زماں خود گشتہ، در رمضان ۱۰۶۴ھ از پیش گاہ صاحب قرآن ثانی شاہجہاں بخدمت واقعہ نویسی دارالملک کابل مامور شد و در سال ہشتم عالمگیری بمنصب احتساب اردوے بادشاہی معزز گردید و بعد چندے صدارت کابل با و تفویض یافت و بہ ایں تقریب در وطن مالوف (کابل) گوشۂ جمعیتی گرفتہ متاع علم را در چارسوئے عالم رواج داد کہ مرزا از مشرب صافی صوفیہ نیز بہرۂ تمام داشتہ وصحبت یکے از اکابر طریقہ دریافتہ دو نکتہ از تصانیف ایشاں بہ خاطر فقیر (ولی اللہ) چسپیدہ۔ یکے آنکہ در مبحث وجود مے نویسد الخ۔

دوانی (متوفی ۹۲۸ھ) پر ختم ہوتا ہے۔ سلطان محمد[1] خان فاتح نے جب یورپین اقوام کو اسلام سے آشنا کرنا ضروری سمجھا تو اپنے اہل عصر علماء کو شریعت و حکمت کی تطبیق پر متوجہ کیا ان میں سے محقق دوانی ایک نامور استاذ ہیں حکمت عملی میں اکثر افاضل زیادہ توجہ نہیں کرتے تھے مگر شیخ جلال الدین دوانی نے محقق نصیر الدین طوسی[2] متوفی (۶۷۲ھ) کے بعد اخلاق جلالی لکھکر اس فن کو زندہ کر دیا، شاہ عبدالرحیم نے شاہ ولی اللہ کو حکمت عملی سکھانے میں خصوصی توجہ برتی ہے جسکا ذکر "انفاس العارفین" اور "جزو لطیف" میں موجود ہے۔

شاہ عبدالرحیم قدس سرہ کا یہ کارنامہ بھی قابل احترام ہے کہ حکمت عملی سکھلانے پر خاص زور دیتے تھے عام متکلمین نے ارسطو کی حکمت نظریہ کو اپنا مطمح نظر بنا لیا ہے، وہ حکمت عملی سے سروکار نہیں رکھتے۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ علوم کلامیہ میں دلچسپی سے حصہ لینے والے فقہا اور متکلمین، قومی زندگی کی ضروریات میں تدبر اور تفکر سے محروم ہو گئے۔ امام ولی اللہؒ فرماتے ہیں "حضرت ایشاں با اخلاق سلیمہ مرضیہ از شجاعت و فراست و کفایت و غیرت بوجہ اتم موصوف بودند۔ و عقل معاش مثل عقل معاد کامل و وافر داشتند و در مجلس صحبت، حکمت عملی و آداب معاملہ بسیاری آموختند" ۔۔۔ بحوالہ کتاب "تمہید فی الانفاس" این فقیر را در مجلس صحبت حکمت عملی و آداب و معاملہ بسیارے آموختند صلا" اس بنیاد پر شاہ ولی اللہؒ نے عظیم الشان عمارت کھڑی کر دی ہے، اپنے حالات میں جہاں اور انعامات الٰہیہ کا ذکر کرتے ہیں یہ بھی لکھتے ہیں۔

---

[1] (فائدہ جلیلہ) قام امیر تیمور (ن ۸۰۷ھ) بتایید جمیع من اہل العلم منہم الشیخ بہاء الدین نقشبندؒ لاقامۃ خلافۃ اسلامیۃ عجمیۃ و توفی ۸۰۷ھ و اولادہ صاروا ملوکاً فی الشرق و فی الھند و کان فتح القسطنطنیۃ علی ید السلطان محمد خان الفاتح ۸۵۷ھ مبدءً للد ور العجمی الخالص فی مراکز الاسلام۔ وکذالک کان مبدءً للد ور الار تقائی فی ازدیادہ کتاب التمہید از حضرت مولٰنا الشیخ عم فیضہم

حضرت شیخ عم فیضہم کتاب التمہید میں فرماتے ہیں ۸۵۷ھ مطابق ۱۴۵۳ء میں عثمانی سلطان محمد خاں فاتح نے جب قسطنطنیہ فتح کیا تو اسکی حکومت کا عیسائی علماء اور حکماء سے اختلاط و ارتباط زیادہ بڑھا سلطان نے خاص طور پر اہل علم کو تنبیہ کیا کہ وہ یونانی فلاسفروں کے مختلف اسکولوں سے صحیح واقفیت پیدا کریں، نیز حکمائے اسلام نے جسقدر علم حقائق مدون کیا ہے، غزالی ہوں یا ابن عربی، ان کی تحقیقات و نظریات کو فلسفی زبان میں تحریر کریں۔ خواجہ زادہ (متوفی ۸۹۳ھ) عبدالرحمان جامی متوفی (۸۹۸ھ) جلال الدین دوانی متوفی ۹۲۸ھ، کی تصانیف اس کی شاہد عدل ہیں، ان سب میں یہی جلوہ نظر آتا ہے (قلت) علامہ مصلح الدین مصطفٰی بن یوسف الحنفی المعروف بخواجہ زادہ جو سلطان محمد خاں فاتح کے استاد اور قسطنطنیہ کے سرکاری کالج کے مدرس تھے آپ نے سلطان مذکور کے ارشاد پر تہافۃ الفلاسفہ اسی سلسلہ میں لکھی ۱۲ نور الحق۔

[2] ابو عبداللہ نصیر الدین محمد بن محمد بن حسن، کان راساً فی علم الاوائل ذا منزلۃ من ھولاکو، کان وزیرا لہ تذ ذمہ ابن القیم فی الاغاثۃ اقبح ذم یرد مرفی ذمہ خلل منہ علوم الحکمۃ وکونہ راساً فی التشیع توفی ۶۷۲ھ

محمد نور الحق العلوی غفرلہ لآبائہ و لمشائخہ الکرام

حکمت عملی کہ صلاح این دوزہ دراں است بوسعت تمام افادہ فرمودند و توفیق تشیید آں بہ کتاب وسنت وآثار صحابہ دادند" نعو (جزء لطیف) اگر شاہ ولی اللہ کے شاہ کار حجۃ اللہ البالغہ پر غور کیا جائے تو اس میں ایک امتیازی وصف یہ بھی نظر آتا ہے کہ وہ مباحث ارتفاقات میں حکمت عملی کا مفصل ذکر کر کے تمام احادیث کو انھیں ابواب پر تقسیم کر دیتے ہیں پھر خاص موقعہ پر حدیث کے ذیل میں حکمت عملی کا کوئی نکتہ ذکر کر دیتے ہیں

الغرض شاہ صاحب کی تمام کتابیں عبادات کے چار ابتدائی ارکان کے بعد حکمت عملی کے ابواب پر مبنی ہیں اسکا ایک نتیجہ ہماری سمجھ میں یہ ہے کہ شاہ صاحب نے حسن و قبح (یعنی بر و اثم) کے معنی لفظی بحثوں سے مجرد کر کے ہر طالب حق کے لئے انکو مشخص کر دیا ہے، انکی تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی چیز کو اچھا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے نوعی خواص اسمیں کاملاً پائے جاتے ہیں، مثلاً اگر ایک گدہے کو ہم اچھا کہیں گے تو مطلب ہوگا کہ حماریت کے لازم اس میں پورے موجود ہیں، یہ نہیں کہ وہ مثلاً ایک انسان سے بھی بڑھکر ہے، اسی طرح اگر ہم ایک نبات کو یا ایک جماعت کو اچھا کہینگے تو اس کے نوعی خواص کے اعتبار سے اس کی قیمت لگائینگے بنابریں ایک انسان کو اچھا کہنے کا مطلب یہ ہوگا کہ اس میں انسانیت نوعیہ کے خواص کاملاً پائے جاتے ہیں اسی طرح جس قدر ان اوصاف میں تنزل ہوگا اسی قدر اسکی خوبی میں نقص پیدا ہوتا جائیگا، انسانیت کے اوصاف کیا ہیں؟ اسکا جواب ایک ماہر حکمت کے نزدیک یہ ہوگا کہ تمام اقوام اور اصناف میں استقراء تام کے بعد جسقدر اوصاف مشترک پائے جاتے ہیں وہ انسانیت کا مصداق ہیں شاہ صاحب کی حجۃ اللہ پڑھکر دیکھئے وہ ہر بات میں کسی عمل کی کسی خلق کی کسی عقیدہ کی خوبی فقط اس طریقہ سے ثابت کرینگے کہ وہ انسانیت کے عام افراد میں یعنی مشرق و مغرب میں اور عرب و عجم میں پایا جاتا ہے، یہ ایسا نفیس جوہر حکمت ہے جس سے عام مصنفین کی کتب خالی ہیں، دوسرے علماء کی کتابیں پڑھکر حسن و قبح کی تمیز میں بر و اثم کی حقیقت معین کرنیمیں خیالی فلسفہ گھڑنے سے زیادہ کوئی کمال پیدا نہیں ہوتا۔[1]

شاہ صاحب کی اس استقرائی اجتماعیت کے بعد ایک طالبعلم اس درطہ سے یک لخت نکل جاتا ہے، وہ گھر کے نظام کو ایک سلطنت کے طور پر چلانیکی فکر صحیح اپنے اندر رکھتا ہے اسی کو بڑھا کر وہ محلے، مدینے اور مدن میں پھیلا کر دنیا کی سیاست پر حکمران بن سکتا ہے، اس کے بعد وہ عالم سمجھ سکتا ہے کہ اسلام عالمگیر انقلاب کا مکمل پروگرام ہے جس پر قرآن عظیم حاوی ہے، اور وہ اس نقطۂ نظر سے اپنی تشریح آپ ہے کسی تکمیل اور تشریح کا محتاج نہیں، یہ شاہ صاحب کے فلسفہ کا بہترین نتیجہ ہے جس نے قرآن کو مسلمانوں کے اذہان کے قریب کر دیا۔

---

[1] [تنبیہ] واضح رہے کہ یہ مسئلہ کہ حسن و قبح عقلی ہے یا شرعی، یہ جداگانہ موضوع اور مذکورہ بالا مسئلہ سے نازل درجہ کی بحث ہے دونوں میں خلط نہیں کرنا چاہئے۔ رہا یہ کہ حسن و قبح شرعی ہے یا عقلی؟ اسکا قطعی فیصلہ شاہ صاحب نے انفاس العارفین میں بسط سے کر دیا ہے۔ ظہیر احمد ۱۲ محمد نور الحق

باب دوم (تکمیلی ملکات)

اب ہم شاہ صاحبؒ کے تکمیلی ملکات سے بحث کرتے ہیں تکمیلی ملکات سے ہماری مراد یہ ہے کہ:-

(الف) صاف عقلیت سے تمام معلومات کو مرتب کر لینا تاکہ ان میں کسی قسم کا تضاد اور تزاحم باقی نہ رہے۔

(ب) وہبی قوتوں سے سرشار ہونا تاکہ تمام اختلافات کی اصلاح کے لئے جو تدابیر الہیہ کام کر رہی ہیں وہ بھی محسوس ہونے لگیں۔ اس قوت وہبی کا استناد، اول الذکر قوت عقلی پر ہو، غرض اس پہلے عقلی فیصلہ کی اس قوت وہبی سے تائید ہو رہی ہو۔

(ج) اس کے بعد قرآن حکیم کے حقائق پر عقلی اور وہبی ہر دو قوتوں سے غور کرنا اور اس کے تاریخی انقلابات کو مرتب طور پر سوچنا، سامنے لانا، اور واضح کرنا، پھر اس علم کی ایک تعلیم گاہ بنا کر راسخین فی العلم تیار کرنا جو اپنے زمانہ میں اور آئندہ آنیوالے دور میں قرآنی تعلیمات کو ملل اور ادیان کے مقابلہ میں قایم رکھ سکیں۔

یہ نمبر سوم، مذکورہ بالا قوتوں (عقلی اور وہبی) کے استعمال کا پہلا میدان ہے، اسکی تفصیل پر مختصراً آئندہ بحث آتی ہے۔

فصل (۱)

شاہ ولی اللہ اور قرآن فہمی کے باب کی ایک عام غلط فہمی کی اصلاح

فقہاء عظام نے قرآن عظیم کو اپنی "اصول فقہ" میں پہلے درجہ پر رکھا ہے، مگر اس سے مراد انکے یہاں چند آیات احکام ہیں جو امر و نواہی کی شکل میں قرآن حکیم میں مدون ہیں، اس تخصیص کا یہ اثر پیدا ہوا کہ ایک عالم سارا قرآن سمجھنا ضروری نہیں جانتا پھر اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کی تفسیر واعظوں اور قصہ گو افسانہ طراز لوگوں کے ہاتھ آگئی، اور فقہا کا اس میں دخل نہ رہا۔

ائمہ فقہا نے اپنے اصول میں بالاتفاق یہ مسئلہ درج کیا ہے کہ اگر قرآن شریف میں ایک آیت بلفظ عموم نازل ہوئی ہو اور مفسرین اس کا کوئی خاص واقعہ سبب بتاتے ہوں تو قرآن فہمی میں عموم الفاظ ہی مدنظر رہیگا خصوصیت محل کو اس میں دخل نہیں ہوگا۔

اس قاعدے پر اتفاق ہوتے ہوئے آپ جس تفسیر کو اٹھا کر دیکھیں گے ہر آیت کے ماتحت ایک جزئی واقعہ پائینگے، مثلاً یہ آیت ابوجہل کے حق میں ہے، یہ عبد اللہ بن ابی منافق کے بارے میں نازل ہوئی، یہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی فضیلت میں اتری، اس میں اہل بیت کے فضائل کا بیان ہے، عام اساتذہ اور طلبہ کو آپ انھیں جزئی چیزوں میں غور کرتا ہوا پائینگے۔ شاہ صاحب نے "الفوز الکبیر" کی ابتدا میں اس غلطی کو نہایت وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ اور آیات احکام کا مطلب یہ بتلایا کہ اجتماعی طور پر انسان میں جو بد اخلاقیاں اور بد اعمالیاں مروج

ہیں انکو ان آیات کا سبب نزول سمجھنا چاہیئے عرب یا عجم، زمانے کے تقدم یا تاخر سے انکو کوئی تعلق نہیں الفوز الکبیر میں ہے محقق آنست کہ وجود اعمال فاسدہ وجریان مظالم درمیان ایشان سبب نزول آیات احکام است۔

اس طریقے پر سوچنے والی ایک جماعت شاہ صاحب کے صحبت یافتہ لوگوں میں پیدا ہوگئی شاہ محمد عاشق[1] پھلتی اور شاہ محمد امین کشمیری ولی اللہی اس گروہ کے سرکردہ ہیں، سراج الہند مولنا شاہ عبد العزیز متوفی سنہ ۱۲۳۹ھ نے شاہ ولی اللہ صاحب کے بعد ان سے پڑھکر تکمیل کی

فصل (۲) قرآن میں قصص انبیا کی تکرار کامل اور مضامین قرآن کی ولی اللہی تقسیم حسن کی بدولت سے فہم قرآن کا دروازہ کھل جاتا ہے اور قرآن تک رسائی ہو سکتی ہے

قرآن شریف میں انبیا کے قصے مکرر سکرر موجود ہیں، انسان بے ترتیبی سے پڑھتے پڑھتے اکتا جاتا ہے شاہ صاحب نے عامہ کتب الہیہ کے لئے تین اصول مقرر کئے ہیں جنکے بعد وہ تمام قصص ایک اعلیٰ روحانیت پیدا کرنے کا ذریعہ بنجائینگے۔ وہ تین اصول حسب ذیل ہیں:

(۱) التذکیر بآلاء اللہ (۲) التذکیر بایام اللہ (۳) التذکیر بالموت وما بعدہ[2] آپ نے ان تین فنون

[1] حضرت مولنا الشیخ عم فیضہم رسائل تمہید میں فرماتے ہیں عام طور پر صدہا اہل علم شاہ ولی اللہ سے مستفیض ہوئے حرمین سے باہذاق عام ان سے علم سیکھنے کے لئے دہلی آتے رہے لیکن ان کے مکمل نظریہ کو سمجھنے والے تین چار رفقا سے زیادہ نہیں (۱) ان کے ماموں زاد بھائی شاہ محمد عاشق (۲) جمال الدین شاہ محمد امین ولی اللہی کشمیری (۳) شاہ نور اللہ بڈھانوی (۴) شاہ ابو سعید بریلوی پہلے تین حضرات شاہ عبد العزیز کے استاد ہیں، اور چوتھے کا نواسہ سید احمد امیر شہید ہیں۔ اینجاہ روزے در اواخر ایام خود، باین فقیر و صلاح آثار محمد عاشق اشارہ کردہ والد ماجد فرمودند کہ بایکدگر دوستی دارند، و این دوستی سبب ابتہاج و سرور من میشود، سر این کلمہ من بعد بظہور پیوست کہ این عزیز باین فقیر ارتباط طریقت پیدا کرد و متبع شد، و امید این است کہ این دوستی مثمر فوائد بسیار باشد۔ انفاس صفحہ الشیخ محمد عاشق بن الشیخ عبید اللہ بن الشیخ محمد ادخلہ یحیی من اول ترعرعہ وکان سیدی الوالد یرانی انادایاہ متحابین للہ فیقول انہ یسرنی ذلک عسے ان یکون لہ شان ثم الہم طلب طریق الحق منی وحکمتی فی ہذا الطریق ورزق محبۃ عظیمۃ منی ومنح الاقبال التام علی الاخذ منی فما زال یصعد ویصعد حتی رایت فیہ تفقط لطیفۃ انا ذلحجر البہمنت، وہو بحمد اللہ نفیسی ودعا علمی وحافظا اسراری وناظور کتبی، بل ہو کان الباعث علی تسوید کثیر منہا والمباشر لتبییضہ وانی ان علومی تبقی فی الناس من جہتہ۔ اخذ منی وشارکنی فی الاخذ عن مشائخ الحرمین۔ تفہیمات صفحہ ۲۵-۲۶ بعدازو الد ازیاران عمدۂ ایشان مثل شاہ محمد عاشق وخواجہ محمد امین ولی اللہی نیز علوم، حاصل کردم، شاہ محمد عاشق در سماع و قرأت بر شیخ ابو الطاہر و دیگر مشائخ حرمین شریک حضرت ایشان بودند عجالہ نافعہ صفحہ ۳۲ قال الشیخ محسن فی الیانع الجنی ومن اجلۃ اصحاب الشیخ ولی اللہ الشیخ محمد عاشق، قد شارکہ فی الاخذ عن مشائخ الحجاز ومن مولفاتہ کتاب فی السلوک معروف والشیخ محمد امین الکشمیری نجارا والدہلوی قرارا، کان ینتسب الی شیخہ ویعرف بالنسبۃ الیہ وہما اللذان اخذ عنہما الشیخ عبد العزیز کما ذکرہ فی عجالتہ صفحہ ۹

[2] باید دانست کہ معانی منطوقہ قرآن خارج از پنج علم نیست (الف) علم احکام از واجب و مندوب و مباح و مکروہ و حرام، خواہ از قسم عبادات باشد یا معاملات یا تدبیر منزل یا سیاست مدنیہ و تفصیل این علم ذمہ فقیہ است (ب) علم مخاصمہ با چہار فرقہ ضالہ، یہود و نصاری و مشرکین و منافقین و تفریع برین ذمہ متکلم است (ج) علم تذکیر بآلاء اللہ از بیان خلق آسمان و زمین و الہام بندگان بانچہ ایشان را در می بایست و از بیان صفات کاملہ او تعالی (د) علم تذکیر بایام اللہ یعنی بیان وقائع کہ آن را خدائے تعالیٰ ایجاد فرمودہ است از انعام مطیعین و تعذیب مجرمین (ہ) علم تذکیر بالموت و ما بعد آن از حشر و نشر و حساب و میزان و جنت و نار و حفظ تفاصیل این علوم و الحاق آثار و احادیث مناسبہ آن وظیفہ واعظ و مذکر است۔ فوز کبیر صفحہ ۳ ۱۲ نور الحق غفرلہ

پر الفوز الکبیر کے مقدمے میں تفصیل سے بحث کی ہے ۔ قرآن شریف سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ذکر، یعنی مطلق تذکیر کے لئے نازل ہوا، قال اللہ تعالیٰ شانہٗ "و لقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر" تذکیر مذکور کی بحث کو مستقل طور پر کسی نے ہاتھ تک نہیں لگایا، عام واعظ اور قصہ گو لوگ ان آیتوں میں تصرف کرتے رہے اور ان کی بحثیں ایک طرح تلاعب کے درجہ تک جا پہنچیں ۔

(۱) واضح رہے کہ مذکورہ بالا تذکیر میں مفسر کو ایک تو علوم طبعیات میں کافی مہارت ہونی چاہئے تاکہ آلاء اللہ کی تشریح کر سکے "سطعات[۱]" میں شاہ صاحب نے تصریح کر دی ہے کہ حکمت طبعیہ کو قرآن عظیم نے آلاء اللہ کی تذکیر میں استعمال کیا ہے ــــ (۲) تذکیر بایام اللہ کو فقط ایک مورخ اور فلسفہ تاریخ کا حاذق ماہر ہی حل کر سکتا ہے کہ ایک قوم کسطرح بڑھی تھی، پھر کس طرح گری ــــ (۳) انسانی زندگی موت پر ختم نہیں ہوتی اس پر حنیفی ادیان میں یہودی، نصرانی، مسلم سب متفق ہیں اور صابی ادیان میں سے سناتنی، بدھسٹ، اور مجوس، جو تناسخ کے قائل ہیں، وہ بھی موت پر زندگی کو ختم نہیں کرتے آزاد طبع عقلمندوں کی جماعت میں سے بھی بہت بڑا حصہ انسانی زندگی کو موت پر ختم نہیں کرتا البتہ ادنےٰ طبع کے چند بوالہوس شور مچاتے رہتے ہیں جن سے عوام متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے، اس غفلت سے انسان کو نکالنا اور اس کی زندگی کا مفہوم اسے سمجھانا، اس کے ثمرات جو اس دنیا میں پیدا ہوتے ہیں یا وہ ثمرات جو موت کے بعد پیدا ہونگے انکو ذہن نشین کرانا قرآن عظیم کے مقاصد میں اہم چیز ہے اس مسئلہ کو (تذکیر بالموت و مابعدہ کو) الہیات کا ایک بہت بڑا فاضل ہی سمجھا پڑھا سکتا ہے جسے عقلی الہیات کے ماسوا مختلف ادیان کے نظریات مابعد الموت پر پورا پورا عبور حاصل ہو ۔

عقدہ لاینحل اور مسئلہ حقیقت روح

یہاں ایک پیچیدگی غلط تعبیر سے پیدا ہوئی جس نے مسلم مفکرین کے اذہان کو جامد بنا رکھا ہے، مابعد الموت کے مسئلہ پر غور کرنے سے پیشتر انسانی روح[۲] کو سمجھنا از حد ضروری ہے عامہ مفسرین نے روح کے علم کو متشابہات میں داخل کر رکھا ہے، کوئی مفکر اس کے قریب نہیں جا سکتا، اس لئے تمام مسائل مابعد الموت تحت اللفظ ترجمہ پڑھنے سے زیادہ قابل غور نہیں سمجھے جاتے یہانتک کہ عقائد کی کتابوں میں توحید اور نبوت کا مسئلہ تو عقلی مانا جاتا ہے اور عذاب القبر سے لیکر آگے کی تمام بحثیں نقلی سمجھی جاتی ہیں عذاب القبر کو صرف اسلئے مانا جاتا ہے کہ حدیث شریف میں اسکا ذکر موجود ہے ۔

شاہ صاحب نے اپنی تالیفات میں مسلمانوں کو اس غلطی سے بچا لیا ہے، مابعد الموت جو زندگی قرآن ثابت کرتا ہے، انکے یہاں مسلسل عقلی نتائج کا مجمل بیان ہے، عقل صریح کی پوری تائید کے بغیر کوئی چیز قرآن منوانے کی خواہش نہیں رکھتا ۔

---

[۱] دیکھو سطعات طبع جدید ص سطعہ (۱۵) نوع انسانی کا اعتدال جن علوم سے وابستہ ہے وہ سات ہیں علم الہیات، علم طبعیات، علم ایام اللہ وغیرہ
[۲] روح کے مسائل کو شاہ صاحب نے حجۃ اللہ کے علاوہ تفہیمات جلد ثانی ص بعد اور الطاف القدس ص بعد میں حل کیا ہے تفہیمات میں یوں شروع کرتے ہیں ایں کلمہ ایست چند در تحقیق سعادت آخرویہ بدانکہ تحقیق سعادات اخرویہ موقوف بر مقدمہ است حقیقۃ روح و لمیتہا و اجنہ مجازات الخ نور الحق العلوی غفرلہ

اس ہمارے دور میں جب سے ہندوستان سے اسلامی حکومت چلی گئی ہے شاہ صاحب کے ان افادات پر توجہ نہ کرنا مسلمانوں کی سنت سے بڑی بدقسمتی ہے۔

فصل (۳) شاہ صاحب کی تقسیم کے مطابق قرآن کا ایک اہم مضمون مخاصمہ اور عام علماء کی اس نکتہ سے بے اعتنائی

شاہ صاحب نے قرآن کے اصول میں سے پانچویں اصل مخاصمہ قرار دیا ہے جو یہود و نصاریٰ مشرکین اور منافقین کیساتھ جاری ہے اسکی پوری تفصیل "الفوز الکبیر" کے مقدمہ میں ملیگی۔ ہماری سمجھ میں شاہ صاحب کے مباحث (درباره مخاصمہ) کا خلاصہ یہ ہے کہ علم اخلاق جو احکام شرعیہ کے ضمن میں ملحوظ ہے۔ اس کی تعلیم دو طرح دینی چاہیئے اول بطریق اوامر نواہی دوم ان اخلاق حمیدہ کے تارکین کی زندگی میں جو معائب پیدا ہوتے ہیں انکی تفصیل بتائی جائے۔

ایک جماعت جو اپنے آپکو احکام الہیہ کا پابند مان لیتی ہے پھر اس ملت کے متبعین کیلئے مرکز کا کام دیتی ہے ایسی جماعت کی خرابی سے ساری ملت برباد ہو جاتی ہے، انکی مثالیں یہود اور نصاریٰ سے مخاصمہ کرکے واضح کردی گئیں۔

ایک ایسی جماعت جو عقلی اصول پر اپنی ترقی تجویز کرلیتی ہے وہ اپنے مسلمہ اخلاق کی پابندی کو ترک کرکے کس طرح برباد ہوتی ہے، اس کی توضیح مشرکین کے مناظرے میں آئیگی۔

ایک شخص جو اپنے آپ کو کسی مذہب کا پابند سمجھتا ہے پھر تساہل اور تہاون سے ان احکام کے مقصد کو پورا نہیں کرتا، اس کی غلطیاں منافقین کے مناظرے سے واضح ہونگی۔

شاہ صاحب کی اس توضیح کے بعد مخاصمہ قرآن حکیم کے مقاصد میں نہایت اہم درجہ رکھتا ہے لیکن اس کو بے التفاتی سے پڑھکر گذر جاتا ہے۔

ہمارے خیال میں بہت کم مفسرین ایسے ہونگے جو اس مقصد پر متوجہ ہوتے ہوں جن لوگوں نے یہ خیال بنایا تھا کہ فقیہ بننے کیلئے قرآن کریم کے فقط اوامر و نواہی کافی ہیں، ہمارا خیال ہے کہ وہ قرآن کو مس تک نہیں کر سکے۔

جب مسلمانوں کی مرکزی جماعت کا قرآن عظیم کے متعلق یہ خیال ہو تو عوام بیچارے اس بارہ میں کہاں تک قابل ملامت قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ نے قرآن کے مضامین کو مذکورہ بالا پانچ ابواب میں تقسیم کرکے دنیائے اسلام پر رحمت کا دروازہ کھول دیا ہے یہاں اگر انکی کسبی عقلی اور وہبی اشراقی قوتیں کام نہ کرتیں تو ہمارے خیال میں قرآن کو اسطرح واضح کرنا ناممکن تھا۔

ہم نے امام فخر الدین رازی (محمد بن عمر متوفی ۶۰۶ھ) کی تفسیر پڑھی، نیز جار اللہ زمخشری (محمود بن عمر متوفی ۵۳۸ھ) کی تفسیر کا مطالعہ کیا، انکے علاوہ معالم التنزیل از (ابو محمد حسین بن مسعود فراء) بغوی (متوفی ۵۱۶ھ) اور تفسیر حافظ عماد الدین ابو الفدا اسمعیل بن عمر المعروف بہ ابن کثیر (متوفی ۷۷۴ھ) بھی پڑھی، ان سے ہمیں اپنی استطاعت کے مطابق سوائے تحیر کے کچھ نصیب نہیں ہوا، اگر طالب علمی کے عہد میں ہم نے نجم الائمہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ (متوفی ۱۳۳۹ھ) سے چند

ؔ ۵ رأیت فی مبشرۃ ان الامام ناکثا جاء الی مدینۃ دار الرشاد فی السندھ واقام فی حجرۃ منہا ثم جاء شیخنا شیخ الہند الی دار الرشاد و نزل فی تلک الحجرۃ (بقیہ بر صفحہ)

آیتوں کی تفسیر نہ سنی ہوتی جو کتابوں میں نہیں ملتی اور ہمارے لئے وہ اطمینان کا ذریعہ بن سکی اور اس کے ساتھ ہی شیخ الاسلام مولنا محمد قاسم نانوتوی (متوفی ۱۲۹۷ھ) کے بعض تفسیری جملے ہم نے نہ پڑھے ہوتے تو ہم علم تفسیر کے حاصل کرنے سے قطعاً مایوس ہوجاتے۔ ہم مانتے ہیں کہ پہلے زمانہ میں مسلمانوں نے انہی کتابوں سے قرآن سمجھا تھا جب وہ قرآن کی حکومت مجتہدانہ اصول پر قائم کر رہے تھے، مگر اس قسم کی تفسیروں سے قرآن فہمی ہمارے لئے ناممکن ہے۔

ہم نے مولنا شیخ الہند قدس سرہ سے اصول تفسیر پر کتابیں مانگیں، آپ نے کتاب "الاتقان فی علوم القرآن" از حافظ جلال الدین (عبدالرحمان بن ابی بکر سیوطی متوفی ۹۱۱ھ) ہمیں مرحمت فرمائی، میں نے پوری کوشش سے ساری کتاب بار بار پڑھی، سوائے چند اوراق کے مجھے اس میں کوئی چیز حسب نظر نہ آئی جسے اصول کا درجہ دیا جا سکے یہ زمانہ ایسا تھا کہ میں اصول فقہ سے فارغ ہو کر اس میں ایک مستقل تصنیف[1] لکھ چکا تھا، اسی زمانہ میں حضرت مولنا نے یہ بھی فرمایا تھا ایک مختصر سا رسالہ اصول تفسیر میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے بھی لکھا ہے جس کا نام "الفوز الکبیر" ہے۔

یہاں میں خیال کرتا ہوں کہ حضرت مولنا قدس سرہ کی عادت مبارکہ کا ضمناً ذکر کروں، آپ جانتے ہو کہ امام فخر الدین رازی اور علامہ (مسعود[2] بن عمر المتوفی ۷۹۱ھ) تفتازانی کو عموماً طلبہ میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ان نامور حضرات کے مقابلہ میں طلبہ شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کی بات سننے کے لئے بھی تیار نہیں نجم الائمہ شیخ الہند اگر کسی مسئلے میں امام رازی یا علامہ تفتازانی کی تغلیط کرتے تو مبہم طور پر یہ فرماتے کہ محققین کی رائے اس مسئلہ میں یوں ہے طلبہ سمجھتے کہ یہ "محققین" ان حضرات سے بھی کوئی متقدم ہستیاں ہونگی، میں ایک لمبے عرصے کے بعد متفطن ہوا کہ محققین سے مراد حضرت شیخ الاسلام مولنا محمد قاسم اور ان کے اساتذہ کرام اور مشایخ عظام ہیں جو شاہ ولی اللہ صاحبؒ پر ختم ہوجاتے ہیں۔

یہ باعث تھا کہ آپ نے "الفوز الکبیر" مجھے شروع میں عطا نہ کی، بلکہ فقط اس کا تذکرہ کر دیا۔ جب میں سندھ

(بقیہ حاشیہ ص۱۹۱) ممن یوسند اشبہ شیخنا بالامام مالک ونظراً الی ذلک جعلت عنوانہ "نجم الائمۃ" قال الامام الشافعی اذا ذکر العلماء فمالک النجم۔ کتاب التمہید حمد تحدیث النعمۃ، ص۱۱ خطبہ) ۱۲

[1] قال الشیخ عم فیضہم فی کتاب التمہید فی ائمۃ التجدید: فی آخر ۱۳۰۳ صنفت مراصد الوصول الی مقاصد الاصول، لخصت فیہ مسلم الثبوت واضفت الیہا اشیاء من تحریر ابن الہمام وشرح المختصر للعضد وشرح المسلم للشیخ نظام الدین اللکہنوی وشرح بحر العلوم حسب ما ادی الیہ فکری فلما عرضتہ علی شیخ الہند استحسنہ جداً والبسنی بلباسہ مراراً ھ ص۸ ۱۲ محمد نور الحق العلوی عفرلہ

[2] اختلف فی اسمہ وفی مذہبہ فی الفقہ فقیل اسمہ مسعود، قال ابن العماد فی الشذرات اثبتہ السیوطی فی طبقات النحاۃ بلفظ مسعود وہو المشہور والذی اثبتہ ابن حجر فی الدرر الکامنۃ وانباء الغمر بلفظ محمود ھ ملخصاً۔ قال مولنا الشیخ عم فیضہم فی کتاب التمہید قلت قال العیمی قیل انہ شافعی والاوجہ انہ حنفی لتالیفہ فی اصول الفقہ الحنفیۃ ولما ذکرہ صاحب المنہل الصافی المستوفی بعد الوافی فی ترجمۃ علاء الدین محمد بن محمد البخاری وہو حنفی بلا ریب من انہ تفقہ بابیہ وعمہ وسعد التفتازانی وغیرہم انتہی، ودعوی امکان تفقہ العلاء البخاری بالسعد مع کونہ شافعیاً تکلف لایخفی علی المنصف انتہی قول العیمی قال السید احمد الطحطاوی فی حواشیہ علی الدر المختار، التفتازانی کان حنفیاً لما ذکرہ صاحب البحر فی دیباجۃ شرح ہند وانتہت الیہ ریاسۃ الحنفیۃ فی زمانہ حتی ولی قضاء الحنفیۃ ولہ تکملۃ شرح الہدایۃ للسروجی وفتاوی الحنفیۃ وشرح تلخیص الجامع الکبیر والتلویح حاشیۃ التوضیح لصدر الشریعۃ انتہی قول الطحطاوی۔ انتہی ما فی التمہید ۱۲ محمد نور الحق العلوی عفرلہ

پہنچا تو مجھے "فوز الکبیر" کا نسخہ ملا اس سے پیشتر میں امام رازی کی تفسیر کا مطالعہ کر کے کافی پریشان ہو چکا تھا، فصل اول کا مطالعہ ختم کر لینے کے بعد میں مطمئن ہو گیا کہ انشاء اللہ علم تفسیر مجھے آ سکتا ہے پھر اس دن سے آج تک میں انکے مسلک سے باہر جانے کی ضرورت محسوس نہیں کر سکا۔

فصل (۴)

متن قرآن سے شاہ ولی اللہ کا اعتنا اور اسکی برکات
آپ کا ترجمہ قرآن "فتح الرحمان" اور اسکی خصوصیات

قرآن شریف کو عامہ مسلمین کے اذہان کے قریب لانا ضروری تھا مسلمانوں کی ذہنی سطح استوار کرنیکے لئے سب سے پہلے شاہ عبدالرحیم نے یہ بہترین راستہ اختیار کیا کہ متن قرآن عظیم تحقیق و تفہیم سے پڑھانے لگے اس سے پہلے علماء کا یہ دستور تھا کہ قرآن شریف فقط تلاوت کرنے کے لئے پڑھاتے اور مطالب سکھانے کے لئے جس فن سے انھیں دلچسپی ہوتی اس قسم کی ایک تفسیر طالب علم کو پڑھا دیتے جس سے قرآن شریف گویا اس فن کی ایک اعلیٰ کتاب بنجاتی اور جو اخلاقی ذہنیت استاد کی طبیعت میں مرکوز ہوتی، تفسیر پڑھنے سے اور راسخ ہو جاتی

شاہ ولی اللہ قدس سرہ لکھتے ہیں "غالباً در حلقہ یاران بیروں از تلاوت ہر روز دو سہ رکوع بہ تدبر و بیان معانی می خواند ندع انفاس ص۲۶ دوسرے موقع پر تحریر کیا ہے "از جملہ نعمتہائے علمی بریں ضعیف آں بود کہ چند بار درس دار قرآن عظیم با تدبر و شان نزول در جوع بہ تفاسیر بہ خدمت ایشان حاضر شدم و ایں معنی سبب فتح عظیم افتادہ حرائے لطیف"

اس کا اثر یہ ہوا کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے متن قرآن کی حقیقت اپنے اشراق سے اس طرح معین کر لی کہ یہ کتاب بذات خود ایک کامل مکمل نصاب ہے اس پر اضافہ کی کوئی ضرورت نہیں، ہندوستانی مسلمانوں کی شاہی زبان فارسی تھی ۱۱۵۰ھ میں آپنے اس کتاب مجید کا فارسی میں "فتح الرحمان" کے نام سے ترجمہ کیا، جو ۱۱۵۱ھ میں ختم ہوا اور ۱۱۵۱ھ میں "فتح الرحمان" کی تدریس کا افتتاح ہوا، آپ نے ترجمہ کے ساتھ مختصر طور پر تشریحی فوائد بھی لکھے جن کی اہمیت میں یورپ جا کر سمجھ سکا ہوں۔

(الف) مثال کے طور پر کتب علیکم القصاص فی القتلیٰ "کی تفسیر ملاحظہ ہو، قصاص کا ترجمہ مساوات اور مماثلت، غالباً آپ کو کسی تفسیر میں نہیں ملیگا: انسانی مساوات کو یہاں مبنائے حیات قرار دیا گیا ہے کما قال تعالیٰ شانہ "ولکم فی القصاص حیاۃ یا اولی الالباب لعلکم تتقون" پھر انسانی سوسائٹی کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے (الف) خود اپنی قوم (ب) اور اجنبی، اجنبی کو "العبد بالعبد" سے تعبیر کیا گیا ہے اور اپنی قوم کو (ج) الذکر و الانثیٰ میں تقسیم کر دیا ہے، اس بنیادی چیز پر جہانتک میری نظر کام کر سکی کسی حکیم نے تنبیہ نہیں کی، ہمارے دور میں جبکہ ہم یورپ سے اشتراک عمل کرنے پر مجبور ہیں اور یورپین نظریات کو ہم بڑی عزت و عظمت سے لیتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں انسانی سوسائٹی کو تحلیل کرنیوالے حکماء مسلمانوں میں کم نظر آتے

ہیں تو نوجوان مسلمان کے دماغ پر اسکا اچھا اثر نہیں پڑتا، وہ یہاں پہنچکر اپنی خودی گم کرنے لگتا ہے، اگر اساسی چیز اسکو قرآن حکیم میں سے سمجھا دیجائے تو وہ تفصیلات ہر اچھے عالم سے لے سکتا ہے اور اسکی اسلامیت کو کوئی صدمہ نہیں پہنچ سکتا۔

(ب) سورہ رعد کی آخری آیتوں اولم یروا انا ناتی الارض ننقصها من اطرافها واللہ یحکم لا معقب لحکمہ وھو سریع الحساب الخ پر شاہ صاحب کا حاشیہ[1] پڑھیئے۔ اس سے مکہ معظمہ ہی میں "اسلامی حکومت" کی تاسیس آپ کو سمجھ آنے لگے گی اور اس سے بہت سے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے میں آپ کو سہولت ہوگی۔ پارٹی پالیٹکس کی بنیاد اس بیان میں روشن نظر آتی ہے جس کی تفصیل "فیوض الحرمین" میں زیادہ موجود ہے وہاں آپ نے سلطنت کو خلافت ظاہرہ سے تعبیر کیا ہے۔ اور سلطنت پیدا کرنیوالی پارٹی کو آپ خلافت باطنہ کا نام دیتے ہیں (دیکھو مثنؔ) قرآن کی حکومت پیدا کرنیوالی پارٹی ہی کا نام حزب اللہ ہے اس طرح سیاسی مسائل پر غور کرنیکی توجہ، شاہ صاحب کی کتابیں پڑھنے سے پیدا ہوتی ہے، اسکے بعد یورپ کی موجودہ ترقی ہمارے لئے کوئی نئی چیز نہیں رہتی البتہ ہم اپنے چند غفلت شعار بادشاہوں اور امیروں کی سستی کا برا نتیجہ بھگت رہے ہیں ہمارا مذہب اگر قرآنی قانون سے ماخوذ ہے تو ہم دنیا کے مقابلے میں پسپا نہیں ہو سکتے، اگر بادشاہوں کی شکست کے بعد انکی باقیماندہ میراث کو ہم اسلام سمجھیں تو میری رائے یہ ہے کہ اس اسلام کی پوری شکست مان لینی چاہیئے، تاکہ نئی نسل کو نئے سرے سے کام کرنیکی ہمت پیدا ہو، غلط اصولوں کی تصحیح میں ان کے دماغوں کو الجھانا نہیں چاہیئے

قرآن عظیم کا مذکورہ بالا ترجمہ میرے نزدیک ایک ہندوستانی کے لئے تمام تفاسیر سے بہتر کتاب ہے، اس کے ازبر کر لینے کے بعد دوسری تفاسیر پڑھنی چاہئیں، تب کہیں ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے اگر یہ ترجمہ ایک استاد سے پڑھنے کے بعد ذہن میں راسخ نہیں ہوا تو میرے خیال میں ایک عجمی موجودہ تفاسیر سے کوئی معتدبہ فائدہ نہیں اٹھا سکتا خواہ وہ تفاسیر نقلی ہوں یا عقلی یا ادبی۔

فصل (۵) آیات متشابہات کے متعلق شاہ صاحب کا مسلک

قرآن حکیم نے آیات قرآنی کی تقسیم محکمات اور متشابہات میں کر دی ہے عموماً اہل علم متشابہات میں بحث کرنا نامکن سمجھتے ہیں، پھر متشابہات کی ایسی واضح تعریف و تفسیر جس سے تمام ایسی آیتیں تحقیقی اور تحدیدی طور پر

---

[1] حاشیہ کی عبارت یہ ہے "یعنی روز بروز شوکت اسلام بہ زمین عرب منتشر مے شود و دار الحرب ناقص مے گردد از اطراف آں عامہ مفسرین این آیت را مدنیہ دانند و نزدیک مترجم لازم نیست کہ مدنی باشد مراد از نقصان دار الحرب ما سلام اسلم و غفار و جہینہ و مزینہ و قبائل یمن است پیش از ہجرت ھ　　محمد نور الحق غفرلہ

[2] لطیفہ: حضرت مولانا الشیخ عم فیضہم نے ایک دوسری مجلس میں مجھ سے فرمایا کہ دور حاضر کے علما اور طلبا کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ وہ کتاب الٰہی کی تعلیم کے وقت متن کو چھوڑ کر شروح و تفاسیر پر زور دیتے ہیں، اور فن حدیث میں بخاری کی شرح حجۃ اللہ البالغہ سے پوری بے غفلت برت کر صرف متون پر اکتفا کرنا شعار بنا لیا گیا ہے، یہ دونوں بہترین غیر طبعی ہیں۔ انتہی (۲)　　محمد نور الحق غفرلہ

جدا کر لیجا سکیں کوئی متفق علیہ موجود نہیں ہے اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک تو قرآن بتمامہ ناقابل فہم ہو گیا، اور متشابہات میں غور نکرنا ایک اصول اور عقیدہ مقرر ہو گیا۔ ایک کتاب کی نسبت جب یہ عقیدہ بنجائے کہ اس کے بعض حصے (جن کا پورا تعین بھی نہیں) فہم سے بالاتر ہیں تو انسانی متوسط عقول کے لئے ساری کتاب مشتبہ بنجاتی ہے طبیعت میں خدشات اور اوہام اٹھتے ہیں کہ فلاں فلاں آیات کا جو مفہوم ہمنے معین کیا ممکن ہے کہ اسکی نقیض ان آیات میں موجود ہو جنکو ہم نہیں سمجھ سکتے۔ اس غلط فکر نے عمل کے لئے قرآن کی طرف سے مسلمانوں کے التفات کو یکسر مٹا دیا۔

شاہ صاحب کے علوم میں یہ خاص قوت ہے کہ وہ متشابہات کے معانی راسخین فی العلم کے لئے تحقیقاً سے سمجھا سکتے ہیں۔ ان علوم کو ہم تکمیلی علوم میں شامل جانتے ہیں، بیشک ہر طالب علم اس درجہ پر نہیں پہنچ سکتا لیکن اگر وہ اپنی جد و جہد مسلسل جاری رکھے تو رسوخ فی العلم کا مرتبہ حاصل کر لینا اسکے لئے ناممکن نہیں ہے۔

اس یقین کو پیدا کرنے کے بعد قرآن کریم کے عالموں کی ایک مستقل سوسائٹی پیدا ہونا لازم ہے جس میں استاد کامل و مکمل اور اہل علم اول اور دوم درجہ کے شامل ہوں، یہ قرآن کی تعلیمات کو دنیا میں کامیاب بنانیکے لئے "مرکزی قوت" ہوگی۔

مکہ معظمہ میں رہتے ہوئے ہمیں زیادہ تر واسطہ ان اہل علم سے پڑتا رہا جو شیخ الاسلام (حافظ تقی الدین احمد بن عبدالحلیم عرف) ابن تیمیہ (متوفی ۷۲۸ھ) کی امامت کے قائل ہیں، ظاہریہ حنابلہ اور شافعیہ محدثین کی طرح ان کا بھی میلان ہے، وہ اسی وہم میں مبتلا تھے کہ متشابہات میں بحث کرنا فتنے کا دروازہ کھولنا ہے اور متشابہات کا علم یقینی طور پر حاصل کرنا کسی عالم کے لئے ممکن نہیں، اس طرح وہ ہماری تعلیم پر ایک پابندی عائد کرنا چاہتے تھے تاکہ ہم شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کو کھلے طور پر طلبہ کے سامنے پیش نہ کر سکیں، کیونکہ شاہ صاحب متشابہات میں بحث کرتے ہیں اور یہ ان کے اصول کے خلاف ہے۔

ہمیں اس سے تھوڑے دنوں پریشانی رہی اور ہم نرمی سے عقلی طور پر ان کو سمجھاتے رہے۔ اتفاقاً ہمیں حافظ ابن تیمیہ کی تفسیر قل هو الله احد مطبوعہ مصر ہاتھ آئی جو ہمارے لئے ایک حیرت کا سبب بن گئی، ابن تیمیہ نہایت شدت سے اس فکر کی تردید کرتے ہیں کہ متشابہات کا علم خدا تعالیٰ کے سوا کسی کو حاصل نہیں اور یہ نتیجہ ہے اس مشہور قاعدہ کا کہ "وما یعلم تاویلہ الا اللہ" پر وقف لازم مانا جاتا ہے "والراسخون فی العلم" کو اس سے منقطع کر دیا جاتا ہے، ابن تیمیہ پوچھتے ہیں کہ آیات متشابہات کا علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تھا یا نہیں؟ اور اس سے اوپر جبرئیل بھی جانتے تھے یا نہیں اگر جواب نفی میں ہے تو ان آیتوں کے نازل کرنیکا کیا مطلب[1] تھا؟

---

[1] مقالہ زیر بحث کی ترتیب کے وقت شیخ الاسلام کی تفسیر سورۂ اخلاص میرے سامنے نہیں ورنہ اہل علم کے لئے اسکی عبارت بعینہ نقل کر دی جاتی البتہ ان کے رسالہ الاکلیل فی المتشابہ والتاویل کے چند اقتباسات ذیل میں ذکر کئے جاتے ہیں جو مائن فیہ میں کافی ہیں۔ قال شیخ الاسلام، لم یقل فی المتشابہ لا یعلم تفسیرہ و معناہ الا اللہ وانما قال وما یعلم تاویلہ الا اللہ وہذا ہو فصل الخطاب بین المتنازعین فی ہذا الموضع ...

ہم نے یہ نقل ان اہل علم کو دکھلانا شروع کی اس پر وہ حیران رہ گئے بعد ازاں وہ خود ابن تیمیہ کی دوسری کتابوں سے اس کی تائیدات تلاش کر کے ہمیں آکر سنانے لگے۔

میرا اپنا اس معاملے میں یہ حال ہے کہ جب سے میں نے "مسلم الثبوت" کی شرح از مولانا بحر العلوم (متوفی ۱۲۲۵ھ) پڑھی اور یہ ۱۳۲۰ھ کا واقعہ ہے) تو اس زمانہ سے میں اس پر مطمئن تھا کہ بحث اور مناظرہ سے تو متشابہات کا مطلب حاصل نہیں ہو سکتا مگر وہبی طریقہ سے اللہ تعالیٰ کاملین امت مرحومہ کو یہ علم عطا کرتا رہتا ہے اسکے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) بمعناہ وتفسیرہ بل قال "کتاب انزلناہ الیک مبارک لیدبروا آیاتہ" وھذا یعم المحکمات والمتشابہات، ومالا یعقل لہ معنی لا یتدبر وقال "افلا یتدبرون القرآن" ولم یستثن شیئا منہ نہی عن تدبرہ والله ورسولہ انما ذم من اتبع المتشابہ ابتغاء الفتنۃ وابتغاء تاویلہ، فاما من تدبر المحکم والمتشابہ کما امرہ الله وطلب فہمہ ومعرفۃ معناہ فلم یذمہ الله بل امر بذلک ومدح علیہ۔

ولھذا قال الحسن البصری "ما انزل الله آیۃ الا وھو یحب ان یعلم فی ما انزلت وماذا عنی بھا۔ وما استثنی من ذلک لا متشابہا ولا غیرہ۔ وقال مجاھد عرضت المصحف علی ابن عباس من اولہ الی آخرہ مرات اقف عند کل آیۃ واسالہ عنہا" فھذا ابن عباسؓ حبر الامۃ یجیب مجاھدا عن کل آیۃ فی القرآن، وھذا ھو الذی حمل مجاھدا ومن وافقہ کابن قتیبۃ علی ان جعلوا الوقف عند قولہ "والراسخون فی العلم" فجعلوا الراسخین یعلمون التاویل لان مجاھدا تعلم من ابن عباس تفسیر القرآن کلہ وبیان معانیہ، و. یبین ذلک ان الصحابۃ والتابعین لم یمتنع احد منہم عن تفسیر آیۃ من کتاب الله، ولا قال ھذا من المتشابہ الذی لا یعلم معناہ ولا قال قط احد من سلف الامۃ ولا من الائمۃ المتبوعین ان فی القرآن آیات لا یعلم معناھا ولا یفہمہا رسول الله صلی الله علیہ وسلم ولا اھل العلم والایمان جمیعا لا نعلم احدا من سلف الامۃ ولا من الائمۃ لا احمد بن حنبل ولا غیرہ انہ نفی ان یعلم احد معنی المتشابہ وجعلوہ بمنزلۃ الکلام الاعجمی الذی لا یفہم۔ ولا قالوا ان الله ینزل کلاما لا یفہم احد معناہ و انما قالوا فی احادیث الصفات تمر کما جاءت ونہوا عن تاویلات الجہمیۃ وردوھا وابطلوھا ونصوص احمد والائمۃ قبلہ بینۃ فی انہم کانوا یبطلون تاویلات الجہمیۃ فھذا اتفاق من الائمۃ علی انہم یعلمون معنی المتشابہ وانہ لا یسکت عن بیانہ وتفسیرہ بل یبین ویفسر باتفاق الائمۃ من غیر تحریف ولا الحاد، وانما مذھبہم نفی ھذہ التاویلات وردھا لا التوقف عنہا ثم ان الصحابۃ نقلوا عن النبی صلی الله علیہ وسلم انہم کانوا یتعلمون منہ التفسیر مع التلاوۃ ولم یذکر احد منہم عنہ قط انہ امتنع عن تفسیر آیۃ "۱۲

[1] قال مولانا عبد العلی فی فواتح الرحموت: "قد نقل عن الاولیاء الکرام اصحاب الکرامات، انہم یعلمون تاویل المتشابہات عند ریاضاتہم الشدیدۃ والمجاھدات القویۃ وخلعہم ابدانہم وانسلاخہم فی اعلی علیین فانہ یفاض علیہم عند ھذہ الحال علوم وھبی من غیر قصد وطلب وکسب مالا عین رأت ولا اذن سمعت والسلف انما راموا بعد مفہومیۃ المتشابہات عدہ للمفہومیۃ بالکسب والنظر" (ص ۲ طبع مصر بالمستصفی للغزالی) قال الامام عبد القاھر البغدادی (المتوفی ۴۲۹ھ) فی کتابہ "اصول الدین" کان شیخنا ابو الحسن الاشعری یقول لابد ان یکون فی کل عصر من العلماء من یعلم تاویل المتشابہ من حروف الہجاء وغیرھا والیہ ذھبت المعتزلۃ ص ۲۲۳

بعد کافی زمانہ گزرنے پر خواجہ محمد معصوم سرہندی العروۃ الوثقیٰ (متوفی ۱۰۷۹ھ) کے مکتوبات میں یہ پڑھا کہ حضرت امام ربانی وہبی طریقہ سے متشابہات کی تاویل پر قادر ہونے کو صحیح مانتے ہیں اور مقطعات کی تفسیر سمجھانے میں انھوں نے بڑی احتیاط برتی کہ اس مجلس میں سوائے خواجہ معصوم کے کوئی دوسرا حاضر نہو۔

یہ میرے اساسی خیالات تھے شاہ ولی اللہ کی حکمت نے اس فکر کی تکمیل کردی، اس کے بعد قرآنی مفاہیم کو میں اطمینانی شکل میں سمجھ سکا، میرے خیال میں شاہ صاحبؒ کا اس فن کو تعلیم و تلقین کے ذریعہ اپنی خاص جماعت میں عام کردینا اس دوسرے ہزار میں ایک بہت بڑی نعمت ہے، شاہ صاحب کے اتباع میں مولانا محمد اسمٰعیل شہید (متوفی ۱۲۴۶ھ) پھر مولانا محمد قاسمؒ اس حصے میں ایک استقلالی شان رکھتے ہیں یعنی اپنے اپنے زمانہ کی اصطلاحات کے مطابق اہل علم کو مطمئن کرسکتے ہیں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو شخص تقدیر کے مسئلہ کو حجۃ اللہ البالغہ کے اصول پر حل نہیں کرسکتا وہ حکمت ولی اللہیہ سے کیا فائدہ اٹھا سکتا ہے، تقدیر کا مسئلہ بیان کرنے میں مولانا محمد قاسم کی بھی وہی شان ہے جو شاہ صاحبؒ کی ہے مگر شاہ صاحبؒ اپنے متبعین کو سمجھاتے ہیں اور مولانا ایک عیسائی، ایک آریہ سماجی کو بھی سمجھا سکتے ہیں۔

جو لوگ ان اصطلاحات کے پابند ہیں جن سے ان مسائل پر غور کرنا کسی راسخ فی العلم کیلئے بھی جائز نہیں ہوسکتا اور ان ہی سے مدارس اور مکاتب بھرے پڑے ہیں، میں نہیں سمجھ سکتا کہ وہ اس زمانہ میں اسلام کیلئے کس قدر مفید ہوسکتے ہیں۔ یہ میری تربیت کا اثر لازم ہے کہ میں اس قسم کے غوامض میں خود رائی پسند نہیں کرتا مگر کسی راسخ فی العلم جماعت سے تعلق بھی پیدا نہ کرنا اور ان مسائل کے متعلق ہر وقت پریشان دماغی میں مبتلا رہنا طالب علم کی شان سے دور جاتا ہو۔

فصل (۶) رسوخ فی العلم کی تشریح

"رسوخ فی العلم" کا مطلب یہ ہے کہ ایسے عالم کے معلومات میں کہیں تناقض نہیں ملتا، جو چیزیں بظاہر متعارض ہیں وہ ایک قاعدے کے اندر اس کی نظر میں جمع ہوجاتی ہیں شاہ ولی اللہ نے مکتوب مدنی کے شروع میں لکھا ہے کہ ہمارے دور کے علوم خاصہ میں سے جو علم کا علم تطبیق آسا ہے، اسی کلیہ کے ماتحت وہ وحدت شہود اور وحدت وجود کی تطبیق اسی رسالہ میں بیان کرتے ہیں۔

لہ خواجہ محمد معصوم کے مکتوبات گو مطبوع ہیں مگر وہ جو دستیاب ہید کیا سکا کوئی نسخہ مجھے دستیاب ہو سکا تاکہ حضرت خواجہ کی اصل عبارت سے مقابلہ کر کے شبہ کیا جاتا۔

لہ شاہ صاحب فرماتے ہیں:۔ نصیبنا فی هذه الدورة من رحمة الله ان یجتمع فی صدورنا علوم علماء هذه الامة معقولها ومنقولها ومکتوفها وینطبق بعضها علی بعض فیضمحل الخلاف بینها ویستقر کل قول فی مقرہ فهذا الاصل منسحب علی فنون العلم من الفقه والکلام والتصوف وغیرها ۱۲ محمد نور الحق العلوی غفرلہ

شاہ رفیع الدین صاحبؒ (متوفی ۱۲۳۳ھ) نے تکمیل الاذہان[1] میں تطبیق الآراء کو ایک مستقل فن بنا دیا۔ یہی مولانا محمد اسمٰعیل شہید "عبقات" میں وجودیہ وذاتیہ اور شہودیہ ظلیہ میں تطبیق کی سعی کرتے ہیں، مولانا محمد قاسم "قاسم العلوم"[2] میں "راسخین فی العلم" کے مابین اختلاف تسلیم ہی نہیں کرتے وہ لکھتے ہیں کہ جیسے دو سلیم الحواس ایک چیز کے دیکھنے سننے میں مختلف نہیں ہوسکتے، اسی طرح دو راسخ فی العلم کسی عقلی، وجدانی مسئلے میں کبھی کبھی مختلف نہیں ہوسکتے جو اختلاف بظاہر نظر آتا ہے وہ فقط صوری ہوتا ہے۔

ان مقالات پر غور سے تامل کرنے کے بعد راسخ فی العلم کے معنے محقق ہوجاتے ہیں، ہم شاہ صاحب کو "راسخین فی العلم" کا امام مانتے ہیں۔

مثال کے طور پر شاہ صاحبؒ کی تحقیقات کا ایک نازک مسئلہ یہاں ذکر کر دیتے ہیں، حضرت شیخ اکبر جو وحدت وجود کے مسئلے کے مسلم امام ہیں، ان کے کلام میں دو مختلف نظریئے ملتے ہیں، ان کی تفصیل مولانا اسمٰعیل شہید کی زبان میں عینیۃ اور ذاتیۃ ہے، یہ اصطلاح "اخبار الاخیار" میں بھی ملتی ہے اور نفحات الانس میں بھی موجود ہے، اہل علم کوئی قطعی فیصلہ نہیں کرسکتے کہ ان مختلف عبارات کا مرجع ومحل کیا ہے جہاں ہر چیز کو وجود کا عین (بالفاظ دیگر واجب الوجود کا عین) کہا جاتا ہے اور پھر وہی عالم (شیخ اکبر) دوسرے موقع پر واجب الوجود اور ممکن الوجود میں فرق کرنے بیٹھ جاتا ہے پھر اس کے بعد تنزل وجود کا اصول تحقیق سے پیش کرتا ہے۔

اب شاہ صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ عینیت، نفس کلیہ پر ختم ہوجاتی ہے، اس تمام تر کائنات کا ایک نفس ہے جیسے ایک شخص کا ایک نفس ہے، اس حقیقت پر ابن عربی کے یہاں بھی پوری بحث موجود ہے اور حکما کے ہاں بھی شاہ صاحب "نفس کلیہ" اور اس کے ماتحت تمام کائنات کو من وجہ ایک دوسرے کا حقیقۃً عین مانتے ہیں، جیسے زید وعمرو اور انسان من وجہ عین ہیں، شاہ صاحب نفس کلیہ کو جنس الاجناس قرار دے

---

[1] حضرت مولانا الشیخ عم فیضہم نے کتاب التمہید کے "موقف سادس" میں موضوع تطبیق پر بحث کی ہے اور اس موضوع کے متعلق ائمہ ثلثہ مولانا شاہ رفیع الدین، مولانا شاہ اسمٰعیل شہید، مولانا محمد قاسم کی تصریحات بسط سے نقل کی ہیں مضمون کی ابتدا میں فرماتے ہیں ولما کان التطبیق بین الاحادیث المختلفۃ، ثم التطبیق بین الاحادیث الصحیحۃ واقوال الفقہاء الحنفیۃ من خواص علوم مشائخنا ائمۃ الطائفتا الدیوبندیۃ والدہلویۃ عموماً ومن اہم علوم شیخنا شیخ الہندؒ خصوصاً وانا لا اقدر علی ایضاح طریقۃ لعامۃ اہل العلم الا بعد اعلامہم بما انتھی الیہ افکار الولی اللّٰہیین فاضطررت الی نقل من کلام الامام رفیع الدین الدہلوی ثم من کلام الصدر الشہید محمد اسمٰعیل الدہلوی ثم من کلام شیخ الاسلام محمد قاسم الدیوبندی ما یتعلق بالباب ۱۲

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "کتاب العبقات" از ص۳ بیں عبقہ ص۲ وص۲۱ ببعد ۱۲

[3] کاش قاسم العلوم کا ایک نسخہ میرے پاس بھی ہوتا ۱۲

محمد نور الحق العلوی غفرلہٗ

ہیں، اُن کے نزدیک جوہر اور عرض دونوں جنسیں نفس کلیہ کے ماتحت آتی ہیں، عام حکماء یونان کا جوہر و عرض سے اوپر جنس مشترک عالی کا نہ ماننا ان کی قصور نظر پر محمول ہے۔[51]

نفس کلیہ کا بطریق ابداع ذات حق سے صادر ہونا، ذات حق کو "وراء الوراء" ثابت کر دیتا ہے نسبت ابداعیہ میں مبدع اور مبدع کے مابین ایک طرح کی وحدت کہی جا سکتی ہے، مگر وہ وحدت حقیقی نہیں ہوتی، انسانی عقل وہاں جا کر تھک جاتی ہے، درجہ ابداع پر پہنچکر عقل کسی امتیاز کو قائم کرنے پر قادر نہیں ہوتی، اس لئے مجازاً وحدت (بین المبدع والمبدع) کا اطلاق کر لیا جاتا ہے۔

اب مسئلہ صاف ہو گیا نفس کلیہ تک کائنات کی عینیت حقیقیہ ہے، اسی لئے صوفیہ بحر اور موج کی مثال دیتے ہیں، اس سے اوپر ایک معلوم الآنیۃ مجہول الکیفیۃ نسبت ہے[52] جسے ابداع سے تعبیر کرتے ہیں عقل کے احاطے سے خارج ہونے کے باعث اسمیں ہر قسم کے مشتبہ الفاظ مجازاً استعمال کئے جا سکتے ہیں، اس قسم کا فیصلہ دینا، اور اسکو محقق طور پر سلیم عقول کے دماغ تک پہنچانا اور تمام متعارض اقوال کی توجیہ پر قادر ہونا ایک راسخ فی العلم امام ہی کی شان ہے۔

فصل (۷) مسئلہ نسخ فی القرآن اور شاہ صاحبؒ

قرآن عظیم میں فکری انتشار کا ایک اور باعث مسئلہ ناسخ و منسوخ کی بحث بھی ہے، اہل علم منسوخ

---

[51] شاہ صاحب "الطاف القدس" میں فرماتے ہیں "فلاسفہ درمیان جوہر و عرض حقیقت مشترکہ اثبات نہ کردہ اند، و نفس کلیہ را حس ای نشمردہ اند، و منشاء آں عدم ظہور نفس کلیہ است نزدیک عقل انسان، شہادت کسے کہ مشہود او علیہ و بہ را شناختہ است یاد نتواں کرد ما خود میدانیم کہ یک حقیقت منبسط مے شود بدو شبح گاہے در کسوت قیام بنفسہ ظہور کند، و کسے بجوہر گردد و گاہے در لباس قیام بغیرہ بر آید و کسے بعرض شود ؎

گہے در کسوت لیلےٰ فرو شد ـــ گہے در صورت مجنون بر آمد

از نیرنگی ہائے ہمیں معنے است تجوہر اعراض در عالم مثال، و عرض شدن جواہر در موطن وہم، و صدق صورت ذہنیہ بر موجود خارجی الی غیر ذالک مما لا یخفی ھ ملخصاً ۱۲

[52] مسئلہ ابداع پر شاہ صاحب نے بدور بازغہ و تفہیمات وغیرہ کتب میں بحث کی ہے "الطاف القدس" میں ۱۰۵ سے ۱۰۹ تک مفصل بحث کی ہے، فرماتے ہیں "درمیان مبدع و مبدع نسبتے واقع است کہ نظیر آن در شہادت موجود نیست یا دہ نیست تا تحقق مبدع در مادہ بود، و ازیں جہت انفرازے و استقلالے پیدا کند، و وحدت نیست کہ سابق و لاحق بتقدم و تاخر زمانی از ہم ممتاز شود الی ان قال پس محقق در مسئلہ ابداع آن است کہ نسبتے است معلوم الآنیۃ و مجہول الکیفیۃ الخ ۱۲

محمد نور الحق غفر لہ العلوی

آیات کو متفقہ طور پر محدود و محصور نہیں کرتے یعنی ایسی آیات کی تحدید میں وہ خود باہم مختلف ہیں اس کا اثر قرآن شریف پڑھنے والے پر یہ پڑتا ہے کہ وہ ہر عملی معاملے (حکم) میں اسکے منسوخ ہونے کا شبہ پیدا کرکے اپنے آپ کو فارغ الذمہ بنا لیتا ہے ۔

شاہ صاحب کے رسوخ فی العلم کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ آپ نے نسخ فی القرآن کے مسئلہ کو اطمینان بخش طریقے سے حل کر دیا۔ "الفوز الکبیر" میں اس کی مفصل بحث موجود ہے، شاہ صاحب نسخ کا لغوی ترجمہ متقدمین کی اصطلاح کو مانتے ہیں، متقدمین جب کسی آیت کو منسوخ کہیں گے تو ان سے اُن کی مراد کوئی خاص اصطلاحی معنی نہیں ہونگے، بلکہ لغوی مفہوم جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے وہی ان کی مراد ہوتا ہے، اگر کوئی مضمون ایکدفعہ مطلق یا مجمل بیان کر دیا جائے اور دوسرے موقع پر مطلق کی قیود واضح کر دیجائیں، یا اجمال کو تفصیل سے بدل دیا جائے تو لغوی طور پر دونوں جگہ کہا جائے گا کہ دوسرے مضمون نے پہلے کو منسوخ کر دیا۔

اس اعتبار سے بے شک قرآن کی آیات میں کثرت سے نسخ موجود ہے کی سورتوں میں عموماً اصول اور کلیات محقق کئے جاتے ہیں، اور مدنی سورتوں میں ان کی تشریح اور تفصیل آتی ہے - ایک قوم کو تدریجی ترقی دینے والا کوئی استاد اس طریق بیان سے بچ نہیں سکتا۔ اس تبدیلی کو جو قطعاً طبعی ہے معیوب نہیں سمجھا جا سکتا اور نہ اس سے شکوک پیدا ہوتے ہیں - پھر متقدمین کے بعد متاخرین[۵۷] آتے ہیں - وہ نسخ کا ایک خاص مطلب معین کر لیتے ہیں -ان کے نزدیک جیسے توراۃ کے تفصیلی احکام پر عمل کرنا قرآن کے تفصیلی اوامر کے بعد ممنوع ہے، اسی طرح قرآن میں بعض ایسی آیتیں موجود ہیں جن پر عمل کرنا مطلقاً جائز نہیں ۔

یہ اصطلاح فقہا کے باہمی اختلاف اور تضارب کے بعد پیدا ہوئی، شاہ صاحبؒ اس اصطلاح پر قرآن میں منسوخ نہیں مانتے ----- لیکن واضح رہے کہ شاہ صاحبؒ کا بیان اس فصل میں حکیمانہ ہے، تو وہ کل تمام حالت کو مدنظر رکھکر انھوں نے اس مسئلہ کو تدریجاً سمجھانے کی سعی کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ پہلے اہل پانچسو آیتیں منسوخ مانتے تھے لیکن شیخ جلال الدین سیوطی اتقان میں بیس سے زیادہ آیتیں منسوخ

---

[۵۶] پوری بحث کے لئے دیکھو فوز کبیر طبع مجتبائی دہلی از صفحہ ۲ تا ۱۲

[۵۷] فوز کبیر کی اصل عبارت حسب ذیل ہے "متقدمین (بنابر اصطلاح خود) عدد آیات منسوخہ بپنج صد رسانیدہ اند و اگر نیک بنگری غیر محصور است، اما آنچہ باصطلاح متاخرین منسوخ است عدد قلیل بیش نیست لاسیما بحسب توجیہی کہ ما اختیار کردہ ایم شیخ جلال الدین سیوطی در کتاب اتقان بعد از آنکہ از بعض علماء آنچہ مذکور شد به بسط تقریر نمود، آنچہ برائے متاخرین منسوخ است بر وفق شیخ ابن عربی تحریر کردہ قریب به بیست شمردہ، فقیر را در اکثر آں بیست نظر است، الی ان قال، قلت. وعلی ما حررت لا یتعین النسخ الا فی خمس ایات ۵ فوز کبیر

[illegible]

تسلیم نہیں کرتے اس بارے میں سیوطی کا مقتدا اور شیخ قاضی ابوبکر (محمد بن عبداللہ المعروف بہ) ابن العربی مالکی (متوفی ۵۴۳ھ) ہے، شاہ صاحب مذکورہ بالا بیس آیتوں میں بھی تطبیق دے کر نسخ کو پانچ آیتوں میں منحصر کر دیتے ہیں، اس کے بعد ہماری رائے یہ ہے کہ جس شخص نے ان پندرہ آیتوں کی تطبیق غور سے پڑھی وہ باقی ماندہ پانچ آیتوں میں بھی بآسانی تطبیق دے سکتا ہے، شاہ صاحب صراحۃً یہ نہیں کہتے کہ قرآن شریف میں کوئی آیت منسوخ نہیں اور وہ اس طرح صراحۃً لکھتے تو بعض معتزلہ کے قول سے تشابہ ہو جاتا اور عامہ اہل علم اس پر غور کرنا ہی چھوڑ دیتے[1]

اب صورت حال یہ ہے کہ مشکل آیتوں کو تو انھوں نے حل کر دیا اور نہایت آسان آیات میں نسخ مان لیا اگر اسلوب حکیم پر ان کے بیان کو حمل کیا جائے تو ہمارا مذکورہ بالا نتیجہ اخذ کرنا بعید نہیں ہوگا۔

ان پانچ آیات میں جو سب سے زیادہ مشکل ہے ہم اس کو یہاں مثالاً بیان کر دیتے ہیں قال الامام ولی اللہ. کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت الایہ. قلت منسوخۃ بآیۃ یوصیکم اللہ فی اولادکم وحدیث لا وصیۃ لوارث مبلغ للنسخ (الفوز الکبیر ص)

اگر وارثوں کے ایسے حالات نہوتے جنمیں وہ غیر وارث بھی بن سکتے ہیں تو اس کی توجیہ ناممکن ہوتی۔ والدین خصوصاً ایسی حالت میں ہیں کہ وہ غیر وارث نہیں ہوتے، لہذا ان کے حق میں وصیت قطعی طور پر منسوخ ہونی چاہئے۔ اور آیت مذکورہ بالا میں مکتوبہ وصیت والدین کے لئے ہے، اس لئے شاہ صاحب نے آیت مذکورہ کو قطعی طور پر منسوخ مان لیا، مگر میرے شخصی حالات ایسے تھے جن سے مجھے تنبہ ہوا، میری والدہ غیر مسلمہ میرے ساتھ موجود تھی، میں بیمار ہوا تو مجھے اس کی فکر لاحق ہوئی کہ اگر میں مرجاؤں تو اس بیچاری کو کوئی نہیں پوچھے گا، اس وقت اس کی جسقدر خاطر تواضع کی جاتی ہے وہ میری وجہ سے ہی میرکو مرتے ہی یہ محروم ہو جائیگی، اب مجھے وصیت کا مطلب سمجھ میں آیا، کہ اگر حالات ایسے درپیش ہوں تو وصیت لازم ہے بنابریں کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت پر عمل کرنے کی ایک صورت نکل آئی اسلئے اسکو منسوخ کہنے کی ضرورت ہی نہیں اطلاق کو تطبیق کی خاطر مقید بشک کر لیجئے، یہ توفقہ قرآنی کا بہت بڑا وسیع باب ہے۔ علیٰ ہذا القیاس باقی ماندہ چار آیتوں میں تطبیق بہت آسان ہے وہ اولی غیر اولی عزیمت رخصت پر حمل کرنے سے حل ہو جاتی ہیں۔

میں اپنی سمجھ کے موافق شاہ صاحب کے بیان کو ایک حکیمانہ طرز بیان سمجھتا ہوں، میں اسے قبول نہیں

---

[1] قال الامام عبدالقاہر البغدادی زعم بعض القدریۃ من اہل عصرنا انہ لیس فی القرآن آیۃ منسوخۃ ولا آیۃ ناسخۃ وھو ابومسلم الاصبہانی الخراسانی ہ ص (راجع ترجمتہ فی الاعلام لخیر الدین الزرکلی) محمد نورالحق غفرلہ

کر سکتا، کہ جس امر پر مجھے تنبہ ہوا۔ شاہ صاحب کی نظر ادھر جا ہی نہ سکتی تھی، اور باقی جابجا آیتوں کی مثالیں میرے مطلب کی شواہد ہیں، وہاں انھیں قواعد سے بآسانی تطبیق ہو سکتی ہے جنکو وہ دوسری آیات میں استعمال کر رہے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ ذہنیت عامہ کو منتشر نہ کرنے کے لئے شاہ صاحب نے یہ طریقہ اختیار کیا ہی اسکی مثال مسوی[1] میں بھی ایک جگہ ملتی ہے، فرماتے ہیں کہ بعض اوقات غیر مطہر چیز کو شارع مطہر کے درجے پر رکھدیتا ہے اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ چیز جس کی تطہیر زیر بحث ہی نجس ہی نہیں ہی مگر چونکہ دیکھا جاتا ہی کہ نجاست کی نفی سے ذہنیت عامہ ابا کریگی اس لئے ایک غیر مطہر چیز کو کہدیا جاتا ہے کہ "لیطهره ما بعده"

فصل (۸) شاہ صاحب اور مقصد قرآن کی تعیین

قرآن شریف کا مقصد معین کرنیکے لئے "حجۃ اللہ"[2] کا باب "الحاجۃ الی دین ینسخ الادیان" پڑھنا چاہئے۔ اس کے بعد "ازالۃ الخفا"[3] میں "ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق الایۃ" کی تفسیر پڑھنا ضروری ہے یہ تفسیر شاہ صاحب کے نوادر میں سے ہے یہ مسئلہ [تعیین مقصد قرآن] بہت بڑی اہمیت کا مالک ہی کہ پہلے تمام ادیان پر اس دین کو فوقیت دینا کیوں ضروری ہے؟ پھر آیا اس کا تحقق بھی ہوا یا محض ایک امید افزا خیال ہے، دونوں کتابوں کے مذکورہ بالا دو مباحث [باب "ینسخ الادیان"، اور تفسیر ھو الذی ارسل رسولہ الخ] کے پڑھنے کے بعد مذکورہ بالا ہر دو سوالوں کا تشفی بخش جواب مل جاتا ہے، اور اس سے قرآن شریف کی حکمت اساسی طور پر متعین ہو جاتی ہے، پھر اس کی مزید توضیح آپ کو حجۃ اللہ البالغہ[4] کے باب "اقامۃ الارتفاقات" میں ملیگی۔ اس مقصد [وجہ غلبۂ دین حق اور اسکا وقوع] کو تشخیص اور تعیین سے محفوظ کرنے کے بعد اسلام کی حقیقت روشن ہو جائیگی۔

---

[1] مسوی کی عبارت حسب ذیل ہی۔ ان ام ولد لابراہیم بن عبد الرحمان بن عوف سالت ام سلمۃ زوج النبی صلعم فقالت انی امراۃ اطیل ذیلی و امشی فی المکان القذر فقالت ام سلمۃ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یطھرہ ما بعدہ ۔ قلت فی المنھاج طین الشارع المتقین نجاستہ یعفی منہ عما یتعذر الاحتراز عنہ غالبا و یختلف بالوقت و موضعہ من الثوب والبدن، وفی الھدایۃ عن محمد انہ لما دخل الری و رای البلوی فی الازوات افتی بان الکثیر الفاحش لا یمنع الصلاۃ و قاسوا علیہ طین البخاری ۔ مسوی ج ۱ ص ۴۳ طبع مکہ مسئلہ تفصیل کیلئے مصفی ص ۲۳ دیکھو ملاحظہ ہو ۔ ۱۲

[2] حجۃ اللہ طبع مصر ص ۹۵ ۱۲

[3] دیکھو ازالۃ الخفا طبع ہند ص ۴۴ ۱۲

[4] حجۃ اللہ طبع مصر ص ۴۲ ۱۲

محمد نور الحق العلوی غفرلہ

فصل (۹) شاہ صاحب کی حکمت کی اساس و بنیاد

مذکورہ سابق مقصد قرآنی کو ہم شاہ ولی اللہ کی حکمت کی اساس مانتے ہیں جب کبھی ہم فلسفہ ولی اللّٰہی کہیں گے تو اس سے یہی مراد ہوگا۔ اس فلسفے کی تاریخ ارتقائی دنیا کی تکوینی ترقی کے ساتھ ساتھ تاویل الاحادیث" میں ملیگی، آدم علیہ السلام کے زمانے میں جو شرائع مقرر تھے وہ اسی فلسفے کے ماتحت تھے اور اس زمانے کی حاجتوں کو پورا کرتے تھے جس قدر انسانیت ترقی کرتی گئی، اسی قدر اس فلسفے کی تفریعات میں بھی اضافہ ہوتا گیا، ابراہیم سے پہلا دور (یعنی حنیفیت سے پیشتر کا دور) صابئین کا ہے تاویل الاحادیث میں اس دور کی (جس میں آدم، ادریس و نوح تا قبل ابراہیم علیہم السلام داخل ہیں) پوری تشریح ملیگی، ادریس علیہ السلام ہی طبعیات، ریاضیات، الہیات کے بانی سمجھے جاتے ہیں حکمت کے ان اقسام کا مرکز بدلتا رہا کبھی ہند کبھی ایران کبھی یونان، اس کے بعد ابراہیمی دور آئیگا، حنفا اسی فلسفے کی شکل کو دوسرے رنگ میں بدل دینگے، اس تبدیلی کے اسباب کیا تھے؟ اور تبدیلی کس شکل میں ہوئی؛ اس کی تفصیل "تاویل الاحادیث" میں ملیگی، اس اہم مسئلے کے حل کرنے پر انسانیت کی حقیقت مشخص ہوگی، فلسفہ وہی ہے جو دور صابئین میں تھا اس کی تشریعی صورت بدل جاتی ہے؎

دم بدم گر شود لباس بدل | مرد صاحب لباس را چہ خلل

ہمارے حکماء اسلام اس مسئلے میں بہت تھوڑی بحث پر اکتفا کرتے رہے اس لئے وہ "سورۂ انعام" کو کبھی قابل اطمینان طریقے سے حل نہیں کرسکے، شاہ صاحب کی کتابیں عموماً اور "تفہیمات الٰہیۃ و بدور بازغہ" خصوصاً اس مسئلہ کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے بار بار پڑھنی چاہئیں[۲]

الامام کا لقب اور شاہ صاحبؒ ہم نے امام کا لفظ شاہ ولی اللہ کے منصب میں اسی ضرورت کیلئے اضافہ کیا ہے کہ یہ اہم مسئلہ ہمیں کوئی پہلا امام نہیں بتلاتا، اگر ہم شاہ صاحبؒ کو امام مان لینگے تو دوسرے لفظوں میں اس مسئلہ کی اہمیت اصلی شان میں طلبہ کے سامنے آجائیگی۔ انھیں غور کرنا پڑیگا کہ شاہ صاحب کیوں امام کہلاتے ہیں تو اس خصوصیت کی طرف آسانی سے توجہ مبذول ہوسکتی ہے، "تاویل الاحادیث" میں ابراہیم علیہ السلام سے لے کر سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیا کی زندگی کو

---

[۱] یہ ممالک صابیت کا مرکز تھے، جس کی دعوت ادریس علیہ السلام سے منسوب ہے، صابیت کے بعد حنیفیت ہے جس کے داعی اول ابراہیم علیہ السلام ہیں - ۱۲

[۲] تفہیمات الٰہیہ ص۲۶ و ص۲۸ و ص۴۲ و تفہیم علم مقامات الملاء الاعلیٰ ص۹ نسخہ خطیہ، و بدور بازغہ ص۱۸ بعد و ص۱۹ بعد ملاحظہ ہوں۔
محمد نور الحق غفرلہ العلوی

تدریجی ترقی کے اصول سے موجہ بنایا گیا ہے۔

یہاں ہمیں یہ امر واضح کر دینا چاہیئے کہ کسی مفکر کا اس سلسلہ بیان میں کسی خاص حصے سے اختلاف کرنا ہمارے نزدیک کوئی معیوب بات نہیں ہم شاہ صاحب کی امامت کو اس تسلسل تاریخی میں منحصر کرنا چاہتے ہیں ہمیں کوئی بڑا امام ایسا نظر نہیں آتا کہ جن انبیاء کا ذکر قرآن شریف میں ہے انکی تاریخ کو کسی فلسفے کے ماتحت مرتب کر دے، یہ خصوصیت خدا تعالےٰ نے شاہ صاحب کے لئے ودیعت رکھی ہوئی تھی، ہماری رائے یہ ہے کہ شاہ صاحبؒ کی اس حکمت کو محققانہ سمجھنے کے بعد اگر قرآن عظیم تحت اللفظ پڑھا جائیگا، تو وہ کسی زائد تفسیر کا محتاج نہیں ہوگا۔

فصل (۱۰) مضامین قرآن کا ظاہری انتشار اور شاہ صاحبؒ

یہاں تک جس قدر بحث قرآن عظیم کے متعلق شاہ صاحب کی کتابوں سے ذکر کی گئی، اس کا موضوع قرآن کے مواد خمسہ[1] کی عقلی تشریح ہے، قرآن نے ان مضامین کو ایک خاص طریقے سے بیان کیا ہے، مضامین مختلف سورتوں میں منقسم ہیں، سورتوں کے مضامین میں ایک ربط جیسا کہ علمی کتابوں کی شان ہے نظر نہیں آتا، مولوی شبلی مرحوم کی زبان میں اُسے مختلف پھولوں کا ایک ڈھیر کہا جا سکتا ہے، شاہ صاحب حکمت بیان کرتے وقت اس موضوع (ربط آیات) پر مطلق توجہ نہیں کرتے وہ فرماتے ہیںؒ اُمی قوم کی تفہیم کیلئے ان کی عادات کے مطابق خود ان کے محاورات میں قرآن نے اپنے مقاصد واضح کر دیئے، تکرار ہو یا اطناب اس سے بچنے کی کبھی سعی نہیں کی، مخاطبین کو عالم بنا دینا مقصد ہے، اس میں قرآن کامیاب ہو گیا ایک حکیم کی نظر میں اگر ایک علمی کتاب اس طرح سوسائٹی کو بلند کر دیتی ہے تو وہ تناسب آیات کی زیادہ ضرورت نہیں سمجھے گا۔ الفوز الکبیر میں شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں" بیان این علوم بروش تقریر عرب اول واقع شدہ نہ بروش تقریر متاخران، پس مناسبت در انتقال از مطلبے بمطلبے رعایت نکرد، بلکہ آں چہ القائے آں بر عباد خود مہم

[1] حضرت مولانا الشیخ عم فیضہم نے ایک درسی مجلس میں شاہ صاحبؒ کی طرف سے توجیہ کرتے ہوئے مجھسے ارشاد فرمایا کہ شاہ صاحب مذکورہ بالا مضامین خمسہ میں ترتیب ربط کے قائل نہیں ہیں مثلاً احکام مرتباً ایک جگہ مذکور ہوں، پھر مخاصمہ کسی خاص ترتیب سے یک جگہ بیان ہو۔ بعدہ تذکیر بالآء اللہ مرتباً۔ اس کے بعد تذکیر بایام اللہ نسقاً وعلیٰ ہذا القیاس، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آیا آیات وسور میں ربط کا انکار کرتے ہیں، سورۂ بقرہ رکوع "یابنی اسرائیل" کا حاشیہ ملاحظہ ہو۔ مترجم گوید ازیں جا تا سیقول السفہاء خدائے تعالیٰ اشارات میفرماید بنبوت پیغمبر ما صلی اللہ علیہ وسلم از قصہ دعا حضرت ابراہیم کہ در تورات مذکور است و ترجیح میدہد بملت حنیفیہ کہ پیغمبر ما برائے آں مبعوث شدہ بود، میکند قول یہود را کہ حضرت یعقوب بیہودیت وصیت کردہ است و از تفریق در انبیا نہی میفرماید یعنی معتقد بعضے باشند منکر بعضے (فتح الرحمان: دیکھا! کس طرح ایک طویل مضمون کو چند الفاظ سے مرتبط کر دیا ۱۲ محمد نور الحق العلوی غفرلہ

دانست، آں را بشر فرمود، ہرچہ مقدم شود گوشود و ہرچہ مؤخر شود گو شود۔ تمت

فصل (۱۱) ربط آیات اور شاہ ولی اللہ

مگر یہ نہ سمجھا جائے کہ شاہ صاحب قرآن کی ادبی لطافت (نسق آیات) پر نظر نہیں رکھتے، ان کا مطلب فقط یہ ہے کہ سب سے پہلے مطالب پر غور کرنا چاہیے، جسے اکثر مفسرین فراموش کر چکے ہیں، علوم بلاغت اور اس کے توابع میں ہمارے متاخرین نے کوتاہی نہیں کی، مگر چونکہ حکمت کے اصول پر مطالب کو ذہن نشین کرنے کی طرف توجہ نہیں کر سکے، اس لئے ان کی ادبی موشگافیاں عقلمندوں پر زیادہ موثر نہیں ہوتیں، جب شاہ صاحب اصل مطلب سے فارغ ہو جاتے ہیں تو نمونہ کے طور پر ربط آیات پر توجہ دلاتے ہیں کوتاہی نہیں کرتے جیسے سورہ بقرہ کی آیت "یا بنی اسرائیل" کے حاشیہ سے ظاہر ہے۔ ان کے بعد شاہ عبدالعزیز آئے، انھوں نے فتح العزیز میں ربط آیات پر التزام سے بحث کی، اور اس فن کو ظاہر کرنے میں شاہ صاحب کی اتباع میں سے آپ نے حقیقت کی۔

میری توجہ شروع سے اس فن (ربط آیات و سور) کی طرف منعطف رہی بعض بعض لطیف نکتے سمجھ میں آنے لگے، میں نے مولانا شیخ الہند سے جب ذکر کیا، تو حضرت نے بعض نادر فوائد تلقین فرمائے مثلاً ایک غزوہ کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کے اندر ربوا کا مسئلہ آگیا ہے، حضرت مولانا نے اس کا ایک لطیف ربط[1] بتایا جو تفسیروں میں نہیں ملتا، مولوی احمدی صاحب نے مجھ سے سن کر اپنے حاشیہ میں نقل کر دیا ہے، اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں کہ جن لوگوں نے ربط آیات پر بحث کی اسقدر سرسری مضمون لکھتے ہیں کہ اس سے کہیں بہتر تھا کہ نہ لکھتے، حضرت خود اس طرف زیادہ توجہ نہ دے سکے کہ یہ مسئلہ ان کا زیادہ وقت لیتا تھا۔

میں اس فن کی طرف قاضی ابوبکر بن عربی کا ایک مقولہ کتاب الاتقان میں پڑھنے کے بعد متوجہ ہوا وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے ربط آیات کے بحث میں علوم جمہ ستر پائے، مگر لوگوں کو اسکا طالب نہ دیکھا اس لئے توجہ ہٹالی[2] میں خود تقریباً چالیس برس سے اس مسئلے پر غور کرتا رہا ہوں، عموماً ان مقاصد قرآنیہ کو پیش نظر

[1] حضرت مولانا الشیخ عم فیضہم نے نظارۃ المعارف دہلی میں اس آیت کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا۔ صحابہ کرام نے جب احد میں شہیدوں کی حالت دیکھی تو کہا لنربین، یعنی ہم زیادتی سے بدلہ لیں گے اس پر خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ جب معمولی معاملوں میں تم ربوا اور زیادتی کو ناجائز قرار دے چکے ہو جیسے سورہ بقرہ میں گزرا، ان الذین یاکلون الربوا لا یقومون (الخ) تو یہاں پھر زیادتی کو کیسے جائز قرار دیتے ہو "اضعافا مضاعفۃ" کا یہ مطلب لینا کہ ربوا کھانا تو جائز ہے مگر اضعافا مضاعفۃ حرام ہے بالکل غلط ہے۔ کیونکہ ربوا کی حرمت سورہ بقرہ میں صاف طور پر واضح کر دی گئی ہے۔ انتہی بکلماتہ الشریفۃ ۱۲

[2] قال ابوبکر بن العربی فی سراج المریدین، ارتباط آی القرآن بعضہا ببعض حتی تکون کالکلمۃ الواحدۃ متسقۃ المعانی منتظمۃ المبانی علم عظیم لم یتعرض لہ الا عالم واحد عمل فیہ سورۃ البقرۃ، ثم فتح اللہ لنا فیہ فلما لم نجد لہ حملۃ ورأینا الخلق باوصاف البطلۃ

رکھکر جو شاہ صاحب کی حکمت میں معین ہوئے آیک ایک سورت کو ایک خاص موضوع اور معین مضمون کے لئے مقرر کر کے تسلسل قایم کرنے پر کامیاب ہوا مجھے کسی دوسرے حکیم کا قرار دادہ مضمون سلسلہ کلام الٰہی سے استنباط کرنیکی ضرورت نہیں ہوئی میں معانی کو شاہ صاحب کی حکمت سے باہر جانے نہیں دیتا۔ عام مفسرین سے جہاں کہیں اختلاف کرونگا وہ شاہ صاحب کے اصول سے تشبث کے تحت میں ہوگا۔ بعض ایسے مواقع بھی ملیں گے کہ میری سند مولنا شاہ عبد العزیز، اور شاہ رفیع الدین اور مولنا محمد اسمعیل شہید اور مولنا محمد قاسم کے کلام میں ملیگی شاذ و نادر باتیں ایسی ہونگی، جو خود میرے فکر کا نتیجہ ہیں میں ایسے موقع پر صراحتہً بتا دیا کرتا ہوں کہ یہ میری سوچی ہوئی بات ہے اسکا رد و قبول ہر وقت سامع کے اختیار میں ہے مگر جن چیزوں میں ائمہ اور اساتذہ کی سند موجود ہے میرا جی چاہتا ہے کہ اہل علم تناسب آیات میں توجہ کریں اور انکی تقلید سے ابا نہ کریں۔

فصل (۱۲) قرآن اور سنت کے باہمی تعلق کی بارہ میں شاہ صاحب کی علمی رائے

عام اہل علم قرآن شریف کے ساتھ سنت اور اجماع کو ادلہ شرعیہ میں شمار کرتے ہیں، شاہ ولی اللہ صاحب سنت کو قرآن سے مستنبط چیز مانتے ہیں لیکن اس استنباط کا طریقہ وہ نہیں ہے جو ائمہ فقہا میں مروج ہے بلکہ حکمت کے اصول پر استنباط کرنے کے طریقے اور ان کے اصول شاہ صاحب کے یہاں علیحدہ مقرر ہیں[1]۔ "خیر کثیر" میں اس مسئلہ کی انھوں نے تفصیل لکھدی ہے، اس طرح پر اگر سنت کو مانا جائے تو قرآن کے استقلال پر کوئی زد نہیں پڑیگی۔

فصل (۱۳) اجماع کا تعلق اور استناد قرآن سے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے خلافت راشدہ کے آخری وقت تک یعنی شہادت عثمان

(بسلسلہ صفحہ گزشتہ) ختمنا علیہ وجعلناہ بیننا وبین اللہ ورددنا الیہ ۵ وقال غیرہ اول من اظہر علم المناسبۃ الشیخ ابوبکر النیسابوری وکان یزری بعلماء بغداد لعدم علمھم بالمناسبۃ ۔ وقال الشیخ ولی الدین الملوی قد وھم من قال لا یطلب للآی الکریمۃ مناسبۃ لانھا علی حسب الوقائع المتفرقۃ وفصل الخطاب انھا علی حسب الوقائع تنزیلا وعلی حسب الحکمۃ ترتیبا وتاصیلا فالمصحف علی وفق ما فی اللوح المحفوظ مرتبۃ سورہ کلھا وآیاتہ بالتوقیف کما انزل جملۃ الی بیت العزۃ ومن المعجز البین اسلوبہ ونظمہ الباھر والذی ینبغی فی کل آیۃ ان یبحث اول کل شیء عن کونھا مکملۃ لما قبلھا او مستقلۃ ۔ ثم المستقلۃ ما وجہ مناسبتھا لما قبلھا ففی ذلک علم جم وھکذا فی السور یطلب وجہ اتصالھا بما قبلھا وما سیقت لہ ۵ قال الامام الرازی فی سورۃ البقرۃ ومن تامل فی لطائف نظم ھذہ السورۃ وفی بدائع ترتیبھا علم ان القرآن کما انہ معجز بحسب فصاحۃ الفاظہ وشرف معانیہ فھو ایضا معجز بسبب ترتیبہ ونظم آیاتہ ولعل الذین قالوا انہ معجز بسبب اسلوبہ ارادوا ذلک الا انی رأیت جمہور المفسرین معرضین عن ھذہ اللطائف والاسرار ۵ اتقان ج ۲

[1] اسکی سند شاہ صاحب کی عبارت میں مجھکو نہیں ملی۔ حضرت نے فرمایا شاید فوز کبیر میں ہے فلیراجع ۱۲ ۔ دیکھو فوز کبیر مذکورہ سیاق تفصیل وہاں مذکور ہے۔ نور الحق

(۳۵ھ) تک شاہ صاحب کی تحقیق میں مسلمانوں میں کبھی اختلاف نہیں ہوا۔ اس دور کو وہ دور اجماع کہتے ہیں اس کی تفصیل "ازالۃ الخفا" میں مذکور ہے شہادت عثمان کے بعد اختلاف شروع ہوا اب اجماع وہی مستند ہوگا جو مذکورہ دور اول کے تتبع میں منعقد ہو، شاہ صاحب اسی دور کو خیر القرون قرار دیتے ہیں: اس کی پوری تفصیل "ازالۃ الخفا"[1] میں موجود ہے ایسے ساری دنیا جانتی ہے کہ اس زمانے میں مسلمانوں کا مستند سوائے قرآن عظیم کے کوئی اور لکھی ہوئی چیز نہیں تھی اس پر یہ جماعت اپنے پارٹی پالیٹکس کے نظام کو ملحوظ رکھتے ہوئے عمل کرتی تھی، اس پارٹی کی سینٹرل کمیٹی کیطرف اشارہ ہے قرآن حکیم کی ذیل کی آیت میں السابقون الاولون من المہاجرین والانصار والذین اتبعوھم باحسان رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور تعلیم سے جو جماعت قرآن پر عمل کرنے کے لئے تیار ہوئی اس کا وہ مرکزی حصہ جسکا ہر قول و فعل خدا تعالےٰ کے ہاں پسندیدہ ہے وہ مہاجرین اور انصار کا پہلا طبقہ تھا۔ اس کی اتباع قرآن پر عمل کرنے کے لئے قیامت تک مسلمانوں کے لئے ضروری ہے، جو چیز اس زمانہ میں متعین ہوگئی۔ اس کو اسی شکل میں اور اسی معنے میں قایم رکھنا اتباع بالاحسان ہے، زمانے کے تغیرات سے جو نئی چیز قابل بحث پیش آئے وہاں اس جماعت متبعین بالاحسان کا فیصلہ ماننا ضروری ہوگا یہ اس دور کے مابعد کے اجماع کا حاصل ہے، اسطرح اجماع قرآن کی حکومت قایم کرنیوالی جماعت کے متفقہ فیصلے یا اغلبیت کے فیصلوں کا نام ہوگا، لہذا اجماع قرآن سے علیحدہ کوئی نئی چیز نہیں ہے، بلکہ اجماعیات قرآنی اصول کے تشریحی بائیلاز ہونگے۔ اس سے کوئی ترقی کن جماعت، جو زمانہ کے طویل عرصہ میں کام کرے، خالی نہیں ہوسکتی، اس طرح اجماع بھی قرآن کے مقابل ایک مستقل اصل نہ بنا۔ بلکہ قرآن کی حکومت قایم کرنے والی جماعت کے اتفاق کا نام ہوا۔ اس طور سے مسلمانوں میں قرآن کے مستقل درجہ کا تعارف کرانے والی شخصیت امام ولی اللہ دہلوی ہیں[2]۔

---

[1] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو ازالۃ الخفا ص۸ و ص۱۱ و دیگر مواضع ۱۲

[2] حضرت مولانا الشیخ عم فیضہم نے ۱۱ اگست ۱۹۴۰ء کو تفسیر سورۂ والنجم میں مجھ سے ارشاد فرمایا، علماء اصول فقہ کہتے ہیں کہ اصول دین چار ہیں کتاب و سنت و اجماع و قیاس درحقیقت یہ تعبیر صحیح نہیں، کیونکہ قیاس تو وہی معتبر ہے جو اصول ثلاثہ سے مستنبط ہو، باقی رہے تین اصول سو ہمیں بڑی محنت کے بعد معلوم ہوا کہ ساری سنت قرآن سے مستنبط ہے خیر کثیر میں اس کی تصریح موجود ہے، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء ثلثہ کے متفق فیصلے کے بغیر کوئی عمل مستند نہیں ہے کیونکہ حضرت علی کے عہد میں خیر الامم سے مشورہ کا جوہر کھو گیا تھا لہذا اجماع کا مدار بھی کتاب و سنت پر ہوا، بنا بریں اصل ہے فقط کتاب اللہ تو ما ینطق عن الھویٰ، ای ما ینطق بالقرآن عن الھویٰ، ہمارا رسول دین کے معاملہ میں کوئی ہوائی بات نہیں کہتا، ذاتی خواہش کو اس میں کچھ دخل نہیں، اور دین قرآن میں منحصر ہے اور قرآن ہی دین کا

باب سوم، علم حدیث

شاہ ولی اللہ سنت کے تمام ابواب کو قرآن عظیم سے مستنبط مانتے ہیں، مگر انبیا کے اصول استنباط کو امہ

(بسلسلہ صفحہ سابق)

قانون اساسی ہے یہاں ماینطق سے مطلق نطق مراد رکھکر وحی متلو اور غیر متلو کو ملا دیا گیا ہے ہمارے یہاں یہ پسندیدہ نہیں بلکہ مطلق نطق بالقرآن مراد ہے،

واضح رہے کہ جب اساسی قانون پر عملدر آمد شروع ہوتا ہے تو مخاطبین کی حالت کے مطابق چند تمہیدی قوانین بنائے جاتے ہیں، فرق یہ ہوتا ہے کہ قانون اساسی غیر متبدل ہوتا ہے اور تمہیدی قوانین ضرورت کے وقت بدل سکتے ہیں، ہم سنت ان تمہیدی قوانین کو کہتے ہیں جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد خلفاء ثلثہ نے مسلمانوں کی مرکزی جماعت کے مشورے سے تجویز کئے، خلافت عثمانیہ کے بعد یہ نظام ٹوٹ گیا کہ تمام کام شورے سے کئے جائیں۔

(تنبیہ) واضح رہے کہ ارشاد "وشاورھم فی الامر" میں صیغہ امر وجوب کے لئے ہے جن لوگوں نے امر استحبابی بنایا ہے۔ ان کی تغلیط، امام ابوبکر جصاص رازی (متوفی ۳۷۰ھ) کی تفسیر "احکام القرآن" میں مفصلاً موجود ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو جماعت اس قرآن پر عمل کرنے کیلئے اولین بار پیدا ہوئی جنکو "السابقون الاولون من المهاجرین والانصار" کہا جاتا ہے ان کے مشورہ سے قانون تمہیدی بنانا یہ سنت ہے، سنت کو ہماری تعبیرات حنفیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین میں مشترک مانتے ہیں اور یہی ہماری رائے ہے۔ اور یہ سنت قرآن ہی سے پیدا ہوئی آجکل کی اصطلاح میں اسکو "بائی لاز" کہا جاتا ہے جیسے "تعزیرات ہند" اصل ہے اور "ضابطہ فوجداری" بائیلاز اول قانون ہے۔ اور دوسرا اسکی تفصیل ہے (اجماع) مشورہ سے کثرت رائے سے بحث سے جو فیصلہ ہو وہ اجماع ہے (خلاصہ) سنت کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ حضورؐ نے کچھ ارشاد فرمایا یا کیا اور سب نے اسکو تسلیم کر لیا۔

(قیاس) اپنے زمانے کی ضرورتوں کے پیش نظر بائیلاز تیار کر لینا یہ قیاس کہلاتا ہے، حضرت عثمانؓ کے بعد جو بائیلاز تیار کرنے والے حضرات کو "والذین اتبعوھم باحسان" کہا جاتا ہے، اصل قانون اساسی متعین ہے۔ بائیلاز اسوقت اور بھی اسوقت اور جنہیں زمانہ کے اقتضاآت کے مطابق فروعی تبدیلیاں ہونگی نئی نئی پیش آمدہ صورتوں کے متعلق تفصیلی احکام کا استخراج ہوگا اور اسکا نام فقہ ہے، ان ھو الا وحی یوحی ، ان ھو ای القرآن (فتح الرحمان)۔

بعض حضرات "ھو" کی ضمیر آنحضرتؐ کے مطلق نطق کی طرف راجع کرتے ہیں۔ تاکہ حدیث شریف بھی اس میں داخل ہو جائے بے شک احادیث صحیحہ وحی غیر متلو ہیں۔ مگر اس حصہ کو آیت کے مفہوم میں داخل کرنے سے بعض خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، استنباط حضور ملحق بالوحی ہے، اسکو وحی باطنی کہا جاتا ہے، یہی وحی باطنی صوفیہ میں بطور الہام موجود ہے، اور وحی باطنی اقامت قرآن کے لئے کام آتی ہے۔ ۱۲

[1] یہ تصریح مجھے نہیں ملی ۱۲

محمد نور الحق غفرلہ العلوی

فقہا کے اصول فقہ سے علیحدہ قرار دیتے ہیں چنانچہ خیر کثیر[1] میں فرماتے ہیں "میں کتاب الصلوٰۃ" کے متعلق تمام صحیح حدیثوں کو قرآن سے استنباط کرنے پر قادر ہو گیا ہوں، میرا جی چاہتا ہے کہ اس کے متعلق ایک مستقل رسالہ لکھ دوں" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن عظیم سے خود سمجھ کر (جیسے شاہ صاحب فرماتے ہیں) یا مستقل وحی سے اخذ کر کے (جیسے عام اہل علم کہتے ہیں) قرآن پر عمل کرنے کا مفصل پروگرام دیا ہے جسے علما حدیث نے بڑی محنتوں سے دو سو برس کے عرصہ میں جمع کیا اسی طرح انبیا کی سیرتوں کو جمع کرنا پہلے زمانے میں بھی رائج رہا ہے۔ سطعات[2] میں شاہ صاحب تصریح کرتے ہیں کہ قرآن عظیم کی طرح اپنی وحی جس کے معانی اور الفاظ

---

[1] خیر کثیر کی عبارت حسب ذیل ہے: ومن علوم الحدیث تفسیر القرآن والاستنباط منه، وهو اعظم العلوم و سنورد علیك منه کفافا، امر الله سبحانه باشیاء مطلقة کالصلوٰة والزکوٰة، وکقوله سبح اسم ربك الاعلى، وسبح بحمد ربك وغیر ذالك، فوقتها رسول الله صلى الله علیه وسلم باوقات معینة۔

وامر بامور کقوموا، وکبر، واتل ما اوحی الیك، وارکعوا واسجدوا، فبین رسول الله صلى الله علیه وسلم انها ارکان الصلوٰة۔

واقسم بامور کالفجر، والضحى، واللیل اذا سجى، والشفق، ولیال عشر، فاستنبط منها رسول الله صلى الله علیه وسلم انها اوقات الصلوٰة على تفصیل ذکر فی کتب الاحادیث۔

وسبح نفسه فی اوقات وحمد نفسه فی اوقات فذکر ان المراد الصلوٰة السریة والجهریة

وبالجملة فهذا طریق استنباطه صلى الله علیه وسلم، ونحن قد تتبعنا جمیع ما وصل الینا من الاحادیث الواردة فی کتاب الصلوٰة، فوضح لنا انها مستنبطة کلها من کتاب الله استنباطا حکمیا، وعسى ان نحیطه فی رسالة منفردة۔ خیر کثیر ص ۱۲

[2] قال الامام ولی الله در نفس پیغمبر برکات الٰہی از دو میزاب مے ریزد (میزاب اول) از دریائے تشریع، چنانکہ حقیقت او در اقسام ہفت گانہ بیان کردیم (دیکھو ص سطعہ ص نور) (میزاب دوم) از دریائے سر کلام و تعیین وضع از آں منزل بر قلب پیغامبر قرآن باشد، اگر میزاب اول پیش دستی کرد و میزاب ثانی تخلف نماید آں حدیث قدسی باشد و اگر میزاب کلام پیشدستی نماید و میزاب تشریع تخلف کند، محتمل غیر واقع است، و کتب الٰہی پیش از قرآن ہمہ بر روش حدیث قدسی بودہ اند۔ الا ماشاء اللہ، لہذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمودہ اند، انما کان ینزل علی النبی ما مثله آمن علیه البشر الحدیث ۔ دو چیز لازم کتاب الٰہی است یکی برکات ملکوت و استحسان ملاء اعلی در رضائے ایشاں از ہر کہ آں کتاب را خواند در ترویج آں کوشد، و دیگر بقائے آں کتاب علی ممر الدہور والاعصار، و توفیق با فتن امت حفظ آں را، اگر ایں دو معنی متخلف شود آں کتاب الٰہی نخواہد بود بلکہ صحیفہ فردے از افراد بشر کہ بہ ارادۂ خود جمع علم پیغمبر کردہ است، مانند صحیح بخاری و صحیح مسلم درملت ما ۔ سطعات طبع جدید ص ۱۲ ۔

محمد نور الحق غفر له العلوی شب ۱۷ اپریل ۱۹۴۲ء

مقرر ہو کر نازل ہوں اور پھر قطعی طور پر محفوظ رہیں، چند ٹکڑوں کے ماسوا کسی مذہب کی کتاب الہٰی میں یہ طریقہ نہیں برتا گیا۔ عام طور پر ائمہ دین کتابیں اپنے اجتہاد سے جمع کرتے ہیں جو اس نبی کی سیرت اور اس کے اقوال کو جمع کر دیتی ہیں یعنی ان ہی کتابوں میں وہ چیز بھی آجاتی ہے، جو براہ راست لفظاً اور معنیً مقرر ہو کر نازل ہوئی (جیسے تورات کے احکام عشرہ، یا انجیل کے بعض خطبات) نیز وہ چیز بھی آجاتی ہے جو نبی اپنی اجتہاد سے تعلیم دیتا ہے (یہ فیصلہ شدہ امر ہے کہ اگر نبی کے اجتہاد پر منجانب اللہ گرفت نہ ہو تو وہ حکماً وحی سمجھی جاتی ہے) ہماری امت میں کتب مقدسہ کی اس قسم کی مثال میں شاہ صاحبؒ صحیح بخاری و صحیح مسلم کو پیش کرتے ہیں[لہ]۔

اس بظاہر سادہ تحقیق میں ایک بہت بڑے اشکال کا حل موجود ہے جو کتب مقدسہ کے متعلق ہمارے اہل علم کے اذہان پر مستولی ہے، ہمارے علما عموماً یہ سمجھتے ہیں کہ اصلی تورات اور انجیل غائب ہو چکی ہے چونکہ وہ کوئی کتاب قرآن شریف کی طرح محفوظ نہیں دیکھتے۔ اور اُن کی ذہنیت میں یہ چیز راسخ ہے کہ سابقہ کتب الہٰی بھی قرآن کی طرح نازل ہوئی تھیں، اس لئے وہ ان کتابوں کو مقدس ماننے کے لئے کسی طرح تیار نہیں ہیں۔ اس نظریہ سے یہ بُرا نتیجہ پیدا ہوا کہ قرآن حکیم نے جہاں اہل کتاب کو اپنی کتابوں پر عمل کرنے کی دعوت دی، اور عمل نہ کرنیکا الزام دیا اس کی صحیح تفسیر کرنے سے ہمارے علما عاجز آگئے محض اسرائیلی یا خرافاتی روایات لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اگر کتب مقدسہ کو کتب حدیث کی طرح مان لیا جائے تو یہ اشکال من اصلہ رفع ہو جاتا ہے۔

سورۂ والنجم کی آیت "ان ھو الا وحی یوحیٰ" کی دو طرح تفسیر کیجاتی ہے:۔

(۱) شاہ صاحبؒ کے طریقے پر تحقیق یہ ہے کہ ضمیر "ھو" قرآن کی طرف راجع ہے، اور "ما ینطق عن الھویٰ" میں بھی نقل قرآنی کے متعلق بحث ہے۔

(۲) مگر اہل علم کی دوسری جماعت اس آیت کو قرآن سے مخصوص نہیں مانتی، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے تمام تر اقوال کو ایک طرح وحی ثابت کرنے پر زور دیتی ہے ان کے نزدیک "وما ینطق عن الھویٰ" قرآنی نقل سے مقید نہیں ہے، بلکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ہر قول "وما ینطق عن الھویٰ"

[لہ] الفرقان:۔ غالباً شاہ صاحبؒ کی یہ تمثیل صرف نوعیت تنزیل اور طریقہ جمع و تالیف کے لحاظ سے ہے، اور یقیناً بالکل صحیح ہے ورنہ جس شخص نے بائبل بالخصوص "عہد جدید" کو بغور دیکھا ہے اور ان "کتب مقدسہ" کی تاریخ پر جس کی نظر ہے اس کے نزدیک ان کی روایتی حیثیت صحیحین تو کجا معاجم طبرانی جیسی کتابوں کے برابر بھی مشکل ہی سے ہو سکتی ہے لیکن اس کے باوجود شاہ صاحب کی اس تحقیق سے وہ مشکل حل ہو جاتی ہے جس کا ذکر مولانا نے آئندہ سطور میں کیا ہے۔ کما لا یخفیٰ علی المتبحر المتیقظ ۱۲۰۰ نعمانی غفرلہ

میں داخل ہے، اور اسی کو " ان ھو الا وحی یوحی " میں وحی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۱) ان حضرات کے نزدیک حدیث کی اصل بھی وحی ہی سے ثابت ہے، فقط الفاظ کا فرق ہے، قرآنی الفاظ وحی سے معین ہوئے، اور حدیث کے الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ کے اپنے طبعی ملکہ سے صادر ہوتے ہیں، مگر معانی سب کے سب وحی ہیں۔

(۲) پھر ان کے نزدیک یہ فرق بھی موجود ہے کہ قرآن خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک مصحف میں کتابتہ محفوظ کر دیا گیا، اور اس کی روایت بالتواتر قایم رہی، لیکن حدیث میں جو وحی آئی ان کے نزدیک بھی، نہ تو حضور کے زمانے میں اس کی کتابت ہوئی اور نہ اسکے لئے تواتر ضروری ہے۔

ان لوگوں کی اصطلاح پر اگر کتب مقدسہ سابقہ کو کتب حدیث کا درجہ دیا جائے تو لطریق اولے اسکو مستبعد نہیں سمجھنا چاہئے اگر یہ لوگ اس بات کو تسلیم کرلیں تو تمام اشکال حل ہو جائینگے۔

(۱) ہماری کتب حدیث میں بالاتفاق غیر صحیح روایات بھی موجود ہیں (۲) نیز ان کتب حدیث میں ایک واقعہ کو مختلف طریقوں سے بھی روایت کیا گیا ہے (۳) ہماری بہت سی کتب حدیث میں بھی کاتبوں سے غلطیاں ہوتی رہتی ہیں جنکو محققین علما درست کرتے رہتے ہیں، اسکے بعد اگر اناجیل اربعہ کو ہماری صحاح اربعہ (صحیحین ابو داود، ترمذی) کے درجہ پر رکھدیا جائے تو ذرہ برابر اختلاف نظر نہیں آئیگا، میں نے انجیل کی شرح، مسٹر ہنری اسکاٹ، کی اردو میں مطالعہ کی اس میں اناجیل اربعہ کے اختلافات کو اسی طرح جمع کرنے، اور ترجیح دینے کی سعی کی گئی ہے، جیسے ہم کتب حدیث میں کرتے ہیں، اس دن سے میرے دماغ میں ایک نیا فکر پیدا ہوا جس سے کتب مقدسہ کی تحریف کا الزام جس طرح عموماً ہم اہل کتاب پر عائد کرتے ہیں اور مولنا رحمت اللہ مہاجر مکی نے " اظہار الحق " میں اسکو بڑی شد و مد سے ثابت کیا ہے، کمزور ہونے لگا، اور جو محقق عالم تورات میں تحریف کا انکار کرتے ہیں جیسے امام بخاری، شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور امام ولی اللہ دہلوی، ان کی تحقیق کا مطلب سمجھ میں آنے لگا۔ مگر یہ فکر کبھی مکمل نہیں ہو سکتا جب تک ہم کتب مقدسہ سابقہ کو کتب حدیث کے درجہ پر نہ لے آئیں، جب " سطعات " میں میں نے شاہ ولی اللہ صاحب کی مذکورہ بالا تصریح پڑھی تو اطمینان کا سانس لیا۔

لہ" الفرقان"، اناجیل اربعہ کو صحاح اربعہ کے درجہ میں رکھنے کا اگر یہ مطلب ہو کہ انکی جمع و تالیف اس انداز سے ہوئی ہو جس طرح کہ صحاح اربعہ کی۔ تو بے شک قابل قبول ہو، لیکن اگر روایتی استناد میں مساوات مراد ہو تو اس کے لئے بہت سے ناقابل شک حقائق و واقعات سے چشم پوشی کرنا پڑیگی، ہاں تورات کا حال بہ نسبت اناجیل کے ضرور کچھ غنیمت ہے لیکن صحاح اربعہ کے درجہ میں تو اس کو بھی نہیں رکھا جاسکتا اسلئے بظاہر مولنا مدظلہ کی مراد صرف طریق جمع و تالیف میں مماثلت ہی ہو ۱۲ نعمانی غفرلہ

فصل (۲) کتب حدیث پر شاہ صاحب کی تنقید اور طبقاتی تقسیم

حدیث کی کتابیں دو طرح پر مرتب کی گئیں۔ پہلی قسم وہ ہے جن میں فقط صحیح احادیث درج ہیں۔ دوسری قسم وہ کتابیں ہیں جن میں صحیح روایات کے ساتھ غیر صحیح روایات بھی لکھی گئیں۔ مگر تصریح کر دی گئی کہ یہ روایات صحیح نہیں ہیں، پھر ان مصنفات کی روایت کا سلسلہ بھی یکساں قایم نہ رہ سکا بعض صحاح ایسی ہیں جو تواتر کے قریب پہونچ گئیں، بعض ایسی بھی ہیں جو مشہور اور مستفیض کے درجے پر ہیں، اس فرق کو ملحوظ رکھکر شاہ صاحب نے کتب احادیث کے طبقات مقرر کر دیئے۔

طبقۂ اولیٰ میں موطا مالک، صحیح بخاری، صحیح مسلم کو رکھا، طبقہ ثانیہ میں، سنن ابوداؤد، جامع ترمذی سنن نسائی مقرر کی، ان چھ کتابوں کے ماسوا باقی طبقات میں کئی دہائیاں اور کئی سیکڑے کتب ملینگی، شاہ صاحب کے نزدیک وہ سب قابل احتجاج نہیں ہیں۔[1]

اس طرح شاہ صاحب نے علم حدیث میں ایک نئی روح پھونکدی، شیخ الاسلام ابن حجر اور سیوطی کے زمانے سے جو غیر محققانہ طریقہ اہل علم پر غالب آ رہا تھا اس نئی روح نے اسکو مغلوب کر دیا۔

میں نے شیخ عبدالحق محدث دہلوی (م ۱۰۵۲ھ) کے مقدمہ مشکوۃ میں جب یہ مضمون دیکھا کہ پچاس کے قریب حدیث کی کتابیں ہیں جن میں صحیح اور غیر صحیح احادیث جمع کی گئی ہیں، اور شیخ نے ان سب کو ایک درجے پر رکھا ہے وہ صحاح ستہ میں بھی غلط روایات کا اختلاط اسی طرح مانتے ہیں جسطرح باقی کتب میں تو میرے دماغ پر ایک پریشانی طاری ہوگئی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ یہ سب کتابیں مجھے کسی کتاب خانہ میں

---

[1] قال الامام فی حجۃ اللہ البالغۃ: فان ایراد الضعیف مع بیان حالہ لا یقدح فی صحۃ الکتاب انتہی ص ۱۳۳، ۱۲

[2] حضرت مولنا الشیخ کتاب التمہید فی ائمۃ التجدید میں لکھتے ہیں۔ اشاعت الحدیث فی الملۃ الہندیۃ انما کانت بعد الالف الثانی لما جاء الشیخ عبد الحق الدھلوی فی ابتداء المائۃ الحادی عشر، فاقام فی دھلی، وعلم ودرس بنحو خمسین سنۃ (طریقۃ الشیخ) وطریقۃ الشیخ عبد الحق مبنیۃ علی (الف) الانتصار لمذھب الفقہاء الحنفیۃ (ب) والانتصار لائمۃ طرق التصوف لاسیما القادریۃ والنقشبندیۃ (ج) وعدم التعرض للسلاطین والملوک فی سیاستہم مع عدم الاختلاط بہم، فان کانت رسوم الناس موافقۃ للسنۃ فبہا ونعمت وان کانت المخالفۃ قلیلۃ فیئول ویؤلف، وان کانت واضحۃ فلا یجہر بالانکار بل یقرر الحدیث علی حقیقۃ وعمل المتاخرین یوجہ باختلاف للمصالح لاختلاف الزمان، ولولا ذلک لما تیسر شیوع الحدیث فی الذین ماقرع بما سماعہم ولا تالف اذہانہم منذ اربع مائۃ سنۃ بل من ستمائۃ سنۃ (وکان الباعث) لجلب النظر من عامۃ المحصلین الی طریقۃ الشیخ عبد الحق امور۔ منہا، ان الشیخ لا یذعن بحکم

پہنچا لیں، ان کے مطالعہ کے بعد علم حدیث کی جو تحقیق ثابت ہو اس پر اعتماد کیا جائے، خالی پانچ کتابیں پڑھ لینے سے کیا ہوتا ہے اسکے بعد میں متون مذکورہ بالا کی فراہمی میں لگ گیا مگر بہت جلد اپنے آپکو اس سے عاجز ماننے لگا۔

مجھے حضرت مولنا شیخ الہند قدس سرہ نے اس قسم کی تشویش سے نجات دلانے کیلئے مشورہ دیا کہ

(سلسلہ متفرقات) المحدثین لحصر الاحادیث الصحیحة على الاغلب فی الکتب الخمسة، بل تبع الشیخ کمال الدین ابن الھمام فی تسویة جمیع کتب الحدیث مع البخاری ومسلم فی الاحتجاج باحادیثھا، اذا کان رجالھا مثل رجال الصحیحین، وبذالک یتسع نطاق البحث للحنفیة والا فاحادیث الکتب الخمسة اکثرھا مخالفة للمذھب الحنفی فی زعمھم، ومنھا انہ یستخرج الاحادیث من مجموعات جلال الدین السیوطی کالجامع الکبیر" والدر المنثور لانتصار المذھب الحنفی، ولذلک یاتی الشیخ عبد الحق بتلخیص ماذکرہ الفقھاء المحدثون مثل العینی وابن الھمام واتباعھما، لتائید المذھب الحنفی، ومنھا انہ یخترع القواعد لتصحیح الاحادیث التی یستدل بھا الحنفیة، ونذکر لذلک مثالا من کتابہ "اللمعات" قال فی باب التیمم۔ اعلم ان الاحادیث وردت فی الباب مختلفة متعارضة جاء فی بعضھا ضربتان وفی بعضھا ضربة واحدة، وفی بعضھا کفان، وفی بعضھا یدان الی المرفقین، والاخذ باحادیث الضربتین والمرفقین اخذ بالاحتیاط (فان قلت) التعارض علی تقدیر ان یکون الاحادیث متساویة المرتبة والمحدثون حکموا بان احادیث الضربتین والمرفقین غیر مذکورة فی الصحاح (قلت) عدم ذکرھا فی الصحاح محمل بحث، کما نقلناہ من الحاکم والدارقطنی علی ان عدم صحتھا وقوتھا فی زمن الائمة الذین استدلوا بھا ممنوع اذ یحتمل ان یطرق الوھن والضعف من جھة لین الرواة الذین رووھا بعد زمان الائمة۔ فالمتاخرون من المحدثین الذین جاءوا بعدھم رووھا فی السنن دون الصحاح۔ ولا یلزم من وجود الضعف فی الحدیث عند المتاخرین وجودہ عند المتقدمین مثلا رجال الاسناد فی زمن ابی حنیفة کان واحد من التابعین یروی عن الصحابة، او اثنان او ثلثة ثم روی ذلک الحدیث من بعدہ من لم یکن فی تلک الدرجة۔ فصار الحدیث عند ائمة الحدیث مثل البخاری ومسلم والترمذی وامثالھم ضعیفا ولا یضر ذلک فی الاستدلال بہ عند ابی حنیفة، فھذا برھان نکتة جیدة، انتھی۔

(قلت) او لیظھر ضعفھا لمن اتقن فنون الحدیث من النظر فی مبادی السند واعتبار المتابعات والشواھد بادنی التفات، انتھی عبارة التمھید ۱۲ محمد نور الحق غفرلہ العلوی

ہیں۔ "حجۃ اللہ البالغہ" کا مطالعہ جاری رکھوں۔ لیکن سنا رہ جانے سے بیشتر تحت ایسا موقع دستیاب نہ ہوسکا، طبقات[1] مذکورہ کی بحث جب "حجۃ اللہ"[2] میں مجھے سمجھ آئی، اور معلوم کیا کہ اصل قابل اعتنا فقط چھ کتابیں ہیں، جو پہلے اور دوسرے طبقے میں بیان ہو چکی ہیں تو طبیعت سے تمام بوجھ جاتا رہا۔

۔ جن محدثین نے غیر صحیح احادیث جمع کرکے،

(الف) ان کی عدم صحت کی تصریح کردی (ب) پھر ان کا فیصلہ بھی اہل علم کے نزدیک مسلم ہے (ج) مزید اس کے ان کی کتابیں اہل علم میں رواج پذیر بھی ہیں۔ ان تین خصوصیات والی کتابوں کو شاہ ولی اللہ صاحب اُن کتابوں کے درجے پر نہیں لانے دیتے، جو خصوصیات مذکورہ بالا سے یکسر عاری ہیں۔

عام اہل علم اس دقیقے پر متنبہ نہیں ہوسکے۔ اور پچاس کتابوں کو مساوی درجے پر ایک فہرست میں درج کر گئے۔

شاہ ولی اللہ کی "حجۃ اللہ" کا یہ مضمون شاہ عبدالعزیز نے زیادہ تفصیل اور توضیح سے عجالہ نافعہ[3] میں درج

---

[1] (نکتۃ فی طبقات کتب الحدیث) (الف) قال النووی فی التقریب - اول مصنف فی الصحیح المجرد صحیح البخاری ثم مسلم، وھما اصح الکتب بعد القرآن، والبخاری اصحھما واکثرھما فوائد واختص مسلم بجمع طرق الحدیث فی موضع واحد (والصواب)، انہ لم یفت الاصول الخمسۃ من الصحیح الا الیسیر اعنی الصحیحین وسنن ابی داود والترمذی والنسائی (ب) قال السیوطی فی "تدریب الراوی" منکراً الحصر الصحاح فی الاصول الخمسۃ۔ ان فی مجمع الزوائد، وغیرہ من کتب الحدیث یوجد صحیح کثیر، (قلت) وھل تقدر علی الجمع بین قول الامام النووی "والصواب انہ لم یفت الاصول الخمسۃ الا الیسیر، وبین قول السیوطی ما ان فی مجمع الزوائد وغیرہ یوجد صحاح کثیرۃ" الا بان نقول ان الاول قول المحققین والثانی قول الوارقین المتعمقین قال الامام ولی اللہ فی قرۃ العینین،

جمعے کہ ناظر اند در علم حدیث بطریق وراقیت، نہ بطریق اجتہاد وتحقیق، از استادان محقق حدیث را نہ گرفتہ اند وسلاسل ملت مصطفویہ گشتہ اند نہ تقلید اسلاف را محکم کردہ ونہ طریق اجتہاد وتحقیق را استوار نمودہ اند،

، ومارأیناہ فی طبقات کتب الحدیث کلاماً اتقن من کلام الامام ولی اللہ فی حجۃ اللہ البالغۃ ثم شرحہ الشیخ عبدالعزیز فی "العجالۃ النافعۃ" ثم شید ارکانہ مولانا محمد قاسم الدیوبندی فی ھدایۃ الشیعۃ، بالدلائل العقلیۃ ۔ فیتبین منہ ضعف رای ابن الجماء الذی یبطل الطبقات بالکلیۃ وکذلک ضعف رای السیوطی الذی لا یفرق فی الطبقۃ الثانیۃ والثالثۃ والرابعۃ ویظھر منہ ان الذین لا یتقنون الحدیث من المحدثین والفقہاء ھم مثل السوفسطائیۃ من الحکماء کتاب التمھید ۱۲

[2] دیکھو حجۃ اللہ طبع مصر ص۱۳۵ بعدہ، [3] ملاحظہ ہو عجالہ نافعہ ص۶ بعدہ۔ محمد نور الحق غفرلہ

کردیا ہے۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی اور کتب حدیث کے متعلق ولی اللہی نظریہ کی عقلی تشریح

مگر دونوں کتابوں میں یہ مضمون ایک وجدانی فیصلے سے آگے نہیں بڑھ سکا، ہر دو بزرگوں نے کوئی عقلی دلیل اس پر قایم نہیں کی، بلکہ محققین اہل علم کا اتفاق اس معاملہ پر کافی سمجھا گیا ہے، ابتدا میں ایک حد تک میری دماغی تڑپ کو پورا کرنے کے لئے یہ امر کافی تھا. مگر میں اس سے زیادہ توضیح و توثیق کا خواہشمند تھا۔

اتفاقاً میں شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم کا رسالہ" ہدیۃ الشیعہ" مطالعہ کر رہا تھا، اس میں مولانا نے شاہ صاحب کے مذکورہ بالا مضمون کو عقلی طور پر مدلل کر دیا، اس طرح علم حدیث کی تنقید جو شاہ صاحب نے قایم کی تھی، ہمارے لئے قابل استفادہ ہو گئی۔

حضرت مولانا فرماتے ہیں :-

اوّل بطور تنبیہ گزارش ہے کہ کتابیں آدمیوں ہی کی تصنیف ہوتی ہیں، جیسے آدمی سب طرح کے ہوتے ہیں جھوٹے سچے، معتبر غیر معتبر، فہمیدہ غیر فہمیدہ، ایسے ہی کتابیں بھی سب طرح کی ہوتی ہیں۔

(۱) ملحدان بے دین نے بہت سی کتابیں تصنیف کر کے، اچھے اچھے بزرگوں کے نام لگا دی ہیں اور ان میں اپنی واہیات سیکڑوں بھر دی ہیں۔

(۲) اور جو کتابیں کہ بلا لئے اہل سنت کی تصنیف ہیں، ان میں بھی اکثر ایسی ہیں کہ وہ لوگوں کی فیض رسانی کے لئے تصنیف نہیں ہوئیں، بلکہ بطور بیاض کے جمع کی گئیں تاکہ نظر ثانی کر کے ان کی روایات کا حال معلوم کریں، اور اتفاق سے نظر ثانی کا اتفاق نہیں ہوا یا ہوا اور کسی وجہ سے وہ بیاضیں لوگوں کے ہاتھ پلے پڑ گئیں۔

(۳) اور بعض کتابیں ایسی ہیں کہ وہ بہت کم یاب اور بدرجہ غایت نادر الوجود بلکہ مفقود ہیں، اور ملحدوں اور بدعتوں کے وہ ہاتھ لگ گئیں۔ انھوں نے اپنی گھڑی ہوئی روایتیں ان میں داخل کر دی ہیں، یا اہل سنت کے مقابلہ کے وقت کسی روایت کو ان کتابوں کی طرف منسوب کر دیتے ہیں، تاکہ اہل سنت خاموش ہو جائیں

سنو! اہل تشیع اکثر ایسا ہی کرتے ہیں اور ایسی کتابوں کا حوالہ دیا کرتے ہیں اسلئے اہل حق کو لازم ہے کہ جب کسی شیعہ سے کسی کتاب کا حوالہ سنیں تو اول تو یہ دریافت کریں کہ یہ روایت اس کتاب میں ہے کہ نہیں، دوسرے اس کتاب کا حال تحقیق کریں

کہ معتبر ہے کہ نہیں،

فصل ۲

اور معتبر ہونے کی یہ صورت ہے کہ کسی کتاب کی روایات کے معتبر ہونے میں چند باتیں ضروری ہیں اول تو یہ کہ اس کتاب کے مصنف کو تفریح طبائع محزونہ کے لئے فقط قصہ گوئی، اور افسانہ خوانی۔ مدنظر نہ ہو، بلکہ واقعات واقعی کے مشتاقوں کی تسکین کیلئے اس کتاب کو تصنیف کیا ہو، ورنہ چاہیئے کہ "بہار دانش"[۵] اور "بوستان خیال" کے افسانے اور "چہار درویش" اور "بکاولی" کی کہانیاں، اور "فسانہ عجائب" اور "فسانہ غرائب" کے طوفان سب کے سب دستاویز خاص و عام ہو جائیں۔

دوسری یہ کہ مصنف کتاب کسی کی رو و رعایت، اور کسی کی بغض و عداوت نہ رکھتا ہو اور اس کا حفظ اخبار، اور صدق گفتار، اس درجہ مشہور ہو کہ اسکی تحریر کی نسبت کسی کے دل میں شک و شبہ نہ ہو، ورنہ طومار کے طومار اخباروں کے جو لڑکیوں کی زبانوں میں اپنے بزرگوں کی شجاعت اور انکے غنیموں کی بزدلی سے مشحون ہوا کرتے ہیں بالاتفاق مسلم ہو جائیں، اور شیعہ سنیوں کی، اور سنی شیعوں کی سندیات برسر و چشم رکھنے لگیں اور ہر کس و ناکس کی بات قبول کرنے لگیں اور یہ فرق قوت وصف حفظ، و تفاوت صدق و کذب، اور علیٰ ہذا القیاس یہ تہمت رو و رعایت اور کینہ و عداوت ہرگز قابل لحاظ نہ رہے۔

تیسری یہ کہ مصنف کتاب، باوجود صدق و دیانت اور حفظ و عدالت کے اس فن میں، جس کی وہ کتاب ہے دستگاہ کامل رکھتا ہو اور ملکہ کما ینبغی، نہ یہ کہ دین میں مثلاً نیم ملا ہو جس سے خطرہ ایمان ہو یا طب میں مثلاً نیم طبیب ہو کہ بیماروں کو خطرۂ جان ہو۔

چوتھی یہ کہ وہ کتاب باوجود شرائط مذکورہ کے قدیم سے مشہور و معروف اور اسی قسم کے لوگوں کے واسطہ جو مجموعہ اوصاف مرقومہ ہوں، دست بدست ہم تک پہنچی ہو۔ ورنہ لازم، کیا الزم تھا کہ انجیل و تورات جو کلام ربانی ہیں، اور اس خدا

۵۔ اس کتاب کا مصنف شاہجہانی عہد کا اچھا عالم ہے، شرح وقایہ پر حاشیہ لکھا ہے جب مولف اس کتاب کے شاہجہاں مرحوم کے پاس لے گیا تو شاہ نے صرف ایک روپیہ انعام دیا اور فرمایا کہ یہ کاغذ کی قیمت ہے۔
مولانا عم فیضہم ۱۲ محمد نور الحق

کی تصنیف ہیں جو بوجہ اتم جامع اوصاف مذکورہ کیا مجموعہ صفات کمال اور معدن جملہ کمالات جلال وجمال ہو، اعتماد واعتبار میں ہم پلہ قرآن مجید اور فرقان حمید کی ہو چالیس

پانچویں یہ کہ روایت کی کتاب میں ضروری ہے کہ مصنف کتاب نے اول سے التزام اس بات کا بھی کیا ہو کہ بجز صحیح روایتوں اور محقق حکایتوں کے، اور اپنی کتاب میں درج نہ کرونگا، جیسے صحاح ستہ کہ ان کے مصنفوں نے یہ شرط کرلی ہو کہ بجز صحیح روایت کے اپنی کتاب میں درج نہ کریں گے، اسی واسطے ان کتب کا نام صحاح ستہ مشہور ہو گیا۔

فصل (۱۴)

سو اگر کوئی کتاب کسی بیاض کی ہو کہ اس نے اس میں ہر قسم کی رطب ویابس روایتیں، اور صحیح وغلط حکایتیں اس غرض سے فراہم کرلی ہیں کہ بعد میں نظر ثانی کرکے صحیح صحیح کو قایم رکھکر، باقیوں کو نقل کے وقت حذف کرونگا، جیسا کہ امام بخاری رح اور مسلم رح نے کیا۔

یا صحیح کو صحیح بتلاکر، موضوع یعنی بنائی ہوئی باتوں، اور گھڑی ہوئی حکایتوں اور ضعیف وغیرہ کو لکھکر اس کے بعد لکھ جاؤنگا کہ یہ موضوع ہے یا ضعیف ہے مثلاً جیسے امام ترمذی نے کیا، لیکن اتفاقات تقدیر سے ان کا یہ ارادہ پیش نہ گیا اور یہ آرزو پوری نہونے پائی تھی، جی کی جی ہی میں تھی کہ اجل نے آدبایا، تو ایسی روایات کا ہرگز اعتبار نہ ہوگا۔

ورنہ کونسا مصنف نہیں کہ اس نے اول ایک مجموعہ بیاض بطور کلیات کے فراہم نہیں کیا[1] خود امام بخاری سے بہت سی سندوں سے منقول ہے کہ انھوں نے چھ لاکھ حدیثوں سے چھانٹ کر بخاری شریف کی حدیثیں نکالی ہیں۔

اور عبدالرزاق بخاری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری نے کوئی تیز دفعہ حدیثوں کی بیاض لکھی کی تھی اور انکو چھانٹ کر بخاری کا مسودہ کیا تھا

[1] امام ولی اللہ مصفیٰ میں فرماتے ہیں "امام مالک در موطا قریب دہ ہزار حدیث جمع کردہ بود۔ بعد ازاں روز بروز نظر میکرد ازاں کم مے ساخت تا ایں قدر باقی ماند" مصفیٰ ۱۲　　محمد نور الحق غفرلہٗ　　۲۲ر اپریل ۱۹۴۰ء

بہر حال ایسی بیاضوں کا جمع کرنا ایسے ایسے ائمہ حدیث کی نسبت بھی ثابت ہو سو

اگر اتفاق سے، امام بخاری مثلاً، بعد فراہمی بیاض کے قبل اس کے کہ بخاری شریف

کی حدیثیں اس میں سے چھانٹ کر بخاری تصنیف کریں، اس دار فانی سے کوچ

کر جاتے تو وہ بیاض امام بخاری کی تصنیف سمجھی جاتی، لیکن کوئی بتلائے تو کیا

وہ قابل اعتبار کے ہو جاتی؟

سب جانتے ہیں کہ اگر وہ ایسی ہوتی تو امام بخاری کو چھانٹنے ہی کی کیا

ضرورت تھی، تو اس صورت میں خود امام بخاری ہی اس بات کے گواہ ہیں

کہ وہ میری بیاض قابل اعتبار نہیں، پھر ہم کیونکر فقط اس سبب سے اس کا

اعتبار کرنے لگیں کہ وہ ایسے بڑے محدث امام المحدثین کی تصنیف ہے کہ جہاں

میں کوئی اس کا ثانی ہوا ہے نہ ہوگا۔

غرض اگر کوئی اس قسم کی کتاب کسی کو ملجائے اور اس کے مصنف کو۔ گو وہ

کتنا ہی بڑا محدث کیوں نہ ہو۔ اس کی تہذیب اور تالیف کا اتفاق نہ ہوا ہو تو

وہ کتاب کسی طرح علماء، کیا، جہال کے نزدیک بھی بہ شہادت عقل قابل اطمینان

نہیں" انتہی کلماتہ الشریفہ بحوالہ کتاب التمہید[1]

شیخ الاسلام مولٰنا محمد قاسم کے ارشادات کے بعد علم حدیث کی جو تنقید شاہ صاحب نے قائم

کی تھی ہمارے لئے قابل استفادہ ہو گئی۔

یہ تھا تذکرہ پہلے اور دوسرے طبقہ کا۔

فصل (۳) ہمارا اپنا استقراء اور ولی اللہی نظریہ کی مزید تشریح

شاہ صاحب نے تیسرے، چوتھے، اور پانچویں طبقے میں جن کتابوں کا ذکر کیا ہے۔

(الف) یا تو اُن کے مصنف ملتزم الصحۃ نہیں۔

(ب) یا ان کی روایت منقطع ہو گئی ہے یعنی کاتبوں کی بلا تصحیح نقل پر نسخوں کا انتشار تو ہوتا رہا

[1] کنت قرأت تعیین طبقات کتب الحدیث فی العجالۃ و انا فی دیوبند و قرأت ذلک المبحث فی حجۃ اللہ البالغۃ لکن ما حصل لی الانشراح فی فہم المسئلۃ الا بعد ما قرأت ما قررہ شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم فی "ھدیۃ الشیعۃ" کتاب التمہید ۱۲ محمد نور الحق غفرلہ

مگر محدثین نے اپنے مشایخ سے پڑھکر اس نسخہ کو صحیح کیا ہو، پھر اس طرح تسلسل قایم رہے کہ ہمارے زمانہ تک صحیح شدہ نسخے محفوظ طور پر مل سکیں، ایسا نہیں ہوا، ایسے نسخے قابل اعتماد نہیں ہونگے۔

(ج) انکے سوا بعض ایسے محدثوں نے بھی کتابیں تصنیف کیں جنکی لیاقت علمی بھی مسلم نہیں ہے۔

متاخرین محدثین نے جن کی ابتدا ابن السبکی (حافظ تاج الدین عبدالوہاب متوفی ۷۷۱ھ) سے ہوئی اور حافظ عراقی (عبدالرحیم بن حسین متوفی ۸۰۶ھ) اور ابوالحسن ہیثمی (علی بن ابی بکر متوفی ۸۰۷ھ) اور ابن حجر عسقلانی کے توسط سے سیوطی پر خاتمہ ہوا۔ ان غیر معتمد کتابوں کی روایتیں زوائد کے نام سے جمع کر دیں جس سے علم حدیث میں فتنے کا دروازہ کھل گیا اس ذخیرہ میں کافی سے زیادہ روایتیں ایسی موجود ہیں، جنکو دوسرے طبقے کا مصنف ضعیف قرار دیتا ہے، اور ان طبقات میں پہنچکر ان متاخرین کے نزدیک وہ حدیث متواتر بنجاتی ہے۔

ہم نے کئی سال کی محنت سے شاہ صاحب کے طبقات کو استقرا کر کے یقین حاصل کیا، گو عقلی دلائل سے مولنا محمد قاسم نے ہمیں مطمئن کر دیا تھا، مگر ہم نے اس کے ساتھ، محدثین کی جو کتابیں ملسکتی ہیں، ان میں عمل استقرا بھی جاری رکھا تو شاہ صاحب کے اس نظریہ پر (کہ پہلے اور دوسرے طبقے کی حدیثیں ہی صحیح ہیں) پورا اطمینان حاصل ہوا۔

مثال کے طور پر صحیح حدیث میں آیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ افضل الاعمال کیا ہے؟ آپ نے فرمایا "الصلوٰۃ لوقتہا" اس جملے کا صحیح ترجمہ یہی ہے کہ وقت سے نماز کو موخر نہ کیا جائے۔ یہ ضروری نہیں کہ اول وقت میں نماز ادا کیجائے، بلکہ بعض اوقات آخر وقت میں نماز ادا کرنا زیادہ مستحب مانا جاتا ہے۔ کما ثبت عنہ علیہ الصلوٰۃ والسلام "ابردوا بالظہر الخ" اس کے مقابل بعض روایتوں میں "افضل الاعمال الصلوٰۃ لاول وقتہا"، آیا ہے، ترمذی نے اس روایت کی تضعیف کر دی، اب مستدرک حاکم کو دیکھئے۔ وہ اسی جملہ مضاعفہ کو تیس چالیس سندوں سے روایت کرتا ہے، ایک غیر محقق عالم اس کثرت اسانید سے متاثر ہو کر اسکی صحت یا اس کے درجہ شہرت اور تواتر پر یقین کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے، ہم نے حاکم کی ان روایات کی تنقید "فتح الباری" کی امداد سے شروع کی تو ان میں سے ایک اسناد بھی صحیح نہ نکلی۔

ان متاخر محدثین نے ائمہ متقدمین پر تصحیح احادیث میں پورا اعتماد نہیں کیا۔

واضح رہے کہ ائمہ تنقید کے طبقات تین ہیں۔

ائمہ تنقید حدیث کے تین طبقے	(طبقہ اولیٰ) شعبۃ بن الحجاج (متوفی ۱۶۰ھ)	سفیان بن سعید ثوری (متوفی ۱۶۱ھ)

(ثانیہ) یحییٰ بن سعید القطان (متوفی ۱۹۸ھ)، عبد الرحمان بن مہدی (متوفی ۱۹۸ھ)
(ثالثہ) یحییٰ بن معین (متوفی ۲۳۳ھ)، امام احمد بن حنبل (متوفی ۲۴۱ھ)

ان کے بعد ائمہ فقہ الحدیث کو چار طبقوں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے:۔

ائمہ فقہ الحدیث کے چار طبقے

(طبقۂ اولیٰ)	سفیان ثوری	امام مالک بن انس
(〃 ثانیہ)	عبد اللہ بن المبارک	امام شافعی
(〃 ثالثہ)	امام اسحٰق بن ابراہیم راہویہ	امام احمد بن حنبل
(〃 رابعہ)	امام بخاری	امام ابو داؤد

ان کے بعد ائمہ مصنفین کے طبقے آتے ہیں:۔

ائمہ مصنفین کے دو طبقے

طبقہ اولےٰ:۔ امام بخاری، اور ابو داؤد[1]
طبقہ ثانیہ:۔ مسلم و ترمذی، نسائی بھی اسی طبقہ میں شمار ہوتے ہیں، ان حضرات پر تصحیح احادیث کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد محدثین کی خدمات دو قسم کی ہیں:۔

ان ائمہ کے بعد کے محدثین کی خدمات کی اقسام

اوّل یہ کہ ان کتابوں کی خدمت کریں جنکا تعلق طبقہ اولےٰ اور ثانیہ سے ہے مثلاً انکی اسماء الرجال لکھیں۔ انؑ کی فقہ پر بحث کریں، انؑ کی تائید میں طرق جمع کریں، انؑ کی غلطیوں پر تنبیہ کریں، کیونکہ تھوڑی تھوڑی غلطیاں ہر مصنف سے ہوتی رہیں حتیٰ کہ امام بخاری جو سب سے زیادہ متقن مانے جاتے ہیں، ان کی کتاب میں حافظ ابن حجر چالیس[2] کے قریب ایسی حدیثیں مانتے ہیں جنکی اسانید ضعیف ہیں؛ اور حافظ صاحب کے پاس بھی انکا کوئی حل نہیں ہے، مگر جن ائمہ کی کتب پر اسطرح کی تنقید عمل میں آئی اور انکی غلطیاں محدود اور معین ہوگئیں، ان کی کتابوں سے استفادہ کرنا سہل ہو جاتا ہے۔

---

[1] امام ابو داؤد کو طبقۂ اولیٰ میں اور امام مسلم کو طبقہ ثانیہ میں دیکھکر کسی صاحب کو یہ خلجان نہ ہو کہ درحقیقت طبقہ کے لحاظ سے امام ابو داؤد امام مسلم سے مقدم اور امام بخاری کے ہم طبقہ ہیں اگرچہ ان کی کتاب "سنن ابی داؤد" کا درجہ امام مسلم کی "صحیح" کے بعد ہے، لیکن مصنفات کی ترتیب بدل جانے سے انکے ذاتی تقدم پر کوئی اثر نہیں آتا، اپنے زمانے کے اکابر میں امام احمد اور امام اسحٰق گنے جاتے ہیں ان کے بعد امام احمد کی جگہ ابو داؤد نے اور امام اسحٰق کی جگہ امام بخاری نے لی۔ ۱۲ منہ عم فیضہ

[2] یوں تو حافظ ابن حجر نے صحیح بخاری میں سو کے قریب معلل روایتیں نکالی ہیں، پھر ان خدشات کے جوابات بھی بیان کئے ہیں مگر چالیس کے قریب روایات کا ضعف ان کے نزدیک اس درجہ کا ہے کہ بہ اعتراف حافظ اس کا کوئی جواب نہیں بن پڑتا

محمد نور الحق العلوی غفرلہ　　۲۲ راپریل ۱۹۴۰ء

اس (قسم اول) کی طرح حدیث کی خدمت کرنے والے ائمہ محدثین، ہمارے اساتذہ تک پائے جاتے ہیں، قسم دوم وہ محدثین ہیں جو علم حدیث میں جدت پیدا کر کے نئی تصانیف پیش کرنا چاہتے ہیں، ان کی تمام کتابیں اس قابل نہیں کہ ان سے کوئی دینی مسئلہ اخذ کیا جائے، ان میں جو نئی روایتیں ملینگی وہ عموماً وہی ہونگی جنکو پہلے ائمہ نے غیر صحیح سمجھ کر چھوڑ دیا ہے، اس طرح کی بے احتیاطی نے علم حدیث کو بجائے مفید ہونے کے ایک طرح مضر بنا دیا، اس دوسرے (جدت پسند) طبقے کی تصانیف میں وہ تمام نقائص پائے جاتے ہیں جو اس کتاب کی روایتوں میں ہمارے علماء کے نزدیک قابل اعتراض ہیں۔

ہم نے حافظ ذہبی (شمس الدین محمد بن احمد متوفی ۷۴۸ھ) اور ابن تیمیہ حرانی متوفی ۷۲۸ھ اور حافظ ابو الحجاج مزی (یوسف بن زکی متوفی ۷۴۲ھ) کے زمانہ تک علما میں تنقید کا مادہ واضح طور پر پایا ہے اس زمانہ تک پہلی صنف کے عالم (یعنی محفوظ و صحیح کی خدمت کرنیوالے) دوسروں سے ممتاز چلے آئے ہیں لیکن ابن السبکی سے لیکر پھر دونوں قسم کے علما میں اختلاط پایا جاتا ہے اور یہ سلسلہ اس طرح شاہ ولی اللہ تک ممتد ہے، شاہ صاحبؒ نے پھر تمیز پیدا کر دی، اور محققین کے اس طریقے پر چلنے والی ایک مستقل جماعت تیار کر دی۔ اسے ہم شاہ صاحبؒ ہی کی قوت تجلایۂ کا ایک مظہر جانتے ہیں۔

فصل (۴) صحاح ستہ کی چھٹی کتاب ابن ماجہ ہے یا موطا مالک

محدثین میں عموماً مشہور ہے کہ صحاح چھ کتابیں ہیں۔ ان میں سے پانچ متفق علیہ ہیں۔ صحیح بخاری صحیح مسلم، سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن نسائی، ششم میں اختلاف ہے۔ ایک بڑی جماعت موطا مالک کو چھٹی کتاب مانتی ہے، اس جماعت کے اولین امام قاضی عیاض (بن موسیٰ مالکی، متوفی ۵۴۴ھ) ہیں انھوں نے "مشارق الانوار"[1] موطا، بخاری، مسلم، کی شرح میں لکھی، اسی عہد کے دوسرے امام قاضی ابو بکر

---

[1] قال الامام عبد العزیز الدھلوی، فی العجالۃ النافعۃ طبقۂ اولی از کتب حدیث سہ کتاب اند موطا، صحیح بخاری، صحیح مسلم قاضی عیاض کتاب "مشارق الانوار"، را برائے شرح ایں ہر سہ کتاب مخصوص نوشتہ، و ایں "مشارق الانوار" غیر مشارق الانوار صغانی است (قال مولانا الشیخ عم فیضہم حسن بن محمد الصغانی الاہوری فقیہہ محدث و اکابر ائمۃ الطریقۃ مثل شیخ الاسلام فرید الدین الاجودنی، و سلطان المشائخ نظام الدین الدہلوی و اکابر فقہاء الہند ترجع اسانیدہم الی الامام العلامۃ الصغانی فی الفقہ والحدیث۔ فانہ اخذ من صاحب الہدایۃ بواسطۃ ولدہ عمر المرغینانی فہو شیخ الہند الاوّل۔ توفی ۶۵۰ھ تنبیہ) کہ احادیث صحیحین در آن بحذف اسناد و تصحیح نمودہ چنانچہ مشارق الانوار عیاض شرح ایں سہ کتاب است و کتاب جامع الاصول، ابن اثیر، شرح صحاح ستہ است و صاحب جامع الاصول ابن ماجہ را در صحاح عد نکردہ۔ بلکہ موطا را ششم قرار دادہ والحق معہ۔ محمد نور الحق غفرلہ

بن عربی مالکی (متوفی ۵۴۳ھ) ہیں ان کے بعد اس فکر کے داعی حافظ مجدالدین ابن[1] اثیر شافعی (مبارک بن محمد مؤلف جامع الاصول، ونہایہ، متوفی ۶۰۶ھ) ہیں جنھوں نے جامع الاصول میں ابن ماجہ، کو نظر انداز کرکے موطا مالک کو چھٹی کتاب قرار دیا، ان کے بعد حافظ علاء الدین مغلطائی بن قلیج حنفی (متوفی ۷۶۲ھ) ہیں اُن کی تصریح ہے "اوّل من صنّف الصحیح مالک" مر قالہ فی المصنف بھران - اساتذہ کی متابعت میں محدثین کی کثیر جماعتیں پیدا ہوئیں۔ شاہ صاحب اُن میں غالباً آخری ہستی ہیں۔

دوسری جماعت نے سنن ابن ماجہ کو چھٹی کتاب قرار دیا۔ پہلے جس[2] عالم نے یہ تجویز کی۔ وہ اسماء الرجال میں تو امام تھے، مگر فقہ اور تعامل سلمین سے قطعاً ناآشنا ہیں، پھر اُن کے تتبع میں عام طور پر یہی کتاب صحاح میں شمار ہونے لگی۔

سنن ابن ماجہ کا علمی درجہ | اس کتاب (ابن ماجہ) کا علمی درجہ فقہاء محققین کے نزدیک یہ ہے کہ ہر وہ حدیث جس میں وہ منفرد ہے، اگر موضوع نہیں تو ضعیف ضرور ہوگی۔

یہ کتاب ہمارے اساتذہ کے یہاں بھی درس میں مروج ہے، اسکو مذکورہ بالا قسم کی غیر صحیح کتب حدیث کے مطالعہ اور سمجھنے کے لئے نمونہ بنایا جاتا ہے، مگر طالب علم ابتداء تحصیل میں ان مشکل مسائل پر غور نہیں کرتے جب ایک عالم ہمارے مشائخ کے پاس درجہ تکمیل طے کرنے لگتا ہے، تب اسے ان دقائق پر متوجہ کیا جاتا ہے۔

درجہ تکمیل | ہمارے یہاں درجہ تکمیل ایک قاعدے میں منضبط شدہ طریقہ نہیں بن سکا، عام طور پر فارغ التحصیل طلبہ جب اپنے طور پر پڑھانے لگتے ہیں تو ان کو شکوک پیدا ہوتے ہیں اور وہ ان کے ازالہ کے لئے پھر اساتذہ کی خدمت میں بار بار آتے ہیں اور تدریجاً ان شبہات کا حل کرتے کرتے درجہ اطمینان تک جا پہنچتے ہیں، ہم ان کو درجہ تکمیل کا فارغ مانتے ہیں۔

میری طالب علمی اسی طرح پر ہوئی، اور میں آخر میں دیکھتا ہوں کہ میں اپنی طرز میں منفرد نہیں تھا، میری طرح میرے ساتھیوں میں اور حضرات بھی تحقیق کرتے کرتے انھیں مسائل پر پہونچے، جہاں میں پہونچا تھا: اس تجربہ کے بعد میں نے یہ نظریہ قایم کر لیا ہے کہ تکمیل کے لئے غیر قانونی طور پر ہماری اساتذہ

[1] احد اسلاننہ الاخوۃ۔ ثانیھم الامام عز الدین، علی بن محمد بن الاثیر، مؤلف الکامل واسد الغابۃ ولباب الانساب مختصر فیہ الانساب للسمعانی۔ توفی ۶۳۰ھ، وثالثھم الوزیر الادیب ضیاء الدین نصر اللہ بن محمد، صاحب "المثل السائر"۔ توفی ۶۳۷ھ ۱۲

[2] بلا وجہ وجیہ کے میں اس عالم کی تعیین کرنے سے قاصر رہا ہوں۔ شاہ ولی اللہ محدث لبعد ذلک امراً۔ ۱۲ نورالحق غفرلہٗ

اپنی صحبت میں رہنے والے عالموں کو مکمل بنا دیتے ہیں۔

نوجوان طلبہ کے ساتھ میرا ان مسائل پر مذاکرہ ہوتا رہا، انھوں نے عام علما کی شکایت کی میں نے انکو اس خاص طبقے (میری طرح تکمیل کرنیوالے حضرات) کا تعارف کرایا جن سے وہ مطمئن ہو گئے جن لوگوں نے اپنی ضد نہیں چھوڑی میں نے انھیں یونیورسٹیوں کے متوسط الاستعداد گریجویٹوں کی کثیر مثالوں سے لاجواب کر دیا۔

فصل (۵) صحیح وضعیف حدیثوں میں تمیز کا ملکہ پیدا کرنیکا ولی اللہی طریقہ

یہ خرابی جو عام اذہان پر مستولی ہے، اس کی تہہ میں یہ مرض پنہاں ہے کہ حدیث کے فن کو خصوصاً تصحیح اور تضعیف کو تقلیداً اخذ کیا جاتا ہے، ایک ایسا عالم جو اپنی سمجھ سے صحیح حدیثوں کو صحیح سمجھتا ہو آج پیدا ہونا متعذر ہو گیا ہے اسماء الرجال میں توثیق وتضعیف کا اختلاف پھر صحیح حدیث کی تعریف میں مختلف آرا طالب العلم میں یکسوئی سے کوئی ملکہ پیدا ہونے نہیں دیتیں، آخر مجبور ہو کر فقہا کا جو متوارث مسلک ہے اُسی میں راجح و مرجوح کی تمیز پیدا کرنے کے بعد، جو حدیث اس مسلک کے موافق ہوا سے صحیح اور جو مخالف ہو، اس کو ضعیف بنانے کی استعداد حاصل ہونے پر طالب علم اپنا سفر ختم کر دیتا ہے۔[۵]

شاہ صاحب نے پہلے اس مرض کی تشخیص میں اپنی پوری طاقت صرف کر دی، اس کے بعد مرض کے ازالہ کا پورا نصاب تیار کر کے اپنے طریقہ کی تعلیم شروع کر دی، اب ان کے طرز پر چل کر مجتہد منتسب کی طرح ایک محقق محدث پیدا ہو سکتا ہے جو ایک نئی حدیث کی تصحیح میں اگرچہ اپنے آپ کو عاجز پاتا ہو گا مگر جن احادیث کو ائمہ نے عموماً صحیح کہا ہے ان کی صحت کے وجوہ معلوم کرنے میں وہ کسی سے پیچھے نہیں رہیگا۔ اس اطمینان کے بعد وہ فقہ پر نظر ثانی کریگا، جو مسائل صحیح احادیث کے مطابق پائیگا انھیں کو راجح مانے گا۔

اس طریقے کے عالم پیدا کرنے سے شاہ ولی اللہ نے سلف کے طریقے کو زندہ کر دیا جسکی مثال تیسری صدی ہجری کے بعد ملنا مشکل ہے۔

شاہ صاحب کی تحقیق میں موطا مالک کی اہمیت حاوضیت

فن حدیث میں شاہ صاحب کی تجدید اس بنیاد پر مرتکز ہے کہ صحاح ستہ میں اصح الکتب بخاری نہیں بلکہ موطا ہے بوجوہ ذیل:-

[۵] یعنی طلبہ مجبوراً حدیث کو ترک کر کے پہلے فقہ حاصل کرتے ہیں اور اس سے نصب العین معین کر کے پھر حدیث کیطرف متوجہ ہوتے ہیں بعد ازاں جو حدیث مقررہ نصب العین کے مطابق پائی اس کو راجح اور جو مخالف نظر آئی اسکو مرجوح قرار دیتے ہیں (حضرت شیخ عم فیضہم) فرالحق

(۱) مؤطا مالک کے اسانید کی تصحیح سمجھنا بہت آسان ہے کیونکہ ان میں عموماً ایک دو ہی راوی ہوتے ہیں جن کا اکثر حصہ علماء مدینہ سے ہے جنکو تمام ائمہ مسلمین معتمد علیہ، اور ثقہ مانتے ہیں، اس لئے ان اسانید کا سمجھنا بہت آسان ہے۔

(۲) ادہر امام مالک کی شاگردی امام شافعی اور امام محمد ہر دو نے کی، ان ہر دو اماموں کی تنقید موطا پر موجود ہے، اس سے بھی انسان کو موطا کی تصحیح میں بڑی مدد ملتی ہے۔
یہ ہر دو مجتہد، امام مالک کے استنباط کی مخالفت تو کرتے ہیں، مگر روایت کی تضعیف نہیں کرتے یہ چیز طالب العلم کے لئے سرمایۂ توثق ہے۔

(۳) اس کے بعد ائمہ حدیث، امام بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی، امام مالک کی کتاب کی شروح[۱] لکھتے ہیں، اس حصے کو شاہ صاحب نہایت وضاحت سے موطا کی شرح میں سمجھا دیتے ہیں۔

قال الامام ولی اللہ فی المسوّٰی ص من تتبع مذاھبھم و رزق الانصاف من نفسہ علم لامحالۃ ان الموطا عدۃ مذھب مالک واساسہ، وعمدۃ مذھب الشافعی واحمد وراسہ، ومصباح مذھب ابی حنیفۃ وصاحبیہ ونبراسہ۔ وھذہ المذاھب بالنسبۃ للموطا کالشرح للمتون، وھو منھا بمنزلۃ الدوحۃ من الغصون، وان الناس وان کانوا من فتاوی مالک فی رد وتسلیم وتنکیث وتقویم، ما صفا لھم المشرب ولا تاتی لھم المذھب الا بما سعی فی ترتیبہ واجتھد فی تھذیبہ وقال الشافعی لذلک لیس احد اٰمن علیّ فی دین اللہ من مالک۔

وعلم ایضا ان الکتب المصنفۃ فی السنن کصحیح مسلم وابی داؤد والنسائی وما یتعلق بالفقہ من صحیح البخاری وجامع الترمذی مستخرجات علی الموطا مطمح نظرھم فیھا وصل ما ارسلہ، ورفع ما اوقفہ واستدراک ما فاتہ وذکر المتابعات والشواھد لما اسندہ واحاطۃ جوانب الکلام بذکر ما روی خلافہ۔ وبالجملۃ فلا یمکن تحقیق الحق فی ھذا ولا ذلک الا بالاکباب علی ھذا الکتاب، انتہی

---

[۱] قال الشیخ الاقدس عم فیضھم الامام ولی اللہ لا یقبل قول اکثر المحدثین فی تقدیم الصحیحین علی الموطا بل یوافق الامام الشافعی حیث قال ما اعلم فی الارض کتابا بعد کتاب اللہ اصح من موطا مالک ویجعل الموطا متنا متینا مقدما علی جمیع کتب الحدیث ویجعل صحیح البخاری ومسلم وغیرھما کالشرح لہ کتاب التمھید۔ موقف ثالث ۱۲ محمد نور الحق غفرلہ العلوی

وقال فی "المصفیٰ"

"یقین معلوم شد کہ طریق اجتہاد و فقہ امروز مسدود است الا از یک وجہ کہ موطا را پیش گیرند، و وصل مرسل آں، و ماخذ اقوال صحابہ و تابعین بہ شناسد، و نظر مجتہدانہ اختیار کنند و تعقبات شافعی و غیر آں در نظر دارد، بعد ازاں جہد کنند بعلم احکام الٰہی و یقین یا غالب رائے حاصل کنند بدلالت دلائل بر آں مسائل"۔

وقال ایضاً:- "چوں مبتدی قدرت بر زبان عربی یافت موطا مالک بخوانانید، و ہرگز آں را معطل نگذارند کہ اصل علم حدیث است و خواندن آں فیض ہا دارد" ۔

وقال فی الحجۃ الطبقۃ الاولیٰ من کتب الحدیث منحصرۃ بالاستقراء فی ثلثۃ کتب الموطا و صحیح البخاری و صحیح مسلم وقد روی الموطا عن مالک بغیر واسطۃ الف رجل وقال الشافعی اصح الکتب بعد کتاب اللہ موطا مالک واتفق اھل الحدیث علی ان جمیع ما فیہ صحیح علی رای مالک و من وافقہ واما علی رای غیرہ فلیس فیہ مرسل ولا منقطع الا وقد اتصل السند بہ من طرق اخری، فلاجرم انہا صحیحۃ من ھذا الوجہ۔ باب طبقات کتب الحدیث۔

وقال الامام عبد العزیز فی العجالۃ النافعۃ، "و نسبت دریں ہر سہ کتب (موطا و بخاری و مسلم) آں است کہ موطا گویا اصل و ام صحیحین است و در کمال شہرت رسیدہ، و ہزار کس از علمائے عصر مالک موطا را روایت کردہ اند، و عدالت و ضبط رجال ایں کتاب مجمع علیہ است، در مکہ و مدینہ و عراق و شام و یمن و مصر مشہور شدہ و بناء فقہاء امصار براں است"۔

لہ قال شیخ الاسلام ابن حجر کتاب مالک صحیح عندہ وعند من قلدہ، فی الاحتجاج بالمرسل والمنقطع و غیرھما یعنی ان العلماء قد اختلفوا فی العمل بالحدیث المرسل والمنقطع فذھب الامام مالک و الامام ابو حنیفۃ واکثر العلماء من تبع التابعین الی صحۃ العمل بہما، ویصح عندھم الاستدلال بقول عمر وامثالہ والاستدلال باتفاق جمع من التابعین من اھل المدینۃ. فالامام مالک عمل بمقتضی اصلہ ولیست ھذہ العلل قادحۃ فی صحۃ الحدیث عندہ، فیکون الموطا کلہ صحیحاً عند مالک وابی حنیفۃ و سائر تبع التابعین۔

وزاد السیوطی علی الحافظ ابن حجر فقال ان المرسل والمنقطع حجۃ عند مالک ومن وافقہ فی ھذہ المسئلۃ وکذلک حجۃ عندنا (ای الشافعیہ) اذا اعتضد بالروایۃ المرفوعۃ او بموقوف صحابی، ولیس فی الموطا مرسل الا وقد اعتضد بالروایات المرفوعۃ بلفظہا او بالمعنی فالصواب ان یقال ان الموطا صحیح عند الجمیع۔ تعریباً مقدمہ مصفیٰ ص ۷ نور الحق

درزمانِ مالک. وبعد از زمان مالک نیز، علما در تخریج بر موطا و ذکر متابعات و شواہد اِحادیث
آن سعی بلیغ نمودہ اند، ودر شرح غریب، وضبط مشکلات وبیان فقہ وسائر وجوہ بیان
آن قدر اہتمام نمودند کہ زیادہ بر آں متصور نیست، صحیح بخاری وصحیح مسلم ہر چند در بسط
وکثرت احادیث دہ چند موطا باشند لیکن طریق روایت احادیث، وتمیز رجال، دراہ
اعتبار واستنباط از موطا آموختہ اند، انتہی۔

(قلت) فتبقدیم الموطا على سائر کتب الحدیث والفقہ تختلف الطریقۃ الولی اللّٰهیۃ عن عامۃ
الفقہاء والمحدثین اختلافاً جوھریاً۔ ومن لم یتفطن بذلک لا یصح ان یعد من اتباع الامام
ولی اللہ انتھی۔ کتاب التمھید۔

پس موطا مالک ایسی مرکزی کتاب ہے جس پر فقہا اور محدثین سب متفق ہیں۔ اب اگر اس کتاب
کو اصل قرار دیکر حدیث کی باقی کتابیں پڑھی جائیں تو اُن کتابوں کی صحت پر یقین حاصل ہو سکتا ہے۔ میں
اس طریقہ پر دو ماہ میں طالب علم کو حدیث سمجھنے کا فن سکھاتا رہا ہوں، آخر میں مکہ معظمہ رہتے ہوئے بھی
حرم محترم کے علمانے مجھ سے یہ فن سیکھا۔

قرآن عظیم ہماری دانست میں اپنے موضوع کی مستقل کتاب ہے، گزشتہ فصول میں ہم نے اسکی
توضیح کرنے کی سعی کی ہے، مگر آیات احکام پر عمل کرنے کے لئے ہمیں دورِ نبوت اور خلافت راشدہ کا طرز
عمل معلوم ہونا ضروری ہے، اس کے لئے ہمیں ایک فقہ کی کتاب درکار ہے جس میں تصریح ہو کہ رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نمازیوں ادا کرتے تھے مسلمانوں سے زکوٰۃ اس طرح وصول کرتے تھے، بیع وشرٰی
کے معاملات اس طرح طے ہوتے تھے۔ غرض تمام آیات احکام کی تفصیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور
خلفاء راشدین کے وفاقی دور (یعنی شہادت عثمانؓ تک) سے معلوم ہونی چاہئے اور یہ چیز موطا میں ملتی ہے۔

حضرت علی کے زمانے میں جب باہمی جنگیں شروع ہوئیں تو حضرت علیؓ مدینہ منورہ چھوڑ کر عراق
تشریف لے گئے، یعنی اہل مدینہ نے جو علم سیکھا تھا اس پر فتنہ کا کوئی اثر نہیں پڑ سکا۔

اس کے بعد بنی امیہ کے دور میں سیاسی مرکز دمشق بنا۔ مگر انھوں نے علمی مرکز مدینہ طیبہ ہی کو تسلیم
کیا۔ اس سے اہل مدینہ کا توارث، بہت سے مسائل کو آسانی سے حل کرنیکا سبب بنا، اور یہ توارث
موطا میں ملتا ہے "السنۃ التی لا اختلاف فیھا عندنا کذا وکذا"، کا جملہ امام مالک جب ارشاد کرتے
ہیں تو اس سے یہی توارث مراد ہوتا ہے جو خلافت راشدہ سے شروع ہو کر بنی امیہ کے دور تک قائم رہا۔

فقہاء سبعہ | مدینہ منورہ میں صحابہ کرام کے بعد سات[1] فقہا پیدا ہوئے (۱) سعید بن مسیب (۲) عروہ بن الزبیر (۳) قاسم بن محمد بن ابی بکر الصدیق (۴) خارجہ بن زید بن ثابت (۵) عبید اللہ بن عبد اللہ بن مسعود (۶) سلیمان بن یسار (۷) ابوبکر بن عبد الرحمن ابن حارث یا سالم بن عبد اللہ بن عمر یا ابوسلمہ بن عبد الرحمن بن عوف ؓ تعریب مقدمہ مصفی صفحہ ۳

ان فقہاء سبعہ نے اہل مدینہ کے تمام تر علم کو محفوظ کر دیا۔ پھر اُن کے شاگردوں (امام ابن شہاب زہری وغیرہ) سے امام مالک نے علم لیا، لہذا اس سے بڑھکر دنیا میں کسی کتاب کا صحیح ملنا ناممکن ہے۔

فصل (۶) | امام علماء نے موطا کو اسقدر اہمیت کیوں نہیں دی؟

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اہل علم نے کیوں اس کتاب کو موخر کر دیا؟ اسکا جواب معلوم کرنے کیلئے اس حقیقت کا سمجھنا ضروری ہے کہ جو علوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمانوں میں محفوظ ہیں اُن کی چار قسمیں قرار دیجاتی ہیں (الف) علم فقہ (ب) مغازی وسیر (ج) تفسیر (د) فتن وملاحم، امام بخاری کی کتاب ان ہر چار فنون کی جامع واقع ہوئی ہے۔ اور اس طرح کی جامع کتاب اور اس سے بڑھکر صحیح مجموعے کا ملنا ممکن نہیں ہے بنا بریں اہل علم سب اسی پر ٹوٹ پڑے۔

امام ولی اللہ قرآن عظیم کے معانی کو علیحدہ علیحدہ ابواب میں تقسیم کر چکے ہیں اور ان کے نزدیک ہر ایک باب اُن میں سے اپنے افادے میں مستقل ہے، نہ تو کسی پہلی کتاب کا محتاج ہے، اور نہ کسی بعد کے علم وعمل سے متاثر ہوتا ہے۔ البتہ فن احکام عملی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ سمجھنے کا محتاج ہے، خیر القرون میں جس طرح قرآن شریف پر عمل کیا گیا، وہ اہل مدینہ کے یہاں محفوظ تھا

---

[1] استاذ امام ابو منصور عبد القاہر تمیمی بغدادی، متوفی ۴۲۹ھ کتاب اصول الدین صفحہ ۳۱۲ میں لکھتے ہیں۔ اربعة من الصحابة تكلموا في جميع ابواب الفقه، وهم علي وزيد وابن عباس وابن مسعود (۱) وهؤلاء الاربعة متى اجمعوا في مسئلة على قول فالامة فيها مجتمعة على قولهم (۲) وكل مسئلة اختلف فيها هؤلاء الاربعة فالامة فيها مختلفة ۱ وكل مسئلة انفرد فيها علي بقول تبعه فيها ابن ابي ليلى والشعبي وعبيدة السلماني ۲ وكل مسئلة انفرد فيها زيد اتبعه مالك والشافعي في اكثره۔ ويتبعه خارجة لا محالة ۳ وكل مسئلة انفرد فيها ابن عباس اتبعه فيها عكرمة وطاوس وسعيد بن جبير ۴ وكل مسئلة انفرد فيها ابن مسعود تبعه فيها علقمة والاسود ثم من بعد الصحابة مرتبة الفقهاء السبعة وهم سعيد بن المسيب وعروة بن الزبير وخارجة بن زيد والقاسم بن محمد وسليمان بن يسار وعبيد الله بن عبد الله بن مسعود وابوبكر بن عبد الرحمان بن الحارث بن هشام ۱۲

اور موطا اس کا ایک اچھا نصاب ہے، اس لئے قرآن کریم پڑھنے کے بعد موطا کی ضرورت بہر حال باقی رہیگی شاہ صاحب کی تقسیم میں احکام کے سوا جو فنون ہیں۔ اُن میں قرآن حکیم کسی فن (مثلاً مغازی و تفسیر اور فتن و ملاحم) کا محتاج نہیں ہے، اب ایک ایسے امام کے لئے جو اسلام کو قرآن شریف میں مکمل پاتا ہو، موطا جیسی فقہ کی کتاب کے سوا کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوگی۔

پھر شاہ صاحب کو یہ بھی معلوم ہو کہ امام احمد بن حنبل مغازی، تفسیر اور ملاحم میں صحیح روایات کا انکار کرچکے ہیں

وصیت شیخ الهندؒ مجھے مولانا شیخ الہند نے دو کتابوں کے مطالعہ کی وصیت فرمائی۔

(الف) فنون حدیث میں میرا شغف دیکھا کہ میں تمام کتابوں کو جمع کرنیکا از حد ساعی ہوں، تو حضرت نے مجھے فرمایا کہ تمہیں صحاح سے اگر مزید کی ضرورت ہو تو مسند امام احمدؒ کو کافی سمجھو۔

(ب) اور شرح حدیث میں فتح الباری سے تمسک کرو۔

مسند احمد شاہ صاحب کا طریقہ سمجھنے کے بعد مجھے صحاح سے زائد متون کی حاجت محسوس نہیں ہوئی۔

(۱) مسند احمد کے متعلق افسوس ہے کہ اس میں ان کے بیٹے عبد اللہ کی روایتیں ملا دی گئی ہیں۔

(۲) اور جن روایتوں کو امام احمد نے صراحتہً غیر صحیح کہا، اور مسند سے ان کو کاٹ دیا تھا کاتبوں نے وہ بھی اس میں درج کر دی ہیں۔

(۳) ایک اور اتفاقی مصیبت یہ پیش آئی کہ امام احمد جب گھر میں معتکف ہو چکے تھے اسوقت ان سے مسند پڑھا گیا ہے۔ اور امام کے بیٹے عبد اللہ کے سوا اس کا اور کوئی راوی نہیں ہے، اور عبد اللہ ابن احمد اتنا لائق اور قابل اعتماد نہیں ہے جتنا کہ اس کتاب کی روایت کے لئے ثقہ ہونا ضروری ہے، یہ کتاب یا تو مجمع مسلمین میں پڑھائی جاتی، اور متعدد لوگ اس کے راوی ہوتے۔ اور یا عبد اللہ سے کوئی بہت بڑا فاضل اس کا راوی ہوتا۔

ان حالات کے پیش نظر مجھے ادھر توجہ کرنیکی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، پھر بھی میں نے اس

لہ فی الحجۃ - کاد مسند احمد ان یکون من جملۃ الطبقۃ الثانیۃ (ای سنن ابی داؤد وجامع الترمذی ومجتبی النسائی) فان الامام احمد جعلہ اصلاً یعرف بہ الصحیح من السقیم وقال احمد، ما لیس فیہ فلا تقبلوہ ۱۵

وفی العجالۃ النافعہ - حضرت والد ماجد قدس سرہ مے فرمود وند کہ مسند امام احمد نزد فقیر نیز از طبقہ ثانیہ است و دے اصل است در معرفت سقیم از ضعیف و بہ دے شناختہ مے شود حدیثے کہ آں را اصل ہست، و آنچہ درو اصل نیست گر آنکہ در مسند بعض احادیث ضعاف بسیار اند - کہ دل آں بایں نکردہ اند - اما ضعیف ، در بسیت از آں احادیث کہ متاخرین تصحیح آں مے کنند، بہتر است ثانیہ - و علمائے حدیث و فقہ آں را پیشوائے خود ساختہ اند و حقیقت یکن اعظم است در فن حدیث اھ ۱۲

محمد نور الحق

سے استفادہ کیا، اور خاص خاص عالموں کے لئے یہ سرمایہ مطالعہ مفید ہو سکتا ہے عام طور پر اس کے ذکر کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

فتح الباری اس کے بعد میں نے فتح الباری سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے، اور اس کا یہ نتیجہ تھا کہ میں صحیح بخاری کو حافظ ابن حجر سے بھی بڑھکر اصح الکتب مانتا تھا جن چالیس حدیثوں پر ابن حجر نے جرح کر کے لکھا کہ اس جرح کا کوئی جواب نہیں بن پڑتا، میں انکا بھی جواب دینے کے لئے تیار تھا، مجھے یہ بُرا معلوم ہوتا تھا کہ طالبعلم کو حدیث کی جو پہلی مرکزی کتاب پڑھائی جائے، اس پر بھی اُسکو اعتماد کامل نہ ہو

سبب الرجوع الی المؤطا میرا کافی زمانہ اسی طرح گزرا، اس کے بعد شکوک پیدا ہونا شروع ہوئے جبکہ میں نوجوان تعلیم یافتہ گروہ سے ملنے لگا تو بعض چیزیں انکو سمجھانا میرے لئے مشکل ہوا میں نے صحیح بخاری کے ابواب میں ربط پیدا کرنے کی اسی طرح کوشش کی جس طرح ایک سورت کی آیات میں تناسب پیدا کرتا رہا ہیں نے ان چیزوں میں سے بعض چیزیں مولنا شیخ الہندؒ کو سنائیں آپنے بہت پسند کیں میں نے اس کے لئے قواعد کلیہ ضبط کر لئے ہیں جنھیں لکھ نہیں سکا۔ یہ چیز میرے پاس فتح الباری سے زائد تھی۔

مگر جس قدر میری توجہ قرآن عظیم کی طرف بڑھتی گئی۔ اور نوجوانوں کو بخاری کی بعض احادیث کا سمجھانا مشکل ہوتا گیا۔ اسی قدر میرے سابقہ یقین میں تزلزل پیدا ہونے لگا[1] میں اسکا بھی قائل نہیں ہوا

---

[1] "الفرقان" صرف اس بناپر کہ جدید تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ کو صحیح بخاری کی بعض احادیث کا سمجھانا مشکل ہو اس کی صحت کے یقین میں "تزلزل" پیدا ہونا باوجود غور کے سمجھ میں نہیں آسکا ــــ اس ناچیز نے بھی اس طبقہ کی دینی تعلیم کا کچھ تھوڑا سا تجربہ کیا ہے اور اس تجربہ نے اس نتیجہ پر پہونچایا ہے کہ انمیں سے جن افراد کی ذہنیت صرف کالج ہی میں بنی ہے یعنی ان کو کسی اچھی سوسائٹی یا گھر کی فضا سے اچھے اثرات لینے کا کوئی موقع ہی نہیں ملا اور صرف کالج ہی کی فضا ان پر اثر انداز ہوئی ہے اور ویسی ہی سوسائٹی ان کی رہی ہے ــــ ان کا حال عموماً یہ ہے کہ "قرآن عظیم" کے بھی بہت سے حصے کا سمجھانا انھیں مشکل ہے، بالخصوص آغاز آفرینش کے متعلق قرآن پاک جو کچھ کہتا ہے اور ماورائیات کے متعلق اس کے جو بیانات ہیں آج کل کے کتنے ہی جدید تعلیم یافتہ نوجوان ہیں۔ جو از راہ عناد و تمرد نہیں بلکہ ذہنیت کی مادی کیوجہ سے علمی طور پر ان کو نہیں قبول کر سکتے ــــ ایسے نوجوانوں کے لئے خود میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ان کو ابتداءً قرآن پاک لفظی ترجمہ نہیں پڑھایا بلکہ پہلے دو تین مہینہ میں اپنے مخصوص طریقے پر میں نے اسقدر عربی زبان ان کو سکھائی کہ وہ قرآن کو حقیقی معنی میں پڑھ سکیں اور اس دو تین مہینے میں مسلسل تبادلہ افکار کے ذریعہ انکی ذہنیت کو ہموار کرنے کی کوشش میں بھی لگا رہا اس کے بعد بھی انکو قرآن پاک ایک سرے سے شروع نہیں کرایا بلکہ ابتداءً ایسی سورتیں منتخب کیں جن کے مضامین کو وہ بآسانی سمجھکر قبول کر سکتے تھے، اس تدریجی عمل سے بفضلہ تعالیٰ وہ قرآن کی ادق تعلیمات کو بھی قبول کرنے کے قابل ہو گئے (بقیہ برصفحہ آیندہ)

کہ دینی تعلیم اگر عربی مدارس کے طلبہ کو دیجائے تو اطمینان بخش ہو، اور اگر دینی تعلیم کالج کے طلبہ کو دیجائے تو اطمینان پیدا نہ کرسکے، اگر ایسا ہو تو وہ تعلیم حقیقی اسلام کی تعلیم نہیں ہوگی، اس لئے کہ قرآن ساری دنیا کے لئے نازل ہوا ہے، اگر کالج کے طلبہ کو ہم قرآن کی تعلیم اسی طریقے پر (جو عربی مدارس میں کامیاب ثابت ہوا) نہیں دے سکتے تو غیر مسلم لوگوں کو ہم کیا پڑھا سکتے ہیں۔

اس طرح ابن حجر کی تحقیقات سے میری طبیعت غیر مطمئن ہونے لگی، رحمت الٰہی کا ایک کرشمہ سمجھنا چاہیے کہ مجھے موطا مالک کی شرح التمہید، از حافظ ابن عبد البر (یوسف ابوعمر مغربی متوفی ۴۶۳ھ)

(بسلسلہ صفحہ گزشتہ) جو شروع میں ان کے لئے ناقابل فہم تھیں ـــــ میرا خیال ہے کہ اس تدریجی طریقہ سے ان کو صحیح بخاری بھی پڑھائی جاسکتی ہے ـــــ علاوہ ازیں اس یورپ زدہ طبقہ، یا یورپین نو مسلموں کے "فہم و عدم فہم" کو احادیث کی صحت و عدم صحت کے لئے کسوٹی بنانا تو تجربہ سے قطع نظر علمی و عقلی طور پر بھی صحیح نہیں ـــــ اور اس معیار پر تو قرآن کے بعض حصے بھی قابل غور ہو جائیں گے۔

(۲) نیز اس باب میں عربی مدارس کے طلبا کا اس طبقہ سے مختلف الحال ہونا اور اس کی وجہ بھی بالکل ظاہر ہے، تحتانی درجات کے تعلیمی اثرات کے علاوہ مدارس عربیہ کا ماحول بھی ہمارے طلبہ کے ذہن کو "علوم نبوت" سے قریب تر کرنے میں کافی مدد دیتا ہے، بخلاف یورپی علوم کی درسگاہوں کے کہ وہاں کا ماحول اور وہاں کی تعلیم نہ صرف یہ کہ اس بارہ میں کوئی مدد نہیں دیتے بلکہ انسانی ذہن کو وہ علوم نبوت سے اور دور کر دیتے ہیں، اس لئے عربی مدارس کے طلبہ کا قرآن و حدیث کے علوم کو بآسانی قبول کرسکنا، اور "کالجوں" کے تعلیم یافتوں کے لئے اُن کا مشکل ہونا اور بعض چیزوں کو نہ سمجھ سکنا بالکل فطری چیز ہے جس میں قرآن یا حدیث کا کوئی قصور نہیں۔

اس موقعہ پر یہ سطریں لکھنے کی جسارت اس لئے کرنی پڑی کہ موطا کے بعد صحیحین کے متعلق خود حضرت شاہ صاحبؒ کا یہ فیصلہ ہے کہ "اما الصحیحان فقد اتفق المحدثون علی ان جمیع ما فیہما من المتصل المرفوع صحیح بالقطع وان کل من یھون امرھما فھو مبتدع متبع غیر سبیل المومنین الخ حجۃ اللہ البالغہ ص۱۳۳" ۱۲ نعمانی غفرلہ

لہ کتاب التمہید از ابن عبد البر کا مکمل نسخہ مغرب میں موجود ہے، مکہ معظمہ کے زمانہ اقامت میں مجھے یہ معلوم ہوا تھا، ہندوستان میں اس کی چند جلدیں میرے مطالعہ سے گزریں جن کا تعلق مولوی شمس الحق عظیم آبادی کے کتب خانہ سے تھا بعد ازاں کابل میں چند اور جلدیں اسی کتاب کی میرے مطالعہ میں آئیں، لیکن میں یہ دیکھکر حیران رہگیا کہ ہند اور کابل کے نسخوں کا کاتب ایک ہی ہے۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ جب ہندوستان غارت ہوا تو یہ جلدیں یہیں سے کابل پہونچیں۔

اڑ اُئے کچھ ورق لالہ نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری
(قال مولانا الشیخ)

نور الحق علوی

مل گئی، اس نے فتح الباری کی جگہ لے لی، میں حافظ ابن حجر کی نسبت ابن عبدالبر کو بہت بڑا محقق مانتا ہوں
ادہر شاہ ولی اللہ کا زور تھا کہ موطا کو سب پر ترجیح دینا لازم ہے، اب میں اس کا قائل ہونے لگ گیا
موطا میں وہ تمام مشکل حدیثیں نہیں پائی جاتیں جنکا سمجھنا نوجوانوں کے لئے بہت مشکل ہے۔
اب ان مختلف اثرات کا مجموعی نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن عظیم کے بعد میں شاہ ولی اللہ کی کتاب مسوّیٰ
شرح موطا کا پڑھنا، حدیث اور فقہ کے لئے کافی سمجھتا ہوں، اور یہ اسلام میں ساری دنیا کو سکھا
سکتا ہوں، مسلمانوں کو ائمہ فقہا کے طریقے پر اور غیر مسلمونکو حکمت کے اصول پر۔
جہانتک میرا حلقہ اثر رہا، میں اس میں خدا کے فضل سے کامیاب رہا ہوں، اس سے مجھے
شاہ ولی اللہ کی اس تجدید کی (کہ موطا اصح الکتب ہے) برائی العین قدر و قیمت نظر آنے لگی
متاخرین محدثین اس چیز کی طرف قطعاً متوجہ نہیں ہیں۔ میں ان کی تعلیمات کو درجہ تکمیل کے لئے توجاً
قرار دیتا ہوں، مگر قرآن سمجھنے کے لئے ان کی تعلیمات کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔
مولنا حمیدالدین مرحوم میرے بہت پرانے دوست تھے، قرآن شریف کے تناسق آیات میں
ہمارا مذاق متحد تھا، اگرچہ طریقے اور پروگرام میں کسی قدر اختلاف رہا، وہ بائبل مجھ سے بدرجہا اعلیٰ جانتے
تھے، اور میں حدیث ان سے زیادہ جانتا تھا، جب تک میں ہندوستان میں انسے ملتا رہا حدیث شریف کے
ماننے نہ ماننے کا جھگڑا کبھی ختم نہیں ہوا۔ اتفاقاً جس سال میں مکہ معظمہ پہنچا ہوں اسی سال وہ بھی حج کے
لئے آئے، ہماری باہمی مفصل ملاقاتیں رہیں، افکار میں بے حد توافق پیدا ہوگیا تھا۔ مگر وہاں بھی
حدیث کے ماننے نہ ماننے پر بحث شروع ہوگئی، ہم نے سختی سے ان پر انکار کیا، اور کہا کہ حدیث کو ضروری
ماننا پڑے گا، تنگ آکر فرمانے لگے، آخر آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا موطا مالک! فرمایا ہم اسکو
مانتے ہیں، میں نے کہا بس آج سے ہمارا نزاع ختم ہے۔ ہم آپ کو صحیح بخاری ماننے کے لئے مجبور نہیں
کرتے! رہا یہ کہ صحیح بخاری میں میرے اشکالات کیا ہیں، اور میں ایک یورپین مسلم کو وہ کتاب کیوں نہیں
پڑھا سکتا، ان تفاصیل پر میں مجالس عامہ میں گفتگو کرنیکا روادار نہیں، اہل علم جو تکمیل کر چکے ہیں، یا تکمیل
کے قریب ہیں ان سے میں مذاکرات میں سب کچھ کہدونگا، میں نے یورپ کا سفر سخت انقلابی حالات
میں کیا ہے اور بحمداللہ شاہ ولی اللہ کے طریقہ پر قرآن دانی اور موطا مالک کی فقہ کو مانتا ہوا سالم نکل آیا
ہوں۔ یہ میں شاہ صاحب کی تجدید کی بہت بڑی برکت مانتا ہوں، کاش اہل علم ادہر توجہ کریں۔ اور
نوجوان مسلمان کی مرکزی طاقت (یعنی عربی مدارس اور کالج کے طلبہ) سے ہونہار افراد کو جمع کر کے ایک
شیرازے میں باندھ دیں۔

باب چہارم علم فقہ

فصل اوّل (عرب) : عرب اور رسول اللہ کی بعثت کا مقصد

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے متعلق سورۂ جمعہ میں تصریح کردی گئی ہے کہ اس کے پہلے مخاطب اُمیین ہیں، امیین سے مراد عرب کے وہ طوائف ہیں جنھوں نے قریش کی امامت کو تسلیم کرلیا ہے ، بعثت کا مقصد دوسرے موقع پر قرآن عظیم نے اس طرح واضح کیا کہ ابراہیم اور اسمعیل علیہما السلام نے مل کر دعا کی کہ ہماری نسل سے ایک امت مسلمہ (یعنی ابراہیمی حنیفی ملت پر) پیدا کی جائے اور یہ بیت ، اس کا منبع اور اس کا مرکز ہو۔ اس امت مسلمہ کو ایک نبی کی ضرورت ہوگی، جو ملت حنیفیہ کی صحیح معنوں میں تعلیم دے، اور ان کو اس کے لئے تیار کرے کہ اس دین کو وہ تمام امم میں پہنچا سکیں یعنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت قریش کے لئے ہے[۱] (؟) قریش عربی قوموں میں مل جل کر عرب بن چکے ہیں ، یہ سلسلہ اسمعیل علیہ السلام کی اولاد میں پہلے طبقہ سے شروع ہوا ، اسمعیل کی اولاد قبائل میں

[۱] "الفرقان" اس موقع پر اصل مسودہ مضمون میں یہی الفاظ ہیں ، میں نے ایک عریضہ کے ذریعہ مولانا کو ان الفاظ کیطرف توجہ بھی دلائی تھی ، لیکن پھر بھی مولانا نے یہ الفاظ برقرار رکھے اور تحریر فرمایا کہ اس کی تفصیل حضرت شاہ صاحبؒ کی کتاب "تفہیمات الہیہ" جلد اول ص۳۳ میں مذکور ہے ، اسوقت اتفاق سے میرے پاس "تفہیمات" کا نسخہ نہیں ہے کہ میں مراجعت کر کے اس کے منشا کو سمجھ سکوں لیکن یہ بالکل ظاہر ہے کہ اسکا مطلب آنحضرت کی بعثت عامہ کو قریش یا صرف عرب کے ساتھ مخصوص کرنا نہیں ہے جیسا کہ بادی النظر سے شبہ ہوتا ہے کیونکہ اس سے اوپر والی سطر میں آپ کے دین کے "تمام امم" کے لئے ہونے کی تصریح موجود ہے اور آگے بھی اسی بحث میں یہ تصریح چند جگہ ملیگی ۔ نیز قرآن پاک میں بار بار اسکا اعلان کیا گیا ہے کہ آپ کی رسالت تمام اقوام عالم کیلئے ہے (قال تعالیٰ ، قل یا ایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا الذی لہ ملک السموات والارض وقال تعالیٰ : تبارک الذی نزل الفرقان علیٰ عبدہ لیکون للعالمین نذیراً ـــــــ وقال تعالیٰ ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظہرہ علی الدین کلہ ۔ الی غیر ذالک من الآیات) ـــــــ تو غالباً اس سے مولانا کا منشا یہ ہوگا کہ آپ کی اولین بعثت قریش کے لئے ہے اور آپکے ذریعہ سے من حیث القوم قریش ہی کو وہ بلند مقام دینا مقصود ہے جسکی دعا حضرت ابراہیم و اسمعیل علیہما السلام نے کی تھی اور قریش ہی آپ کے اولین مخاطب ہیں اور باقی دنیا کے لئے وہی آپ کے پیغام کے حامل اور مبلغ
(بقیہ از صفحہ ۱)

تقسیم ہوگئی ہر جگہ انھوں نے اپنا مرکز دعوت قایم کیا، اور اس گروہ خاص کی امامت حاصل کرلی، یہانتک کہ تورات میں جو بارہ سرداروں کی پیشگوئی ہے، اہل کتاب اسکو اسمعیل علیہ السلام کی بلا واسطہ صلبی اولاد پر حمل کرتے ہیں، ہم ان کی تاویل کو ملت عربیہ یعنی حنیفیت کی اشاعت کے لئے تسلیم کرتے ہیں کہ انہیں بارہ سرداروں (یعنی حقیقی بلا واسطہ فرزندان اسمعیل) نے حنیفیت کا مرکز عرب میں پیدا کیا، بہت دیر کے بعد قصی نے منتشر اولاد اسمعیل کو مکہ معظمہ میں جمع کردیا، یہاں سے خاتم النبیین کی بعثت کا ارھاص شروع ہوتا ہے، یہ لوگ (جماعت قصی بن کلاب) فقط عرب کی سرداری پر اکتفا کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ عراق و شام میں تجارت کے ذریعہ اپنا رسوخ پیدا کررہے تھے اسطرح یہ مجمع الاقوام بناکر ان پر سرداری اور حکومت کی متمنی تھے، یہ چیزیں ان کے یہاں خاندانی روایات کے ذریعے منتقل ہوتی رہتی تھیں کہ ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ایک بہت بڑا نبی پیدا ہوگا جو ہمیں تمام اقوام کا سردار بنادیگا، بنی اسرائیل میں بھی یہی جذبہ موجود تھا۔ اور اس معنی میں ہر دو خاندانوں کی باہمی رقابت جاری تھی۔

بنی اسرائیل پہلے تو موسیٰ علیہ السلام کے بعد کسی کو ان کے برابر ماننے کے لئے تیار نہیں ہوئے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کام موسیٰ علیہ السلام نے کیا ان کے نزدیک وہی ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا مصداق تھا مگر ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم اسرائیلی قوموں سے باہر نہیں جاسکی۔

مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام ضرور ایسے بزرگ تھے جنھوں نے اس تعلیم کو غیر اسرائیلی لوگوں میں بالفاظ دیگر صابئین یا آرین قوموں میں بھی پہونچانے کی کوشش کی، مگر ان کی مرکزیت کو اسرائیلی قوموں نے ہی قبول کرنے سے انکار کردیا، یہود عموماً مسیح علیہ السلام کی تعلیم سے کم مستفید ہوئے، اگرچہ آگے چل کر موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم کو دنیا میں سنبھالنے والے یہی لوگ رہے جو مسیح کے حواریین سے مستفید ہوئے، آج ہمارے زمانے میں جسقدر توراۃ کی اشاعت ہے کیا یہ یہودیوں کی محنت کا نتیجہ ہے؟ ہرگز نہیں مسیح کی تعلیم کے شائع کرنے سے پہلے عہد قدیم کا شایع کرنا ضروری تھا، اس لئے مسیحی سلطنتیں اور مسیحی اشاعتی جماعتیں، عہد قدیم کی اشاعت کا ذریعہ بنیں۔

ان چیزوں کا اثر قریش کے اولی الرائے بزرگوں پر پڑتا رہا، وہ دیکھتے تھے کہ عیسائیوں نے

(سلسلہ صفحہ گزشتہ) ہیں جیسا کہ حضرت شاہ صاحب الفوز الکبیر میں مقصد بعثت پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

خدا تعالیٰ خواست کہ بدست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عرب را پاک کند و بدست عرب سائر اقالیم را الخ	خدا تعالیٰ نے چاہا کہ آنحضرتؐ کے ذریعہ سے عرب کو پاک کرے اور ان کے ذریعہ سے ساری دنیا کو

یہانتک کتابت بھی ہوچکی تھی اس کے بعد "تفہیمات" اور "حجۃ اللہ البالغہ" میں بھی اس بحث کے مطالعہ کا موقع ملا اور وہیں سے پورا مطلب حل ہوا۔ اب میں انشاء اللہ اپنے مقالہ میں اس مقام کی وضاحت کرسکونگا - ۱۲ نعمانی غفرلہٗ

بڑی بڑی سلطنتیں قائم کرلیں۔ مگر وہ حنیفی دین کو سنبھال نہیں سکے۔ اس سے قریش مکہ کے مرکز میں یہ توقع فطرتی کے بعد سلسل زور سے قائم رہی کہ ہم میں سے کوئی آدمی پیدا ہوگا جو اسلی مرکز پیدا کریگا۔

جملہ معترضہ [اجتماعیت اسلامیہ، اور انفرادیت مخترعہ]

ہمارے اہل علم ایک لمبے زمانے سے سلاطین کی انفرادی تحریکوں کا شکار ہو رہے ہیں، انھوں لے اسلام کی اجتماعی قوت کو نظر انداز کر دیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور رسالت پر اسطرح غور کیا جاتا ہے کہ ساری نسل انسانی میں خدا تعالے کو منظور تھا کہ ایک اکمل انسان پیدا کرے وہ فرد فرید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے، اس موضوع کی ہر عالم اپنے فن سے توضیح کرتا ہے، اسی پر سیرت کی کتابیں کثرت سے لکھی گئیں۔

ہم نے جب سے یورپ کی سیاسیات کا براہ راست مطالعہ شروع کیا ہمیں انسانی اجتماعی تحریک کے دونوں اسکولوں (یعنی سرمایہ دار اور محنت کش) کے مطالعہ کا ایک حد تک پورا موقع ملا۔ آج کل کے لیڈر بین الاقوامی تحریکوں کو چلانے کے لئے مذہب سے عداوت رکھنا ضروری خیال کرتے ہیں، سوشلسٹ اپنے مافی الضمیر کو چھپانے کی ضرورت نہیں جانتے، وہ علانیہ مذہب پر حملہ کرتے ہیں، سرمایہ دار اسکول معناً ان کا ہم صفیر ہے، مگر اپنی سیاست کو چلانے کے لئے مذہبی لوگوں کو استعمال کرتا رہتا ہے اس لئے یہ لوگ علانیہ مذہب سے دشمنی نہیں خریدتے۔

ہم نے اس اجتماعی تحریک کا لادینیت سے کوئی طبعی ربط محسوس نہیں کیا، اس لئے ہمنے لادینیت کو اجتماعی تحریک سے نکالکر باہر پھینکدیا، اب اسلام میں جو ہماری واقفیت تھی وہ دیوبندی اسکول میں تعلیم پانے سے شاہ ولی اللہ کی امامت پر مرتکز تھی، شاہ صاحب کی کتابوں میں ہمنے اجتماعیت کا تمام زور دیکھا اگرچہ وہ اُسے نمایاں نہیں کرنا چاہتے۔ کیونکہ ملک کی عام حالت اس کو برداشت نہیں کر سکتی تھی، ہمارا زمانہ شاہ پرستی کو چھوڑ کر بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ مجھے کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ شاہ صاحب کیطرح میں بھی اجتماعیت اسلامیہ کو نمایاں کرنے میں تامل کروں، میرے لئے زیادہ سے زیادہ یہی نقصان ہوگا کہ میرے دوستوں میں جن لوگوں نے شاہ صاحب کی حکمت غور سے نہیں پڑھی۔ وہ میری مخالفت پر ٹوٹ جائیں گے لیکن اب ہماری حالت ایسی کمزور ہو چکی ہے کہ ان کمزور طاقتوں کی رعایت کرنا کوئی ضروری امر نہیں رہا، شاہ صاحب کے زمانے میں پھر بھی مسلمانوں کا ایک سرمایہ محفوظ تھا۔ اس کی حفاظت کے لئے وہ مصالح وقتیہ کا خیال کرتے رہے، دو سو برس کے بعد وہ سب کچھ لٹ چکا ہے کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہی جسکی حفاظت کیلئے ہم مصلحت وقتیہ کا خیال دل میں لاسکیں۔

اس لئے شاہ صاحب کی اصلی تعلیم کو، پوست کندہ، تمام اصناف انسانیت میں شائع کرنا، میں نے اپنا مقصد زندگی بنالیا ہے۔

اس فیصلے کے بعد پہلا اثر میرے افکار پر یہ آیا کہ مجھے قرآن شریف کی تفسیر پر نظر ثانی کرنا پڑی اسمیں سے انفرادیت کو خارج کرکے اصول اسلامیہ کی اجتماعی روح کو قائم رکھنا میں نے اپنے لئے ضروری قرار دیا، ورنہ میں دنیا کی اقوام کے سامنے قرآن پیش نہیں کرسکونگا۔

اگر قرآن شریف کی تعلیم کا مرکز میرے ذہن میں یہ ہوتا کہ وہ ایک اکمل ترین انسان کے ذریعہ نازل ہوئی، اس لئے دنیا کو وہ پیغام سننا چاہئے تو مجھے اندیشہ ہے کہ ہر قوم اپنے بزرگ و معتقد کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں مسیحی قومیں معارضے میں اکمل ثابت کرنیکی سعی کریگی، اور وہ مقصد ان مبادی کے طے کرتے کرتے قابل توجہ نہیں رہیگا۔

میں قریش کی ہستی ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کی دعاء کا پہلا نتیجہ قرار دیتا ہوں، کہ ایک امت ہونی چاہئے کہ وہ امم کو ہدایت دے (ومن ذریتنا امۃ مسلمۃ لک)

پھر اس امت کی ضرورتوں کے لئے ایک فرد امام درکار ہے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق دنیا سے بواسطہ قریش ہے اس نکتہ[1] سے میرے بہت سے عقدے حل ہوگئے۔

میں قریش میں فردیت اور صنفیت کا قائل نہیں رہا۔ اس لئے ہاشمیت، صدیقیت اور فاروقیت کے الفاظ میرے دماغ سے نکل چکے ہیں۔ ایک حدیث میں آیا ہے "الائمۃ من قریش" ایک اور روایت میں آیا ہے کہ بارہ سردار[2] پیدا ہوں گے۔ "کلھم من قریش"، مگر اب انفرادیت نے ہمارے دماغ خراب کر دئیے ہیں۔

اس کے بعد سورہ بقر کی آخری آیتوں میں "لا نفرق بین احد من رسلہ" سے میں یہ سمجھا کہ پہلے ہمیں تمام انبیاء اللہ پر ایمان صحیح حاصل کرنا ضروری ہے، ان میں سے ایک فرد اکمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جماعت انبیاء سے قطع کرکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر

---

[1] یہاں مولانا نے اپنے اس مدعا اور اس نکتہ کو جو اہل علم کے لئے بھی نامانوس ہے بہت ہی ایجاز و اختصار سے بیان فرمایا ہے جس سے بہت سوں کو طرح طرح کے شبہے پیدا ہونیکا قوی امکان ہے کاش مولانا ایک مستقل مقالہ میں اس مقصد پر وضاحت سے روشنی ڈالیں ۱۲ نعمانی

[2] وسیاتی تحقیقہ۔ فانتظر ۱۲ محمد نور الحق غفرلہ العلوی

غور کرنا میرے نزدیک صحیح نہیں رہا۔

ہم لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے شخصی اوصاف میں اس قدر انہماک کر چکے ہیں کہ انکی پیدا کی ہوئی جماعت کی قدر وقیمت ہماری نظروں سے جاتی رہی، مگر قرآن شریف کا ایک اشارہ ہمارے اس تخیل کو درست کرنے کے لئے کافی ہے۔

(۱) محمد رسول اللہ کے ساتھ "والذین معہ" ملا کر آپ کی تمام کامیابی کو جماعتی کام بنا دیا گیا ہے۔

(۲) کتب حدیث میں ایک جملہ معروف ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت بر سر حق رہیگی، انکی تفسیر میں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "ما انا علیہ و اصحابی"،

(۳) قرآن عظیم نے جو دعا ہمیں اسلامی عقائد پر مضبوط رہنے کے لئے سکھائی وہ سورہ فاتحہ میں مذکور ہے، وہاں "صراط مستقیم" کی تفسیر "صراط الذین انعمت علیہم" سے کیگئی اور "الذین انعم اللہ علیہم" کی تفسیر خود قرآن شریف میں انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین سے کی گئی ہے، اس سے فی البدیہہ قرآن شریف کی تعلیم کو اجتماعی سمجھنا ضروری تھا، مگر کسی بے التفاتی کا شکار ہو کر ہم انفرادیت کی دلدل میں پھنس گئے۔

قرآن اور دنیا میں انٹرنیشنل انقلاب کا پروگرام

اسکے بعد میرے دماغ پر یہ اثر پیدا ہوا کہ قرآن عظیم دنیا کی تمام اقوام میں انٹرنیشنل انقلاب کا پروگرام ہے، اسے میں نے آیت "ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون" سے استنباط کر لیا دین ہر قوم کا علیحدہ علیحدہ رہ چکا ہے، اور قومی افکار و اعمال کا مقدس حصہ اس قوم کا دین کہلاتا ہے جب اس دین حق کو تمام ادیان پر غالب کرنا منظور ہو تو تمام اقوام میں انقلاب پیدا کرنا ضروری ہوگا۔

انقلاب کا قرآنی پروگرام اور طاقت

انقلاب مذکور کی دو صورتیں ہیں اوّل یہ کہ تمام ادیان پر غلبہ فقط تعلیم و تربیت کے ذریعہ سے ہو، اس طرح اگر متحقق ہوتا تو قومیں اپنی خوشی سے اس دین حق کو قبول کرتیں، جب اس کے ساتھ "ولو کرہ المشرکون" کا جملہ نازل ہو چکا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ایک مرکزی طاقت کے زور سے اس دین کا غلبہ پیدا کیا جائیگا۔ انٹرنیشنل انقلاب کا ترجمہ اس سے زیادہ اور کچھ ہم سمجھ نہیں سکے۔

عدم تشدد کا مسلک

آج کل ہندوستان میں ایک نئی اصطلاح پیدا کیگئی ہے۔ کہ عدم تشدد کی پابندی سے اقوام پر غلبہ حاصل کر لیا جائیگا۔ اور انقلاب اس نئے طریقے پر ہوگا۔

اب تک جو انقلاب کا مطلب سمجھا گیا ہے یہ اس سے مختلف چیز ہے

(جب تک یہ تھیوری عمل میں نہ آجائے قدیم فیصلوں کو منسوخ نہیں کر سکتی) میں ذاتی طور پر عدم تشدد کی پالیسی ایک محدود زمانے کے لئے معین کر چکا ہوں، اور مجھے یہ بھی سمجھ میں آسکتا ہے کہ تاریخ میں مقدس ہستیوں نے اس پالیسی کو ایک خاص وقت کے لئے ضرور استعمال کیا ہے مگر انسانی فطرت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ محض اسی کی بنیاد پر آخر تک کامیابی کبھی بھی حاصل نہیں ہوئی۔

خیر یہ (عدم تشدد کا نظریہ) تو جملہ معترضہ میں ایک دوسرا جملہ معترضہ تھا اب ہم پھر اصل مطلب (تکمیل جملہ معترضہ) پر بحث کو مکمل کرنا چاہتے ہیں۔

اگر قرآن عظیم کی تعلیم کو انٹرنیشنل انقلاب کا پروگرام مان لیا جائے تو اس کے لئے تین چیزوں کی تعیین ضروری ہے۔

(الف) اس کا آئیڈیا[1] (ب) اس کا پروگرام (ج) اس پروگرام کو چلانیوالی سنٹرل کمیٹی، کوئی انقلابی تحریک، پارٹی یا پالیٹکس کے سوا کامیاب نہیں ہوتی، اور ہر پارٹی یا پالیٹکس میں ان تین چیزوں کی تعیین ضروری ہے۔

قرآن کی انقلابی تحریک کا آئیڈیا

(۱) میں نے قرآن عظیم میں غور کر کے اسکا آئیڈیا اس آیت کو مقرر کیا "ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون"

اس تحریک کو چلانیوالی پارٹی یا حزب اللہ

(۲) پروگرام کے لئے پہلے حزب اللہ کی تعیین و تحدید ضروری ہے حزب اللہ اس پارٹی کا نام ہے۔ جو قرآن عظیم کے انٹرنیشنل انقلاب کو کامیاب بنانا مقصد حیات قرار دیتی ہے

---

[1] آئیڈیا کا ترجمہ ہماری زبان میں عموماً نصب العین اور مطمح نظر کیا جاتا ہے۔ مگر یہ ترجمہ پوری اصطلاح کو واضح نہیں کرتا سیاست کے ماہر حکماء کے نزدیک یہ کلمہ آجکل خاص اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوتا ہے جسکو ہم بالاختصار اسطرح بیان کر سکتے ہیں کہ وہ ایک بہت بڑا مقصد ہے جو طریق عمل کی رہنمائی کرتا رہیگا اس کا اپنی تکمیلی شکل میں متحقق ہونا ضروری نہیں ہے (بلکہ یہاں تک کہنا جائز ہے کہ آئیڈیا مکمل صورت میں کبھی متحقق ہو نہیں سکتا، وہ صرف طریق عمل کی رہنمائی کرتا ہے) مثلاً ایک ستارے کو دیکھکر ہم ایک جہت معین کر لیتے ہیں اور عام الفاظ میں کہدیتے ہیں کہ اس ستارے پر پہنچنا مقصد ہے، اسی طرح ایک نہایت ارفع و اعلیٰ چیز کو انسانیت کے تمیع کرنے کے لئے کارکن طاقتوں کے سامنے رکھدیا جاتا ہے، یہ سب اس طرف اپنا رخ درست کر لیتے ہیں، یہ آئیڈیا کہلاتا ہے ہماری تعلیمات میں اس کی کچھ مثال، استقبال قبلہ ہے۔ قالہ مولانا الشیخ عم فیضہم ۱۲

محمد نور الحق غفرلہ العلوی

حزب اللہ کی ضروریات پر قرآن عظیم کی مختلف سورتوں میں کافی ہدایتیں دی گئی ہیں، جہاں جہاں "یا ایھا الذین آمنوا" وغیرہ سے مومنین کو خطاب کیا گیا کہ وہ کفار اور منافقین کے راستے پر نہ چلیں، بلکہ فلاں فلاں حکم کی اس اس طرح پابندی کریں۔ ان تمام مواقع کو حزب اللہ کا پروگرام سمجھنا چاہئے۔ "یا ایھا الذین آمنوا" کے پہلے مخاطب حزب اللہ کے افراد ہی ہوتے ہیں، اس میں مرد عورت، عرب و عجم سب شامل ہیں، اس کا پہلا نمونہ "السابقون الاولون من المهاجرين والانصار" ہیں اور ان کے بعد "والذین اتبعوھم باحسان" قیامت تک کی جمیع اقوام مسلمہ کو شامل ہے اس طرح یہ پروگرام قیامت تک جاری رہیگا۔

سنٹرل کمیٹی کی تعیین (۳) اب فقط مرکزی کمیٹی کا سوال باقی رہجاتا ہے، میری سمجھ میں "السابقون الاولون من المهاجرين والانصار" سنٹرل کمیٹی کو معین کر دیتی ہے۔

مسئلہ خلافت و امامت اس تخیل پر تفصیل سے بحث کرنے کا یہ موقع نہیں ہے، مگر ایک آدھ مسئلہ کی طرف اشارہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ خلافت راشدہ کے دور کے بعد مسلمان دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ اہل سنت اور شیعۂ اہل بیت ہمارے اصول پر اس اختلاف کا حل نہایت سہل ہوگا۔ ابوبکر صدیقؓ کی تقدیم کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ اس قدر کمالات نفسیہ کے مالک تھے کہ پوری جماعت صحابہؓ میں کوئی آدمی ان کے مقابل نظر نہیں آیا[1]، ہمارے نزدیک مرکزی جماعت (سنٹرل کمیٹی) نے فیصلہ کیا کہ ابوبکرؓ مقدم[2] ہوں، اس لئے وہ واجب الاتباع تھے، اگر جماعت علیؓ یا عثمانؓ یا عمرؓ کو مقدم کر دیتی تو مسلمانوں پر انھیں کی اطاعت ضروری ہوتی؛ اس منصب کے لئے جسقدر اہلیت امیدواروں میں

---

[1] "الفرقان" واضح رہے کہ مولانا کا منشا یہاں صحابہ کرام کے نفس الامری "فرق مراتب" اور تفاضل باہمی کا انکار کرنا نہیں ہے بلکہ مولانا کا مطلب یہ ہے کہ انتخاب برائے خلافت کی بنیاد ان ذاتی اور شخصی کمالات کی زیادتی پر نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق صرف سابقین اولین کے فیصلے سے ہے اور اس باب میں یہ فیصلہ ہی اصل چیز ہے ۱۲ نعمانی غفرلہ

[2] موجودہ دور کی محافل علمیہ اور سیاسیہ میں حصہ لینے والے حضرات بخوبی جانتے ہیں کہ ایک رزولیوشن جب پیش ہوتا ہے تو اسکی اثبات اور تائید تو تجویز پر مختلف المذاق ارکین، مختلف نقطۂ نظر سے روشنی ڈالتے ہیں، آخر میں ہمیں اس رزولیوشن کے حق میں متعدد دلائل نظر آتے ہیں جو سب کے سب مستدل حضرات کے خیال میں اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہیں، اس کے بعد وہ تجویز اتفاق، یا کثرت رائے سے منظور ہو کر آئین بن جاتی ہے۔ پھر صرف تجویز کا متن شایع کر دیا جاتا ہے۔ خلافت صدیقؓ اور سنٹرل کمیٹی کے ارکان کو اسی پر قیاس کیجئے، کسی رکن نے ان کی سابقیت اسلام سے استدلال کیا، کسی کے پیش نظر مرض وفات کی امامت ہے، علی ہذا القیاس مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے صدیق کی تقدیم کا رزولیوشن سنٹرل کمیٹی نے پاس کر دیا ان مختلف زاویہ ہائے نگاہ کی تفصیل ازالۃ الخفا اور قرۃ العینین میں مذکور ہے (بقیہ صفحہ آیندہ)

ضروری ہے، اس میں یہ ہر چہار حضرات کامل اہلیت کے مالک ہیں۔ مسلمانوں کو ان کے ذاتی اوصاف دیکھکر مسئلہ خلافت میں ایک کو ترجیح دینے کا فکر پیدا ہی نہیں کرنا چاہیئے تھا جس سے یہ تحزب الاحزاب پیدا ہوا، جو جماعت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم کو چلانے کے لئے چھوڑی، وہ مہاجرین اور انصار کے پہلے طبقہ میں سے ایسے لوگ تھے جن پر یہ صادق آتا ہے "رضی اللہ عنھم ورضوعنہ"۔ یہ جملہ اس طرف مشیر ہے کہ اُن کا فیصلہ خدا تعالٰے کے یہاں پسندیدہ اور مرضی ہے۔ اس لئے کسی کو انکی اطاعت سے چون وچرا کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

بظاہر یہ مرکزی کمیٹی کی تشخیص میرا اپنا فکر ہے، مگر "قرۃ العینین" اور "ازالۃ الخفا" کو غور سے پڑھیئے تو آپ کو شاہ صاحب کا اصلی مطمح نظر یہی نظر آئیگا، میرا کام اس میں ان کی بات کو عام سمجھدار طبقہ تک پہنچانے کے سوا کچھ نہیں رہیگا۔

یہاں پر مذکورہ بالا جملہ معترضہ ختم ہوگیا ہے۔

فصل دوم عجم

سورہ جمعہ میں امیین کے بعد "واخرین منھم لما یلحقوا بھم" کا ذکر آیا ہے، اس کی تفسیر میں ایسی روایات موجود ہیں، جن سے ایرانی قوم کی طرف اشارہ نکل سکتا ہے، ایران اس زمانہ میں آرین (صابی) قوموں کا مرکز بن چکا تھا، اس سے پہلے زمانے میں ہندوستان کو یہ مرکزیت حاصل تھی، ہماری سمجھ میں "واخرین منھم" کے مصداق میں، ایران اور ہند و ماتبعھما شامل ہونے چاہئیں، ہم اس حصہ کو قرآن حکیم کی بین الاقوامی تعلیم کا متن سمجھتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت جیسے امیین کے لئے ہے ویسے ہی آخرین کے لئے بھی ہے۔ اس اجتماعی تحریک کا پہلا مرکز قریش ہیں، ہماری دانست میں انکی حکومت پانچسو برس تک رہی، اس حکومت کے پہلے حصے میں وہ بارہ سردار گزر چکے ہیں[1] جنھوں نے قیصر وکسریٰ کی حکومتوں کو ملاکر رومن امپائر کے رقبہ سے دوچند

(بقیہ صفحہ گزشتہ) (لطیفہ) ایک سندھی ہندو نے اپنے یہاں کے ایک شیعہ سے دریافت کیا کہ تم کیا چاہتے ہو؟ کہنے لگا کہ ہم بجائے شوریٰ کے توریث کے خواہاں ہیں، اس پر ہندو نے مسکراکر کہا کہ ساری دنیا کی مرکزی سیاست کو جیسے اسلام کا دعویٰ ہے تم ایک خاندان میں منحصر کرنا چاہتے ہو اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ پیغمبر اسلام صرف قریش کے لئے نبی تھے۔ اگر ایسا نہیں تو پھر شوریٰ پر اعتماد کرو۔ حضرت مولٰنا عم فیضہم ۱۲ "محمد نور الحق"

[1] اخرج الشیخان واللفظ لمسلم، قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لا یزال الاسلام عزیزاً الی

ممالک پر حکومت کی۔ اس حکومت کی اگر سیاسی فلاسفی سے تحلیل کی جائے تو وہ انسانیت کے لئے ایک نمونہ کی حکومت ہے۔ ولید بن عبد الملک (متوفی ۹۶ھ) کہتے ہیں کہ داؤد و سلیمان علیہما السلام کی حکومت شام میں رہی وہ نبی تھے۔ اس سے قطع نظر کرلو، پھر میری حکومت کا ان کی حکومت سے مقابلہ کرو اور دیکھو کوئی اندھا نہیں جس کے لئے میں نے عصا کش مقرر نہ کیا ہو، کوئی بھوکا اور بیمار نہیں ہے کہ جسکو کھانا اور دوا نہ پہونچتی ہو۔

یہ ایک عرب بادشاہ کی حکومت ہے، خلیفہ راشد کی خلافت نہیں، خلیفہ راشد کی حکومت تو گویا آئیڈیل حکومت ہے اس کی نظیر پھر مسلمان پیدا ہی نہیں کرسکے، مگر قریش کے یہ بادشاہ اور سردار بھی

(بقیہ صفحہ گزشتہ) اثنی عشرة خلیفة من قریش۔ قلت۔ هم الخلفاء الاربعة الراشدون، ثم التحق بهم معاویة۔ بعد صلح الحسنؓ، وکذلک عبد الملک بن مروان بعد اتفاق الناس علیه عقیب قتل ابن الزبیرؓ ثم السابع منهم الولید بن عبد الملک، وجاء بعده سلیمان بن عبد الملک وهشام بن عبد الملک، والاحسن ان لا نتغالی فی الاطراء فی حق العبد الصالح عمر بن عبد العزیز۔ بجعله مستقلا بل هو کان مثل النائب والتتمة لسلیمان بن عبد الملک، ثم نجعل بعدهم منهم المنصور والمهدی وهارون فان، اوائل خلفاء بنی هاشم ما کانوا مستضعفین ولا مداهنین، فلا یقاسون باواخرهم والذین ینقمون علیهم بقیام بنی امیة فی جزیرة الاندلس، فلیس بشئ فانهم ما قدروا علی تنظیم الخلافة الا بعد زمان اما فی اول الامر فلیس حالهم الا کالامراء الخارجین علی الجماعة۔ قال الامام ولی اللہ الدهلوی فی ازالة الخفا ——— در اول دولت عباسیہ امر خلیفہ در اطراف عالم نافذ بود، و بعد معتصم حکم ایشاں ضعیف شد۔ کتاب التمهید موقف ثانی ۱۲

ھ لم اظفر بالروایة لقلة الکتب عندی ۱۲

ھ والولید اعطی المجذمین ومنعهم من سوال الناس، واعطی کل مقعد خادما وکل ضریر قائدا وفتح فی خلافته فتوحا عظاما۔ منها الاندلس، وکاشغر والهند۔ تاریخ فخری ص۹۰ (نور الحق علوی)

عہ "الفرقان" اقول ومن امعن النظر حق الامعان فیما قام به امیر المؤمنین عمر بن عبد العزیز فی خلافته من اعزاز الدین وایثار الآخرة علی الدنیا فی سائر شعب الامارة واصلاح ما افسده بعض من قبله من الولاة والامراء واحیاء السنن النبویة واماتة البدعات الشنیعة الی غیر ذلک من الاصلاحات والتجدیدات لن یرضی بجعله تتمة لسلیمان ولا لاحد مثله وکیف یرضی وصنیعه فی خلافته وطریق عمله رضی اللہ عنه عین صنیع الخلفاء الراشدین سیما جده عمر بن الخطابؓ فما له ولسلیمان بن عبد الملک وامثاله وکیف نجعل خلافته تتمة لملکه والتفصیل لا یسعه هذا المقام ۱۲ نعمانی غفرلہ

اسقدر اجتماعیت کے مالک تھے۔ وہ اگرچہ اپنے گھروں میں، اور اپنے خاندان کے افراد کے لئے قیصر وکسریٰ سے بھی زیادہ شاندار زندگی مہیا کرتے ہوں (اور اسکا ہم انکار نہیں کر سکتے) مگر وہ انسانی اجتماع کو، اور اسکی ضرورتوں کو نظر انداز نہیں ہونے دیتے تھے۔

انفرادی فکر والے ہمارے مؤرخین نے ان کے ذاتی اور شخصی نقائص کو بڑھا چڑھا کر دکھایا ہے اس لئے کہ اس مورخ کے نزدیک جس خاندان کی حکومت چاہئے، بدقسمتی سے حکمراں خاندان اور اس کی آپس میں جنگ ہے۔

اب ہم تاریخ اس طرح پڑھنا نہیں چاہتے، دیکھنا یہ ہے کہ ایک بادشاہ نے عام انسانیت کے لئے کیا کام کیا، اگر شاہان اسلام کے اجتماعی کام اچھے ہیں، تو اُن کے شخصی نقائص اور تھوڑا سا مالی تفوق ہم برداشت کر سکتے ہیں۔ مسلمانوں سے باہر بھی بادشاہ گزرے ہیں، ہند اور یونان میں کوئی شخص اس طرح انسانیت کا خادم نظر نہیں آتا۔

سلاطین اور علماء کرام ان بادشاہوں میں اعتدال پیدا کرنیوالی جماعتیں ہمارے نزدیک فقہاء اور صوفیہ تھے، فقہاء میں سے جب ایک فقیہ کو قاضی القضاۃ بنا دیا جاتا۔ تو بادشاہ اپنی تمام قلمرو کے قضاۃ کے فیصلوں میں (جو قاضی القضاۃ کے نائب ہوتے تھے) کسی قسم کی مداخلت نہیں کرتا تھا، اس نے اسلامی انصاف کو ایک استقلالی درجہ دے دیا ہے۔

ہمیں ہندوستان کی تاریخ میں ایسی چیزیں معلوم ہیں کہ سلطان عالمگیر کے نالائق جانشینوں نے اپنے سب سے بڑے قاضی کی مجالس خاصہ میں نہایت بے توقیری کی قاضی مذکور کے بعض احباب نے اسکو شرم اور غیرت دلائی کہ تم کیوں اس درجہ تک اپنی ہتک گوارا کر لیتے ہو۔ قاضی کا جواب یہ تھا کہ یہ شخص میری قضا کے فیصلوں میں میرا قلم نہیں روکتا، اس لئے اس کی سلطنت میں مسلمانوں کے فائدے کے لئے اپنی ہتک گوارا کر لیتا ہوں۔

اب دیکھئے اجتماعی نکتہ نظر سے میں اس ہتک کرنیوالے (سلطان محمد شاہ) کی بھی تعریف کرتا ہوں، اور پہلے میں اس قاضی کی بےعزتی کو اسکا سب سے بڑا جرم قرار دیتا تھا، یہ چیز (قاضی کے فیصلوں میں دخل نہ دینا) ہارون ومہدی ومنصور کے زمانے سے ایک حقیقت واضحہ بن چکی ہے، اور فرخ سیر کے آخری زمانے تک نہایت سختی سے اسکی پابندی کی گئی۔ قاضی کے فیصلے کو وہ گویا خدا تعالیٰ کا حکم سمجھکر نہایت ادب و احترام سے دیکھتے تھے۔

سلاطین اسلام اور صوفیہ دوسرا عنصر جس نے شاہانہ طغیان سے ان بادشاہوں کو بچایا وہ صوفیہ

کا مجمع تھا، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی (متوفی ۵۶۱ھ) بغداد میں خلفا کے سامنے، اپنی خانقاہ میں انکے احکام پر تنقید کرتے رہے اور وہ شیر مادر کی طرح اُسے پی جاتے تھے، اور یہ عرب بادشاہوں کی منزل کا آخری دور تھا، وہ جسوقت زیادہ صلاحیت کے مالک تھے تو صوفیا و زہاد کی صحبت او نصیحت کو اپنی سعادت کا ذریعہ سمجھتے تھے [1]

بغداد میں خلفاء عباسیہ نے ایرانیوں کو حکومت کے لئے تیار کر دیا[2]، اور بغداد کے زوال کے بعد بخارا کی حکومتیں برسرکار آگئیں، اس سے غزنی پیدا ہوئی پھر غزنین سے لاہور اور دہلی عجمیوں کا مرکز بنے، اگر اسلام کو عربی اقوام کے لئے معین کر دیا جائے تو یہ تمام محنتیں (بغداد، بخارا، غزنی، مصر، دہلی وغیرہ کو مرکز بنانا) اسلامی اجتماع پر ایک دنبل ہونگی، آج ہم غلط فہم عربوں کو اسی میں مبتلا دیکھتے ہیں مگر جسوقت ہمنے اسلام کی اساسی حکمت بین الاقوامیت کو قرار دیا، تو ہمارے نزدیک قرآن کے مقاصد پورا

---

[1] قال عبید اللہ بن عمر القواریری لما لقی هارون الرشید فضیل بن عیاض قال له الفضیل یا حسن الوجه انت المسئول عن هذه الامة (خطیب ۱۴۲/۹)، قال سفیان بن عیینة دعانا هارون الرشید فدخلنا علیه ودخل الفضیل اخرنا مقنعا راسه بردائه. فقال لی یا سفیان ایهم امیر المؤمنین. فقلت هذا واومات الی الرشید فقال له یا حسن الوجه انت الذی امر هذه الامة فی یدك وفی عنقك لقد تقلدت امرا عظیما فبکی الرشید ثم اتی کل رجل منا ببدرة فکل قبلها الا الفضیل (وفیات الاعیان) وقال ابن الاهدل قال الرشید لفضیل ما ازهدك، قال انت ازهد منی، لانی زهدت فی الدنیا الفانیة وانت زهدت فی الآخرة الباقیة. (شذرات الذهب) اقبل المنصور یوما راکبا والفرج ابن فضالة جالس عند باب الذهب فقام الناس ولم یقم له الفرج فاستشاط غضبا ودعا به فقال ما منعك من القیام حین رایتنی، قال خفت ان یسالنی اللہ عنه لم فعلت ویسالك لم رضیت قد کرهه رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فبکی المنصور وقربه وقضی حوائجه (خطیب بغداد ۳۹۴/۱۲) ۱۲

[2] هم الاسرة السامانیة. وهی اسرة تنسب الی بهرام جور صاحب کسری فهی اسرة عریقة فی المجد فی الامة الفارسیة وکان فی عهد المامون من تلك الاسرة اولاد اسد بن سامان، وکان المامون یرعی حقوق الحرمة لذوی البیوتات. فقربهم ورفع من اقدارهم، وکانت بلاد ما وراء النهر منقسمة بینهم، یلونها من جهة امیر خراسان (الف) فکان نوح بن اسد فی سمرقند (ب) واحمد بن اسد فی فرغانة (ج)، ویحیی بن اسد فی الشاش واشروسنه (د) والیاس بن اسد فی هراة وکان احمد بن اسد عفیف الطعمة مرضی السیرة، لایاخذ رشوة ولا احد من اصحابه ولما توفی استخلف

کرنے والے عرب، اور پھر ان کے بعد عجم ایک ہی درجہ پر آجاتے ہیں۔ یہ اسی اجتماعی نیکی کا اثر ہے کہ عربوں کی انفرادیت ہماری نظروں سے غائب ہو چکی ہے۔ وہ (عرب) اس اجتماعی تحریک کے امام ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلے اس اجتماعیت کو دنیا میں کامیاب کر دکھلایا۔ وہ قیامت تک انسانی نسلوں کیلئے قرآن کی اجتماعیت پر عمل کرنے کے لئے نمونہ رہیں گے۔ مگر اسکا یہ مطلب نہیں ہونا چاہئے کہ انکی مرکزی قوت کے کمزور ہونے پر اسلام ختم ہوگیا۔

ہم امیر المومنین معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کی فتوحات اور قسطنطنیہ پر انکے حملہ کو حسب ذیل

(بقیہ صفحہ گزشتہ) إنه تصرّف على أعمال سمرقند وما وراء النهر وكان إسمعيل بن أحمد يخدم أخاه نصراً فولاه بخارا سنة ۲٦۱ه. وإسمعيل هذا هو الذي على يده انتهى عز عمرو بن الليث وورث ما كان بيده من ملك خراسان وصارت لهذه دولة عظيمة اورثها أهل بيته واستمرت دولتهم (۱۰۰) سنة و ستة أشهر، ثم انتهت على يدي آل سبكتگين من جهة، والترك الخاقانية من جهة أخرى وهذه أسماء تواريخهم وملوكهم

۱- نصير بن أحمد بن سامان	۲٦۱	۲۷۹
۲- إسمعيل بن أحمد	۲۷۹	۲۹۵
۳- أحمد بن إسمعيل	۲۹۵	۳۰۱
۴- نصير بن أحمد	۳۰۱	۳۳۱
۵- نوح بن نصير	۳۳۱	۳۴۳
٦- عبد الملك بن نوح	۳۴۳	۳۵۰
۷- منصور بن نوح	۳۵۰	۳٦٦
۸- نوح بن منصور	۳٦٦	۳۸۷
۹- منصور بن نوح	۳۸۷	۳۸۹
۱۰- عبد الملك بن نوح	۳۸۹	۳۸۹

ع- ولقد زالت على يد السامانيين دولة رجلين كبيرين ١- عمرو بن الليث الصفار ٢- محمد بن زيد وبذلك صارت القوة للأسرة السامانية فكان بيدهم بلاد ما وراء النهر وخراسان إلى الري وسجستان ولهم فيها النفوذ والسلطان تام۔ محاضرات خضری ۳۲۱ و ۳۲۲ ج ۳ ۱۲

ھ كان الصحابة يغزون مع يزيد بن معاوية فإنه غزا القسطنطنية في حياة أبيه معاوية رضي الله عنه وكان معه في الجيش أبو أيوب الأنصاري، وذلك الجيش أول جيش غزا القسطنطنية وفي صحيح البخاري عن ابن عمر عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال أول جيش يغزو القسطنطنية مغفور لهم

عزت و احترام سے دیکھتے ہیں، سلطان محمود غزنوی (متوفی ۴۲۱ھ) کی مُلتوں کی بھی ہم ایسی ہی قدر کرتے ہیں یہ ہمارے ذہن سے عربی عجمی فرق کے زائل ہونے کا ایک نمونہ ہے۔

فصل ۳ – تطبیق الفقہ والحدیث

انقلابی تحریکوں میں اساسی قانون غیر متبادل ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس کے چلانے والی قوم کے طبعی خصوصیات کے مطابق دوسرے درجہ کا نظام سنٹرل کمیٹی پیدا کر لیتی ہے جسے بائیلاز کہا جاتا ہے بنی امیہ کے آخری دور تک اسلامی تحریک کی مرکزیت حجاز میں رہی، بنو امیہ نے دمشق کو اپنی سیاست کا مرکز بنایا۔ مگر اصل اجتماعیت کا مرکز مدینہ منورہ ہی رہا۔ عباسیوں نے مرکزیت ... حجاز سے بغداد میں منتقل کر لی۔ اس لئے خلفاء عباسیہ کے تمام وزراء ایرانی ہوئے، اور جب وہ اپنی ابتدا میں آگے بڑھتے تو خلفا کے لئے ان کے قتل کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہتا تھا۔ خلیفہ منصور (متوفی ۱۵۸ھ) نے ابو مسلم خراسانی (عبد الرحمان بن مسلم متوفی ۱۳۷ھ) کو قتل کیا: خلیفہ محمد مہدی (متوفی ۱۶۹ھ) نے ابو عبید اللہ اور ابو عبد اللہ کو روندا[۲]۔ ہارون رشید (متوفی ۱۹۳ھ) نے برامکہ کو موت کے گھاٹ اتارا اس کے بعد

(بسلسلہ صفحہ گزشتہ) (منہاج السنۃ ص۲۴۵) ولی معاویۃ یزید علی الجیش الی قسطنطنیۃ وکانت تلک الغزاۃ تحت رایۃ یزید وھو کان امیرھم یومئذ وذلک فی ۵۵ھ فجعل ابوایوب یقول ما علی ان امر علینا شاب. فمرض فی غزوۃ تلک ودخل علیہ یزید یعودہ فقال لہ اوصنی. قال اذا انا مت فاحملونی فاذا صاففتم العدو فادفنونی تحت اقدامکم (استیعاب و اصابہ ص۴۰۳ و ص۲۵۱، ۸۹) ۱۲

[۱] در کتب تاریخ یافتہ می شود کہ زائچہ سلطان محمود غزنوی با زائچہ طالع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مشابہت تمام داشت از جہت مواضع کواکب سیارہ و مناظرات آنہا۔ و قران علوین در مسعود بیت شمس و مریخ و مانند آن بس فتوح و مجاہدات عظیمہ از سلطان محمود بظہور رسید ھ تفہیمات الہیہ ص۲۳۶

[نکتہ] والذی اعتقدہ انہ ان اتفق غلبۃ الھنود علی اقلیم الھند غلبۃ مستقرۃ عامۃ وجب فی حکمۃ اللہ ان یلھم رؤسائھم التدین بدین الاسلام کما الھمہ الترک. وذلک منشعب عن عموم بنوتہ والغفاد کونہ صاحب ملۃ ھ تفہیمات ص۳۳ ۱۲

[۲] خلیفہ محمد مہدی کے تین وزیر یکے بعد دیگرے ہوئے۔

(اول) ابو عبید اللہ معاویہ بن یسار۔ غلام آزاد کردہ اشعریین۔ نجابت اخلاق اور حسن سیرت میں ممتاز زمانہ تھا اسی نے سب سے پہلے خراج کے موضوع پر نہایت نفیس کتاب لکھی جو بعد کے مصنفین کے لئے شمع راہ بنی۔ ربیع حاجب کو اس سے رقابت پیدا ہو گئی اس نے خلیفہ مہدی سے کہا کہ ابو عبید اللہ کا لڑکا (محمد) ملحد ہے۔ مہدی نے اسکو قتل کرا دیا۔ بعد ازاں مہدی ہموارہ

خلفا کی یہ طاقت ختم ہو گئی، مامون (متوفی ۲۱۵ھ) خود وزرا، علی الخصوص فضل بن سہل (یہ وردہ برامکہ کا تربیت یافتہ تھا، پھر بھی اس نے اپنے اس عربی ذی الریاستین فضل بن سہل (متوفی ۲۰۲ھ) کو قتل کرا دیا۔

مگر عباسی خلافت ہی نے ایرانیوں کو حکمرانی سکھلائی۔ بعد کے خلفا ایرانی وزیروں یا ایرانی قائدوں کے اشاروں پر چلتے تھے۔

ایران اور خراسان ہماری سمجھ میں ایران اور خراسان کے درمیان حقیقی تضاد نہیں یہ دونوں قومیں ایک ہی قوم کے شعبے ہیں۔ اس لئے ترکیّت کا جو خیال معتصم کے بعد پیدا کیا جاتا ہے، ہم اُسے قبول نہیں کرتے یہ سب ایرانیت تھی، ترکوں کے بچے ایرانی تہذیب سے مہذب ہو کر حکومت کرتے تھے، سلطان محمود غزنوی کو دیکھ لیجئے، وہ نسلاً ترک ہے۔ مگر سوائے ایرانیت کے اس کے دربار میں کوئی چیز نہیں ہے۔

ہندوستان میں بھی جسقدر سلاطین آئے وہ عموماً ترکی نسل سے تھے، مگر ہم سب کو ایرانی مانتے ہیں، ان کی زبان، فکر، فلسفہ تمام تر ایرانی تھا۔ اس تہذیب سے باہر نکل کر کوئی ترک حکومت کے کسی منصب پر نہیں پہونچا۔

یہ سمجھ بھی ہمارے اس اجتماعی تاثر کا نتیجہ ہے۔ جیسے ہم نے قریش کی تقسیم بھلا دی اسی طرح ایرانیت کے اقسام ہماری نظر سے غائب ہیں۔

(بسلسلہ صفحہ گزشتہ) ابو عبید اللہ سے خائف رہا کہ مبادا اپنے بیٹے کا انتقام لینے کی سازش کرے چنانچہ ۱۶۱ھ میں اسکو وزارت سے معزول کر دیا گیا اور وہ معزولی کی حالت میں ۱۷۰ھ کو فوت ہوا۔

(دوم) دوسرا وزیر ابو عبد اللہ یعقوب بن داؤد ہے، یہ خاندان سلیم کا آزاد کردہ غلام ہے۔ خلیفہ محمد مہدی کو اس سے اسقدر محبت تھی کہ عام شاہی اعلان میں لکھا کہ یعقوب میرا بھائی ہے۔ مہدی کے حاشیہ نشینوں نے از راہ حسد اس کے خلاف سازش کی کہ یہ انتقال خلافت کا متمنی ہے، اس پر مہدی نے اسکو ۱۶۶ھ میں معزول کر دیا۔

(سوم) بعد ازاں محمد مہدی نے فیض بن ابی صالح کو وزیر مقرر کیا۔ یہ شخص عیسائی خاندان سے ہے۔ خلیفہ مہدی کی وفات تک وزیر رہا، اور ۱۷۳ھ اوائل سلطنت رشید میں فوت ہوا۔

وفی المحاضرات، داوقع المهدی بابی عبید الله معاویة بن یسار، ویعقوب بن داؤد لوشایة کانت بهما، مع نزاهة الاول وحسن سیرته۔ ومع ما کان للمهدی من الولوع بالثانی حتی کتب للجمهور انه اتخذ اخا فی الله ۵ مالک ۱۲　　محمد نور الحق غفرلہ

ہم واخرین منھم کی اس تفسیر کو زیادہ صحیح مانتے ہیں جس میں ایرانیوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایرانی اشخاص ہمارے نزدیک زیادہ قدر و قیمت نہیں رکھتے۔ بلکہ ہمارے نزدیک ایرانیت سے مراد ایرانی تہذیب ہے۔

حجازی اور عراقی فقہ کی تدوین جب اسلام کی مرکزی طاقت ماموں کے عہد سے ایرانیوں کے ہاتھ آئی، تو قرآن کی اساسی اجتماعی تحریک کے لئے عربی بائیلاز کے علاوہ ایرانی "بائیلاز" کی ضرورت فقہا کو محسوس ہونے لگی۔ ہم اسلامی فقہ کے یہ دو اسکول (حجازی و عراقی) علیحدہ علیحدہ مانتے ہیں موجودہ اصطلاحات کے رو سے فقہ کا ترجمہ بائیلاز ہے، اسلام کی اجتماعی اساسی تحریک قرآن شریف میں منضبط ہے اور وہ غیر متبدل رہیگی۔ خلافت راشدہ میں عربی ذہنیت کے مطابق اس کے بائیلاز تیار ہوئے اور وہ حجازی فقہ ہے جس کا مرکز مدینہ منورہ تھا۔ اور امام مالکؒ نے اسکو موطا میں ضبط کر دیا ہے۔

صحابہ کرامؓ میں ائمہ فقہا خلیفۂ راشد کے مشیر رہا کرتے تھے، فاروق اعظمؓ کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ عراق فتح کرنے کے بعد اس میں ایک نیا مرکزی شہر بسایا جائے، نیز یہ بھی محسوس ہوا کہ میرے مشیروں میں سے ایک بڑا استاذ[1] عراق کے بائیلاز بنانے کی بنیاد رکھدے۔ اس کے لئے انھوں نے عبداللہ بن مسعود کو اپنی صحبت سے جدا کر کے بطور معلم عراق بھیجا، عبداللہ بن مسعود کی صحبت سے عراقی فقہا تیار ہوئے جنھوں نے ایرانی مرکزی حکومت کے لئے بائیلاز [فقہ عراقی] تیار کر دیئے۔

جس طرح اہل مدینہ کے فقہا امام مالک کے ذریعہ سے زندہ رہے، اسی طرح اہل عراق کے

---

[1] قال الحافظ ابن عبد البر فی کتاب الاستیعاب، بعث عمر بن الخطابؓ عبد اللہ بن مسعود الی الکوفۃ مع عمار بن یاسر، وکتب الیھم انی قد بعثت الیکم بعمار بن یاسر امیرا وعبد اللہ بن مسعود معلما و وزیرا۔ ھما من النجباء من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من اہل بدر فاقتدوا بھما واسمعوا من قولھما۔ وقد آثرتکم بعبد اللہ بن مسعود علی نفسی، واقبل عبد اللہ بن مسعود وعمر جالس فقال کنیف ملئ فقھا، وقال ابن مسعود انی لا علمھم بکتاب اللہ وما انا بخیرھم، استیعاب ص۳۲۲ ج۲ ص۳۲۳ ج۲ وحلیۃ الاولیاء لابی نعیم ص۱۲۹ ج۱ وازالۃ الخفاء ج۲، ۱۲

محمد نور الحق العلوی غفرلہ

فقہا کا علم امام ابوحنیفہؒ کے ذریعہ محفوظ رہا۔ امام ابوحنیفہؒ نے ایک ایسی جماعت تیار کردی کہ ایرانی حکومت کے تبدلات میں وہ نئی نئی ضرورت کو پورا کرسکے گی۔

بغداد کے رہنے والے ایک تمدن رکھتے ہیں۔ جو کہ عربی اور ایرانی تمدن کا مجموعہ ہے۔ بغداد میں جیسے فارسی بولی جاتی تھی۔ اسی طرح عربی بھی استعمال ہوتی تھی زوالِ بغداد پر عربی بولنے والی قوموں نے قاہرہ کا رخ کیا۔ اور فارسی بولنے والی قومیں دہلی میں جمع ہوگئیں۔ ایرانیت اور عجمیت میں بغداد اور دہلی یکساں مان لئے جائیں پھر بھی ان میں زمین و آسمان کا فرق ہے بغداد سے حکومت دہلی پہونچی اس میں اس نے بخارا اور غزنی کا راستہ طے کیا ہے۔ بغداد اور بخارا کے تمدن میں بھی اتنا فرق موجود ہے جتنا دو قوموں میں ہوسکتا ہے۔ اسی طرح بخارا اور غزنی کا فرق بھی قومیت سے کم درجے کا نہیں ہے۔ اس کے بعد لاہور اور دہلی کا نمبر آتا ہے یہاں بھی قومیتیں بدلتی جاتی ہیں۔

امام ابوحنیفہ کے شاگردوں کو ہارون الرشید کے زمانے میں فقہ کی امامت تفویض ہوئی امام ابو یوسف قاضی القضاۃ[1] تھے۔ اور امام محمد لا کالج کے پرنسپل، ان کی تعلیم اور صحبت میں اس قدر بلند مرتبہ فقہا تیار ہوئے کہ دہلی تک پہونچنے میں جسقدر تبدلات پیش آئے۔ اُن کا لحاظ رکھکر وہ اسلامی بائیلاز تیار کرنے میں کمال رکھتے تھے انھیں کے زور پر سلاطین اپنا عدالتی قانون قوموں کو منواتے رہے۔

دہلی میں قضا کا مستقل مرکز پیدا ہوا جیسے دوسرے اسلامی ممالک اس لئے نہیں جانتے کہ اس کی تاریخ فقط فارسی زبان میں مدون ہے۔

تدوین فقہ اور ہندوستان اس مرکز سے دو دفعہ اجتماعی تحریک میں تجدید پیدا ہوئی اس اسلامی فقہ کو جو بخارا سے یہاں پہونچی تھی، ہندوستان کے مطابق کرنیکی سعی کی گئی پہلی دفعہ تغلقوں کے عہد میں فتاویٰ تاتارخانیہ[2] تیار ہوا، دوسری بار سلطان عالمگیر (متوفی ۱۱۱۸ھ) کے

---

[1] یعقوب بن ابراہیم الانصاری، الامام ابو یوسف، اخذ عن ابی حنیفۃ وثقہ ابن معین واحمد ولی القضاء لثلاثۃ من الخلفاء۔ المہدی، والہادی والرشید۔ وکان الیہ تولیۃ القضاء فی المشرق والمغرب وہو اول من دعی فی الاسلام، بقاضی القضاۃ۔ وکان یقال لہ قاضی قضاۃ الدنیا۔ لانہ کان یستنیب فی سائر الاقالیم التی یحکم فیہا الخلیفہ۔ مات فی سنۃ ۱۸۲ (تاج التراجم از حافظ زین الدین قاسم بن قطلوبغا، ج) ۱۲

[2] فتاویٰ تاتارخانیہ۔ مولانا عالم بن علاء اندرپتی دہلوی متوفی ۸۰۰ھ نے امیر کبیر تاتارخاں دہلوی کے نام نامی پر لکھا، امیر مذکور تقیدی جو سلطان غیاث الدین تغلق کو کسی جنگ میں ملا۔ سلطان نے اس کی خاص تربیت کی، اس کے بعد سلطان محمد شاہ تغلق نے، سکو، رکین

زمانے میں خود سلطان نے فتاوی عالمگیری تیار کرایا، اور تمام قلمرو میں اس پر عمل واجب قرار دیا سلطان کے بعد بھی نادر شاہ کے حملے تک (یعنی ۱۱۵۱ھ/۱۷۳۸ء تک) یہ قانون ہندوستان میں متبوع رہا ہے۔

یہاں تک ہم نے فقہ حنفی کو سمجھنے کے لئے چند اصول پیش کئے ہیں۔

شاہ ولی اللہ اور فقہ اب ہم شاہ ولی اللہ پر آتے ہیں، شاہ صاحب نے فقہ اپنے والد شاہ عبدالرحیم سے پڑھی۔ اور شاہ عبدالرحیم فتاوی عالمگیری کے مصنفین[۱] میں سے ایک عالم ہیں۔ ہمارے زمانے میں ہندوستان

(بقیہ صفحہ گزشتہ) سلطنت میں شامل کرلیا، امیر مذکور بہت بڑا سخی، عادل اور بہادر تھا، تفسیر تاتارخانی اسی کی تصنیف ہے وہ نیز اسی کے حکم سے مولنا عالم بن علا نے فتاوی تاتارخانیہ لکھا کتاب مذکور کا اصلی نام زاد السفر ہے ۷۷۷ھ ہجری میں تصنیف ہوئی سلطان فیروز شاہ ابن رجب نے ہرچند چاہا کہ کتاب مذکور میرے نام سے ہو، مگر مؤلف نے اس کو منظور نہ کیا لصلۃ اقرتہ کانت بینہ وبین تاتارخان وھو کتاب عظیم فی مجلدات جمع فیہ مسائل المحیط البرھانی والذخیرۃ والخانیۃ والمظھیریۃ، ولخصہ الامام ابراھیم بن محمد المتوفی ۹۵۶ھ فی مجلد، وانتخب منہ ما ھو غریب او کثیر الوقوع ولیس فی الکتب المتداولۃ۔ (نزھۃ الخواطر لمولانا عبدالحی الحسنی) ۱۲

[۱] امام ولی اللہ فرماتے ہیں: "حضرت ایشاں مے فرمودند کہ در زمان عالمگیر فتاوی عالمگیری، بامرے تدوین کردہ بودند، و نظر ثانی میکردند بعضی ازاں کار بہ شیخ حامد۔ کہ در درس مرزا محمد زاہد شریک بابود مفوض شد بوسے بہ خانہ من آمد کہ رفاقت من کنید مبلغ کنایومیہ بنام شما مقرر خواہد شد۔ قبول نہ کردم، والدہ من ایں قصہ استماع کردہ بر بہ جا شدند و مبالغہ از حد گذرانیدند مضطر شدہ بوظیفہ مؤلف شدم و بہ آں کا مشغول گشتم۔ حضرت ابوالقاسم اکبرآبادی چوں بہ ایں معنی مطلع شدند فرمودند آں وظیفہ را ترک کنید گفتم والدہ ناخوش مے شود فرمودند اجابۃ حق، اللہ ذھب حق العباد، قول صحیح است، گفتم دعا کنید کہ خدا تعالیٰ ایں وظیفہ را بہ غیر سعی من دور کند، تا والدہ ناخوش نشود، دعا کردند، در چند روز بادشاہ اسامی اہل وظیفہ را طلب کرد، و آں را بہ عزل و نصب تغیر میداد چوں بنام من رسید آں وظیفہ را دور کرد۔ و نوشت اگر خواہند ایں قدر زمین بدہید، مرا پرسیدند۔ قبول نہ کردم و شکرانہ بجا آوردم۔

میفرمودند۔ روزے در نظر ثانی، بر عبارتے ناموجہ، کہ از اختلال کلام صورت مسئلہ برہم برخوردہ بود۔ مرا گزر افتاد۔ بہ کتاب ہاکہ ماخذ آں مسئلہ بودند، رجوع کردم معلوم شد کہ ایں مسئلہ در دو کتاب مذکور است و در ہر یک بہ عبارت دیگر، مؤلف فتاوی ہر دو عبارت راجمع کردہ، ازیں سبب اختلال تمام پذیر فتہ۔ بر حاشیہ نوشتم، من لم یتفقہ فی الدین نقل حرف فیہ، ھذا غلط، وصوابہ، لکن ا ... آں ایام عالمگیر را بہ جمع و تدوین آں اہتمام عظیم بود۔ ملا نظام ہر روز یک دو صفحہ پیش بادشاہ مے خواندند چوں ایں جا رسید اتفاقاً ایں حاشیہ را با متن مخلوط کردہ بہ یک نسق خواند، بادشاہ متنبہ گشت و گفت ایں عبارت چیست، ملا نظام در آں مجلس تدافع کرد کہ ایں را مطالعہ نہ کردہ ام، فردا بہ تفصیل عرض خواہم کرد، چوں بخانہ آمد، ملا حامد را عتاب کرد کہ ایں جلد باعتماد شما گذاشتہ بودم شما پیش بادشاہ مرا خفیف کردید۔ باعث ایں لفظ چہ بود، ملا حامد در آں وقت ہیچ نگفت بعد ازیں با من اظہار ملال کرد، کتاب ہاکہ ماخذ ایں مسئلہ بود حاضر کردم و اختلال عبارت و پریشانی واضح کردم بوجہے کہ بر ہمگناں ثابت شد۔ بازا کثر آں قوم بر من حسد مے بردند

کے اندر جسقدر علمی تحریکیں مرکزیت رکھتی ہیں وہ سب کی سب ایسے اساتذہ پر ختم ہوتی ہیں جو عالمگیری دور کے ممتاز فرد تھے۔ شیخ محب اللہ بہاری (متوفی ۱۱۱۹ھ) کی کتابیں اصول اور معقول میں ہمارے یہاں کافی رواج پذیر ہیں۔ اور ہندوستانی طریقہ تحصیل دوسرے اسلامی ممالک میں انھیں کتابوں کی بدولت ممتاز ہو گیا ہے، شیخ محب اللہ عالمگیری دور کے نامور فاضل تھے "فاضل خان" انکا لقب و خطاب تھا۔ [1]

شاہ ولی اللہ کی اساسی تربیت فکریہ میں ہم شاہ عبد الرحیم کو مرکز مانتے ہیں۔

(الف) قرآن شریف کا ترجمہ تفسیروں سے علیحدہ انھوں نے (شاہ عبد الرحیم نے) پڑھانا شروع کیا۔

(ب) وحدت وجود کا مسئلہ صحیح طریقہ سے انھوں نے تعلیم دیا ہے۔

(ج) حکمت عملی کو اسلامی علوم میں با وقعت بنانا انھیں کے ارشاد کا نتیجہ ہے۔

یہ چیزیں شاہ ولی اللہ کی تعلیم میں بہت اہم مانی جاتی ہیں۔ لہٰذا ہم شاہ صاحب کے تمام کمالات کو بھی عالمگیری دور کا ایک نتیجہ بنانا چاہتے ہیں، شاہ صاحب اپنے والد کی وفات کے بعد بارہ سال تک دہلی میں درس دیتے رہے۔ یعنی جو کچھ انھوں نے اپنے والد سے سیکھا تھا۔ وہ ان کے دماغ میں راسخ ہو گیا۔ اس کے بعد وہ حجاز پہنچے اور شیخ ابراہیم کردی کے شاگردوں میں سے شیخ ابو الطاہر مدنی اور شیخ حسن بن علی عجیمی (متوفی ۱۱۱۳ھ) کے شاگردوں میں سے شیخ تاج الدین قلعی (متوفی ...) کی صحبتوں سے مستفید ہوئے۔ [2] شیخ ابو الطاہر شافعی تھے، اور شیخ تاج الدین حنفی، شاہ ولی اللہ نے حجاز جا کر حنفیہ اور شافعیہ کو ایک درجہ پر مان لیا۔

پہلے ہم ذکر کر چکے ہیں کہ امام مالک حجازی فقہ کے جامع ہیں ان کی شاگردی کے بعد امام شافعی نے

(سلسلہ صفحہ گذشتہ) و بظاہر سبب ایں عزل حسد الشان بود، واللہ اعلم، انفاس ص ۲۳۲ اسی کتاب کے ص ۹۱ پر مذکور ہے کہ شہنشاہ عالمگیر کو شاہ عبد الرحیم سے ملاقات کرنیکا اشتیاق دامنگیر ہوا، چنانچہ ہر دو کی ملاقات ہوئی۔

[1] قال الامیر القنوجی۔ لازم السلطان عالمگیر، فولاہ قضاء لکھنؤ۔ ثم بعد مدۃ قضاء حیدرآباد ثم عزلہ ثم امرہ بتعلیم ابن ابنہ رفیع القدر بن محمد معظم ولما فوض عالمگیر فی آخر عمرہ حکومۃ کابل الی ابنہ محمد معظم الملقب بشاہ عالم و سافر ھو مع ابنہ رفیع القدر من الدکن الی کابل صحبہ القاضی ولما توفی عالمگیر فی الدکن ۱۱۱۸ھ، وانتھض شاہ عالم من کابل الی الدیار الھندیۃ اعطی القاضی منصبا جلیلا وولاہ صدارۃ ممالک الھند کلھا۔ ولقبہ بفاضل خان، فی ۱۱۱۹ھ فتوفی فی ھذہ السنۃ ھ ابجد العلوم وماثر الکرام وتذکرہ علمائے ہند) ۱۲

[2] راجع ترجمۃ الشیخ حسن بن علی وترجمۃ الشیخ تاج الدین الحنفی فی ابجد العلوم ص ۹۲۲ و انفاس العارفین ص ۱۹۲ و ص ۱۹۶۔

شاہ عبد الرحیم اور غازی عالمگیر کی ملاقات

حجازی فقہ کو عراقی فقہ کا مقابل بنادیا، امام شافعی کی فقہ کی خصوصیات پر اس موقع پر ہم بحث کرنا نہیں چاہتے، مگر اتنا بتلادینا ضروری ہے کہ شاہ ولی اللہ نے جسقدر صوفیہ اور محدثین حجاز میں دیکھے وہ اکثر شافعی تھے اور ہر شاہ صاحب یہ بھی جانتے ہیں کہ سلاطین عثمانیہ، سلاطین دہلی کی طرح حنفی ہیں، بنا بریں وہ اس چیز کو پسند نہیں کرتے کہ شافعیت اور حنفیت کے اختلافات پر زیادہ توجہ کریں، وہ اسلام کی بین الاقوامی سیاست میں جیسے عرب اور عجم کو مستقل مانتے ہیں (یعنی ہر دو نے سیاست اسلامیہ کا فرض ادا کیا) اسی طرح فقہ شافعیہ کو عرب کی جگہ، اور فقہ حنفیہ کو عجم کی جگہ مانتے ہیں، کیونکہ فقہ حنفی عجمیوں نے پیدا کی، اور یہ ان کے مذاق کے عین مطابق ہے۔

اب شاہ صاحب کی تجدید اور تحقیق یہ ہے کہ وہ فقہ کے ہر دو طریقوں کو امام مالک سے استنباط کرتے ہیں، یعنی انھوں نے دونوں طریقوں میں ایک امر مشترک پیدا کردیا ہے حجازیوں میں بھی امام شافعی اہل مدینہ کی روایتونکو مقدم مانتے ہیں، اس لئے کہ انھوں نے ابتدا میں اہل مکہ سے پڑھا بعد ازاں امام مالک کی کتاب پڑھ کر فقہ میں ترمیم کرلی۔

اسی طرح عراقی علما میں سے امام محمد نے پہلے عراقی فقہا کی روایتیں پڑھیں، اس کے بعد امام مالک سے موطا پڑھکر عراقی تفقہ[1] میں ترمیم کرلی۔

اسطرح فقہ حنفی اور فقہ شافعی تو مقابل بن گئیں، مگر موطا امام مالک ان میں امر مشترک رہا شاہ

---

[1] (فائدۃ نفیسۃ تخلو عنہا الاسفار) امام محمد کی کتب ثلثہ کا موضوع۔

(الف) موطا، امام مالک کی کتاب میں فقہ عراقی سے جسقدر موافق روایتیں تھیں، انکو لے کر امام محمد نے کتاب موطا تالیف کی۔

(ب) کتاب الحجج میں امام نے عراقی فقہ کی مخالف روایتوں پر تنقید کردی۔

(ج) کتاب الآثار، اہل مدینہ کے پاس تلامذہ ابن مسعودؓ کی جو روایتیں نہ تھیں، اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک وہ مستند ہیں ان کو امام محمد نے کتاب الآثار میں جمع کردیا۔

(نکتہ) شیخ الاسلام ابن حجر، حنفی علما کے تراجم میں زیادہ انصاف نہیں کرسکے، لسان المیزان میں امام محمدؒ کے حق میں لکھتے ہیں "کذبہ ابو یوسف"، حالانکہ وہ معاملہ از قبیل حدثت ونسیؒ ہے۔ امام ابو حنیفہؒ سے امام ابو یوسفؒ نے چار مسئلے روایت کئے پھر بھول گئے، جب امام محمدؒ نے انھیں یاد دلایا کہ آپنے مجھے یہ روایتیں سنائیں تو ابو یوسفؒ نے انکار کردیا، یہ اسوقت کا واقعہ ہے جب کہ ہر دو میں تنافر پیدا ہوچکا تھا [تنافر کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو شرح سیر کبیر از سرخسیؒ۔ نوٹ] الغرض یہ تمام معاملہ حدثت ونسیؒ کے ماتحت ہے نہ کہ کذب کے زیادہ سے زیادہ ان چہار روایات کا اعتبار نہو گا لیکن اس سے ثقاہت پر ذرہ برابر اثر نہیں پڑسکتا، کیا شیخ الاسلام ابن حجر اسکو نہیں جانتے؟ حضرت مولٰنا عم فیضہم ۱۲

ولی اللہ، یہ امر مشترک واضح طور پر دنیائے اسلام کو سمجھانا چاہتے ہیں، اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ حنفی شافعی تخاصم ختم ہو جائیگا

شاہ ولی اللہ نے حجاز پہونچکر اسناد کے سمجھنے میں تفقہ پیدا کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حدیث کی پبلک کتابوں میں آپ نے موطا مالک کو اصل قرار دیا۔ صحیحین اور سنن موطا کی متابعات وشواہد ذکر کرنیوالی کتابیں بنیں، اس طریق تفقہ سے شاہ صاحب کے شاگرد احادیث صحیحہ کو اپنے اجتہاد سے صحیح مان سکتے ہیں۔

جسطرح فقہائے مجتہد منتسب کا درجہ مجتہد مستقل کے ساتھ مان رکھا ہے۔ اگرچہ مجتہد مستقل پیدا ہونے ایک زمانہ سے ختم ہو گئے، مگر مجتہد منتسب ہمیشہ پیدا ہوتے رہتے ہیں، اور انھیں کے ذریعہ سے فقہ کی تجدید اور تحقیق قایم ہے۔ اسی طرح شاہ صاحب نے ائمہ محدثین کو مجتہد مستقل کا درجہ دیا۔ اور مجتہد منتسب تیار کرنیکا راستہ موطا مالک کو مقدم مان کر تیار کر دیا، اب شاہ صاحب کے اتباع میں سے جو محقق عالم پیدا ہونگے وہ صحیحین اور سنن ابی داؤد و ترمذی میں سے صحیح حدیثیں نکالنے پر خود قادر ہونگے، وہ مذکورہ بالا کتب حدیث کو اسی لئے صحیح نہیں مانتے کہ ان کے مصنف بہت بڑے عالم تھے، بلکہ وہ اپنی ذاتی تحقیق اور اجتہاد سے ان ائمہ کی تصحیح کو قبول کرتے ہیں۔

علم کے اس مرتبہ کی تعیین اور تعلیم کے بعد علم فقہ میں شاہ صاحب کا یہ مسلک قرار پایا کہ صحاح ستہ میں جو حدیثیں صحیح ہیں۔ ان کے موافق جو فقہی عالم فتوے دیتا ہے اسی کو ترجیح دیجائے۔ خواہ شافعی ہو خواہ حنفی۔

حجاز پہنچکر شاہ صاحب کا فقہی سلک یہ پہلا درجہ ہے، ان کی فقہی تحقیق کا جو حجاز میں رہ کر انھیں سمجھ میں آئی، وہ عام علما کی طرح اسبات کو قبول نہیں کر سکتے تھے کہ فقط فقہ حنفی تمام مسلمانوں کو ایک نقطہ پر جمع کرنیکے لئے کافی ہے، اس لئے کہ عربی بولنے والے ممالک عموماً شافعی اور مالکی مذہب رکھتے ہیں۔ پھر اگر وہ لوگ سلطنت عثمانیہ کے مرکز سے دور ہیں تو وہ فقہ حنفی بہت کم جانتے ہیں مصر اور مغرب اس کی مثالیں ہیں، اب شاہ صاحب کا فیصلہ یہ ہوا کہ حنفی، شافعی فقہ کو مساوی درجہ پر رکھا جائے۔ اور موطا مالک کو اصل بناکر کتب حدیث میں جو معروف اور اکثریت کی زیر عمل روایتیں ہیں (یعنی شواذ اور غرائب کو چھوڑ دیا جائے) ان کو انتخاب کر لیا جائے۔ اس کے مطابق اگر حنفی روایت ہو تو اسکو ترجیح دو۔ اگر شافعی ہو تو وہ راجح ہے۔ اگر اس فقہ کو اسلامی مرکز میں قایم کر دیا جائے تو مسلمانوں کا ایک نقطہ پر جمع ہو جانا آسان ہو جائیگا۔

مرکز کی تلاش اور پھر حنفی فقہ کی طرف رجوع شاہ صاحب پہلے یہی ذکر کر چکے تھے کہ شاید ان کا عمل تجدید حجاز میں مستقر ہوگا، اور تمام دنیائے اسلام اسکو قبول کرے گی مگر حجاز میں جاکر حالات کا پورا تتبع کرنے کے بعد انکی رائے بدل گئی، اس کی طرف "تفہیمات الٰہیہ" میں اشارہ موجود ہے۔

لـہ امام ولی اللہ کو ہندوستان میں الہام ہوتا کہ آپ کو "تذکرہ شاہ ولی اللہ" صمدیت (دعابر عنہا بالمصطفویت) کا درجہ عطا کیا گیا (فی برتحفہ ۲۰)

ہند میں فقہ حنفی اور شاہ ولی اللہؒ اس کے بعد وہ دہلی آئے اور اسی کو مرکز بنالیا، دہلی کے مرکز میں فقہ شافعی کی مطلقاً ضرورت نہیں تھی، ہندوستان جب سے فتح ہوا اس میں حنفی فقہ برسراقتدار رہی، ہم ہندوستان میں اس لئے فقہ حنفی کے خصوصی واجب ہونے کا فتویٰ دیتے ہیں کہ شروع اسلام سے یہاں سوائے فقہ

(بقیہ صفحہ گزشتہ) جس کے بعد باستثناء نبوت کوئی بڑا درجہ محقق نہیں ہو، اس الہام کا سب سے بڑا مقصد فوری طور پر موجودہ نظام کی درہمی برہمی تھی، (یعنی محمد شاہ کے زمانے کی بوسیدہ سیاست کا قلع قمع کرکے ازسرنو حکومت کا استوار کرنا تھا، مگر شاہ صاحب نے الہام کے سمجھنے میں غلطی کی اور آپ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے حجاز چلے گئے (حالانکہ الہام ہند سے متعلق تھا) وہاں جاکر دیکھا تو کچھ بھی نہیں۔ آپ مایوس ہندوستان واپس آگئے، مگر وقت کے گزر جانے پر الہام کا ثانیاً یہ مطلب ہوا کہ آپ اپنی جدوجہد جاری رکھیں اور سیرت انبیاء پر چلیں غرض ایک فوری مقصد غلط فہمی کے باعث سرخرو پایا گیا اگر فوراً کام شروع کردیا جاتا تو مقصد پورا ہوجاتا۔ (تفہیمات الٰہیہ ص۲۲) پھر شب جمعہ ۲۱ ذی قعدہ ۱۱۴۴ھ میں آپ کو مکہ معظمہ میں دوبارہ الہام ہوا، فرماتے ہیں: میں نے مکہ معظمہ میں دیکھا کہ خداتعالیٰ نے مجھے اس زمانہ کا نظام قائم رکھنے میں ایک واسطہ بنایا ہے، میں نے دیکھا کہ کفار کا سردار مسلمانوں کے شہروں پر غالب آگیا، ان کے اموال لوٹ لئے انہیں قید کرلیا، اور اجمیر جیسے شہر میں کفر کے خصوصی احکام جاری کردیئے، اور اسلامی قانون ممنوع قرار دیدیا، خداتعالیٰ کی ناراضگی سے متاثر ہوکر میں غضب سے بھر گیا، اور میرے غضب کا اثر اس ہجوم میں بھی پھیل گیا، جو میرے ساتھ تھا انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ اس وقت خداتعالیٰ کی رضا کس طرح حاصل ہوسکتی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ "فك كل نظام" تمام بوسیدہ نظاموں کو توڑ دو، اس کے بعد ہجوم آپس میں جنگ شروع کردیتا ہے اور میں ایک شہر کے قریب پہنچا تاکہ اسکو برباد کردوں، ادھر وہ لوگ بھی میرے پیچھے چلے آئے اور لگاتار شہروں کو برباد کرتے ہوئے اجمیر پہنچ گئے۔ یہاں میں نے دیکھا کہ ان لوگوں نے کفار کے سردار کو ذبح کرڈالا ہے، اور اس کی رگ ہائے گردن سے خون بڑے زور سے بہہ رہا ہے۔ (فیوض الحرمین ص۹۰)

(تعبیر) ہمارے خیال میں یہ مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی قوت کی شکست کی طرف اشارہ ہے، اور شاہ صاحب من وجہ اس کے سرانجام دینے کا واسطہ ہیں، اجمیر کا ذکر اس لئے آیا ہو کہ دہلی کا روحانی مرکز اجمیر تھا، حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیر تشریف لائے اور یہیں سے اشاعت اسلام کا کام شروع کیا جس کے نتیجہ میں دہلی فتح ہوئی، اس خواب سے دو سال بعد یعنی ۱۱۴۶ھ میں باجی راؤ شمالی ہند پر حملہ آور ہوا، اور ۱۱۵۰ھ میں نادر شاہ افشار کے حملہ سے تمام سابقہ انتظامات کرد و برد ہونا شروع ہوئے، نادر شاہ کے بعد احمد شاہ ابدالی نے اس سلسلہ کو جاری رکھا جس میں مسلمانوں کی خانہ جنگی اور ان کے نظام سلطنت کی بوسیدگی ظاہر کرنے کے سوا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ مگر اسی احمد شاہ نے پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کا خاتمہ کردیا۔

ہند میں جن مسلمان امیروں نے احمد شاہ کو اس حملہ کی دعوت دی تھی ان میں نواب نجیب الدولہ پیش پیش ہیں جسے یہ تاریخی حقیقت معلوم ہو کہ نواب نجیب الدولہ شاہ ولی اللہ کے خاص مسترشدین میں سے تھے، اسکو ہماری یہ تعبیر قبول کرنے میں عذر نہ ہوگا۔

(ارشاد شد کہ نزد نواب نجیب الدولہ نہ صد عالم بود، ادنیٰ پنج روپیہ و اعلیٰ پنج صد روپیہ، و سہ قاضی حنفی، شافعی، مالکی و حنبلی را طلبیدہ بود رفت، بازفرمود حاجی غلام مصطفےٰ حنبلی باتباع حضرت الاعظم بود، چنانچہ میاں حیات خوشنویس ہم حنبلی است۔ ملفوظات شاہ عبد العزیز ص۸) ———— (باقی برصفحہ آئندہ)

حنفی کے اور کوئی فقہ معلوم ہی نہیں ہوتی، ایران کے اثر سے شیعہ کی حکومت یہاں قایم ہوئی، مگر وہ اسکیل ہی علیحدہ ہی، اس سے ہماری بحث نہیں۔ مسلمانان ہند کی اکثریت حنفی مذہب کی پابند ہی۔ ہندمیں جب اسلام آیا تو یہاں کے ایک بڑے حصے نے اسکو اجنبی سمجھا، مگر کافی زمانے کے تامل وتعاون اور بڑی بڑی سلطنوں اور بڑے حکما اور صوفیہ کی محنتوں سے ہندوستانی قوم نے اسلام کو اپنی چیز بنالیا، یہ اسلام ان کے قلوب واذہان میں حنفی صورت میں آیا، اس لئے حنفیت ہندوستانی قوم کا قومی مذہب ہی، اب یہاں کوئی مصلح ومجدد اسطرح کبھی کام نہیں کریگا کہ جہاں حنفیت کی رعایت ممکن ہو وہاں بھی اس کی

(بسلسلۂ صفحۂ گزشتہ) اس واقعہ کے قاعدہ "فک کل نظام" کو شاہ ولی اللہ نے اپنے انقلابی نظریہ کا عنوان قرار دیا، اور تفسیر وحدیث وفقہ وتصوف کی تمام کتابوں میں جو پچاس کے قریب ہیں۔ مناسب مواقع پر اجتماع اسلامی (اسلامی سوسائٹی) کے فساد کی تفصیل اور انقلاب کی ضرورت پر زور دیا اور بسط سے بحث کی ہی۔

چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ کے باب "اصلاح الارتفاقات" ص۱۰۳ میں فرماتے ہیں، اگر کسی قوم میں تمدن کی مسلسل ترقی جاری رہے تو اسکی صنعت اور حرفت اعلیٰ مدارج کمال پر پہونچ جاتی ہی، اس کے بعد اگر حکمراں جماعت آرام وآسایش اور زینت وتفاخر کی زندگی اپنا شعار بنالے تو اسکا بوجھ قوم کے کاریگر طبقات پر اتنا بڑھجا ئیگا کہ سوسائٹی کا اکثر حصہ حیوانات جیسی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوگا۔ ایسے وقت میں ضروری ہی کہ قدرت الٰہیہ "انقلاب" کے سامان پیدا کردے اور قوم کے سر سے اس ناجائز حکومت کا بار اتار دے۔ چنانچہ قیصر وکسریٰ کی حکومتوں نے یہی وطیرہ (آرام وآسایش اور رفاہیت بالغہ) اختیار کیا، اس مرض کو دور کرنے کے لئے ان پڑھ لوگوں میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔

یہاں ضمنی طور پر مثالوں کی ذیل میں بتلاتے ہیں کہ دہلی کے بادشاہوں اور امیروں کی حالت بھی قیصر وکسریٰ کے لگ بھگ جا پہنچی ہے فرماتے ہیں "وما تراہ من ملوک بلادک یغنی عن حکایاتھم"

دوسرے موقعہ پر جہاں ربوا کی بحث ہی (حجۃ اللہ ص۱۰۴) کہ اسلام نے ربوا کو قطعی طور پر بند کردیا ہی، وہاں تفصیل سے بتایا کہ رفاہیت بالغہ کے مرض سے سوسائٹی کو محفوظ کردینا ازحد ضروری ہے۔

"فک کل نظام" کے بعد نئی تعمیر ضروری ہے، اس کے لئے تفہیمات الٰہیہ ص۲۱۴ میں ہیئت اجتماعیہ کے ہر ہر صنف کو اس کی غلطیوں پر متنبہ کرکے سیدھا راستہ بتلایا ہے۔

سب سے پہلے علما اور صوفیہ اور اولاد مشائخ اور طلبہ اور واعظوں اور زاہدوں کو تبلیغ کی ہی کہ انھیں کیا کرنا چاہئے، بعد ازاں ملوک وامراء اور فوجی طاقت اور پیشہ ور جماعتوں کے فرائض پر مفصل بحث کی ہی، عورت اور مرد کے اجتماع میں جو غلطیاں ہو رہی ہیں ان کو نمایاں کرکے بتلایا ہے، شہروں کے انتظامات اور صوبہ داروں کے فرائض نہایت تحقیق سے واضح کئے ہیں۔

اور لطف یہ ہی کہ یہ سب کچھ ملاء اعلیٰ کی طرف سے نیابۃً تحریر کیا ہی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہی کہ اس اجتماع میں صحیح بات کہنے والے کے لئے کسقدر خطرات ہونگے، حضرت مولٰنا عم فیضہم ۱۲ محمد نور الحق

پرواہ نہ کرے، اس مذہب نے ہندوستان میں اتنا توسع پیدا کرلیا ہے کہ ہر محقق کے لئے حنفیت سے باہر جانیکی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ اس کو شاہ صاحب نے "فیوض الحرمین" میں ضبط کر دیا ہے اور کئی بار لکھا ہے کہ مجھے حکم دیا گیا کہ لا تخالف عوام بلادک[1] اسی بنا پر ہمنے شاہ صاحب سے تعلق رکھنے والے ایسے لوگوں کو جو حنفی بننا نہیں چاہتے۔ ہندوستانیت سے خارج کر دیا ہے۔ انھیں کوئی حق نہیں ہے کہ ہندوستانی معاملات میں دخل دیں۔

پھر انہیں بھی دو قسم کے عالم ہیں (۱) جن لوگوں کو شاہ صاحب کے اتباع میں سے حنفی مذہب پر پورا اعتماد نہیں رہا۔ ان میں سے بعض نے شافعی مذہب اور بعض نے حنبلی مذہب اختیار کرلیا انکی چند نظیریں شاہ عبدالعزیز اور شاہ اسحق (متوفی ۱۲۶۲) کے شاگردوں میں پائی جاتی ہیں، یہ لوگ ہندوستانی بن سکتے ہیں، کیونکہ ان کو حنفیت سے مخاصمت نہیں مرکز اسلام میں یہ چاروں مذہب اسلام کے مساوی شارح سمجھے جاتے ہیں ایک حنفی کسی شافعی یا حنبلی سے عناد نہیں رکھتا۔

(۲) مگر ایسے عالم جن کو حنفیت پر اعتماد نہ ہو، اور وہ مذاہب اربعہ میں سے کسی مذہب کے پابند ہو کر نہ رہ سکیں۔ ان سے شاہ ولی اللہ نے تبرّی[2] کی ہے، ان کو اپنے سلسلہ میں منتسب ہونیکی اجازت نہیں دیتے، اس لئے ہم ایسے انسانوں کو اپنی تحریک کا قیّم کبھی نہیں مان سکتے، یہ اصلی دیوبندیت ہے، شاہ صاحب کے علوم سے تباعد کرنا دیوبندیت نہیں ہے۔

حنفیت میں شاہ صاحب کی الہامی تجدید، ہندوستان کے لئے شاہ صاحب کو ایک نئی چیز الہام ہوئی، فیوض الحرمین میں فرماتے ہیں:- عرفنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان فی المذہب الحنفی طریقۃ انیقۃ ھی اوفق الطرق بالسنۃ المعروفۃ التی جمعت ونقحت فی زمان البخاری واصحابہ وذلک ان یوخذ من اقوال

---

[1] قال فی موضع من فیوض الحرمین ولفظ فی لفحۃ اخری فبین ان مراد الحق فیک ان تجمع شملاً من الامۃ المرحومۃ بک فایاک وما قیل ان الصدیق لایکون صدیقاً حتی یقول لہ الف صدیق انہ زندیق، وایاک ان تخالف القوم فی الفروع فانہ مناقضۃ لمراد الحق ھ ص۶۲ ۱۲

[2] استفدت منہ صلی اللہ علیہ وسلم ثلثۃ امور خلاف ما کان عندی وما کانت طبیعتی تمیل الیہ اشد میل، احدھا الوصاۃ بالتقید بھذہ المذاہب الاربعۃ لا اخرج منہا والتوفیق ما استطعت وجبلتی تابی التقلید وتانف منہ راسا لکن شئی طلب منی التعبد بہ بخلاف نفسی ھ فیوض الحرمین ص۶۴ وانا اوصی طالب الحق بامور منہا ان لا یصحب جھال الصوفیۃ ولا جھال المتعبدین ولا المتقشفۃ من الفقہاء ولا الظاہریۃ من المحدثین الخ ص۲۸۷ تراجم، وراجع التفہیمات ص۲۰ وعقد الجید باب تاکید الاخذ بھذہ المذاہب الاربعۃ والتشدید فی ترکھا والخروج عنہا ۱۲

الثلاثة قول اقربهم بها في المسئلة - ثم بعد ذلك يتبع اختيارات الفقهاء الحنفيين الذين كانوا من علماء الحديث، فرب شيء سكت عنه الثلثة في الاصول وما تعرضوا لنفيه ودلت الاحاديث عليه فليس بد من اثباته والكل مذهب حنفي ه مثل

دوسری جگہ میں لکھتے ہیں :- ثم كشف لي انوذجا ظهر لي منه كيفية تطبيق السنة بفقه الحنفية من الاخذ بقول احد الثلثة وتخصيص عموماتهم والوقوف على مقاصدهم والاقتصار على ما يفهم من لفظ السنة وليس فيه تاويل بعيد ولا ضرب بعض الاحاديث بعضا ولا رفضا لحديث صحيح بقول احد من الامة، وهذه الطريقة ان اتمها الله واكملها فهي الكبريت الاحمر والاكسير الاعظم فيوض الحرمين مثل

اس طریقہ سے شاہ صاحب نے حنفی فقہ میں تجدید کردی، اب انکی رائے یہ ہے کہ جس قدر احادیث صحیحہ موجود ہیں، ان کے موافق فقہاء حنفیہ میں سے کسی نہ کسی کا فتویٰ ضرور ملتا ہے اس لئے فقہ شافعی کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی، ایک حنفی جبکہ وہ حدیث میں تحقیق کے درجہ پر پہونچ جائے اور اپنی تصحیح شدہ حدیثوں کے موافق فقہ حنفی میں سے روایات منتخب کرے، تو وہ فقہ واجب الاتباع ہوگی، شاہ عبدالعزیز اس فقہ کے امام ہیں -

---

لہ قال الحافظ عبد القادر القرشي في الجواهر المضية مثل والحافظ زين العابدين قاسم بن قطلوبغا في تاج التراجم مثل (نسخه خطیه) قال ابن العديم سمعت قاضي العسكر يقول قدم دمشق الكاساني فحضر اليه الفقهاء وطلبوا منه الكلام معهم في مسئلة فعينوا مسائل كثيرة فجعل كلما ذكر مسائل يقول ذهب اليها من اصحابنا فلان وفلان، فلم يزل كذلك حتى كالهم لم يجد مسئلة الا وقد ذهب اليها احد من اصحاب ابي حنيفة فانفض المجلس على ذلك ولم يتكلموا معه ۱۲

ے قال الامام عبد العزيز الدهلوي ان المجتهدين الباحثين عن دلائل احكام الشرعية ومآخذها لما رأوا احاديث رسول الله صلى الله عليه وسلم متعارضة، وآثار الصحابة والتابعين مختلفة وهي اهم المآخذ واكثرها في الاحكام تحيروا واختلف رأيهم في التفصي عن هذا التعارض والاختلاف (الف)، فاما الذي اختار مالك تحكيم عمل اهل المدينة - لان المدينة بيت الرسول وموطن خلفائه و مسكن اولاد الصحابة واهل البيت ومهبط الوحي. واهلها اعرف بمعاني الوحي فكل حديث او اثر يخالف عملهم لا بد ان يكون منسوخا او مأولا او مخصصا او محذوف الفقرة فلا يعتني بها (ب)، والذي اختاره الشافعي تحكيم اهل الحجاز، واشتغل بالدراية مع ذلك وحمل بعض الروايات على حالة و بعضها على حالة اخرى. وسلك مسلك التطبين مهما امكن. ثم ارتحل الى مصر العراق فسمع روايات كثيرة

شاہ صاحب بحیثیت مجتہد منتسب

ہم شاہ ولی اللہ کو حنفی اور شافعی ہر دو مذہبوں میں مجتہد منتسب مانتے ہیں جب وہ اپنے آپ کو مرکز اسلام (حجاز) میں تصور کرتے ہیں تو فقہ حنفی اور شافعی میں سے کسی ایک کو ترجیح دینا جائز سمجھتے ہیں اور جب وہ خود کو ہندوستان میں فرض کرتے ہیں تو اپنے والد کے طریقہ پر فقط فقہ حنفی کے مجتہد منتسب امام ہوتے ہیں اسکے متعلق فیوض الحرمین میں ایک تصریح موجود ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا فرماتے

(بقیہ گزشتہ) عن ثقات تلك البلاد و ترجح عنده لبعض الروايات على عمل اهل الحجاز نجد ثمه في مذهبه قولان قد يه و جديد -

(ج) والذی اختاره احمد بن حنبل اجراء كل حديث على ظاهره. لكنه خصص بموارده مع اتحاد العلة فجاء مذهبه على خلاف القياس واختلاف الحكم مع عدم الفارق. ولذلك نسب مذهبه الى الظاهرية.

(د) واما الذی اختاره ابوحنيفة ثم تابعوه امر بين جدا وبيان ذلك انا تتبعنا فوجدنا فى الشريعة صنفين من الاحكام (صنف) هى القواعد الكلية المطردة المنعكسة كقولنا لا تزر وازرة وزر اخرى. وقولنا الغنم بالغرم وقولنا الخراج بالضمان، وقولنا العتاق لا يحتمل الفسخ، وقولنا البيع يتم بالايجاب والقبول وقولنا البينة على المدعى واليمين على من انكر ونحو ذلك مما لا يحصى -

(وصنف) وردت فى حوادث جزئية لاسباب مختصة كانها بمنزلة الاستثناء من تلك الكليات. فالواجب على المجتهد ان يحافظ على تلك الكليات (التى) لا ندرى اسبابها ومخصصاتها على اليقين فلا يلتفت اليها مثال ذلك ان البيع يبطل بالشروط الفاسدة، قاعدة كلية - وما ورد فى قصة جابرؓ، انه اشترط الحملان الى المدينة فى بيع الجمل، قصة شخصية جزئية فلا تكون معارضة لتلك الكلية وكذا احاديث المصراة تعارض القاعدة الكلية التى ثبتت فى الشرع قطعا، وهى قولنا الغنم بالغرم ونحو ذلك من المسائل ولزم من هذا ترك العمل باحاديث كثيرة - وردت على هذا النسق الجزئى لكنهم لا يبالون بها، بل يعدون الاجتهاد المحافظة على الكليات، ودرج الجزئيات فى تلك الكليات مهما امكن، وهذا الكلام الاجمالى له تفصيل طويل لا يسع الوقت له، والله الهادى ه. بحوالہ کتاب التمہید موقف ثالث

مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو" ملفوظات شاہ عبدالعزیز - طبع مجتبائی میرٹھ ص۱۱۶-۱۱۷ ۱۲

سے قال الامام ولی اللہ فی " بوارق المعرفة"

شاہ عبدالرحیم کا حنفی طریقہ

مخفی نماند کہ حضرت والد ماجد در اکثر امور موافق مذہب حنفی عمل مے کردند - الا بعض چیزہا کہ بحسب حدیث یا وجدان بمذہب دیگر ترجیح مے یافتند - ہ
(انفاس العارفین ص۸)

۱ محمد نور الحق غفرلہ العلوی

ہیں: نفخ فی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نفخۃ فبین ان مراد الحق فیك ان یجمع شملا من الامۃ المرحومۃ بك فایاك وما قیل ان الصدیق لا یکون صدیقا حتی یقول لہ الف صدیق انہ زندیق وایاك ان تخالف القوم فی الفرع فانہ مناقضۃ لمراد الحق، ثم کشف لی امر فجالی قولہ الاکسیر الاعظم

امام عبدالعزیز دھلوی امام عبدالعزیز شاہ ولی اللہ کی وفات پر نو عمر تھے، شاہ صاحب کے شاگردوں سے انھوں نے اپنی تکمیل کی، شاہ عبدالعزیز کے خسر شیخ مولوی نوراللہ بڈھانوی شاہ ولی اللہ کے خاص اصحاب سے تھے وہ فقہ حنفی کی تحقیق کا طریقہ شاہ صاحب سے سیکھ چکے تھے، شاہ عبدالعزیز نے اپنی تکمیل کرلی، اور پھر اس طریقے پر ہندوستان میں شاہ صاحب کے علوم کو کامیاب بنانیوالی جماعت تیار کرنے میں مصروف ہوگئے۔

شاہ عبدالعزیز کے زمانے میں سیاسی تنزل انتہا تک پہونچ چکا تھا، سلاطین دہلی کے بالمقابل قوت (انگریز) بہت متیقظ اور چابک تھی، ان کی کڑی نگاہوں کے زیر اثر شاہ عبدالعزیز کو کام کرنا پڑا، اس لئے ان کا مرکز نمایاں نہیں ہے، اور ان کو تھوڑا سا کام کرنے میں لمبا وقت خرچ کرنا پڑا، پھر بھی اول درجے کے کامیاب علما میں شمار کئے جائیں گے، انھوں نے شاہ صاحب کے نظریۂ انقلاب کو کامیاب بنانیوالی مرکزی جماعت پیدا کردی [قلت ھم الارکان الاربعۃ للنہضۃ الھندیۃ (۱) الامیر الشہید السید احمد البریلوی (۲) الصدر السعید مولٰنا عبدالحی الدھلوی (۳) والصدر الشہید مولٰنا محمد اسمٰعیل الدھلوی (۴) والصدر الحمید مولٰنا محمد اسحاق الدھلوی نور الحق] اسے ہم شاہ ولی اللہ کی فقہ کی تجدید مانتے ہیں۔

مشائخ دیوبند ہمارے اساتذہ دیوبند شاہ عبدالعزیز کے شاگردوں کے شاگرد ہیں ہمنے ان کا طریق نہایت تحقیق سے حاصل کیا، ہم افغانستان اور ترکی میں رہے ہمیں فقہاء حنفیہ میں اپنے مشائخ سے بہتر عالم کہیں نظر نہیں آئے۔ اس کے بعد ہم حجاز میں رہے، جہاں حنفی، شافعی، مالکی حنبلی موجود ہیں اور حنابلہ کی حکومت ہے، اتفاقاً وہاں حنیفہ کو اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا، مگر ہم نے جب اپنا تعارف شاہ ولی اللہ کے طریقے پر کرایا تو علماء حرمین کو ہمارے مسلک سے کوئی خصومت نہ رہی ہماری حالات ایسے نہیں تھے کہ ہم اپنے مسلک کی عمومی تعلیم کا انتظام کرسکتے۔ مگر خواص علماء نے شاہ صاحب کا طریقہ (تحقیق حدیث اور تحقیق فقہ) ہم سے خصوصی طور پر اخذ کیا، اسے ہم شاہ صاحب کے طریقے کی بہت بڑی کامیابی سمجھتے ہیں ہم جانتے ہیں کہ ہندوستان کے لوگ شاہ صاحب کے طریقے کو عام طور پر اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے مگر اسکا سبب ایک سیاسی مقابلہ ہے جسپر ہم یہاں بحث کرنا نہیں چاہتے۔

وباللہ الثقۃ

باب پنجم تصوف و فلسفہ

(الف ۱) عام طور پر متصوفین مبادی اخلاق سے اپنا مسئلہ شروع کرتے ہیں انسان کے بدن میں تین عضو ہیں جنہیں علمائے طب اعضائے رئیسہ کہتے ہیں، دماغ، قلب، کبد۔ ان اعضاء رئیسہ کی مرکزی قوتوں کو لطیفۂ عقل قلب و نفس کہتے ہیں، پھر انکی ترکیب و تحلیل سے مختلف حالات اور مقامات پیدا ہوتے ہیں جن سے متصوفین اپنی کتب میں پورے بسط سے بحث کرتے ہیں۔

(الف ۲) شاہ ولی اللہ ان لطائف ثلثہ سے پہلے ایک لطیفۂ جوارح بھی تجویز کرتے ہیں، ان کی عبارت "الطاف القدس" میں سے بعینہا نقل کیجاتی ہے۔

در ظاہر شرع کہ مسمی باسلام است مبحوث عنہ لطیفۂ جوارح است، و تحقیق ایں لطیفہ آں ست کہ قلب و عقل و نفس بہ اعتبار تقویم جوارح، و آلہ بودن برائے تکمیل افعال جوارح فنا در جوارح مسمے بہ لطیفۂ جوارح میگردد، و برائے تفہیم ایں لطیفہ بریں فقیر شترے ظاہر ساختند، کہ مشرف بر موت بود، غیر از رمقے از حیات با او باقی نماندہ و جمیع لطائف ثلثہ بازرہ او ضعیف گشتہ، اما او را در قطارے لبستہ بودند، و او غیر از رفتن قوتے نداشت، پس تا آخر انزہاق روح راہ مے رفت، بعد ازاں بمرد، از رفتن باز ماندنش ہماں دمردنش ہماں، دریں حال آگاہانیدند کہ ایں شتر فانی است در لطیفۂ جوارح و مواخذۂ اعمال شرائع بر ہمیں لطیفہ است " ص ۲۹، ۳۰

(ب) متصوفین کو کہنا پڑتا ہے کہ تعلیم شریعت ایک خاص نصاب رکھتی ہے، اور تصوف و طریقت اسکے ماورا دوسری چیز ہے، اور پھر یہ بھی ساتھ ہی کہنا پڑتا ہے کہ یہ تصوف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں رائج نہ تھا، اسکا سبب یہ بتاتے ہیں کہ حضورؐ کی صحبت میں آنا نور اور برکت تھی کہ اس علم کیطرف احتیاج ثابت نہیں ہو سکی

(۱) ہمیں اس قسم کی فکر میں ایک بین نقص نظر آتا ہے، گویا تعلیم فقہ علیحدہ چیز ہے، اور تصوف اس سے ایک جداگانہ غیر ضروری امر ہے یعنی جسکا جی چاہے اسے (تصوف کو) اخذ کرے اور جسکی مرضی نہو اس سے سروکار نہ رکھے۔

(۲) پھر آگے چلکر ہم نے دیکھا کہ ایمان باللہ و الآخرۃ ان متصوفین کی صحبت ہی میں مکمل ہوتا ہے، اور یہ بھی واضح ہے کہ قرآن عظیم ایمان باللہ کو جس کے ساتھ ایمان بالیوم الآخر نہو قابل اعتماد نہیں مانتا، اس سے ہماری طبیعت

میں تشویش پیدا ہوئی کہ جو چیز ایمان بالیوم الآخر پر یقین دلاتی ہے، اسکو کمزور کیوں کر دیا گیا۔

(پ) شاہ صاحب کی اس حکمت کو پڑھ لینے کے بعد ہمارا اطمینان ہوا۔ ہم انسانی زندگی کو وحدت غیر منقسمہ مانتے ہیں، دنیاوی زندگی اور اخروی زندگی دو متباین چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی سیر کے مختلف منازل ہیں۔

شاہ صاحب کے لطیفہ جوارح کا مطلب یہ ہی کہ لطائف ثلاثہ بارزہ دو رخ رکھتے ہیں، ایک جوارح کیطرف اسکی تکمیل کا نام شریعت ہی، دوسرا رخ اپنے منبع کیطرف اس کی تکمیل تصوف، طریقت، فلسفہ کہلائیگی، ہر انسان ایک ہی جبلت لیکر نہیں آتا بعض چیزیں ایک شخص کو شروع زندگی میں سمجھ میں آجاتی ہیں، مگر دوسرے کو کافی زمانہ گزرنے پر انکا علم حاصل ہوتا ہی اسی طرح یہ ہوسکتا ہے کہ ایک انسان اپنی انانیت کا مصداق بدن کو سمجھے اور اسکا فہم لطیفہ جوارح سے آگے نہ بڑھ سکے۔ جیسے عامۃ الناس کی حالت ہی، اور دوسرا انسان جو ذکی ہے وہ اپنے افعال جوارح کو عقل، اخلاق، اور طبیعت کے اقتضا میں تقسیم کرلیتا ہے، وہ انسانیت کے لئے ایک مرکزیت پیدا کرسکتا ہے۔

اسطرح پر شریعت اور طریقت دو چیزیں نہیں ہونگی، بلکہ ایک چیز کے دو رنگ یا ایک درخت کے دو ثمر ہیں، ایک پہلا، ایک دوسرا، اس طریق پر حیات کی وحدت بھی قایم رہیگی، اور انسانیت میں اختلاف مدارج بھی معقول رہیگا۔

"الطاف القدس" میں پہلا باب لطیفہ جوارح پر بحث کرنے کے لئے معین ہی، دوسرے باب میں لطائف ثلثہ کے دوسرے پہلو پر بحث ہی، تیسرے باب میں عقل اور قلب کے پہلے بطن پر بحث ہی چوتھے میں عقل اور قلب کے بطن البطن پر بحث ہی آخری درجہ پر پہنچ کر انسان کو اس تجلی سے ربط پیدا ہوتا ہی جو کائنات کی مرکزی قوت کے آئینہ میں ظاہر ہوئی۔

یہ مباحث مستقل توجہ سے پڑھنے کے قابل ہیں، اسوقت ان پر تفصیل سے بحث کرنا مقصود نہیں۔

تجلی الٰہی کی تشریح سمجھنے کے لئے کتاب "السطعات" کا پڑھنا لازم ہی اور ادراک انسانی کے تنوع کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے "الطاف القدس" کا مطالعہ کرنا ضروری ہے، اور اسلام میں تصوف کا فلسفہ تاریخ سمجھنے کے لئے ہمعات کا مطالعہ کرنا چاہیئے، اور متصوفین کے طریق کی تفصیل "انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ"[1] میں دیکھنی چاہیئے۔

شاہ صاحب نے اپنے والد ماجد سے جسطرح "طریقہ" حاصل کیا، اسکی تفصیل "قول جمیل" میں ملیگی، شاہ صاحب کے والد اور چچا کے سوانح حیات جنکو شاہ صاحب کے فلسفہ اور تصوف کی روح کہنا چاہیئے "انفاس العارفین" میں مذکور ہیں، اس کتاب کے بعد اگر "اخبار الاخیار" از شیخ عبدالحق دہلوی اور "نفحات الانس" از مولانا جامی کا مطالعہ کیا جائے تو اسلام میں تصوف کی پوری تاریخ سامنے آجائیگی۔

---

[1] کتاب الانتباہ کے دو حصے ہیں، یہاں مراد حصہ اول ہی جو شائع ہوچکا ہی، دوسرا حصہ حدیث اور فقہ سے متعلق ہی جو ابھی تک شائع نہیں ہوا حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ مکہ معظمہ میں ہمنے اسکا ایک صحیح نسخہ دیکھا جو بیشمار لطائف پر مشتمل ہی کاتب حقیر کو توقع ہی کہ اسکی نقل مجھ کو مل جائیگی دعا ذالک علی اللہ بعزیز محمد نور الحق

فصل (۲) عجمی اقوام اور فلسفۂ اشراق

جیسے ہم نے امام ابوحنیفہ کی فقہ کو ایرانی تہذیب کے مفتوح ہونے کے بعد، اسلام کا ایک ضروری جزو قرار دیا ہے، اسی طرح ایرانی مسلم کی طبیعت نے جب اپنا پرانا فلسفہ اسلامی رنگ میں لیا تو اسکا نام تصوف ہوا۔

آرین قوموں میں تہذیب کے دو عنصر ہیں (۱) ایک کسی مجتہد کا قانون فقہ جیسے منوجی کا دہرم شاستر (۲) اور دوسرا اشراقی فلسفہ، یہ چیز سندھ میں بھی تھی، اسکے علاوہ ایران اور یونان میں موجود تھی، آرین تہذیب کے یہ تینوں مرکز ایک ہی طرح کا فکر رکھتے ہیں۔ ایران جب مسلمان ہوا تو ان کے مشائی فلاسفروں نے علم کلام پیدا کیا، اور انکے اشراقی حکمانے تصوف مدون کیا یہ چیزیں (مشائیت اور اشراقیت) ان اقوام کی ذہنیت کے لوازم میں سے ہیں جب ان میں شہنشاہی پیدا ہوئی تب کہیں انھیں قانون ضابطہ کی ضرورت کا احساس ہوا، اسکا نتیجہ یہ قانون (لا۔ فقہ) ہے جو یونان، ایران، ہند سب میں مکتوب اور غیر مکتوب شکل میں پایا جاتا ہے جب یہ قومیں مسلمان ہوئیں تو اسلام کی تعلیم کا وہ حصہ جو جوارح کی تہذیب سے متعلق تھا، انھوں نے قانونی شکل میں مرتب کر لیا، اسی کا نام امام الائمہ ابوحنیفہ کی فقہ ہے (۲) اسکے بعد تہذیب کا جو حصہ لطیفۂ عقل کے ظاہر سے تعلق رکھتا ہے اسکا نام فلسفہ مشائیت یا علم کلام ہے (۳) اور جو حصہ عقل کے بطن سے متعلق ہے اسکا نام حکمت یا فلسفہ اشراقیت ہے اسلام نے بغداد کے مرکز میں جب ایرانیت پر پورا قبضہ کیا، اور اسکو ابھار کر اسلام کی خدمت کے لئے تیار کیا۔ تو اسی مرکز سے تصوف پیدا ہوا، اور اسی طرح فقہ حنفی بھی عراق ہی سے نکلی۔

ہند میں اسلام ایران کے راستہ سے آیا لہذا یہاں فقہ حنفی آئی اور تصوف بھی آیا۔ بنابریں ہند میں اسلام کی عظمت قائم کرنیوالا کوئی محقق نہ فقہ حنفی سے قطع نظر کرسکتا ہے اور نہ تصوف سے بے نیاز ہوسکتا ہے۔

ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ ترکی تحریک ایرانیت سے علیحدہ چیز نہیں ہے۔ ترک ایرانی تہذیب کے حامل ہوکر حاکم ہوتے رہے، اس لئے دہلی اور استنبول میں وہی تصوف رائج ہوا۔ جو بغداد میں پیدا ہوا تھا ہمیشہ مختلف استعدادات کے اثر سے اس (تصوف) کی ظاہری شکل بدلتی رہیگی، مگر معنوں میں کوئی فرق نہیں آئیگا۔

آرین قوموں کو حنیفی طریقے پر نبوت کا قائل بنانا اس پر موقوف ہے کہ ان کے تصوف کی آخر تک اس طرح اصلاح کردیجائے کہ وہ نبوت کے سمجھنے کا آلہ بن سکے۔

فصل (۳) آرین اقوام کو سامی نبوت سمجھانیکا ولی اللہی طریقہ

(ج) فلاسفر الہیات میں واجب الوجود کو بالاتفاق مانتے ہیں، مگر انسانی حواس کا اس سے تعلق پیدا

ہونا ناممکن سمجھتے ہیں، بخیال ان کے وہ جسمانیت سے اتنا مجرد ہے کہ انسانی حواس اسکو کسی طرح ادراک نہیں کر سکتے۔

اب دوسری طرف انبیا علیہم السلام کی تعلیمات کو لیجئے وہ واجب الوجود کا جونسا نام سکھائیں جیسے اللہ، لاھوت، لاہ[1] یا ان کے ہم معنی کوئی اور لفظ اس ذات سے دیکھنے اور سننے کا تعلق ضرور پیدا کرتے ہیں، نبوت کا مطلب ہی یہی ہے کہ اس کے حامل نے خدا کی کوئی بات سنی اور وہ اپنے اتباع کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر انکے طریقے پر کوئی شخص تکمیل کرے تو وہ اللہ تعالے کو دیکھے گا جس وقت تک اس مسئلہ کا حل اور اس اختلاف کی تطبیق آرین قوموں کو نہ سمجھائی جائے وہ اپنی طبیعت سے اسے قبول کرنیکو تیار نہیں ہو سکتے۔

(ج) شاہ صاحب کے تصوف میں یہی کمال ہے وہ تجلی الٰہی کا مسئلہ اس طرح سمجھاتے ہیں، جس کی ایک طرف تو واجب الوجود سے من وجہ عینیت کی نسبت رکھتی ہے یعنی اس تجلی سے تعلق رکھنے پر کہا جا سکتا ہے کہ ہم اللہ تک پہنچ گئے اور دوسری طرف تجلی اپنے مظہر کے رنگ میں اسطرح رنگین ہو جاتی ہے کہ انسانی عقل اور حواس باطنہ کا باطن اس سے تعلق پیدا کر سکتا ہے اور اس کے بعد یہ کہنا صحیح ہوتا ہے کہ میں نے خدا تعالیٰ کو دیکھا یا اسکی بات سنی۔

اس طرح کی تطبیق کے بعد آرین فلاسفی (حکمت) اور سامی نبوت میں اختلاف رفع ہو جائیگا۔

ہم نے جب سے عقلمندوں کو اسلام کی تبلیغ کرنا مقصد حیات بنایا۔ وہ خواہ مسلم ہوں یا غیر مسلم تو ہمیں اس تحقیق کی از حد ضرورت ہوئی، ہم نے نوجوان تعلیم یافتہ کو اس ضرورت پر متنبہ کرنے کے بعد شاہ صاحب کی تصوف کی کتابیں پڑھائیں۔ تو وہ اس علم کی ویسے ہی ضرورت محسوس کرنے لگے، جیسے ایک عامی مسلمان جب نماز کی پابندی کا ارادہ کرے تو کسی فقہ کے سیکھنے کو ضروری سمجھتا ہے۔

فصل (۴) شاہ صاحب کی نظر میں تصوف کی اہمیت اور ضرورت

یہاں ہم شاہ ولی اللہ صاحب کی ایک عبارت نقل کر کے ان کے مسلک کو واضح کر دیتے ہیں کہ وہ اس تصوف کی کتنی اہمیت مانتے ہیں تفہیمات الٰہیہ میں فرماتے ہیں

"لیس منا من لم یتدبر کتاب اللہ ولم یتفھم حدیث نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم، لیس منا من ترک ملازمۃ العلماء اعنی الصوفیۃ الذین لھم حظ من الکتاب والسنۃ اوالراسخین فی العلم

---

[1] حضرت مولانا الشیخ عم فیضہم کی تحقیق یہ ہے کہ تبت کا مرکزی مذہبی شہر لاسہ دراصل لاہ سہ ہے یعنی بیت اللہ، یہ شہر آرین اقوام کی مذہبی تہذیب کا قدیمی مرکز ہے فرماتے ہیں، ہم نے جب یہ خیال مولانا حمید الدین سے ظاہر کیا تو فرمانے لگے کہ خدا تعالیٰ کے نام کا یہ مادہ دنیائے مذہب کا قدیم ترین لفظ معلوم ہوتا ہے۔ جو تمام مذاہب میں معمولی اختلاف سے مستعمل ہوتا رہا۔
محمد نور الحق غفرلہ

الذین لھم حظ من الصوفیۃ، او المحدثین الذین لھم حظ من الفقہ۔ او الفقہاء الذین لھم حظ من الحدیث اما الجہال من الصوفیہ والجامدون للتصوف فاولئک قطاع الطریق ولصوص الذین فایاک وایاھم۔ جعلنا اللہ سبحانہ ممن یطیعہ ویتبع رضوانہ ولا یشرک بہ شیئاً فانما نحن بہ ولہ والسلام۔ ص ۲۰۳

دوسرے ملکوں کے علما جو پچھلی صدی میں تجدید کا فکر رکھتے تھے۔ ان میں سے جنکو شاہ صاحب کے علوم قرآنیہ اور حدیثیہ اور فقہیہ پہونچے، وہ ان کی پوری قدر کرتے رہے۔ مگر شاہ صاحب کے تصوف کو ماننا ان کے لئے بہت گراں تھا۔ اس سے وہ سمجھتے ہیں کہ ہم ایرانیت اور ہندیت کے قریب چلے جا رہے ہیں۔ حالانکہ وہ سامیوں اور آرین قوموں میں ایک تضاد ثابت کرنا اپنے ترفع کے لئے ضروری مانتے ہیں۔ حجاز میں رہتے ہوئے، اسطرح کے لوگوں سے ہمیں کافی واسطہ پڑا، مگر جب ہمنے انھیں ان مقاصد عالیہ پر متوجہ کیا، جو آرین قوموں کو سامی نبوت سمجھانے سے پیدا ہوتے ہیں اور ان سے انسانیت جسقدر بلندی پر پہونچتی ہے اس کے لئے شاہ صاحب کے تصوف نے راستہ صاف کر دیا ہے تو وہ اسکی قدر کرنے لگے مگر اسپر احاطہ کرنے کے لئے وقت صرف کریں۔ یہ وسعت قلب ہمنے اُن میں نہیں دیکھی، ان لوگوں کی طرف سے جو ہندوستانی مسلمانوں میں پروپیگنڈا ہوا اس میں تصوف قطعی طور پر نظر انداز کر دیا گیا، اس طرح وہ ہندوستانی جو پروپیگنڈا کا شکار ہوئے اپنے ائمہ کے کلام سے زیادہ مستفید نہیں ہو سکے۔

فصل (۵) اسلام اور ہندوستانیت

ہم نے محسوس کیا کہ ایک عرب جیسا اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے اسی طرح اپنی عربیت پر فخر کرتا ہے یہی حال ایرانی اور ترک کا ہے، مگر ایک ہندوستانی کو دوسرے ممالک میں جاکر اپنی ہندوستانیت سے ایک قسم کی نفرت محسوس ہونے لگتی ہے اس لئے کہ وہ اسلام اور اس کی تعلیم کے ائمہ ہندوستان سے باہر ہی مانتا ہے، ہماری سمجھ میں یہ فکر مسلمانوں کے لئے نہایت مضر ہے، مسلمانوں کی اتنی آبادی کسی ملک میں نہیں جتنی ہندوستان میں ہے، ان کی ترقی کا سامان جس قدر ہندوستان میں میسر ہے کسی مسلمان کو اپنے ملک میں حاصل نہیں، اس طرح اتنی بڑی قوم ترقی کے راستے سے بھٹک رہی ہے۔

اس کا علاج ہماری سمجھ میں یہی آتا ہے کہ وہ اپنی تعلیم میں بھی پہلے ہندوستانی ائمہ پر اعتماد کرنا سیکھیں، اس کے بعد ان ائمہ کے شرف کے ساتھ ہندوستانیت محترم ہو جائیگی اور ہندوستانی کو اپنے ملک میں ترقی کرنیکا خیال پہلے درجہ پر ہوگا اور دوسری قوموں سے ملکر ترقی کرنیکا فکر دوسرے درجہ پر آئیگا ہماری سمجھ میں یہی انکے لئے راہ نجات ہے۔[۵]

[۵] "الفرقان"۔ اس فصل میں مولانا کا بیان (شاید اختصار وایجاز کی وجہ سے) نہایت غیر واضح ہے اور پتہ نہیں چلتا کہ اس سے مولانا کا منشا کیا ہے حالانکہ یہ سلسلہ

اسی لئے ہم شاہ ولی اللہ کے علوم کا ہندوستانیوں میں تعارف کرانا ضروری جانتے ہیں ہماری ہندوستانیت کا مطلب یہ ہے کہ ہمنے اسلام شاہ ولی اللہ سے سیکھا جو ہندوستانی تھے دہلوی تھے یہیں پیدا ہوئے یہیں دفن ہوئے،

فصل (۶)

نبوت کی رہنمائی کی ضرورت صرف امور آخرت ہی میں نہیں ہے بلکہ دنیوی معیشت کا سنوارنا بھی نبوی ہدایات کا محتاج ہے ابن خلدون کی ایک سنگین غلطی پر انتباہ

شاہ صاحب کے مکمل فلسفے کو سامنے رکھ لینے کے بعد حجۃ اللہ البالغہ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ امر واضح ہو جائیگا کہ انبیاء علیہم السلام نے جیسے انسان کو رویت الٰہی کے لئے تیار کر دیا، ویسے ہی تہذیب جوارح کا فرض بھی ادا کیا، انسان کی پوری زندگی کی تہذیب اور اصلاح نبوت کا اولین مقصد ہے۔

اس تبیُّن کے بعد ابن خلدون کا یہ نظریہ خود بخود باطل ہو جائیگا کہ "انسان کو ضرورت نبوت فقط امور آخرت معلوم کرنے کے لئے ہے، دنیاوی معیشت کا نظام محتاج نبوت نہیں" وہ اس پر یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ غیر مسلم قوموں میں دنیاوی ترقی موجود ہے، یعنی اور ان میں نبوت کی روشنی نہیں اسطرح ابن خلدون نے عربی ذہنیت پر بہت برا اثر ڈالا ہے، عرب اس سے بڑھکر کوئی حکیم اپنے یہاں نہیں دیکھتے، اور وہ انھیں دنیاوی ترقی میں انبیاء کی ضرورت سے مستغنی کر دیتا ہے جس سے وہ بآسانی حکماء یورپ کے پروپیگنڈا کے شکار ہو جاتے ہیں شاہ صاحب

(بسلسلہ لہ صفحہ گزشتہ) خود مولانا کے نزدیک نہایت اہم ہے اسلئے ضرورت تھی کہ اسکو تفصیل اور وضاحت سے پیش کیا جاتا ہمنے اپنی حد تک غور بھی کیا لیکن پوری طرح سمجھ میں نہ آسکا کہ مولانا ان سطور کے ذریعہ کونسا "فکر" مسلمانوں میں پیدا کرنا چاہتے ہیں اگر مقصد صرف یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان "اپنے ان ہندوستانی ائمہ دین" مثلاً حضرت مجدد الف ثانی حضرت شاہ ولی اللہ وغیرہ ہما من المتقدمین والمتاخرین قدس اللہ اسرارہم، کے بلند مقام پہچانیں اور انکے دینی و ملی کارناموں کو جانیں (جنکی نظیریں دوسرے اسلامی ممالک نے بھی اس دور میں کم پیدا کیں یا نہیں پیدا کیں) اور اسطرح ہندوستانیت کی حقارت کا وہ غلط فکر زائل ہو جو "ہندوستان اور اسلام" کے گہرے تاریخی تعلقات اور ہندوستانی ائمہ دین کی خاص خدمات کا علم نہونے ہی کی وجہ سے خود ہندوستانی مسلمانوں میں پیدا ہو گیا ہے اور جسکا خمیازہ قومی اور سیاسی مصائب و نقصانات کی شکل میں بھی ہمکو بھگتنا پڑا ہے اور پڑ رہا ہے تو ہمکو مولانا کی اس کوشش سے پورا اتفاق ہے، فی الحقیقت ایک ہندوستانی مسلمان کے لئے اس حیثیت سے احساس کمتری کا کوئی موقع ہی نہیں ہے وہ اپنے پاس ہندوستانی ائمہ دین اور انکے اعلیٰ دینی کارناموں کی ایک روشن اور قابل فخر تاریخ رکھتا ہے اور اسطرح مسلمان ہونیکے ساتھ وہ ہندوستانی ہونے پر بھی فخر کر سکتا ہے ——— لیکن اگر ان سطور سے مولانا کا منشا ہندوستانی مسلمانوں کو اس نیشنلزم کے اختیار کرنیکا مشورہ دینا ہے جو یورپ کی پیداوار ہے اور ترکی و ایران جسکو اختیار کر چکے ہیں تو پھر ہمکو اس رائے سے شدید اختلاف ہے یہ "نیشنلزم" ہمارے نزدیک مقاصد اسلام کے تو خلاف ہے ہی لیکن اب تو عالم انسانیت کے لئے بھی اسکا لعنت ہونا آشکارا ہو چکا ہے اسی "بدعت" نے اسوقت یورپ کو آگ اور خون کے جہنم میں جھونک رکھا ہے ——— پھر خصوصاً حضرت امام ولی اللہ قدس سرہ کا جو رجحان بلکہ متعین نظریہ اس باب میں ہے وہ آپ کی اس وصیت سے سمجھا جا سکتا ہے

"ما مردم غریبیم کہ در دیار ہندوستان آباء ما بغربت افتادہ اند وعربیت نسب وعربیت لسان ہر دو فخر ماست کہ ما را بسید اولین و آخرین وافضل انبیاء و مرسلین وفخر موجودات علیہ وعلی آلہ الصلوات والتسلیمات نزدیک میگرداند شکر ایں نعمت عظمیٰ آنست کہ بقدر امکان عادات و رسوم عرب اول کہ منشاء آنحضرت است صلی اللہ علیہ وسلم از دست ندہیم و رسوم عجم و عادات ہنود را درمیان خود نہ گذاریم"

(المقالۃ الوضیۃ فی النصیحۃ والوصیۃ صفحہ ۳ قلمی نقل نسخہ مطبوعہ مطبع مطبع الرحمٰن شاہجہاں آباد در ۱۲۶۸ھ) م لہ

لہ اس مقالہ کی کتابت مکمل ہو جانے کے بعد سلسلہ طباعت جب دہلی جانا ہوا اور حضرت مولانا سندھی سے متفرق صحبتوں میں استفادہ کا موقع ملا تو معلوم ہوا کہ آپ کا منشا اس "یعنی نیشنلزم" کی دعوت نہیں ہے بلکہ آپ کا مقصد اس سے بہت ارفع ہے جس کی تفصیل انشاء اللہ کبھی آئندہ خود مولانا ہی فرمائینگے ۱۲ نعمانی

کی حکمت پڑھنے والا اس مصیبت سے ہمیشہ محفوظ رہیگا۔

فصل (۷) روحانیت اور اخلاق انسانی کا تعلق اقتصادیات سے شاہ صاحب کی نظر میں

شاہ صاحب نے لطیفہ جوارح کو اساس قرار دے کر ہمیں ایک دوسری مشکل سے بھی نجات دلائی ہے عام طور پر تصوف اور فلسفہ، اخلاق سے شروع کیا جاتا ہے، اقتصادی ضروریات حیوانی زندگی کے لئے بیشک ضروری مانی جاتی ہیں، لیکن ان کو انسانیت سے سیدھا تعلق نہیں تسلیم کیا جاتا اس نے ہماری سیاست کو کھو کھلا کر دیا ہے ہمارے بڑے بڑے عقلمند اور زیادہ با اخلاق سب اجتماعی سیاست سے دور رہنا اپنا کمال سمجھتے ہیں۔

مگر شاہصاحب اس اصول کو حجۃ اللہ میں متعدد مواقع پر نہایت وضاحت سے سمجھاتے ہیں چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں ــــ "انسانیت کے اجتماعی اخلاق اسوقت بالکل برباد ہو جاتے ہیں جب کسی جبر سے ان کو اقتصادی تنگی پر مجبور کر دیا جائے اسوقت وہ گدھے اور بیل کیطرح صرف روٹی کے لئے کام کرینگے جب انسانیت پر ایسی مصیبت آئیگی تو خدا انسانیت کو اس سے نجات دلانے کا کوئی راستہ ضرور الہام کریگا۔ فرعون کی ہلاکت قیصر اور کسریٰ کی تباہی اسی اصول پر لوازم نبوت میں شمار ہوتی ہے، اسطرح پورا فلسفہ نہایت اعلیٰ طریق پر مرتب ہو جائیگا۔ انسانی اجتماعی زندگی کے لئے اقتصادی نظام ایسا ہونا ضروری ہے جو انکی ضروریات کو پورا کر دے اور اس کے بعد انکے پاس کچھ وقت بچ جائے تاکہ وہ اپنے لطائف کی تکمیل پر غور کر سکیں۔

مذکورہ بالا الہام کبھی تو انبیاء کے ذریعے سے صورت پذیر ہوتا ہے اور کبھی صدیق اور حکیم کے واسطے سے، اقتصادی نظام کی درستی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسانی اجتماعیت کے اخلاق مکمل ہونگے اور ان اخلاق کی تکمیل ہی قبر اور حشر کی مصیبتوں سے نجات دلائیگی، پھر ان اخلاق کی تکمیل دوسرے درجہ پر جنت کی نعمتوں سے مستفید کریگی، اور تیسرے درجے پر جا کر اسکو رویت رب العلمین کیلئے تیار کر دیگی۔

اس فلسفے میں کہیں خطرہ نہیں آتا۔ اگر اسے نبوت کا مقصد قرار دیا جائے، اور جہاں نبوت نہو وہاں انبیاء کے اتباع صدیق اور حکیم انکا کام کریں تو نبوت انسانیت کے لئے ایک فطری چیز بنجائیگی اور یہی شاہ ولی اللہ کی فلاسفی کی روح ہے جسکا ہمیں یہاں تعارف کرانا چاہا ہے۔

شاہصاحب نے ایک موقع پر "تحدیث نعمت" کے طور پر شاہ محمد عاشق کو (جن کا نام علی ہی) خطاب کرتے ہوئے خوب فرمایا ہے ؎

علی! من مے شناسم ایں گہر ندداں حکمت را ؍ فلاطون آمد یہ یونانی کہ من دارم

"وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین، القد جاءت رسل ربنا بالحق"

حضرت شاہ ولی اللہ کا ایک خاص نظریہ !

علم الاخلاق اور علم المعیشت کا باہمی ربط و تعلق

(از مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی)

(مولانا ممدوح نے اس عنوان پر ایک مقالہ "انجمن ترقی ادب دہلی" کے دوسرے سالانہ اجلاس منعقدہ ۲۳ فروری ۴۲ء میں پڑھا تھا جو ندوۃ المصنفین دہلی کے ماہنامہ "برہان" کی مارچ کی اشاعت میں شائع بھی ہو چکا ہے۔ اب میری درخواست پر مولانا موصوف نے اسپر نظر ثانی بلکہ کافی ترمیم و اضافہ فرما کر "شاہ ولی اللہ نمبر" کے اس دوسرے اڈیشن کے لئے مرحمت فرمایا ہے جو شکریہ کے ساتھ یہاں درج کیا جاتا ہے۔ اور چونکہ اس مقالہ سے مولانا سندھی مدظلہ کے مندرجہ سابق مقالہ کی آخری سطور کی ایک گونہ شرح اور تفصیل ہو جاتی ہے اسلئے اسکے واسطے یہی جگہ مناسب سمجھی گئی)

(مدیر)

تمہید حضرات کرام! اس ادبی مجلس میں جس موضوع پر کچھ کہنے کا ارادہ ہے وہ اپنی حیثیت میں ایک اچھوتا موضوع ہے بلکہ بغیر کسی خود ستائی اور علمی غرور کے بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ علمی دنیا میں یہ پہلی کوشش ہے جو سپرد قلم کی گئی ہے لیکن ایسے بڑے دعوے کے ساتھ یہ بھی واضح رہے کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ اس سے بہت کم ہے جو اس سلسلہ میں کہا جانا چاہئے ۔ مختلف وجوہ و اسباب کے علاوہ اس اختصار کی بڑی وجہ میری عدیم الفرصتی ہے اور غالباً مجلس ترقی ادب" کا یہ "یک روزہ" اجلاس بھی طوالت کا متحمل نہ ہوتا ۔

اس مقالہ کا اصل موضوع "علم الاخلاق کے ساتھ علم المعیشت کا تعلق" ہے اگرچہ حکماء اسلام میں چونکہ صرف حکیم الامۃ شاہ ولی اللہ (نور اللہ مرقدہ) نے اس "تعلق" کو "علم الاخلاق" میں بہت اہمیت دی ہے اور حکمت ولی اللہی میں اسکا مقام بہت بلند ہے، اسلئے اگر ہم اسکی تعبیر ان الفاظ میں کریں کہ شاہ ولی اللہ رح کے فلسفہ کا خصوصی امتیاز کیا ہے، تو یہ صحیح اور برمحل ہوگا ۔

جدید و قدیم فلاسفہ اور حکماء نے فلسفہ و حکمت کی جو تعریفیں کی ہیں اُن کا خلاصہ اور نچوڑ اسطرح کیا جا سکتا ہے

" حکمت نام ہے قول و عمل میں درست کاری اور حق و راستی کی معرفت کا پس اگر معرفت اور درست کاری اشیاء

کے پوشیدہ اسرار اور اسباب و مسببات کے باہمی تعلق و ارتباط سے آگاہ کرتی ہے تو اسکو حکمت علمیہ کہتے ہیں۔"

اس پوری حقیقت کو قرآن عزیز نے اپنے معجزانہ انداز میں اسطرح بیان کیا ہے۔

من یؤت الحکمۃ فقد　　جس شخص کو حکمت سے حصہ دیا گیا ہے بلاشبہ اس کو زبردست
اوتی خیرا کثیرا (بقرہ)　　بھلائی دی گئی اور بہت بڑا کمال بخشا گیا۔

اور اگر مسطورہ بالا معرفت اور آگاہی رموز قدرت کے مطابق ہر شئے کو اسکے مناسب جگہ دے تو اس کو "حکمت عملی" کہا جاتا ہے ۔[۵]

حکمت کی عظمت حکمت اپنے اندر کیسے عظیم الشان کمالات رکھتی ہے اور حیات انسانی کے ارتقاء میں اسکا درجہ کس قدر بلند اور پرعظمت ہے؟ اسکا اندازہ جدید اور قدیم علمی کائنات کے اس ذخیرہ سے ہو سکتا ہے جو علمی نظریوں اور عملی سائنس کے ذریعہ ہماری مادی زندگی کی ترقی اور سربلندی کی بیش بہا خدمات انجام دیتا رہا، اور دے رہا ہے۔ نیز ہماری روحانی نشو ونما اور کمالات کے ارتقاء کا ضامن اور کفیل ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خالق علوم نے اپنی ذات کے ساتھ اس کمال کو متصف ظاہر کیا ہے۔

انک انت العلیم الحکیم ۔　　بلاشبہ تو ہی علم والا حکمت والا ہے (یعنی سرچشمہ علم و حکمت ہے)[۵]

حکمت اور علم الاسرار یہی حکمت جب "قوانین الٰہی" (شریعت حقہ) کے رازہائے سربستہ اور حقائق و رموز سے آگاہی میں استعمال کی جاتی ہے تو اسکا نام "علم الاسرار" ہو جاتا ہے، اس وقت اسکا منشاء یہ ہوتا ہے کہ وہ بتائے کہ دین و مذہب کے قوانین و اصول کس طرح عقل و فطرت (نیچر) سے مطابقت رکھتے اور کس طرح کائنات کے انفرادی و اجتماعی نظام کے لئے باعث فلاح و سعادت ہیں۔

دینی فلاسفہ و حکماء اسلام میں سراج انبیاء محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد فلسفہ و حکمت کے اس خاص شعبہ "علم الاسرار" کا معلم اول عمر بن الخطاب (فاروق اعظم رضی اللہ عنہ) ہے اور معلم ثانی علی بن ابی طالب (حیدر کرار رضی اللہ عنہ) کو سمجھا جاتا ہے، عورتوں میں یہ سعادت سب سے پہلے عائشہ صدیقہ (رضی اللہ عنہا) کے حصہ میں آئی۔

اس کے بعد اسلامی گہوارے میں بہت سی ماؤں نے ایسے بچوں کی پرورش کی جو غزالی، قشیری، رازی، ابن تیمیہ، ابن قیم اور احمد سرہندی بن کر اس فلسفہ و حکمت کے امام کہلائے۔

حکیم الامت امام ولی اللہ دہلوی لیکن بارھویں صدی ہجری کے شروع میں یوپی کے غیر معروف قصبہ پھلت، میں معلم اول حضرت عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہ) کی نسل سے ایک بچہ نے عالم وجود میں قدم رکھا، والدین کی جانب سے اگرچہ اسکو احمد سے موسوم کیا گیا لیکن اپنی فطری کمالات اور "علم اسرار و حکمت" کی امامت کبریٰ نے اس آفتاب حکمت کو دار السلطنت دہلی میں "ولی اللہ" کے لقب سے مشہور کیا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ فیلسوفِ اُمت "ولی اللہ دہلوی" نے حکمتِ ربانی اور فلسفۂ الٰہی کا جو "اسلوب" قائم کیا وہ اپنے تمام پیش روؤں سے زیادہ ممتاز اور اپنی حیثیت سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ یہی نہیں بلکہ تمام اسلامی و غیر اسلامی حکماء و فلاسفہ کے نظریۂ اخلاق میں وہ حقیقت مفقود نظر آتی ہے جو اس حکیم و فیلسوف کے یہاں بدرجہ کمال پائی جاتی ہے۔

حکیم الامۃ کا نظریۂ اخلاق

شاہ ولی اللہ بہت سی پُر عظمت کتابوں کے مصنف ہیں جو مختلف علوم و فنون کا نادر ذخیرہ ہیں، مگر اُن کی تصنیفی زندگی کا شاہکار "حجۃ اللہ البالغہ" ہے، یہ کتاب علوم عقلیہ و نقلیہ کا بیش بہا گوہر اور انمول موتی ہے "علم اسرار" و "حکمتِ ربانی" کے پیش نظر شاہ صاحب نے اس میں وہ سب کچھ سپردِ قلم کر دیا ہے جو انسانی سعادت کے انفرادی و اجتماعی دونوں پہلوؤں اور دنیوی و اخروی دونوں زندگیوں سے متعلق ہے۔

اس کتاب کا ایک حصہ "علم الاخلاق" سے متعلق ہے جس میں اخلاق کے علمی نظریوں اور عملی درست کاریوں کو بہترین طرزِ نگارش کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔

دوسری کتابوں میں جب آپ "علم الاخلاق" کے ان مباحث کا مطالعہ کریں گے جن میں "علم الاخلاق کا دوسرے علوم سے تعلق" پر بحث کی گئی ہے تو تمام علماءِ اخلاق اور حکماء و فلاسفہ کو اس پر متفق پائیں گے کہ وہ اس سلسلہ میں علم مابعد الطبیعۃ (میٹافزیکس) فلسفۂ طبیعی (فزیکس) علم الارتقار (ایویوشن) علم النفس (سائیکالوجی) علم المنطق (لاجک) جمالیات (استھیٹک) فلسفۂ قانون (فلاسفی آف لاء) علم الاجتماع (سوشیالوجی) اور فلسفۂ تاریخ (فلاسفی آف ہسٹری) کا تو ذکر کرتے ہیں لیکن کسی ایک جگہ بھی یہ اشارہ نہیں کرتے کہ "علم اخلاق" کا کوئی تعلق اجتماعی علم المعیشت سے بھی ہے یا نہیں، اور اگر ہے تو کس طرح کا ہے۔؟

ارسطو کی کتاب الاخلاق، فلسفۂ اخلاق میں ابن مسکویہ کی کتاب السعادۃ اور تہذیب الاخلاق، ماوردی کی ادب الدنیا والدین، غزالی کی احیاء العلوم، راغب کی الذریعہ، ابن قیم کی مدارج السالکین اور اسی قسم کی دوسری اخلاقی کتابوں میں کسی جگہ اسکا ذکر نہیں ملتا، مشہور حکماء و فلاسفہ اور علماءِ اخلاق کے تمام مباحث اخلاق کو غور و خوض سے مطالعہ کرنے کے باوجود اس سلسلہ میں ناکامی کے سوائے اور کچھ ہاتھ نہیں آتا، چنانچہ قدیم علماء و حکماء مثلاً ارسطو، فلاطون، سقراط، منکہ ہندی، رواقی، ابیقورین، کندی، فارابی، ابن سینا، غزالی، ابن باجہ، ابن طفیل، ابن رشد، ابن خلدون، ابن ہیثم، ابن عربی، ابن مسکویہ اور اخوان الصفاء، کے بیان کردہ "اخلاقی نظریے" جس طرح اس مسئلہ میں تہی دامن ہیں اسی طرح جدید علماء اخلاق "مثلاً کاونٹ، اسپنسر، شوپنہار، ڈیکارٹ فرنساوی، بنتھم اور جون اسٹورٹ مل، اسپنوزا، جرمن، ہیگل کے حکمت و فلسفہ کے تمام اخلاقی نظریے بھی اس سوال کے جواب میں واماندہ و بیچارہ نظر آتے ہیں۔

حالانکہ جرمن فلاسفر آگسٹ کمسٹ، اور کاونٹ، اور انگریزی فلاسفر ہربرٹ اسپنسر تو ان مشاہیر فلاسفہ میں

میں سے ہیں جنہوں نے "علم الاخلاق" کے ساتھ "علم الاجتماع اور علم الارتقاء" کو منطبق کرنے کے لئے بہت سے جدید اور وسیع نظریوں سے کام لیا ہے لیکن ان میں سے کسی ایک کی بھی پرواز خیال اُس رفعت و بلندی تک نہ پہنچ سکی جو "ولی اللہ دہلوی" کے حصہ میں آئی۔

متاخرین علماء اخلاق، عارف رومی، سعدی، اور شیخ سرہندی نے اخلاقیات پر بہت کچھ کہا، اور خوب کہا، مگر دنیا کے اجتماعی اخلاق کی برتری یا بربادی پر جو چیز سب سے زیادہ اثر انداز ہے اور ہوتی رہی ہے یعنی "اجتماعی اقتصادیات" اسکا نشان یہاں بھی نہیں ملتا۔

غرض "ولی اللہ دہلوی" کی مشہور کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" وہ پہلی کتاب ہے جس نے ہم کو اس بیش قیمت علمی نظریہ سے روشناس کرایا کہ اجتماعی علم اخلاق کی فلاح وسعادت اجتماعی معاشیات کے عادلانہ نظام پر موقوف ہے؛ اور یہ کہ دنیا کی قوموں کا اجتماعی اخلاق اس وقت تک صحیح اور بہتر نہیں ہو سکتا جب تک کہ ان کے درمیان ایک ایسا اجتماعی، اقتصادی نظام قائم نہ ہو جائے جو افراط و تفریط سے پاک عادلانہ اصول رکھتا ہو۔

امام الحکمۃ "ولی اللہ" کے علاوہ تمام علماء اخلاق "جدید ہوں کہ قدیم" یہ سمجھتے رہے ہیں کہ قوموں کے اجتماعی اخلاق کو "حسین" بنانے کے لئے عمدہ اخلاقی نظریوں کے غازہ کی ضرورت ہے اس لئے انہوں نے جدید علم الاخلاق کو علم الاجتماع پر منطبق کرنے کی زبردست کوشش کی ہے مگر ان تمام علماء سے جدا ولی اللہ دہلوی نے یہ دعویٰ کیا کہ "اجتماعی اخلاق" کا حُسن اس وقت تک نہیں نکھر سکتا جب تک کہ اقوام کے اجتماعی جسم کو فاسد معاشی نظام کے جذام سے صحت نہ ہو جائے، اگر یہ ہو جائے تو پھر اجتماعی اخلاقیات کا تازہ خون خود بخود جسم اقوام میں دوڑنے لگے گا اور اس کے حسن و زیبائش کے لئے کسی خارجی پوڈر اور غازہ کی ضرورت نہیں رہے گی۔

اجمال کی تفصیل اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ علماء اخلاق کے نزدیک یہ تسلیم شدہ مسئلہ ہے کہ علم اخلاق کا علم الاجتماع کیساتھ گہرا تعلق ہے، اور وہ اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں۔

"انسان کی زندگی اجتماعی زندگی کے بغیر نا ممکن ہے لہٰذا وہ ہمیشہ کسی نہ کسی جماعت کا فرد ہو کر ہی زندہ رہ سکتا ہے اور یہ ہماری قدرت سے باہر ہے کہ ہم کسی ایک فرد کے فضائل سے اسطرح بحث کریں کہ جس جماعت کی جانب وہ منسوب ہے اُس سے بالکل قطع نظر کریں اسلئے کہ اس کے بغیر ہم کیسے جان سکتے ہیں کہ جس جماعت سے اسکا تعلق ہے اس کے اندر وہ کون سے اوصاف ہیں جن سے فضائل و محاسنِ اخلاق میں ہدد ملتی یا رکاوٹ پیدا ہوتی ہے؟[1]

حقیقت حال یہ ہے کہ انسان نہ صرف کسی ایک بلکہ بہت سے روابط کے ساتھ ناگزیر طور پر مربوط ہے، اور اسطرح وہ اپنے کنبہ کا بھی عضو ہے، شہر و قریہ کا بھی، قوم کا بھی فرد ہے اور پھر تمام انسانی دنیا کا بھی"[2]

"ان حقائق کے پیش نظر انفرادی اخلاق کا تعلق علم الاجتماع کے ساتھ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے"[3]

[1] اخلاق و فلسفہ اخلاق ص ۱۱۔ [2] ایضاً ص ۲۲۵ [3] مختصر از اخلاق و فلسفہ اخلاق ص ۲۲۲ تا ص ۲۲۶

اور شاہ ولی اللہؒ نے خصوصیت کے ساتھ "مبحث ارتفاقات" کے عنوان سے اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

پس اس مسلمہ عقیدے نے "انفرادی اخلاق" کے مقابلہ میں "اجتماعی اخلاق" کی برتری پر مہر تصدیق ثبت کر دی، اور یہ واضح کر دیا کہ حیات انسانی میں اجتماعی اخلاق کی قیمت بہت زیادہ ہے کیونکہ اسکی افادیت بہت زیادہ ہے۔

لیکن علماء اخلاق میں یہ اختلافی مسئلہ ہے کہ "اجتماعی اخلاق" میں سے کس خلق کو شرف اور برتری حاصل ہے، کتب اخلاق میں اس بحث کو "فضیلت" کے باب میں بیان کیا جاتا ہے اور اس میں، سقراط، ارسطو، افلاطون، ابن مسکویہ، اور دورِ حاضر کے علماء اخلاق کے مباحث کو تفصیل سے نقل کیا گیا ہے۔ ان مباحث کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سقراط تو شئ کی صحیح معرفت کو سب سے بڑی فضیلت تسلیم کرتا ہے، ارسطو نظریۂ "اوساط" کا قائل ہے یعنی ہر دو رذائل کے درمیان ایک فضیلت پوشیدہ ہے۔ افلاطون کبھی اپنے استاد سقراط کی تقلید کرتا نظر آتا ہے اور کبھی خواہشاتِ نفس پر ضبط اور کنٹرول، کو سب سے بڑی فضیلت شمار کرتا ہے۔

ابن مسکویہ ارسطو کی تائید میں منہمک ہے اور دورِ حاضر کے علماء فضائل اجتماعیہ کو بغیر کسی برتری اور فضیلت کے مختلف اقسام میں تقسیم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، لیکن ولی اللہ دہلوی نے اصولِ اخلاق کو چار حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے "اجتماعی اخلاق" کے لئے صرف ایک ہی فضیلت کو "اصل" اور "معیار" قرار دیا ہے۔ اور وہ "عدل" ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

"عدالت ہی ایک ایسی اساس ہے کہ جب انسانی اطوارِ زندگی مثلاً نشست و برخاست، خواب و بیداری، رفتار و گفتار اور شکل و لباس وغیرہ میں اسکا لحاظ کیا جائے تو اسکو "ادب" کہتے ہیں اور جب مالی حیثیت یعنی جمع و خرچ سے متعلق امور میں اسکو پیش نظر رکھا جائے تو اسکا نام "کفایت" ہے اور اگر تدبیر منزل میں اسکا صحیح استعمال کیا جائے تو وہ آزادی (حسول لبرٹی) کہلاتی ہے اور اگر تدبیر مملکت میں اسکو بنیاد بنایا جائے تو اسکو "سیاست" کہا جاتا ہے اور اگر اسکو باہمی اخوت و محبت اور تعلقات میں اساس بنایا جائے تو اسی "عدل" کو حسن معاشرت کا نام دیا"

اجتماعی اخلاق میں "عدل" کی حیثیت کو جس طرح شاہ صاحب نے ظاہر فرمایا ہے "علماء اخلاق" کے لئے یہ ایک ایسا بہترین نظریہ ہے جو "فضیلت" سے متعلق قدیم و جدید تمام مباحث کے اختلاف کے لئے ایک "محاکمہ" اور فیصلہ کن مسئلہ کی طاقت رکھتا ہے اور اسی اجتماعی اخلاق میں "عدل" کی برتری کے ساتھ ساتھ وہ تمام مشکلیں بھی حل ہو جاتی ہیں جو "فضیلت" کی بحث میں علماء اخلاق کے سامنے رونما ہیں۔

عدل کا تعلق نظام انسانی سے | فیلسوفِ امت شاہ ولی اللہ "اجتماعی اخلاق" پر "عدل" کو یہ حیثیت کیوں دیتے ہیں؟ اس کا جواب خود انھوں نے "عدالت" کی تعریف کرتے ہوئے دیا ہے۔ حجۃ اللہ میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

"عدالت ایک ایسے ملکہ کا نام ہے جس کے ذریعہ سے تدبیر منزل، سیاست مملکت اور اسی قسم کے اجتماعی

معاملات کے لئے سہولت اور آسانی کے ساتھ ایک عادل اور پُر از خیر نظام قائم ہو جاتا ہے۔ درصل یہ ایک ایسی نفسانی کیفیت کا نام ہے جس کو ایسے لطیف افکار کلیہ اور سیاسیات عالیہ پھوٹ نکلتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اسکے عالم روحانیات کے نزدیک ٹھیک اور مناسب ہوں۔[1]

اور فیوض الحرمین میں خلق حسن "سمت صالح" کی بحث میں تحریر فرماتے ہیں۔

"اخلاقِ انسانی میں ایک خلق کا نام "سمتِ حسن" (نیک سرشت) ہے اسکی حقیقت یہ ہے کہ اسکے ذریعہ سے نفسِ ناطقہ اُن اعمال و اخلاق میں بیداری اور توجہ کامل حاصل کرلیتا ہے جو اس کے اور خدا کے درمیان اور اس کے اور خدا کی تمام مخلوق کے درمیان وابستہ ہیں اور ایسے "نظامِ صالح" کی جانب راہ پا جاتا ہے جو رضاءِ الٰہی کا منشا ہے۔

سو جب اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی بھلائی چاہتا ہے تو اسکو ان اعمال و اخلاق کی سمجھ عنایت کرتا، اور "عادلانہ نظام" کی جانب رہنمائی کرتا ہے[2]

معیشت کا نظام اور علم الاخلاق

اس طویل بحث کو اب اس طرح ترتیب دیجئے کہ "انسان اگر اخلاق کریمانہ سے متصف نہیں ہے تو پھر وہ حیوانوں اور چوپاؤں سے بھی بدتر ہے اور اس آیت کا مصداق ہے۔

لھم قلوبٌ لایفقھون بھا و لھم	ان کے دل ہیں پر سمجھتے نہیں، اُن کی آنکھیں ہیں
اعین لایبصرون بھا ولھم اذان لا	پر دیکھتے نہیں اُن کے کان ہیں پر اُن سے سنتے نہیں، یہ
یسمعون بھا اولٰئک کالانعام بل	چوپاؤں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ
ھم اضل اولٰئک ھم الغافلون (الاعراف)	ہیں یہی ہیں جو غفلت سے سرشار ہیں۔

اخلاق میں انفرادی اخلاق سے زیادہ اجتماعی اخلاق کا مرتبہ ہے، قرآن عزیز نے اگرچہ جدا جدا ہر ایک قسم کے اخلاقی اصول بیان کئے ہیں لیکن جس آیت کو جامع اخلاق کہا گیا اس میں اُن ہی اخلاق کریمانہ کا ذکر ہے جو اجتماعی اخلاق کہلاتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

ان اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربیٰ	بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے عدل کا احسان کا اور قرابت والوں کیساتھ حسن سلوک اور دادو دہش کا

پھر یہی آیت اسکے لئے بھی فیصلہٗ ناطق ہے کہ اجتماعی اخلاق میں بھی "عدل" کا درجہ بلند و بالا ہے اس لئے کہ "عدل" ہی سے احسان تک رسائی ہوتی ہے اور "عدل" ہی "ایتاء ذی القربیٰ" کی توفیق بخشتا ہے اسلئے آیت میں اس کو اولیت کا شرف بخشا گیا۔ .... پھر "عدل" ہی اس چیز کو منصہ شہود پر لاتا ہے جو اجتماعی اخلاق بلکہ اجتماعی حیات کا مدار ہے یعنی "نظام صالح" بلاشبہ ایک محور و مرکز ہے اور تمام اجتماعی مسائل اُسی کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں، صرف اسی کے وجود سے اجتماعیات کا وجود ہے اور اسی کے فساد و فنا میں اجتماعیات کا فساد و فنا مضمر ہے۔

الحاصل ان ہر سہ درجات و منازل کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عادل و صالح نظام کی صلاحیت اور اسکا فساد کسی شے کے ساتھ وابستہ ہے؟ یہ بظاہر ایک بہت معمولی سوال ہے لیکن اپنی حقیقت کے پیش نظر بہت اہم اور

[1] حجۃ اللہ ج ۲ ص ۱۱۰ [2] فیوض الحرمین ص ۵۸

اجتماعی حیات پر بہت زیادہ اثر انداز ہے ۔ ـــــ ارسطو کی کتاب الاخلاق اسکا جواب صرف یہ دیتی ہے کہ "صالح نظام" کا وجود "حصولِ سعادت" پر موقوف ہے جو اخلاقیات کے لئے "مثلِ اعلیٰ" ہے لیکن "سعادت" کس طرح ہم کو ایک مکمل اجتماعی صالح نظام تک پہنچاتی ہے اسکا جواب ارسطو کے پاس نفی میں ہے البتہ وہ "علم الاخلاق" سے الگ ہو کر اسکا جواب سیاسیات میں دینے کی سعی کرتا ہے اور اسطرح "نظامِ اجتماعی" کو اخلاق سے جُدا کر دیتا ہے ۔

سقراط اور افلاطون کے یہاں بھی یہی حال نظر آتا ہے اور اسی طرح اُن کے متبعین مسلمان فلاسفروں اور حکمار کا حال ہے ۔ ابن سینا ۔ فارابی، ابن مسکویہ، ابن رشد، اس سلسلہ میں یہ سب اسی اسکول کو مانتے چلے آتے ہیں جس کی طرح یونانی فلاسفروں نے ڈالی تھی ۔ ـــــ امام غزالی، ابن تیمیہ، ابن قیم ابن عربی اور رومی اگرچہ اخلاقیات میں ایک مستقل اسکول رکھتے ہیں اور ان کے لئے بہترین نوامیس قائم کرتے ہیں تاہم اس سوال کے جواب میں "عدل" تک پہنچکر وہ بھی خاموش ہو جاتے ہیں اور انکا فکر اس سے اوپر پرواز کرنے کو تیار نظر نہیں آتا ۔ ..... لیکن اس سوال کا جواب امام الحکمت "ولی اللہ دہلوی" کے پاس موجود ہے، اور بلا شبہ انہوں نے "صالح وعادل نظام" کی صلاحیت کو جس اصل اور ناموس پر قائم کیا ہے وہ ان ہی کا طغرائے امتیاز ہے چنانچہ فرماتے ہیں ـــ

"جب پارسیوں اور رومیوں کو حکومت کرتے صدیاں گزر گئیں اور دنیوی تعیش کو انہوں نے اپنی زندگی بنا لیا اور آخرت کو بھلا دیا اور شیطان نے اُن پر غلبہ کر لیا تو اب انکی تمام زندگی کا حاصل یہ بنگیا کہ وہ عیش پسندی کے اسباب میں منہمک ہو گئے اور اُن میں کا ہر شخص سرمایہ داری اور تمول پر فخر کرنے اور اترانے لگا، یہ دیکھ کر دنیا کے مختلف گوشوں سے وہاں ایسے ماہرین جمع ہو گئے جو سچا عیش پسندوں کیواد عیش دینے کے لئے عیش پسندی کے نئے نئے طریقے ایجاد کرنے اور سامانِ عیش مہیا کرنے کے لئے عجیب وغریب دقیقہ سنجیوں اور نکتہ آفرینیوں میں مصروف نظر آنے لگے اور قوم کے اکابر اس جد وجہد میں مشغول نظر آنے لگے کہ اسبابِ تعیش میں کس طرح وہ دوسرے پر فائق ہو سکتے اور ایک دوسرے پر فخر ومباہات کر سکتے ہیں، حتیٰ کہ ان کے امراء اور سرمایہ داروں کے لئے یہ سخت عیب اور عار سمجھا جانے لگا کہ انکی کمر کا پٹکا یا سر کا تاج ایک لاکھ درہم سے کم قیمت کا ہو یا اُن کے پاس عالیشان سر بفلک محل نہ ہوں جن میں پانی کے حوض، سرد وگرم حمام بے نظیر پائیں باغ ہوں اور بلا ضرورت محض نمائش کے لئے بیش قیمت سواریاں حشم وخدم اور حسین وجمیل باندیاں موجود نہ ہوں اور صبح وشام رقص وسرود کی محفلیں گرم ہوں اور جام وسبو سے شراب ارغوانی چھلک رہی ہو اور فضول عیاشی کے وہ سب سامان مہیا ہوں جو آج بھی تم عیش پسند بادشاہوں اور حکمرانوں میں دیکھتے ہو اور جنکا ذکر تقریر طولانی کے مرادف ہے، غرض یہ غلط اور گمراہ کن عیش اُن کے "معاشی نظام"* کی تباہی کا باعث بن رہا تھا ۔ ... نتیجہ یہ تھا کہ مملکت کی اکثریت پر یہ حالت طاری تھی کہ دلوں کا امن وسکون مٹ گیا تھا، ناامیدی کا بلی بڑھتی جاتی تھی اور بہت بڑی اکثریت رنج وغم اور آلام ومصائب میں گھر گئی

نظر آتی تھی اسلئے کہ ایسی مفرطانہ عیش پرستی کے لئے زیادہ سے زیادہ رقوم اور آمدنی درکار تھی اور وہ ہر شخص کو مہیا نہ تھی البتہ اسکے لئے پادشاہ، نواب، امراء اور حکام نے معاشی دست برد شروع کر دی اور اسکا طریقہ یہ اختیار کیا کہ کاشتکاروں تاجروں، پیشہ وروں اور اسی طرح دوسرے کاربرداروں پر طرح طرح کے ٹیکس عائد کر کے انکی کمر توڑ دی اور انکار کرنے پر انکو سخت سے سخت سزائیں دیں اور مجبور کر کے اُن کو ایسے گھوڑوں اور گدھوں کی طرح بنا دیا جو آبپاشی اور ہل چلانے کے کام میں لائے جاتے ہیں، اور پھر کارکنوں اور مزدور پیشہ لوگوں کو اس قابل بھی نہ چھوڑا کہ وہ اپنی حاجات و ضروریات کے مطابق بھی کچھ پیدا کر سکیں خلاصہ یہ کہ ظلم و بداخلاقی کی انتہا ہو گئی تھی۔ اس پریشاں حالی و افلاس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انکو اپنی اخروی سعادت و فلاح اور خدا سے رشتۂ و بندگی جوڑنے کے لئے بھی مہلت نہ ملتی تھی اور اس "فاسد معاشی نظام" کا ایک مکروہ پہلو یہ بھی تھا کہ جن صنعتوں پر نظام عالم کی بنیاد قائم ہے وہ اکثر یک قلم متروک ہو گئیں اور امراء و رؤسا کی مرضیات و خواہشات کی تکمیل ہی سب سے بڑی خدمت اور سب سے بہتر حرفہ شمار ہونے لگا۔ اور جمہور کی یہ حالت تھی کہ انکی تمام زندگی بداخلاقیوں کا نمونہ بن گئی تھی اور ان میں سے اکثر کا گذارہ بادشاہوں کے خزانوں سے کسی نہ کسی طرح وابستہ ہو گیا تھا مثلاً ایک طبقہ جہاد کئے بغیر باپ دادا کے نام پر مجاہدین کے نام سے وظیفہ خواری کر رہا ہے تو دوسرا مدبرین مملکت کے نام سے پل رہا ہے، کوئی بادشاہ و امراء کی خوشامد میں قصیدہ خوانی کر کے شاعری کے نام سے وظیفہ پا رہا ہے تو کوئی صوفی اور فقیر بن کر دعا گوئی کے زمرہ میں مالی استحصال کر رہا ہے۔ خلاصہ یہ کہ کسب معاش کے بہترین طریقوں کا فقدان تھا اور ایک بڑی جماعت چاپلوسی، مفاحبت، چرب زبانی اور دربارداری کے ذریعہ معاش حاصل کرنے پر مجبور ہو گئی تھی اور یہ ایک ایسا فن بن گیا تھا جس نے انکے افکار عالیہ اور ذہنی نشو و نما کی تمام خوبیاں مٹا کر پست و ارذل زندگی پر قانع کر دیا تھا۔ ...... پس جب یہ فاسد مادہ وبا کیطرح پھیل گیا اور لوگوں کے دلوں تک سرایت کر گیا تو اُن کے نفوس ذلت و حسنت سے بھر گئے اور اُن کی طبائع، اخلاق صالحہ سے نفرت کرنے لگیں اور ان کے تمام اخلاق کریمانہ کو گھن لگ گیا، اور یہ سب اس "فاسد معاشی نظام" کی بدولت پیش آیا جو عجم و روم کی حکومتوں میں کارفرما تھا۔ آخر جب اس مصیبت نے ایک بھیانک شکل اختیار کر لی اور مرض ناقابل علاج حد تک پہنچ گیا تو خدائے تعالیٰ کا غضب بھڑک اٹھا اور اُس کی غیرت نے تقاضہ کیا کہ اس مہلک مرض کا ایسا علاج کیا جائے کہ فاسد مادہ جڑ سے اکھڑ جائے اور اُس کا قلع قمع ہو جائے۔ اُس نے ایک "نبی اُمّی" (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مبعوث کیا اور اپنا پیغامبر بنا کر بھیجا، وہ آیا اور اس نے روم و فارس کی ان تمام رسوم کو فنا کر دیا اور عجم و روم کے رسم و رواج کے خلاف صحیح اصولوں پر ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالی۔۔۔ اس نظام میں فارس و روم کے فاسد نظام کی قباحت کو اس طرح ظاہر کیا کہ معاشی زندگی کے ان تمام اسباب کو یک قلم حرام قرار دیا جو عوام اور جمہور پر معاشی دستبرد کا سبب بنتے اور مختلف عیش پسندیوں کی راہیں کھول کر حیات دنیوی میں بیجا انہماک کا باعث ہوتے ہیں مثلاً مردوں کے لئے سونے چاندی کے زیورات اور حریر و دیبا کے نازک کپڑوں کا استعمال، اور تمام انسانی نفوس کے لئے

خواہ مرد ہو یا عورت ہر قسم کے چاندی اور سونے کے برتنوں کا استعمال اور عالیشان کوشکوں اور رفیع الشان محلات و قصور کی تعمیر اور مکانوں میں فضول زیبائش و نمائش وغیرہ کہ یہی فاسد نظام کے ابتدائی منازل اور معاشی نظام کی تباہی کا منشاء و مولد ہیں۔

بہرحال خدائے تعالیٰ نے اس ہستی کو اخلاقِ کریمانہ اور نیک نہادی کا معیار اور ان پاک امور کیلئے میزان بنادیا"
اسی طرح شاہ صاحب "ارتفاقات" پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

"یہ واضح رہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا منشاء اگرچہ بالذات عبادات الٰہی سے متعلق ہے مگر عبادات کے ساتھ ساتھ اس منشاء میں رسوم فاسد کو فنا کر کے اجتماعی زندگی میں بہترین نظام کا قیام بھی شامل ہے۔ اسی لئے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:۔

بعثت لاتمم مکارم الاخلاق — میں اس لئے مبعوث کیا گیا ہوں کہ مکارم اخلاق کی تکمیل کروں۔

اور اسی لئے اس مقدس ہستی کی تعلیم میں "رہبانیت" کو اخلاقی حیثیت نہیں دی گئی بلکہ انسانوں کے باہم اختلاط و اجتماع کی زندگی کو ترجیح دی گئی ہے۔ لیکن اس اجتماعیت کا امتیاز یہ قرار دیا ہے کہ اس کے معاشی نظام میں نہ دولت و ثروت کو وہ حیثیت حاصل ہو جو عجمی بادشاہوں کے یہاں حاصل تھی اور نہ ایسی کیفیت ہو کہ تمدن سے بیزار دہقان اور وحشی لوگوں کی طرح ان کی معیشت ہو۔ پس اس مقام پر دو متعارض قیاس کام کر رہے ہیں ایک یہ کہ نظام معیشت میں دولت و ثروت ایک محبوب و محمود شے ہے اس لئے کہ اگر وہ صحیح اصول پر قائم ہو تو اس کی بدولت انسانوں کا دماغی توازن اعتدال پر رہتا، اور اس سے ان کے اخلاقِ کریمانہ صحیح اور درست رہتے ہیں۔ نیز انسان اس قابل بنتا ہے کہ دوسرے حیوانات سے ممتاز ہو۔ اس لئے کہ بیکسانہ اور مجبورانہ فلاکت سوء تدبیر اور مزاج کے اختلال کا باعث ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ نظام معیشت میں دولت و ثروت ایک بدترین چیز ہے جبکہ وہ باہمی مناقشات اور بغض و حسد کا سبب بنتی اور خود اہل دولت و ثروت کے اطمینانِ قلب کو تعب اور حریصانہ کدو کاوش کے زہر سے مسموم کرتی ہو اور قوموں کو استحصال بالجبر اور دوسروں پر معاشی دستبرد کے لئے آمادہ کرتی ہو۔ کیونکہ اس صورت میں یہ بداخلاقی کے مرض میں مبتلا کر دیتی، آخرت اور یاد الٰہی یعنی روحانی زندگی سے یکسر غافل و بے پروا بنا دیتی اور مظلوموں پر نت نئے مظالم کا دروازہ کھولتی ہے۔ لہٰذا بہترین راہ یہ ہے کہ دولت و ثروت "نظام معیشت" میں ایسا درجہ رکھتی ہو جو توسط اور اعتدال پر قائم اور افراط و تفریط سے پاک ہو۔ اور یہ صحیح معاشی نظام کے بغیر ناممکن ہے"[1]

[1] مختصر از حجۃ اللہ ص ۱۰۲ ج ۱

ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:-
اور یہ واضح رہے کہ اگر کسی شہر میں مثلاً دس ہزار انسان آباد ہوں تو "سیاست مدنیہ" کے پیش نظر از بس ضروری ہے
کہ اُن کی صنعت و حرفت اور کسب و تجارت پر بحث کی جائے اور اُن کے معاشی مسائل کو زیر بحث لایا جائے۔
سو اگر اہل بلدہ صرف شہری سیاست ہی کے دلدادہ ہیں اور اُن میں صنعت و حرفت کا تو شوق ہے مگر وہ زراعت
اور مویشیوں کی نگہداشت اور ترقی کی جانب سے بالکل بے پرواہ ہیں تو اُن کی دنیوی ترقی خسارہ میں ہے۔
اور اگر عیش پسندی میں غرق ہیں، نئی نئی قسم کی شرابوں کی ایجاد اور بت گری کے ذریعہ عیاشی اور بت پرستی کی عبادت
کے سامان مہیا کرتے ہیں، اور مجسموں اور اسٹیچو بنا بنا کر بالواسطہ بت پرستی کے مشاغل کو تقویت پہنچاتے ہیں تو یہ اُن کی
دینی ہلاکت و تباہی کا پیش خیمہ ہے۔
اس کے برعکس اگر اہل بلدہ صنعت و حرفت، تجارت، زراعت، شہری سیاست اور اس قسم کے معاشی
و سیاسی امور میں ایسے طریق کار پر گامزن ہیں جو "حکمت" کے اصول پر مبنی ہے اور مناسب پیشوں کی ترویج کا باعث
ہے نیز غیر مناسب اعمال اور شرعی و اخلاقی نقطۂ نظر سے قبیح اور بد نتائج کا موجب نہیں ہے تو اہل بلدہ کی دنیوی
زندگی بہت خوب اور صحیح و درست ہے۔
اس سلسلہ میں یہ بھی پیش نظر رہے کہ اگر کسی شہر یا ملک کے ذمہ دار اور سربرآوردہ ارکان معتدل معاشی نظام
سے الگ ہو کر زیورات کی زیب و زینت، لباس کی نزاکت، عمارات کی بلندی و رفعت، کھانے، پینے کی اشیاء
میں مفرطانہ تعیش اور عورتوں کے حسن کو دوبالا کرنے کیلئے خارجی زیبائش کی جانب راغب ہو جائیں اور ضروری حاجات
اور مناسب ضروریات کی جگہ مصنوعی تعیش کو اختیار کرلیں جس طرح کہ آج کل عرب و عجم اس میں مبتلا نظر آتے ہیں تو
پھر اکثر افراد ملک کا رجحان امور طبیعیہ میں تصرف کے ذریعہ بناوٹی چمک دمک پیدا کرنے کی جانب ہو جائیگا تاکہ وہ
ملک کے سربرآوردہ افراد کی خواہشات کی تکمیل کرسکیں اور یہی معاش زندگی کا مدار ہو جائے۔
چنانچہ ایک جماعت اگر کنیزوں کو اور اس زمانہ میں خود اپنی لڑکیوں کو رقص و غنا کی تعلیم میں مشغول نظر آتی
ہے تو ایک دوسری جماعت لباس میں قسم قسم کے نقش و نگار اور حیوانات و اشجار کی تصاویر کی تزئین کرتی دیکھی جاتی ہے
اور ایک تیسری جماعت سونے چاندی اور جواہرات کے زیورات میں بے نظیر کاریگری اور طرح طرح کی
اختراعات اور خارجی زیبائش حسن کے نازدں اور قسم قسم کی صنعتوں میں منہمک رہتی ہے۔
اور ایک چوتھی جماعت عمارتوں کی زیب و زینت، اُن کے مسرفانہ نقش و نگار، مینا کاری اور پچی کاری
رفیع الشان محلات و قصور کے نت نئے ڈیزائنوں کی فکر میں مصروف پائی جاتی ہے۔
پس جب کسی ملک یا قوم کا ایک بہت بڑا گروہ اسی قسم کی مسرفانہ عیش پسندانہ صنعتوں میں منہمک ہو جاتا ہے
تو پھر وہاں زراعت، تجارت، مفید صنعت و حرفت پر بہت بڑا اثر پڑتا اور جب قوم کے سرمایہ دار اور ذمہ دار ارکان
اپنی پونجی کو ان غیر ضروری اور فضول صنعتوں پر بے دریغ صرف کرنے لگتے اور اپنے رجحان طبع کو اس طرح ضائع کرکے

داد وتحسین دینے لگتے ہیں تو وہ اپنے ملکی اور شہری مصالح کو برباد کرتے اور صحیح نظام معاشی کو فاسد بناتے ہیں اور اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو ضروری حرفے اور پیشے ہیں یعنی زراعت، تجارت اور مفید صنعت و حرفت، اُن کے لئے ماحول تنگ ہو جاتا ہے اور ان کے لئے راہیں مسدود ہو جاتی ہیں بلکہ ان پر محاصل اور ٹیکس کا اسقدر بار بڑھ جاتا ہے کہ کسی طرح وہ فروغ نہیں پا سکتیں اور یہ مضرت آہستہ آہستہ "خارش کی وبا" کی طرح تمام افراد میں سرایت کر جاتی ہے اور معاشی نظام اور مدنی مصالح کو گھن لگ کر دنیوی زندگی کی تباہی کا باعث بن جاتی ہے۔ اور روحانی کمال اور اخروی زندگی پر اس قدر برا اور مہلک اثر پڑتا ہے کہ ناقابل بیان ہے۔

یہی مہلک جراثیم تھے جو عجم و عرب کے جسم تمدن و معیشت میں پیدا ہو کر اس کی دنیوی اور اخروی صحت و فلاح کو برباد اور اُن کی اخلاقی حیات کو تباہ کر رہے تھے کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں یہ الہام کیا کہ وہ اس مہلک مرض کا علاج کریں اور عجم و عرب کو تباہی اور ہلاکت سے نجات دیں۔ اور علاج کا یہ طریقہ اختیار کیا جائے کہ مرض کی صرف اصلاح کافی نہ سمجھا جائے بلکہ اُس فاسد مادہ کا ہی قلع قمع کر دیا جائے اور اُس کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکا جائے جو ان مہلک اثرات کا باعث ہے۔

پس ذات قدسی صفات نے اسی مصلحت کے پیش نظر اس قسم کے تمام معاشی اور تمدنی نظام کو ممنوع قرار دیدیا جو اس مرض کے پیدا ہونے کا سبب تھے۔ مثلاً رقص و سرود کی تعلیم، مردوں کے لئے حریر و دیباج اور اسی قسم کے ریشمین نازک لباس، سونے چاندی کی ایسی تجارت جو سود و ربا کا موجب بنتی ہو اور سود و قمار وغیرہ۔[51]

شاہ ولی اللہ کے اس نظریہ کی صداقت کے لئے پرانی تاریخوں کی ورق گردانی کی ضرورت نہیں، موجودہ یورپین حکمرانوں کی تاریخ ہی اس کیلئے زندہ شہادت ہے۔

کیا آپ اس بات سے انکار کر سکتے ہیں کہ جہاں تک انفرادی اخلاق کا تعلق ہے بعض یورپین اقوام اخلاقی مسائل میں بلند اخلاق اور مضبوط کیرکٹر کی حامل نظر آتی ہیں لیکن جب اُن کی اجتماعی اخلاقی زندگی پر نظر ڈالئے تو عذر، فریب، بدعہدی، معاشی دستبرد، آتصال بالجبر اور اسی قسم کی بداخلاقیوں کا سرتاسر مرقع نظر آتی ہیں، وہ معاہدات کرتی ہیں مگر بدعہدی کے لئے، مظالم توڑتی ہیں مگر آئین اور قانون کا نام دے کر، فریب کاریاں کرتی ہیں مگر تدبر اور سیاست کہہ کر اور معاشی دستبرد روا رکھتی ہیں مگر تجارت اور تمدن آموزی کا پردہ رکھ کر حتیٰ کہ انفرادی بداخلاقیوں میں سے بھی بدکاری، شراب خواری اور عیاشی اُن کا مایۂ خمیر بن چکی ہے۔

لیکن یہ سب کیوں ہے؟ صرف اس لئے کہ اُن کے معاشی نظام کی بنیادیں جمہور کی حاجتوں کے پورا کرنے کے اصول پر استوار نہیں کی گئیں بلکہ اُس سرمایہ دارانہ اصول پر قائم ہیں جس کو شاہ ولی اللہ کے نظریہ میں فاسد اور مذموم معاشی نظام سے تعبیر کیا گیا ہے۔

پس جس حکمران قوم کا معاشی نظام رفاہیت کی افراد کا داعی اور معاشی دستبرد کا حامل ہے اُس قوم میں کبھی اجتماعی محاسنِ اخلاق پیدا نہیں ہو سکتے اور وہ قوم ہمیشہ اجتماعی بداخلاقیوں کا معدن ہوگی، کمزور اقوام کے لئے فتنہ بنے گی اور تکبر، ظلم، حق تلفی، دوسروں کی تحقیر و تذلیل اور خود غرضی و خوشامد پسندی جیسے مکروہ اخلاق اس کی فطرت ثانیہ بن جائیں گے۔

اور اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جو قوم، غلامی یا دوسرے اسباب کی بدولت ایسے معاشی نظام کے ہاتھوں موجودہ مفید

[51] حجۃ اللہ البالغہ جلد دوم ص۱۰۲، ۱۰۲

اور عادلانہ رفاہیت سے خالی اور محروم ہے تو وہ دوسری قسم کی اجتماعی بد اخلاقیوں کا گہوارہ بن جائیگی اور اس میں فلسفہ نفس قنوطیت یعنی ناامیدی اور یاس، عجز، بزدلی، افلاس اور گداگری جیسی بداخلاقیاں نمودار ہو جائیں گی۔

پس شاہ صاحب کے زیر بحث نظریۂ اخلاق کے پیش نظر اجتماعی اخلاق اور عادلانہ معاشی انتظام میں ایسا تلازم ہے جو کسی طرح ایک دوسرے کو جدا ہونے نہیں دیتا۔ اور شاہ صاحب کی نظر میں اجتماعی اخلاق میں حسن و کمال جب ہی پیدا ہو سکتا ہے کہ حکومت کا معاشی نظام ایسے اعتدال پر ہو کہ جس میں بیباکانہ عیش پسندی کا دخل ہو نہ افلاس اور فقر و فاقہ کا اور نہ وہ معاشی دستبرد اور آئینی استحصال بالجبر پر قائم ہو اور نہ معیشت کے ترقی پذیر ذرائع سے خالی اور محروم ہو۔

حضرت شاہ صاحب فیوض الحرمین میں ایک مکاشفہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

میں نے رویائے صادقہ میں دیکھا کہ مجھ کو اللہ تعالیٰ نے نظام خیر کی تکمیل کیلئے اپنی منشاء و مراد کا آلۂ کار بنا دیا ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ تمام مسلم ممالک پر کفار نے غلبہ کر کے انکو تہ وبالا کر ڈالا ہے اور یہ دیکھ کر مجھ پر ایک غضب کی سی حالت طاری ہے اور میرے اردگرد رومی، فارسی، ازبک اور عجم و عرب کے مسلمانوں کا جم غفیر جمع ہے کوئی گھوڑے پر سوار ہے تو کوئی اونٹ پر اور کوئی پیادہ اور سب ہی میری طرح کفار کے اس غلبہ پر غضبناک نظر آتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ عرفات کے میدان میں بقصد حج جمع ہیں۔ آخر وہ میری جانب مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

ما حکم اللہ فی ھذا الساعۃ (اس حالت کے پہنچ جانے کے بعد اب خدا کا فیصلہ کیا ہے؟) میں نے جواب دیا۔

فک کل نظام موجودہ تمام نظامہائے عالم کو درہم برہم کر دینا[1]

امام الحکمت ولی اللہ کا اس سے یہ مطلب ہے کہ چونکہ اب عالم میں اسلام کا وہ بنیادی نظام باقی نہیں رہا جس کا جزو اعظم مرسیع معاشی نظام ہے اور جو جمہور کے امن و اطمینان کا کفیل ہے تو اب تعمیر سے پہلے تخریب ضروری ہے اور اس کے بعد ہی اس عادلانہ نظام کے قیام کی توقع کی جا سکتی ہے۔

امام ابو یوسفؒ نے علم الاسرار کے معلم اول اور شاہ صاحب کے جد امجد حضرت عمر بن الخطابؓ کا ایک مقولہ کتاب الخراج میں نقل کیا ہے جو امام الحکمۃ کے نظریہ کی تائید کرتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے ایک ذمی یہودی کو بھیک مانگتے دیکھ کر فرمایا:۔

" وہ حکمران خدا کے سامنے سخت مواخذہ میں گرفتار ہو گا جسکی قلمرو میں ایک بھکاری بھی بھیک مانگنے پر مجبور ہو؟

الحاصل امام الحکمۃ شاہ ولی اللہ دہلوی وہ پہلا فلسفی اور علم الاخلاق کا پہلا حکیم ہے جس نے دنیا کے سامنے یہ پیش بہا نظریہ پیش کیا کہ کسی قوم کا اجتماعی اخلاق تک پہنچنا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک اس کے نظام حکومت میں ایسا عادلانہ معاشی نظام قائم نہ ہو اور افراط و تفریط سے الگ عوام و خواص دونوں کے لئے یکساں فلاح و خیر اور امن و عافیت کا ضامن ہو۔ اور بلاشبہ ولی اللہی حکمت و فلسفہ کا یہ خصوصی امتیاز ہے کہ وہ اخلاقیات کو معاشیات کے ساتھ مربوط کرتی اور ان دونوں کے درمیان لازم و ملزوم کا رشتہ ثابت کرتی ہے۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین و العاقبۃ للمتقین۔

[1] فیوض الحرمین، ص ۸۹

ہندوستان میں اسلامی حکومت کے زوال کا سبب

شاہ صاحب کی نظر میں

(از حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہٗ)

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہر پہلو پر جس تفصیل سے لکھنے کو جی چاہتا ہے اُسکی فرصت نہیں، اور اس فرصت میں جو لکھا جا سکتا ہے وہ پسند نہیں، اس لئے میں نے اس نمبر میں لکھنے سے معذرت چاہی تھی، مگر ارشاد ہوا کہ شاہ صاحب کے متعلق جتنا بھی اور جس قدر مختصر سے مختصر بھی لکھا جا سکے وہ فائدہ کے لحاظ سے مختصر نہیں، اسی حوصلہ افزائی کے سبب یہ چند سطریں لکھنے کی ہمت کر رہا ہوں،

ایسے کم مصنف گزرے ہیں جن کی تصانیف میں اُن کے زمانہ کی روح نہ ہو، یا اُس میں زمان و مکان کی جھلک نہ ہو، اور کم از کم یہ کہ اپنے زمانہ کی علمی ناقدر شناسی اور اضطراب احوال کا ذکر نہ ہو، مگر شاہ صاحب کی تصانیف کا یہ حال ہے کہ وہ زمان و مکان کی قید سے بالکل پاک اور گلہ و شکایت اور حرف حکایت سے سرا پا بے نیاز ہیں، یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ کتابیں اُس زمانہ میں لکھی گئی ہیں جب امن و اطمینان اِس ملک سے حرف غلط کی طرح مٹ گیا تھا، سارا ملک طوائف الملوکی، خانہ جنگی، سیاسی بدامنی اور ہر طرح کے شور و شر میں مبتلا تھا، دلّی کی سیاسی مرکزیت مٹ چکی تھی، شمشیر زن اپنی بادشاہی کا خواب دیکھ رہا تھا، سکھ ایک طرف، مرہٹے دوسری طرف، جاٹ تیسری طرف، اور روہیلے چوتھی طرف ملک میں ہر طرف اودھم مچا رہے تھے، اور نادر شاہ اور احمد شاہ جیسے پرجوش سپہ سالار خیبر کے دروازے کے پاس کھڑے جب چاہتے تھے آندھی کی طرح آجاتے اور سیلاب کی طرح نکل جاتے تھے اور اس درمیان میں دلّی خدا جانے کتنی دفعہ لُٹی اور کتنی دفعہ بنی مگر اللہ رے دِلّی کے تاجدارِ علم کا امن و اطمینان کہ یہ سب کچھ آنکھوں کے سامنے ہوتا رہا، مگر نہ دل کو اضطراب، نہ خیال میں انتشار، نہ قلم میں اضطرار، نہ زبان پر زمانہ کا گلہ، نہ قلم سے بے اطمینانی کا اظہار، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلندی کے جس آسمان یا صبر و رضا کے جس لامکان میں تھے وہاں تک زمین کی آندھیاں نہیں پہنچیں اور زمان و مکان کی گردشیں وہاں اپنا کام نہیں کرتیں، اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ سچے اہلِ علم کی شان کتنی بلند، اور اصحاب تسلیم و رضا کا منصب کتنا اونچا ہے۔

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۔ (قرآن)　　ہاں! اللہ کی یاد سے دِل اطمینان پاتے ہیں۔

صحیح علم کی صحیح خدمت بھی ذکر اللہ کی دوسری شکل ہے، اسلئے اگر وہ بھی قلب میں اطمینان اور روح میں سکون پیدا کرے تو عجیب نہیں

شاہ صاحب کی تصنیفات کے ہزاروں صفحے پڑھ جائیے آپ کو یہ معلوم بھی نہ ہوگا کہ یہ بارھویں صدی ہجری کے پُرآشوب زمانہ کی پیداوار ہے، جب ہر چیز بے اطمینانی اور بدامنی کی نذر تھی صرف یہ معلوم ہوگا کہ علم وفضل کا ایک دریا ہے جو کسی شور وغل کے بغیر سکون وآرام کے ساتھ بہہ رہا ہے جو زمان ومکان کے خس وخاشاک کی گندگی سے پاک وصاف ہے۔

لیکن پھر بھی وہ اسی زمانہ میں تھے جب ہندوستان کی اسلامی سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا، ہر طرف بے ترتیبی اور بدنظمی پھیلی ہوئی تھی، ہر طرف بے قیدی اور بے حکمی آشکارا تھی؛ امراء رنگ رلیوں میں تھے، صوفیہ خانقاہ کی جاگیروں سرنگیوں اور نالیوں میں تھے۔ اور علماء جاہ طلبیوں اور سلاطین کی درباداریوں میں تھے، بادشاہ دین ودنیا کے ہر خیال سے آزاد ہوکر ملک کی دولت، رقص وسرود کے تماشوں اور حسن وجمال کے بازاروں میں لٹا رہے تھے، رعایا بدحال اور ستمگروں کے مظالم سے پامال ہو رہی تھی، اس سے خزانے خالی ہو رہے تھے، اور فتنہ گرم بازاری دکھا رہے تھے، یہ وہ منظر تھا جس پر ہزار ضبط وسکون کے بعد بھی شاہ صاحب کی آنکھوں سے بالآخر آنسو کے چند قطرے گر ہی گئے، حجۃ اللہ البالغہ کے ایک باب کے آخر میں لکھتے ہیں:-

وَغالب سبب خراب البلدان فی ھٰذا الزمان شیئآن، احدھما تضییقھم علی بیت المال ان یعتادوا التکسب بالاخذ منه علیٰ انھم من الغزاۃ او من العلماء الذین لھم حق فیه، او من الذین جرت عادۃ الملوک بصلتھم کالزھاد والشعراء او بوجه من وجوہ التکدی ویکون العمدۃ عندھم ھو التکسب دون القیامۃ بالمصلحۃ فیدخل قوم علی قوم فینغصون علیھم وَ یصیرون کلاً علی المدینۃ، وَالثانی ضرب الضرائب الثقیلۃ علی الزراع وَالتجار وَالمحترفۃ وَالتشدید علیھم حتی یفضی الٰی اجحاف المطاوعین وَاستئصالھم وَالی تمنع اولی بأس شدید وَبغیھم وانما تصلح المدینۃ بالجبایۃ الیسیرۃ وَاقامۃ الحفظۃ بقدر الضرورۃ فلیتنبه اھل الزمان لھذہ النکتة

(باب سیاسۃ المدینۃ)

"اس زمانہ میں ملک کی خرابی وویرانی کے زیادہ تر دو سبب ہیں، ایک بیت المال یعنی ملک کے خزانہ پر تنگی وہ اس طرح کہ لوگوں کو یہ عادت پڑ گئی ہے کہ کسی محنت کے بغیر خزانہ سے روپیہ اس دعوے سے حاصل کریں کہ وہ سپاہی ہیں یا عالم ہیں جنکا حق اس خزانہ کی آمدنی میں ہے، یا اُن لوگوں میں سے ہیں جنکو بادشاہ خود انعام واکرام دیا کرتے ہیں، جیسے دھرپتیہ صوفی، اور شاعر اور دوسرے گروہوں میں سے جو ملک وسلطنت کے کسی کام کے بغیر کسی نہ کسی ایسے طریقہ سے روزی حاصل کرتے ہیں جو محنت کے بغیر ان کو ملتی ہے، یہ لوگ اُن کے اور دوسروں کے ذرائع آمدنی کو کم کر دیتے ہیں اور ملک پر بوجھ ہیں۔ دوسرا سبب کاشتکاروں بیوپاریوں، اور پیشہ وروں پر بھاری محصول لگانا اور اس بارہ میں سختی کرنا ہے، یہاں تک کہ جو بیچارے حکومت کے مطیع اور اسکے حکم کو مانتے ہیں وہ تباہ ہو رہے ہیں اور جو سرکش اور نافرمان ہیں اور سرکش ہو رہے ہیں اور حکومت کے محصول نہیں ادا کرتے حالانکہ ملک اور سلطنت کی آبادی سستے محصول وفوج اور عہدہ داروں کی بقدر ضرورت تقرری پر ہے، چاہئے کہ اس ملک کے لوگ ہشیار ہو کر سیاست کا اس نکتہ کو سمجھیں"

شاہ صاحب نے ان چند سطروں میں جو کچھ فرمایا ہے وہ آج صفحوں اور دفتروں میں پھیلا کر لکھا جا سکتا ہے ان کی دوربین نگاہ سیاسیات و اقتصادیات کے جن باریک گوشوں تک پہنچ گئی تھی ابنائے عصر ان کے سمجھنے سے بھی قاصر تھے جاگیرداری سسٹم نے تمام ملک کو امراء پر بانٹ دیا تھا، مرکزی کمزوری نے اُن سب کی باگیں ڈھیلی کر دی تھیں، پشتینی امراء اس زعم پر کہ ان کے بزرگوں نے بھی اس سلطنت کا کوئی کارنامہ کبھی انجام دیا تھا بے دردی سے اور بغیر کسی محنت کے سلطنت کی دولت اور زمین پر قابض تھے اور اب گو وہ اس قابل بھی نہیں رہے تھے کہ سلطنت کا کوئی کام انجام دے سکیں، پھر بھی اسی ظاہری طمطراق، تزک و احتشام، عیش و آرام اور نمائش کی زندگی بسر کر رہے تھے اور سلطنت کے مالیات کا نظام ان کی اس فضول عیاشی اور اسراف سے تہ و بالا ہو رہا تھا۔ زمیندار اپنے اپنے حلقے بنا کر سلطنت کی زمینوں پر قابض تھے اور اگر ان کو کچھ طاقت حاصل تھی تو ہر قسم کے سرکاری مطالبات کو ٹھکرا کر داد عیش دے رہے اور لوٹ رہے اور کھا رہے تھے۔ اور ان سرکش زمینداروں سے ہر سال مالیانہ کی وصولیابی کسی فوجی مہم کے بغیر ناممکن تھی، چکلہ داروں اور عاملوں کا یہی کام ہوتا تھا کہ ہر سال لڑ بھڑ کر زمینداروں کی گڑھیاں فتح کریں اور مالیانہ وصول کریں۔

اسی طرح اگر کسی خاندان میں ظاہری یا باطنی کمالات کی حامل کوئی ہستی ہو اور اسکے اطمینان کے لئے بادشاہ وقت کوئی روزینہ مقرر کر دیتا ہے تو اسکو نسلاً بعد نسلٍ لاخراج زمینیں دی جا رہی تھیں۔ کہ وہ "دعائے ازدیاد جاہ و جلال و عمر و اقبال" میں مصروف رہیں، ان کے اخلاف ان ظاہری و باطنی کمالات سے محروم ہونے کے باوجود سلطنت کے مالیہ پر بے وجہ بوجھ تھے، اور بے محنت کی روزی پا کر ملک و ملت کے لئے اُن کا وجود ننگ و عار بن رہا تھا۔

یہی حال ان سلاطین اور امراء کی ان زر پاشیوں کا تھا جو وہ مدح گو شاعروں، قصہ خوانوں، گویّوں، نقالوں اور فنونِ لطیفہ کی بہترین اداکاروں پر صرف کر رہے تھے۔ اور سلطنت کی بنیادیں جن محکموں پر قائم تھیں وہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو کر زیر و زبر ہو رہے تھے۔

اس غیر عادلانہ نظام کا نتیجہ یہ تھا کہ بادشاہوں کو چونکہ بہرحال اپنے کاروبار کو چلانا تھا اسلئے سرکشوں اور زبردستوں کو جن سے وہ کچھ نہیں لے سکتے تھے چھوڑ کر غریب کسانوں پر اور ان پر جو ان کی فرمائشوں کی تعمیل سے سرتابی نہیں کر سکتے تھے کل سلطنت کے مصارف کا بار تھا، اور سارے محصول اکیلے ان ہی سے وصول کئے جا رہے تھے جس سے ملک کی بے چینی اور بدحالی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ان غیر متوازی اقتصادی حالات کا انجام تباہی کے سوا کیا تھا ـــ؟

اس ایک اقتباس سے اندازہ لگائیے کہ شاہ صاحب کی اقتصادی و سیاسی نگاہ کتنی دور تک پہنچتی تھی ـــ

انقلابی یا مجدد؟

(از جناب مولانا سید احمد صاحب اکبرآبادی ایم۔ اے مدیر "برہان" دہلی)

آجکل تجدد نواز علماء اور ارباب قلم کا یہ فیشن ہو گیا ہے کہ وہ اسلام کو عالمگیر مذہب ثابت کرنے کیلئے ہر اس نظریہ اور اصطلاح کو اسلام پر منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جسکو ایک زیر دست پروپیگنڈے نے قبول عام کے بازار میں شہرت و قدرت دیدی ہو، آپکو یاد ہو گا اب سے چند سال پہلے "جمہوریت" کا غوغا ہوا، اس کی مدح و ثنا میں ارباب فکر و انشا نے دادِ سخن گستری دینی شروع کی تو ہمارے ان علمائے کرام نے دلائل و براہین سے ثابت کیا کہ اسلام کا نظام حکومت بھی تو جمہوری ہی ہے، پھر اب موجودہ ڈیماکریسی ناکام ہوتی ہوئی نظر آتی ہے اور اُسکے بالمقابل ڈکٹیٹر شپ کی طرف لوگ زیادہ مائل معلوم ہوتے ہیں تو انھیں حضرات نے اب جمہوریت کی مذمت بیان کرنا شروع کر دی ہے، اور کچھ تکلم زیر لب کے انداز پر، اور بعض کھلم کھلا کہہ رہے ہیں کہ دراصل اسلام بھی تو ڈکٹیٹر شپ ہی کا قائل ہے۔ حالانکہ اگر واقعی طور پر غور کیا جائے تو اسلام کے نظام حکومت کو موجودہ اصطلاح کے ماتحت نہ جمہوریت سے کوئی واسطہ ہے اور نہ ڈکٹیٹر شپ سے۔ بلکہ وہ ان دونوں کے درمیان کی ایک معتدل راہ ہے جسمیں خلیفہ نہ ڈکٹیٹر کی طرح بالکل مطلق العنان ہوتا ہے، اور نہ کسی صدر جمہوریہ کی طرح مجلس نمائندگان کا بالکل پابند۔

اسی طرح سوویٹ روس کی طرف سے سوشلزم کا پروپیگنڈہ ہوا تو ہم میں کتنے ہی تھے جو اسکی آن بان سے مرعوب ہو کر بر ملا اسلام کے اقتصادی نظام کو بھی سوشلزم پر منطبق کرنے لگے۔ اور انھوں نے دعوے کیا کہ اسلام میں اور سوشلزم میں بنیادی طور پر (یہ بھی محض برسبیل احتیاط) کوئی فرق نہیں ہے۔ ہم ان دوستوں کی نیت پر کوئی حملہ نہیں کرنا ممکن ہے کہ یہ سب باتیں نیک نیتی کے ساتھ ہوں، اور اس غرض سے ہوں کہ وہ اسلام کو ایک عالمگیر اور دنیا کے ترقی یافتہ نظریوں کا ساتھ دینے والا مذہب ثابت کرنا چاہتے ہوں۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ان کا یہ طرز عمل اسلام کے لئے حد درجہ نقصان رساں ہے۔ اس کے تو معنی یہ ہوئے کہ اسلام بجائے خود کوئی حقیقت ثابتہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک ایسی ربڑ ہے جسکو کھینچ تان کر وہ ہر قد و قامت پر راست کر سکتے ہیں، اور وہ ایک ایسا مبہم و مجہول دستور ہے جسکی تشریح ہر زمانہ میں اس کے جدید رجحانات کے مطابق ہو سکتی ہے۔

اسی نوع کی ذہنی مرعوبیت کی ایک بدترین مثال یہ ہے کہ آج ہم اپنے بزرگوں کی تعریف کرتے ہیں تو انکو لئے وہی عنوانات تجویز کرتے ہیں جو موجودہ دور سیاست میں کسی بڑے سے بڑے لیڈر کے لئے سرمایۂ نازش و افتخار

سمجھے جاتے ہیں۔ اس قسم کے لفظوں میں غالباً سب سے بڑا شاندار اور پرعظمت لفظ "انقلابی" ہے گزشتہ چند برسوں میں اسلامی سیاست پر جن حضرات نے مقالے لکھے ہیں انکا مطالعہ کیا جائے تو آپکو معلوم ہوگا کہ ہمارے ارباب قلم کس بری طرح جدید عنوان ستایش سے مرعوب ہو کر رہ گئے ہیں، اب انہیں اپنے ہر بزرگ کی ذات "انقلابی" اور اسکا ہر کارنامہ "انقلاب" نظر آتا ہے ان بزرگوں میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات غالباً سب سے نمایاں اور ممتاز ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب کو ہندوستان کے دور آخر کا سب سے بڑا داعی انقلاب رہنما اور انقلابی کہا جاتا ہے۔ حالانکہ اگر انقلابی کے صحیح معنی کو پیش نظر رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ حضرت شاہ صاحب کو انقلابی کہنا انکی تعریف و توصیف نہیں بلکہ ایک گونہ تنقیص ہے مندرجہ ذیل سطروں میں اسی حقیقت پر کچھ روشنی ڈالنے کی سعی کیگئی ہے۔

انقلابی کے خصائص سب سے پہلے انقلابی اور مصلح کا فرق سمجھ لیجئے، جو حضرات کسی قوم میں تبدیلی پیدا کرتے ہیں وہ دو قسم کے ہوتے ہیں ایک مصلح اور دوسرا انقلابی، ان دونوں میں مابہ الامتیاز یہ ہے کہ مصلح کا راستہ نہایت معتدل اور افراط و تفریط سے بچا ہوا ہوتا ہے۔ وہ روحانی اور اخلاقی کیرکٹر کے لحاظ سے بہت بلند پایہ انسان ہوتا ہے اسکی تمام کوششیں خیر خواہی اور خیر اندیشی کے جذبہ پر قائم ہوتی ہیں، اس میں منتقمانہ جوش بالکل نہیں ہوتا اسکو ذاتی ترفع اور وجاہت پسندی سے بُعد ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے اور کہتا ہے، سچائی اور ایمانداری سے کرتا اور کہتا ہے لیکن اسکے برخلاف ایک انقلابی لیڈر یا رہنما کا یہ حال نہیں ہوتا، اس کے سامنے ایک نظام ہوتا ہے اسکے خیال میں نہایت ہی مکروہ، اور مذموم، وہ ہر ممکن طریقہ سے اسکو تبدیل کرنا چاہتا ہے، اس کے لئے عفو و درگزر بے معنی چیزیں ہیں، یہ نظام چونکہ اسکی نگاہ میں انتہا درجہ قبیح اور لائق مذمت ہوتا ہے، اور اس کے احساسات اسکی نفرت و حقارت سے پر ہوتے ہیں، اس لئے ردعمل کے اصول کے مطابق وہ اس کا انتہائی توڑ تلاش کرتا ہے اور اس پر جم جاتا ہے۔ اس راہ میں اسکو اعتدال اور میانہ روی کا مطلقاً دھیان نہیں رہتا، مثلاً ایک انقلابی، نظام سرمایہ داری کو دیکھتا ہے تو وہ اس کے مقابلہ میں سوشلزم سے کم کسی چیز پر راضی ہی نہیں ہو سکتا۔ وہ انفرادی ملکیت کا ہی سرے سے منکر ہوتا ہے، اسکے لئے یہ دشوار ہے کہ وہ ملکیت کی تحدید، یا اس پر کچھ پابندیاں، عائد کرنے پر رضامند ہو سکے۔

پھر جب وہ اپنی ایک شاہراہ مقصود متعین کر لیتا ہے تو وہ اس پر آنکھ بند کر کے بڑی تیزی سے چلتا ہے اب اس کو گرد و پیش کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی اور نہ اسے یہ خیال ہوتا ہے کہ "زیر قدمش ہزار جانست" والا معاملہ ہے، ایسا نہ ہو کہ سینکڑوں بے گناہ انسان اس کی تیز گامی کی نذر ہو جائیں، اس لحاظ سے "انقلابی" کے لئے ضروری نہیں کہ وہ فضائل اخلاق کا پابند ہو، اور روحانی مرتبہ کے لحاظ سے وہ کسی غیر معمولی حیثیت کا انسان ہو، غرض یہ ہے کہ ایک انقلابی کے ذاتی خصائص و شمائل کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں تین چیزیں نمایاں نظر آئینگی:

(۱) تشدد اور جبر ——— (۲) افراط و بے اعتدالی ——— (۳) خود غرضی اور جذبۂ انتقام

انقلاب فرانس کے نام سے آج کون پڑھا لکھا نا واقف ہے جنھوں نے اس کی تاریخ پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ فکری اور ذہنی تبدیلی پیدا کرنے میں فرانس کے چار مصنفوں کو بہت دخل ہے مانٹیکیو، والٹیر، دیدرو، اور روسو، یہ چار وہ لوگ ہیں جنکی تصنیفات کو اساس انقلاب کہا جاتا ہے۔ اِن میں غالباً سب سے زیادہ اعتدال پسند روسو ہے، لیکن اسکا حال بھی یہ ہے کہ وہ امن، علم، تہذیب اور مذہب و اخلاق ان سب چیزوں کا برملا مذاق اُڑاتا ہے، اور ان پر پھبتیاں کستا ہے مثلاً ایک جگہ وہ لکھتا ہے :-

تہذیب کیا ہے؟ تعیش پسندی! ــــــ امن کیا ہے؟ ظلم و جبر! ــــــ علم کیا ہے؟ انسانی غلطیاں

چونکہ اس طرح کی انتہا پسندانہ باتیں شعوری یا غیر شعوری طور پر کسی اندرونی جذبۂ انتقام پر مبنی ہوتی ہیں اسی لئے خود روسو کے بعض عقیدتمندوں کو اس کی طرف سے کبھی کبھی شبہ پیدا ہو جاتا تھا اور وہ دریدہ یہ سوال کرتے تھے۔

"کیا روسو سوسائٹی کا اس لئے دشمن ہے کہ اس میں وہ اپنے لئے کوئی جگہ پیدا نہیں کر سکا؟"

"کیا وہ دولت سے اسلئے متنفر ہے کہ وہ اسے حاصل نہ کر سکا؟"[1]

.. پھر کتاب انقلاب کے مسلمہ ابواب و فصول میں غدر، اور انقلاب میں کوئی فرق نہیں ہے چنانچہ انقلابیوں کا ایک عام مقولہ ہے کہ کامیاب بغاوت کا نام انقلاب ہے، اور ناکام انقلاب کا نام بغاوت۔ افسوس ہے کہ یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہے، ورنہ یہ بات بہت آسانی سے ثابت کیجا سکتی ہے کہ آج کل کے مصطلحہ انقلاب میں جن لوگوں نے شاندار انقلابی کارنامے کئے ہیں، ان میں اکثر و بیشتر ایسے ہی لوگ تھے جو ذاتی طور پر سوسائٹی کے مردجہ مظالم کا شکار رہے اور اس کی وجہ سے انھوں نے اسکے خلاف علم بغاوت بلند کیا، مثال کے طور پر میں کارل مارکس کی ابتدائی پُرمصائب زندگی کو پیش کر سکتا ہوں، اس بنا پر اسکے اعمال و اعمال کی نسبت یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کسی ذاتی غرض یا کسی جذبۂ انتقام سے بالکل بری اور منزہ تھے۔

میں اس موقعہ پر یہ بھی ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ میں کسی انقلابی لیڈر کی واقعی عظمت و بزرگی کا منکر نہیں ہوں لیکن اصل مقصد یہ ہے کہ میرے نزدیک ایک مصلح، مجدد اور مجاہد کا مرتبہ انقلابی سے کہیں زیادہ بلند ہے، اور میں ایک لمحہ کے لئے یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ آپ اپنے کسی مجدد ملت یا مجاہد امت کو انقلابی کے لفظ سے یاد کریں۔

حضرت شاہ صاحب کے خصائص انقلابی کی ان خصوصیات کو پیش نظر رکھکر اب حضرت شاہ صاحب کے اوصاف و کمالات کا جائزہ لیجئے تو معلوم ہوگا کہ حضرت شاہ صاحب اسلام کے بہترین مفکر، حکیم اور زبردست عالم ربانی اور زاہد نامتنفر تھے۔ ان کی تصنیفات نے اس زمانہ کی بیمار ذہنیتوں کی اصلاح کر کے انھیں پاک صاف بنایا غیر اسلامی اوہام و تخیلات کی جگہ مسلمانوں میں خالص اسلامی تخیل پیدا کیا۔ حضرت شاہ صاحب شریعت اور طریقت فلسفہ اور تصوف عقلیات اور نقلیات کے ایسے مجموعہ دلکش و دل آویز تھے کہ ان کی ذات جس طرح ایک مسلمان کے لئے رشد و

[1] انقلاب فرانس از جناب باری صفحہ ۲

ہدایت کا کام دے سکتی ہے۔ نامسلموں مگر انصاف پسندوں کے لئے بھی وہ بہترین معلم ثابت ہو سکتی ہے حضرت شاہ صاحبؒ کی پُر زور تحریر کا اثر مسلمانوں کی طرح غیر مسلموں کے دل و دماغ کو بھی متاثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ اسکی وجہ یہی ہے کہ وہ اسلام کے بہترین رازدار حکیم و مصلح ہیں، اور پھر اپنے ہمہ گیر دلائل و براہین کی روشنی میں اُسے اسطرح بیان کرتے ہیں کہ سننے والے کو مجال انکار باقی نہیں رہتا، اسلام دین فطرت ہے۔ پس جس کسی کو اس دین کے محرم اسرار ہونیکا شرف حاصل ہوگا۔ ضروری ہے کہ تمام نوامیس فطرت۔ اسرار و رموز عالم سے بھی پوری طرح باخبر ہو اس مقام بلند پر پہنچکر مجاز اور قیاس و تخمین کے تمام حجابات یک قلم اُٹھ جاتے ہیں اور دیکھنے والا جلوۂ جمال حقیقت سے بلاواسطہ شادکام و نائز المرام ہوتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچکر ارباب سلوک و معرفت کی اصطلاح میں انسان اپنے تئیں مجدد سمجھنے لگتا ہے، اب اگر کسی مرشد کامل یا علم شریعت میں مہارت کے ذریعہ حضرت حق جل و علا کی توفیق اسکے شامل حال ہو گئی تو وہ مگراہ ہو کر طرح طرح کو دعاوی باطلہ کرتا ہے، ورنہ وہ سنبھل جاتا ہے اور اس مقام سے گزر کر اسکی طبیعت میں اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے تفہیمات، الخیر الکثیر اور حجۃ اللہ البالغہ کے شروع میں جو کچھ اپنی نسبت لکھا ہے ایک طرف آپ اس کو دیکھئے اور دوسری جانب آپ نے اپنی تصنیفات میں شریعت و طریقت کی تطبیق کی جو کوشش کی ہے اسکو ملاحظہ فرمائیے تو صاف عیاں ہو جاتا ہے کہ آپ بے شبہ اس مقام رفیع پر سرفراز تھے جو مجددیت کا مرتبہ کہلاتا ہے لیکن چونکہ علوم ظاہریہ و رسمیہ میں بھی آپکو بڑا کمال تھا، اس لئے مجددیت کی شان کیساتھ آپکے قبائے عظمت میں فلسفیت کے ایک تکمہ زریں کا اور اضافہ ہو گیا ہے اور ان دونوں کی آمیزش نے حکمائے اسلام کی صف میں آپکو ایک نمایاں تر مقام پر لا بٹھایا ہے۔

مقام مجددیت حضرت شاہ صاحبؒ خود اپنے اس مقام کا اظہار تفہیمات میں اس طرح کرتے ہیں:۔

مجھ کو میرے رب نے سمجھایا ہے کہ ہم نے تمکو اس طریقہ کا امام بنادیا اور حقیقت قرب تک پہنچنے کے تمام راستوں کو بند کر کے صرف ایک راستہ کھلا رکھا ہے، اور وہ تمہاری محبت اور اطاعت کا راستہ ہے، جو شخص تمہارا دشمن ہے، اس کے لئے آسمان آسمان نہیں اور زمین زمین نہیں پس تمام اہل مشرق و مغرب تمہاری رعیت ہیں اور تم ان کے بادشاہ۔ اسے غرض نہیں کہ یہ لوگ جانتے ہیں یا نہیں، اگر جانتے ہیں تو کامیاب ہوں گے ورنہ نقصان اٹھائینگے،،

ایک مقام پر فرماتے ہیں:۔

مجھکو بتایا گیا ہے کہ میں اس حقیقت کا اعلان کر دوں کہ آج وقت میرا ہی وقت ہے اور زمانہ میرا ہی زمانہ ہے، اس شخص پر حیف جو میرے جھنڈے کے نیچے نہیں ہے"

ایک دو نہیں تفہیمات کا اول سے آخر تک مطالعہ کیا جائے تو ہمیں اس بات سے متعلق اشارات و تصریحات بکثرت ملینگی، پھر حضرت شاہ صاحبؒ نے جو کچھ فرمایا، مدعیان باطل کے دعاوی کی طرح محض زبانی تعلی اور خود ستائی نہ تھا،

بلکہ ان کی تصنیفات، اُن کے شاندار علمی اور عملی کارنامے اس دعویٰ کا ناقابل تردید ثبوت ہیں اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب جن مضبوط بنیادوں پر اپنے دست تجدید سے اسلام کی تعمیر قائم کرگئے ہیں اس کی استواری کا یہ عالم ہے کہ حوادث و نوازل کے لاکھ سیلاب آئیں اسکو متزلزل نہیں کرسکتے آج اسلامی فلسفہ اور حقائق و معارف اسلام کی جو کچھ روشنی نظر آتی ہے غور کیجئے تو وہ سب اسی آفتاب علم کا پرتو ہے۔

فیضی احسنت از ین عشق کہ دوران امروز ‏ گرم دارد ز تو ہنگامۂ رسوائی را

علم اسرار یہ ظاہر ہے کہ شان مجددیت اس وقت تک کامل نہیں ہوسکتی، جب تک کہ شریعت کے غوامض و حکم سے پوری طرح واقفیت نہ ہو اس کے بغیر ایمان محض ایمان بالغیب اور عمل صرف "تعمیل حکم" کے درجہ تک محدود رہتا ہے حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کو مجددیت کے مقام بلند پر سرفراز ہونا تھا اسلئے انھیں اسرار و رموز شریعت کا محرم بنایا گیا اور جو حقیقتیں دوسروں کو محض سان گمان سے معلوم تھیں۔ آپ نے ان کا مشاہدہ کیا۔ چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ میں ارشاد ہوتا ہے۔

میرے نزدیک تمام جدید فنون میں سب سے زیادہ دقیق، مرتبہ کے لحاظ سے سب سے زیادہ بلند اور علوم شرعیہ میں سب سے زیادہ روشن اور بہترین دین کے اسرار کا علم ہے جسمیں احکام کی حکمتوں اور مصلحتوں سے اور خاص خاص اعمال کے بھیدوں اور ان کی نکات سے بحث ہوتی ہے پس خدا کی قسم یہی علم سب سے زیادہ اسکا مستحق ہی کہ انسان اپنی استطاعت کیمطابق اسمیں اپنی نفیس ترین اوقات صرف کرے اور فرض طاعتوں کے بعد اسکو اپنے لئے ذخیرۂ آخرت بنائے کیونکہ اسی علم کے ذریعہ انسان کو شرعی احکام و مسائل کی بصیرت حاصل ہوتی ہی، اور اخبار شرع کے ساتھ اسکی نسبت ایسی ہی ہوجاتی ہے جیسی عروض جاننے والے کی اشعار کے دواوین کے ساتھ یا ایک عالم منطق کی براہین حکما کے ساتھ ـــــ اور وہ اندھیرے میں ٹھوکریں کھانیسے محفوظ ہوجاتا ہی"

علوم رسمیہ و ظاہریہ میں مہارت پھر ہر مجدد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے ماحول کا بالکل صحیح اندازہ رکھتا ہو اپنے زمانہ کے عواطف و امیال سے پوری طرح باخبر ہو۔ اور جدید طریقۂ استدلال پر اسکو کامل عبور ہو اگر یہ چیز نہیں تو اسے مجددیت میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی، کیونکہ وہ ابنائے زمانہ کو انکے مروجہ علوم کی روشنی میں حقائق اسلامی کو سمجھا نہیں سکیگا اور لوگ خود اسی کے طرز استدلال سے نامانوس ہوکر اس کے دلائل زیادہ توجہ کے ساتھ سن نہیں سکینگے۔

زور تحریر و تقریر ان کمالات کیساتھ زور تحریر و تقریر کی نعمت سے بھی بہرہ اندوز ہونا ضروری ہے، اس کے بغیر مخاطب پر متکلم کے دلائل و براہین کا اثر کم ہوتا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ کی ذات گرامی ان تمام اوصاف و

شمائل کی بھی جامع تھی آپ کے عہد میں علوم عقلیہ میں منطق اور فلسفہ کا زور تھا حضرت شاہ صاحبؒ دینی و نقلی علوم میں مرتبہ امامت رکھنے کیساتھ ان علوم میں بھی مہارت تام رکھتے تھے، اور یہی وجہ ہے کہ حجۃ اللہ البالغہ لکھکر انھوں نے شرعیات مسائل کے باب میں ابوالحسن اشعری وغیرہ کے علم کلام سے الگ ایک بالکل نئے علم کلام کی بنیاد رکھدی ہے جو بحث و استدلال کے لحاظ سے پہلے علم کلام سے کہیں زیادہ معقول اور نتائج کے افادہ کے اعتبار سے اس سے کہیں زیادہ قطعی الثبوت ہے رہا زور تحریر! تو اس کے لئے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں جس شخص نے آپ کی تصنیفات کا مطالعہ کیا ہے اسکو معلوم ہوگا کہ آپ کے کلام میں حافظ ابن تیمیہ کی سی صولت کلام اور بات کا پھیلاؤ اگرچہ بالکل نہیں ہے لیکن وہ جو کچھ فرماتے ہیں ایسے جچے تلے، اور موزوں و مناسب الفاظ میں فرماتے ہیں کہ پڑھنے والے پر اس کا اثر ہوتا ہے اور جتنا جتنا وہ آگے بڑھتا ہے عقیدت و ارادت کا نقش اسی قدر زیادہ جلی اور پختہ ہوتا جاتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب کا عمل تجدید | ان کمالات وخصائص سے آراستہ ہوکر آپ نے جب تجدید کے میدان میں قدم رکھا تو کوئی شبہ نہیں آپ نے وہی عظیم الشان کارنامہ انجام دیا جو صحیح معنی میں ایک نائب رسول ہی کر سکتا ہے، آپ نے جس فضا میں آنکھ کھولی وہ اخلاقی اور روحانی پستی کے لحاظ سے نہایت شرمناک دور تھا، مغلیہ سلطنت کا چراغ ٹمٹمانا شروع ہوگیا تھا، دربار پر شیعوں کا قبضہ تھا، تمام ملک میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا، مسلمانوں کی تعلیمی حالت یہ تھی کہ درسگاہوں میں صدرا، شمس بازغہ اور شرح مطالع کے شرح و حواشی اس کثرت سے رائج تھے کہ گویا اس زمانہ میں مسلمانوں کا نصاب تعلیم ان کتابوں کے سوا کچھ اور تھا ہی نہیں دینیات میں تھوڑا بہت اگرچہ پڑھایا جاتا تھا بھی تو فقہ کی چند کتابوں کا تفسیر و حدیث کا رواج بہت کم تھا بس۔

ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

کا مصداق تھا، اخلاق اور اعمال کا یہ عالم تھا کہ بدعات مشرکانہ اعمال و رسوم جو زیادہ تر ہندوؤں کیساتھ اختلاط کا نتیجہ تھے، گھر گھر رواج پذیر تھے، امرا اور ارباب ثروت عیش و عشرت میں مصروف ہوکر دین حق سے غافل ہو چکے تھے، حضرت شاہ صاحبؒ نے ان تمام احوال گرد و پیش کا جائزہ لے کر اپنا عمل تجدید جاری کیا تو اس طرح کہ ایک طرف آپ نے شیعیت کی تردید میں ازالۃ الخفاء تصنیف فرمائی "مدرسہ رحیمیہ دہلی" (جو حضرت شاہ صاحبؒ کے والد ماجد کے نام پر تھا) میں قرآن و حدیث کا درس دیا جس میں دور دور کے علماء شریک ہوکر کسب سعادت کرتے تھے آپ نے پچاس سال کے قریب مدت تک اس مدرسہ میں درس جاری رکھا، اسی سلسلہ میں آپ نے قرآن مجید کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا تاکہ اسکا افادہ عام ہوسکے کوئی شبہ نہیں کہ یہ اقدام بھی آپ کا غیر معمولی عمل تجدید تھا جس نے عام علماء میں اُن کی خود غرضی کی بنا پر بے چینی پیدا کر دی تھی، اسی کے ساتھ ساتھ آپ نے حجۃ اللہ البالغہ اور تقلید و اجتہاد میں رسائل

تصنیفات کرکے اس بات کی سعی بلیغ کی کہ ان میں جو ذہنی تسفل اور دماغی جمود وخمود پیدا ہوگیا ہے، اور جو فی الحقیقت ان کے اجتماعی سیاسی اور مذہبی انحطاط کا باعث بنے، وہ دور ہو اور اس کے بجائے اجتہادِ فکر کی روشنی، آزاد غور وخوض کی عادت اور صحیح اسلامی طریقہ پر سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو۔

کون کہہ سکتا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کا عمل تجدید بیکار و بے اثر رہا، خوش قسمتی سے حضرت شاہ صاحبؒ کو جانشین بھی ایسے میسر آئے جنھوں نے آپکے علوم وفنون کی حفاظت اور دیانتداری کے ساتھ انکی نشر واشاعت میں حضرت شاہ صاحبؒ کی جانشینی کا پورا حق ادا کیا، نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم نے اس خاندان کی نسبت کیا خوب لکھا ہے:-

"ہر یکے از ایشاں بے نظیر وقت وفرید دہر ووحید عصر در علم وعمل وعقل وفہم وقوت تقریر وفصاحت تحریر وتقویٰ ودیانت وامانت، ومراتب ولایت بود، وہم چنیں اولاد اولاد ایں سلسلہ از طلائی ناب است"۔ (اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقہاء المحدثین)

لیکن خاندان ولی اللہی نے جس شاہراہ کو اختیار کیا اس کی بنیاد حضرت شاہ صاحب نے ہی ڈالی تھی، اس بنا پر مجددیت کا شرف اس تمام سلسلہ میں حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لئے ہی مخصوص ہے، آج ہندوستان میں علم دین کا چرچا، مذہبی بیداری، اور شرک وبدعت سے اجتناب، اور علماء کا وقار جو کچھ نظر آتا ہے یہ سب حضرت شاہ صاحبؒ کے ہی مجددانہ کارناموں کا اثر با بعد ہے، ورنہ مصر ایران اور شام وفلسطین اور ترکی و افغانستان میں مسلمانوں کی جو حالت ہے کون کہہ سکتا ہے کہ اگر اس خاندان والاشان کی خدمات بابرکات نہ ہوتیں تو ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہبی حالت ان ممالک سے بھی بدتر نہ ہوتی!

پس اس علمی وعملی جلالت شان کے باعث آپ خود سوچئے کہ حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ ایک بلند پایہ مجدد تھے، یا انقلابی؟ کوئی شبہ نہیں کہ آپ زمانہ کے اعتبار سے متاخر تھے لیکن اپنے علمی وعملی اور ظاہری باطنی کمالات وخصوصیات کے لحاظ سے زمانہ سلف کے اکابر علماء ومجتہدین سے کسی طرح کم نہیں تھے بلکہ ایک بڑی حد تک ابوالعلاء المعری کے اس شعر کے مصداق تھے ؎

وَاِنِّی وَاِنْ کُنْتُ الْاَخِیْرَ زَمَانُہٗ ۔۔۔ لَآتٍ بِمَا لَمْ تَسْتَطِعْہُ الْاَوَائِلُ

لیکن آپ کو "انقلابی" کہنا یا یہ دعویٰ کرنا کہ آپ کسی نئے فلسفہ کے علمبردار تھے، آپ کی تعریف نہیں بلکہ تنقیص ہے، اور اسلام کے صحیح طریق فکر اور اسکے درست طریق اصلاح وارشاد سے بیخبری کی دلیل ہے:

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

مجدّدِ وقت!

(از حضرت ماہر القادری)

تو مبلغ تھا حدیث فخر موجودات کا!
تیرے آتے ہی جنازہ اٹھ گیا بدعات کا

تو مفسر بھی، محدث بھی، فقیہہ و شیخ بھی
کون اندازہ لگائے تیرے محسوسات کا

تیری فطرت بے نیازِ درگہ شاہ و وزیر
تجھکو دنیا میں بھروسا تھا خدا کی ذات کا

میں سمجھتا ہوں مشیت کا وہی مفہوم تھا
تو نے جو مطلب لیا قرآن کی آیات کا

عقل و مذہب کو سمویا تو نے اس انداز سے
صبح میں جیسے نمایاں ہو دھندلکا رات کا

تیرے ارشادات میں سامان تسکین ضمیر
روح ایمان نقطہ نقطہ تیرے ملفوظات کا

سادگی اسلام کی پھر سے نمایاں ہو گئی
نور جب پھیلا جہاں میں تیری "تفہیمات" کا

تیرے وارث ہیں ترے نور ہدایت کی شبیہہ
اب بھی چرچا ہے جہاں میں تیری تعلیمات کا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بحیثیت مصنف

(از جناب مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی استاذ تفسیر ندوۃ العلماء لکھنؤ)

یہ سب جانتے ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اسلام کے ان جلیل القدر عالموں میں سے ہیں جن کی شہرت وعظمت زمان ومکان کے حدود سے آگے بڑھ چکی ہے، اور جن کا بیش قیمت علمی ترکہ ایک قوم اور اقلیم کی میراث نہیں بلکہ پوری امت اسلامیہ اور پورے عالم اسلام کا سرمایۂ فخر ہے لیکن اس علمی حقیقت تک ان لوگوں کی رسائی جنکو شاہ صاحب کے خارق عادت علمی وذہنی کمالات کا مشاہدہ (بعد زمانی یا بعد مکانی کی وجہ سے) نصیب نہیں ہوسکا آپ کی تصانیف ہی کے ذریعہ سے ہوسکتی ہے، اس لئے آپ کی تصنیفی خصوصیات کی وضاحت اور مصنف کی حیثیت سے اسلام کی علمی ودینی تاریخ میں آپ کے مقام کی تشریح - آپ کی صحیح معرفت کے لئے ضروری اور نہایت اہم علمی موضوع ہے جس کے بغیر نہ صرف آپ کا تذکرہ، نہ صرف ہندوستان کی علمی تاریخ، بلکہ اسلام کی علمی تاریخ بھی نامکمل رہیگی۔

شاہ صاحبؒ کا مرتبہ مصنف کی حیثیت سے شاہ صاحبؒ اسلام کے ان چند مصنفین میں سے ہیں جنکی تعداد مصنفین اسلام کی بے نظیر کثرت کے باوجود بہت کم ہے، حاشا وکلا یہ اسلام کے مشہور تاریخی فخر اور امتیاز کا انکار اور مصنفین اسلام کی تنقیص نہیں ہے۔ دنیا کے کسی مذہب کی علمی تاریخ اتنے اہل قلم، اتنے صاحب تصنیف، اور تاریخ کی اتنی مختصر مدت میں اتنا وسیع معمور اور قیمتی کتب خانہ نہیں پیش کر سکتی جتنا اسلام نے پیش کیا لیکن اس موقع پر ہمارے سامنے عظمت کا معیار تصانیف کی کثرت، موضوع کا تنوع، کتابوں کی ضخامت، تصانیف کی مقبولیت اور رواج مضامین کا اشکال اور پیچیدگی، خیالات میں تعمق اور فہم یا تشریح مطالب میں موشگافی، متن کا اختصار، اور مطالب کی تلخیص یا شارحانہ اور محشیانہ گرہ کشائی اور نکتہ رسی میں سے کوئی چیز نہیں ہے، یہ سب کمالات اپنی جگہ پر مسلم اور یہ تمام علمی خدمات اپنے اپنے زمانہ میں لائق احترام وشکر لیکن تجدید و امامت کا مقام اس سے بلند ہے ہر مصنف امام وقت اور مجدد فن نہیں ہوتا، اس مقام کے لئے شرط ہے کہ مصنف نے کسی موضوع پر کوئی ایسی چیز پیش کی ہو جس سے اسوقت تک کا کتب خانہ خالی ہو۔ نئے علمی نظریات اور علم ودین کے حدود کے اندر رہکر تازہ خیالات اور جدید تحقیقات پیش کی ہوں۔ اس کے یہاں جدت فکر ہو، ذہن کا اجتہاد ہو اور مضامین

مطالب میں اصلیت اور اولیت ہو، اگر تنہا یہی شرط ہے تو علامہ ابن خلدون ایسے مصنف کی بہترین مثال ہو۔
لیکن اگر "فکر ارجمند" کے ساتھ "دل درد مند" اور عقل کے ساتھ عشق جمع ہو جائے اور مصنف کا قلم نغمہ زن کی انگلی کی طرح رباب دل کے تاروں کیساتھ کھیلنے لگے، تو وہ صرف مصنف نہیں رہتا، بلکہ ایک اخلاقی اور دینی مصلح بھی بنجاتا ہے، امام غزالی کی بعض تصنیفات میں یہ رنگ پایا جاتا ہے۔

لیکن اگر علم و استدلال کے ساتھ کوئی صحیح دینی تحریک و دعوت کوئی اصلاحی جوش اور کسی صالح انقلاب کی خواہش شامل ہو جائے اور اس کی تحریروں اور تصنیفات سے کسی نئے دور کا آغاز اور کسی نئی جماعت کی پیدائش کا سامان ہو تو وہ مجدد کہلانیکا مستحق ہوتا ہے، امام ابن تیمیہؒ اور حضرت مجددؒ سرہندی اسکی مثال ہیں

ہمارے نزدیک شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان میں سے اکثر کمالات کے جامع ہیں اسلام کے باکمال مصنفین کی خواہ کتنی ہی مختصر فہرست بنائی جائے، آپ کے نام کے بغیر وہ نامکمل رہیگی اور ترتیب و مراتب کے لحاظ سے آپکا نام اتنا پیچھے نہیں رہیگا، جتنا کہ تاریخ کے لحاظ سے آپکا زمانہ پیچھے ہے ؎

وانی وان کنت الاخیر زمانہ　　لاٰت بما لم تستطعہ الاوائل

لیکن اس کے قبل کہ ہم شاہ صاحبؒ کی تصنیفی خصوصیات کیطرف اشارہ کریں ہم اسلام کی ہزار سالہ تصنیفی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا چاہتے ہیں، تاکہ شاہ صاحب سے پہلے جتنا علمی کام ہو چکا تھا نیز تصنیف کا ارتقاء و انحطاط ہمارے سامنے رہے۔

اسلام کی تصنیفی تاریخ پر ایک نظر

مسلمانوں کی تصنیفی تاریخ حدیث اور متعلقات قرآن سے شروع ہوتی ہے، اس لئے طبعی طور پر ان کی تصنیفی کاوشوں کا موضوع اور ان کی دماغی جولانیوں کا میدان نقل و روایات، جمع و ترتیب کا میدان تھا، اور اس میں انھوں نے اس تجسس و تفتیش اس دیانت و احتیاط کا ثبوت دیا۔ جسکی زیادہ سے زیادہ کسی انسان سے توقع کیجا سکتی ہے، چوتھی صدی ہجری تک کی بہترین اسلامی تصنیفات اسی موضوع سے تعلق رکھتی ہیں:-

دینی و مدنی ضرورتوں سے فقہ کا علم پیدا ہوا اور علماء نے دوسری ہی صدی سے اس میں مجتہدانہ تصنیفات کیں جنمیں سے قدیم کتابوں میں سے امام شافعی کی بے نظیر کتاب کتاب الام اور اسکے بعد ابن قدامہ حنبلی کی جلیل القدر تصنیف المغنی اور پچھلی صدیوں میں احناف کی مایہ ناز کتاب ہدایہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔
مسائل کے استنباط اور قیاس و اجتہاد کے سلسلہ میں ضروری طور پر اصول فقہ کیطرف توجہ ہوئی اور بہت جلد

ؔ اصلیت اور اولیت سے مراد یہ ہے کہ یہ خیالات اسی کے ہوں کسی کی تقلید سے نہ پیدا ہوتے ہوں اور اس سے پہلے اس طرح کسی نے ان خیالات کا اظہار نہ کیا ہو۔

مسلمانوں نے اس کو اتنی ترقی دی کہ غالباً کسی مذہب و قوم کے اصول تشریع و قانون سازی نے اتنی ترقی نہ حاصل کی ہوگی، اس فن میں مسلمانوں کی بہترین دماغی جودت صرف ہوئی، اور وہ ان کی ذہانت کا بہترین نمونہ ہے امام غزالیؒ کی مستصفیٰ اور علمار احناف اور شافعیہ کی طویل و متوسط کتابیں اسکا ثبوت ہیں۔

علوم منقولہ میں سے فن تفسیر کیطرف بھی پوری توجہ ہوئی، مگر عرصہ تک مصنفین کا نقطۂ نظر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ) یہ رہا کہ آیات سے متعلق زیادہ سے زیادہ ممکن مواد جمع کردیں، اور یہ کام بعد کے آنیوالوں کے لئے جنکے سامنے وہ ماخذ نہیں ہیں بہت مفید اور ضروری ہے، لیکن ان میں ذاتی تفکر، زندگی اور ماحول پر انکی تطبیق اور بیشتر کتابوں میں تنقیح کی کمی، اور بعض میں اپنے زمانہ کے فانی اور وقتی خیالات و نظریات سے تاثر کی زیادتی اور اپنے زمانہ کا عکس ہے، اس دور میں اصول تفسیر کی عدم تدوین اور اس پر کسی معتد بہ کتاب کا نہونا بھی ایک محسوس کمی ہے۔

دوسری صدی کی ابتدا ہی میں ابتداءً مختلف قوموں کے اختلاط اور مختلف مذاہب کے اجتماع سے اور بعد میں یونانی فلسفہ اور خیالات کیوجہ سے مسلمانوں میں ایک نہایت خام قسم کی عقلیت پیدا ہوئی جسمیں کسی قسم کی گہرائی اور پختگی نہیں تھی اور جو فرد یا قوم کی نوعمری یا ذہنی مرعوبیت کی حالت میں کبھی کبھی پیدا ہوجایا کرتی ہے اس لئے اس موضوع پر ہمیں معتزلہ سے لے کر فلاسفہ تک (بشمول ابن سینا اور ابن رشد) کسی کی تصنیف میں کوئی جدت فکر، اجتہاد، اور ارسطو کے فلسفہ میں کوئی اضافہ یا ترمیم یا کسی انقلابی کوشش کا نشان نہیں ملتا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے یہاں یونانی فلسفہ اور اسلام کے تقابل میں وہ حریت فکر بھی نہیں جسکے یہ سب سے بڑے مدعی ہیں۔

اس فلسفہ کے مقابلہ میں علم کلام پیدا ہوا، اور اصول فقہ کے بعد یہ دوسرا فن ہے جسمیں مسلمانوں کی ذہانت صرف ہوئی امام ابوالحسن اشعری (المتوفی ۳۲۴ھ) اور امام ابومنصور ماتریدی (المتوفی ۳۳۳ھ) کی تصنیفات اور امام غزالی (م ۵۰۵ھ) کی جارحانہ اور امام رازی (م ۶۰۶ھ) کی مدافعانہ کوششیں اس سلسلہ میں ناقابل فراموش ہیں؛ فلسفہ اور علم کلام کے تقابل سے جو خاص قسم کی ذہنی پیچیدگیاں، غلط مذہبی نظریات و تصورات، اور دوسری طرف اسلام کے ضعف اور بعد زمانہ سے بدعات اور مشرکانہ خیالات پیدا ہوگئے تھے انکا اقتضا تھا کہ ایسے اشخاص پیدا ہوں جو سنت کا احیا کریں، عقل و نقل کے اس معرکہ میں اسلامی عقائد و مسائل کی حکیمانہ تشریح کریں اور خالص اور قدیم اسلام کی طرف دعوت دیں یہ خدمت آٹھویں صدی میں شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد رشید علامہ ابن قیم نے اپنی عالمانہ تصنیفات کے ذریعہ انجام دی رحمہم اللہ

اس کے بعد سے خلاف و جدلیات اور مذہبی مباحث اور علمی مناظروں کا دور شروع ہوا، اور بہترین

تو نیں اس میں صرف ہونے لگیں، اسی دور میں حدیث کے متعلقات پر بعض نہایت بیش قیمت اور جلیل القدر تصنیفات ہوئیں جنمیں سے صحیح بخاری کی شرح فتح الباری خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔

اس کے بعد سے تمام عالم اسلامی میں ایک عام علمی انحطاط اور تصنیفی زوال شروع ہوا جو بارہویں صدی تک قایم رہا، اجتہاد و تفکر کی قوت جاتی رہی، علم میں تقلید شعار بن گیا، فنون کی شرح وتخلیص مآل کار رہگیا، اور علما پر "درسیت" طاری ہوگئی، درسانہ تصنیفات، اور متعلق درسی کتابیں سرمایہ فخر رہگئیں، ہمتیں پست ہوگئیں، شرح و تلخیص اور اس کے بعد صرف تحشیہ پر قناعت کی جانے لگی، بحث و نظر کا میدان تنگ سے تنگ اور تفکر کا دائرہ محدود سے محدود ہوتا گیا، علوم معقول بھی منقول بن گئے نقلیات میں تفکر، عقلیات میں اجتہاد، قدیم علمی اندوختہ میں نئے اضافے اور طریق بحث و استدلال میں تغیر کی رسم موقوف ہوگئی گیارہویں اور بارہویں صدی کے عرب اور ہندوستانی علماء و مصنفین کے تذکرے ملاحظہ ہوں، کوئی مجتہدانہ تصنیف اور کوئی نایاب علمی تحقیق نہیں ملیگی۔

علم و تصنیف کے اس دور انحطاط میں شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے لیکن وہ اپنے زمانہ کی پیداوار نہیں ہیں، ان کی ذہنی سطح، ان کے مدارک، ان کے علوم و معارف اپنے زمانہ کے عام علما کی سطح سے بہت بلند تھے اور وہ ان اشخاص میں تھے جو کئی کئی سو برس کے بعد اپنے زمانہ کے بالکل برخلاف اہل زمانہ سے بالکل مختلف پیدا ہوتے ہیں اور ان کو عبقریین اور نوابغ کہا جاتا ہے، شاہ صاحب خود اپنے الفاظ میں اسی "تخریج بر تخریج اور تفریع بر تفریع" کے دور میں پیدا ہوئے (ازالۃ الخفاء ص ۱۵) لیکن آپکی تصنیفات اپنے زمانہ کی عام روش سے بالکل علیٰحدہ، آپ کا طرز فکر و بحث جدا، اور آپکے مضامین ان لوگوں کے لئے جنکے معلومات عام درسی کتابوں تک محدود ہیں بالکل نئے ہیں، چنانچہ خود آپ کو اسکا احساس تھا اور جا بجا آپ نے اسکا اظہار فرمایا ہے ازالۃ الخفا میں ایک جگہ فرماتے ہیں:-

"چوں ایں مقدمہ بایں آب و تاب در کتب کلامیہ نخواندہ محتمل کہ وحشتے بخاطر تو راہ یابد"

دوسری جگہ فرماتے ہیں:-

"ولابد چوں ایں ہفت نکتہ گفتہ شد باید دانست کہ مفہوم خلافت خاصہ بر نہجی کہ بیان کردیم علمی ست شریف کہ نور توفیق آنرا در خاطر بندۂ ضعیف ریختہ بیستحظہ من یعرفہ و ینکرہ من لا یعرفہ و ذلک من فضل اللہ علینا و علی الناس و لکن اکثر الناس لا یشکرون"

اس موقع پر جہاں یہ ثابت کر رہے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی حیثیت مجتہدین امت کے مقابلہ میں ایسی ہی جیسی مجتہد مستقل کی منتسب مجتہدین کے مقابلہ میں ہوتی ہے لکھتے ہیں:-

"لیکن فہم ایں معنی بغایت دقیق است جمعے کہ سرمایہ علم ایشاں شرح وقایہ و ہدایہ باشد کجا ادراک ایں سر دقیق تواند کرد" (ازالۃ الخفا صفحہ ۸)

اب ہم اپنی حیثیت کے مطابق شاہ صاحبؒ کی خصوصیات تصنیف بیان کرتے ہیں:-

خصوصیات تصنیف (۱) سبقت و اولیت:- اسلامی مسائل کی حکیمانہ توجیہ و تشریح، اور تطبیق عقل و نقل اگرچہ بارہویں صدی کے عالم کے لئے بالکل نیا موضوع نہیں تھا، خود شاہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ کے مقدمہ میں امام غزالی، خطابی، اور شیخ الاسلام عز الدین بن عبد السلام کا نام لیا ہے جنھوں نے احکام شرعی کے حکم و مصالح بیان کئے ہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان بزرگوں نے جو کچھ لکھا اس کی حیثیت اشارات و نکات سے زیادہ نہیں ہے، اسلام کے پورے نظام شرعی کی حکیمانہ تشریح ہمیں شاہ صاحب سے پہلے نہیں ملتی، اس اہتمام، وسعت اور جامعیت کے ساتھ اس موضوع پر ہمارے علم میں حجۃ اللہ البالغہ پہلی تصنیف ہے، اور پھر اس کے اکثر ابواب و مضامین بالکل نئے ہیں۔ اور فلسفہ، علم کلام، قرآن و حدیث، تصوف اور ذاتی غور و مشاہدہ اور قوت استدلال کی آمیزش شاہ صاحب ہی کا حق ہے۔

اصول تفسیر پر کوئی چیز عام طور پر نہیں ملتی، صرف چند اصول و قواعد تفاسیر کے مقدمہ میں یا اپنا طرز تصنیف بیان کرنے کے لئے بعض مصنفین چند سطروں میں لکھ دیتے ہیں، شاہ صاحب کی کتاب الفوز الکبیر فی اصول التفسیر بھی اگرچہ مختصر ہے لیکن پوری کتاب سراسر نکات و کلیات ہے، درحقیقت ایک جلیل القدر عالم کی جسکو فہم قرآن کے مشکلات کا عملی تجربہ ہو ایک قیمتی اور نادر بیاض ہے اسکی قدر وہی لوگ جان سکتے ہیں جنکو ان مشکلات سے واسطہ پڑا ہو بعض اصول جو شاہ صاحبؒ نے اپنے ذوق و وجدان اور فہم قرآن کی بنا پر لکھدیئے ہیں، دوسری کتابوں کی سیکڑوں صفحات کے مطالعہ سے نہیں حاصل ہو سکتے، اسی رسالہ کے مقدمہ میں شاہ صاحب کا یہ فرمانا حرف بحرف صحیح ہے کہ:-

"میگوید فقیر ولی اللہ بن عبد الرحیم عاملہما اللہ تعالیٰ بلطفہ العظیم چون بریں فقیر درے از فہم کتاب اللہ کشادند خواست کہ بعضے نکات نافعہ کہ در تدبر کلام اللہ یاران را بکار آید در رسالہ مختصرے مضبوط نماید امیدواری از عنایت حضرت باری آن است کہ طالب علماں را بمجرد فہم ایں قواعد راہے واسع در فہم معانی کتاب اللہ کشادہ گردد کہ اگر عمرے در مطالعہ تفاسیر یا گزرانیدن آنہا بر مفسران علیٰ انہم اقل قلیل فی ہذا الزمان بسر برند آں ضبط و ربط بدست نیارند"

قرآن کے مضامین، مقاصد، اس کے طرز و اسلوب کی خصوصیت اور انسانی تالیفات خصوصاً متاخرین کی کتب درسیہ سے اس کے اختلاف اور شان نزول کے متعلق چند لفظوں میں جو کچھ لکھا ہے،

آج اس میں ممکن ہے کوئی ندرت نہ معلوم ہو، لیکن بارہویں صدی میں یہ قطعاً نئے خیالات تھے اور آج بھی کتنے حلقوں میں یہ خیالات نامانوس ہیں۔

قرآن مجید نے جن فرقوں کی تردید کی ہے ان کے اصلی اور صحیح خیالات وعقائد اور کمزوریوں کا بیان انکی گمراہیوں اور غلط فہمیوں کے حقیقی اسباب اور ان کی تاریخ نفاق کی تشریح اور مسلمانوں کی بعض جماعتوں پر انکی تطبیق فہم قرآن کی اساس ہے، جو اختصار کے باوجود اس وضاحت کیساتھ کسی بڑی سے بڑی تفسیر میں نہیں ملتی۔

نسخ میں متقدمین ومتاخرین کے اصطلاحی فرق کی توضیح اور منسوخ وناسخ آیات میں تطبیق، صحابہ وتابعین کے تفسیری اختلافات کا حل شاہ صاحبؒ کی عمدہ تحقیقات میں سے ہے۔

نحو کے مشہور اور ظاہری قواعد کی بعض آیات سے بظاہر عدم مطابقت کی جو توجیہ شاہ صاحب نے کی ہے (ص۱۲۰ مجتبائی) اس کی قدر وہ لوگ کر سکتے ہیں جو نحو کی تدوین کی تاریخ سے واقف اور بصرہ اور کوفہ کے دبستان کے اختلافات پر نظر رکھتے ہیں۔

بہر حال اس کتاب کا ہمارے ہاتھوں میں ہونا خدا کی ایک نعمت اور اس کا ہمارے نصاب درس میں عام طور پر داخل نہ ہونا اس نعمت کی ناقدری، اور ناواقفیت یا بدمذاقی ہے۔

خلیفہ کے شرائط اور اس کے احکام پر اگرچہ جستہ جستہ چیزیں، فقہ اور علم کلام کی کتابوں میں ملتی ہیں مگر اسلام کے نظام حکومت کی تشریح اور خلافت عامہ اور خلافت خاصہ کی تقسیم اور ان کے جداگانہ اوصاف کا بیان، ازالۃ الخفا کے سوا کہیں نہیں، نیز قرآن سے خلافت راشدہ کے اثبات میں شاہ صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ان کے تفردات میں سے ہے۔

رسالہ انصاف اور حجۃ اللہ کے محدثانہ ابواب میں شاہ صاحب نے مذاہب کے اختلاف کے اسباب اور اسکی تاریخ کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ آن کی سلامت فہم، اصابت رائے اور دقت نظر نیز وسعت قلب کی بہترین دلیل ہے، اور اس طرز پر اس سے پہلے کسی عالم کی تحریر دیکھنے میں نہیں آئی۔

اس سبقت واولیت کے علاوہ اگر ہم شاہ صاحبؒ کی دوسری تصنیفی خصوصیات کو مختصر الفاظ میں بیان کریں تو وہ یہ ہونگی (۱) دقت نظر (۲) وسعت نظر (۳) سلامت فہم (۴) سلامت بیان، (۵) قوت انشاد تعبیر۔

ان میں سے ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ تشریح کرنے کے بجائے ہم شاہ صاحبؒ کی دو معرکۃ الآرا کتابوں (حجۃ اللہ البالغہ اور ازالۃ الخفا) پر تبصرہ کرتے ہیں ــــــ شاہ صاحبؒ کے مقام کے سمجھنے کے لئے ان دو کتابوں کا پڑھنا کافی ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ شاہ صاحب کی یہ مایۂ ناز تصنیف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان معجزات میں سے ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کے امتیوں کے ہاتھ پر ظاہر ہوئے، اور جن سے اپنے وقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اعجاز نمایاں اور اللہ کی حجت تمام ہوئی، بارہویں صدی کے کچھ بعد ہندوستان اور تمام اسلامی ممالک میں عقلیت کا جو دور شروع ہونیوالا تھا اور احکام و شرائع کے اسرار و مصالح کی جستجو کا جو عام ذوق پیدا ہونیوالا تھا، اسکا یہی اقتضا تھا کہ اس دور کے شروع ہونے سے پہلے بارہویں صدی کے امام کے قلم سے ایسی کتاب لکھوادی جائے۔ چنانچہ شاہ صاحب نے حجۃ اللہ کے دیباچہ میں ان غیبی اشارات اور بشارتوں کا ذکر کیا ہے جو اس خیال کی محرک ہوئیں۔ اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کام میں کسقدر غیبی تحریک و تائید شامل تھی۔

ہمارے علم میں کسی مذہب کی تائید، اس کی حکیمانہ توجیہ اور کسی مذہبی نظام کی فلسفیانہ تشریح میں کسی زمانہ میں ایسی کتاب نہیں لکھی گئی، یا اگر لکھی گئی تو دنیا کے سامنے نہیں، اسلام کے معاشی و سیاسی نظام پر بھی جابجا جو اشارات اور متفرق نکات ہیں انکو اگر ازالۃ الخفا اور دوسری تصنیفات کے اشارات و نکات کیساتھ جمع کر لیا جائے، تو وہ بڑے کام کی چیز ہوسکتی ہے اور تشریح و تفصیل کے لئے ایک اچھا متن بن سکتا ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں اس کتاب پر تبصرہ کرنا اور اس کے محاسن کو نمایاں کرنا بہت مشکل ہے پھر ہر شخص کا ذوق، نقطۂ نظر، اس کی مشکلات اور ان کے حل کی راہ جدا ہے اس لئے اپنے ذوق کے مطابق اس کتاب کے بعض ابواب پر ہم ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں۔

مبحث اول کے تمام ابواب تقریباً شاہ صاحبؒ کے تفردات میں سے ہیں، تکلیف و مجازات پر اعلیٰ متکلمانہ اور حکیمانہ بحث ہے جس سے بہت سے عقدے کھل جاتے ہیں، انسانوں کی صلاحیت و استعداد کے مدارج اور فطری تفاوت اور ملکیت و بہیمیت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے شاہ صاحب کی کمال نکتہ دانی اور نفسیات و طبائع انسانی کا وسیع اور عمیق مطالعہ معلوم ہوتا ہے۔

مبحث خامس میں دوسری مفید بحثوں کے علاوہ "معاصی و آثام" پر سیر حاصل بحث ہے۔

مبحث سادس اول سے لیکر آخر تک بے نظیر ہے اس مبحث کو پڑھکر شاہ صاحبؒ کی دقیقہ رسی کے ساتھ غایت درجہ کا سلامت فہم بھی معلوم ہوتا ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ صاحب مذاہب کی تاریخ اور طبائع و نفسیات ادیان" نیز تشریع اور قانون سازی کی باریکیوں پر کتنی گہری نظر رکھتے ہیں، یہ پورا باب مجتہدانہ اور حجۃ اللہ کے محاسن میں سے ہے۔

مبحث سابع میں جو مضامین و نکات آگئے ہیں، وہ عام طور پر اصول فقہ کی کتابوں میں نہیں ملسکتے اور

اس میں بعض حقائق ایسے آگئے ہیں، جو اصول و کلیات کا حکم رکھتے ہیں اور جن کے نہ جاننے کی وجہ سے بڑی بڑی غلط فہمیاں اور بے اعتدالیاں ہوتی ہیں۔

تتمہ جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں شاہ صاحب کی وسعت نظر اور وسعت قلب کی بہترین دلیل ہے اور اس سے شاہ صاحبؒ کا ذوق حدیث، کتب حدیث کی محبت اور مسلک اجتہاد معلوم ہوتا ہے جو ان کا اصل ذوق اور مسلک ہے۔

شاہ صاحبؒ کی عربیت اس موقع پر نامناسب نہ ہوگا اگر ہم شاہ صاحبؒ کے ایک اور امتیاز کی طرف بھی اشارہ کردیں جس میں شاہ صاحبؒ نہ صرف اپنے زمانہ میں بلکہ ہندوستان کی پوری اسلامی تاریخ میں منفرد ہیں، وہ شاہ صاحبؒ کی عربیت اور عربی میں قدرت تحریر ہے۔

اہل نظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں، کہ ہمارے ملک میں اسلام کے دوسرے مفتوحہ ممالک کی طرح کبھی بھی عربی کا صحیح اور اعلیٰ ذوق نہیں رہا، یہ نظری ذوق اگر کبھی رہا بھی ہو، تو اسمیں شبہ نہیں کہ تحریر میں عربیت اور قدرت بیان بہت نایاب رہی، اگر تاریخی جستجو کیجائے تو میر غلام علی آزاد بلگرامی اور بعض ایسے ہندوستانی مصنفین کو چھوڑ کر جن کی زندگی کا بڑا حصہ عربی ممالک اور عرب فضلا کی صحبت میں گزرا ایسے مصنفین کا ملنا مشکل ہو جن کی عربی تحریر، ادبی اسقام سے پاک، عربی ذوق کے مطابق اور سلیس و رواں ہو، نصاب درس کی مخصوص ساخت اور ہندوستان میں عربی نظم (متنبی و سبع معلقہ وحماسہ) کے نمونوں کی زیادتی اور خوبی کیوجہ سے ہندوستانی علماء کی نظم انکی عربی نثر سے کہیں بہتر ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ پہلے ہندوستانی مصنف ہیں جنکی عربی تصانیف (بالخصوص حجۃ اللہ البالغہ میں) اہل زبان کی سی روانی و قدرت اور ادباء عرب کی سی عربیت ہے اور وہ ان بے اعتدالیوں سے پاک ہیں جو عجمی علماء کی عربی تحریریں پائی جاتی ہیں۔

ہم ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہیں اور یہ کہنے کی جرأت کرتے ہیں کہ علمی اور سنجیدہ مضامین پر مقدمۂ ابن خلدون کے بعد حجۃ اللہ البالغہ عربی نثر و تحریر کا پہلا کامیاب نمونہ ہو۔ بلکہ بعض اہل ذوق کا خیال ہے کہ مقدمۂ ابن خلدون میں ادبیت اور حجۃ اللہ میں سلاست زیادہ ہے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ بارہویں صدی تک (بلکہ بعض مقامات پر اسوقت بھی) حریری کے مقامات عربی نثر کا واحد نمونہ تھا، مضامین و خیالات کے مقابلہ میں الفاظ اور محاسن لفظی کی ترجیح، قافیہ کی شدید پابندی، دائرہ خیال کی تنگی، مشکل و نامانوس اور پرشکوہ الفاظ کا استعمال اس طرز تحریر کی خصوصیات ہیں، اس طرز تحریر کی پیروی کیساتھ سنجیدہ وسیع علمی مضامین اور حکیمانہ خیالات کا اظہار بیحد مشکل ہے، تمام دنیا میں حریری ہی کا سکہ چلتا رہا۔ اور "مقامات"

دماغوں پر چھائے رہی، قاضی فاضل نے اپنی قابلیت اور منصب وزارت کی وجہ سے اس طرز کو اور مقبول بنا دیا
ابن خلدون پہلا شخص ہے جس نے اس لفظی طلسم کو توڑا اور ان پابندیوں سے آزاد ہو کر علمی تاریخی اور فلسفیانہ
مضامین کو جیتی جاگتی زبان میں ادا کیا۔
یہ ایک تاریخی حقیقت ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ ابن خلدون کے مقدمہ کے بعد پھر اگر کوئی
دوسری تصنیف اس طرز کی ملتی ہے تو اس طویل مدت میں صرف اسی ہندوستانی عالم کی تصنیف حجۃ اللہ البالغہ ہے۔
حدیث و فقہ کے مضامین کو سلیس عربی میں ادا کر دینا ایک عالم کے لئے بیشک کمال نہیں لیکن
حجۃ اللہ کا مبحث ثالث جس میں ارتفاقات کے ابواب ہیں ملاحظہ ہو، اسی طرح وہ دوسرے مضامین جس کے
لئے شاہ صاحب کے سامنے کوئی دوسرا قدیم نمونہ نہیں تھا، شاہ صاحب کے "نبوغ" اور عبقریت کی دلیل ہیں
ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء یہ شاہ صاحبؒ کی دوسری معرکۃ الآرا تصنیف ہے اور اپنی بہت سی خصوصیات کی
بنا پر اپنے موضوع پر غالباً پہلی اور یقیناً اس وقت تک آخری کتاب ہے، تمام کتاب وجد آفریں اور ولولہ انگیز
علمی اور ذوقی نکات سے لبریز ہے جس کا پورا اندازہ پوری کتاب پڑھنے سے ہوتا ہے، کوئی شخص بھی جو
اس کتاب کے مقصد اور مصنف کے مسلک سے اختلاف رکھتا ہے، اگر انصاف کیساتھ اس کتاب کے
. . . . اکثر حصہ کے
مطالعہ کی زحمت گوارا کرے تو اس کو خلفاء کی عظمت کا قائل ہو جانا پڑیگا۔
اس کتاب کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:-
(۱) اسلام میں صحابۂ کرام کا مقام، ان کے فضائل ان کے حقوق، اور اس کے متعلق مباحث
پر بے نظیر گفتگو اور افادات۔
(۲) خلفاء راشدین کی خلافت کا ثبوت قرآن مجید سے اس کتاب کی بہترین بحثوں میں سے ہے جو نکات
وحقائق سے لبریز ہے خصوصاً آیت تمکین، آیت استخلاف، آیت اذن قتال، آیت اعراب (قل للمخلفین
من الاعراب) آیات (محمد رسول اللہ والذین معہ) آیت (یریدون لیطفئوا نور اللہ) آیت شوری
(سورہ شوری، الازالہ ۲ ۱) آیت (او من کان میتاً فاحییناہ) (سورہ انعام) (ازالہ ۱ ۱) کی
جیسی تفسیر کی ہے اور اس کے ضمن میں قلم سے جو نکات و معارف نکل گئے ہیں، وہ کسی بڑی سی بڑی
تفسیر میں نہیں مل سکتے، خلفاء کے فضائل اور بشارات میں جو روایات ہیں، البتہ وہ کہیں کہیں تحقیق و تنقیح
کے قابل ہیں۔
(۳) نبی، خلیفہ، محدث اور صدیق کی تعریف ان کے اوصاف اور خلافت خاصہ کی تشریح

شاہ صاحب کا خاص موضوع اور اس کتاب کا خاص مضمون ہے۔

(۴) اس کتاب کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اسلام کی دینی تاریخ اور ذہنی و مذہبی انقلاب و تغیر کا ابھرا ہوا خاکہ ہے۔ اسلام کی سیاسی و علمی تاریخیں تو بے شمار ہیں لیکن ایسی تاریخ کہیں نہیں ملتی، کتابوں میں منتشر مواد ملتا ہے، اس کتاب میں بھی اس موضوع کے متعلق بہت سا مواد جمع کردیا ہے مثلاً اگر آپ جاننا چاہیں کہ دینی انحطاط تدریج کے ساتھ کسطرح ہوا اور اس کے مظاہر کیا تھے، کن کن چیزوں میں اصل معیار سے انحراف ہوا تو آپ "خیر القرون سے متصل اور اسکے بعد کے فتنے (از ص۱۲۲) خیر القرون اور شر القرون کے احکام کا اختلاف" (از ص۱۳۰) اور "تغیرات کلیہ" کی بحثوں میں دیکھ سکتے ہیں اور اس سے ایک تاریخ مرتب کرسکتے ہیں۔

(۵) عام حقائق و معارف جو ساری کتاب میں پھیلے ہوئے ہیں، خصوصاً کتاب کی فصل ہفتم میں جو پہلے حصہ کے صفحہ ۲۵۵ سے پہلے حصہ کے خاتمہ تک ہے۔

(۶) خلفاء راشدین، خصوصاً شیخین اور بالاخص حضرت فاروق اعظم کے ولولہ انگیز اور ایمان افروز تاریخی حالات اور سیرت جس میں بڑے استقصا سے کام لیا گیا ہے اور بڑی اچھی ترتیب اور موثر انداز میں انکو پیش کیا گیا ہے۔

امید ہے کہ اس مختصر سے تعارف اور تبصرہ سے شاہ صاحبؒ کا وہ مقام و مرتبہ واضح ہوجائیگا جو آپ کو اسلام کی علمی اور تصنیفی تاریخ میں حاصل ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شاہ صاحبؒ کا ایک علمی مآخذ

از

جناب مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی رفیق دارالمصنفین اعظم گڈھ

حضرت شاہ صاحب نے اپنے متعلق تفہیمات میں ارشاد فرمایا تھا :-

برسرم ورد دارد اندکہ ایں حقیقت بمردم برساں کہ امروز وقت وقت تست وزماں زماں تو ! وائے برکسے کہ زیر لوائے تو نہ باشد !	میرے ذہن میں ڈالا گیا ہے کہ میں آدمیوں تک اس حقیقت کو پہنچا دوں کہ یہ زمانہ تیرا زمانہ اور یہ وقت تیرا وقت ہے، افسوس اس پر جو تیرے علم کے نیچے نہ ہو !

یہ حقیقت جس طرح دنیا پر ظاہر ہو کر رہی وہ واقف کاروں سے پوشیدہ نہیں !

نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے بہت ہی سچ کہا تھا کہ اگر وجود او در صدر اول در زمانہ ماضی می بود امام الائمہ و تاج المجتہدین شمردہ می شد !	اگر شاہ صاحب صدر اول میں ہوتے تو امام الائمہ اور مجتہدوں کے سردار شمار ہوتے۔

حیرت ہوتی ہے کہ اس عہد میں ایسی جلیل القدر اور یگانۂ روزگار ہستی ہندوستان میں پیدا کیسے ہوئی جب کہ حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ کے الفاظ میں حال یہ تھا کہ

"مغلیہ سلطنت کا آفتاب لب بام تھا مسلمانوں میں رسوم و بدعات کا زور تھا جھوٹے فقراء اور مشائخ اپنے بزرگوں کی خانقاہوں میں مسندیں بچھائے اور اپنے بزرگوں کے مزاروں پر چراغ جلائے بیٹھے تھے، مدرسوں کا گوشہ گوشہ منطق و حکمت کے ہنگاموں سے پرشور تھا، فقہ و فتاوی کی لفظی پرستش ہر مفتی کے پیش نظر تھی مسائل فقہ میں تحقیق و تدقیق مذہب کا سب سے بڑا جرم تھا عوام تو عوام خواص تک قرآن پاک کے معانی و مطالب اور احادیث کے احکام و ارشادات اور فقہ کے اسرار و مصالح سے بے خبر تھے" (معارف نمبر ۵ جلد ۲۲)

اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہ صاحبؒ کا خاندان ہمیشہ سے علم و عمل کا مرکز رہا لیکن اصلاح و تجدید امت

اور فقہ دین کی جو دولت شاہ صاحب کے حصہ میں آئی اس کی کوئی نظیر نہیں،

شاہ صاحب کے ہندی اساتذہ میں آپ کے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب اور مولانا محمد افضل صاحب معروف بہ حاجی سیالکوٹی کے اسمار گرامی ملتے ہیں لیکن ان بزرگوں کے احوال میں بھی ہم کو کوئی ایسی نمایاں چیز نہیں ملتی ہے جس سے اندازہ ہو سکے کہ شاہ صاحب کے تجدیدی کارناموں میں ان کے اثرات کو کہاں تک دخل ہے ؟

اصل یہ ہے کہ شاہ صاحب کی تحریک اصلاح و تجدید بڑی حد تک مرہون منت ہے ان علوم معارف کی جو خدا کے فضل و کرم سے ان پر منکشف ہوئے جن کا بار بار وہ اپنی مصنفات میں ذکر فرماتے ہیں شریعت کے اسرار و حقائق کے اس انکشاف نے شاہ صاحبؒ کی دنیا بدل دی اور معاصرین تو درکنار وہ اپنے سلف و خلف دونوں سے بدرجہا بلند ہو گئے،

دوسری چیز جس نے شاہ صاحب میں بلند نظری اور عالی ہمتی پیدا کی، ہمارے نزدیک وہ اکابر علمائے اسلام کے خیالات اور اُن کی زندگیوں کا غیر متعصبانہ مطالعہ ہے !

یوں تو شاہ صاحب کے پیش نظر متعدد علمار کی تصانیف معلوم ہوتی ہیں مثلاً علامہ عزالدین ابن عبدالسلام امام غزالی اور شیخ ابو طالب مکی وغیرہ لیکن ان علمار میں ایک ایسی عالی مقام ہستی کی زندگی اور اس کے خیالات بھی شاہ صاحب کے سامنے رہے جو تاریخ اسلام میں اپنی خصوصیات کے باعث بہت ہی ممتاز اور اہم درجہ رکھتی ہے، جس کی ذات خود ایک عظیم الشان دعوت اصلاح و تجدید کا سبب بن چکی تھی اس سے ہماری مراد شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی ذات بابرکات ہے !

۱۱۴۳ھ میں شاہ صاحبؒ ہندوستان سے حجاز تشریف لے جاتے ہیں اور مشائخ حرمین سے استفادہ کرتے ہیں شاہ صاحب کے مشائخ حرمین میں شیخ ابراہیم کردی ایک بزرگ کا ذکر آتا ہے یہ وہی بزرگ ہیں جو شاہ صاحب کی نسبت فرمایا کرتے تھے کہ ولی اللہ الفاظ کی سند مجھ سے لیتے ہیں اور معنی کی سند میں اُن سے لیتا ہوں[1] ۔

شیخ ابراہیم کردی ایک بلند نظر اور وسیع المشرب عالم تھے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے قدر دان بلکہ زبردست حامی تھے !

ابن آلوسی بغدادی جلار العینین ص۲۶ میں ان کے متعلق لکھتے ہیں :-

وکان سلفی العقیدۃ ذابّاً عن شیخ الاسلام ابن تیمیۃ	سلفی العقیدہ اور ابن تیمیہ کی طرف سے دفاع کرنے والے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں کے فیض صحبت نے شاہ صاحب کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حافظ ابن

[1] شاہ صاحب کے استاذ ابو طاہر محمد بن ابراہیم کردی ہیں اور یہ مقولہ بھی انہی کا ہے غالباً محترم مقالہ نگار کو سہو ہوا ہے ۔ مدیر

قیم رحمہا اللہ کی کتابوں کی طرف متوجہ کیا! اور اس طرح انقلاب و تجدید کے ایک امام کا دوسرے امام سے روحانی رابطہ پیدا ہوا۔

شاہ صاحبؒ نے ان دونوں حضرات سے پورا نفع اٹھایا، بلکہ ان کی طرف سے پوری طرح دفاع بھی فرمایا۔ صاحب جلاء العینین تفہیمات کے حوالہ سے شاہ صاحب سے نقل کرتے ہیں :۔

وعلی هذا الاصل اعتقدنا فی شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فانا قد تحققنا من حالہ انہ عالم بکتاب اللہ ومعانیہ اللغویۃ والشرعیۃ وحافظ لسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وآثار السلف عارف لمعانیہما اللغویۃ والشرعیۃ استاذ فی النحو واللغۃ محرر لمذہب الحنابلۃ فروعہ واصولہ فائق فی الذکاء ولسان وبلاغۃ فی الذب عن عقیدۃ اھل السنۃ لم یؤثر عنہ فسق ولا بدعۃ اللھم الا ھذہ الامور التی ضیق علیہ لاجلھا ولیس شیٔ منھا الا ومعہ دلیلہ من الکتاب والسنۃ وآثار السلف فمثل ھذا الشیخ عزیز الوجود فی العالم ومن یطیق ان یلحق شاوہ فی تحریرہ وتقریرہ والذین ضیقوا علیہ ما بلغوا معشار ما آتاہ اللہ تعالیٰ وان کان تضییقہ ذالک ناشیاً من اجتہاد ومشاجرۃ العلماء فی ذالک ما ھی الا کمشاجرۃ الصحابۃ رضی اللہ عنہم فیما بینھم والواجب فی ذالک کف اللسان الا بخیر!

اسی اصل پر ہم نے ابن تیمیہ کے بارہ میں اعتقاد کیا، ہم نے ان کے حال کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ وہ کتاب وسنت کے عالم اس کے معانی سے واقف اور سنت رسول اللہ کے حافظ ہیں، نحو اور لغت کے امام ہیں حنابلہ کے اصول و فروع کے مبلغ ہیں اہل سنت کی طرف سے دفاع کرتے ہیں ان سے کسی قسم کا فسق یا بدعت ہم نے سرزد ہوتے نہیں دیکھا البتہ وہ امور جن کے متعلق ان پر اعتراض کیا گیا ہے تو ان میں سے کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کے متعلق ان کے پاس کتاب وسنت سے کوئی دلیل نہ ہو، ایسا عالم زمانہ میں مشکل سے پیدا ہوتا ہے، کون ہے جو ان کی تحریر و تقریر کا مقابلہ کر سکے؟ جن لوگوں نے ان پر اعتراض کیا ہے ان کو ان کے علم کا دسواں حصہ بھی نہیں ملا ہے! ہاں ان کے بارہ میں علماء کا مشاجرہ ایسا ہی ہے جیسے صحابہ کرام کا آپس میں، ضروری ہے کہ ان کے متعلق خیر کے سوا اپنی زبان بند رکھی جائے لہ (ملخصاً)

⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘

ان الفاظ پر غور کرو شاہ صاحبؒ۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی جلالت علم، نقد دین اور حمایت اسلام کے جوش و ولولے سے کیسے متاثر نظر آتے ہیں!

لہ تذکرہ شاہ ولی اللہؒ

شاہ صاحب کی مصنفات میں جا بجا شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے خیالات ملتے ہیں بعض جگہ تو پوری کی پوری عبارت نقل فرمادی ہے۔ لیکن نام نہیں لیا ہے' اس کی وجہ غالبًا اہل زمانہ کا تعصب ہے!

مثال کے طور حجۃ اللہ البالغہ مطبع صدیقی بریلی کی یہ عبارت ملاحظہ ہو (جلد ا صفحہ ۱۶۴)

وقد کان فی الصحابۃ ومن بعدھم من یقرء البسملۃ، ومنھم من لا یقرء وھا ومنھم من یجھر بھا ومنھم من لا یجھر بھا وکان منھم من یقنت فی الفجر ومنھم من یتوضأ من الحجامۃ والرعاف والقئ ومنھم من لا یتوضاء من ذالک ومنھم من یتوضاء من مس الذکر ومس النساء بشھوۃ ومنھم من لا یتوضاء من ذالک ومنھم من یتوضأ مما مستہ النار ومنھم من لا یتوضاء من ذالک ومنھم من یتوضاء من اکل لحم الابل ومنھم من لا یتوضاء من ذالک ومع ھذا فکان بعضھم یصلی خلف بعض مثل ما کان ابو حنیفۃ واصحابہ والشافعی وغیرھم رضی اللہ عنھم یصلون خلف ائمۃ المدینۃ من المالکیۃ وغیرھم وان کانوا لا یقرؤن البسملۃ لا سرًا ولا جھرًا، وصلی الرشید اماما وقد احتجم فصلی الامام ابو یوسف خلفہ ولم یعد وکان افتاہ الامام مالک بانہ لا وضوء علیہ وکان الامام احمد بن حنبل یری الوضوء من الرعاف والحجامۃ فقیل لہ فان کان الامام قد خرج منہ الدم ولم یتوضأ ھل تصلی خلفہ فقال کیف لا اصلی خلف الامام مالک وسعید بن المسیب۔

صحابہ اور ان کے بعد ایسے لوگ تھے کہ بعض بسم اللہ پڑھتے تھے بعض اس کو جہر سے پڑھتے تھے بعض نہیں' ان میں سے بعض فجر میں قنوت پڑھتے تھے بعض نہیں، بعض قی، اور رعاف سے وضو کرتے تھے بعض نہیں، بعض مس ذکر اور عورتوں کو شہوت کے ساتھ چھونے سے وضو کرتے تھے۔ بعض نہیں، ماستہ النار اور اونٹ کے گوشت سے بعض وضو کرتے تھے بعض نہیں، لیکن اس کے باوجود ان میں سے ہر شخص ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتا تھا مثلاً ابو حنیفہ اور اُن کے اصحاب اور امام شافعی وغیرہ ائمہ مدینہ مالکیہ وغیرہ کے پیچھے نماز پڑھتے تھے اگرچہ وہ لوگ سرًا یا جہرًا بسم اللہ نہیں پڑھتے تھے، رشید نے نماز پڑھائی اور اسکے اس نے پچھنا لگایا تھا امام ابو یوسف نے اسکے پیچھے نماز پڑھی' لوٹائی نہیں، امام مالک نے فتویٰ دیا تھا کہ ان پر وضو نہیں ہے اور امام احمد پچھنے اور رعاف کے باعث وضو کو کہتے تھے اُن سے کہا گیا کہ اگر امام کے خون نکلے اور وہ وضو نہ کرے تو کیا آپ اس کے پیچھے نماز پڑھیں گے فرمایا میں امام مالک اور سعید بن المسیب کے پیچھے نماز کیسے نہ پڑھونگا؟

بعینہ یہی عبارت شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے فتاویٰ جلد دوم صفحہ میں پائی جاتی ہے! ملاحظہ ہو:-

وقد كانت الصحابة والتابعون ومن بعدهم منهم من يقرء البسملة ومنهم من لا يقرؤها ومنهم من يجهر بها ومنهم من لا يجهر بها وكان منهم من يقنت في الفجر ومنهم من لا يقنت ومنهم من يتوضاء من الحجامة والرعاف والقئ ومنهم من لا يتوضاء من ذالك ومنهم من يتوضا من مس الذكر ومس النساء بشهوة ومنهم من لا يتوضاء من ذالك ومنهم من يتوضاء من القهقهة في صلاته ومنهم من لا يتوضاء من ذالك ومنهم من يتوضا من اكل لحم الابل ومنهم من لا يتوضاء من ذالك ومع هذا فكان بعضهم يصلي خلف بعض مثل ما كان ابوحنيفة واصحابه والشافعي وغيرهم يصلون خلف ائمة اهل المدينة من المالكية وان كانوا لا يقرؤن البسملة لا سرا ولا جهرا وصلى ابو يوسف خلف الرشيد وقد احتجم وافتاه مالك بانه لا يتوضاء فصلى خلفه ابو يوسف ولم يعد، وكان احمد بن حنبل يرى الوضوء من الحجامة والرعاف فقيل له فان كان الامام قد خرج منه الدم ولم يتوضاء تصلي خلفه فقال كيف لا اصلي خلف سعيد بن المسيب ومالك،

اسی طرح دیکھو شاہ صاحب فوز الکبیر میں سبب نزول کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:-

آنچہ از استقراء کلام صحابہ و تابعین معلوم می شود آں است کہ "نزلت فی کذا" محض برائے قصہ کہ در زمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بودہ وسبب نزول آیت گشتہ استعمال کنند، بلکہ گاہے یکے از ما "صدق علیہ" آیہ راکہ در زمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بودہ است یا بعد ازاں حضرت ذکر کنند وگویند نزلت فی کذا۔	صحابہ اور تابعین کے کلام کے استقراء سے معلوم ہوتا ہے کہ (نزلت فی کذا) محض اس واقعہ کے لئے نہیں ہے جو عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہوا اور نزول آیت کا سبب بن گیا۔ بلکہ اس پر بھی بولتے ہیں جس پر یہ آیت صادق آرہی ہو خواہ وہ واقعہ عہد نبوی میں ہو یا بعد کو۔

بالکل اسی مفہوم کو حافظ جلال الدین سیوطی اتقان میں ابن تیمیہ سے نقل کرتے ہیں،

قال ابن تیمیہ قولھم نزلت ھذہ الآیۃ فی کذا یراد بہ تارۃ سبب النزول ویراد بہ تارۃ ان ذالک داخل فی ھذہ الآیۃ وان لم یکن السبب کما تقول عنی بھذہ الآیۃ کذا النوع التاسع،	ابن تیمیہ نے کہا کہ ان لوگوں کا قول "نزلت ہذہ الآیۃ فی کذا" کبھی اس سے سبب نزول مراد ہوتا ہے اور کبھی اس سے یہ مراد ہوتا ہے کہ یہ بھی اس آیت کے مصداق میں داخل ہے اگرچہ وہ سبب نہ ہو۔

ان تصریحات کے بعد اگر ہم اس نتیجہ پر پہنچیں کہ شاہ صاحب کے علمی انقلاب میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے خیالات کو کسی حد تک ضرور دخل ہے تو شاید بے جا نہ ہو!

ـــ

لہ فی نسخۃ وقد کان فی الصحابۃ والتابعین ومن بعدھم من یقرء البسملۃ ۱۲

خطاب بروح پرفتوح

حقائق و معارف آگاہ امامنا و مولانا حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہٗ

(از جناب میر الفت صاحب کاظمی امروہوی)

اے اعلم عالمان نامی — وے افضل فاضلان سامی

اے شاہ ولی، ولی اللہ — وے شیخ و محدث گرامی

اے عارف عارفان ہندی — وے اشرف کاملان شامی

تو بحر حقائق و معارف — تو شہر تصوف و کلامی

در ناموران دہر نامت — در تاجوران سرّ انامی

در چشم اکارم و اعاظم — چون مردم دیدۂ گرامی

در حلقۂ اہل علم و عرفان — مہتاب ستی بذات سامی

در جلوہ گہ مہ حقیقت — چوں کبک روی بخوش خرامی

در حکمت وحدت و تصوف — خوش تقریری و خوش کلامی

در رسم شریعت و طریقت — گہ خامۂ تو نہ کرد خامی

در میدان الٰہیات — از فکر بلیغ خود جامی

در تفسیر کلام باری!! — با نطق کلیم در کلامی

در اسرار سیاست دین — تو ماہر و واقف تمامی

در منزل جمع و نظم امت — تو قائد اعظم و امامی

در سلسلۂ اتحاد انتظام است — با حبل متین خوش انتظامی

بر تست عیاں نہاں ز اسرار — با ہاتف غیب ہمکلامی

کشاف رموز علم و عرفان — لاریب بہ فطنت تمامی

تفہیمات الٰہیہ را — در دہر بفہم گرامی

ہاں سینۂ تست مشرق نور — شد پیک ازل بتو پیامی

ہاں وارث علم احمد ستی — از فیض رسول شاد کامی

صورت کشِ معنیٔ حقیقی — از وے بقلم بہ ارتسامی
تو ماحیٔ بدعت و ضلالت — تو شرع و طریق را است حامی
بہر گم گشتگانِ حیرت — مہدیٔ و مجددٍ و امامی
بر دوشِ تو پرچمِ ہدایت — بر فرقِ تو تاج نیکنامی
تصنیفاتِ تو بحرِ تحقیق — ہستی چہ محققِ گرامی
زیں نظمِ تو جامِ علم وادی — بیخود شدہ جامی و نظامی
پر نور زِ تو "جہان آباد" — در دورِ جہاں ہمہ تمامی
ہستی شہ دیں بملک دنیا — شاہی بہ تو نسبتِ غلامی
نام نیک تو در انام است — وابستہ شہرتِ دوامی
تو لائقِ صد ہزار تکریم — تو مستحقِ لک احترامی
کردی چو بعشق زندہ دل را — در عالم زندۂ دوامی!
کے فلسفی رتبہ ات شناسد — یعنی کہ بلند تر مقامی
دانند کہ عارفانِ خاصند — بینند بہ کمالِ تو چہ عامی
پرسد چو کسے زمن بگویم — اے خواجہ تو کیستی کدامی
لاریب مثال برزخ استی — ق — بے شبہ در آنچناں تمامی
کاں سو بخدائے خویش ہمراز — ویں سوئے بخلق ہمکلامی
در حال تو قال من نگنجد — تو کامل و ناقصم تمامی
نشناسد جز ولی، ولی را — تو زیر قبائے ربِّ سامی
اے آنکہ تو نائبِ رسولی — اے آنکہ تو ہادی و امامی
از فیضِ تو بہرہ ور جہانی — از فضل تو ملکِ ما گرامی
از مجلس ما برفت ساقی — مردیم بسوزِ تشنہ کامی
روح پاکت بما در آید — ہر چند کہ تو بلند بامی
شد چہرۂ ہند تیرہ و تار — از ظلمتِ بدعت و غلامی
کن محو زِ مہر حجتِ خویش — ایں سایۂ داغ نا تمامی
گاہے بہ افق توجہے کن — یا روحِ ولی بتو سلامی!

شاہ ولی اللہ صاحبؒ
اور
اُن کی بعض علمی خصوصیات

(از جناب مولانا سید ابو النظر صاحب رضوی امروہوی)

قدرت کے بہترین شاہکار، اور مجدد علم و حکمت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی علمی خصوصیات پر روشنی ڈالنے کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ نہ صرف مذہبی حقائق ہی کی مکمل تفسیر کی جائے گی بلکہ حیات و مرگ کا ہر عقدۂ علم و سیاست کا ہر گوشہ اور تمدن و معاشرت کی ہر پیچیدگی بھی حل کی جائے گی۔ لیکن آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس تشنگی کو دور کرنے کے لئے ایک مختصر سا مضمون کافی نہیں ہو سکتا اور بسیط تحقیقی مضمون[1] عام دلچسپیوں کو جذب نہ کر سکے گا اس لئے مجبور ہو کر صرف چند سیاسی نکات کے سلسلہ میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ امید کہ اسے دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے گا۔

آج کل آپ پاکستان کا ذکر بہت کچھ سُن رہے ہوں گے کیونکہ سیاسی مطلع پر آج یہی آفتاب چمک رہا ہے اور یہی سیاہ بادل فضار پر امنڈتا ہوا چلا آ رہا ہے — ہندوستان کے سیاسی ماحول کے اعتبار سے یہ چیز کہاں تک بہتر ہے اور کہاں تک نہیں میرے موضوع کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میں صرف شاہ صاحبؒ کا نقطۂ نظر ہی آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں اور تھوڑی بہت تفصیلات پیش کرتے ہوئے تاکہ آپ صحیح پوزیشن تک بآسانی پہنچ سکیں۔

شاہ صاحبؒ اپنی تصنیف تفہیمات الٰہیہ جلد اول صـ۲۰۳ پر تحریر فرماتے ہیں:-

واعلم ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اجتمعت فیہ خصلتان احدٰھما النبوۃ والثانیۃ	جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں دو قسم کے اخلاقی ملکات تھے ایک نبوت دوسرے قبیلہ قریش کی عظمت و

[1] میں نے اس ہی نقطۂ نظر سے ایک مضمون لکھا تھا اور شائع کرنے کے لئے روانہ بھی کر چکا تھا مگر یہ سمجھتے ہوئے واپس منگا لیا کہ غالباً اس درجہ دقیق علمی تحقیقات اور نازک ترین مجتہدات سے عام دلچسپی کو وابستہ نہ کیا جا سکیگا اگرچہ میرا طبعی اندازِ تحقیق اس ہی میں جھلکتا تھا مگر اس میں بھی شک نہیں کہ میری وہ محنت عام لوگوں کے لئے دلچسپی کا باعث نہ ہو سکتی تھی اس لئے اس سادگی پر اترنا پڑا جو پرکاری دوستوں نہ تھی وہ بھی میرا ہی گناہ تھا اور یہ بھی میرا ہی گناہ ہے اس لئے معذرت طلبی شاید نتیجہ خیز نہ ہو سکے گی —— ابو النظر رضوی

سعادة قريش بسببه فالنبوة عمت كل الاصناف الاحمر والاسود مستويان فيما يرجع الى الفيض الذى هو من باب النبوة ولذلك لما اقتضت المصلحة الكلية عموم سلطنة الترك الهمهم التدين بدين الاسلام ولما سعادة قريش نسبتها كانت خلافتهم الى زمان طويل

برتری۔ نبوت با ہر رنگ و نسل کے لئے یکساں تھی۔ اپنے عمومی فائدہ کے لحاظ سے یہی وجہ ہے کہ جب حکمت الٰہی نے بعض مصالح کے پیش نظر ترک قوم کو شہنشاہیت سپرد کرنا چاہی تو ان کے دل میں مذہب اسلام اختیار کرنے کی تڑپ پیدا کردی۔ لیکن قریش کی بزرگی کے سبب انکے درمیان بہت دنوں تک حکومت کا رہنا ہے۔

والذى اعتقده انه ان اتفق غلبة الهنود مثلاً على اقليم هندوستان غلبة مستقرة عامة وجب فى حكمة الله ان يلهم رؤساءهم التدين بدين الاسلام كما الهم الترك وذلك منشعب على عموم نبوته وانعقاد كونه صاحب ملته

وہ چیز جس پر میرا وجدان گواہی دیتا ہے یہ ہے کہ اگر کسی سیاسی انقلاب کا تقاضا یہ ہوا کہ ہندو ہندوستان یا اس کے ملحقات پر بھی حکومت کریں اور حکومت بھی مستقل اور ہمہ گیر قسم کی ہو تو یقیناً خدا کے قانون کا فیصلہ یہی ہوگا کہ ہندو لیڈر اسلام قبول کریں گے جیسے کہ ترکوں نے قبول کرلیا تھا کیونکہ عموم نبوت اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحب ملت ہونیکا نتیجہ یہی ہونا چاہیے

اس کے معنی جیسا کہ آپ سمجھ رہے ہوں گے اس کے سوا کچھ نہیں ہوسکتے کہ اگر سیاسی انقلاب کوئی ایسی کروٹ لیتا ہے جس میں ہندوستانی ہی ہندوستان پر حکومت کرسکتے ہوں تو مسلمانوں کو اکثریت و اقلیت کی ذہنی کشمکش قبول کرنے سے انکار کردینا چاہیے ہندوستان یا تو کسی نہ کسی شہنشاہیت کا غلام رہیگا ورنہ جمہوری حکومت قائم ہونیکی صورت میں ہندوستان کی فضاؤں میں اسلامی پرچم ہی لہرا سکتا ہے بالشویزم۔ نازی ازم یا ہندوازم کا پرچم نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آج ایک اشتراکی اپنے نصب العین کی صداقت پر اعتماد رکھتا ہے۔ اس ہی نظریہ کو معاشی زندگی کا آخری حل یقین کرتا ہے لیکن بدنصیب مسلمان ہی کو اس چیز پر ذرہ برابر ایمان نہیں کہ اسلام نے جو بہترین نظریۂ حیات کائنات انسانی کے لئے اختراع کیا تھا اور جس کے سوا کوئی دوسرا نظریہ فطرت انسانی کی تشنگی نہیں بجھا سکتا وہی عملی زندگی کی ہر گتھی کو سلجھا سکتا ہے سیاست و معاشرت کا کوئی پہلو سوقت تک درست نہیں ہوسکتا جب تک اسلام کے ناخن تدبیر سے عقدہ کشائی کا مطالبہ نہ کیا جائے گا اگر ضرورت ہے تو صرف اس بات کی کہ اسلام کے قانون حیات کو پوری روشنی میں لے آیا جائے آج ہر نظریہ اپنے قانونی دفعات کی تشریح کر رہا ہے مگر ایک اسلامی قانون ہی ایسا ہے جس کا معاشی، سیاسی اور تمدنی قانون موجودہ شعوری رجحانات کے سایہ میں دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا جا سکتا ورنہ اس کے کوئی معنی نہ تھے

کہ ہر نامکمل قانون اپنی تکمیل کا دعویٰ کر رہا ہو لیکن قدرت کا مکمل قانون ہی اپنی تشنگی کے لئے ہر سراب نظر کا محتاج ہو ا۔

آج آپ اکثریت کے زعم باطل سے کانپ رہے ہیں لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ہندوستان کو آزادی نصیب ہوتے ہی حسب ذیل حقائق سے اسلامی ہند کا دوچار ہونا قوانین فطرت کے ناقابل تبدیل فیصلوں میں سے ایک ہے۔

(۱) مسلمان کی وہ دولت اور وہ برتری جس کا نام تجارتی ذہنیت تھا دوبارہ دامن میں آجائے گی اور آپ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم کر سکتے ہیں کہ یہی وہ راز تھا جس نے ایک طرف مسلمان کو دنیا کے ہر گوشہ تک پہنچنے پر آمادہ کیا تھا اور دوسری طرف عام انسانی فطرت سے واقف کرتے ہوئے اخلاقی ملکات کے عملی فوائد سے بھی آشنا ۔ اور اسی بنا پر ہر مسلمان اپنی جگہ پر وسعت نظر کے ساتھ ایک بہترین مبلغ کے فرائض انجام دے سکتا تھا آج یہ دولت ہم سے غصب کر لی گئی ہے مگر جب ہماری وراثت ہمیں واپس مل جائیگی تو ہم اس ہی اسٹیج سے دنیا کو پیغام زندگی دے رہے ہوں گے۔ جہاں سے ہم ہمیشہ جرأت، رواداری، سچائی اور نیک عملیوں کا پیغام دیتے رہے تھے۔ آپ اس نکتہ کو معمولی سمجھئے تنہا یہی چیز مسلمانوں کو زمین سے آسمان تک اٹھانے کے قابل ہے۔ مسلمان اور اخلاقی شعور دونوں ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ مگر اقتصادی مجبوریوں نے اس کے ذہن و وجدان کو ماؤف کر دیا اور وہ اس قابل نہ رہا کہ خود اپنی ہستی ہی کو سنبھال سکے کجا یہ کہ دوسری قوموں کو دعوت عمل دے لیکن جب یہ کانٹا جو اس کی زندگی کے ہر پہلو میں کھٹک رہا ہے نکل جائے گا تو دنیا میں کونسی قوم ہے جو اس کی پاکیزہ اور بلند ترین ذہنیت کا مقابلہ کر سکے گی۔ کاش اسلامی فطرت کے نازک ترین محاسن اور مسلمانوں کی ماحولی کمزوریوں کا احساس ہمارے نوجوانوں کو ہوتا تو وہ کبھی کسی دوسرے نظریہ کے قدموں پر سجدہ کرنا گوارہ نہ کر سکتے تھے۔ مگر مجھے اس کا بھی کچھ خوف نہیں کیونکہ وقت کی وہ آواز جو ابھی دور سے آرہی ہے عنقریب خواب کے نشہ میں چور نوجوانوں کو چٹکیاں لے کر جگا دیگی اور پھر انھیں کوئی طاقت خواب گراں کی آلودگیوں سے دوبارہ تر دامن نہ کر سکے گی اور وہی ہماری عید کا پہلا دن اور ہماری تاریک شام کی تابناک صبح ہوگی۔

(۲) ہم غلامی کی بنیاد پر آج کوئی بین الاسلامی محاذ قائم نہیں کر سکتے مگر جب ہم اس قابل ہو جائیں گے تو ہماری طاقت ناقابل شکست اور ہمارا اقتدار ناقابل انکار حد تک پہنچ جائے گا۔ آپ شاید اس چیز سے پوری طرح واقف ہوں گے کہ ہمارے برادران وطن انفعالی ذہنیت رکھتے ہیں، ہر درخت، ہر دریا اور ہر آدم کے سامنے سجدہ کرنے والی قوم کیا آپ کے نزدیک مسلمانوں کی اخلاقی طاقت سے اثر پذیر ہوئے بغیر رہ سکتی ہے؟ پھر بین الاسلامی اتحاد سے ہمارے برادران وطن کو بین الاقوامیت کا صحیح مفہوم بھی سمجھنے میں آسانی ہو جائے گی اور ہندوؤں میں بین الاقوامی ذہنیت کا پیدا ہو جانا ہی ہندوستان میں اسلام کی پہلی اور آخری فتح ہوگی۔ چھوت چھات، مذاہب پر محققانہ نگاہ سے گریز، صدہا خدا بنا لینے کی بنا پر لامرکزی ذہنیت کا عذاب اور اس کی تاریک ترین پستی ان کو محسوس ہونے لگے گی اور وہ ہر لمحہ گزرنے پر اسلامی تعلیم، اسلام کی انقلابی تحریک اور اسلام کے ہر ذہنی ارتقا سے وابستہ ہوتے ہوئے آخر اس دعوتِ حق پیغام

الٰہی اور پائندہ درسِ حیات سے سبق لینے لگیں گے جسے ہماری اصطلاح میں اسلام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(۳) آج غلامی نے مسلمانوں کو علمی تحقیقات، اجتہادی نظریات اور انقلابی تحریکات سے جہاں تک بے بہرہ بنادیا ہے اس کا اندازہ آپ کو اسلامی قلعوں (مذہبی مدارس) اسلامی سوسائٹی بلکہ اسلامی ہند کے ہر گوشہ کی افیون خوردگی سے ہو سکتا ہے۔ نہ جدید علوم حاصل کرنے کا ذوق ہے، نہ جدید ذہنیت کے سانچہ میں قدیم نظریات کو ڈھال سکنے کی تمنا، مقلدانہ ذہنیت اجتہادی نظریات کو گوارا کرتی ہے نہ اسلام کے وسیع ترین نظامِ حیات کے ہر پہلو پر ریسرچ کرنے کا کوئی تصور زندگی کی لہر دوڑاتا ہے لیکن اگر ہندوستان آزاد ہو جائے تو یقین رکھئے کہ یہ ساری فضا یکسر تبدیل ہو جائے گی۔ ترقی کی امنگ تبلیغ کا ولولہ اور "خیرامت" ہونے کا یقین ان تمام کمزوریوں کو دور کر دے گا جن کے لئے آج کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آتی اور مسلمانوں کا یہی شعوری ارتقار نہ صرف مسلمانوں کو زندہ تر بنانے میں کامیاب ہوگا بلکہ ہماری ہمسایہ قوم کو بھی مطالعہ اور تنقید کی دعوت دے گا جس کی بنیاد پر وہ ایسی زندگی کی تعمیر کر سکیں گے جسے انقلاب اور تغیر کا کوئی زلزلہ اپنی جگہ سے جنبش نہ دے سکے گا۔

اس ہی نوع کے چند در چند اسباب و علل ہیں جو ہندوستان پر اسلامی حکومت کے پرچم کو لہرانے کے ذمہ دار کہلائے جا سکتے ہیں لیکن اس ہی کے ساتھ یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ یہ سب کچھ مکمل آزادی اور استقلال حکومت کے نتائج ہیں جن کو غلامی کے زمانے میں دہرانے سے کوئی خاص فائدہ مرتب نہیں ہو سکتا۔ دوسرے آپ کو تاریخ کے مطالعہ نے شاید یہ بھی بتا دیا ہو گا کہ ترک پہلے دفعہ ہی میں ایمان نہیں لے آئے تھے انھوں نے بھی مسلمانوں سے زبردست جنگ کی تھی۔ تاریخی تباہی سے آشنا کیا تھا، علم، دولت اور حکومت غصب کر سکنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی اگر مسلمان ان کا ہر سیاسی اور علمی محاذ پر مقابلہ کر سکنے کے قابل ہوتے اور اپنی مستقل زندگی کو قائم نہ رکھ سکتے تو ہرگز ترک قوم ردِّعمل کے قانون کا کوئی اثر قبول نہ کر سکتی ہے ہمارا یہ فرض ناقابلِ فراموش ہے کہ ہم تنازع للقوۃ کی جنگ میں کامیاب ہو سکنے کی طاقت اور زندہ رہ سکنے کی صلاحیت کا ثبوت دیتے رہیں ورنہ یہ ضروری نہیں کہ جو کچھ ترکستان میں ہوا وہ ہی ہندوستان میں بھی ہو۔ قدرت کا ہر کرشمہ گوناگوں استعدادات سے وابستہ ہے جب تک ہم زندہ رہ سکنے کی صلاحیت، سیاسی طاقت کی تقسیم باہمی تقسیم سے نہ پیدا کرتے رہیں گے نتائج ہمارے قابو میں نہیں آ سکتے۔ پاکستان کا جہاں تک آئینی نظریات سے تعلق ہے اس کو ایک بہترین لائحہ عمل کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ رہا پاکستانی اسکیم کا عملی نظریہ ہونا ہونا یہ ہر شعوری نظریہ کی طرح ایثار و قربانی کے جذبات اور قوم کے احساس خودداری پر موقوف ہے کیا اگر مسلمان مرکزی حکومت میں ناقابلِ انکار سیاسی اقتدار نہ قائم کر سکیں تو یہ قدرت کا ظلم یا اسکیم کا نقص نہیں بلکہ تغییر بالنفس کی دعوت قرآنی قبول نہ کرنے کا نتیجہ ہو گا۔

-- شاید یہ ایک سوال پیدا ہو کہ اگر ہر قوم کا مستقل حکومت تک پہنچکر مسلمان ہو جانا ضروری ہے تو مغربی اقوام عیسائیت سے اسلام کی طرف کیوں آج تک رجوع نہ ہو سکیں۔ اس لئے میں اختصار کو پیش نظر رکھتے ہوئے صرف اتنا بتا دینا چاہتا ہوں کہ قرآن نے ہمیں بتا دیا ہے کہ چونکہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ اور ان کے متبعین پر مظالم کئے تھے اس لئے خدا نے اس کا ردّ عمل عیسائیوں کے ہاتھوں سے ضروری قرار دیتے ہوئے یہ وعدہ کیا کہ عیسائیوں کی حکومت ہمیشہ رہے گی تاکہ اس ظالم قوم کو سکون و اطمینان کی زندگی سے ناآشنا ہونے دیا جا سکے اور چونکہ بقول شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے جیسا کہ انھوں نے تفہیمات الٰہیہ میں تصریح کی ہے کہ موجودہ عیسائیوں کے پاس حکومت صرف اس لئے ہے کہ خدا نے عیسائیوں سے حکومت کا وعدہ کیا تھا اور آج باوجود ہزار کمزوریوں کے اگر کسی گروہ کو عیسائی کہا جا سکتا ہے تو وہ یہی ہیں بنا بریں اس وعدہ کو پورا کرنے کے لئے اس ہی قوم کا انتخاب کرنا پڑا دوسرے مسلمان چونکہ عدل پرست فطرت پر پیدا کئے گئے تھے اس لئے وہ اس غرض کو پورا کرنے کے واسطے کسی طرح موزوں بھی نہ ہو سکتے تھے۔

شاہ صاحبؒ کا دوسرا سیاسی نظریہ آمریت اور ڈکٹیٹر شپ کے بارے میں ہے۔ اگرچہ آج تک قرآن کی آیات کو مغربی جمہوریت پر ہی چسپاں کیا جاتا رہا مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلامی آمریت مغربی آمریت سے ترقی یافتہ تھی یا یوں کہنا چاہیئے کہ آمریت اور جمہوریت دونوں کے درمیان ایک بہترین سیاسی محاکمہ تھا۔ شاہ صاحبؒ اپنی تصنیف البدور البازغہ میں ڈکٹیٹر کو "امام حق" سے تعبیر کرتے اور اجتماعی زندگی کا تنہا اس کو ہی ضامن قرار دیتے ہیں۔

تیسرے شاہ صاحبؒ تمام اسلامی طبقات کی اصلاح و تنظیم اور ان کی صنعتی ترقیات کو بھی نہایت اہم چیزوں میں سے شمار کرتے ہیں بلکہ ان کے مکاشفات کا جہاں تک تعلق ہے وہ اس انقلابی دور کے لئے صنعت و مزدپیشگی ہی کو "ملاء اعلیٰ" کی مرضیات بتاتے ہیں یعنی ہمارے زمانہ میں خواہ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کی جائے محنت پیشہ طبقات کی اہمیت کو کم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس زمانہ کے لئے خدا اور اسکے مرکزی قانون کا منشا یہ ہی ہے۔ افسوس ہے کہ عدیم الفرصتی کی بنا پر مذکورہ علمی نکات پر بھی سیر حاصل بحث نہیں کر سکتا کجا یہ کہ شاہ صاحب کی علمی خصوصیات پر کوئی مقالہ علم و تحقیق کے سایہ میں ترتیب دے سکنے کی کوشش کی جائے۔

باسمہ سبحانہ

عقیدت کے پھول

بدرگاہ شاہ ولی اللہ دہلوی

(از مولانا قاری عبد العزیز صاحب شوقی اسعدی انبالوی فاضل دیوبند)

اے شہ عالمانِ دیں شیخ جہانِ علم و فن — فخر گروہ اولیاء راس الائمہ زمن

شاہ و گدا سبھی کو تھا تیرا وجود رہنما — دہر میں ہر طرف ترا بحر کرم تھا موجزن

تیری زبانِ فیض سے غلغلہ ہائے معرفت — تا بجبل پہنچ گئے گونج اٹھا ہر ایک بن

ہند میں کسکو یاد تھا شغل حدیث مصطفٰے — درس نے تیرے کر دیا تازہ یہ جذبۂ کہن

آپ نے عام کر دیا فلسفہ دینِ پاک کا — آپ ہیں صدر بزم علم آپ ہیں میر انجمن

سارے علوم آپ کے گوشۂ چشم کے مطیع — زور عمل بھی آپ میں ہمرہِ قوتِ سخن

فوز کبیر آپ کے خیر کثیر کی دلیل — دہر میں آپ کا وجود حجتِ ربِّ ذو المنن

آپ کے گھر سے زندہ پھر ہو گئی سنت جہاد — نصرتِ حق میں آپ کا وقف تھا مال و جان و تن

برسرِ عام و برملا حکم خدا سنا دیا — دار کا خوف کچھ کیا نے غم بندش رسن

جذبۂ حریت کو بھی آپ نے زندہ کر دیا — اور سکھا دئے ہمیں عزتِ نفس کے چلن

بات وہ دل نشیں کہی غیر بھی جس پہ مر مٹا — تیرے کمال کے معترف ہیں سبھی شیخ و برہمن

جس کے جواب کے لئے دنگ ہے امتِ فرنگ — تو نے دیا ہے وہ ہمیں درس سیاستِ مدن

آپ جہاں سے کیا اٹھے رنگ جہاں بدل گیا — یعنی کہ بزم خاص کی بجھ گئی شمع ضو فگن

جو ترے در پہ آ گیا تشنہ لبی سے چھٹ گیا — چشمۂ فیض بن گیا اس کا ہر ایک موئے تن

پیدا ہوا نہ آج تک ہند میں ثانی آپ کا — یوں ہی گزر گئے تمام دہر کے روز و ماہ و سن

تیری صفت میں ہر زماں خامۂ شوقی ہے رواں — تیری ثنا میں تر زباں طائرِ وادی و چمن

در گہِ شاہ میں چند پھول لایا ہے شوقی ملول

پائیں جو رتبۂ قبول دل [illegible]

امام شاہ ولی اللہ اور حنفیت

(از جناب مولٰنا محمد یوسف صاحب فاضل بنوری استاذ جامعہ اسلامیہ رفیق مجلس علمی ڈابھیل ضلع سورت)
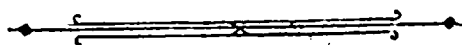
حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ سرزمین ہند کے ان اکابر میں سے ہیں جن کی نظیر نہ صرف اپنے عصر میں اور نہ صرف ہندوستان ہیں بلکہ بہت سے قرون اور ممالک اسلامیہ میں ڈھونڈھنے سے نہیں ملتی۔

حضرت موصوف بقول حضرت حجۃ الاسلام مولٰنا محمد قاسم نانوتوی بانی دار العلوم دیوبند ان افراد امت میں سے ہیں کہ سرزمین ہند میں اگر صرف شاہ ولی اللہ ہی پیدا ہوتے تو ہندوستان کے لئے یہ فخر کافی تھا۔

حضرت شاہ صاحب کی زندگی اور علمی وعملی کمالات کے اتنے گوشے ہیں کہ ہر ایک مستقل تصنیف کا محتاج ہے مثلاً حضرت ممدوح کی جامعیت اور تبحر، دقت نظر، ظاہری وباطنی علوم کا حیرت انگیز اجتماع، مکاشفات وکرامات تصنیف وتالیف، ترجمہ قرآن کی بنیاد، نصاب حدیث کی تاسیس، درس کی اصلاح، اسرار شریعت کی دلنشین اور موثر تشریح، کلام تصوف فلسفہ اخلاق اور نظام حکومت میں ان کے خاص خاص قابل قدر نظریات اصول تفسیر و اصول حدیث میں خاص خاص تحقیقات جہاد کا جوش، حکومت اسلامیہ کی خلافت راشدہ کے اصولوں پر تشکیل و تاسیس وغیرہ وغیرہ اتنے کمالات وخصائص ہیں جو اہل نظر وفکر کے لئے اور اہل دل واہل ذوق ارباب قلم کیلئے کافی جولانگاہ تحقیق وتدقیق ہیں ——— حضرت موصوف کیا تھے؟ خدائے تعالیٰ کی ایک حجت قاطعہ تھی جو بارہویں صدی میں ہندوستان میں ظاہر ہوئی میری بساط ہی کیا ہے کہ میں ارباب نظر کے لئے شاہ صاحب کے کمالات کے کسی شعبہ پر ایسا لکھ سکوں کہ حق ادا ہو سکے تاہم حصول سعادت کے لئے ایک موضوع پر کچھ اظہار رائے کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ عصر حاضر کے ذوق کے پیش نظر مجھے کوئی دلچسپ موضوع اختیار کرنا چاہیے تھا مگر مندرجہ ذیل امور نے مجھے عنوان مندرجہ بالا پر کچھ اظہار خیال کرنے کے لئے مجبور کیا۔

(۱) حنفیت حقیقت میں ایک شرعی نظام قانون ہے جس کو اصحاب درایت اور ائمہ مذہب نے نظام عالم کیلئے اعلیٰ ترین قانون سمجھا اور آخرت کے لئے ایک نافع ترین ذریعہ نجات ووسیلہ سعادت خیال کیا۔

(۲) ہند اور بیرون ہند کے مخالف تقلید حضرات نے حضرت شاہ ولی اللہ رح کو بھی امام ابن حزم ظاہری علامہ ابن القیم اور قاضی شوکانی کی طرح عدم تقلید کے لئے ایک رکن رکین سمجھا بلکہ تقلید اور بالخصوص حنفیت کا دشمن ظاہر کیا ہے

(۲) حضرت موصوف کی بعض تالیفات میں بعض ایسی عبارات بھی موجود ہیں جن سے ایک سطحی النظر شخص دیانت داری کے ساتھ حضرت شاہ صاحبؒ کے متعلق یہ رائے قائم کرسکتا ہے۔

اس موقع پر مناسب ہوتا کہ کچھ تفصیلی نظر اجتہاد و تقلید پر ڈال سکتا تاکہ کسی قدر واضح ہو جاتا کہ حضرت شاہ صاحب مجتہد تھے یا مقلد لیکن مضمون بہت طویل ہو جائے گا اس لئے اس کے متعلق چند اشارات ہی پر اکتفا کرتا ہوں اور وہ اشارات بھی نہایت مجمل ہوں گے، لیکن انشاء اللہ اہل علم کے لیے وہ کافی بھی ہوں گے:۔

۱۔ اگر قدما میں سے قاضی بکار اور امام طحاوی اور ابوبکر خصاف اور ابوبکر جصاص، قاضی ابوزید دبوسی شمس الائمہ سرخسی وغیرہ وغیرہ اور متاخرین میں سے امیر کاتب اتقانی، علاء الدین ماردینی، ابن الہمام، ابن امیر الحاج، قاسم بن قطلوبغا وغیرہ مقلد ابوحنیفہ ہو سکتے ہیں حالانکہ یہ حضرات بھی اپنے خصوصی مختارات رکھتے ہیں تو پھر حضرت شاہ صاحب کا انہی کی طرح حنفی ہونا کیوں مستبعد ہے۔

نیز جب کہ قاضی اسمٰعیل، حافظ ابن عبدالبر، قاضی ابوبکر بن عربی، حافظ اصیلی، ابن رشد کبیر مالکی ہو سکتے ہیں اور دارقطنی، بیہقی، خطابی۔ ابوالمعالی، امام الحرمین، غزالی، ابن عبدالسلام، ابن دقیق العید وغیرہ شافعی ہو سکتے ہیں اور علی ہذا جب کہ ابن جوزی، ابن قدامہ، ابن تیمیہ، ابن قیم وغیرہ حنبلی ہو سکتے ہیں، تو پھر اسی درجہ میں حضرت شاہ صاحب کو مقلد مذہب حنفی ماننے میں کیا اشکال ہو سکتا ہے۔

۲۔ اصولاً کسی امام صاحبِ مذہب کا متبع چند جزئی مسائل میں اگر اپنے امام کے خلاف رائے قائم کرے تو علماء امت میں اس کو اتباع و تقلید کے منافی نہیں سمجھا جاتا قریباً سب مذاہب کے علماء میں کثرت سے خاص خاص مسائل میں بہت سے اختیارات اپنے ائمہ کے خلاف ملتے ہیں۔

۳۔ پس اگر آپ نے تقلید کے وسیع حدود کو ان اشارات اور امثلہ سے کچھ سمجھ لیا ہے تو پھر حضرت شاہ صاحب کی عبارات و ملفوظات سے یہ سمجھنا آپ کے لیے آسان ہو جائے گا کہ حضرت ممدوح حنفی تھے یا غیر حنفی،

۴۔ اجتہاد و تقلید کے سمجھنے کے لیے، ایک حد تک حضرت شاہ صاحب کی تالیف "عقد الجید فی الاجتہاد والتقلید" عربی میں، اور اردو میں حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی کتاب "الاقتصاد فی التقلید والاجتہاد" اور شیخ الہند حضرت مولنا محمود حسن قدس سرہٗ کی کتاب ایضاح الادلہ کی دفعہ پنجم کافی وشافی ہیں۔

۵۔ ہر محدث کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ فقیہ بھی ہو جیسا کہ ہر فقیہ کا محدث ہونا ضروری نہیں نیز تفقہ کا مرحلہ تحدیث سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ اس کی وضاحت کے لئے مندرجہ ذیل دو واقعے پیش کرتا ہوں:۔

۱۔ حافظ حدیث ابوعمر بن عبدالبر مالکی اندلسی (المتوفی ۴۶۳ھ) اپنی کتاب "جامع بیان العلم" میں فرماتے ہیں کہ امام حدیث اعمش (سلیمان بن مہران) کی مجلس میں ایک شخص آیا اور اعمش سے کوئی مسئلہ دریافت کیا

آپ کوئی جواب نہ دے سکے دیکھا کہ امام ابوحنیفہ تشریف رکھتے ہیں فرمایا کہ کہیے نعمان! کیا ہے جواب ؟ امام ابوحنیفہ نے فوراً جواب دیا' امام اعمش نے پوچھا کہ ابوحنیفہ! تم نے کہاں سے یہ جواب دیا ابوحنیفہ نے فرمایا کہ آپ ہی نے تو مجھ سے فلاں حدیث اپنی سند سے بیان کی تھی اسی سے یہ مسئلہ اس طرح نکلتا ہے الخ امام اعمش یہ دیکھ کر بے ساختہ فرمانے لگے:-

نحن الصیادلة وانتم الأطباء (۱) ہم تو عطار ہیں طبیب تو آپ لوگ ہیں۔

نیز امام ابن عبدالبر اسی کتاب میں نقل فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ اعمش نے امام ابو یوسف سے ایک مسئلہ دریافت فرمایا ابو یوسف نے جواب دیا آپ نے فرمایا یعقوب! (امام ابو یوسف کا نام ہے) تم نے یہ کہاں سے کہا؟ فرمایا اس فلاں حدیث سے جو آپ نے ہی مجھ سے بیان فرمائی ہے۔ اعمش فرمانے لگے:-

یا یعقوب انی لاحفظ هذا الحدیث من قبل ان یجتمع ابواك ما عرفت تاویله الی الآن (۲)

یعقوب! یہ حدیث تو مجھے اس وقت سے یاد ہے کہ آپ کے والدین جمع بھی نہ ہوئے ہوں گے لیکن آج تک مجھے اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

اور یہ اعمش وہ جلیل القدر امام ہیں جن کے متعلق امام بخاری کے استاذ علی بن المدینی فرماتے ہیں:-

حفظ العلم علی امة محمد صلی الله علیه وسلم ستة عمرو بن دینار بمکة والزهری بالمدینة وابو اسحاق السبیعی والاعمش بالکوفة وقتادة ویحیی بن ابی کثیر بالبصرة (۳)

امت محمدیہ کے لئے چھ محدثوں نے علم محفوظ کیا عمرو بن دینار نے مکہ میں زہری نے مدینہ میں اور ابو اسحاق و اعمش نے کوفہ میں اور قتادہ و یحیی بن ابی کثیر نے بصرہ میں

۲- امام حدیث ابو محمد رامہرمزی اپنی کتاب "المحدث الفاصل" میں فرماتے ہیں:-

عن انس بن سیرین اتیت الکوفة فرأیت فیها اربعة آلاف یطلبون الحدیث واربعمائة قد فقهوا اھ (۴)

انس بن سیرین فرماتے ہیں کہ میں کوفہ آیا تو مشتغلین بالحدیث چار ہزار پائے اور فقہ صرف چار سو کو آیا تھا۔

اب تو شاید ہر منصف کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ فقہ کتنی مشکل چیز ہے اور صرف محدث بننے سے فقیہ نہیں بن سکتا اس قسم کے سیکڑوں نہیں ہزاروں واقعات سے اسلام کا علمی ذخیرہ بھرا پڑا ہے اس تمہید کے بعد میں اصلی مقصد کیطرف آرہا ہوں

(۱) مختصر جامع بیان العلم ص ۱۸۲
(۲) مختصر جامع بیان العلم ص ۱۶۲
(۳) تہذیب التہذیب لابن حجر ص ۲۲۳
(۴) مقدمہ نصب الرایہ ص ۲۵ مطبوعہ مجلس علمی ڈابھیل ضلع سورت

حضرت شاہ صاحبؒ کا مسلک انکی تالیفات کی روشنی میں

(۱) تفہیمات الہیہ ص۲۰۷ و ص۲۰۹ ج ۱ میں فرماتے ہیں[1]:

ان تشعب الدین طرقا ومذاهب وکون الامۃ فیها احزابا متحزبۃ...... امر عظیم هال خاصتهم وعامتهم فمن اهل الله من کشف له عن ارتباط کل قول نطق به فقیه من فقهاء الاسلام بالشریعۃ المحمدیۃ علی صاحبها الصلوات والتسلیمات ولم یکشف له عن الجادۃ القویمۃ التی اقامها الله تعالیٰ لعباده ورضی لهم......... فسکت عن ترجیح بعض الاقوال علی بعض وحمل اختلافها علی العزیمۃ والرخصۃ

ومن اهل الله من یتراءی له الجادۃ القویمۃ التی تؤدی الی ظاهر الشریعۃ والتی توارثها جماهیر المسلمین عن جهابذۃ التابعین عن کبار الصحابۃ والتابعین عن النبی صلی الله علیه وسلم کالتناول بالید ولم یتوارثوا عین ذلک ولکنه اشبه شیء بما توارثوه.......

فرأی المتکلم فی ترجیح الراجح نصرۃ الدین وذبا عنه کاکثر الفقهاء والمحدثین فانهم قد بالغوا فیه

ومن اهل الله من کشف له عن الامرین فسلمهما کلیهما علی معنی انهما من دائرۃ الشرع وان المتعبد بهما فی فسحۃ من دینه متدین لله تعالیٰ معذور عند غیره وان الفضل للجادۃ القویمۃ وهی المرضیۃ عند الله تعالیٰ کل الرضا......

ومن اعظم نعم الله تعالیٰ علیّ ان جعلنی من الحزب الثالث وکشف لی عن اصل الشریعۃ وعن تبیانها الحاصل علی لسان النبی صلی الله علیه وسلم ثم عن تبیان تبیانها الحاصل علی السنۃ الصحابۃ والتابعین ثم عن ایضاحها وتدوین اصولها وفروعها الحاصل علی ایدی المجتهدین المتقدمین ثم عن شرح مذاهبهم وتاویلهم والتخریج علی قواعدهم الحاصل علی ایدی المتاخرین من الفقهاء فی کل مذهب فکشف لی عن کل ذلک بترتیبه الواقع فی نفس الامر...... فرأیت کل قول قیل فی الدین مرتبطا باصل الشریعۃ بواسطۃ او بغیر واسطۃ۔

[1] الفرقان: چونکہ مضمون خالص علمی ہے اور صرف اہل علم ہی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں اور وہی اس کے مخاطب بھی ہیں اس لئے شاہ صاحب کی عبارات کے تراجم درج کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی اور جتنا حصہ اس کا عام فہم ہو سکتا ہے وہ مولانا خیر محمد صاحب کے اس مضمون میں آگیا ہے جو اس مضمون کے بعد متصلاً درج ہے ۱۲ ۔ نعمانی غفرلہ

پھر ص۱۵۲ ج اول میں فرماتے ہیں۔

(۲) فکان من اعظم نعم اللہ تعالیٰ ان کشف لی عن حقیقۃ حال المذاہب وحال المتقید ببعضہا وحال من اراد الانتقال الی مذہب بعد ما کان متقیدا بمذہب آخر وحال من اخذ فی بعض المسائل بمذہب و فی البعض الآخر بمذہب آخر، وھل خیر الشارع او الزم کل واحد ان یلتزم مذہبا واحدا۔

پھر ص۱۵۳ ج ۱ میں فرماتے ہیں:۔

(۳) وکشف لی ان الاختلاف علی اربعۃ منازل: اختلاف مردود ولیس لقائلہ ولمقلدہ من بعدہ عذر وھذا قلیل الوجود فی المذاہب الاربعۃ المدونۃ، واختلاف لقائلہ عذر مالم یبلغہ حدیث صحیح دال علی خلافہ فاذا بلغہ فلا عذر لہ، واختلاف مقبول قد خیرا لشارع المکلفین فی طرفیہ تخییرا ظاہرا مطلقا کالاحرف السبعۃ من القرآن واختلاف ادرکنا کون طرفیہ مقبولین اجتہادا واستنباطا من بعض کلام الشارع صلوات اللہ وسلامہ علیہ والانسان مکلف بہ لا مطلقا بل یشترط الاجتہاد وتاکد الظن وتقلید من حصل لہ ذلک

اور فیوض الحرمین ص۶۲ میں فرماتے ہیں:۔

(۴) سألتہ صلی اللہ علیہ وسلم سوالا روحانیا فنفخ الیّ نفخۃ ...... ونفخ نفخۃ اخری فتبین ان مراد الحق فیک ان یجمع شملا من شمل الامۃ المرحومۃ بک، فایاک ان تخالف القوم فی الفروع فانہ مناقضۃ لمراد الحق ثم کشف انموذجا ظہر لی منہ کیفیۃ تطبیق السنۃ بفقہ الحنفیۃ من الاخذ بقول احد الثلاثۃ وتخصیص عموماتہم والوقوف علی مقاصدہم والاقتصار علی ما یفہم من لفظ السنۃ ولیس فیہ تاویل بعید ولا ضرب بعض الاحادیث بعضا ولا رفض الحدیث صحیح بقول احد من الامۃ وھذہ الطریقۃ ان اتمہا اللہ واکملہا فہی الکبریت الاحمر والاکسیر الاعظم اھ

پھر ص۴۸ میں فرماتے ہیں:۔

(۵) عرفنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان فی المذہب الحنفی طریقۃ انیقۃ ھی اوفق الطرق بالسنۃ المعروفۃ التی جمعت ونقحت فی زمان البخاری واصحابہ وذلک ان یوخذ من اقوال الثلاثۃ قول اقربہم بہا فی المسألۃ ثم بعد ذلک یتبع اختیارات الفقہاء الحنفیین

الذین کانوا من علماء الحدیث (۱) فرب شئ سکت عنہ الثلاثۃ فی الاصول وما تعرضوا النفیہ ودلت الاحادیث علیہ فلیس بد من اثباتہ والکل مذھب حنفی اھ

پھر ص۹۵ میں فرماتے ہیں:۔

(۶) واستفدت منہ صلی اللہ علیہ وسلم ثلاثۃ امور خلاف ما کان عندی..........

وثانیہا الوصاۃ بالتقید بھذہ المذاھب الاربعۃ لا اخرج منہا، والتوفیق ما استطعت وجبلتی تأبی التقلید وتأنف منہ رأسا لکن شئ طلب منی التعبد بہ بخلاف نفسی اھ

پھر اسی کے ص۱۰۱ میں فرماتے ہیں:۔

(۷) اعلم ان الملل والمذاھب توصف بالحقیۃ بالمعنیین احدھما جلی والآخر دقیق یری من بعد ...... وکذلک معنی حقیۃ المذھب ان یکون احکامہ مطابقۃ لما قالہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی نفس الامر ولما کان القرون المشھود لہا بالخیر وان کانت المسألۃ لا نص فیہا ولا روایۃ محققیتہا ان تکون محفوفۃ بقرائن تورث غالب الظن بان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لو تکلم فی المسألۃ لما نطق بغیر ھذا ...... وکذلک المذھب ربما یکون العنایۃ المتوجہۃ الی حفظ ملۃ حقۃ متوجہۃ الی حفظ مذھب خاص بأن یکون حفظۃ المذھب یومئذ ھم القائمون بالذب عن الملۃ وھذا المعنی الدقیق لا یوقف علیہ الا بالنور النبوی ..... فنقول ترای لی ان فی المذھب الحنفی سرا غامضا ثم لم ازل اتحدق فی ھذا السر لغامض حتی شاھدت ان لھذا المذھب یومنا ھذا رجحانا علی سائر المذاھب بحسب ھذا المعنی الدقیق اھ

اور حجۃ اللہ ص۱۵۱ ج۱ میں فرماتے ہیں:۔

(۸) ومما یناسب ھذا المقام التنبیہ علی مسائل ضلت فی بوادیہا الافہام وزلت الاقدام وطغت الاقلام منہا ان ھذہ المذاھب الاربعۃ المدونۃ المحررۃ قد اجتمعت الامۃ او من یعتد بہ منہا علی جواز تقلیدھا الی یومنا ھذا وفی ذلک کلہ من المصالح ما لا یخفی لاسیما فی ھذہ الایام التی قصرت فیہا الھمم جدا واشربت النفوس الھوی واعجب کل ذی رأی برأیہ فما ذھب الیہ ابن حزم حیث قال التقلید حرام ولا یحل لاحد ان یاخذ قول احد غیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلا برھان .... انما یتم فیمن لہ ضرب من الاجتہاد ولو فی مسألۃ واحدۃ وفیمن ظہر علیہ ظہورا بینا ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم امر بکذا ونہی عن کذا وانہ لیس بمنسوخ الخ

(۱) فیوض الحرمین کے ایک قلمی نسخہ میں جو کہ مسلم یونیورسٹی کی نسخہ کتب خانہ میں ہے یہاں پر اتنی زیادت موجود ہے کہا بحافظۃ ابی جعفر الطحاوی رحمۃ اللہ غفرلہ

نیز عقد الجید میں صلا سے لے کر ۲ ورتک اسی مضمون کو نہایت وضاحت و تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

اور حجۃ اللہ ص۱۵۶ ج ۱ میں فرماتے ہیں:۔

(۹) ومنها ان التخریج علی کلام الفقهاء وتتبع لفظ الحدیث لکل منهما اصل اصیل فی الدین ولم یزل المحققون من العلماء فی کل عصر یأخذون بهما فمنهم من یقل من ذا ویکثر من ذاک ۔ ۔ ۔ فلا ینبغی ان یهمل امر واحد منهما ۔ ۔ ۔ وانما الحق البحت ان یطابق احدهما بالآخر ۔ ۔ ۔ اھ

اور تفہیمات الٰہیہ ص۲۰۲ ج ثانی میں فرماتے ہیں:۔

(۱۰) ونحن نأخذ من الفروع ما اتفق علیه العلماء لا سیما هاتان الفرقتان العظیمتان الحنفیة والشافعیة وخصوصاً فی الطهارة والصلاة فان لم یتیسر الاتفاق واختلفوا نأخذ بما یشهد له ظاهر الحدیث ومعروفه ونحن لا نزدری احداً من العلماء فالکل طالب الحق ولا نعتقد العصمة فی احد غیر النبی صلی الله علیه وسلم الخ

اور تفہیمات الٰہیہ ص۲۰۲ ج ۲ میں فرماتے ہیں:۔

(۱۱) لیس منا من امر یتدبر کتاب الله ولم یتفهم حدیث نبیه صلی الله علیه وسلم، لیس منا من ترک ملازمة العلماء اعنی الصوفیة الذین لهم حظ من الکتاب والسنة او الراسخین فی العلم الذین لهم حظ من التصوف، او المحدثین الذین لهم حظ من الحدیث او الفقهاء الذین لهم حظ من الفقه اھ

نیز تفہیمات ص۲۴۲ ج ۲ میں ایک وصیت کے ذیل میں فرماتے ہیں:۔

(۱۲) ودر فروع پیروی علماء محدثین کہ جامع باشند میان فقہ و حدیث کردن و دائماً تفریعات فقہیہ برکتاب و سنت عرض نمودن آنچہ موافق باشد در حیز قبول آوردن والا کالائے بدریش خاوند دادن الخ

نیز اسی تفہیمات ص۱۱ ج ۲ میں فرماتے ہیں:۔

(۱۳) فاذا رفع الیه قضیة فله ان یجتهد فیها برأیه ویتحری الصواب فان کان قد سبق فیها حکم لجماعة فعلیه ان لا یجاوزه وهی القیاس والاجماع الخ

(فائدہ) اس عبارت سے ایک خاص بات یہ معلوم ہوئی کہ حضرت شاہ صاحب کے نزدیک جو اہل اجتہاد بھی ہو اگر اس کے سامنے بھی کوئی ایسا نیا قضیہ پیش کیا جائے کہ علماء سابقین کا اس کے متعلق کوئی حکم موجود ہو تو اس سے تجاوز نہ کرے۔

نیز اسی صفحہ میں فرماتے ہیں ــــ واذا تحمل رجل امرا ووافق ظنک فلا تجاوزه عنه وهو الاجماع دلیلاً ظنیاً

ولا قیاس ولا اجماع فی ما سوی ذلک"۔

اور اسی تفہیمات کے ص۲۱۵ ج ا میں فرماتے ہیں:۔

(۱۵) "وان قصرت افہامکم فاستعینوا برأی من مضی من العلماء ما ترو ہ احق واصرح واوفق بالسنۃ" اور حجۃ اللہ البالغۃ ج۱ میں حضرت شاہ صاحب اپنے مسلک کی وضاحت مندرجہ ذیل الفاظ میں فرماتے ہیں:

(۱۶) "وھا انا بریٔ من کل مقالۃ صدرت مخالفۃ لآیۃ من کتاب اللہ او سنۃ قائمۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم او اجماع القرون المشہود لھا بالخیر او ما اختارہ جمہور المجتہدین ومعظم سواد المسلمین فان وقع شیٔ فانہ خطأ رحم اللہ من ایقظنا من سنتنا او نبھنا من غفلتنا، اما ھولاء الباحثون بالتخریج والاستنباط من کلام الاوائل المنتحلون مذھب المناظرۃ والمجادلۃ فلا یجب علینا ان نوافقھم فی کل ما یتفوھون بہ ونحن رجال وھم رجال والامر بیننا وبینھم سجال اھ"۔

ان تمام مذکورہ اقتباسات سے بآسانی ہم عموی طور پر حسب ذیل نتائج اخذ کر سکتے ہیں:۔

۱۔ مذاہب اربعہ کی تقلید کرنا چاہیے بالخصوص شر و فساد کے اس دور اتباع ہوی کے اس زمانہ میں اس شخص کے لئے جو براہ راست کتاب وسنت سے استنباط نہ کر سکتا ہو ان مذاہب کی تقلید میں بہت سی مصالح ہیں۔

۲۔ کسی فقہی قیاسی مسالہ میں اگر سلف کا کوئی قول موجود ہو اور اس کے علم میں کسی صحیح حدیث سے مخالف نہ ہو تو اسے ماننا ضروری ہوگا۔

۳۔ اگر ائمہ کے اقوال یا کسی ایک امام کے اقوال میں اختلاف ہو تو جو مسلک کتاب وسنت سے زیادہ قریب ہو اس کو اختیار کرنا چاہیے۔

۴۔ مذاہب اربعہ میں بہت کم ایسا کوئی مسالہ ملے گا جس کی کوئی دلیل موجود نہ ہو یا اس کے قائل یا اس کے مقلد کو معذور نہ سمجھ سکیں۔

۵۔ غور سے یہی معلوم ہوا کہ حنفی مذہب آج کل باقی مذاہب سے زیادہ بہتر ہے۔

۶۔ حنفی مذہب کی تقلید میں بہترین طریقہ یہ ہے کہ ابو حنیفہ ابو یوسف محمد بن الحسن تینوں ائمہ کے اقوال میں سے اس کو لیا جائے جو حدیث سے زیادہ قریب ہو اور یہ مذہب حنفی کی تقلید کے مخالف نہیں ہے۔

۷۔ صرف حدیث ہی پر قناعت کر کے فقہ سے بے بہرہ رہنا یا صرف فقہ پر کفایت کر کے حدیث سے محروم رہنا یہ غلو ہے افراط و تفریط ہے جو درست نہیں دونوں کو ملانا اور ان میں تطبیق دینا ضروری ہے اور یہی بہترین طریقہ ہے۔

۸۔ کسی دلیل قوی کی وجہ سے اگر کوئی مقلد اپنے امام کا مسلک چند مسائل میں ترک کر دے تو یہ تقلید کے

منافی نہیں -

۹- اگر کوئی مسألہ فقہ حنفی کی کتب ظاہر الروایۃ میں موجود نہ ہو اور حدیث میں مذکور ہے تو اس کو ضرور لینا ہوگا اور یہ مذہب حنفی کی تقلید کے خلاف نہ ہوگا -

ایک مثال سے اسکی وضاحت چنانچہ شاہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ صلالح ۲ میں فرماتے ہیں:-

"ومن قال مذہب ابی حنیفۃ رحمہ اللہ ترک الاشارۃ بالمسبحۃ فقد اخطا ولا یعضدہ روایۃ ولا درایۃ قالہ ابن الھمام نعم لم یذکرہ محمد فی الاصل وذکرہ فی المؤطا ووجدت بعضھم لا یمیز بین قولنا: لیست الاشارۃ فی ظاھر المذھب وقولنا ظاھر المذھب انھا لیست"

یعنی جس شخص نے یہ کہا کہ ابو حنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ تشہد میں اشارہ بالسبابہ نہ کرنا چاہیے، اس نے غلطی کی کیونکہ یہ عقل ونقل دونوں کے خلاف ہے جیسا کہ ابن الہمام نے فرمایا: ہاں امام محمد نے اس مسئلہ کو مبسوط میں ذکر نہیں کیا (جو ظاہر الروایۃ کی کتابوں میں سے ہے) لیکن موطا میں اس کو ذکر فرمایا، اور دیکھتا ہوں کہ بعض لوگ فقہا کی ان دو تعبیروں میں فرق نہیں کرسکتے -

(۱) اشارہ ظاہر مذہب میں نہیں - (۲) ظاہر مذہب یہ ہو کہ اشارہ نہیں -

حضرت شاہ صاحب کا مسلک یہ تو شاہ صاحب کی مذکورہ بالا عبارات کے عمومی نتائج یا آپ کے نظریات تھے ان کے علاوہ انہی اقتباسات سے ہم حضرت شاہ صاحب کے مسلک کے بارے میں خصوصی طور پر مندرجہ ذیل نتائج پر بھی پہنچتے ہیں :-

۱- ائمہ اربعہ کے اختلافات کے بارے میں آپ کی پوری تشفی ہوگئی ہے اور اس کا صحیح منشا بھی سمجھ گئے ہیں -

۲- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو وصیت فرمائی ہے کہ مذاہب اربعہ کے دائرے سے باہر نہ نکلیں اور جہاں تک ممکن ہو ان میں تطبیق دیں -

۳- آپ کو اپنے طبعی رجحان یا میلان کے خلاف ان مذاہب کی تقلید پر مامور کیا گیا -

۴- آپ کو حکم دیا گیا کہ فروعی مسائل میں بھی "حنفیہ" کے خلاف نہ کریں جب تک صراحۃً کسی حدیث کی مخالفت نہ ہو

۵- اللہ تعالیٰ نے آپ کو اتنے علم وفہم سے نوازا جس کے ذریعہ ہندوستان میں رائج حنفیت کی اصلاح کرسکیں عام حنفی علمار کے غلو سے جو اس کے حقیقی خد وخال چھپ گئے ہیں اس کو واضح کرسکیں -

۶- حنفیہ اور شافعیہ جس پر متفق ہوں اس پر آپ ضرور عمل کرتے ہیں اگر ان میں اختلاف ہو تو اس جانب کو اختیار کرتے ہیں جس کی تائید حدیث سے ہوتی ہو -

۷- آپ مجتہدین امت کی اتباع ضرور کرتے ہیں متاخرین کی تخریجات جو وہ قدما کے کلام سے کرتے ہیں یہ ضروری نہیں کہ

اسے بھی آپ قبول کریں۔

ان نتائج میں غور کرنے سے یہی معلوم ہوا کہ حضرت شاہ صاحب ایک فقیہ النفس حنفی محدث ہیں اور ان فقہا محدثین کے زمرے میں ہیں جو قوی وضعیف، صحیح وغلط اور راجح ومرجوح میں پوری بصیرت کے ساتھ فیصلہ کر سکتے ہیں یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان میں اس درجہ کا کوئی حنفی محدث اور فقیہ النفس محقق دوسرا پیدا نہیں ہوا۔

حتی الوسع آپ حنفی مذہب ہی میں اس قول کو اختیار کرتے ہیں جو حدیث اور دوسرے مذاہب سے متفق ہو۔ اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ فقہا حنفیہ میں شیخ ابن الہمام صاحب فتح القدیر اور آپ کے دو محقق شاگرد حافظ حدیث قاسم بن قطلوبغا اور محقق ابن امیر الحاج جو تفقہ نفس کے ساتھ تبحر حدیث، اطلاع رجال فن جرح وتعدیل اور اصول فقہ وغیرہ میں پوری دستگاہ رکھتے ہیں اور بہت سے فروعی مسائل میں اپنی اپنی خاص رائے رکھتے ہیں اسی طبقہ میں حضرت شاہ صاحب کا بھی شمار ہونا چاہیے۔ بعض مسائل میں ان حضرات کا حنفیہ سے خلاف کرنا جیسے مذہب حنفی کے خلاف نہیں سمجھا جاتا اور اس کے باوجود ان کو فقہا حنفیہ ہی میں شمار کیا جاتا ہے اسی طرح بعض مسائل واحکام میں مذہب حنفی کے خلاف شاہ صاحب کا رجحان نفس حنفی مذہب کے خلاف نہیں کہا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کا عام مذہب حنفی تھا اور فتوحات اسلامیہ سے لے کر سلطان محمد شاہ کے آخری وقت تک یہی قانونی مذہب رہا سلطان عالمگیر اورنگ زیب رحمۃ اللہ نے فتاوی عالمگیریہ تدوین کرایا ان مدونین میں جیسا کہ ناظرین کو معلوم ہوگا حضرت شاہ صاحب کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم بھی شامل تھے۔ اور آخری اسلامی دور کا یہی ہندوستان میں قانون رہا۔ ہندوستان کے حنفی محدثین میں شیخ محمد عابد سندھی صاحب المواہب اللطیفۃ علی مسند ابی حنیفۃ" وطوالع الانوار شرح الدر المختار" وغیرہ وشیخ محمد ہاشم سندھی، شیخ عبدالغفور سندھی، شیخ محمد قائم سندھی، شیخ ابوالحسن سندھی اور حضرت شاہ صاحب کے تلامذہ میں آپ کے جانشین شاہ عبدالعزیز اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی اور السید مرتضی بلگرامی زبیدی جو تبحر حدیث وغیرہ میں کچھ کم نہیں۔ سب حنفی المذہب ہی ہیں حضرت شاہ صاحب کے بعد شاہ عبدالعزیز حنفی محدث آپ کے جانشین رہے اور شاہ عبدالعزیز کی جانشینی شاہ محمد اسحاق آپ کے نواسے نے کی اور شاہ اسحاق کے مسند نشین شیخ عبدالغنی مجددی ہوئے یہ سب بھی حنفی المسلک محدث تھے۔

شاہ صاحب کے فقہی مسلک کے سمجھنے کے لئے آپ کی علمی تاریخ کا پیش نظر ہونا بھی ضروری ہے جس کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ممدوح نے شروع میں حضرت والد ماجد شاہ عبدالرحیم وغیرہ علماء سے علوم حاصل کئے اور فقہ حنفی پڑھا اور جب تک ہندوستان میں تھے اور حرمین شریفین کی زیارت کو نہیں گئے تھے آپ پر فقہ حنفی کا اثر تھا، ۱۱۴۳ھ میں جب مدینہ منورہ پہنچے اور شیخ ابوطاہر کردی شافعی سے تلمذ ہوا تو اس کے بعد فقہ شافعی کا اثر بھی شامل تھا آ گیا اور کتاب الام جو امام شافعی کی کتاب ہے اس کے مطالعہ سے فقہ شافعی کا اثر اور بڑھتا گیا۔ آخر میں امام مالک

کی کتاب مؤطا کی طرف بہت توجہ ہوئی اور اس کی عربی و فارسی میں دو شرحیں مختصر لکھیں اور اس کی وجہ سے مذہب مالکی کا اثر بھی آپ پر پڑا ہے۔ لیکن آپ اکثر امام مالک کا مذہب موطا کی روایتوں ہی کو ٹھہراتے ہیں حالانکہ مالکیہ میں بہت سے مؤطا کے اقوال مہجور ہیں اور مذہب میں داخل نہیں۔

امام احمد کا مذہب حقیقت میں امام شافعی کے مذہب کی فرع ہے بلکہ ظاہریت و اجتہاد میں ایک زخ ہے مشکل سے امام احمد کا کوئی ایسا قول ملے گا جو مذہب شافعی میں کوئی روایت اس کے مطابق نہ ہو غرض اس طرح سے آپ کی طبیعت پر مذاہب اربعہ کی فقہ اثر انداز ہوتی گئی اور اس کی خواہش ہوئی کہ ایک ایسا جامع مسلک اختیار کیا جائے جس کے ذریعہ مذاہب میں تطبیق و توفیق ہو جائے سارے احکام کے ذخیرہ میں بیس سئلے ایسے نہیں ملیں گے جس میں امام ابوحنیفہ متفرد ہوں، یا ابوحنیفہ کا کوئی قول یا ابو یوسف و محمد کا کوئی قول امام شافعی کے موافق موجود نہ ہو اس لئے آپ نے جامعیت مذاہب کا یہ مسلک اختیار کیا لیکن اس طرح پر کہ اس جامعیت کو اختیار کر کے بھی آپ حنفی رہ سکیں کیونکہ "وایاک ان تخالف القوم فی الفروع" (خبردار اپنی قوم یعنی اہل ملک کی فروعی مسائل میں مخالفت نہ کرنا) آپ کو سرکار مدینہ کا حکم مل چکا تھا جیساکہ فیوض الحرمین کے مذکورہ بالا اقتباسات میں گزر چکا۔

یہاں تک لکھ چکا تھا کہ شاہ صاحب کا ایک مکتوب "کلمات طیبات" کے صفحہ ۱۶۱ پر دیکھا جو کچھ میں لکھ چکا ہوں اس مکتوب سے اور اس کی تائید نکلتی ہے ممکن ہے کسی کو کچھ غلط فہمی ہو جائے اس لئے نقل کر کے چند جملے عرض کروں گا۔

سوال آنکہ عمل تو در مسائل فقہیہ برکدام مذہب است

"گفتم بقدر امکان جمع می کنم در مذاہب مشہورہ مثلاً صوم و صلوٰۃ و وضو و غسل و حج بوضعے واقع می شود کہ ہمہ اہل مذاہب صحیح دانند و عند تعذر الجمع باقوی مذاہب از روئے دلیل و موافقت صریح حدیث عمل می نمایم و خدائے تعالیٰ ایں قدر علم دادہ است کہ فرق میان ضعیف و قوی کردہ شود و در فتوی بحال سنفتی کار می کنم مقلد ہر مذہبی کہ باشد ازہماں مذہب جواب می گویم خدائے تعالیٰ بہر مذہبے از مذاہب مشہورہ معرفتے دادہ است الحمد للہ تعالیٰ" اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ آپ مجتہد مطلق نہ تھے بلکہ ان محدثین فقہا امت میں سے تھے جو مذاہب کے احکام و ادلہ سامنے رکھ کر قوی و ضعیف کا فیصلہ بخوبی کر سکتے ہیں ورنہ جو شخص درجہ اجتہاد مطلق کو پہنچ جائے اس پر تقلید دوسرے کی حرام ہو جاتی ہے وہاں تو اس کی گنجائش نہیں نکلتی کہ بنابر احتیاط مذاہب میں تطبیق و توفیق دیتے رہیں بس یہ جامعیت کا مسلک ہی خود ہمیں بتلا رہا ہے کہ آپ مجتہد نہ تھے ورنہ جواب میں صاف فرما دیتے کہ میں اپنے عصر کا خود مجتہد ہوں کسی خاص مذہب کا پابند نہیں بلکہ غور سے کچھ یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ بجائے کسی ایک مذہب کے اتباع کے مذاہب اربعہ اور بالخصوص حنفیہ و شافعیہ سب کا اتباع ایک حد تک ضروری سمجھتے ہیں۔ نیز یہ معلوم ہوا کہ عوام

امت کے لیے اپنے اپنے مذاہب کی تقلید ہی ضروری جانتے ہیں اس لیے استفتاء میں مستفتی کا خیال کرتے ہیں اور اس کو اسی کے مذہب کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں اگر آپ مجتہد ہوتے تو اپنی رائے کے مطابق جس کو صحیح خیال فرماتے وہی جواب دیتے بہرحال مدارک اجتہاد کا سمجھنا بھی ہم جیسوں کا کام نہیں، حضرت شاہ صاحبؒ کے لیے یہ فخر کافی ہے کہ مختلف فضائل و کمالات کے ساتھ مدارک اجتہاد اور ائمہ کے منشار اختلاف کو وہ سمجھتے ہیں اور ترجیح و تمیز پر بصیرت کے ساتھ قادر ہیں خلاصہ یہ ہے کہ آپ مفتی فقیہ اور فقیہ محدث کے درجہ میں ایک جلیل القدر دقیق النظر فقیہ، واسع الاطلاع محدث ہیں، اس موضوع کے اطراف و جوانب ابھی بہت کچھ تشنہ تحقیق ہیں، نیز حضرت شاہ صاحب کے مسلک کے متعلق آپ کی تصنیفات میں بہت کچھ ذخیرہ اس کے علاوہ بھی موجود ہے لیکن اس وقت اس فرصت میں اسی مختصر مضمون پر کفایت کرتا ہوں توقع ہے کہ اہل علم و طلبہ کے لیے بصیرت سے خالی نہ ہوگا واللہ ولی التوفیق والهداية

حضرت شاہ ولی اللہ اور تقلید

(از جناب مولانا خیر محمد صاحب رئیس اوّل مدرسہ خیر المدارس جالندھر)

(یہ مضمون مولانا محمد یوسف صاحب فاضل بنوری کے مندرجہ صدر مقالہ کو دیکھنے کے بعد اسکی تذئیل کے طور پر لکھا گیا ہے)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

واقعی سیدنا حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ العزیز کے علو مرتبت اور دقتِ مسلک پر نظر کرتے ہوئے بجز اس کے کچھ نہیں کہا جا سکتا ؎

راہ ہے دشوار منزل دور تر پا شکستہ کیا کرے کیونکر چلے؟

مگر اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے حضرت الحاج مولانا محمد یوسف صاحب بنوری ادام اللہ فیوضہم کو جنھوں نے تقلید و حنفیت کے متعلق حضرت شاہ صاحبؒ کے مسلک کو انہی کی عبارات سے ایک حد تک واضح کرنے میں پوری کوشش فرمائی ہے۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ مولانا موصوف کے مضمون کی تشریح میں بطور تذئیل بلا تکرار حوالجات چند سطور لکھ کر ہدیہ ناظرین کروں۔

میرے خیال میں کسی بزرگ کے مسلک کو واضح کرنے کے لئے خود ان کے اقوال اور ان کے فن کے متعلق معتبر شہادات سے بڑھ کر قوی دلیل نہیں ہو سکتی۔ میں نے بھی اسی طریقہ کو اختیار کیا ہے۔ لیکن اصل مدعا کو شروع کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تقلید کی حقیقت کے متعلق مختصراً کچھ عرض کر دیا جائے تاکہ ناظرین کرام بصیرت کے ساتھ میرے معروضات پر غور کر سکیں واللہ الموفق۔

تقلید کی تعریف قاضی محمد اعلیٰ تھانویؒ بعض شروح حسامی سے نقل فرماتے ہیں۔

التقلید اتباع الانسان غیرہ فیما یقول او یفعل معتقداً للحقیۃ من غیر نظر الی الدلیل الخ (کشاف اصطلاحات الفنون ص۱۱۷۸)	یعنی تقلید اصطلاح میں کہتے ہیں کسی آدمی کا دوسرے کے قول یا فعل کی محض حسن عقیدت سے اتباع کرنا (ایسی اتباع جو ابتداءً دلیل میں غور کرنے پر مبنی نہیں)

"تقلید کا اچھا یا برا ہونا "معتقد فیہ" کے احوال پر موقوف ہے، اگر معتقد فیہ غیر مطیع (فاسق و فاجر یا مشرک و کافر) ہو تو تقلید حرام و قبیح ہے۔ قرآن و حدیث میں اسی کی ممانعت جا بجا وارد ہے اور اگر معتقد فیہ مطیع اور لائق اتباع

امام و مجتہد) ہو تو تقلید حسن اور بعض حالات میں واجب ہے ۔ قرآن و حدیث اسی کی تائید سے مملو ہیں اور یہی امت مرحومہ میں رائج و مشہور ہے اور حضرت شاہ صاحبؒ بھی اسی تقلید کے معتقد و مادح بلکہ قائل و عامل ہیں چنانچہ آئندہ عبارات سے یہ چیز روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گی ۔

تشریح مفہوم تقلید از قول شاہ صاحبؒ

ان الامۃ اجتمعت علی ان یعتمدوا علی السلف فی معرفۃ الشریعۃ فالتابعون اعتمدوا فی ذلک علی الصحابۃ وتبع التابعین اعتمدوا علی التابعین وھکذا فی کل طبقۃ اعتمد العلماء علی من قبلھم الخ (عقد الجید ص۳۶)

یعنی معرفت شریعت میں تمام امت نے بالاتفاق سلف پر اعتماد (و اعتبار) کیا ہے ۔ چنانچہ تابعینؒ نے صحابہ پر اعتماد کیا اور تبع تابعین نے تابعین پر اعتماد کیا ۔ اسی طرح ہر ہر طبقہ میں پچھلے علماء پہلے علماء پر اعتماد و اعتبار کرتے چلے آئے ہیں ۔

تقلید شخصی و غیر شخصی

مطلق تقلید دو قسم پر ہے شخصی و غیر شخصی ۔ جو مذہب کسی خاص مجتہد کی طرف منسوب ہو اس کے جملہ مسائل مفتیٰ بہا اور راجحہ کو قبول کر کے اپنے عمل کے لئے کافی سمجھنا تقلید شخصی ہے اور ایک سے زائد مذاہب کے مسائل کو معمول بہا ٹھہرالینا تقلید غیر شخصی ہے ۔

تقلید غیر شخصی کا رواج

ائمہ اربعہ کے مذاہب کی تدوین و تشہیر سے قبل دوسری صدی کے آخر تک تقلید غیر شخصی کا رواج قائم رہا حتی کہ صحابہؓ و تابعینؒ میں بھی اس کا دستور تھا ۔

چنانچہ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں :-

حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؒ کے عہد میں تقلید غیر شخصی

(۱) لان الناس لم یزالوا من زمن الصحابۃ الی ان ظھرت المذاھب الاربعۃ یقلدون من اتفق من العلماء من غیر نکیر من احد یعتبر انکارہ ولو کان ذلک باطلاً لانکروہ (عقد الجید ص۳۳)

کیونکہ صحابہ کرامؓ کے زمانہ سے لیکر چار مذہبوں کے ظہور تک لوگوں کا یہی دستور (رواج) رہا ہے کہ جو عالم (مجتہد) مل جاتا اسی کی تقلید کر لیتے اور کسی معتبر آدمی نے اس پر انکار نہیں کیا اور اگر یہ تقلید باطل ہوتی تو وہ لوگ ضرور اس پر اعتراض کرتے ۔

(۲) وردبان اعتقاد افضلیۃ الامام علی سائر الائمۃ مطلقاً غیر لازم فی صحۃ التقلید اجماعاً لان الصحابۃ والتابعین کانوا یعتقدون ان خیر ھذہ الامۃ ابوبکر ثم عمر و کانوا یقلدون

یعنی اس اعتراض کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ تقلید کے صحیح ہونے میں بالاجماع یہ اعتقاد رکھنا ضروری نہیں کہ (میرا) امام باقی تمام ائمہ پر مطلقاً فضیلت رکھتا ہے اس لئے کہ صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ تمام امت میں افضل حضرت ابوبکرؓ ہیں اور پھر حضرت عمرؓ

فی کثیر من المسائل بخلاف قولهما ولم ینکر علے ذلك احد فکان اجماعًا علی ما قلناه (عقد الجید صـ۲)	باوجود اس کے بہت سے مسائل (اختلافیہ) میں ان دونوں کی رائے کے خلاف دوسرے صاحبوں کی تقلید کرلیا کرتے تھے اور کسی نے اس پر انکار نہیں کیا۔ لہٰذا یہ مسئلہ اجماعی ہوا
(۳) فعند ذلك صار لکل عالم من علمأ التابعین مذهب علی حیاله فانتصب فی کل بلد امام (انصاف صـ۱)	پس اس وقت تابعین علماء میں سے ہر عالم (مجتہد) کے لیے مستقل مذہب ہوا اور اس طرح گویا ہر شہر میں ایک امام پیدا ہوگیا۔

تقلید شخصی کا رواج

پھر جب ائمہ مجتہدین کی فقہ بطون اوراق میں مدون ہونا شروع ہوگئی تو جن غیر مجتہد لوگوں کو مذاہب مدونہ میسر آگئے انھوں نے تقلید شخصی کو اپنے عمل کے لئے کافی سمجھا لہٰذا دوسری صدی کے بعد تقلید شخصی کا رواج شروع ہوگیا اور جہاں مذاہب مدونہ میسر نہ آئے وہاں پہلو بہ پہلو تقلید غیر شخصی بھی چلتی رہی۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں :-

(۱) وبعد المائتین ظهر فیهم التمذهب للمجتهدین باعیانهم، وقل من کان لا یعتمد علی مذهب مجتهد بعینه وکان هذا هو الواجب فی ذلك الزمان۔ (انصاف صـ۵۹)	اور دو صدیوں کے بعد لوگوں میں خاص خاص مجتہدین کا مذہب اختیار کرنا ظاہر ہوا اور ایسے آدمی بہت کم تھے جو مجتہد معین کے مذہب (کی تقلید شخصی) پر اعتماد نہ رکھتے ہوں اور اسوقت یہی واجب ہوگیا تھا۔
(۲) اعلم ان الناس کانوا قبل المائة الرابعة غیر مجتمعین علی التقلید الخالص لمذهب واحد بعینه (حجة الله البالغة صـ۱۲۲ ج ۱)	یعنی چوتھی صدی سے پہلے سب لوگ صرف تقلید شخصی ہی پر جمع نہ ہوئے تھے (بلکہ بعض لوگوں میں اس وقت تقلید غیر شخصی کا بھی وجود تھا جیساکہ "انصاف" کی مذکورہ صدر عبارت سے معلوم ہوچکا ہے)

مذاہب اربعہ میں تقلید شخصی کا انحصار

ائمہ اربعہ (امام ابوحنیفہؒ امام شافعیؒ امام مالکؒ امام احمدؒ) کے مذاہب کی فقہ جب مدون ہوکر مشہور ہوگئی تو چوتھی صدی کے اندر انہی چار مذاہب میں تقلید شخصی منحصر ہوگئی اور کسی کو اس میں خلاف نہ رہا۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں :-

(۱) انه لما اندرست المذاهب الحقة الا هذه الاربعة کان اتباعها اتباعًا للسواد الاعظم والخروج عنها خروجًا عن السواد الاعظم (عقد الجید صـ۳۸)	یعنی جب بجز مذاہب اربعہ دوسرے مذاہب حقہ معدوم ہوگئے تو انھیں چاروں کا اتباع "سواد اعظم" کا اتباع ٹھیرا اور ان سے نکلنا "سواد اعظم" سے نکلنا ہوا۔

مذاہب اربعہ میں تقلید شخصی کا انحصار بالہام الٰہی

ائمہ اربعہ میں کو کسی ایک کی تقلید شخصی بلحاظ حفاظت دین اللہ تعالیٰ

کا ایک خاص فضل اور الہامی راز ہے۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:۔

وبالجملۃ فالمذہب للمجتہدین سر الہمہ اللہ تعالیٰ العلماء وجمعہم علیہ من حیث یشعرون اولا یشعرون ... (انصاف ص ۶۳)

خلاصہ یہ کہ مجتہدین کے مذہب کی پابندی (یعنی تقلید شخصی) ایک راز ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے علماء (کے قلوب میں) الہام فرمایا اور ان کو اس پر جمع فرما دیا خواہ (اس تقلید شخصی کی خوبیاں) سمجھیں یا نہ سمجھیں۔

مذاہب اربعہ کی تقلید شخصی کے جواز پر امت کا اجماع

حضرت شاہ صاحب رح فرماتے ہیں:۔

ھذہ المذاھب الاربعۃ المدونۃ المحررۃ قد اجتمعت الامۃ او من یعتد بہا منہا علی جواز تقلیدھا الی یومنا ھذا ... (حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۲۳/۱)

تمام امت نے یا امت کے قابل اعتبار افراد نے ان مذاہب اربعہ مشہورہ کی تقلید کے جواز پر آج تک اجماع کیا ہے۔

غیر مجتہد کیلئے "تقلید مجتہد" کا وجوب

حضرت شاہ صاحبؒ امام بغوی محدث رح سے نقل فرماتے ہیں:۔

ویجب علی من لم یجمع ھذہ الشرائط تقلیدہ فیما یعن لہ من الحوادث (عقد الجید ص ۳)

یعنی جو شخص شرائط اجتہاد کا جامع نہیں۔ اس پر واجب ہے کہ پیش آنیوالے حوادث میں مجتہد کی تقلید کرے۔

تقلید شخصی میں دینی فوائد

حضرت شاہ صاحب رح کثرت فوائد دینیہ کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

وفی ذلک (التقلید) من المصالح مالا یخفیٰ لاسیما فی ھذہ الایام التی قصرت الھمم جدا واشربت النفوس الھوی واعجب کل ذی رای برائہ (حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۲۳/۱)

یعنی اس تقلید شخصی میں بہت سے فوائد ہیں جو مخفی نہیں بالخصوص اس موجودہ دور میں جس میں کم ہمتی بے اندازہ ہے اور نفوس خواہش پرستی میں مستغرق ہیں اور ہر شخص اپنی اپنی رائے پر مغرور ہو رہا ہے۔

تفقہ سے بے بہرہ اہلحدیثوں کی "مذمت"

فاما ھذہ الطبقۃ الذین ہم اہل الحدیث والاثر فان الاکثرین منہم انما ہمہم روایات وجمع الطرق وطلب الغریب والشاذ من الحدیث الذی اکثرہ موضوع او مقلوب لا یراعون المتون ولا یتفہمون المعانی ولا یستنبطون سرھا ولا یستخرجون رکازھا وفقہھا وربما عابوا الفقہاء وتناولوھم بالطعن

لیکن یہ طبقہ جو اہل الحدیث والاثر (بعرف حال "اہلحدیث" یا غیر مقلد) کہا جاتا ہے تو ان میں سے اکثر کی پوری کوشش اور انتہائی جد وجہد ہوتی ہے بس روایات کا بیان کرنا اور سندوں کا جمع کرنا اور غریب وشاذ حدیث کا "تلاش" کرنا جو اکثر موضوع یا مقلوب ہوتی ہیں یہ لوگ نہ تو الفاظ حدیث کا لحاظ کرتے ہیں اور نہ معانی سمجھتے ہیں اور نہ ان کے راز کو استنباط کر سکتے ہیں اور نہ ان کے اسرار وفقہ کو نکال سکتے ہیں

وادعوا عليهم مخالفة السنن ولا يعلمون انهم عن مبلغ ما اوتوه من العلم قاصرون وبسوء القول فيهم آثمون. (انصاف ص۵۵)

اور بعض اوقات فقہاء کرام پر عیب لگاتے ہیں ان پر زبان طعن دراز کرتے ہیں اور ان پر مخالفت سنت (و حدیث) کا دعویٰ کرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ "فقہاء" کو جس قدر علم دیا گیا ہے وہ خود اس سے قاصر ہیں اور فقہاء کی بدگوئی سے سخت گنہگار ہوتے ہیں۔

وصیت نبویہ متعلق تقلید مذاہب اربعہ

شاہ صاحب فیوض الحرمین میں فرماتے ہیں:۔

واستفدت منه صلى الله عليه وسلم ثلاثة امور خلاف ما كان عندي .... وثانيهما الوصاة بالتقليد بهذه المذاهب الاربعة لا اخرج منها الخ (فیوض الحرمین ص۶۴)

مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تین ایسی باتیں معلوم ہوئیں کہ میرا خیال پہلے ان کے خلاف تھا۔ ۔ ۔ ۔ (انہیں سے) دوسری بات یہ ہے کہ آپ نے وصیت فرمائی کہ ان مذاہب اربعہ ہی کی تقلید کروں اور ان سے باہر نہ جاؤں۔

بارگاہ نبوت سے مذہب حنفی کو ترجیح

اسی فیوض الحرمین میں فرماتے ہیں:۔

عرفني رسول الله صلى الله عليه وسلم ان في المذهب الحنفي طريقة انيقة هي اوفق الطرق بالسنة المعروفة التي جمعت ونقحت في زمان البخاري واصحابه الخ (فیوض الحرمین ص۴۸)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بتلایا کہ مذہب حنفی میں ایک ایسا عمدہ طریقہ ہے جو دوسرے طریقوں کی بہ نسبت اس سنت مشہورہ کے زیادہ موافق ہے جس کی تدوین اور تنقیح امام بخاری اور انکے اصحاب کے زمانہ میں ہوئی۔

ہندوستان میں عوام کیلئے مذہب حنفی کی تقلید کا ترک کرنا حرام ہے

فرماتے ہیں:۔

فاذا كان انسان جاهل في بلاد الهند وبلاد ماوراء النهر وليس هناك عالم شافعي ولا مالكي ولا حنبلي ولا كتاب من كتب هذه المذاهب وجب عليه ان يقلد بمذهب ابي حنيفة ويحرم عليه ان يخرج من مذهبه لانه حينئذ يخلع من عنقه ربقة الشريعة ويبقى سدًى مهملاً۔ (انصاف ص۷۰)

جب ایک عامی انسان علاقہ ہندوستان اور ماوراء النہر میں رہنے والا ہو۔ جہاں کوئی عالم شافعی اور مالکی اور حنبلی اور ان کی کتب مذہبیہ میسر نہ آسکتی ہوں تو اس پر واجب ہے کہ صرف امام ابو حنیفہؒ کے مذہب کی تقلید کرے اور ان کے مذہب سے علیحدہ ہونا اس کے لئے حرام ہے کیونکہ وہ اس وقت شریعت کی رسی ہی اپنی گردن سے اتار کر بالکل بیکار رہ جائے گا۔[۱]

[۱] شاہ صاحب کے اس ارشاد کی تصدیق ایک منصف مزاج اور خدا ترس اہل حدیث بزرگ مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم کی اس تصریح سے ہوتی ہے فرماتے ہیں:۔ "پچیس برس کے تجربہ سے ہم کو یہ بات معلوم ہوئی کہ جو لوگ بے علمی کے ساتھ مجتہد مطلق اور تقلید کے تارک بن جاتے ہیں وہ آخر اسلام کو سلام کر بیٹھتے ہیں کفر و ارتداد و فسق کے اسباب دنیا میں اور بھی بکثرت موجود ہیں مگر دینداروں کے بے دین ہو جانے کے لئے بے علمی کے ساتھ ترک تقلید بڑا بھاری سبب ہے" (رسالہ اشاعۃ السنہ ۱۱ جلد ۱۱ مطبوعہ ۱۸۸۸ء)

یہاں تک مختلف عنوانات کے ماتحت حضرت شاہ صاحبؒ کی کتب سے جو عبارات ذکر کی گئی ہیں ان سے معلوم ہوا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے نزدیک نتائج ذیل مسلم ہیں۔

(۱) معرفت شریعت کا سلف کے اتباع (تقلید) اور ان کے اعتماد پر موقوف ہونا اجماعی مسئلہ ہے۔

(۲) صحابہؓ و تابعینؒ کے عہد میں نفس تقلید کا رواج بلا نکیر تھا۔

(۳) افضل کے ہوتے ہوئے مفضول کی تقلید بالاجماع ثابت ہے جب کہ وہ اس کا مستحق ہو۔

(۴) دوسری صدی کے بعد تقلید شخصی کا جاری ہونا اور اس کا اس وقت واجب ہونا۔

(۵) چوتھی صدی کے قبل تک تقلید شخصی کے ساتھ ساتھ تقلید غیر شخصی کا بھی کچھ کچھ پائے جاتے رہنا۔

(۶) مذاہب اربعہ حنفی شافعی مالکی حنبلی کی اتباع سواد اعظم کی اتباع ہے۔

(۷) مذاہب اربعہ کی تقلید شخصی من عند اللہ ایک الہامی راز ہے۔

(۸) مذاہب اربعہ کے جواز تقلید پر اجماع امت ہے۔

(۹) غیر مجتہد پر تقلید واجب ہے۔

(۱۰) تقلید شخصی میں دینی فوائد بکثرت ہیں۔

(۱۱) ترک تقلید اور فقہاء پر طعن و اعتراض کرنا معصیت اور قصور علم کا نشان ہے۔

(۱۲) مذاہب اربعہ کی تقلید پر پابند رہنے کی وصیت خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی۔

(۱۳) مذاہب اربعہ کی تقلید کا ترک کرنا منشائے نبوی کے خلاف ہے۔

(۱۴) مذہب حنفی کے "طریقہ انیقہ" کے موافق سنت ہونے کی شہادت خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔

(۱۵) ہندوستان کے عوام کے لئے مذہب حنفی ہی کی تقلید واجب ہے اور اس کا ترک حرام بلکہ نتیجۃً ترک اسلام کے مرادف ہے (والعیاذ باللہ)

سابقہ نقول اور ان کے ان بدیہی نتائج سے حضرت شاہ صاحبؒ کا مسلک بخوبی واضح ہو گیا۔ کہ آپ مذاہب اربعہ کو حق اور ان کی تقلید کو ضروری سمجھتے تھے اور خود حنفی المذہب مقلد تھے ...... مگر مزید اطمینان کے لئے حضرت شاہ صاحبؒ کے حنفی المذہب ہونے کے ثبوت میں ذیل کی دو اہم شہادتوں کو نقل کر کے مضمون ہذا کو ختم کیا جاتا ہے

پہلی شہادت نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ (مرحوم) مشہور اہل حدیث مصنف لکھتے ہیں:۔

ان الشاہ ولی اللہ المحدث الدھلوی قد بنی	شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنا یہ طریقہ اختیار کیا ہے
طریقتہ علی عرض المجتہدات علی السنۃ	کہ وہ اجتہادی مسائل کو قرآن و حدیث پر پیش کرتے ہیں
والکتاب وتطبیق الفقہیات بمعانی کل باب	اور مسائل فقہیہ کے ہر ہر باب کو قرآن و حدیث پر

(الی قولہ) وطریقتہ ھذا اکلہ مذھب حنفی الخ۔

تبلیغ دیتے ہیں..... اور ان کا یہ تمام طریقہ مذہب حنفی ہی ہے۔

(الحطہ ص)

دوسری شہادت

مولانا محسن تیمی حضرات دہلویہ کی سند کے متعلق لکھتے ہیں:۔

قلت ومن لطائف ھذا الاسناد انہ اجتمع فی اولہ اربعۃ اخرھم ابو عبدالعزیز اشترکوا فی اربع خصال وذلک انھم دھلویون سکنی وعمریون صلبیۃ وانھم صوفیۃ اصحاب الزھد والورع وانھم حنفیون علی مذھب النعمان ابی حنیفۃ وصاحبیہ رضی اللہ عنھم الخ (رسالہ الیانع الجنی ص)

میں کہتا ہوں منجملہ اس سند کی خوبیوں کے یہ امر ہے کہ اس کے شروع میں چار بزرگ جن کے آخر ابو عبدالعزیز (شاہ ولی اللہ صاحبؒ) ہیں ایسے ہیں جو چار امور میں شریک ہیں:۔

(۱) وہ چاروں سکونت کے اعتبار سے دہلوی ہیں
(۲) نسبی خاندان کے اعتبار سے عمری (فاروقی) ہیں
(۳) چاروں زاہد پرہیزگار صوفی ہیں
(۴) چاروں امام ابوحنیفہ نعمان (بن ثابت) اور ان کے صاحبینؒ کے مذہب کے موافق "حنفی المذہب" ہیں۔

امید ہو کہ ہمارے زمانہ کے جو حضرات کسی غلط فہمی کی وجہ سے یا شاہ صاحب کی کتابوں پر پوری نظر نہ ہونے کے سبب سے حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کو عدم تقلید کا حامی اور خصوصاً "مذہب حنفی" کا مخالف سمجھے ہوئے ہیں بلکہ ہندوستان میں انہی کو اس مسلک "عدم تقلید" کا بانی اور مؤسس سمجھتے ہیں وہ خود شاہ صاحب کی ان تصریحات اور نواب صدیق حسن خاں اور مولانا محسن تیمی جیسے "شاہدین عادلین" کی شہادت کے بعد اپنے خیال کی اصلاح فرمائینگے

چونکہ مجھے یہاں مولانا محمد یوسف صاحب فاضل بنوری کے مقالہ پر صرف تذئیل لکھنی تھی، اور ادارۂ الفرقان کی طرف سے جگہ بھی محدود دی گئی تھی، اس لئے انہی چند سطروں پر اکتفا کرنا ناگزیر ہے، جو صاحب اس موضوع (مسئلہ تقلید) پر مفصل بحث دیکھنا چاہیں وہ راقم الحروف کا رسالہ "خیر التنقید"[1] ملاحظہ فرمائیں جس میں اس مسئلہ کے ہر گوشہ پر کتاب وسنت اور ارشادات سلف کی روشنی میں مفصل اور منقح بحث کر کے اصل حقیقت کو واضح کر دیا گیا ہے۔

[1] "خیر التنقید" ملنے کا پتہ:۔ ناظم مدرسہ عربی خیر المدارس جالندھر شہر (پنجاب) قیمت ۴ر محصول ڈاک ۱ر ۱۲

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ

اور ان کے کام کا مختصر تعارف

(از محمد منظور نعمانی مدیر الفرقان بریلی)

[اس نمبر کیلئے میں نے جو مقالہ قریباً ڈیڑھ سو صفحہ کا شاہ صاحب کی سوانح حیات اور آپ کے مساعی تجدید و اصلاح کی تفصیلات پر تیار کیا تھا، اس کا تذکرہ اور شایع نہ ہو سکنے کی وجہ بھی ابتدائی صفحات میں عرض کی جا چکی ہے اور آئندہ اس کی اشاعت کے متعلق اب جو خیال ہے وہ بھی وہیں ظاہر کیا جا چکا ہے ـــــ اس وقت تو صرف "انگلی کٹا کے شہیدوں" کی فہرست میں نام لکھوانے کی نیت سے ۲۰ صفحے کی محدود وسعت کو پیش نظر رکھ کر مضمون لکھنے کے لئے قلم ہاتھ میں لیا ہے ـــــ اتنی سی جگہ میں بھی حضرت شاہ صاحبؒ کے کام کے کسی ایک مخصوص اور محدود شعبہ پر کچھ لکھا جا سکتا تھا لیکن اتفاق کی بات ہے کہ کسی اور مقالہ میں بھی آپ کے "سوانح حیات" مرتب اور مستقل طور پر نہیں لکھے گئے، لہذا اس کمی کو پورا کرنے کیلئے ضروری معلوم ہوا کہ ان صفحات میں حسب گنجائش اختصار و اجمال کے ساتھ ہی سہی مگر آپ کے "سوانح" ہی لکھے جائیں۔ اگرچہ یہ ظاہر ہے کہ شاہ صاحب کی جو "سوانح حیات" ۲۰ صفحے میں لکھی جائے گی وہ "سوانح" نہیں ہوگی بلکہ اس کو "سوانح" کے خلاصہ کا خلاصہ بھی مشکل ہی سے کہا جا سکے گا، لیکن اب اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں۔ البتہ بعض دوسرے مقالات میں (بالخصوص مولانا گیلانی اور مولانا سندھی کے مقالوں میں) متفرق طور پر خود شاہ صاحب کے اور آپ کے والد ماجد نیز اساتذہ و مشائخ اور اولاد و احفاد و تلامذہ و مستفیضین کے جو تذکرے اور ان حضرات کے کاموں کی جو تفصیل گزر چکی ہے اس سب کے ساتھ مل کر یہ خلاصہ بھی انشاء اللہ زیادہ ناقص نہ رہے گا۔

اس مختصر تعارف میں جو چیزیں شاہ صاحب کے حالات سے متعلق ہیں وہ آپ ہی کی تصنیفات سے ماخوذ ہیں، اور یہ التزام بھی عدم گنجائش ہی کی وجہ سے کیا گیا ہے۔ "مدیر"]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سلسلۂ نسب حضرت شاہ صاحب کا سلسلۂ نسب والد ماجد کی طرف سے امیر المومنین سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے اور والدہ محترمہ کی جانب سے امام موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے ـــ آپ نے امدادفی

ماثر الاجداد" میں اپنا سلسلۂ نسب خود اس طرح بیان فرمایا ہے:۔

فقیر ولی اللہ ابن الشیخ عبدالرحیم ابن الشہید وجیہ الدین بن معظم بن منصور بن محمد بن قوام الدین عرف قاضی قازن بن قاضی قاسم، بن قاضی کبیر الدین عرف قاضی بدہ بن عبدالملک، بن قطب الدین بن کمال الدین بن شمس الدین مفتی، بن شیر ملک بن محمد عطا ملک بن ابوالفتح ملک بن محمد عمر حاکم ملک بن عادل ملک بن فاروق بن جرجیس بن احمد بن محمد شہریار، بن عثمان بن ہامان بن ہمایوں، بن قریش بن سلیمان بن عفان، بن عبداللہ، بن محمد بن عبداللہ بن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ وعنہم اجمعین[لہ]۔"

ٹھیک طور سے تو معلوم نہیں ہو سکا کہ شاہ صاحب کے اجداد نے سرزمین عرب کب اور کیوں چھوڑی لیکن اوپر کے نسب نامے میں ہمایوں، جرجیس، محمد شہریار جیسے ناموں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت فاروق اعظم سے پانچ چھ پشتوں کے بعد ہی یہ خاندان غالباً عجم کو اپنا وطن بنا چکا تھا، واللہ اعلم۔

اگرچہ شاہ صاحب کے ان اجداد میں متعدد ہستیاں خاص شہرت کی مالک اور اپنی مستقل تاریخ رکھنے والی ہیں مگر یہاں ہم عدم گنجائش کی وجہ سے صرف آپ کے دادا شاہ وجیہ الدین شہید سے سلسلۂ کلام شروع کرتے ہیں:۔

آپ کے دادا شاہ وجیہ الدین شاہ وجیہ الدین شہید سلطان غازی اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کی فوج میں ایک نامور مجاہد تھے اور اپنے مجاہدانہ و شجاعانہ کارناموں ہی کی وجہ سے خاص شرف و امتیاز رکھتے تھے "جنگ برادران" میں سلطان غازی کی طرف سے وہ بڑی بہادری سے لڑے تھے۔ اور مرہٹوں سے جہاد ہی کے لئے وہ دکن جا رہے تھے (یا بقول بعض وہاں سے واپس آ رہے تھے) کہ راستہ ہی میں ڈاکوؤں کے ایک گروہ سے مقابلہ ہو گیا اور اسی میں شہید ہو گئے ۔۔۔ "حیات ولی" کے مصنف مولوی رحیم بخش صاحب نے آپ کا مفصل تذکرہ لکھا ہے یہاں ہم عدم گنجائش کی وجہ سے ان کے تعارف میں صرف شاہ صاحب ہی کے ایک مختصر مگر بلیغ فقرہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ "ماثر اجداد" میں ارقام فرماتے ہیں:۔

"شاہ وجیہ الدین بکمال تقوے و شجاعت موصوف بودند"

والد ماجد شاہ عبدالرحیم شاہ صاحب کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم کے کسی قدر بلکہ ایک حد تک کافی حالات مولانا گیلانی اور مولانا سندھی کے مقالات میں گذر چکے ہیں، اب یہاں اس پر کسی خاص اضافہ کی ضرورت نہیں، لہذا خود شاہ صاحب ہی کا تذکرہ سنئے:۔

حضرت شاہ ولی اللہ رح کے مختصر حالات خود ان کی زبانی

خود شاہ صاحب نے اپنے حالات و سوانح میں ایک مختصر رسالہ بنام "الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف"

[لہ] اس مقتضب ماثر کے بعض ناموں میں کچھ اختلاف بھی ہے لیکن یہاں عدم گنجائش کی وجہ سے اس سے بالقصد کوئی تعرض نہیں کیا گیا ہے۔ م

فارسی زبان میں لکھا ہے ذیل میں پہلے اسی کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے ـــــ فرماتے ہیں:-

شاہ صاحب کی خود نوشت مختصر سوانح حیات بتاریخ ۱۴ شوال ۱۱۱۴ھ چہارشنبہ کے دن طلوع آفتاب کے وقت یہ فقیر پیدا ہوا تاریخی نام عظیم الدین[1] نکالا گیا، ولادت سے پہلے خود والدین ماجدین اور چند اور صلحاء نے میرے بارہ میں بہت سے بشارتی خواب دیکھے جن کو بعض دوستوں نے مستقل رسالہ القول الجلی میں بھی جمع کر دیا ہے ـــــ عمر کے پانچویں سال مکتب میں بٹھا دیا گیا۔ ساتویں سال والد ماجد نے نماز روزہ شروع کرایا اور اسی سال "رسم سنت" عمل میں آئی۔ اور جیسا کہ یاد رہ گیا ہے اسی ساتویں سال میں قرآن پاک ختم ہوا اور فارسی تعلیم شروع ہوئی، یہاں تک کہ دسویں سال شرح ملا جامی پڑھ لی اور مطالعہ کتب کی استعداد پیدا ہو گئی ـــــ چودھویں ہی برس میں شادی کی صورت پیدا ہو گئی اور والد ماجد نے اس معاملہ میں انتہائی عجلت سے کام لیا اور جب سسرال والوں نے والد ماجد کے تقاضوں کے جواب میں سامان شادی تیار نہ ہونے کا عذر کیا تو آپ نے ان کو لکھ بھیجا کہ میری یہ "جلد بازی" بے وجہ نہیں ہے بلکہ اس میں کوئی راز ہے لہذا یہ مبارک کام بلا تاخیر ہی ہو جانا چاہئے۔ چنانچہ والد بزرگوار کے اصرار سے اسی سال یعنی عمر کے چودھویں ہی برس میں شادی ہو گئی اور وہ راز بعد میں اس طرح ظاہر ہوا کہ نکاح سے تھوڑے ہی دن بعد میری خوشدامن کا انتقال ہو گیا اس سے چند ہی روز بعد میری اہلیہ کے نانا نے وفات پائی، پھر چند ہی دنوں میں عم بزرگوار شیخ ابوالرضا محمد قدس سرہ کے صاحبزادے شیخ فخر عالم نے رحلت فرمائی اور یہ صدمہ ابھی تازہ ہی تھا کہ میرے بڑے بھائی شیخ صلاح الدین کی والدہ ماجدہ نے (گویا آپ کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم کی پہلی بیوی نے) داغ مفارقت دیا ان صدمات کے ساتھ ہی والد ماجد پر ضعف اور مختلف قسم کے امراض کا غلبہ ہوا اور دیکھتے دیکھتے آپ کی وفات کا سانحہ عظیم بھی پیش آ گیا ـــــ ان حوادث کے پیہم گزر جانے پر معلوم ہوا کہ شادی کے متعلق والد ماجد کی عجلت فرمائی میں کیا راز تھا، درحقیقت اگر اس وقت یہ کام اس طرح عجلت سے انجام نہ پاتا تو ان حوادث کی وجہ سے پھر مدتوں بھی اس کا موقع نہ آ سکتا تھا!

شادی سے ایک سال بعد پندرہ سال کی عمر میں والد ماجد کے ہاتھ پر میں نے بیعت کی اور مشائخ صوفیہ بالخصوص حضرات نقشبندیہ کے اشغال میں لگ گیا، اور توجہ و تلقین اور آداب طریقت

---

[1] خود شاہ صاحب سے منقول ہے کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک منامی بشارت کی بنا پر آپکا نام قطب الدین بھی رکھا گیا تھا (انفاس) لیکن اللہ تعالیٰ کو منظور تھا کہ آپ کو اپنے "ولی" کے نام سے ہی مشہور کرے چنانچہ آج آپکے ان دونوں (عظیم الدین اور قطب الدین) کا پتہ صرف کتابوں سے چلتا ہے ورنہ عالم اسلامی نیا آپ کو شاہ ولی اللہ ہی کے نام سے جانتی اور پہچانتی ہے۔ شاہ عبدالعزیز رح نے تحفۂ اثنا عشریہ میں چونکہ ایک خاص مصلحت سے اپنا بھی غیر معروف نام "غلام حلیم" لکھا ہے اس لئے ولدیت میں بھی شاہ ولی اللہ رح کا غیر معروف ہی نام "قطب الدین" ذکر کیا ہے ۱۲

کی تعلیم و خرقہ پوشی کی جہت سے میں نے اپنی نسبت کو درست کیا — اسی سال بیضاوی کا ایک حصہ پڑھ کر گویا ان دیار کے مروجہ نصاب تعلیم سے فراغت حاصل کی والد ماجد نے اس تقریب میں بڑے پیمانہ پر خواص و عام کی دعوت کی اور مجھے درس کی اجازت دی جن علوم و فنون کا درس اس ملک میں مروج ہے ان میں ذیل کی کتابیں میں نے سبقاً سبقاً پڑھیں۔ حدیث میں پوری مشکوٰۃ شریف سوائے "کتاب البیوع سے کتاب الآداب" تک کے تھوڑے سے حصہ کے، اور صحیح بخاری کتاب الطہارت تک اور شمائل ترمذی کامل — اور تفسیر میں، تفسیر بیضاوی اور تفسیر مدارک کا ایک حصہ اور حق تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک بہت بڑی نعمت مجھ پر یہ ہوئی کہ کامل غور و فکر اور مختلف تفاسیر کے مطالعہ کے ساتھ والد ماجد کے درس قرآن میں مجھے حاضری کی توفیق ملی اور اس طرح کئی بار میں نے حضرت سے متن قرآن پڑھا اور یہی میرے حق میں فتح عظیم کا باعث ہوا۔ والحمد للہ علی ذالک

اور علم فقہ میں شرح وقایہ اور ہدایہ پوری پڑھیں اور اصول فقہ میں حسامی اور توضیح تلویح کا کافی حصہ اور منطق میں شرح شمسیہ پوری اور شرح مطالعہ کا کچھ حصہ اور کلام میں شرح عقائد مع حاشیہ خیالی اور شرح مواقف کا بھی ایک حصہ، — اور سلوک و تصوف میں عوارف اور رسائل نقشبندیہ وغیرہ اور علم الحقائق میں شرح رباعیات مولانا جامی، لوائح، مقدمہ شرح لمعات اور مقدمہ نقد النصوص اور فن خواص اسماء و آیات میں والد ماجد کا خاص مجموعہ اور طب میں موجز، اور فلسفہ میں شرح ہدایۃ الحکمۃ وغیرہ اور نحو میں کافیہ اور اس کی شرح از ملا جامی اور علم معانی میں مطول اور مختصر المعانی اس قدر جتنے پر ملا زادہ کا حاشیہ ہے اور ہیئت و حساب میں بھی بعض رسالے پڑھے — اور الحمد للہ کہ اسی تحصیل کے زمانہ میں ہر فن سے خاص مناسبت پیدا ہوگئی اور اس کے خاص مسائل اور اہم مباحث میرے ذہن کی گرفت میں آگئے۔

میری عمر کے سترھویں سال والد ماجد مریض ہوئے اور اسی مرض میں واصل برحمت حق ہوگئے۔ اور اس مرض وفات ہی میں مجھے بیعت و ارشاد کی اجازت مرحمت فرمائی اور اس اجازت میں کلمہ "یدہ کیدی" (اس کا ہاتھ گویا میرا ہی ہاتھ ہے) مکرر ارشاد فرمایا۔

خدا تعالیٰ کا ایک بڑا احسان یہ ہے کہ حضرت والد ماجد جب تک رہے اس فقیر سے بیحد راضی رہے اور اسی رضامندی کی حالت میں اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ حضرت والد کو جیسی توجہ میرے حال پر رہی ایسی ہر باپ کو اپنے بیٹوں کے ساتھ نہیں ہوتی، میں نے کوئی باپ کوئی استاد اور کوئی مرشد ایسا نہیں دیکھا جو اپنی اولاد یا اپنے کسی شاگرد یا مرید کیطرف اس قدر توجہ اور شفقت کرتا ہو

جو حضرت والد ماجد کو میرے ساتھ تھی ۔ اللھم اغفرلی ولوالدی وارحمھما کما ربیانی صغیرا وجازھما بکل شفقۃ ورحمۃ ونعمۃ منھما علیّ مائۃ الف اضعافھا انک قریب مجیب ۔

پھر حضرت کی وفات کے بعد بارہ سال تک کتب دینیہ اور معقولات کے درس میں اشتغال رہا اور ہر علم و فن میں غور کرنے کا موقع ملا ۔

اور مذاہب اربعہ کی فقہ اور انکی اصول فقہ کی کتابوں اور اُن احادیث کے غائر مطالعہ کے بعد جنسے وہ حضرات اپنے مسائل میں استناد فرماتے ہیں نور غیبی کی مدد سے "فقہاء محدثین" کا طریقہ دلنشین ہوا ۔ غرض والد ماجد کی وفات سے ۱۲ برس اس طرح گزرنے کے بعد حرمین شریفین کی زیارت کا شوق پیدا ہوا اور آخر ۱۱۴۳ھ میں یہ فقیر حج سے مشرف ہوا اور ۱۱۴۴ھ میں مکہ معظمہ و مدینہ منورہ کی مجاورت اور شیخ ابو طاہر قدس سرہٗ و دیگر مشائخ حرمین شریفین سے اخذ روایت حدیث کی سعادت حاصل ہوئی مدینہ منورہ کے دوران قیام میں روضۂ مقدسہ سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم میری توجہ کا خاص مرکز رہا اور الحمد للہ کہ مجھ فقیر پر اس قدسی دربار سے فیوض و برکات کی بے پایاں بارش ہوئی ۔ نیز اس سفر مبارک میں حرمین شریفین اور عالم اسلامی کے بہت سے علمائے کرام کے ساتھ خوب رنگین صحبتوں کا موقع ملا ۔ حضرت شیخ ابو طاہر مدنی قدس سرہٗ کی طرف سے تمام طرق صوفیہ کا جامع خرقہ بھی اسی بابرکت سفر میں عنایت ہوا ۔ پھر ۱۱۴۴ھ کے آخر میں حج سے مکرر مشرف ہو کر اوائل ۱۱۴۵ھ میں وطن کی طرف واپسی ہوئی اور بتاریخ ۱۴ رجب ۱۱۴۵ھ ٹھیک جمعہ کے دن بفضلہ تعالےٰ صحیح و سلامت وطن مالوف دہلی پہنچ گیا ۔ بتعمیل ارشاد " واَمّا بنعمۃِ ربِّکَ فحدِّث " بعض خاص الخاص انعاماتِ الٰہیہ کا بھی تذکرہ کرتا ہوں :-

حق تعالےٰ کا عظیم ترین انعام اس ضعیف بندہ پر یہ ہے کہ اس کو " خلعتِ فاتحیہ " بخشا گیا ہے اور اس آخری دورہ کا افتتاح اُس سے کرایا گیا ہے، اس سلسلہ میں جو کام مجھ سے لئے گئے ہیں وہ یہ ہیں کہ فقہ میں جو " مرضی " ہے اسکو جمع کیا گیا اور فقہ حدیث کی از سر نو بنیاد رکھ کر اس فن کی پوری عمارت تیار کی گئی اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے تمام احکام و ترغیبات بلکہ تمامی تعلیمات کے اسرار و مصالح کو اس طرح منضبط کیا گیا کہ اس فقیر سے پہلے کسی نے یہ کام اس طرح نہیں کیا تھا ۔ نیز سلوک کا وہ طریقہ جس میں حق تعالیٰ کی مرضی ہے اور جو اس دورہ میں کامیاب ہو سکتا ہے مجھے اس کا الہام فرمایا گیا اور میں نے اُس طریق کو اپنے دو رسالوں " ھمعات " اور " الطاف القدس " میں قلم بند کر دیا ہے ۔

ایک کام مجھ سے یہ لیا گیا کہ متقدمین اہل سنت کے عقائد کو میں نے دلائل و براہین سے ثابت کیا

اور "معقولین" کے شکوک و شبہات کے خس و خاشاک سے ان کو قطعی پاک کر دیا اور اُن کی تقریر بحمد اللہ ایسی کی جسکے بعد کسی بحث کی گنجائش ہی نہیں رہتی، علاوہ ازیں کمالاتِ اربعہ ابداع، خلق، تدبیر اور تدلی کی حقیقت اور نفوس انسانیہ کی استعدادات کا علم مجھے عطا فرمایا گیا اور یہ دونوں ایسے علم ہیں کہ اس فقیر سے پہلے کسی نے ان کے کوچہ میں قدم بھی نہیں رکھا ـــ اور حکمت عملی (کہ اس دورہ کی صلاح و فلاح اسی سے وابستہ بلکہ اسی میں منحصر ہے) مجھے بھرپور دی گئی اور کتاب و سنت و آثار صحابہ سے اس کی تطبیق و تفصیل کی توفیق بھی نصیب ہوئی ـــ اس سب کے سوا مجھے وہ ملکہ عطا فرمایا گیا جس کے ذریعہ سے میں یہ تمیز کر سکتا ہوں کہ دین کی اصل تعلیم جو فی الحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہے وہ کیا ہے اور وہ کون کون باتیں ہیں جو بعد میں اس میں ٹھونسی گئی ہیں، یا جو کسی بدعت پسند فرقہ کی تحریف کا نتیجہ ہیں۔"

اپنے یہ حالات اور حق تعالیٰ کے یہ انعامات بیان فرمانے کے بعد حضرت شاہ صاحب اپنی اس تحریر کو ان الفاظ پر ختم فرماتے ہیں:-

ولوان لی فی کل منبت شعرۃ لسانًا لما استوفیت واجب حمدہ والحمد للہ رب العلمین۔	اگر میرے ہر بال کی جگہ زبان ہو جو ہر دم مصروف حمد الٰہی رہے تو بھی حق تعالیٰ کی حمد کا جو حق مجھ پر ہے وہ ادا نہیں ہو سکتا والحمد للہ رب العلمین

شاہ صاحب کی تصانیف کا اجمالی تعارف شاہ صاحب نے اوپر کی سطروں میں اپنے جن خاص کاموں کی طرف اشارہ فرمایا ہے اسکی تفصیلی حقیقت آپکی تصانیف کے مطالعہ سے معلوم ہو جاتی ہے اور فی الحقیقت آپ کے کام اور "مقام" کو سمجھنے کیلئے بلکہ "روح اسلام" اور "منشاء الٰہی" اور انفرادی و اجتماعی "اسلامی دستور العمل" معلوم کرنے کے لئے آپ کی مصنفات ہی بہترین ذریعہ ہیں، مگر ہماری بدقسمتی کہ ان میں سے اکثر قطعًا نایاب ہیں بلکہ بہت سی کتابوں کے تو نام تک معلوم نہیں کافی تعداد میں آپ کی کتابیں ایسی بھی ہیں جو اگرچہ بالکل معدوم نہیں ہوئی ہیں لیکن اب تک اُن کی طبع کی نوبت نہیں آئی اور صرف خاص خاص کتب خانوں میں اُن کے قلمی نسخوں کا پتہ چلتا ہے۔ تاہم جو چھپ چکی ہیں اور متداول ہیں وہ بھی کافی ہیں اور میرا خیال ہے کہ جس کے پاس شاہ صاحب کی صرف یہ مطبوعہ کتابیں ہی ہوں اور وہ اُن سے صحیح استفادہ کر سکے تو پھر بڑے بڑے "کتب خانوں" سے وہ مستغنی اور بے نیاز ہو سکتا ہے۔

ذیل میں آپ کی صرف اُن تصنیفات کا مختصر تعارف کرایا جاتا ہے جو ہمارے علم میں ہیں کہ فی الحقیقت ہمارے سامنے ہمارے ہاتھوں میں اور ہمارے لئے آپ کا سب سے بڑا کام یہی ہے۔

(۱) فتح الرحمٰن، یہ فارسی زبان میں قرآن پاک کا وہ ترجمہ ہے جو سب سے پہلے ہندوستان میں ہوا ـــ نہایت مختصر مگر بہت جامع اور مفید نیز "فوائد" بھی آپ نے اس کے ساتھ میں لکھے ہیں۔ ان "فوائد" کی اہمیت کے متعلق مولانا سندھی، مولانا گیلانی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کے مضامین میں کچھ اشارات گزر چکے ہیں۔

(۲) الفوز الکبیر۔ فارسی زبان ہی میں اصول تفسیر پر نہایت مفید اور بصیرت افروز رسالہ ہے۔

(۳) فتح الخبیر۔ عربی زبان میں قرآن پاک کی تفسیر کا نہایت مختصر مگر بہت جامع نمونہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام سے صحیح طریقہ پر باب تفسیر میں جو کچھ منقول ہوا ہے قریباً وہ سب ہی اس میں لے لیا گیا ہے۔

(۴) مصفّٰی۔ موطا امام مالک کی فارسی شرح ہے۔

(۵) مسوّٰی یہ بھی موطا ہی کی شرح ہے لیکن عربی زبان میں۔ شاہ صاحب درس حدیث کا جو طریقہ رائج کرنا چاہتے تھے یہ دونوں کتابیں گویا اس کا نمونہ ہیں۔ اگر ان کے ساتھ حجۃ اللہ البالغہ جلد ثانی کے بعض ابواب کو بھی ملا لیا جائے تو شرح حدیث میں شاہ صاحب کا حکیمانہ اور محققانہ طریقہ مکمل طور پر سامنے آسکتا ہے۔

(۶) حجۃ اللہ البالغہ۔ اس کتاب کو پورے "اسلام کی" شرح کہا جا سکتا ہے۔ میں اپنی زندگی میں کسی بشر کی کتاب سے اتنا مستفید نہیں ہوا جس قدر کہ اس کتاب سے خدا کے فضل سے مجھے فائدہ پہنچا یا میں نے اسلام کو ایک مکمل اور مرتبط الاجزاء نظام حیات کی حیثیت سے اس کتاب ہی سے جانا ہے، دین مقدس کی ایسی بہت سی باتیں جن کو پہلے میں صرف تقلیداً مانتا تھا اس جلیل القدر کتاب کے مطالعہ کے بعد الحمد للہ میں ان پر تحقیقاً اور علیٰ وجہ البصیرت یقین رکھتا ہوں ـــ' (یہاں اپنی یہ سرگزشت میں نے صرف اس لئے لکھدی ہے کہ شاید اسی کو دیکھ کر کسی اور کو بھی اس کتاب سے استفادہ کا شوق پیدا ہو جائے۔)

(۷) البدور البازغہ۔ اس کو "حجۃ اللہ البالغہ" کے خاص خاص ابواب کا خلاصہ کہا جا سکتا ہے بعض مباحث نئے بھی ہیں اب تک نایاب تھی ہندوستان بھر میں صرف دو تین جگہ اس کے قلمی نسخے معلوم تھے کچھ ہی دنوں پہلے "مجلس علمی" ڈابھیل نے چھاپ کر شائع کر دی ہے۔

(۸) ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء۔ اصل موضوع تو خلفاء راشدین کی خلافت کا اثبات ہے لیکن اسلام کے "اصول عمران و نظریہ سیاست" کی پوری تشریح بھی اس میں آگئی ہے، حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی جیسے وسیع النظر اور بحر العلوم کی شہادت ہے کہ "اس موضوع پر پورے اسلامی لٹریچر میں ایسی کوئی کتاب موجود نہیں۔" اصل زبان فارسی ہے ۱۲۸۶ھ میں پہلی بار مطبع صدیقی بریلی میں چھپی تھی اب عرصہ دراز سے نایاب ہو چکی ہے۔ ابتدائی چہارم حصہ کے قریب حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی نے اپنے ترجمہ کے ساتھ شائع فرمائی تھی وہ ملتی ہے پوری کتاب کا صرف ترجمہ لاہور میں بھی چھپا ہے اور غالباً ملتا ہے لیکن علاوہ کتابت کے ترجمہ میں بھی بڑی فاحش غلطیاں ہیں کاش مولانا لکھنوی مدظلہ

اپنے ترجمہ کی تکمیل فرمادیں اور اس طرح مع متن کے شائع ہو جائے۔ معلوم ہوا ہے کہ "مجلس علمی" ڈابھیل" اب اسکو عربی میں بھی منتقل کرا رہی ہے اور مصر میں اس کے چھپوانے کا ارادہ ہے، اگر یہ کام ہو گیا تو مجلس علمی کی نیکیوں میں یہ بہت بڑی نیکی کا اضافہ ہوگا۔

(۹) قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین۔ تفضیل شیخین کے موضوع پر بہترین علمی کتاب ہے۔

(۱۰) الانصاف۔ صحابہ و تابعین اور ان کے بعد ائمہ مجتہدین میں دینی مسائل کے بارہ میں جو اختلاف پیدا ہوا اُسکا ماخذ اور اس کی تاریخ اس رسالہ میں بیان کی گئی ہے۔ اُردو ترجمہ کے ساتھ کئی بار چھپ چکا ہے۔

(۱۱) عقد الجید۔ اجتہاد اور تقلید سے متعلق مباحث پر محققانہ تصنیف ہے، یہ بھی اردو ترجمہ کے ساتھ چھپی ہے۔

(۱۲) تحفۃ الموحدین۔ دعوتِ توحید خالص، اور رد شرک میں حضرت شاہ صاحبؒ کا فارسی زبان میں مختصر مگر بہت جامع رسالہ ہے، مضامین کے لحاظ سے اس کو شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی "تقویۃ الایمان" کا متن اور اس کی اساس و بنیاد کہا جا سکتا ہے۔ اب سے قریباً پچاس ساٹھ سال پہلے حکیم اجمل خاں مرحوم کے بڑے بھائی حکیم حافظ عبد المجید خاں مرحوم (بانی طبیہ کالج دہلی) کے پریس "اکمل المطابع دہلی" میں اردو ترجمہ کے ساتھ چھپکر شائع ہوا تھا، اب عرصہ دراز سے بالکل نایاب ہے، مجھے اس کا مطبوعہ نسخہ الہ آباد کے ایک دوست سے حاصل ہوا ہے اور میں اس کی دستیابی کو اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت سمجھتا ہوں۔ عنقریب اس کو چھپوانے کا بھی ارادہ ہے۔

(۱۳) شرح تراجم ابواب صحیح بخاری۔ صحیح بخاری کے تراجم الابواب کی تشریح میں یہ عربی رسالہ ہے۔ پہلے ۱۳۲۳ھ میں "دائرۃ المعارف حیدرآباد" سے شائع ہوا تھا، اب اسی سال "اصح المطابع دہلی" نے صحیح بخاری کا جو نسخہ چھاپا ہے تو اس کے شروع میں یہ پورا رسالہ بھی بطور مقدمہ لگا دیا ہے۔

(۱۴) مجموعہ رسائل اربعہ۔ یہ بہت چھوٹے چھوٹے چار رسالے ہیں جن کا تعلق فن حدیث سے ہی ہے (۱) "ارشاد الی مہمات الاسناد" (۲) رسالہ اوائل (۳) تراجم البخاری (یہ مذکورہ بالا رسالہ "شرح تراجم ابواب بخاری" کے علاوہ ہے اور صرف ایک ورق پر ہے) (۴) ما یجب حفظہ للناظر۔

(۱۸) تفہیمات الٰہیہ۔ یہ گویا "ولی اللہی کشکول" ہے، سلوک و تصوف اور علوم شریعت سے متعلق اس میں آپ کے متفرق افادات ہیں۔ پہلے اس کی صرف ایک جلد چھپی تھی اور عرصہ سے وہ بھی نایاب تھی، اب دونوں جلدیں گویا مکمل کتاب "مجلس علمی ڈابھیل" نے شائع کر دی ہے، بعض باتیں اس کتاب میں "عالم بالا" کی بھی ہیں جن کی حیثیت ہم جیسوں کے حق میں "متشابہات" کی ہے۔ بعض تفہیمات فارسی میں ہیں اور بعض عربی میں۔

(۱۹) خیر کثیر۔ تصوف اور "علم اسرار و حقائق" میں آپ کی بلند پایہ کتاب ہے، اس کی اشاعت کا شرف بھی پہلی مرتبہ مجلس علمی ہی نے حاصل کیا ہے ورنہ اب تک ہندوستان بھر میں ایک دو ہی جگہ اس کے قلمی نسخے معلوم ہوئے تھے۔

(۲۰) فیوض الحرمین۔ بزمانہ قیام حرمین شریفین حق تعالیٰ کی طرف سے جو الہامات یا روح پرفتوح سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی جانب سے جو افاضات آپ پر ہوئے اور جو خاص تعلیم و تلقین کی گئی آپ نے اُن سب کو اس رسالہ میں جمع کردیا ہے قریباً سوا سو صفحے پر اب سے بہت پہلے اردو ترجمہ کے ساتھ شایع ہوچکا ہے۔

(۲۱) الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین۔ آپ کو اور آپ کے بعض نسبی یا روحانی بزرگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو "مبشرات" ملے اس میں اُن کا بیان ہے۔

(۲۲) انفاس العارفین۔ اس میں شاہ صاحب نے اپنے بزرگوں کے احوال قلمبند فرمائے ہیں۔ آپکے اکثر سوانح نگاروں کا اس باب میں یہی کتاب ماخذ ہے، چھپ چکی ہے عام طور سے ملتی ہے۔

(۲۳) انسان العین۔ اسمیں شاہ صاحب نے اپنے مشائخ حرمین کا تذکرہ فرمایا ہے۔

(۲۴) القول الجمیل (۲۵) انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ (۲۶) الطاف القدس (۲۷) سطعات (۲۸) ہمعات (۲۹) لمعات ــــ یہ سب رسائل تصوف سے متعلق ہیں اور موخر الذکر چاروں رسالے عام افہام سے بالاتر بھی ہیں ــ بلکہ اکثر "اہل علم" بھی ان سے کچھ استفادہ نہیں کرسکتے سب چھپکر شائع ہوچکے ہیں۔

(۳۰) مکتوبات مع مناقب امام بخاری و ابن تیمیہ۔ اس چھوٹے سے مجموعہ میں آپ کے نہایت اہم چند مکاتیب جمع کئے گئے ہیں۔ حال ہی میں "نذیریہ لائبریری دہلی" کے مہتمم مولوی سید عبدالرؤف صاحب نے بھی ان مکاتیب کو مع ترجمہ کے شائع کیا ہے۔ لیکن کتابت طباعت کی غلطیاں اس اڈیشن میں بے حساب ہیں۔

(۳۱) مکتوب المعارف مع مکاتیب ثلثہ۔ یہ آپ کے بعض خاص مکاتیب کا ایک اور چھوٹا سا مجموعہ ہے۔

(۳۲) سرور المحزون۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "سیرت مقدسہ" کے بیان میں ابن سید الناس کے مختصر سے رسالہ "نور العیون" کا فارسی ترجمہ ہے جو بعض خاص احباب کی درخواست پر خود شاہ صاحب نے کیا تھا۔

(۳۳) الجزء اللطیف۔ حضرت شاہ صاحب کی خود نوشت مختصر سوانح عمری جس کا پورا خلاصہ صفحات ماسبق میں درج ہوچکا ہے۔

(۳۴) المقالۃ الوضیۃ فی الوصیۃ والنصیحۃ۔ یہ شاہ صاحب کا وصیت نامہ ہے چھپ بھی چکا ہے مگر میرے پاس اس کا ایک قلمی نسخہ ہے ــ یہاں تک جن ۳۴ کتابوں کا ذکر کیا گیا یہ سب چھپکر شائع ہوچکی ہیں، اور "ازالۃ الخفا" اور تصوف کے چند رسائل کے علاوہ باقی اور سب اب بھی ملتی ہیں اور صرف تین چار چھوٹے رسائل ۲۳ و ۲۸ و ۲۹ کو مستثنیٰ کرکے باقی سب کے جزوی یا کلی مطالعہ کا شرف اس عاجز کو بھی حاصل ہوا ہے۔ والحمد للہ علی ذلک۔

ان کے علاوہ آپ کی تصانیف میں کتب ذیل کا اور ذکر کیا جاتا ہے لیکن میں ان کے مطالعہ بلکہ زیارت سے بھی ابھی تک محروم ہوں اگرچہ ان میں سے بھی بعض چھپ چکی ہیں۔

شفاء القلوب، زہراوین، تاویل الاحادیث، ہوامع شرح حزب البحر، العقیدۃ الحسنہ، المقدمۃ السنیہ

چہل حدیث، شرح تراجم ابواب، مآثر الاجداد، العطیۃ الصمدیہ، فتح الودود فی معرفۃ الجنود، مسلسلات ۔

ان کے علاوہ آپ کی اور بھی بہت سی تصانیف تھیں جن کے آج نام بھی ہم کو معلوم نہیں، آپ کے علمی سلسلہ کے بعض ثقات آپ کی تصانیف سیکڑوں کے حساب سے بتلاتے ہیں، لیکن جو کتابیں آپ کی معلوم اور متداول ہیں صرف انہی کے مطالعہ سے علوم و مسائل میں آپ کی مجتہدانہ اور خدمت دین و اصلاح و ارشاد میں آپ کی مجددانہ شان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔ اور پھر علی وجہ البصیرت آپ کے اس دعوے اور تحدیث نعمت کی کہ "فلاطون کہ گردویدہ یونانے کہ من دارم" ـــ تصدیق کی جا سکتی ہے ۔ نیز آپ نے اپنے بارہ میں جو کہیں کہیں اس قسم کی باتیں کہی ہیں کہ

(۱) رأیتنی فی المنام قائم الزمان اعنی بذلک ان اللہ اذا اراد شیئاً من نظام الخیر جعلنی کالجارحۃ لاتمام مرادہ الخ (فیوض الحرمین)	میں نے خواب میں دیکھا کہ میں "قائم الزماں" ہوں یعنی اللہ تعالیٰ جب خیر کے کسی نظام کا ارادہ فرماتا ہے تو اپنے اس ارادہ کی تکمیل کے لئے وہ مجھے اوزار یا آلۂ کار کی طرح بنا لیتا ہے ۔

(۲) نعمت عظمیٰ برین فقیر آنست کہ او را خلعت فاتحیۃ دادہ اند فتح دورۂ بازپسیں بر دست وی کنند (خیر کثیر)

(۳) بسرم دادند کہ ایں حقیقت بمردم برساں کہ امروز وقت وقت تست و زمان زمان تو وائے بر کسے کہ زیر لوائے تو نہ باشد" الخ (تفہیمات)

(۴) ومن نعم اللہ علیّ ولا فخر ان جعلنی ناطق ھذہ الدورۃ وحکیمہا و قائد ھذہ الطبقۃ و زعیمہا الخ (تفہیمات)	اور مجھ پر اللہ تعالیٰ کے خاص احسانات میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے مجھے اس دور کا "ناطق" اور "حکیم" اور "قائد و زعیم" بنایا (اور یہ میں فخراً نہیں کہتا ہوں)

غرض اس قسم کے دعاوی جو شاہ صاحب کی تصانیف بالخصوص "تفہیمات الٰہیہ" میں بکثرت ملتے ہیں اور جو بڑے بلکہ یقیناً بہت بڑے دعوے ہیں، ان کی حقیقت کا ادراک اور حقیقت کا یقین بھی آپ کی ان تصانیف ہی کے مطالعہ سے انشاء اللہ بڑی حد تک حاصل ہو سکتا ہے ۔

شاہ صاحب کے سب سے بڑے شاگرد شاہ محمد عاشق رح

حضرت شاہ محمد عاشق پھلتی جو حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں اور جن کو شاہ عبدالعزیز کی استاذی کا بھی فخر حاصل ہے[۱] اور جن کا ذکر خود شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ کے دیباچہ میں نہایت بلند الفاظ میں فرمایا ہے بلکہ اس جلیل القدر کتاب کی تصنیف کا باعث اور محرک انہی کے بے پناہ اصرار کو بتلایا ہے ـــ اور ایک موقع پر خود انہی کو مخاطب کر کے ان کے ساتھ اپنی خصوصیت کا اظہار ان بلند کلمات میں فرمایا کہ

ھذا امر منکم بدء و الیکم یعود، وتلک کلمۃ (میرے علمی (افادات کے) اس سلسلہ کا آغاز بھی تم ہی

کنتم احق بها واهلها وحق الرب المعبود (مقدمہ خیر کثیر صـ)	ہوا اور تم ہی پر اس کا انجام بھی ہوگا اور ربِ معبود کی قسم کہ تم ہی ان "معارف" کے سب سے زیادہ مستحق اور اہل ہو،

اور "تفہیمات الٰہیہ" میں ایک جگہ انہی کے بارہ میں فرماتے ہیں:-

هو محمد الله نصحی و وعاء علمی وحافظ اسراری وناظر کتبی بل هو کان الباعث علی تسوید کثیر منها والمباشر لتبییضه واظن ان علومی تبقی فی الناس من جهته (تفہیمات صـ)	وہ سراپا میری نصیحت اور میرے علم کا خزانہ ہیں، میرے اسرار و معارف کی نگہداشت اور میری کتابوں میں غور و فکر انکا مشغلہ ہے بلکہ میری اکثر کتابیں انہی کی تحریک سے لکھی گئی ہیں اور انہوں نے ہی ان کی تبییض کی ہے اور مجھے توقع ہے کہ لوگوں میں میرے علوم انہی کے ذریعہ سے محفوظ رہیں گے۔

اور مولانا شاہ محمد عاشق خود بھی ایک جگہ بڑے جوش کی حالت میں حضرت شاہ صاحب کے علوم و معارف کیساتھ اپنی خصوصی نسبت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:-

حتی لو احلف علی ان کل ما ظهر من علومه واسراره دامت برکاتهم لاسیما من باب التصوف فما ظهر الا لاجلی وفی مخاطبتی ان شاء الله ما احنث۔ (مقدمہ خیر کثیر صـ۱۵)	اگر میں قسم کھا کے یہ دعویٰ کروں کہ حضرت دامت برکاتہم کے جو حقائق و معارف ظاہر ہوئے خصوصاً باب تصوف میں تو اُن سب کا ظہور میری ہی وجہ سے ہوا اور میں ہی اُن کا مخاطب اوّل تھا تو انشاء اللہ میں اپنی اس قسم میں حانث نہ ہوں گا۔

ظاہر ہے کہ حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کے علمی و عرفانی مقام کا پہچاننے والا اور آپ کی تصانیف جن علوم و معارف پر حاوی ہیں ان کی کنہ اور حقیقت کا جاننے والا ان شاہ محمد عاشق سے زیادہ اور کون ہو سکتا ہے انھوں نے شاہ صاحب کو جس روشنی میں دیکھا، اور آپ کو جو کچھ سمجھا وہ انہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے شاہ صاحب کی کتاب "خیر کثیر" پر جو مقدمہ انھوں نے فارسی میں لکھا ہے (اور مجلس علمی نے اس کو بھی خیر کثیر کے ساتھ شائع کر دیا ہے) اس میں آپ تمام فرماتے ہیں:-

شاہ صاحب کے علمی مقام کے متعلق شاہ محمد عاشق کا بیان

بر سالکان طریقت و طالبان حقیقت پوشیدہ نماند کہ چون حق سبحانہ وتعالیٰ فرد ے کامل را برائے مظہریت علوم و اسرار کامنہ خویش اصطفا نمے فرماید آن را بمنزلہ جارحہ خود ساختہ بزبان وے تکلم نمے نماید، پس ظہور آن علوم و اسرار از وے نہ بر قاعدۂ علوم رسمیہ کسبیہ می باشد کہ عقل آن را اولاً ودر یافت قاعدہ ضبط نمودہ بعد ازاں مربوط و مضبوط بر وے

کارآرد، بلکہ آں اسرار کہ در نفس مقدسہ دے ودیعت نہادہ اند ظہور آں ارادہ فرمودہ علی حبیب الواذات والتقریبات بروز میفرمایند...... (الی ان قال) ودریں زماں بایں مقام اسنی ذات مجمع آیات، مطلع فیض انوار، منبع علوم واسرار، ومخزن کنوز کمالات وراثت محمدیہ، معدن نقود رموز وصایت احمدیہ، مجدد قواعد شریعت، مقنن قوانین طریقت، مبین غوامض معرفت، محقق دقائق حقیقت، اعظم المحدثین ولی العصر، لسان اللہ، قطب الدین احمد، ابو الفیاض شیخ ولی اللہ است مد اللہ ظلال ارشادہ علی العلمین الی یوم الدین کما ہو ثابت عند اہل المعرفۃ والیقین، ومصداق ایں معنی آں ست کہ جناب ختمیۃ علی صاحبہا الصلوات والتسلیمات در بعضے مبشرات ذات کرامت آیات ایشاں را باذات لغات سمات خویش نسبت وجود ذہنی با وجود خارجی فرمودند ودراں مشہد بخطاب ذکی حکیم ہذہ الامۃ کرامت بخشیدند۔ یعنی انچہ از کمالات الٰہیہ درعین ثابتہ آنجناب بفعلیۃ خارجیہ ظہور نمودہ وآثار او بحقیق آثار خارجیہ خود ساختہ، ہماں معانی بتمامہا در عین معانی ایشاں درصورت علوم و معارف جلوہ گر گشتہ پس علوم واسرار ایشاں درحقیقت علوم واسرار آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام اند محفوظ آنہا موروث بشمول بشارت نضر اللہ امرأ سمع مقالتی فوعاھا کما سمعہا، است ''

(مقدمہ خیر کثیر صفحہ ۱۰)

درحقیقت شاہ صاحب کی تصانیف کی اہمیت کا پورا اندازہ اور آپ کے علمی وعرفانی مقام کا کچھ ادراک شاہ محمد عاشق جیسے ثقہ اور ربانی عالم ہی کے اس بیان کے ذریعہ ہوسکتا ہے جو خود بھی اس سمندر کے شناور ہیں، اسی واسطے ہم نے یہاں اُن کا یہ بیان نقل کیا ہے۔

شاہ صاحبؒ کی جامعیت افسوس ابھی شاہ صاحب کے متعلق کچھ بھی نہیں لکھا جا سکا اور مقررہ صفحات کا بیشتر حصہ پر ہو چکا اس لئے اب شاہ صاحب کی جامعیت اور ہر جہتی حیثیت کے متعلق چند اشارات اور کر کے مجبوراً اس سلسلہ کو ختم کیا جاتا ہے۔ میرے نزدیک شاہ صاحب کا سب سے بڑا امتیازی کمال اُن کی یہی جامعیت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنے جد اعلیٰ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے اُن کو میراث ملی ہے۔

ہمارے محترم مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے النبی الخاتم صلے اللہ علیہ وسلم کی جو سیرت اپنے مخصوص الہامی انداز میں لکھی ہے اور جس کی اشاعت کا شرف گزشتہ سال ہی کارپردازانِ الفرقان کو حاصل ہوا ہے اُس میں دربار نبوی کی ہر جہتی حیثیت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے:۔

عجب دربار :-

دربار نبوی کی ہرجہتی حیثیت

سلاطین کہتے ہیں شاہی دربار تھا، کہ فوج تھی، علَم تھا، پولیس تھی، جلّاد تھے، محتسب تھے، گورنر تھے، کلکٹر تھے، منصف تھے، ضبط تھا، قانون تھا ۔ مولوی کہتے ہیں مدرسہ تھا کہ درس تھا، وعظ تھا، افتا تھا، قضا تھا، تصنیف تھی، محراب تھی، منبر تھا ۔ صوفی کہتے ہیں خانقاہ تھی، کہ دعا تھی، جھاڑ تھا، پھونک تھا، رد تھا، وظیفہ تھا، ذکر تھا، شغل تھا، تحنث (چلہ) تھا، گریہ تھا، بکا تھا، وجد تھا، حال تھا، کشف تھا، کرامت تھی، فقر تھا، زہد تھا، قناعت تھی، کنکریاں دکھاتی تھیں کہ کھارے کنوں کا پانی میٹھا ہو جائے گا، بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرا جاتا ہے جس کو جو کچھ کہہ دیا جاتا ہے پورا ہوتا ہے ۔ مگر سچ یہ ہے کہ وہ سب کچھ تھا اس لئے کہ وہ سب کیلئے تھا ۔ آئندہ جس کسی کو چلنا تھا، جہاں کہیں چلنا تھا، جس زمانہ میں چلنا تھا اسی کی روشنی میں چلنا تھا" (النبی الخاتم صـ۱۶۱)

اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی جامعیت کا نقشہ خود حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ نے ازالۃ الخفا میں با یں الفاظ کھینچا ہے :-

فاروق اعظم کی شان جامعیت شاہ ولی اللہ کی زبانی

سینۂ فاروق اعظم را بمنزلہ خانہ تصور کن کہ درہائے مختلف دارد و در ہر درے صاحب کمالے نشستہ در یکدر مثلاً سکندر ذوالقرنین باآں ہمہ سلیقہ ملک گیری وجہانستانی وجمع جیوش و برہم زدن جنود اعداء و در دیگر نوشیروانے باآں ہمہ رفق ولین ورعیت پروری وداد گستری اگرچہ ذکر نوشیرواں در مبحث فضائل حضرت فاروق سوء ادبست و در دیگر ابوحنیفہ یا امام مالکے باآں ہمہ قیام بعلم فتاوی واحکام و در دیگر مرشدے مثل سیدی عبدالقادر یا خواجہ بہاء الدین قدس سرہما و در دیگر محدثے بروزن ابوہریرہؓ وابن عمرؓ و در دیگر قاریے ہمسنگ نافع یا عاصم و در دیگر حکیمے مانند مولانا جلال الدین رومی یا شیخ فریدالدین عطار (ازالۃ الخفا جلد دوم صـ۱۱ مطبوعہ مطبع صدیقی بریلی)

اگر غور کیا جائے تو یہی عبارت خود حضرت شاہ صاحب پر معمولی تغیر کے ساتھ منطبق ہو جاتی ہے ۔

شاہ ولی اللہ کی جامعیت لم تعلیٰ نظر

اسلام کے جس فن کے بھی اعاظم رجال کی تاریخ لکھی جائے حضرت شاہ صاحب کا تذکرہ اس میں خاص امتیاز کے ساتھ کرنا مصنف کا فرض ہوگا جس میں کوتاہی اس کی نااہلیت یا تعصبی بدنیاتی سمجھی جائے گی ۔

شاہ صاحب بحیثیت مفسر قرآن

مثلاً اگر مفسرین قرآن کی تاریخ لکھی جائے تو اس باب کے شاہ صاحب کے بے نظیر افادات الفوز الکبیر فتح الخبیر فوائد فتح الرحمان، تاویل الاحادیث، اور ازالۃ الخفاء حجۃ اللہ البالغہ کے خاص تفسیری مباحث کا تقاضا ہوگا کہ ان کے نام نامی کو اسمیں نمایاں جگہ دی جائے ۔

شاہ صاحب بحیثیت شارح حدیث

علیٰ ہذا اگر محدثین اور شارحین حدیث نبوی پر کوئی کتاب تیار کی جائے تو اس فن کے ان کے

منتشر اور متنوع افادات مصفیٰ مسوّیٰ اور حجۃ اللہ جلد اوّل کے بعض خاص ابواب اور پوری جلد دوم کا تقاضا ہوگا کہ اس کتاب میں بھی اُن کا ذکر نمایاں طور پر کیا جائے۔

شاہ صاحب بحیثیت فقیہ امت

اور اگر فقہاء اسلام کی کوئی تاریخ مرتب ہو تو تفقہ میں حضرت شاہ صاحب کو جو یدِ طولیٰ حاصل ہے جس کا پتہ حجۃ، بدور، انصاف اور عقد الجید سے چلتا ہے اس کی بنا پر زمانہ کے تاخر کے باوجود اُن فقہاء و مجتہدین کے ساتھ آپ کا ذکر کرنا ہوگا جو اُن سے کم از کم پانچ چھ سو برس پہلے گزر چکے ہیں۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اگر صرف حجۃ کے مبحث سادس و سابع" (از صفحہ ۶ تا صفحہ ۱۱۱) ہی کو بامعان نظر دیکھ لیا جائے تو اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ فقہ دین میں شاہ صاحب کا پایہ متقدمین میں بھی کس قدر بلند ہے۔ کاش ہمارے زمانہ کے اہل علم ان بیش بہا اور نادرالوجود علمی جواہر پاروں کی قدر و قیمت سمجھتے۔

شاہ صاحب بحیثیت متکلم اسلام

اور اگر علم کلام کی تاریخ مدون ہو اور اس فن کے ماہرین کے کارناموں کو کسی کتاب میں جمع کیا جائے تو علامہ سعد تفتازانی، قاضی عضد اور سید سند جیسے مصنفین فن کے زمرہ میں نہیں بلکہ امام ابوالحسن اشعری اور امام غزالی اور امام ابن تیمیہ حرانی جیسے ممتاز ائمہ کے ساتھ اُن کا ذکر کرنا مورخ کا فرض ہوگا — صرف حجۃ اور بدور ہی کے مطالعہ سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ شاہ صاحب نے علم کلام کا ایک مستقل ذیلی اسکول ترتیب دیا ہے اور اس فن میں وہ ایک گونہ استقلالی اور انفرادی شان رکھتے ہیں۔ علامہ شبلی مرحوم نے "علم الکلام" میں شاہ صاحب کی اس حیثیت پر کچھ روشنی ڈالی ہے۔ لیکن چونکہ اس کی حیثیت صرف ایک ضمنی تذکرہ کی ہے اس لئے وہ اصلیت اور ضرورت دونوں سے بہت کم ہے، ضرورت ہے کہ اس موضوع پر مستقلاً کچھ لکھا جاتے اور پورے بسط و تفصیل سے لکھا جائے ایسی چیز کے تیار ہونے سے پہلے جو حضرات شاہ صاحب کی اس حیثیت کا اندازہ کرنا چاہیں وہ علامہ شبلی کی "علم الکلام" (صفحہ ۱۰۹ تا ۱۱۱) دیکھنے کے بعد اور کچھ نہیں تو صرف "حجۃ اللہ" کی جلد اوّل ورنہ کم از کم اُس کے چند ابواب "ایمان بصفات اللہ"، "ایمان بالقدر"، "باب الحاجۃ الی ہذہ السبل"، "باب حقیقۃ النبوۃ و خواصہا"، "اسباب التکلیف والمجازات"، "باب الحاجۃ الی دین ینسخ الادیان" ہی ملاحظہ فرمالیں، صرف اتنی سی محنت سے بھی شاہ صاحب کے علم کلام کے خاص اصول ذہن میں آ سکتے ہیں، اور پھر ان سے اس فن کا پورا کام لیا جا سکتا ہے۔

شاہ صاحب بحیثیت امام سلوک و تصوف

اور اگر صوفیہ صافیہ و ائمہ سلوک و معرفت کی کوئی جامع تاریخ لکھی جائے تو اس باب کی شاہ صاحب کی مستقل تالیفات "خیر کثیر"، "القول الجمیل"، "الطاف القدس" وغیرہا اور حجۃ و بدور کے "ابواب احسان" کی بنا پر امام غزالی و سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی اور امام ربانی شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی (قدس اسرارہم) کے ساتھ اُن کا بھی ذکر کرنا مورخ کا فرض ہوگا۔

شاہ صاحب اور علم حقائق و اسرار

ایسے ہی اگر امت محمدیہ میں "حقائق" و "اسرار الٰہی" پر کلام کرنیوالوں کی کوئی فہرست تیار کیجائے

تو حضرت شیخ شبلی اور شیخ محی الدین اکبر ابن عربی کے ساتھ شاہ صاحب کے اس فن کے رسائل سطعات، لمعات وغیرہ اور "تفہیمات الٰہیہ" کی بعض تفہیموں کی بنا پر آپ کا نام نامی بھی اس فہرست میں نمایاں جگہ پر ہوگا۔

شاہ صاحب بحیثیت معلم اخلاق و حکمت عملی

اور اگر اساتذہ اخلاق و معلمین حکمت عملی پر کوئی کتاب لکھی جائے تو حضرت شاہ صاحب کے اس فن کے افادات مندرجہ مکاتیب متفرقہ و انفاس اور بعض ابواب حجۃ اللہ کی بنا پر امام ابو حامد غزالی، شیخ سعدی شیرازی اور محقق جلالی دوانی کے ساتھ آپ کا تذکرہ کرنا بھی مؤلف کتاب کا منصبی فرض ہوگا۔

شاہ صاحب بحیثیت ماہر اقتصادیات و معاشیات

اور علی ہذا اگر ماہرین اقتصادیات و معاشیات کی کوئی تاریخ لکھی جائے تو اس میں بھی شاہ صاحب کا تذکرہ نہایت نمایاں طور پر ہوگا۔ صرف "حجۃ اللہ البالغہ" اور "بدور بازغہ" میں ابواب "ارتفاقات" کے ذیل میں انھوں نے اقتصادی اور معاشی مسائل پر جو کلام کیا ہے اور جو اصول اس سلسلہ میں مرتب کئے ہیں اگر کوئی حکومت نیک نیتی اور دیانت داری کے ساتھ ان کو اپنا "دستور اساسی" قرار دے لے تو یقیناً انشاء اللہ اس کی قلمرو میں وہ ہمہ گیر بے چینی اور طبقاتی کشمکش پیدا نہ ہوگی جو اقتصادی اور معاشی الجھنوں ہی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور فی زمانا جس نے قریباً ہر ہی ملک کے باشندوں سے چین و اطمینان اور زندگی کا سکون چھین لیا ہے اور بنی آدم کی غالب اکثریت کے حق میں جیتے جی ہی اس دنیا کو دوزخ بنا دیا ہے۔ ہمارے محترم دوست مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے اس باب کے شاہ صاحب کے خاص افادات کا خلاصہ اپنے ایک مستقل مقالہ میں بڑے سلیقہ سے مرتب کر دیا ہے، یہ مقالہ اب سے قریباً ایک سال پہلے ان کے رسالہ "ترجمان القرآن" میں شائع بھی ہو چکا ہے میں نے اپنے اصل مقالہ میں (جو اس نمبر ہی کیلئے مرتب کیا گیا تھا لیکن عدم گنجائش کی وجہ سے اس میں درج نہیں ہو سکا) مولانا مودودی کے اس پورے مقالہ کو لے لیا تھا اور اس پر شاہ صاحب ہی کی تالیفات سے کچھ اور بھی اضافہ کیا تھا۔ انشاء اللہ ناظرین کرام کبھی "الفرقان" ہی کے صفحات پر اس کو ملاحظہ فرمائیںگے اور اسی سے اس خاص باب میں شاہ صاحب کی باریک بینی اور حقیقت رسی کا اندازہ کر سکیں گے۔

شاہ صاحب اور امور سلطنت و حکومت

علی ہذا سیاسی حذاقت اور حکومت کے تمام شعبوں کی صحیح تشکیل پر ان کی قدرت کا اندازہ بھی حجۃ و بدور کے انہی "ابواب ارتفاقات" سے کیا جا سکتا ہے۔۔۔ شاہ صاحب نے انہی ابواب میں حکومت کے مالیات، نظام عدل، فوج، پولیس، حتیٰ کہ میونسپلٹی اور "شہر بارہ" تک کی تنظیم کا صحیح طریقہ اور مکمل نقشہ پیش کر دیا ہے، اور ازالۃ الخفاء میں تو "حدیث دیگراں" کے اندر ہی اندر "حکومت الٰہیہ" کا پورا خاکہ ہی دیدیا ہے۔۔۔ کاش دیکھنے والے ان چیزوں کو اس نظر سے بھی دیکھیں۔

شاہ صاحب نے حکومت الٰہیہ کے قیام کیلئے کوئی انقلابی قدم کیوں نہیں اٹھایا

رہا یہ سوال کہ پھر شاہ صاحب نے ان ہی خطوط پر "حکومت الٰہیہ" قائم کرنے کیلئے کوئی انقلابی "جد و جہد" کیوں نہیں کی؟ تو اگرچہ میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ "مجددین" اور "ارباب ارشاد"

کے کاموں میں کوئی کمی نہیں رہ سکتی"، لیکن واقعہ یہ ہے کہ شاہ صاحب کی زندگی میں اس قسم کے کسی اقدام کے نہ ملنے سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ "ان کے کام میں یہ کمی رہ گئی" ۔ اپنے مکمل مقالہ میں اس پہلو پر میں نے مفصل بحث کی ہے اور انشاءاللہ ناظرین کرام اسی کو دیکھنے کے بعد اس بارہ میں صحیح رائے قائم کرسکیں گے یہاں تو اس وقت اس کی طرف صرف اتنا ہی اشارہ کیا جا سکتا ہے — کہ ہر کام کے عمل میں آجانے کیلئے صرف کام کرنیوالے کی صلاحیت ہی شرط نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ وقت کی سازگاری اور ماحول کی صلاحیت بھی ضروری ہے اسکے بغیر کوئی قدم اٹھا دینا ناعاقبت اندیشی اور خام کاری پر محمول ہوتا ہے نیز یہ بھی ظاہر ہے کہ اس قسم کے کام اس عالم اسباب میں افراد سے نہیں ہوتے بلکہ جماعتوں سے انجام پاتے ہیں، اور شاہ صاحب کے زمانہ میں ملت ہندیہ اسلامیہ کی حالت اس قدر گر چکی تھی کہ اس میں سے اس "کار عظیم" کو انجام دینے والے افراد چھانٹے بھی نہیں جا سکتے تھے تو شاہ صاحب کے لئے پہلا کام "اس جماعت" یا "پارٹی" کا تیار کرنا تھا جو اس مقصد کی قدر و قیمت جان کر وقت آنے پر اس کے لئے اٹھ سکتی اور اس کام کو صحیح طریقہ پر چلا سکتی۔ ان کی تصانیف سے صاف ظاہر ہے کہ وہ پوری طرح اس کوشش میں ہیں کہ کم از کم قوم کے خواص کے طبقہ میں جو عام قوم کا دل دماغ ہوتا ہے ایسا ذہنی انقلاب پیدا کردیں جو ان کو اس نصب العین سے قریب کردے اور اس مقصد اعلیٰ کی سرانجامی کے لائق بنا دے اور بسا اوقات ایسا ہی ہوتا ہے کہ اس قسم کے کاموں کی بنیاد ڈالنے والے صرف بنیاد ڈال کر ہی چلے جاتے ہیں — ان کے بعد اس عمارت کی تکمیل بعد والوں کا فرض رہ جاتا ہے۔ تو میرے نزدیک شاہ صاحب کو اس باب میں صرف اتنے ہی کام کا وقت ملا کہ اس "حزب اللہ" کے پیدا کرنے کیلئے صالح لٹریچر تیار کیا اور اس کام کے لئے پورا لائحہ عمل بھی مرتب فرمایا — اب کام کو اس سے آگے بڑھانا اور مناسب وقت آنے پر آپ کے معین کردہ خطوط پر کوئی انقلابی تحریک اٹھانا اور اس کو کامیاب بنانے کے لئے مناسب تدابیر اختیار کرنا، یہ کام بعد والوں کا تھا اور بعد والوں نے کیا بھی، چنانچہ آپ ہی کے صلبی پوتے شاہ اسمٰعیل شہید رح اور دوسرے ایک روحانی پوتے امیرالمومنین سید احمد شہید رح نے مناسب وقت آجانے پر جو تحریک اٹھائی میرے نزدیک وہ شاہ صاحب ہی کی ان کوششوں کا نتیجہ تھا مگر بخت کی نامساعدت اور کام میں کچھ خامیوں کی وجہ سے جن کا کچھ ذکر بعض پہلے مقالات میں بھی آچکا ہے ناکامیابی پر اس تحریک کا انجام ہوا۔

تنازع للبقاء کی اس دنیا کی تاریخ میں حق پرستوں کی کسی جد و جہد کا اس طرح ناکامیاب ہو جانا کوئی نئی بات نہ تھی، مگر وائے بدبختی بجائے اس کے کہ ہم اس معرکہ میں "اسباب شکست" کا کھوج لگاتے اور ان کی تلافی کی کوشش کرتے اس راستہ ہی سے مایوس ہو کر ہم پلٹ پڑے بلکہ اس مقدس نصب العین ہی کو پس پشت ڈال دیا . . . .

خیر بات دور چلی گئی اور دور چلی جا رہی ہے، ورنہ یہاں تو صرف یہ عرض کرنا تھا کہ حضرت شاہ ولی اللہ

اقدس سرہ کی زندگی میں "حکومت الٰہیہ" کے قیام کے لئے کوئی "انقلابی جدوجہد" نہ دیکھ کر یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کہ اُن کے کام میں "یہ کمی رہی" اصل یہ ہے کہ وہ وقت اس کام کا تھا ہی نہیں ورنہ اگر زمین اس کے لئے تیار ہوتی اور وقت کا یہی تقاضا ہوتا تو شاہ صاحب کے وہ مقالات جن میں آپ نے نظامِ حکومت کی تشکیل اور عسکری قوت کی تنظیم و تقسیم سے بحث کی ہے اُن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آپ اس قسم کی مہموں کو بھی خوب انجام دے سکتے تھے۔ خود بھی ایک جگہ صاف لفظوں میں لکھ گئے ہیں:-

فلو فرض ان یکون ھذا الرجل فی زمان واقتضت الاسباب ان یکون اصلاح الناس باقامۃ الحروب ونفث فی قلبہ اصلاحھم لقام ھذا الرجل بامر الحرب اتم قیام وکان اماماً فی الحرب لایقاس بالرستم والاسفندیار بل الرستم والاسفندیار وغیرھما طفیلیون علیہ مستمدون منہ مقتدون بہ

(تفہیمات الٰہیہ جلد ۱ ص ۱۷)

اگر بالفرض یہ شخص ایسے زمانہ میں ہوتا کہ اسباب کا اقتضا یہی ہوتا کہ لوگوں کو جنگ اور قتال سے درست کیا جائے اور اس کے دل میں ڈالا جاتا کہ تلوار ہی سے دنیا کے نظام کو درست کرے تو یہ شخص پھر یہی کرتا اور الحمدللہ بڑی خوبی سے اس کام کو انجام دیتا اور دنیا دیکھ لیتی کہ رستم واسفندیار بھی اس کے مقابلہ میں ہیچ ہیں بلکہ وہ اس کے طفیلی اور شاگرد بننے کے لائق ہیں۔

رہا یہ کہ شاہ صاحب کے زمانہ میں اصلاح کیلئے جنگ وقت کا تقاضا کیوں نہ تھا، افسوس ہے کہ یہاں اس کی طرف کوئی مجمل اشارہ بھی نہیں کیا جا سکتا ناظرین کرام اس کے لئے میرے "اصل مقالہ" کی اشاعت کا انتظار فرمائیں اس میں یہ بحث پورے بسط اور تفصیل سے کی گئی ہے۔

شاہ صاحب اور فلسفۂ تشریع

حضرت شاہ صاحب رح کی ایک اور امتیازی خصوصیت جس کے بیان پر ہم کو یہ سلسلہ ختم کر دینا ہے، وہ "فلسفۂ تشریع" کی تدوین بلکہ اس کی ایجاد ہے۔ امتِ محمدیہ میں آپ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے کل نظامِ شریعت کا فلسفہ مدون فرمایا اور شریعت اسلامیہ کے تمام جزوی و کلی احکام کو باہم گر اس فلسفہ کے ذریعہ اس طرح مرتبط اور منتظم کر دیا کہ دیکھنے والا اب آپ کی رہنمائی میں اسلام کی پوری شریعت کو ٹھیک اس طرح دیکھ سکتا ہے کہ گویا وہ ایک مشین ہے اور ہر ہر حکم اس کا ایک پُرزہ ہے اور ان پُرزوں کے ساتھ اس مشین کا تعلق ایسا جچا تلا ہے کہ نہ تو وہ کسی ایک پُرزہ کی علیحدگی ہی کو قبول کر سکتا ہے اور نہ کسی اجنبی پُرزہ کے اضافہ ہی کی اسمیں گنجائش ہے ——

نئی روشنی کے اس دور میں جبکہ ہر چیز کی حکمت اور لِم پوچھی جاتی ہے، اور "فلاسفی" دریافت کئے بغیر دنی کا لقمہ

بھی نہیں توڑا جاتا، شاہ صاحب کی کتابوں حجۃ اللہ اور بدور بازغہ کے ذریعہ مذہبی دنیا کے میدان مسابقت میں صرف مسلمان ہی بازی لے جا سکتے ہیں ۔ شاہ صاحب کا یہ وہ کارنامہ ہے جس کی وجہ سے اسلام کے علمی خادموں میں ان کو بلا شرکت غیرے ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ حجۃ کے دیباچہ میں خود بھی فرماتے ہیں:۔

وان من اعظم نعم اللہ علیّ ان اٰتانی منہ حظًا وجعل لی منہ نصیبًا (ص۳)

اور اللہ تعالےٰ کی تمام نعمتوں میں عظیم ترین نعمت مجھ پر یہ ہے کہ اس نے اس علم (اسرار دین یا فلسفۂ شریعت) سے مجھے وافر حصہ عطا فرمایا۔

اور "الجزء اللطیف" میں جس کا پورا خلاصہ ہم پہلے درج کر چکے ہیں اسی فن کے متعلق ارقام فرماتے ہیں:۔

واسرار حدیث ومصالح احکام وترغیبات وسائر آنچہ حضرت پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم از خدائے تعالےٰ آوردہ اند وتعلیم فرمودہ اند وآں فنے است کہ پیش از فقیر مضبوط تر از سخن ایں فقیر کسے آں را ادا نہ کردہ است باوجود جلالت آں فن (ص۲۸)

حجۃ اللہ البالغہ اور بدور بازغہ، اسی فن کی مستقل کتابیں ہیں اور اوّلاً و بالذات اِن دونوں کتابوں میں اسی سے بحث کی گئی ہے "عقائد وایمانیات" سے لیکر کتاب الطہارۃ، پھر عبادات، معاملات، معاشرت، سیاست منزلی اور سیاست مدنی وملکی اور اصول جہانبانی وجہانداری، غرض تمام ابواب شریعت اور احکام اسلام کے مصالح اور ان کا فلسفہ حجۃ اللہ میں بالاستیعاب، اور بدور بازغہ میں بھی اس کا کافی حصہ آپ نے درج فرما دیا ہے۔

یہاں تک ہم نے شاہ صاحب کے جن کمالات عشرہ کا ذکر کیا اُن کا تعلق آپ کی افادی اور ارشادی حیثیت سے ہے۔ گویا یہ جو کچھ بھی آپ نے کیا امت کے خواص یا عوام کے لئے تھا، رہا یہ کہ خود آپ کے "اندر" کا کیا حال تھا؟ سو اس کا صحیح اندازہ تو "تفہیمات الٰہیہ" کی بعض خاص تفہیموں سے ہوتا ہے جہاں کسی خاص حال سے مغلوب ہو کر شاہ صاحب اس بارہ میں کچھ کہہ گزرے ہیں ۔ مگر افسوس ہے کہ یہاں اُن تفہیموں کے مختصر سے مختصر اقتباسات کے لئے بھی گنجائش نہیں، نیز یہ بھی خطرہ ہے کہ بلا تشریح سادہ طور پر ان کا نقل کر دینا ممکن ہے بہت سوں کے لئے موجب فتنہ بن جائے اس لئے یہاں اُن کے صرف بعض فارسی اشعار پر اکتفا کیا جاتا ہے اُن سے بھی آپ کے اندرونی سوز و گداز کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ شاعری شاہ صاحبؒ کا پیشہ بلکہ کام بھی نہ تھا البتہ کبھی کبھی "آتش دل" کے شعلے "غیر شاعروں" کی زبان پر بھی شعری شکل اختیار کر لیتے ہیں، میرے نزدیک شاہ صاحب کی "شاعری" کی حقیقت بھی بس یہی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ باوجود تلاش کے مجھے شاہ صاحب کے یہاں صرف اسی قسم کے شعلے جن کو کسی باطنی حال اور اندرونی التہاب ہی کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے انہی میں سے چند شعر اُن کے صرف ایک مکتوب سے چُنکر یہاں درج کئے جاتے ہیں:۔

شاہ صاحب کے باطنی حال اور قلبی واردات کے چند نمونے

"مکتوب المعارف" جس کا تذکرہ بذیل" تصنیفات" کیا جا چکا ہے اُس کے آخر میں بطور ضمیمہ ایک مکتوب حضرت کا لگا ہوا ہے جس میں آپ نے اپنے کسی خاص متوسل کے لئے اپنے بعض اشعار اور رباعیات کی خود ہی مختصر شرح کی ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ "ما فیہا" کی طرف کچھ اشارات کئے ہیں، صرف اسی مکتوب سے دو چار شعر یہاں پیش کئے جاتے ہیں:-

ایک غزل کا مطلع ہے ؎

دلے دارم زخود خالی حبابش میتواں گفتن	درو کیفیتے چوں شرابش میتواں گفتن

ایک اور غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

بزلف پیچ در پیچ کسے گم کردہ ام خود را	خروشے در دل شبہائی کردم چہ میکردم
کسے بائل ہمے سازد کسے باگل ہمی بازد	اگر من یاد آں لبہائے کردم چہ میکردم

ایک اور غزل کا ایک شعر ہے ؎

جانِ من در ہجر یار خود لبہ ختت	من عذاب الہجر اجرنی یا مجیر

ایک اور غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں جن میں عالم تجرد" اور "رفیق اعلیٰ" کی طرف اپنے والہانہ شوق و فہ نظر کا اظہار فرمایا ہے ؎

تا بکے محنت و مہجوری دوری کشم	نازنینِ دلبرم سوئے وطن باز روم
تا بکے بستۂ زنجیر تعلق باشم	آہوئے از ختنم سوئے ختن باز روم

دو رباعیاں بھی آپ کی ملاحظہ ہوں۔

(۱)

در عشق تو از جملہ جہاں بگذشتم	وز ہر چہ بجز یاد تو از آں بگذشتم
مقصود من بندہ بجز وصل تو نیست	اندر طلبت از دل و جاں بگذشتم

(۲)

دائم دل من پیش تو حاضر باشد	چشمم برخ خوب تو ناظر باشد
در مذہب ما ترک ہمی امت و صریح	گر روئے دگر خطرۂ خاطر باشد

انہی چند اشعار سے آپ کے اندرونی حال کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب کے جن کمالات کی طرف ہم نے یہاں تک کچھ اشارات کئے ہیں قارئین کرام غالباً انہی سے شاہ صاحب کی جامعیت اور ہمہ جہتی حیثیت کا کم از کم اجمالی اندازہ ضرور کر سکے ہوں گے تفصیل کے لئے میرے اصل مقالہ کی اشاعت کا انتظار فرمایا جائے۔ اس میں مستقل عنوانات کے ماتحت اِن تمام کمالات پر

مفصل کلام کیا گیا ہے اور ان میں سے ہر باب کے آپ کے افادات کے اقتباسات بھی اس میں پوری تفصیل سے درج کئے گئے ہیں ۔ اگر کہدیا جائے کہ وہ مقالہ شاہ صاحب کے ہر جہتی علوم و معارف کا پورا خلاصہ ہے تو انشاء اللہ مبالغہ نہ ہوگا ۔ اور اب نظر ثانی میں اس پر بہت کچھ اضافہ کا بھی ارادہ ہے اس سے توقع ہے کہ اس کے بعد وہ ڈھائی تین سو صفحہ کی مستقل کتاب ہو جائے گی ۔ اور انشاء اللہ الفرقان کے ایک مستقل نمبر ہی کی حیثیت سے شائع ہو کر ناظرین کرام کی خدمت میں پہنچ جائے گی ۔ اس مختصر مقالہ کو جو اس وقت آپ کے زیر نظر ہے اور ۲۴ صفحے کی محدود وسعت کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا ہے اس اصل مقالہ کا خلاصہ کہنا تو صحیح نہیں ہوگا البتہ یہ اس کے اکثر مضامین کی ایک فہرست ضرور ہے۔

اُس مقالہ کے آخر میں حضرت کا پورا وصیت نامہ بھی درج کیا گیا تھا بلکہ وہی اس کا خاتمہ قرار دیا گیا تھا۔ اب یہاں اس کی تو گنجائش نہیں البتہ تبرکاً وصیت نامہ کی سب سے پہلی اور سب سے آخری وصیت یہاں بھی نقل کرکے اس سلسلہ کا "خاتمہ بالخیر" کیا جاتا ہے۔

حمد و صلوٰۃ کے بعد اولاً اپنی اولاد کو اور ثانیاً احباب کو مخاطب کرکے پہلی وصیت یہ فرماتے ہیں:۔

کتاب و سنت کے ساتھ دائمی وابستگی کے متعلق شاہ صاحب کی پہلی وصیت

اول وصیت این فقیر چنگ زدن است بکتاب و سنت در اعتقاد و عمل و پیوستہ بتدبر ہر دو مشغول شدن و ہر روز حصّہ از ہر دو خواندن و اگر طاقت خواندن ندارد ترجمہ ورقے از ہر دو شنیدن ۔ و در عقائد مذہب قدمائے اہل سنت اختیار کردن و از تفصیل و تفتیش آنچہ سلف تفتیش نکردند اعراض نمودن و بہ تشکیکات خام معقولیان التفات نکردن، و در فروع پیروی علماء محدثین کہ جامع باشند میان فقہ و حدیث کردن، و دائماً تفریعات فقہیہ را بر کتاب و سنت عرض نمودن آنچہ موافق باشد در حیز قبول آوردن والّا کالائے بد بریش خاوند دادن، امت را ہیچ وقت از عرض مجتہدات بر کتاب و سنت استغنا حاصل نیست، و سخن متقشفۂ فقہاء کہ تقلید عالمے را دستاویز ساختہ تتبع سنت را ترک کردہ اند نشنیدن، و بدیشان التفات

اس فقیر کی پہلی وصیت یہ ہے کہ اعتقاد اور عمل دونوں میں کتاب و سنت (قرآن و حدیث) کو نہایت مضبوطی سے پکڑا جائے اور برابر ان میں تدبر جاری رکھا جائے اور اگر عربی نہ جاننے کی وجہ سے خود نہ پڑھ سکتا ہو تو کسی دوسرے سے کم از کم ایک ورق دونوں کا ترجمہ ہی سن لیا کرے ۔ اور عقائد میں قدماء اہل سنت کا مسلک اختیار کیا جائے اور سلف نے جس چیز کی کھود کرید نہیں کی اس کے پیچھے نہ پڑا جائے اور "معقولیان خام" جو شبہات پیدا کرتے ہیں اُن کی طرف مطلق توجہ نہ کی جائے اور فروع فقہ میں ان علماء محدثین کی پیروی کی جائے جو حدیث اور فقہ کے جامع ہوں اور ہمیشہ فقہی تخریجات کو کتاب و سنت پر ضرور پیش کیا جائے پھر جو اس کے موافق ہو اس کو قبول کیا جائے ورنہ کالائے بد بریش خاوند والا معاملہ کیا جائے اور یہ یاد رکھا جائے کہ اُمت کسی وقت

نکردن، در قربتِ خدا جستن بدوری ایشاں۔ | ہر مجتہدات فقہا" کو کتاب و سنت سے جانچنے سے مستغنی اور بے نیاز نہیں۔

ہوسکتی، اور ایسے متقشف "فقیہ" جو کسی عالم کی بات کو دستاویز بنا کر سنت کے تتبع سے بے پروا ہو گئے ہیں ان کی بات تک نہ سنی جائے اور ان کی طرف کسی قسم کا التفات نہ کیا جائے بلکہ اُن سے دور رہ کر خدا کی خوشنودی اور اس کا قرب حاصل کیا جائے۔

شاہ صاحب کا فقہی مسلک

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ پہلی وصیت ہے اور فی الحقیقت ایک صاحب بصیرت اور خدا ترس عالم ربانی کا یہی دستور العمل ہونا چاہئے۔ اسی وصیت سے شاہ صاحبؒ کا فقہی مسلک بھی معلوم ہو جاتا ہے اس نمبر کے کئی مقالوں میں یہ بحث براہِ راست اور ضمناً آئی ہے اور مختلف نقطہائے نگاہ رکھنے والے مضامین نگار حضرات نے اس بارہ میں اپنا اپنا خیال ظاہر فرمایا ہے کہ شاہ صاحب کا فقہی مسلک کیا تھا ۔۔۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی جن کتابوں تک میری رسائی ہو سکی اُن سب کو دیکھنے کے بعد اس باب میں جس نتیجہ پر میں پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ شاہ صاحب کی شخصیت اس سے بالاتر ہے کہ تقلید و عدم تقلید کی اس بحث میں ان کو گھسیٹا جائے۔

ملّت کی انتہائی بدقسمتی ہے کہ شاہ صاحب کی وہ ذات جس کا صحیح اور عادلانہ فیصلہ حامیانِ تقلید اور مخالفانِ تقلید دونوں گروہوں کو ایک معتدل مسلک پر جمع کر سکتا تھا یا کم از کم دونوں فریقوں میں اعتدال پیدا کر کے اور انکی باہمی منافرت و بیجا عصبیت کو مٹا کے ایک دوسرے سے قریب کر سکتا تھا اسی کو بحیثیت فریق اس بحث میں دھر لیا گیا ۔۔۔ ایک طرف سے کوشش شروع ہوئی کہ اُن کو "تقلید" اور "حنفیت" کا پکا دشمن باصطلاح حال "ٹھیٹ غیر مقلد" ثابت کیا جائے ۔۔۔ اور دوسری طرف سے اس کے جواب میں آپ کو عرفی قسم کا "پکا حنفی" اور موجودہ دور کی مروج تقلید کا حامی ثابت کرنے کیلئے زور لگایا گیا نتیجہ ان دونوں کوششوں کا یہ ہوا کہ شاہ صاحب کا جو مقصد تھا وہ کلی طور پر فوت ہو گیا۔ کاش اگر بجائے اس روش اختیار کر لینے کے حضرت شاہ صاحبؒ سے نسبت

لہ اس نمبر کی ترتیب کے دوران ہی میں دہلی سے ایک صاحب کا خط میرے نام آیا جس میں انھوں نے اپنا پتہ بلکہ نام تک نہیں لکھا ہے کہ میں ان کو خط ہی سے جواب دے سکتا۔ اس خط میں مجھ سے باصرار شدید یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ "ولی اللہ نمبر" میں "صرف خدا سے ڈرتے ہوئے بے دھڑک ہو کر" اس "حقیقت" کا اعلان کر دوں کہ ہندوستان میں موجودہ "جماعت اہلحدیث" کے بانی دراصل شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ہی ہیں اور آپ کا مسلک وہی تھا جو موجودہ جماعت اہلحدیث کا ہے اور اسکے ثبوت کیلئے جماعت اہلحدیث کے ایک مشہور بزرگ کے ایک مضمون کا حوالہ دیا گیا ہے جو بہت عرصہ ہوا دہلی ہی کے ایک رسالہ میں باقساط شائع ہوا تھا اور خط میں یہ تہدید بھی فرمائی گئی ہے کہ اگر تم اس حقیقت کا اعلان نہیں کر سکے تو سمجھا جائیگا کہ اپنی جماعت کے خوف سے ایسا نہیں کر سکے اور یہ بات صرف خدا پرستی کے دعوے کے خلاف ہے ۔۔۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تحزب نے لوگوں کے عقل و دماغ کو کس حد تک ماؤف کر دیا ہے ۱۲ منہ

رکھنے والے احناف اُس قسم کے حنفی بننے اور حنفیت کے اُس "طریقہ انیقہ" کو عملاً رائج کرنے کی کوشش کرتے جو شاہ صاحب کا طریقہ تھا اور جس کو آپ نے "فیوض الحرمین" میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تلقین کے حوالہ سے بایں الفاظ بیان فرمایا ہے:-

وذلك ان يوخذ من اقوال الثلثة قول اقربهم بها في المسئلة ثم بعد ذلك يتبع اختيارات الفقهاء الحنفيين الذين كانوا من علماء الحديث فرب شئ سكت عنه الثلثة في الاصول وما انغرضوا لنفيه ودلت الاحاديث عليه فليس بدّ من اثباته والكل مذهب حنفي (ص۲۹)

وہ طریقہ انیقہ جو تمام طریقوں میں سنت معروفہ سے قریب تر ہے یہ ہے کہ ائمہ ثلثہ (ابو حنیفہ، ابو یوسف محمدؒ) میں سے جس کا قول بھی سنت معروفہ (احادیث نبوی) سے قریب تر ہو وہ لیا جائے پھر اُن فقہاء حنفیہ کی ترجیحات کی پیروی کی جائے جو فقیہ ہونے کے ساتھ حدیث کے بھی عالم تھے۔ کیونکہ بہت سے ایسے مسائل ہیں کہ ائمہ ثلثہ نے اصول میں اُن کے متعلق کچھ نہیں کہا اور نفی بھی نہیں کی اور احادیث ان کو بتلا رہی ہیں تو لازمی طور پر اس کو تسلیم کیا جائے گا اور یہ سب حنفی مذہب ہی ہے۔

اور اسی "فیوض الحرمین" میں ایک اور جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی باب کے ایک اور "افاضہ" کا ذکر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:-

ثم كشف انموذجاً ظهر لى منه كيفية تطبيق السنة بفقه الحنفية من الاخذ بقول احد الثلثة وتخصيص عموماتهم والوقوف على مقاصدهم والاقتصار على ما يفهم من لفظ السنة وليس فيه تاويل بعيد ولا ضرب بعض الاحاديث بعضاً ولا رفضاً لحديث صحيح بقول احدٍ من الامة . وهذه الطريقة ان انماها الله واكملها فهي الكبريت الاحمر والاكسير الاعظم۔ (فیوض الحرمین ص۶۳)

پھر (روح نبوی کی طرف سے) میرے لئے ایک اور طریقے کا انکشاف ہوا جس سے "سنت نبوی" کے ساتھ "فقہ حنفی" کی تطبیق کی صورت مجھ پر منکشف ہوئی اور وہ یہ ہے کہ ائمہ ثلثہ (ابو حنیفہ، ابو یوسف، محمد) ان تینوں میں سے کسی ایک کا قول لے لیا جائے (یعنی جسکا قول بھی حدیث کے موافق ہو اسی کو اختیار کیا جائے) اور (حسب ضرورتِ تطبیق) انکے عمومات کی تخصیص کی جائے اور انکے اصل مقاصد (یعنی انکے اقوال کی اصل روح) کو سمجھ کر ان کی رعایت کی جائے — اور احادیث کے اصل الفاظ سے جو مفہوم ہوتا ہو اسی پر اقتصار کیا جائے کہ نہ اس میں بعید تاویلیں ہوں اور نہ ایک حدیث کو دوسری حدیث سے ٹکراتا ہو اور

نہ کسی امتی کے قول کی وجہ سے کسی صحیح حدیث کو چھوڑنا پڑے اور یہ وہ طریقہ ہے کہ خدا نے اگر اس کی تکمیل کرادی تو یہ "کبریت احمر" اور "اکسیر اعظم" ثابت ہوگا۔

بہر حال اگر "ولی اللہی حنفی" حضرات شاہ صاحب کے اس "طریقہ حنفیت" کو عملاً قبول کر لیتے اور اسی کو رواج دینے کی کوشش کرتے ___ اور اسی طرح شاہ صاحب سے تعلق رکھنے والے "عاملین بالحدیث" تقلید اور حنفیت کو اس درجہ میں تسلیم کر لیتے جو شاہ صاحب نے صراحۃً ان کو دیا ہے اور شاہ صاحب کی طرح اپنے اختلاف اور اپنی تنقید کا نشانہ صرف "غیر شرعی تقلید" اور "مسخ شدہ حنفیت" ہی کو بناتے۔ اور صحیح قسم کی تقلید اور اصلی حنفیت یا کم از کم میں شاہ صاحب کے پسندیدہ طریقہ ہی کو قبول کر لیتے یا برداشت ہی کر سکتے تو شاہ صاحب کا منشا پورا ہو جاتا۔

انہی سطروں سے شاہ صاحب کے فقہی مسلک کے متعلق میرا خیال بھی ناظرین کرام کو معلوم ہو گیا ہوگا۔

شاہ صاحب کی حنفیت اور آج کل کے حنفی

اس کے بعد بھی جو حضرات یہ معلوم کرنے کے لئے میری رائے کے منتظر ہوں کہ آجکل کی عام عرفی اصطلاح کی رو سے شاہ صاحب "حنفی" تھے یا "غیر مقلد" تو افسوس ہے کہ ان دونوں لفظوں نے اب جو خاص معنی اختیار کر لئے ہیں اُن کے پیش نظر اس سوال کا جواب میرے نزدیک صرف "نفی" ہی ہو سکتا ہے ___ اگر حنفیت کے دائرہ کو اتنا وسیع مان لیا جائے جتنی وسعت کہ اس کو ہمارے محترم دوست مولانا محمد یوسف صاحب فاضل بنوری نے اپنے مقالہ میں دی ہے اور "فیوض الحرمین" کی مذکورہ صدر عبارت میں شاہ صاحب کے لفظ "موالکل مذہب حنفی" کا مقتضا بھی وہی ہے تو بے شک شاہ صاحب کو "حنفی" کہا جا سکتا ہے اور خود شاہ صاحب بھی اسی معنی کر اپنے کو "حنفی" کہتے ہیں ___ لیکن آج ہمارے حنفی حلقوں میں "حنفیت" کے جو معنی عموماً سمجھے جاتے ہیں اُن کے اعتبار سے شاہ صاحب کو حنفی کہنا یقیناً زبردستی ہے۔ ہماری حنفی دنیا میں آج اُس شخص کو کہاں حنفی تسلیم کیا جا سکتا ہے جس کا اصول "دائماً تفریعات فقہیہ را بر کتاب وسنت عرض نمودن" ہو ___ اور جو کتاب وسنت سے فقہ کی "تقلید" کے اس اصول کو قیامت تک کیلئے امت کا فرض قرار دیتا ہو اور جس کا تحقیقی مسلک وہ ہو جو حجۃ اللہ میں ایک مستقل فصل قائم کر کے "ہمایناسب ہٰذا المقام التنبیہ علی مسائل ضلت فی بوادیہا الاوہام الخ" کے زیر عنوان صفحہ ۱۲۳ سے ۱۲۹ تک شاہ صاحب نے ارقام فرمایا ہے، بلکہ اسی حجۃ اللہ میں اور بدورِ میں بھی آپ نے دیگر ائمہ کے بعض اقوال کو از روئے ادلہ زیادہ قوی سمجھ کر اختیار بھی فرمایا ہے، اور یہ ذکر نادر قسم کے مسائل ہی کا نہیں ہے بلکہ جن مسائل کو آج کل حنفیوں اور غیر حنفیوں میں مابہ الامتیاز سمجھا جاتا ہے بعض ایسے مسائل میں بھی شاہ صاحب نے کسی دوسرے امام کے قول کو قوت دلائل کی وجہ سے اختیار کیا ہے مثلاً "مسئلہ قلتین" رفع یدین، الترجیع فی الاذان والایتار فی الاقامۃ" اقامۃ الجمعۃ فی القریۃ التی فیہا اربعون رجلاً حراً" وغیرہ وغیرہ ___ میرا خیال ہے کہ اگر آج کوئی فاضل دیانت داری سے اس روش پر چلے اور شاہ صاحب ہی کی طرح اس کو "حنفیت" کے منافی نہ سمجھتا ہو

بلکہ اس کو بھی حنفیت ہی کا ایک طریقہ سمجھتا ہو اور اسی بنا پر اپنا رشتہ حنفیت سے بھی رکھنا چاہتا ہو تو ہمارے زمانہ کے ٹکسالی قسم کے حنفی حضرات کبھی بھی اس کو حنفی تسلیم نہیں کرینگے۔۔۔ اور یہ صرف مفروضہ ہی نہیں ہے بلکہ میرے علم میں بعض وہ اہل علم ہیں جنکا طریقہ یہی ہے وہ شاہ صاحب کی ہدایت و وصیت کے مطابق "عرض مجتہدات بر کتاب و سنت" کے قائل ہیں اور اس سلسلہ میں وہ کہیں کہیں فقہ حنفی کی بعض تفریعات کو اپنے نزدیک کتاب و سنت کے مطابق نہ پاکر چھوڑ بھی دیتے ہیں، لیکن کتاب و سنت کے بعد اُن کا دینی مرجع فقہ حنفی ہی ہے اور اسی لئے وہ خود اپنے کو فقہاً حنفی ہی سمجھتے ہیں لیکن ہماری حنفی بارگاہیں ان کو حنفی تسلیم نہیں کرتیں۔۔ اور پھر بات اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ میں نے تو یہ بھی دیکھا ہے کہ اگر کوئی صاحب علم فقہ حنفی ہی کے اندر اتباع حدیث کے صادق جذبہ کے ماتحت ائمہ ثلثہ اور مشائخ حنفیہ کے انہی اقوال کو اختیار کرے جو اس کے نزدیک "اوفق بالحدیث" ہوں اور اس سلسلہ میں اُسے بعض اُن اقوال کو چھوڑنا پڑے جن کی نسبت فقہ کی کتابوں میں "ظاہر الروایت" کی طرف کی گئی ہے یا جن کو "مفتی بہ" بتلایا گیا ہے تو "کھرے اور پکے حنفیوں" کے نزدیک اتنے ہی سے اس کی حنفیت مخدوش ہو جاتی ہے۔ اس لئے اگر میں یہ کہتا ہوں کہ شاہ صاحب آج کل کی عام اصطلاح کے لحاظ سے "حنفی" نہیں تھے تو غلط نہیں کہتا اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے وہ حنفی ہی تھے۔

شاہ صاحب اور موجودہ جماعت اہلحدیث

ایسے ہی میں پوری بلند آہنگی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں اور کہتا ہوں کہ موجودہ "جماعت اہلحدیث" جس نے زمانہ کے امتداد کے ساتھ اب ایک مستقل پانچویں فقہی مسلک کی حیثیت اختیار کرلی ہے اور جس کے افراد کی اکثریت میں کم از کم میں نے تقلید اور حنفیت سے عناد کا سلبی داعیہ "عمل بظاہر الحدیث" کے ایجابی رجحان سے زیادہ پایا، اس جماعت کو ہرگز حق نہیں ہے کہ وہ شاہ صاحب کو اپنا مقتدا اور ہندوستان میں اس مسلک کا داعی اول مشہور کرے۔۔۔ میں نے "اہل حدیث" دوستوں اور بزرگوں میں کسی کو ایسا نہیں پایا جو حضرت شاہ صاحب کی ان تحقیقات کا اقرار اور کھلے دل سے ان سے اتفاق ہی کرتے ہوں کہ

(۱) ان ھذہ المذاھب الاربعۃ المدونۃ المحررۃ قد اجتمعت الامۃ او من یعتد منہا علی جواز تقلیدھا الی یومنا ھذا وفی ذلک من المصالح ما لا یخفی لاسیما فی ھذہ الایام (حجۃ ص۱۲۳)

اس وقت تک تمام امت نے یا کم از کم امت کے اُس طبقہ نے جس کا اعتبار کیا جاسکتا ہے ان مذاہب اربعہ (حنفی شافعی، مالکی، حنبلی) کی تقلید کے جواز پر اجماع و اتفاق کیا ہے اور اس تقلید میں بہت سی مصلحتیں ہیں جو مخفی نہیں ہیں خصوصاً آج کل کے اس زمانہ میں الخ

(۲) اور پھر اگلے صفحہ پر ابن حزم ظاہری کا جواب دیتے ہوئے یہ ثابت فرمانے کے بعد کہ کم علم والوں کا زیادہ علم والوں سے مسائل میں فتوے لینا اور اُن کا فتویٰ دینا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک ہی سے برا

مسلمانوں کا عام دستور رہا ہے، تقلید شخصی (خاص تقلید شخصی) کی توجیہ اور اس کا جواز اس طرح بیان فرماتے ہیں:-

ولا فرق بین ان یستفتی ھذا دائما او یستفتی ھذا حینا وذلک حینا الخ	ہمارے نزدیک اس میں کوئی فرق نہیں کہ کوئی شخص ہمیشہ ایک ہی عالم (مجتہد) سے فتویٰ لیا کرے (یعنی تقلید شخصی کرے) یا کیفما اتفق کبھی کسی عالم سے اور کبھی کسی عالم سے

(۳) اور انصاف کی یہ عبارت کہ "وبالجملة فالتمذھب للمجتھدین سر الھمه الله تعالیٰ" جو مع ترجمہ کے اسی نمبر کے صفحہ (۳۹۹) پر ناظرین کرام ملاحظہ فرما چکے۔

(۴) اور خاص حنفی مذہب کے متعلق آپ نے اپنے جو بلند خیالات "فیوض الحرمین" میں ظاہر فرمائے مثلاً یہ کہ مجھے دکھایا گیا کہ حنفی مذہب میں بڑا غامض سر ہے ... یہاں تک کہ میں نے اس کا مشاہدہ کیا کہ فی زماننا "حنفی مذہب" کو تمام دوسرے مذاہب پر فوقیت اور برتری حاصل ہے۔" (فیوض ص۱۰۲)

(۵) اور اسی "فیوض الحرمین" میں آپ نے یہ بھی صراحت کے ساتھ فرمادیا کہ "مذاہب اربعہ" کی تقلید کے بارہ میں مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص وصیت ہے (ملاحظہ ہو نمبر ہذا کا صفحہ (۴۰۰)

(۶) اور دوسری جگہ فرمایا مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ تم فروع (یعنی فقہ) میں اپنی قوم یعنی ہندی مسلمانوں کی جو عموماً حنفی المذہب ہی تھے) مخالفت نہ کرو۔ پھر آپ فرماتے ہیں کہ سرکار رسالت ہی سے مجھے "سنت" کے ساتھ فقہ حنفی کی تطبیق کا طریقہ بھی بتلایا گیا الخ (ملاحظہ ہو نمبر ہذا کا صفحہ (۳۸۸)

اور پھر ان تمام حقائق کے اظہار کے ساتھ اپنے دستخط کے ساتھ بھی "الحنفی عملاً" لکھتے ہیں (ملاحظہ ہو نمبر ہذا کا ص ۲۴۴)

بہر حال میں نے تو "اہلحدیث" کہلانے والے دوستوں اور بزرگوں میں جن کو کچھ معتدل اور غیر متعصب بھی پایا ان کو بھی حضرت شاہ صاحب کے اس مسلک سے بہت دور پایا اس لئے میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ حضرات کس بنیاد پر حضرت شاہ صاحب کو اپنا "پیش رو" کہتے ہیں ۔۔۔ الحاصل

وکلٌّ یدّعی وصلاً بلیلیٰ | ولیلیٰ لا تقرّ لھم بذاک

حضرت شاہ صاحب کے فقہی مسلک کے متعلق یہ بحث تو استطراداً آگئی، ورنہ در اصل آپ کے "وصیت نامہ" کی اول و آخر دو وصیتوں پر ہم اس سلسلہ کو ختم کرنا چاہتے تھے پہلی وصیت تو گزر چکی آخری وصیت آپ کی یہ ہے:-

شاہ صاحب کی آخری وصیت

در حدیث آمدہ است "ومن ادرک منکم عیسیٰ بن مریم فلیقرء منی السلام" این فقیر آرزوے تمام دارد اگر ایام حضرت روح اللہ را در یا بد اول کسیکہ تبلیغ سلام کند	حدیث میں وارد ہوا ہے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو تم میں سے عیسیٰ بن مریم کو پائے تو انکو میرا سلام پہنچا دے۔ اس فقیر کی بڑی تمنا ہے کہ اگر حضرت روح اللہ مسیح بن مریم کا زمانہ مجھے میسر ہو تو

من باشم و اگر من آنزا نہ دریافتم ہر کسیکہ از اولاد دیا اتباع این فقیر زمان بعثت نشان آنحضرت دریابد حرص تمام کند در تبلیغ سلام تاکتیبہ آخرہ از کتائب محمدیہ باشیم۔ والسلام علی من اتبع الھدیٰ

(وصیت نامہ ص ۲۴)

سب سے پہلا وہ شخص ہو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سلام ان کو پہنچانے وہ میں ہوں۔ اور اگر وہ زمانہ میں نے پایا تو پھر میری اولاد اور میرے پیروؤں میں جو بھی حضرت مسیح کی آمد ثانی کو پائے اس کو میری وصیت ہے کہ حضرت کے اس سلامی پیغام کو ان تک سب سے پہلے پہنچانے کی وہ پوری کوشش کرے تاکہ محمدی لشکر میں آخری سفیر ہونیکا شرف ہم کو حاصل ہو۔ والسلام

حضرت شاہ صاحب کی اس وصیت کو ان کے تمام حلقہ بگوشوں تک پہنچاتے ہوئے یہ عاجز بھی اپنے عزیزوں اور دوستوں سے بہ خاص طور پر درخواست کرتا ہے کہ وہ اس سعادت کو حاصل کرنے کی پُرجوش تمنا اور حریصانہ نیت رکھیں اور یہ حقیر سراپا تقصیر بھی الحمدللہ انتہائی درجہ اس کا آرزومند ہے۔ دیکھئے یہ دولت کس قسمت والے کے ہاتھ آتی ہے۔ واللہ یختص برحمتہ من یشاء

حضرت شاہ صاحب کی اس آخری وصیت ہی پر اس سلسلہ کو بھی ختم کیا جاتا ہے۔ حضرت کی وفات اور باقیات الصالحات کا ذکر مولانا گیلانی کے مقالہ میں آچکا ہے۔ والحمدللہ اولاً وآخراً

محمد منظور النعمانی عفا اللہ عنہ

انشاء اللہ آئندہ سے

"ولی اللہی حکمت" اور حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علوم ومعارف کی نشر واشاعت

الفرقان کا خاص مشن ہوگا

اپنے اس مقالہ کے علاوہ جس کو پھر ترتیب دے کر دوسرے شاہ ولی اللہ نمبر کی شکل میں پیش کرنیکا ارادہ ہے۔ شاہ صاحب کے خاص خاص افادات کو "الفرقان" کے عام پرچوں میں بھی انشاءاللہ پیش کیا جاتا رہیگا، اور حتی الوسع التزام کیا جائے گا کہ الفرقان کا کوئی نسخہ آئندہ اس سے خالی نہ رہے۔

اپنا دوسرا شاہ ولی اللہ نمبر بھی انشاءاللہ تعالیٰ ہم اس سنہ ہی میں اپنے ناظرین کی خدمت میں پیش کرسکینگے۔ ضخامت اور قیمت کے متعلق ابھی صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ مہینے کی کوئی تعیین کی جاسکتی ہے۔

اُمتِ مسلمہ سے روح ولی اللّٰہی کا خطاب

(از جناب سید محمد عبدالرب صاحب صوفی اسسٹنٹ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول بہرائچ)

یہ دیکھ کیوں ہیں تعیش کے میکدے آباد
نہ پوچھ مسجد غرناطہ کیوں ہوئی برباد

یہ دیکھ کس نے بھرا رب آج غیروں کا
نہ پوچھ ذوق میں اسلامیوں کے کیا ہے فساد

یہ دیکھ رسم و رہِ خسروانِ دیں کیا تھی
نہ پوچھ لُٹ گئی کیوں خلافتِ بغداد

یہ دیکھ سخت ہے کس درجہ بندِ لادینی
نہ پوچھ ہائے مسلمان ہونگے کب آزاد

یہ دیکھ کس نے محمدؐ سے بے وفائی کی
نہ پوچھ قوم مسلماں ہے آج کیوں ناشاد

یہ دیکھ خوار ہے مسلم ہے خوار تر کہ نہیں
نہ پوچھ تیز ہے کیوں لہجۂ کیا المرصاد

یہ دیکھ کون ہے مصداق حرفِ دَلّلِسَکُمْ
نہ پوچھ قہرِ خدا نے کیے کیا برباد

جو بیٹھے ہیں سرِ اُمّی کی خوابگاہیں دیکھ
نہ پوچھ حشر طلسمات جنتِ شداد

نہ دل میں شوقِ اطاعت نہ ذوقِ ایمانی
ترے ہوس کی عمارت ہے بخت بے بنیاد

کدھر چلا ہے کدھر راہ ہے کہاں منزل
یہ تیرا وقت! یہ مشکل! یہ سعی لاحاصل

تری حقیقتِ ہستی ہے دانۂ اسپند
اگر ہو ضبطِ خلیلی تو شعلے سے نہ گزند

ہمالیہ سے گزر جائے مدِّ رفعت میں
وہ ذرہ جس کے تب و تاب میں ہے عزمِ بلند

کمال جادۂ لاتر کنوا کی منزل ہے
سوال کر نہیں سکتا فقیرِ غیرت مند

زمیں سے اپنی اُبھر کر بلند ہو جاتا
بس اتنی بات کو کہتے ہیں رفعت الوند

حسینؓ بن کے نظارہ اس حسین پیدا کر
اگر یزید کی بیعت تجھے نہیں ہے پسند

منی میں آج بھی لگتی ہے چوٹ سی دل پر
کہ یاد آتے ہیں بے طرح وہ اب و فرزند

یہ بات ہوتی ہے پختہ یقین سے پیدا
کہ ناز دیکھ کے دل ہو نیاز کا پابند

توانگری پہ صدا بے عمل نہیں موقوف
خدا سے روٹھ کے تقدیر کا گلہ تاچند

عجیب چیز ہے افلاس مرد مومن کا
یہ ہو تو سہل ہے فقر رسول ؐ سے پیوند

گلہ زمانہ کا اے جان پاک ہے زہر
سمجھ تو فلسفۂ نہی "لا تسبوا الدھر"

ہوائے صحن چمن لاکھ ہو نشاط انگیز
نہیں وہ ضبط سلماں جو توڑ دے پرہیز

ہوئی جو بارش مے جام الٹ دیا میں نے
مرا پیالہ کبھی ہو نہیں سکا لبریز

متاع لذت آہ سحر کبھی مت کھو
بہت کم اندر ہے اقلیم خسرو و پرویز

تجھے یہ سیر گل و غنچہ سازگار نہیں
اگر ہے ذوق دکھا سوز رومی و تبریز

اگر پسند نہیں تجھ کو گردش ایام
تو کیوں نہ اٹھ کہ ہویدا ہو کوئی رستاخیز

عجیب عقدہ کیا وا حکیم مشرق نے
زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز"

کسی سے پوچھ طریق ملاح کارہ گر
عیار شرع نہیں کار نادر و چنگیز

نہ شہسوار نہ منزل سے آشنا ہے تو
عبث ہیں تیرے لئے تازیانہ و مہمیز

تمام قوت خیبر شکن ہے چنگیزی
نہ ہو ہلاکت مرحب جو مصلحت آمیز

مزاج چاہیئے تیرا کہ خانقاہی ہو
جو دل مقام الٰہی بدن سپاہی ہو

تجھے قرار نہیں ہے ابھی کسی پہلو
خود اپنے دل پہ ابھی تک تجھے نہیں قابو

تری نگاہ کا دامن ابھی ہے آلودہ
بھٹک رہی ہے ابھی تک تری نظر ہر سو

بھری ہیں سر میں ہوائیں ہوا پرستی کی
شراب عشق سے خالی ہے نہ کیوں یہ کدو

نظام ملت بیضا ابھی درست نہیں
کہ ہے زبان پہ ابھی تک فسانۂ من و تو

عدو نے مل کے گلے خوب ہی کاٹے ہیں
زبان تیغ سے اب تک ٹپک رہا ہے لہو

اثر کہاں سے ہویدا تری خطابت میں
کہ آ رہی ہے تری نطق سے نفاق کی بو

ذرا ٹٹول تو پہلو میں قلب مومن کو
کہے تو اَشْہَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ

عمل بہت ہے مگر کیوں کوئی نتیجہ نہیں
عبث ہے سوزن بے رشتہ سے امید رفو

اثر کہاں سے ہو اِنَّ الصَّلٰوۃَ تنہٰی کا
ابھی تو آب نجس سے کیا ہے تو نے وضو

بغیر بیدردی حق ابھر نہیں سکتا

بدن میں روح یقیں ہو تو مر نہیں سکتا

نظر اٹھا تو یہی ادا اسیر نعمت وجاہ — فقیر مست کے پیروں تلے ہے تاج وکلاہ

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں — فراز چرخ کنم حکم بر ستارہ وماہ

نہ خانقاہ وہ میری نہ مدرسہ کہ جہاں — "نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ"

یہ وہ دیار ہے جس کی فضا میں بستی ہے — وہ زندہ قوم کہ جسکے لئے ہے موت گناہ

سنو مات کے بندو کہ معتبر ہے فقط — حیات انکی جو مرتے ہیں فی سبیل اللہ

تُجَاهِدُونَ بِاَموَالِكُم وَاَنفُسِكُم — یہی ہے عشق یہی معرفت یہی ہے نگاہ

یہ معرفت ہے نہ اسٹیج پر نہ کالج میں — مرے بیاں پہ زمانہ کی حقیقت ہے گواہ

وہ خانقاہ ہے مری کہ جسکی راتوں میں — بلند غلغلہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللہ

وہ مدرسہ ہے مرا جس کی درسگاہوں میں — "معلم و متعلم ہیں سب ولی اللہ"

مرا مزاج لڑکپن سے خانقاہی ہے
مرا ضمیر سپاہی دماغ شاہی ہے

نہ کج کلاہ ہے صوفی نہ صاحب اکلیل — گلیم و خرقہ نہ تن پر نہ دوش پر زنبیل

غنی ہوں صورت عثمانؓ فقیر مثل علیؓ — نہیں متاع کو میری غم کثیر و قلیل

مری نظر میں ہے یم قلزم و زمین سویز — وہ رشک دشت و بیاباں یہ رشک دجلہ و نیل

تمام سادہ و رنگیں ہے زندگی میری — "نہ ہے طریقہ عبد العزیز و اسمٰعیل"

کہیں بلند تو ہو سید احمدی تکبیر — کہ قافلہ ہے مرا گوش بر صدائے رحیل

ادب سے "یَا اَبَتِ افعَل" کہے گلو میرا — کہیں سنائے تو "ماذا تری" زبان خلیل

اٹھے جو مدرسہ و خانقاہ کا لشکر — بہم ہو قوت جبریل و صور اسرافیل

بہت قریب ہے نصرت اگر ہو عزم غزا — کہ فتح بدر ہے فئۃ قلیلۃ کی دلیل

ہمیشہ تیغ پہ کچھ منحصر نہیں ہے جہاد — دلوں میں ہو تو یہی پختہ جذبہ تعمیل

یہی ہے مختصراً حکمت ولی اللہ
جسے تو مدرسہ و خانقہ اٹھے تو سپاہ

تواریخ جانفزا

سنہ ۱۳۵۹ھ

ہدیہ محقر از محمد حسن بدرؔ سنبھلی فاضل دیوبند

سنہ ۱۹۴۰ء

(اس نمبر کے پہلے ایڈیشن کی طباعت ۱۳۵۹ھ اور ۱۹۴۰ء میں ہوئی تھی لیکن اشاعت کی نوبت ۱۳۶۰ھ اور ۱۹۴۱ء میں آئی لہٰذا ذیل کی تواریخ کو تاریخ طباعت اور ضمیمہ آئندہ کی تواریخ کو تواریخ اشاعت سمجھنا چاہئے) ہدیہ

تحفۂ الفرقان ولی اللہ

سنہ ۱۳۵۹ھ

گنج جواہر بیّنات من الہدیٰ والفرقان

سنہ ۱۳۵۹ھ

الفرقان بریلی کا گلشن عرفان ولی اللہ نمبر

سنہ ۱۹۴۰ء

الفرقان کا جلیل المراتب شاہ ولی اللہ نمبر

سنہ ۱۹۴۰ء

کاشفِ اسرار و بیّناتٍ منَ الہدیٰ والفرقان

سنہ ۱۹۴۰ء

شاہِ اقلیمِ علومِ دیں ولی اللہؒ کو
حق نے بخشی تھی عجب فکرِ رسا طبعِ سلیم

آپ وہ مردِ مجاہد فی سبیل اللہ تھے
جس کی ہیبت سے مزاجِ کفر رہتا تھا سقیم

شرک و فسق و بدعت و الحاد نے کھائی شکست
سیفِ مسلولِ ولی اللہؒ سے ہو کر دو نیم

آپ کی شمعِ ہدایت کی بدولت ہند میں
پائی سب گم کردہ راہوں نے صراطِ مستقیم

آپ ہی کے عہد میں اس دین نے پایا فروغ
آپ سے پہلے ہوا تھا جو یہاں آکر مقیم

بہرہ اندوزِ سعادت ہند ہی تنہا نہ تھا
تھا عرب میں اور عجم میں آپ کا فیضِ عمیم

خیر و برکت کا سبب ہے ذکرِ اقدس آپ کا
ہاں مگر درکار ہے اس ذکر کو قلبِ صمیم

ہم کو الفرقان کا ممنون ہونا چاہئے
جس کے ہیں اوراق ذکرِ پاک سے باغِ نعیم

عطر آگیں ہے "ولی اللہ نمبر" کس قدر
روح افزا ہے دماغوں کیلئے اسکی شمیم

اہلِ ایماں میں یہ نمبر اس طرح شائع ہوا
باغِ عرفانِ الٰہی میں چلی گویا نسیم

ہے "ولی اللہ نمبر" بدرؔ "الفرقان" کا
سالِ تاریخِ طباعت کیوں نہ ہو ذکرِ عظیم

۱۹۴۰ء

ہدیۂ نایاب مادہائے تاریخ

سنہ ۱۳۶۰ھ

لالہ ہائے رنگارنگ از محمد حسن بدر سنبھلی علومی

سنہ ۱۳۶۰ھ

الفرقان بریلی کا عنقا ولی اللہ نمبر

سنہ ۱۳۶۰ھ

الفرقان کا بلند طبع شاہ ولی اللہ نمبر

سنہ ۱۳۶۰ھ

گلستانِ ہدی للناس بینات من الہدیٰ

سنہ ۱۳۶۰ھ

نزولِ ہدی للناس وبیناتٍ من الہدیٰ والفرقان

سنہ ۱۳۶۰ھ

تواریخ بیش بہا ولی اللہ نمبر

سنہ ۱۹۴۱ء

کواکب درخشان از محمد حسن بدر سنبھلی علومی

سنہ ۱۹۴۱ء

الفرقان کا تحفۂ نادر شاہ ولی اللہ نمبر

سنہ ۱۹۴۱ء

پرتوِ نور وبینات من الہدیٰ والفرقان

سنہ ۱۹۴۱ء

قطعۂ خوش رنگ از محمد حسن بدر سنبھلی

سنہ ۱۳۶۰ھ — ۱۹۴۱ء

غنچۂ طبع من چو گل بشگفت — دید چوں گلستانِ ولی نمبر

بدر تاریخِ سال طبعش گفت — غنچۂ دلستانِ ولی نمبر

سنہ ۱۹۴۱ء

افقر محمد حسن بدر سنبھلی فاضلِ دیوبند

سنہ ۱۹۴۱ء

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور دار العلوم دیوبند

(از جناب مولانا نسیم احمد صاحب فریدی فاروقی امروہی رفیق ادارۃ الفرقان بریلی)

ساقیٔ دہلی کے مستوں نے بارضِ دیوبند — جب رکھی بنیاد میخانہ بطورِ یادگار

دور دورہ ساغرِ صہبائے طیبہ کا ہوا — جرعہ نوشانِ ازل آئے قطار اندر قطار

قاسمؒ و محمودؒ و انورؒ نے لنڈھائے خم کے خم — اپنی وسعت کے مطابق پی گیا ہر بادہ خوار

آج بھی ساقی کی چشمِ خاص کی تاثیر دیکھ — بادۂ مغرب کے متوالوں کا ٹوٹا ہے خمار

آج بھی آفاق میں اس میکدے کی دھوم ہے — چار جانب سے سمٹ کر آرہے ہیں بادہ خوار

در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق — یہ خصوصیت یہاں ہر فرد میں ہے آشکار

اس کے ہر میخوار کو پیرِ مغاں کا حکم ہے — "با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار"

کاش اے ساقیٔ دہلیؒ تو بھی آکر دیکھتا — اپنے میخانے کی رونق اپنے رندوں کی بہار

تیرا دورِ جام، دورِ چرخ سے بھی تیز تر — تیرا مستقبل ترے ماضی سے بڑھکر شاندار

یاالٰہی حشر تک باقی رہے یہ میکدہ — دور میں ساغر رہے تا گردشِ لیل و نہار

اس کی ہر ہر اینٹ میں تاریخِ ماضی ثبت ہے — ہند میں بزمِ ولیؒ کی ہے یہ واحد یادگار

مسلمِ ہندی اگرچہ مفلس و نادار ہے — پھر بھی اس سرمایۂ ملت کا ہے سرمایہ دار

شوکتیں جب دہلیٔ مرحوم کی آتی ہیں یاد — دیکھ کر اس کو بہل جاتا ہے قلبِ سوگوار

جن کی کوشش سے چلا ہے دورِ صہبائے حجاز — نور سے معمور کردے اے خدا ان کے مزار

آ فریدی تو بھی ہو ساغر بکف مینا بدوش
طالبِ جوشِ عمل ہے ساقیٔ ابرِ بہار

---

[1] حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

Regd No. A-353.

Cover & Pictures printed at Baluja Press, Delhi.